جلد سوم

اشرف التوضیح

تقریر اردو

مشکوٰۃ المصابیح

زیر سرپرستی

جامع المعقول والمنقول حضرت الشیخ الاستاذ

مولانا نذیر احمد صاحب دامت برکاتہم

بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

اہتمام

شیخ الحدیث مولانا محمد زاہد صاحب

نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

ناشر

مکتبۃ العارفی

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

فون: 041-8715856

اشرف التوضیح تقریر اردو مشکوٰۃ المصابیح

اشرف التوضیح

تقریر اُردو

مشکوٰۃ المصابیح

زیرِ سرپرستی:

جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث

مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

افادات:

شیخ الحدیث مولانا محمد زاھد صاحب

نائب صدر جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

ناشر:

مکتبۃ العارفی

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

فون: 041-8715856

نام کتاب .... اشرف التوضیح تقریر اردو مشکوۃ المصابیح جلد سوم

افادات .... حضرت مولانا محمد زاہد صاحب دامت برکاتہم

طبع اول .... ذوالقعدہ ۱۴۲۵ھ

تعداد .... ایک ہزار

کمپوزنگ .... الخطاط کمپوزر

ناشر .... مکتبۃ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

ملنے کے پتے

لاہور: ادارہ اسلامیات، ادارۃ الحرم، مکتبہ سید احمد شہید، مکتبۃ العلم، المصباح

کراچی: دارالاشاعت، زم زم پبلشرز، قدیمی کتب خانہ

ملتان: کتب خانہ مجیدیہ، مکتبہ حقانیہ، ادارہ تالیفات اشرفیہ

مکتبہ شہید اسلام اسلام آباد

مکتبہ فریدیہ اسلام آباد

مکتبہ رشیدیہ راولپنڈی

مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اشرف التوضیح کی تیسری جلد ایک دہائی سے زائد عرصہ کے وقفے کے بعد پیش کی جارہی ہے، اتنی تاخیر کا باعث ایک تو یہ امر بنا کہ اشرف التوضیح کی پہلی دو جلدوں کی بنیاد حضرت والد ماجد قدس سرہ کی امالی اور دورانِ درس طلبہ کے لکھے ہوئے نوٹس تھے، لیکن مشکوٰۃ المصابیح کا جو حصہ تیسری جلد میں زیرِ بحث آنا تھا وہ چونکہ کافی عرصہ پہلے حضرتؒ کے زیرِ درس رہا تھا اس لئے اس کے متعلق حضرت کے امالی یا طلبہ کے اپنے طور پر حضرتؒ سے پڑھنے کے دوران لکھے ہوئے نوٹس تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکے۔ اس مسئلے کے حل کے لئے ایک سال حضرتؒ نے مشکوٰۃ جلد ثانی کا درس خود اپنے پاس رکھا تا کہ اب حضرتؒ کے افادات ساتھ ساتھ لکھے جا سکیں لیکن آپؒ اس کا بہت کم حصہ پڑھا پائے تھے (وہ بھی کتاب الادب سے جبکہ اشرف التوضیح جلد ثالث کتاب الاطعمہ سے شروع ہو رہی ہے) کہ آپؒ کی دیگر تعلیمی، دعوتی، اصلاحی اور انتظامی مصروفیات اور بالخصوص ہرنیاں کا آپریشن اس درس کو جاری رکھنے میں حائل ہو گیا۔

اب طے یہ ہوا کہ اشرف التوضیح کی تیسری اور اس کے بعد کی جلدوں کی بنیاد حضرتؒ کی امالی و تقاریر کو بنانے کی بجائے باقاعدہ تصنیف کے انداز سے لکھا جائے۔ اس مجبوری کے علاوہ تیسری جلد کے لئے حضرتؒ کی طرف سے طے کئے گئے منہج کے زیادہ مناسب بھی یہی تھا، چنانچہ یہ کام برادرم مولانا مفتی محمد مجاہد شہید رحمہ اللہ کے ذمے لگا وہ ابھی کچھ ہی کام کر پائے تھے[1] کہ اس کام کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی گئی۔ کچھ عرصہ تک تو الحمد للہ احقر کے ہاتھوں یہ کام مناسب رفتار سے چلتا رہا لیکن بعد میں شرح ترمذی وغیرہ دوسرے تالیفی کام شروع ہونے کی وجہ سے رفتار کافی سست ہونے لگی، اس لئے بعض احباب کی تجویز ہوئی کہ اس طرح تو تیسری جلد کا معاملہ التواء ہی میں رہے گا، اس سے بچنے کے لئے احقر کا مشکوٰۃ جلد ثانی کا درس ہی ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مرتب و مدون کر کے شائع کر دیا جائے۔ ابتداء میں تو احقر کو اس تجویز کے قبول کرنے میں اس وجہ سے تردد رہا کہ خود اوراق سیاہ کرنا تو ایک طالب علمانہ کام ہے اپنی درسی تقاریر مرتب کروانا مجھ جیسے ایک ناکارہ طالب علم کو زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک احقر اس تجویز کو ٹالتا رہا لیکن کام کی سست رفتاری دیکھ کر آخر کار مجبوراً اس تجویز کو قبول کرنا پڑا، چنانچہ اپنے بڑوں کے مشورے سے بنام خدا یہ

(۱) کمپوز شدہ مسودے کے تقریباً ستر ہ صفحات انہی کے لکھے ہوئے ہیں، اس سے آگے "لذیذ کھانوں کا حکم" کے عنوان سے احقر کا لکھا ہوا ہے۔

کام شروع کروادیا گیا، اب کتاب الاطعمہ کی حدیث نمبر ۲۶ تک کا حصہ تو احقر کا اپنا لکھا ہوا ہے اس سے آگے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مرتب کئے گئے احقر کے درسِ مشکوٰۃ ہیں۔ (۱)

ان درسوں کو کیسٹوں سے کاغذ پر منتقل کرانے، انہیں صاف کر کے مرتب و مدون کرنے اور ضرورت کے مواقع پر حوالہ جات لکھنے کا کام ہمارے دوست مولانا مفتی سجاد احمد صاحب زید مجدھم استاذ حدیث جامعہ دارالقرآن فیصل آباد و فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد نے بڑی محنت و جانفشانی اور لگن سے انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ ساری کہانی اس لئے سنانا پڑی کہ ایک تو تیسری جلد کی تیاری میں تاخیر کی وجہ سمجھ میں آجائے دوسرے اس ریشم میں اس ناکارہ کی درسی تقریروں کے ٹاٹ کا پیوند لگانے کی مجبوری معلوم ہو جائے۔

اس جلد میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

(۱)-----مشکوٰۃ کی ہر حدیث کا عربی متن بھی بالالتزام دیا گیا ہے، یہ متن عموماً مشکوٰۃ کی شرح الطیبی مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی سے لیا گیا ہے۔

(۲)----- ہر زیرِ بحث حدیث کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ ابتدائی ۲۶ احادیث کا ترجمہ تو احقر کا لکھا ہوا ہے باقی احادیث کا ترجمہ بھی احقر کے دروس کی کیسٹوں سے لیا گیا ہے۔

(۳)-----ترجمان السنہ کے انداز میں ہر کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ دیا گیا جس میں موضوع سے متعلق اسلام کے عمومی مزاج اور اصول کو بیان کرنے میں اور بعض غلط فہمیوں یا افراط و تفریط کے ازالے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴)----- حتی الامکان تعبیرات سہل کرنے کی کوشش گئی ہے لیکن بہر حال علمی مباحث میں کسی قدر اصطلاحی اسلوب آجانا ناگزیر ہوتا ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ زیادہ تر حصہ درسی تقریروں پر مشتمل ہے اور دورانِ درس اصطلاحی انداز آجانا ایک فطری امر ہے۔ دورانِ تصحیح ایسی تعبیرات کو کسی قدر سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۵)-----احادیث کی تشریح کے دوران ایسے مباحث بھی زیرِ گفتگو آگئے ہیں جن کا صریح حکم قدیم علماء کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ایسے مواقع پر علماء عصر کی آراء کو ان کے مختصر دلائل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ یہ چیزیں طلبہ جو در حقیقت مستقبل کے محقق علما اور راہنمایانِ امت ہیں کے سامنے آجائیں اور ان کی مستقبل کی علمی و تحقیقی زندگی میں یہ چیزیں ان کے لئے مددگار رہوں۔ نیز یہ بات واضح ہو جائے کہ ان مسائل میں ایک

(۱) زیادہ تر یہ دروس ۲۱-۱۴۲۰ھ کے ہیں۔

سے زیادہ نقطہ نظر کی گنجائش ہے اس لئے اپنے نزدیک قابل ترجیح رائے پر ایسا جمود نہ ہو کہ دوسری رائے رکھنے ہی پر اعتراض کر کے بے اعتدالی کا ارتکاب کیا جائے۔ امید ہے کہ ان مباحث کو اسی تناظر میں دیکھا جائے گا۔

کسی بھی انسانی کام میں غلطی یا کمی کوتاہی کا رہ جانا ایک فطری امر ہے خصوصاً اس جلد کی مجھ جیسے ایک ناکارہ طالب علم کی طرف نسبت ہی غلطیوں وغیرہ کے امکان کے لئے کافی ہے۔ اس لئے اہل علم سے میری سب سے بڑی درخواست یہ ہے کہ وہ اس میں جو غلطی یا تسامح محسوس فرمائیں براہِ کرم احقر کو اس سے متنبہ فرمائیں، احقر ان کا ممنونِ احسان ہوگا۔

مولانا سجاد احمد صاحب زید مجدھم کے تیار کئے ہوئے مسودے کو میں نے ملاحظہ کر کے مناسب اصلاح کی پوری کوشش کی ہے، خاص طور پر تقریری انداز کے جملوں کو تحریری اسلوب کے قریب تر لانے کی بھی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی زبانی بیان اور تحریر کے انداز میں جو فرق ہوتا ہے اسے بالکلیہ ختم نہیں کیا جا سکا۔ ہو سکتا ہے کہ کئی جگہوں پر جملوں کی ساخت وپرداخت بعض حضرات کے ذوقِ لطیف پر ذرا گراں ہو، اسی طرح حوالہ جات درج کرنے کا انداز بھی شاید پوری کتاب میں یکساں نہ ہو، اسی طرح کی بعض اور تکنیکی خامیاں بھی محسوس ہو سکتی ہیں، امید ہے کہ اہل ذوق نفس مضمون پر نظر رکھتے ہوئے انہیں نظر انداز کر دیں گے۔

آخر میں اس جلد سے استفادہ کرنے والوں سے اپنے لئے، اپنے والدین بالخصوص والد ماجد شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ (جن کے زیرِ سایہ ہی یہ کام انجام پایا ہے) کے لئے دعا فرماتے رہیں بالخصوص مولانا مفتی سجاد احمد صاحب کے لئے جن کی محنت اور لگن کے بغیر اس جلد کا منظر عام پر آنا بظاہر بہت مشکل تھا۔

محمد زاہد

۲ر مضان المبارک ۱۴۲۵ھ

فہرست

كتاب الأطعمة

الفصل الاوّل

الفصل الثالث

باب الضیافة

الفصل الاوّل

باب الأشربة

الفصل الاوّل

باب النقيع والأنبذة

الفصل الأوّل

باب تغطية الأواني وغيرها

الفصل الاوّل

مقدمہ کتاب اللباس

كتاب اللباس

الفصل الاوّل

الفصل الثاني

الفصل الثالث

باب الخاتم

الفصل الأوّل

الفصل الثانی

الفصل الثالث

باب النعل

الفصل الاوّل

الفصل الثانی

باب الترجل

بالوں کو درست کرنے کا باب

الفصل الثانی

الفصل الثالث

باب التصاوير

الفصل الاوّل

الفصل الثاني

الفصل الثالث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الأطعمة

صاحب مشکوٰۃ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ خطیب تبریزیؒ نے کتاب کے شروع سے کتاب العلم تک ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں جن کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہے۔ پھر کتاب الطہارۃ سے یہاں تک زیادہ تر ایسی احادیث لائی گئی ہیں جن کا احکام و مسائل سے تعلق ہے۔ یہاں **کتاب الأطعمة** سے ایسی احادیث کا سلسلہ شروع فرما رہے ہیں جو زندگی کے مختلف امور و مراحل میں آداب سے تعلق رکھتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کی شرح سے پہلے مضمونِ باب کی مناسبت سے چند باتیں لکھی جائیں تاکہ باب کی احادیث اور متعلقہ مضامین کے سمجھنے میں بصیرت حاصل ہو سکے۔

(۱) کھانا کھانے کی شرعی حیثیت:-

انسان کی زندگی کا اصل مقصد حق تعالیٰ کی عبادت اور آخرت کی تیاری ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زندگی اور صحت کی بقاء اور تحفظ ضروری ہے۔ اگر زندگی ہی نہ رہے یا قوت و صحت جاتی رہے تو عبادت کیسی ہوگی اور آخرت کی تیاری کیسے ہوگی؟ اس لئے حق تعالیٰ نے انسان کو کئی ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں جن سے وہ اپنی زندگی کو بچاتا ہے اور قوت و صحت کی نشو و نما، ان کے تحفظ اور بحالی میں مدد لیتا ہے۔ پھر اس کو حکم ہے کہ ان نعمتوں کو استعمال کر کے اپنی زندگی کو باقی رکھے اور صحت و قوت کو بحال رکھے۔ انہی نعمتوں میں سے کھانے پینے کی اشیاء بھی ہیں۔ کھانے پینے کی بے شمار نعمتیں دے کر حق تعالیٰ نے اس کو ان کے کھانے کی اجازت بلکہ حکم دیا ہے۔ چنانچہ حکم ربانی ہے:

كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ (۱)

ہماری دی ہوئی پاکیزہ غذائیں کھاؤ۔

---

(۱) سورۃ البقرہ: ۱۷۲

دوسری جگہ ارشاد ہے: **كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ۔** (۱)

اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ (۲)

کھاؤ پیو مگر حد سے تجاوز نہ کرو۔

يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (۳)

اے رسولو! پاکیزہ غذائیں کھاؤ اور اچھے اچھے عمل کرو۔

ایسی بہت سی آیات میں حلال رزق حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے کھانے کا حکم ہے۔ رزقِ حلال کھانا اور اپنی صحت و قوت کا خیال رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور اللہ کے نیک بندوں کی سنت ہے۔

فقہاء نے کھانے کے کئی مرتبے لکھے ہیں، ہر مرتبے کا حکم الگ ہے۔ اتنی مقدار میں کھانا جس سے جان بچ سکے اور اتنی قوت حاصل ہو سکے جس کے بغیر نماز، روزہ اور دوسرے فرائض کا ادا کرنا ممکن نہیں یہ مرتبہ فرض ہے۔ لہٰذا بالکلیہ ترکِ طعام یا کھانے میں اتنی کمی جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو یا فرائض میں خلل واقع ہونے کا خطرہ ہو جائز نہیں، ایسا شخص تارکِ فرض شمار ہوگا۔

دوسرا مرتبہ ہے کہ اس نیت سے بقدرِ ضرورت سے زائد کھانا کہ نوافل، عبادت، تعلیم و تعلّم، خدمت خلق اور دوسرے نیک کاموں کی قوت و ہمت حاصل ہو یہ درجہ مستحب ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا جائے مگر نیک کاموں کی قوت و ہمت حاصل ہونے کی نیت نہ ہو، یہ مرتبہ مباح ہے، اس پر نہ گناہ ہے اور نہ ثواب۔

چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ جتنی مقدار پیٹ بھرنے اور بھوک مٹانے کے لئے کافی ہے اس سے معمولی زیادہ کھانا، اس کو مکروہ لکھا ہے۔

پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ بھوک مٹانے کی مقدار سے کافی زیادہ کھانا، اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ یہ صحت کی خرابی اور فسادِ معدہ کا باعث بھی ہے اور اسراف میں بھی داخل ہے۔ البتہ زیادہ کھانا اگر کسی مقصد صالح کے لئے ہو تو اس کی گنجائش ہے۔ مثلاً روزہ دار اس نیت سے زیادہ کھائے کہ روزہ نبھانے میں مدد ملے گی یا میزبان مہمان کو زیادہ کھلانے کے لئے اس کے ساتھ کھاتا رہے تاکہ مہمان شرمندہ ہو کر کھانا نہ چھوڑ دے۔ (۴)

---

(۱) سورۃ الانعام: ۱۴۲...... (۲) سورۃ الاعراف: ۳۱...... (۳) سورۃ المؤمنون: ۵۱...... (۴) ملخص مافی ردالمحتار ج۶ / ص۳۳۸ وہندیہ ج۵ / ص۳۳۶

نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے اور دوسری لذات میں اعتدال مطلوب ہے، بالکلیہ ترک کر دینا یا اتنی کمی کرنا بھی مناسب نہیں جس سے صحت خراب ہو یا ضعف ہونے لگے اور نفس پر بے جا مشقت اور تنگی ہو اور اتنی زیادتی بھی مناسب نہیں کہ اسراف اور بلا ضرورت کی حد تک پہنچ جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں كُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ پیو) کا حکم بھی ہے اور لَا تُسْرِفُوْا (حد سے تجاوز نہ کرو) یعنی اسراف سے ممانعت بھی ہے۔ اسی طرح احادیث میں کھانے پینے اور دوسری لذات میں بہت زیادہ کمی سے بھی ممانعت ہے اور بہت زیادہ کھانے سے بھی۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

جاء ثلثة رهط إلى أزواج النبى صلى الله عليه وسلم يسألون عن عبادة النبى صلى الله عليه وسلم فلما أخبروا بها كأنهم تقالوها فقالوا: أين نحن من النبى صلى الله عليه وسلم؟ وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تأخر! فقال أحدهم: أما أنا فاصلى الليل أبداً۔ وقال الآخر: أنا أصوم النهار أبداً ولا أفطر وقال الآخر: أنا اعتزل النسآء فلا أتزوج أبداً فجآء النبى صلى الله عليه وسلم إليهم فقال: أنتم الذين قلتم كذا وكذا؟ أما والله! إنى لأخشاكم لله وأتقاكم له لكنّى أصوم وأفطر وأصلى وأرقد وأتزوج النسآء۔ فمن رغب عن سنتى فليس منى۔[1]

تین آدمیوں نے ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں پوچھا، سن کر آپ کا عمل ان کو تھوڑا محسوس ہوا۔ پھر خود ہی یہ توجیہ کی کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عمل کی ضرورت نہیں اس لئے کہ) آپ کے اگلے پچھلے عمل حق تعالیٰ نے معاف فرمادیئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک کہنے لگا کہ میں پوری رات نوافل پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ رہوں گا کبھی شادی نہیں کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان سے پوچھا کہ تم نے ایسے ایسے کہا تھا، دیکھو! میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں لیکن میں کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں نے نکاح بھی کئے ہوئے ہیں، جو میری سنت سے اعراض کرے اس کا میرے ساتھ تعلق نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

كلوا واشربوا والبسو وتصدقوا من غير مخيلة ولا سرف۔[2]

کھاؤ، پیو اور پہنو اور صدقہ کرو مگر فخر اور فضول خرچی نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے:

---

(۱) مشکوٰۃ ج ۱/ص ۲۷ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ...... (۲) تفسیر ابن کثیر ج ۲/ص ۲۱۰، سورۃ الاعراف ناقلاً عن احمد والنسائی وابن ماجۃ

كل ما شئت والبس ما شئت ما اخطأخصلتان سرف ومخلية۔ (حوالہ بالا)

جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پہنو بشرطیکہ دو باتوں سے بچے رہو فضول خرچی اور تکبر و فخر سے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ليس الزهد في الدنيا بلبس الغليظ والخشن وأكل الجشب، إنما الزهد في الدنيا قصر الأمل۔(۱)

موٹا اور کھردرا پہننا اور بے مزہ غذا کھانا زہد نہیں، زہد تو آرزو اور تمنا مختصر رکھنا ہے۔

زیادہ کھانے کی مذمت فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما ملأ آدمي وعآءً شراً من بطن بحسب ابن آدم أكلات يقمن صلبه فإن كان لا محالة فثلث طعام وثلث شراب وثلث لنفسه۔(۲)

انسان نے پیٹ سے برا برتن کبھی نہیں بھرا، انسان کے لئے اتنے لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھیں، اگر اس سے زیادہ ضرور کھانا ہو تو (پیٹ کے تین حصے کرلے) ایک تہائی کھانا، ایک تہائی پینا اور ایک تہائی سانس کے لئے۔

اس حدیث سے وہی بات معلوم ہوئی جو پہلے فقہاء سے نقل کی جاچکی ہے کہ اتنی مقدار میں کھانا جس سے زندگی بحال رہ سکے اور اتنی قوت حاصل ہو جس سے فرائض ادا ہو سکیں فرض ہے، کمر سیدھی رہنے سے یہی درجہ مراد ہے، اس سے زیادہ اعتدال کے ساتھ کھانا مباح ہے، اتنا زیادہ کھانا کہ پیٹ بالکل بھر جائے اور سانس بھی بمشکل نکلے ممنوع ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کی تفسیر کرتے ہوئے اسراف کی تفسیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

إن من السرف أن تأكل كل ما اشتهيت۔(۳)

یہ بات بھی فضول خرچی میں سے ہے کہ جو بھی جی چاہے کھالیا جائے۔

یعنی صرف اس بنیاد پر نہیں کھانا چاہئے کہ دل چاہتا ہے بلکہ ضرورت، افادیت اور نفع و نقصان دیکھ کر کسی چیز کو کھانا چاہئے۔

ان تمام نصوص سے یہ بات حاصل ہوئی کہ شریعت مطہرہ کی نظر میں کھانے پینے میں توسط و اعتدال

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۴۵۰ ...... (۲) مشکوٰۃ ص ۴۴۲ کتاب الرقاق ...... (۳) ابن کثیر ج ۲/ص ۲۱۰ و قال رواہ الدار قطنی فی الافراد و قال ہذا حدیث غریب تفرد بہ بقیۃ

مطلوب ہے نہ اتنی کثرت کرے جس سے غفلت، قساوت، بلادت اور کاہلی پیدا ہو اور نہ اس قدر قلت جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے یا بھوک پیاس کے ستانے کی وجہ سے قلب کو تشویش و پریشانی لاحق ہو اور جمعیت خاطر اور قلبی یکسوئی جاتی رہے اس لئے کہ حسن عبادت کی ایک بہت بڑی بنیاد ہے یہی قلبی یکسوئی اور جمعیت خاطر ہے، اس کے بغیر عبادت میں نشاط اور دلجمعی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں تعلیم دی گئی ہے: کھانا رکھا جا چکا ہو اور ادھر نماز شروع ہو جائے تو کھانا کھا کر پھر نماز پڑھنی چاہئے ورنہ دل کھانے کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے نماز میں یکسوئی حاصل نہیں ہو گی۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

إذا وضع عشاء أحدكم وأقيمت الصلاة فابدؤا بالعشاء ولا يعجل حتّى يفرغ منه۔[1]

جب کھانا رکھ دیا جائے اور نماز کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا کھالو اور جلدی نہ کرو یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ۔

نماز میں دلجمعی اور یکسوئی کا شرعاً مطلوب ہونا اس سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ پیشاب روک کر نماز پڑھنے سے ممانعت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: **لا يصلّي وهو حقن حتّى يتخفف۔**[2]

پیشاب روک کر نماز نہیں پڑھنی چاہئے یہاں تک کہ ہلکا ہو جائے۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز و عبادت میں دلجمعی اور یکسوئی مطلوب ہے اس لئے کھانے میں اتنی کمی کرنا بھی شرعاً ناپسندیدہ ہے جس سے اگرچہ کمزوری نہ ہو مگر دلجمعی فوت ہو جائے۔

یہاں مضمون کی مناسبت سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ایک حکیمانہ عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں مذکورہ مضمون عجیب سادگی اور جامعیت کے ساتھ بیان ہوا ہے:

> عبادت میں نشاط اور سرور صحت اور قوت سے ہی ہوتا ہے اور تجربہ ہے کہ آج کل تقلیل غذا سے صحت برباد ہو جاتی ہے، فاقہ کر کے نماز پڑھنے سے آنتیں قل ھو اللہ پڑھیں گی زبان و قلب سے کچھ نہ نکلے گا، اسی طرح غذائے جسمانی کی کثرت سے غذائے روحانی یعنی ذکر اللہ کم ہو جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
>
> تہی از حکمتی بعلت آں   کہ پری از طعام تا بینی
>
> یعنی حکمت و دانش سے تو اس لئے خالی ہے کہ ناک تک کھانے سے بھرپور ہے۔
>
> اس لئے سالک کو غذائے جسمانی کی کثرت بھی نہ چاہئے بلکہ توسط کا لحاظ رکھنا چاہئے مگر یہ ضرور ہے کہ سب کا اوسط ایک نہیں بلکہ ہر شخص کا اوسط مختلف ہے اور اوسط سے تجاوز کرنا

---

(۱) صحیح بخاری ج۱/ ص ۹۲ کتاب الاذان و ج ۲/ ص ۸۲۱ کتاب لاطعمۃ ...... (۲) ابوداؤد ج۱/ ص ۱۲

اور زیادہ کھانا برا ہے، اسی طرح اوسط سے کم کھانا بھی مضر ہے، ایک ضرر تو جسمانی ہے کہ غذا بہت کم کرنے سے ضعف لاحق ہوتا ہے اور کام نہیں ہو سکتا اور ایک ضرر مقصودِ سلوک کا ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ تشبہ بالملائکہ حاصل کرے۔ تشبہ بالملائکہ اس کو حاصل ہوتا ہے جو نہ شبع (سیری) سے بدمست ہو نہ جوع (بھوک) سے پریشان ہو بلکہ معتدل حالت میں رہ کر طمانینت وجمعیت قلب سے متصف ہو اور جمعیت قلب جیسا کہ زیادہ کھانے سے فوت ہوتی ہے کم کھانے سے بھی فوت ہوتی ہے، زیادہ کھانے سے خطرات کا ہجوم ہوتا ہے کیونکہ معدہ کی تبخیر دماغ کی طرف صعود کرتی ہے تو دماغ پریشان ہوتا ہے اور کم کھانے سے ہر وقت روٹیوں کی طرف دھیان لگا رہتا ہے اس لئے عبادت بھی ناقص ہوتی ہے، پس کھانے سے اصل مقصود جمعیت قلب ہے نہ بہت کھانا مطلوب ہے نہ کم کھانا، دلیل اس کی یہ ہے: **إذا حضر العشاء والعشاء فابدؤا بالعشاء** ۔ فقہاء نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کھانا ٹھنڈا ہونے سے اس کی لذت زائل ہونے کا اندیشہ ہو جب بھی نماز کو مؤخر کر دینا چاہئے، منشا اس کا وہی تحصیل جمعیت قلب ہے کہ بار بار یہ خیال نہ آوے کہ نماز جلدی پڑھوں تاکہ کھانا ٹھنڈا نہ ہو جاوے۔

تقلیل طعام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس وقت خوب اشتہاء ہو اس وقت کھانا کھا کر اشتہاء (بھوک) کو فنا نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہاتھ روک لینا چاہئے۔

(شریعت وطریقت ص ۲۶۴)

(۲) صوفیاء کے مجاہدات اربعہ:-

صوفیاء نے اصلاحِ نفس کیلئے چار مجاہدات کو ضروری قرار دیا ہے: (۱) ترک طعام، (۲) ترک منام (۳) ترک کلام (۴) ترک اختلاط مع الانام۔

چاروں مجاہدات میں ترک سے تقلیل مراد ہے۔ حاصل یہ کہ کھانے، سونے، گفتگو اور لوگوں سے ملاقات میں کمی کی جائے اور وہ بھی اعتدال کے ساتھ۔ یہاں اس کے بارے میں کئی وضاحتیں پیش نظر ہیں:

(۱)........ کھانے اور نیند میں کمی کرنا خود مقصودِ اصلی نہیں بلکہ اصل مقصود کا ذریعہ ہے۔ اصل مقصود اوامر الٰہیہ کو بجا لانا اور معاصی اور محرمات سے اجتناب ہے لیکن یہ مقصود چونکہ ان مجاہدات پر موقوف ہے اس لئے ان مجاہدات کو بطور ذریعۂ مقصود اور وسیلے کے تجویز کیا جاتا ہے، اس بات کی مزید وضاحت اپنے الفاظ میں لکھنے کی بجائے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

''ذریعہ اور مقصود یہ دونوں الفاظ محاورات اور رات دن کی بول چال میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان الفاظ کو بولنے والے بہت کم ایسے ہیں جو ان کے حقیقی معانی و مطالب کو سمجھتے ہیں، زیادہ تر نا سمجھی کے باعث ذریعہ کو مقصود اور مقصود کو ذریعہ بنادیتے ہیں یعنی ذریعہ کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو مقصود کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مقصود کے ساتھ ذریعہ جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔''

''غور کیجئے! ہمیں دنیا میں کس چیز کی ضرورت ہے اور وہ چیز کس طرح حاصل ہوتی ہے پس وہی ضروری چیز مقصود ہے اور ذریعہ اسی وقت کار آمد ہوتا ہے جب مقصود کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مثلاً سیڑھی کہ چھت پر چڑھنے کا ذریعہ ہے تو سیڑھی کا بنانا درست اور ضروری ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ چھت پر چڑھنے کے کام لائی جائے نہ یہ کہ سیڑھی بنا کر احتیاط سے گھر میں رکھ لی جائے اور اس کو مقفل کر دیا جائے اور اس کو استعمال نہ کیا جائے یا بہت سی سیڑھیاں بنا بنا کر گھر میں رکھ لی جائیں۔'' (۱)

حاصل یہ کہ ذرائع اور مقاصد کا فرق بڑی وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ ذرائع اور مقاصد کا فرق سمجھ کر ہر ایک کو اس کے درجے کے مطابق اہمیت دینا ضروری ہے۔ جو چیزیں بطور ذرائع کے اختیار کی جاتی ہیں ان کو مقاصد سمجھنا یا ان کو مقاصد کی طرح اہمیت دے کر ان کے ساتھ مقاصد والا معاملہ کرنا غلطی ہے۔ ذرائع کو اسی حد تک اختیار کیا جائے جب تک وہ مقصود کا ذریعہ ہوں۔ ذرائع میں اتنا انہماک کہ مقصود سے بے فکر ہو جائے یا مقصود فوت ہونے لگے قطعاً جائز نہیں۔ یہ مجاہداتِ اربعہ جن کو صوفیا کرامؒ ''مجاہدۂ حکمیہ'' کہتے ہیں ذرائع ہیں اصل مقصود طاعات کو بجالانا اور معاصی سے اجتناب ہے جس کو صوفیاء کرامؒ ''مجاہدۂ حقیقیہ'' کہتے ہیں۔ اب کسی کو ترکِ طعام و منام کا اہتمام تو ہمیشہ رہتا ہو مگر وہ اسی کو عروجِ کمال سمجھ کر طاعات و اجتناب معاصی سے بے فکر ہو تو یہ حدود سے تجاوز ہے اور ذریعہ کو مقصود بنا دیا اور مقصود کو ذریعہ۔

(۲)............ جیسے بعض لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ ان مجاہداتِ اربعہ کو ذریعہ کی بجائے مقصود کا درجہ دیتے ہیں ایسے ہی بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ ان مجاہدات کو بدعت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نصوص میں ان کا ثبوت نہیں ہے، یہ بات بھی غلط ہے اور خلاف واقعہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ چاروں مجاہدات بے اصل نہیں بلکہ بنیادی طور پر ان کا فی الجملہ شرعاً مطلوب ہونا ثابت ہے۔ تقلیل منام (نیند کی کمی) کا شرعاً مطلوب ہونا قیام اللیل اور تہجد کے فضائل سے سمجھ میں آتا ہے۔ تقلیل طعام کا فی الجملہ مطلوبِ شریعت ہونا بھی بعض احادیث سے ثابت ہے ان میں سے بعض سابقہ مضمون کے دوران نقل کی گئی ہے۔ تقلیل کلام کا

---

(۱) شریعت و طریقت ص ۲۵۳

شرعاً مطلوب ہونا بھی متعدد احادیث سے سمجھ میں آرہا ہے، ایسی کافی احادیث مشکوٰۃ کے باب "حفظ اللسان" میں آئیں گی۔ ایسے ہی اختلاط اور میل جول میں تقلیل کا مطلوب ہونا بھی نصوص سے ثابت ہے۔ مثلاً حضرت عقبہ بن عامرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ما النجاۃ؟ یعنی نجات کا طریقہ کیا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أملك عليك لسانك وليسعك بيتك وابك على خطيئتك۔(1)

ترجمہ ...... اپنی زبان کو قابو میں رکھو، تمہیں تمہارا گھر ہی کافی ہونا چاہئے اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔

اس حدیث کے دوسرے جملے **وليسعك بيتك** سے تقلیل اختلاط مع الانام کا مطلوب ہونا سمجھ میں آیا......... حاصل یہ کہ چاروں مجاہدات بنیادی اور اصولی طور پر نصوص سے ثابت ہیں اس لئے ان کو بے اصل اور بدعت کہنا درست نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صوفیاء کرامؒ ان مجاہدات کے جو قائل ہوئے ہیں وہ اس کو حکم شرعی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ایک ذریعے اور علاج کے طور پر اس کے قائل ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود تو اتباعِ شریعت ہے یعنی طاعات کو بجالانا اور معاصی و محرمات سے بچنا اور اس مقصود کو حاصل کرنے کیلئے ہوائے نفس (نفسانی خواہشات) کا مقابلہ کر کے ان کو دبانا پڑتا ہے اور صوفیاءؒ کا تجربہ یہ ہے کہ ان چار مباحات میں اعتدال کے ساتھ تقلیل کے بغیر ہوائے نفس کا مقابلہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ ان چاروں مباحات میں کمی کو مقصود اور شرعی مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ مقصود کا ذریعہ اور نفس کا معالجہ قرار دیتے ہیں اور معالجات کی بنیاد تجربے پر ہوتی ہے۔ تجربے سے کسی چیز کو مفید پایا تو اس کو اختیار کر لیا اور کسی چیز کو تجربے سے مضر پایا تو اس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ معالجات کا نصوص سے صراحۃً ثابت ہونا ضروری نہیں ہوتا جیسے طبیب کسی چیز کو کسی کے مزاج کے خلاف دیکھتا ہے اور اس کے علم میں وہ چیز اس کیلئے مضر ہوتی ہے تو طبیب اس کو منع کر دیتا ہے اور جو چیز تجربے کی بنیاد پر اس کی صحت کیلئے ناگزیر ہوتی ہے اس کو اس پر لازم کر دیتا ہے، اس کو بدعت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی دوا اور پرہیز کیلئے نصوص سے ثبوت کو مطالبہ کیا جاتا ہے، بالکل یہی حیثیت صوفیاءؒ کے ان مجاہدات کی ہے۔ جیسے اطباء جسم کی خاصیات اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کے ماہر ہوتے ہیں اسی طرح صوفیاءؒ ذرائع کی خاصیات اور ان کی ضروریاتِ و تقاضوں کے ماہر ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے تجربے سے مقصود تک پہنچنے کیلئے ان مجاہدات کو ضروری سمجھا تو معالجے اور ذریعے کے طور پر اس کے قائل ہو گئے جیسے اس کو مقصود سمجھنا اور حکم شرعی کا درجہ دینا غلط ہے ایسے ہی نصوص سے ان کا ثبوت مانگنا اور بدعت کہنا بھی حدود سے تجاوز ہے اور حقیقت حال سے ناواقفی کی بات ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ج ۲/ ص ۴۱۳

(۳)............ یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ تقلیل طعام وغیرہ اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود احکامِ شریعت پر عمل کرنا ہے، یہ چیزیں صرف علاج کے طور پر اختیار کی گئی ہیں اور علاج میں اختلافِ مزاج، اختلافِ اشخاص، اختلافِ حالات اور اختلافِ زمانہ کو بڑا دخل ہے۔ ایک چیز ایک مزاج کے لئے معالجے کا کام کرتی ہے دوسرے مزاج کے لئے وہی چیز مفید نہیں ہوتی۔ ایک علاج ایک شخص کے لئے مؤثر ہوتا ہے وہی علاج دوسرے کے لئے مؤثر نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی شخص کے لئے ایک چیز کسی حالت میں مفید ہوتی ہے اور کسی حالت میں مفید نہیں ہوتی۔ اس لئے ان مجاہدات کو اپنی رائے سے اپنانا اور ان پر عمل کرنا اندیشۂ نقصان سے خالی نہیں۔ جیسے جسمانی علاج میں طبیب کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ ہر شخص کے مزاج اور اس کے حالات کو دیکھ کر علاج کی صورت اور اس کی مقدار طے کرتا ہے ایسے ہی روحانی مجاہدات اور معالجات میں مشائخ سلوک (جو کہ اطباء ایمانی ہیں) کی رائے اور مشورہ بہت ضروری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجاہدات کس کے لئے مفید ہیں اور کس کے لئے نہیں اور جس کے لئے مفید ہیں تو کتنی مقدار تک مفید ہیں۔ آج کل کے مشائخ کی رائے یہ ہے کہ کھانے اور نیند میں اعتدال تو بہر حال ضروری ہے لیکن اتنی کمی کرنا کہ اعتدال اور قدرِ ضرورت سے بھی کم ہو مناسب نہیں۔ آج کل کی صحتیں اور طبائع اس کے متحمل نہیں۔ صحت کی حفاظت بھی شرعی فریضہ ہے البتہ کلام اور غیر ضروری اختلاط اور میل جول میں تقلیل اور احتیاط کی اب بھی ضرورت ہے لیکن اس میں بھی اتنی کمی نہیں ہونی چاہئے کہ طبیعت میں انقباض اور گھٹن پیدا ہونے لگے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض متقدمین نے تقلیل طعام کے سلسلے میں کھانے کی مقدار بہت کم لکھی ہے، مثلاً امام غزالیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یادرکھو کہ (کھانے کی) مقدار کے تین درجے ہیں، اعلیٰ درجہ صدیقین کا ہے یعنی بس اتنا کھائے کہ جس سے کمی کرنے میں زندگی جاتی رہے یا عقل میں فتور آجائے .... متوسط درجہ یہ ہے کہ روزانہ نصف مد یعنی دو تہائی اطل پر اکتفا کیا کرو............ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ روزانہ ایک مد کی مقدار کھائے۔" (۱)

ایک مد کی مقدار تقریباً تین پاؤ بنتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ روزانہ تین پاؤ کھانے کی گنجائش ہے اور درمیانہ مرتبہ یہ ہے کہ روزانہ ڈیڑھ پاؤ کھائے۔ .... اس جیسی باتیں جو سلف سے منقول ہیں یہ بھی شرعی مسائل نہیں بلکہ معالجات ہیں جو انہوں نے اپنے زمانے کی طبائع کو مد نظر رکھتے ہوئے تجویز فرمائے ہیں جن میں حالات اور طبائع کے بدلنے سے تغیر ہو سکتا ہے۔ اصول اور مقاصد میں تو تغیر نہیں ہو سکتا البتہ ذرائع اور وسائل زمانے اور حالات کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں اس لئے کھانے کی مقداروں کے

---

(۱) تبلیغ دین ص ۸۱

سلسلے میں متقد مین کی اتباع اور تقلید ضروری نہیں، اس سلسلے میں اپنے زمانے کے مشائخ اور اطباء کی رائے زیادہ اہم ہے۔

اب تک ہم نے جو کچھ طعام اور تقلیل طعام کے بارے میں لکھا ہے امید ہے کہ اس موضوع پر اکابر کے معتدل اور متوازن مسلک اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کے خاتمہ پر رأس الصوفیاء خاتم المحدثین حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ کی ایک بصیرت افروز عبارت پیش کردی جائے تاکہ حسنِ اختتام کے علاوہ موضوع پر بصیرت میں اضافہ کا باعث ہو۔

چنانچہ ملا علی قاری رحمہ اللہ شمائل ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں:

ومن جهلة الصوفية من يقلل الطعام وأكل الدسم حتى ييبس بدنـه ويعذب نفسه بلبس الصوف ويمتنع من الماء البارد وما هذا طريقة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا طريقة صحابتهم وأتباعهم وإنما كانوا يجوعون إذا لم يجدوا شيئًا فإذا وجدوا أكلوا وقد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأكل اللحم ويحبه ويأكل الدجاج ويحب الحلواء وكان رجل يقول: لا أكل الخبيص لأني لا أقوم بشكره؟ فقال الحسن البصري: هذا رجل أحمق۔ وهل يقوم بشكر الماء البارد؟ وقد كان سفيان الثوري إذا سافر حمل معه في سفرته الشوى والفالوذج۔

ترجمہ ...... بعض جاہل صوفی کھانا کم کھاتے ہیں اور چکنائی بہت کم استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کا بدن خشک ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اون کے موٹے کپڑے پہنا کر تکلیف میں ڈالتے ہیں اور ٹھنڈے پانی سے باز رہتے ہیں حالانکہ یہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین کا طریقہ نہیں۔ وہ حضرات بھوکے اس وقت رہتے تھے جب کہ ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ جب کوئی چیز ملتی تھی تو اس کو کھاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ گوشت کھاتے تھے اور اسے پسند فرماتے تھے، مرغ بھی کھاتے تھے اور میٹھی چیز پسند فرماتے تھے۔

ایک آدمی کہا کرتا تھا کہ میں حلوا اس لئے نہیں کھاتا ہوں کہ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا: یہ احمق ہے، کیا یہ شخص ٹھنڈے پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے اور سفیان ثوری رحمہ اللہ سفر میں اپنے ساتھ بھنا ہوا گوشت اور فالودہ لے جایا کرتے تھے۔

(۳) دن میں ایک مرتبہ سے زیادہ کھانا حدیث کی نظر میں:-

شریعت میں کھانے کی مقدار اور اوقات کی تعیین نہیں کی اس لئے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف ہوتی ہے۔ مقدار یا اوقات کی تعیین کی صورت میں بعض لوگوں کو تنگی پیش آنے کا واضح اندیشہ تھا اس لئے

مقدار اور اوقات کی تعیین کی بجائے اصولی تعلیم ارشاد فرمائی گئی ہے تاکہ ہر شخص اپنے مزاج اور حالات کے مطابق ان اصولوں کو اپنے اوپر منطبق کر کے عمل کر سکے۔ شریعت نے جو اصولی تعلیم دی ہے اس کی تفصیل تو پہلے عرض کی جا چکی ہے، اس کا حاصل درجِ ذیل امور ہیں:

(۱)...... کھانے میں اعتدال ہونا چاہئے، نہ اتنی کمی کی جائے کہ صحت خراب ہو نہ اتنی کثرت کی جائے کہ ہضم خراب ہو اور طبیعت بوجھل رہنے لگے۔

(۲)...... کھانے میں اتنی کمی کرنا جس سے جان جانے کا یا صحت کمزور ہونے کا خطرہ ہو جائز نہیں۔

(۳)...... کھانے میں اتنی کمی کرنا بھی جائز نہیں جس سے اگرچہ فوری طور پر صحت خراب نہ ہوتی ہو اور ضعف بھی نہ ہوتا ہو مگر کچھ عرصے بعد رفتہ رفتہ اس کمی کا اثر ظاہر ہو کر ضعف کا اندیشہ ہو، اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

تعشّوا ولو بكفٍّ من حشف فإن ترك العشاء مهرمة۔ (رواه الترمذی ۲: ۷ وقال هذا حديث منكر الخ۔)

ترجمہ ...... رات کا کھانا کھا لیا کرو اگرچہ پرانی کھجور کی ایک مٹھی ہی کھاؤ اس لئے رات کا کھانا نہ کھانے سے بڑھاپا آتا ہے۔

اس حدیث میں رات کا کھانا کھانے کی اس لئے تاکید نہیں کی جارہی کہ نہ کھانے سے فوری طور پر ضعف ہوتا ہے بلکہ اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ اگرچہ رات کا کھانا نہ کھانے سے فوری طور پر ضعف محسوس نہ ہو لیکن دیر کے بعد اس ضرر کا احتمال ہے کہ بڑھاپا جلدی آجائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے میں ایسی کمی بھی نہیں کرنی چاہئے جس سے مستقبل میں بھی کبھی ضرر اور ضعف ہو سکتا ہو۔

(۴)...... کھانے میں اتنی کمی بھی مناسب نہیں جس سے اگرچہ ضعف نہ ہو لیکن طبیعت الجھنے اور دلجمعی کے جاتے رہنے کا اندیشہ ہو۔ ان اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے ہر انسان اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق کھانے کی مقدار اور اوقات طے کر سکتا ہے۔ اگر کسی کو ایک بار کھانے کی ضرورت ہو وہ ایک بار کھائے، وہ اگر اس سے زیادہ کھائے گا تو یہ اسراف ہوگا، جس کو دو بار یا تین بار کی ضرورت ہے وہ دو یا تین بار کھا سکتا ہے اس کا ایک مرتبہ سے زیادہ کھانا اسراف اور فضول خرچی نہیں بلکہ ضرورت کے دائرے میں داخل ہے۔

اس تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ کھانے کے لئے دن رات میں ایک بار کی تحدید نہیں ہے بلکہ ضرورت اور مصلحت پر مدار ہے۔ ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر ایک بار سے زیادہ کھانے میں بھی کوئی مضائقہ اور کراہت نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے صراحۃً ایک بار سے زیادہ کھانا ثابت ہے۔

قولی دلیل یہ ہے کہ احادیث میں رمضان المبارک میں سحری اور افطاری دونوں کی ترغیب ہے حالانکہ دونوں ایک ہی رات دن میں ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ رات دن میں ایک بار سے زیادہ کھانے کی صرف اجازت نہیں بلکہ کبھی فضیلت بھی ہوتی ہے۔

فعلی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ما أكل آل محمد صلى الله عليه وسلم أكلتين في يوم إلا أحدهما تمر۔

(بخاری ۲ : ۹۵۶، کتاب الرقاق باب کیف کان ????? النبی صلی الله علیه وسلم)

ترجمہ ...... محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے جب بھی دو مرتبہ کھانا کھایا تو ایک مرتبہ کھجور ہوا کرتی تھی۔

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں دو مرتبہ کھانے کا معمول تھا مگر دونوں مرتبہ روٹی وغیرہ نہیں ہوتی تھی، ایک مرتبہ روٹی وغیرہ اور ایک مرتبہ کھجور ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً اور عملاً ایک رات دن میں ایک دفعہ سے زیادہ بار کھانا کھانے کا بلا کراہت جواز ثابت ہو گیا اور اصول کا تقاضا بھی یہی ہے جو کہ ابھی لکھا گیا ہے، مگر دو حدیثوں سے شبہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن میں دو مرتبہ کھانا جائز نہیں یا کم از کم مکروہ اور ناپسندیدہ ضرور ہے۔ یہاں دراصل یہ بحث ان دو حدیثوں پر گفتگو کرنے کے لئے چھیڑ لی گئی ہے، یہاں ان دونوں حدیثوں پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے۔

(۱)...... **كان إذا تغدّى لم يتعشّ وإذا تعشّى لم يتغدّ۔** یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دن کا کھانا تناول فرمالیتے تو رات کا کھانا تناول نہیں فرماتے تھے اور جب رات کا کھانا تناول فرمالیتے تو دن کا کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دن میں دو بار کھانا آپ کا معمول نہیں تھا، اس سے بظاہر ثابت ہو رہا ہے کہ دو مرتبہ کھانا کم از کم ناپسندیدہ اور مکروہ بات ضرور ہے جب کہ بات ایسے نہیں اس لئے کہ دن میں ایک بار سے زیادہ مرتبہ کھانے کا جواز ابھی ثابت کیا جا چکا ہے۔ ہم پہلے اس حدیث کی اسنادی حیثیت اور تخریج پر گفتگو کریں گے، پھر اس کا معنی اور توجیہ ذکر کریں گے۔

اس حدیث کو امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''الجامع الصغیر'' (۱) میں ذکر کیا ہے اور محشی نے ابو نعیم کی ''حلیۃ الاولیاء'' کا حوالہ دے کر صحیح کی علامت لگائی ہے مگر دوسرے بعض علماء اس سے متفق نہیں، وہ اس کو ضعیف قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ عزیزی الجامع الصغیر کی شرح میں لکھتے ہیں: **حل (أي حلية الأولياء لأبي نعيم) عن أبي سعيد بإسناد ضعيف۔** (۲) البانی لکھتے ہیں: **ضعيف۔ رواه ابن بشران في ((الأمالي)) ۱/۷۳**

---

(۱) ج ۲/ص ۳۲۴...... (۲) السراج المنیر ج ۴/ص ۵۵

وابن عساكر في آخرہ جزء أخبار حفظ القرآن ۔ (ق۸/۲) وكذا في التاريخ ۱/٦٥/۱۱ عن سليمان بن عبد الرحمٰن ثنا أيوب بن حسان الجرشي ثنا الوضين بن عطاء عن عطاء ابن أبي باح قال: دعى أبو سعيد الخدري إلى وليمة فرأىٰ صغرة وخضرة فقال: أما تعلمون أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان .... (الحديث)

وقلت وهٰذا أسناد ضعيف ورجاله ثقات لكنّ الوضين بن عطاء سيئ الحفظ فهو لهٰذا ضعيف ثم إنه مرسل كما هو الظاهر لأن عطاء لم يوصله عن أبي سعيد بمثل قوله: عن إبي سعيد و نحوهٗ۔

تـنـبـيـه ...... هٰذا الحديث مما خفي مخرجه على الحافظ العراقي ثم التاج السبكي فذكرا أنه من الأحاديث اللتي او ردها الغزالي في الإحياء ولا أصل لها وعزاه السيوطي في الجامع لأبي نعيم في الحلية ولم أجده في فهرسة "البغية" ۔ (سلسلة الأحاديث الضعيفة ج۱/ص۲۷٦ حديث رقم ۲۵۰)

البانی نے حلیۃ الاولیاء میں اس حدیث کے ہونے کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا ہے مگر سید مرتضٰی زبیدی رحمہ اللہ نے اتحاف میں لکھا ہے کہ ابو نعیم کے حلیۃ الاولیاء میں یہ حدیث حضرت عطاء بن ابی رباح کے ترجمہ میں ذکر کی گئی ہے، اس کے بعد زبیدی رحمہ اللہ نے ابو نعیم کی سند بھی ذکر کی ہے۔ چنانچہ علامہ عراقی رحمہ اللہ کی یہ بات لم أجد لهٗ أصلاً في المرفوع نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

قلت: بل أخرجه أبو نعيم في الحلية في ترجمة عطاء بن ابي رباح حدثنا محمد بن عمر بن مسلم وأحمد بن السندي قالا حدثنا جعفر بن محمد الفريابي حدثنا سليمان بن عبد الرحمٰن الدمشقي حدثنا أيوب بن حبّان حدثنا الوضين بن عطاء عن عطاء بن أبي رباح قال: دعى أبو سعيد الخدري الخ۔[1]

اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں، وضین کے علاوہ باقی رجال ثقات ہیں۔ جنہوں نے ضعیف کہا ہے وضین کی وجہ سے کہا ہے اور وضین مختلف فیہ ہے توثیق بھی کی گئی ہے اور تضعیف بھی۔[2] لہٰذا حدیث بالکل ساقط نہیں ضعف قابل گوارا ہے۔

حدیث کا معنی ...... علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كان إذا تغدّى لم يتعش وإذا تعشّى لم يتغدّ ۔ اجتنابًا للشبع وإيثارًا للجوع تنزهًا

(۱) اتحاف شرح احیاء ج۷/ص۴۰۹ ...... (۲) دیکھئے: میزان الاعتدال ج۴/ص۳۳۴ اور تہذیب التہذیب ج۱۱/ص۱۲

عن الدنيا وتقويًا على العبادة وتقديمًا للمحتاجين على نفسه۔[1]

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مرتبہ کھانے کا جو معمول حدیث میں مذکور ہے اس کے کئی مقاصد ہیں: (۱) کثرت اکل سے بچنا۔ (۲) فاقہ اختیار کرنا۔ (۳) دنیا سے بے رغبتی۔ (۴) عبادت کی رغبت بڑھانا۔ (۵) دوسرے محتاجوں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہوئے خود کم کھانا اور دوسروں کو کھلا دینا۔

علامہ عزیزی لکھتے ہیں: **أي كل في يوم مرتين تنزها عن الدنيا وتقويًا على العبادة وتقديمًا للمحتاج على نفسه ففي قلة الأكل فوائد، منها: رقة القلب وقوة الفهم والإدراك وصحة البدن ودفع الأعراض فإن سببها كثرة الأكل۔ ومنها: خفة المؤنة فإن من تعوّد قلة الأكل كفاه من المال قدر يسير۔ ومنها: التمكن من التصدق بما فضل من الأطعمة على الفقراء والمساكين وليس للعبد من ماله إلّا ما تصدق فأبقى أو أكل فأفنى۔**[2]

یعنی آپ ﷺ دنیا سے بے رغبتی اور عبادت کی قوت اور محتاجوں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کے لئے دن میں ایک بار کھانے پر اکتفاء فرماتے تھے۔ کم کھانے میں کئی فوائد ہیں، ایک یہ ہے کہ دل نرم اور فہم وادراک طاقتور ہوتا ہے۔ بدن تندرست رہتا ہے اور بیماریاں جاتی رہتی ہیں اس لئے بیماریوں کا سبب زیادہ کھانا ہے، اور ایک فائدہ یہ ہے کہ خرچ مشقت کم ہوتے ہیں اس لئے کہ جو کم کھانے کا عادی ہوگا اس کو تھوڑا مال بھی کافی ہو جاتا ہے اور یک فائدہ یہ ہے کہ جو کھانے سے بچ رہتا ہے اسے فقراء اور مساکین پر صدقہ کا موقع ملتا رہتا ہے اور انسان اپنے مال سے یہی فائدہ اٹھاتا ہے کہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے ذخیرہ کر لے یا کھا کر فنا کر دے۔

حدیث کی توجیہ ...... اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ دن میں ایک بار سے زیادہ کھانا ناجائز یا خلافِ سنت ہے اس لئے کہ اس کا جائز اور مسنون ہونا پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔ اس حدیث کی کئی توجیہات ہو سکتی ہیں:

(۱) .... اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کھانا ہوتے ہوئے بھی ایک وقت کا کھانا تناول فرما کر دوسرے وقت کا کھانا قصداً ترک فرما دیتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تنگی اور فقر کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بار کا کھانا عموماً میسر نہیں ہوتا تھا۔ (پھر آپ کا فقر اگرچہ اختیاری تھا کہ فقراء اور محتاجوں پر خرچ کرنے کی وجہ سے آپ کے پاس کچھ باقی نہ بچتا تھا۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بار کھانا تناول فرمانے پر اکتفا فرمانا ایسا ہی ہے جیسے دوسری احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی تین دن تک مسلسل گندم جو کی روٹی سیر ہو کر تناول نہیں فرمائی۔[3]

---

(۱) فیض القدیر ج ۵ / ص ۱۱۲...... (۲) السراج المنیر شرح الجامع الصغیر ج ۴ / ص ۵۶...... (۳) صحیح مسلم ج ۲ / ص ۴۰۹

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ہم کبھی تین چاند دیکھ لیتے تھے مگر اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آگ جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی صرف پانی اور کھجور پر اکتفا کیا جاتا تھا۔[۱]

کیا ان احادیث کی بنا پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلسل تین دن گندم یا جو کی روٹی سیر ہو کر کھانا خلافِ سنت ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ازاجِ مطہرات کی سخاوت اور صدقہ و خیرات کی کثرت کی وجہ سے گھر میں کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہونے کی وجہ سے فاقے کی نوبت آتی تھی، یہی بات اس حدیث کے بارے میں کہنی چاہئے۔

حدیث کی یہ توجیہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے بوادر النوادر صفحہ ۴۱۸ میں اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، یہاں اس کی قدرے تفصیل عرض کر دی گئی ہے۔

(۲)............احقر ناچیز کے خیال میں ایک بات یہ بھی آتی ہے کہ عرف میں عموماً غداء (دن کا کھانا) اور عشاء (رات کا کھانا) سے مراد وہ کھانا ہوتا ہے جو روٹی وغیرہ عادی غذا پر مشتمل ہو۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ کھانا جو روٹی وغیرہ پر مشتمل ہو دن میں ایک بار تناول فرماتے تھے دوسری بار کھجور جو کہ عرب کی اہم غذا تھی تناول فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے صحیح بخاری کی حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کھانے کے دو وقتوں میں سے ایک وقت کھجور ہوا کرتی تھی۔ اگر حدیث کی یہ تشریح کی جائے تو اس حدیث کا مضمون وہی ہوگا جو دوسری صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے:

لقد مات رسول اللہ ﷺ وما شبع من خبز وزیت فی یوم واحد مرتین۔[۲]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال اس حالت میں ہوا کہ آپ نے ایک دن دو مرتبہ روٹی اور زیتون کا تیل پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

جامع ترمذی میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

واللہ ما شبع من خبز ولحم مرتین فی یوم۔[۳]

خدا کی قسم آپ نے دن میں دو مرتبہ روٹی اور گوشت پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ روٹی وغیرہ پر مشتمل کھانا ایک بار ہی تناول فرماتے تھے۔

(۳)............اصل بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے ایسی جسمانی اور روحانی قوت عطا فرمائی تھی جو امت کو عطا نہیں فرمائی گئی، اس لئے کھانے پینے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) صحیح مسلم ج ۲/ص ۴۱۰)......(۲) صحیح مسلم ج ۲/ص ۴۱۰......(۳) جامع ترمذی ج ۲/ص ۵۸، کتاب الزاہد

مجاہدات کی مکمل اتباع کرنا امت کے بس کی بات نہیں، حدیث میں اس کی نظیر موجود ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرات صحابہ کرامؓ کو وصال سے منع فرمایا تو صحابہ نے یہ سوال کیا: **إنك تواصل**۔ آپ بھی تو وصال فرماتے ہیں۔ اس کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إنّی لست مثکلم، إنی أطعم و أسقی**۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں مجھے کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جمہور علماء سے اس کی شرح یہ نقل فرمائی ہے کہ مجھے ایسی وقت عطاء ہے کہ بغیر کھانے پینے کے مجھے کھانے پینے والوں کی طرح طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ کھانے پینے کی کمی کی وجہ سے میری قوت میں کمی نہیں آتی اور نہ ہی مجھے اکتاہٹ ہوتی ہے۔(۲)

اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ کھانے پینے کے معاملات میں امت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جب صحابہ جیسے اقویاء اور اولوالعزم حضرات کو قیاس کی اجازت نہیں دی گئی تو اور کسی کو کیسے اجازت ہو سکتی ہے؟

الأکل فی الیوم مرتین من الإسراف ...... دوسری حدیث جس سے دن میں دو بار کھانے سے ممانعت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے: **الأکل فی الیوم مرتین من الإسراف**۔ یعنی دن میں دو بار کھانا اسراف ہے، یہ حدیث کنز العمال میں دیلمی کے حوالہ سے اس طرح نقل کی گئی ہے:

عن عائشة قالت: رأنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وقد أکلت فی یوم مرتین فقال: یا عائشة! أما تجین أن یکون لك شغل إلّا فی جوفك، الأکل فی الیوم مرتین من الإسراف، واللہ لا یحب المسرفین۔(۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن میں دو بار کھاتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ پیٹ کے علاوہ اور کوئی مصروفیت نہیں چاہتی؟ دن میں دو بار کھانا اسراف ہے اور حق تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اس حدیث کو امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی احیاء العلوم میں نقل کیا ہے۔ سید مرتضیٰ زبیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **قال العراقی: رواہ البیهقی فی الشعب من حدیث عائشة وقال فی إسنادہ ضعف**۔(۴)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح اس طرح فرمائی ہے:

أما الثانی أی دلالة الحدیث علی الکراهة فیظهر حاله بالتأمل فی ألفاظ الحدیث فإنه معلول

---

(۱) صحیح بخاری ج۱/ ص ۲۶۳ ...... (۲) فتح الباری ج۴/ ص ۲۰۷ ...... (۳) کنز العمال ج۱۵/ ص ۴۳۳

(۴) اتحاف ج۷/ ص ۴۱۰ نیز دیکھئے: بیہقی، شعب الایمان ج۵/ ص ۲۶

بكونه إسرافًا والإسراف لا يجتمع مع الحاجة والإباحة فيحمل الحديث ما إذا أكل مرة ثانية من غير جوع كما هو عادة المترفين الخادمين للبطن يأكلون أداءً لحق الوقت كأن الوقت سبب لوجوب الأكل كما هو سبب لوجوب الصلوٰة وأما من أكل للحاجة فلا شناعة فيه أصلًا حتّى أن من احتاج إلى أكثر من مرتين لعارض للمرض أو النقاهة لا حرج في اكثر من مرتين ايضًا۔[1]

''رہا امر ثانی یعنی حدیث کی دلالت (ایک بار سے زیادہ کھانے کی) کراہت پر سو اس کا حال خود حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی علت اسراف فرمائی گئی ہے اور اسراف حاجت اور اباحت کے ساتھ جمع نہیں ہوتا۔ پس حدیث اس صورت پر محمول ہو گی جبکہ دوسری بار بدوں بھوک کے کھائے جیسا اہل تنعم خادمانِ شکم کی عادت ہے کہ محض ادائے حق وقت کے لئے کھاتے ہیں گویا وقت سبب ہے وجوب اکل کا جیسا وقت سبب ہے وجوب صلوٰۃ کا۔ باقی جو شخص حاجت کے سبب کھاوے اس میں کچھ بھی شناعت نہیں حتیٰ کہ اگر کسی شخص کو دو بار سے زیادہ کھانے کی حاجت ہو کسی مرض یا نقاہت کے سبب اس کے لئے دو بار سے زیادہ کھانے میں بھی حرج نہیں۔''

لذیذ کھانوں کا حکم:-

بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ و آثار سلف سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کا بڑا مقصد اگرچہ جسم کی غذائی ضرورتوں کو پورا کر کے توانائی کا حصول اور صحت و زندگی کا بقاء ہے لیکن اس مقصد کے ساتھ ساتھ لذت کو بھی پیش نظر رکھنا شرعاً کوئی ناپسندیدہ بات نہیں بلکہ ایک حد تک شرعاً مطلوب ہے۔ کھانے میں طلبِ لذت کی صحیح شرعی حیثیت واضح کرنے کے لئے پہلے یہاں وہ آیات و احادیث پیش کی جاتی ہیں جن سے اس کا جائز یا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد وہ روایات نقل کی جائیں گی جن سے بظاہر اس کا غیر مطلوب ہونا بلکہ مذموم ہونا معلوم ہوتا ہے، پھر دونوں قسم کے دلائل کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے اکابر امت کے اقوال کی روشنی میں معتدل نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

لذیذ کھانوں کے جواز یا مطلوبیت کے دلائل:-

آیات......

(۱)...... يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

(۱) بوادر النوادر ص ۱۷۴۱ تا ۱۷۴۲ نادرہ نمبر ۳۷......

الشَّيْطٰنِ ۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔[1]

ترجمہ ...... اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور طیب چیزیں کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

اس آیت میں طیبا کی ایک تفسیر لذیذ چیزوں کے ساتھ بھی کی گئی ہے۔ یہ تفسیر کرنے والے حضرات اس کا قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر طیبا کا معنی بھی "حلال" ہی کیا جائے تو حلالا اور طیبا کا معنی ایک ہی ہو گا حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو لفظ اکٹھے استعمال ہوں تو دونوں کا الگ الگ معنی مراد لینا ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

(۲)...... وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۔[2]

ترجمہ ...... اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو چیزیں دی ہیں ان میں سے حلال اور مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں بھی طیبا سے مراد مرغوب چیزیں ہیں۔ آیت نمبر (۱) میں ذکر کردہ قرینہ کے علاوہ یہاں دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ اس سے پچھلی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ .... الخ ۔ میں طیبات سے مراد لذیذ چیزیں ہی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابن بطال سے نقل کرتے ہیں کہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے لذیذ کھانوں اور دوسری مباح لذات کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔[3]

مشہور حنفی فقیہ ابو بکر جصاص رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس آیت میں ان لوگوں کے قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے جو زہد کے طور پر گوشت اور لذیذ کھانوں سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے حرام کر لینے سے منع فرمایا اور ان کے حلال ہونے کی خبر دی ہے، یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرنے میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔[4]

(۳)...... فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔[5]

ترجمہ ...... پس تم کھاؤ وہ حلال اور طیب چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۱۶۸ ...... (۲) سورۃ المائدۃ: ۸۸ ...... (۳) فتح الباری ج ۹ / ص ۵۱۹ ...... (۴) احکام القرآن للجصاص ج ۲ / ص ۴۵۲ وفی الآیۃ دلالۃ علی بطلان قول الممتنعین عن اکل اللحوم والاطعمۃ اللذیذۃ تزهدا لان اللہ تعالیٰ قد نهی عن تحریمها واخبر باباحتها فی قوله: "كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا" ویدل عن انه لا فضیلة فی الامتناع من اکلها ۔ ...... (۵) سورۃ النحل: ۱۱۴

(۴)......قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔(۱)

ترجمہ ...... آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی (بنائی ہوئی) زینت کو اور رزق میں سے اچھی اچھی چیزوں کو۔

مذکورہ بالا آیت میں "طیبا" یا "طیبات" کا لفظ استعمال ہوا ہے، عربی زبان اور محاورے کے اعتبار سے اس کا معنی حلال بھی آتا ہے اور لذیذ بھی، چنانچہ ذیل کی آیت میں دوسرا معنی ہی مراد ہے:

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۔(۲)

ترجمہ ...... کفار سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ) تم اپنی لذتیں اپنی دنیوی زندگی ہی میں ختم کر چکے اور ان سے فائدہ حاصل کر چکے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت نمبر (۴) کی تشریح کرتے ہوئے امام قرطبی رحمہ اللہ نے "طیبات" کا عام معنی مراد لیا ہے جو حلال اور لذیذ دونوں کو شامل ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

الطيبات اسم عام لما طاب كسبا وطعما ۔(۳)

ترجمہ ...... طیبات کا لفظ شامل ہے ان چیزوں کو جو کمائی اور ذائقے کے اعتبار سے اچھی ہوں۔

(۵)......وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۔(۴)

ترجمہ ...... تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں! اگر وہ خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں سے کوئی چیز تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوش گوار سمجھ کر۔

یہاں بیویوں کی طرف سے بطیب خاطر معاف کردہ مہر استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہوئے هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا کا لفظ بڑھایا ہے جس کا ترجمہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے "مزہ دار خوشگوار" کیا ہے، یہی لفظ قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر اہل جنت کے کھانوں کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں، یہاں یہ لفظ بڑھانے سے اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت سے لذت اور مزا حاصل کرنا کوئی بری بات نہیں بلکہ ایک درجے میں مطلوب ہے۔

احادیث نبوی:-

(۱)............ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو

(۱) سورۃ الاعراف: ۳۲......(۲) سورۃ الاحقاف: ۲۰......(۳) تفسیر قرطبی ج ۷/ ص ۱۹۸......(۴) سورۃ النساء: ۴

بکری کی دستی کا گوشت پسند تھا اور آپ کو زہر بھی دستی ہی میں دیا گیا تھا۔[1]

(۲)......... حضرت ابو عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کی اور گوشت پکایا، چونکہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دستی کا گوشت پسند تھا اس لئے حضرت ابو عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دستی آپ کی خدمت میں پیش کی، اسے تناول فرما کر ارشاد فرمایا کہ ''دستی پکڑاؤ'' میں نے دوسری دستی بھی پیش کی، اسے تناول فرما کر ارشاد فرمایا کہ ''دستی دو'' میں نے عرض کیا کہ بکری کی کتنی دستیاں ہوتی ہیں، یعنی دو سے زیادہ تو بکری کی دستیاں نہیں ہوتیں، آپ نے فرمایا کہ اگر تم خاموش رہتے تو جب تک میں مانگتا رہتا تم دستیاں پیش کرتے رہتے۔[2]

(۳)......... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس ایک دفعہ گوشت لایا گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دستی پکڑائی گئی اور دستی آپ کو پسند تھی چنانچہ آپ نے اسے دانتوں سے توڑ کر تناول فرمایا۔[3]

(۴)......... ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاں کسی سلسلے میں تشریف لائے، دوپہر کا آرام آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاں ہی فرمایا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ کے آرام کے دوران جلدی سے گھر میں پلا ہوا بکری کا ایک بچہ ذبح کر کے پکوایا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیدار ہو کر وضو سے فارغ ہوں تو فوراً آپ کے سامنے تیار کھانا موجود ہو۔ اس مقصد کے لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود بھی اپنے خادم کے ساتھ کام میں لگ گئے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیدار ہوئے تو وضو کے لئے پانی منگوایا، وضو سے فارغ ہوتے ہی بھنا ہوا تیار بکرا آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے میری طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: **كانك قد علمت حبنا للحم ادع لی ابا**

---

(۱) شمائل ترمذی ص ۱۲، مسند احمد ج ۲/ص ۵۴ رقم ۳۷۷۷، شعب الایمان للبیہقی ج ۵/ص ۹۱، دستی کی پسندیدگی کی وجہ حدیث نمبر کی تشریح کے ضمن میں بیان کی جائے گی۔

(۲) شمائل ترمذی ص ۱۲ ۔ وقال الشيخ الكاندهلوی فی الاوجز ج ۱۴/ص ۳۷۸ : وروی احمد نحو هذه القصة عن ابی رافع وقال القاری: والظاهر ان القصة متعددة وقال الشيخ الكاندهلوی: وأخذ منه الصوفية الصافية ان الاعتراض علی الشيخ يحرم البركة۔

(۳) رواہ الترمذی وابن ماجہ (مشکوۃ ص ۳۶۶)

بکو۔ ”گویا تمہیں معلوم تھا کہ ہمیں گوشت پسند ہے، ابو بکر کو بھی بلا لاؤ۔“ (۱)

(۵)........ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے والد نے خزیرہ (مختلف چیزوں سے تیار شدہ حلوہ سا) تیار کرنے کا حکم دیا، جب وہ تیار ہو چکا تو مجھے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے بھیجا، حضور اقدس ﷺ نے مجھے دیکھ کر پوچھا: کیا گوشت لائے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں بلکہ خزیرہ ہے، اپنے والد کو جا کر میں نے یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا کہ شاید حضور اقدس ﷺ گوشت تناول فرمانا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے گھر کی ایک پالتو بکری ذبح کی اور اسے بھون کر مجھے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے بھیجا، میں نے یہ بھونی ہوئی بکری حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کی اور پورا ماجرا سنایا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انصار کو جزائے خیر عطا فرمائے بالخصوص عبد اللہ بن عمرو بن حرام (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد) اور سعد بن عبادہ کو۔ (۲)

(۶)........ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک باندی تھیں جنہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خرید کر آزاد فرمایا تھا، ان کے واقعات زندگی سے فقہاء نے بہت سے مسائل نکالے ہیں، انہی میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور کھانا طلب فرمایا، اس وقت گھر کے اندر ہنڈیا میں گوشت پک رہا تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گھر میں پہلے سے موجود کوئی عام سا سالن پیش کر دیا گیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الم ار برمة فيها لحم؟** ”کیا میں نے ہنڈیا میں گوشت پکتا ہوا نہیں دیکھا؟“ گھر والوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ ایسا گوشت ہے جو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو کسی نے صدقے میں دیا ہے (اور آپ صدقہ کی چیز تناول نہیں فرماتے) تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بریرہ کے لئے تو یہ صدقہ ہے لیکن وہ ایک دفعہ اس کی مالک بن جانے کے بعد مجھے بطور ہدیہ دے دے گی تو میرے لئے تو صدقہ نہیں رہے گا بلکہ میرے لئے تو ہدیہ بن جائے گا۔ (۳)

---

(۱) رواه احمد فی مسنده ج٥/ص٢١٦ رقم١٥٢٨١ فی قصة استشهاد ولد جابر ومجئی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی قضاء دیونه ورواه البیهقی فی شعب الایمان ج٥/ص٩١ رقم الحدیث ٥٨٩٦ مختصراً وروی احضر منه الترمذی فی الشمائل ص١٢ ورواه مفصلاً الحاکم فی المستدرك ج٤/ص١١١ وقال: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه وقال الذهبی: صحیح۔

(۲) شعب الایمان ج٥/ص٩٠ رقم الحدیث٥٨٩٥ ورواه الحاکم فی المستدرك ج ٤/ص ١١٢ وقال: صحیح الاسناد ولم یخرجاه وقال الذهبی: صحیح۔

(۳) رواہ البخاری، مشکوٰۃ ص١٦١

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام سالن کی بجائے گوشت طلب فرمایا، اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ امام طبری رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں:

دلت القصة علی ایثارہ علیه الصلاة والسلام اللحم اذا وجد الیه السبیل۔

ترجمہ ...... یہ قصہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اگر ممکن ہوتا گوشت کو ترجیح دیتے تھے۔(۱)

(۷)......... مشکوٰۃ ہی کے کتاب الاطعمہ میں حدیث نمبر ۱۹ آرہی ہے جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسا کھانا پیش کیا گیا جس میں لوکی بھی تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم برتن میں سے لوکی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تناول فرما رہے تھے، بعض صحیح روایات میں اس کی وجہ صراحتاً ذکر فرمائی گئی ہے کہ آپ کو لوکی پسند تھا۔(۲) چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت سے مجھے لوکی ہمیشہ پسند رہا۔

(۸)......... کھانے کا اصل ادب تو یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھایا جائے لیکن اگر برتن میں مختلف انوع کے کھانے ہوں تو اپنی پسند کی چیز کھانے کے لئے اس ادب کی رعایت ختم ہو جاتی ہے جس کی ایک دلیل تو اوپر لوکی پسند کرنے والی حدیث ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے، اس کے علاوہ حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں اس کی تصریح بھی ہے جو آگے کتاب الاطعمہ ہی کے نمبر ۷۰ پر آرہی ہے، اس سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کھانے کا مقصد محض بھوک مٹانے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس میں پسند ناپسند کی اپنی ایک اہمیت ہے، اسی کی خاطر شریعت نے سامنے سے کھانے کا حکم ختم کر دیا ہے۔

(۹)......... کتاب الاطعمہ ہی میں نمبر ۲۱ پر حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے، حلوہ سے کیا مراد ہے، اس کی تفصیل تو حدیث کی تشریح کے وقت آجائے گی، اس وقت یہ ثابت کرنا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے پینے میں بعض چیزیں نسبتاً زیادہ پسند تھیں، چنانچہ اسی حدیث کی تشریح کے ضمن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ودخل فی معنی ھذا الحدیث کل ما یشابه الحلوی والعسل من انواع المآکل اللذیذة۔

ترجمہ ...... اسی حدیث کے مضمون میں کھانے کی ساری لذیذ چیزیں جو حلوی اور شہد کے مشابہ ہیں داخل ہیں۔(۳)

اس حدیث پر ابن حبان رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کیا ہے: **ذکر الخبر المدحض قول من**

---

(۱) فتح الباری ج۹/ ص۵۵۶...... (۲) راجع فتح الباری ج۹/ ص۵۲۵...... (۳) فتح الباری ج۹/ ص۵۵۷

کرہ من المتصوفۃ اکل العسل والحلوی مخافۃ ان لا یقوم بشکرہ۔[1]

(۱۰) .... کتاب الاطعمہ میں نمبر ۴۴ پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الطاعم الشاکر کالصائم الصابر۔

ترجمہ ...... کھاکر شکر کرنے والے روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کی طرح ہے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن التین رحمہ اللہ سے "الطاعم" کا معنی نقل کیا ہے: **ھو الحسن الحال فی الطعم۔** "جو کھانے پینے میں اچھی حالت میں ہو۔"

(۱۱) .... کتاب الاطعمہ ہی میں نمبر ۲۲ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ خربوزہ اور کھجور ملا کر کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں سے ایک کی گرمی دوسرے کی ٹھنڈک اور ایک کی ٹھنڈک دوسرے کی گرمی سے ختم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں عرض کیا جائے گا کہ یہاں ایک قول کے مطابق گرمی اور سردی سے مراد حسی گرمی اور ٹھنڈک ہے جس میں کھجور کے ذائقے کی تیزی بھی داخل ہے، گویا دونوں کو ملانے سے کھجور کی تیزی ختم ہو کر ذائقے میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔[3]

ابو نعیم کی ایک ضعیف روایت میں یہ بھی آتا ہے: **وکان احب الفاکھۃ الیہ۔** یعنی خربوزہ آپ کا مرغوب ترین پھل تھا۔[4]

(۱۲) .... حضرت عبد اللہ بن بسر اور عطیۃ بن بسر رضی اللہ عنہما کی حدیث کتاب الاطعمہ ہی کے نمبر ۶۹ پر آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے کھجور اور مکھن سے آپ کی ضیافت کی، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں: **وکان یحب التمر والزبد۔** "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھجور اور مکھن پسند فرماتے تھے۔"

---

(۱) الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ج ۱۲/ص ۵۹)

(۲) رواہ الترمذی ورواہ ابن ماجۃ والدارمی عن سنان بن سنۃ کذا فی المشکاۃ وکذا رواہ احمد عن ابی ھریرۃ ج۳/ص ۱۲۵ رقم ۷۸۱۱ وعن سنان بن سنۃ ج۷/ص ۲٤ رقم ۱۹۰۳٦ وذکرہ البخاری تعلیقا عن ابی ھریرۃ فتح الباری ج۹/ص ۵۸۲

(۳) وفی الطب لابی نعیم من حدیث انس کان یاخذ الرطب بیمینہ و البطیخ بیسارہ فیاکل الرطب بالبطیخ وکان احب الفاکھۃ الیہ وسندہ ضعیف فتح الباری ج۹/ص ۵۷۳ وراجع ایضا المستدرک للحاکم ج٤/ص ۱۲۱

(۴) فتح الباری ج۹/ص ۵۷۳

(١٣)............ باب الضیافہ کی الفصل الثالث کی پہلی حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انصاری کے باغ میں تشریف لے جانے کا واقعہ آرہا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے فرمایا: **اطعمنا بسرا۔** ''ہمیں آدھی پکی ہوئی کھجور کھلاؤ۔'' اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صرف بھوک ہی نہیں مٹانا چاہتے تھے بلکہ بسر کھانے کو بھی دل چاہ رہا تھا، چونکہ یہاں بے تکلفی تھی اس لئے اپنی پسندیدہ چیز مانگ لی۔

(١٤)............ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو یہ دعاء پڑھتے تھے:

الحمد لله الذی اذاقنی لذته وابقی فیّ منفعته واخرج عنی اذاه۔

ترجمہ...... تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے اس کھانے کی لذت چکھائی اور اس کا فائدہ مند حصہ میرے بدن کے اندر رکھا اور تکلیف دہ حصے کو نکال دیا۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام بھی بیت الخلاء سے نکل کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔[2]

حضرت اصنع بن زید سے روایت ہے کہ نوحؑ کو **عبدا شکورا** بھی اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔[3]

(١٥)............ کتاب الاطعمہ میں نمبر ٥٢ پر حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھانے کا حکم فرمایا، اس کی وجہ یہ بیان فرمائی: فانہ اہنا وامرا ''یہ زیادہ خوشگوار اور ہضم ہونے والا ہے۔'' بعض روایات میں یہ لفظ ہیں: **فانه اشهی واهنا وامرا۔** ''یہ زیادہ لذیذ، خوشگوار اور ہضم ہونے کا باعث ہے۔''[4]

مذکورہ بالا آیات اور احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گو کھانے کا اصل مقصود تو بھوک مٹانا اور جسم کی صحت وبقاء ہے لیکن یہ مقصد لذیذ اور پسندیدہ کھانوں سے حاصل کرنا بھی کوئی ناپسندیدہ بات نہیں ہے بلکہ کھانے کی منفعت کی طرح اس کی لذت بھی ایک نعمت الٰہیہ ہے جس پر شکر کی توفیق مل جائے تو یہ دینی

---

(١) عمل اليوم والليلة لابن السنی ص ٢٤ وقال محققه لم اجده عند غير الصنف واسماعيل من رافع مختلف فيه ورواية رويد بن نافع عن ابن عمر منقطعة قاله المناوی عن العراقی قلت: لكن له شاهدا من حديث عائشة كا سياتی من اثر العوام عند ابن ابی شيبة ج١/ص٢

(٢) رواه العقيلی فی الضعفاء والبيهقی فی شعب الايمان والديلمی كذا فی كشف النقاب ج١/ص٢٣٩

(٣) رواه البيهقی فی شعب الايمان ج٤/ص١١٣ وراجع ايضاً الدر المنثور ج٤/ص١٦٢

(٤) رواه الطبرانی من حديث صفوان بن امية المعجم الكبير ج٨/ص٤٨ رقم ٧٣٣١

ترقی کا بڑا موثر اور آسان ذریعہ بھی ہے، حضور اقدس ﷺ کو بھی کھانے کی بعض چیزیں زیادہ مرغوب تھیں اور آپ انہیں شوق سے تناول فرمایا کرتے تھے بلکہ گھر یا بے تکلفی کی جگہ میں ایسی چیز طلب بھی فرمالیا کرتے تھے، کھانے کے بعض طریقوں کو اس لئے بھی آپ نے پسند فرمایا کہ ان میں لذت زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

طلب لذت کی ناپسندیدگی کے دلائل:-

اس کے برعکس بعض احادیث واقوال سلف سے معلوم ہوتا ہے کہ لذیذ کھانوں کی طلب یا ان کا شوق پسندیدہ نہیں ہے۔ ذیل میں ایسی روایات نقل کی جاتی ہیں۔

(۱)...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان من السرف ان تاکل کل ما اشتهيت۔

ترجمہ ...... یہ بات اسراف میں داخل ہے کہ جس چیز کو بھی تمہارا دل چاہے اسے کھانے لگ جاؤ۔[۱]

لیکن یہ حدیث سند کے اعتبار سے انتہائی ضعیف ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی بقیہ بن الولید ضعیف ہیں، دوسرے راوی یوسف بن ابی کثیر مجہول ہیں اور تیسرے راوی نوح بن ذکوان انتہائی ضعیف ہیں۔ سند پر تفصیلی کلام حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔[۲]

---

(۱) رواه ابن ماجه ص ۲۴۰ والبيهقي في شعب الايمان ج۵/ص۴۶ وابو نعيم في حلية الاولياء والبخاري في الادب المفرد والذهبي في ميزان الاعتدال ج۴/ص۲۷۶ في ترجمة نوح بن ذكوان ۹۱۳۴ وعزاه الالباني في سلسلة الاحاديث الضعيفة ج۱/ص۲۷۲ الى ابن ابي الدنيا في كتاب الجوع ايضًا

(۲) الحديث اورده ابن الجوزي في الاحاديث الموضوعة كذا في سلسلة الاحاديث الضعيفة للالباني ج۱/ص۲۸۳ وذكره الحافظ ابو الفضل المقدسي في تذكرة الموضوعات ص۴۵ وقال: فيه نوح بن ذكوان وهو منكر الحديث وذكره المنذري في الترغيب ج۴/ص۲۰۲ ب "روى" مما يدل على ضعفه عنده۔

واسانيد هذا الحديث تنتهي الى بقية بن الوليد عن يوسف بن ابي كثير عن نوح بن ذكوان عن الحسن عن انس رضي الله عنه ولم اجد من تابع بقية في هذا الحديث وتتلخص علله فيما يلي:

بقية ضعفه بعض الائمة وقال احمد: اذا حدث عن قوم غير معروفين فلا تقبلوه ومثله روى عن يحيى بن معين والعجلي وابن المبارك والنسائي راجع تهذيب التهذيب ج۱/ص۴۷۴ ومابعد وهذا الحديث رواه عن يوسف بن ابي كثير وهو مجهول كما سياتي وبالاضافة الى هذا فان بقية مدلس ولكن تنتفي هذه العلة بتصريحه بالتحديث عند ابن ماجه۔

يوسف بن ابي كثير مجهول قال الحافظ في تهذيب التهذيب ج۱۱/ص۴۲۱ هو احد شيوخ بقية الذين لا يعرفون وكذا صرح بجهالته الذهبي في الميزان ج۴/ص۴۷۲۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

اگر یہ حدیث قابل قبول ہو بھی تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ حلال و حرام، مناسب و غیر مناسب اور مفید و غیر مفید دیکھے بغیر محض لذت دہن کی خاطر کھانے کا شوق فضول خرچی میں داخل ہے۔

(۲)...... حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اياك و التنعم فان عباد الله ليسوا بالمتنعمين۔

ترجمہ ...... تم زیادہ ناز و نعمت والی زندگی سے بچو اس لئے کہ اللہ کے مقبول بندے ناز و نعمت کی زندگی گزارنے والے نہیں ہوتے۔(۱)

مشکوٰۃ کے حاشیہ میں مرقات کے حوالے سے تنعم (ناز و نعمت) کا مطلب یہ نقل کیا گیا ہے کہ خواہشات کو پورا کرنے میں حرص اور لالچ کے ساتھ تکلف اور مبالغے سے کام لیا جائے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۴۴۹)

(۳)...... حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ)

نوح بن ذكوان ضعيف الحديث جدا قال ابو حاتم: ليس بشئى مجهول قال ابن عدى: احاديثه غير محفوظة قال ابن حبان: منكر الحديث جدا يجب التنكب عن حديثه قال الحاكم: ليس بالقوى وقال ايضا: يروى عن الحسن كل معضلة وقال ابو سعيد النقاش: يروى عن الحسن مناكير وقال ابو نعيم: روى عن الحسن المعضلات وله صحيفة عن الحسن عن انس لا شئى راجع تهذيب التهذيب ج١٠/ص٤٨٤ وميزان الاعتدال ج٤/ص٢٧٦ قلت: وهذا الحديث ايضا من رواية عن الحسن عن انس۔

وقال المنذرى: وقد صحح الحاكم اسناده لمتن غير هذا وحسنه غيره (الترغيب والترهيب ج٤/ص٢٠٢) ونقل عمر بن حسن فى كتابه الوضع فى الحديث ج٢/ص٤٢٨ عن الحافظ ابن حجر ما نصه: هذا الحديث صححه البيهقى كما نقله عنه المنذرى فى الترغيب والترهيب ولكن لم يوجد فى نسخة الترغيب المطبوعة تصحيح البيهقى هذا الحديث وانما فيه تصحيح الحاكم حديثا غير هذا روى بنفس السند ولكنه لا يستلزم صحة هذا الحديث او هذا السند عنده فلعله صحح حديثا بهذ السند لانه وجد له متابعات وشواهد وكيف يصحح الحاكم هذا السند وهو نفسه القائل فى نوح بن ذكوان: ليس بالقوى ويروى عن الحسن كل معضلة۔

الحاصل ان الحديث ضعيف جدا ولكن لا نتفق مع ابن الجوزى فى حكمه عليه بالوضع لانه ليس فى سنده من رمى بالوضع او الكذب۔

(۱) رواه احمد فى مسنده ج٨/ص٢٥٧ رقم٢٢١٦٦ وقال المنذرى فى الترغيب ج٤/ص٢٠٣: رواه احمد والبيهقى ورواة احمد ثقات وقال الهيثمى فى المجمع ج١٠/ص٢٥٣ رواه احمد ورجاله ثقات قلت: فى اسناده بقية بن الوليد وهو مدلس كما مر وقد عنعن فى اسناد احمد وفيه ايضا صريح بن مسروق لم اجد ترجمته فى التهذيب ولا فى اللسان واطلاق قول المنذرى والبيهقى: رجاله ثقات يدل على انه ثقة۔

سیکون رجال من امتي یاکلون الوان الطعام ویشربون الوان الشراب ویلبسون الوان الثیاب ویتشدقون فی الکلام اولٓئك شرار امتي الذین غذو ابالنعیم ونبتت علیه اجسامهم۔

ترجمہ ...... میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو طرح طرح کے کھانے کھایا کریں گے، انواع واقسام کے مشروبات پیا کریں گے، رنگارنگ کے کپڑے پہنا کریں گے اور بے احتیاطی سے زیادہ باتیں کیا کریں گے، یہ میری امت کے بدترین لوگ ہوں گے جنہیں ناز ونعمت والی غذائیں ملی ہوں گی اور انہی سے ان کے جسم کی پرورش ہوئی ہوگی۔(۱)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث تو سنداً ضعیف ہے لیکن اس سے ذرا مختصر مضمون حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی منقول ہے۔(۲)

---

(۱) رواه الطبرانی فی الکبیر ج۸/ص۱۰۷ وکذا رواه ابن ابی الدنیا کذا فی الترغیب ج۴/ص۲۰۴ واشار المنذری الی ضعفه ب روی ولکن له شواهد کما سیاتی وکذا قال الهیثمی کما نقله عنه محقق المعجم الکبیر للطبرانی: وحسنه شیخنا (ای العراقی) لشواهده ولم اجد هذه العبارة فی نسخة مجمع الزوائد المطبوعة فی مؤسسة العارف بیروت (۱۴۰۶ھ) واما ما فیه من قوله: رواه البزار وفیه عبد الرحمن بن زیاد بن انعم وقد وثق والجمهور علی تضعیفه وبقیة رجاله ثقات فلعله من غلط بعض النساخ فان الذی رواه البزار والذی فیه عبد الرحمٰن ابن زیاد هو حدیث ابی هریرة رضی الله عنه الاتی بیانه بمتن اخصر من هذا لا حدیث ابی امامة کما یظهر من کلام المنذری فی الترغیب ج۴/ص۲۰۴ وحاشیة المطالب العالیة ج۳/ص۱۵۶ رقم۳۱۳۵ ومن سلسلة الاحادیث الصحیحة ج۴/ص۵۱۵۔

(۲) اما حدیث ابی هریرة رضی الله عنه فرواه البزار ورواته ثقات الا عبد الرحمن بن زیاده ابن انعم (الا فریقی فانه ضعیف) کذا فی الترغیب ج۴/ص۲۰۴ وکذا رواه ابو یعلی فی مسنده کما فی التعلیق علی المطالب العالیه ج۳/ص۱۵۶ رقم ۳۱۳۵۔

واما حدیث عبد الله بن جعفر رضی الله عنه فرواه ابن ابی الدنیا والطبرانی (الترغیب ج۴/ص۲۰۴) وکذا رواه الحاکم فی مستدرکه ج۳/ص۵۶۸ فی کتاب المناقب فی ذکر عبد الله بن جعفر رضی الله عنه وسکتا علیه لکن قال الذهبی: اظنه موضوعا فاسحاق متروك واحرم متهم بالکذب وقال العزیزی فی السراج المنیر ج۳/ص۲۳۹ بعد عزوه الی الحاکم وقال الشیخ: حدیث حسن لغیره واما حدیث فاطمة رضی الله عنها فرواه البیهقی فی شعب الایمان ج۵/ص۳۳ رقم ۵۶۶۹ عن حسن بن علی بن ثابت عن عبد الحمید بن جعفر الانصاری عن عبد الله بن حسن عن امه فاطمة رضی الله عنها بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم الخ وقال: تفرد به علی بن ثابت واما حدیث فاطمة بنت حسین فرواه احمد فی الزهد وابن ابی الدنیا فی المجموع وابن عدی فی الکامل قال الالبانی وهذا اسناد جید رجاله موثقون الا انه مرسل راجع سلسلة الاحادیث الصحیحة ج۴/ص۵۱۳ رقم۱۸۹۱ قلت: ولا ادری اهذا الحدیث والذی قبله حدیثان مستقلان ام اشتبهت فاطمة بنت حسین بفاطمة بنت الرسول صلی الله علیه وسلم علی بعض الرواة من عبد الحمید بن جعفر وان کلیهما من روایته۔

واما مرسل عروة بن رویم فرواه ابن المبارك فی الزهد وقال الالبانی: هذا مرسل صحیح الاسناد کذا فی سلسلة الاحادیث الصحیحة ج۴/ص۵۱۳

ان کی سندیں بھی گو ضعیف ہیں لیکن مجموعی طور پر تعدد اسانید ہونے کی وجہ سے یہ حدیث قابل قبول بن جاتی ہے، اسی وجہ سے علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے حافظ عراقی سے اس کا حسن ہونا نقل کیا ہے، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ یہی حدیث حضرت فاطمہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا اور عروہ بن رویم سے مرسلاً بھی مروی ہے اور دونوں مرسل حدیثوں کی سندیں بقول البانی صحیح یا جید ہیں۔ مرسل وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں تابعی کسی صحابی کا واسطہ ذکر نہ کریں براہ راست اس کی نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دیں اور حدیث مرسل بذات خود بھی بہت سے علماء کے نزدیک قابل قبول ہوتی ہے، جو اسے قبول نہیں کرتے ان کے نزدیک بھی اس کے مضمون کی تائید اگر دوسری مرسل حدیث یا کسی بھی ضعیف حدیث سے ہو جائے تو وہ قابل قبول بن جاتی ہے، یہاں بھی ایک تو ایک مرسل کی تائید دوسری مرسل سے ہو رہی ہے دوسرے اس کی تائید حضرات ابوامامہ، ابوہریرہ اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم وغیرہ کی ضعیف احادیث سے ہو رہی ہے لہٰذا یہ حدیث حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ سے کم کسی بھی حالت میں نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا متن حسب ذیل ہے، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا متن بھی تقریباً یہی ہے:

ان اشرار امتی الذین غذوا بالنعیم ونبتت علیه اجسامهم۔

ترجمہ ...... میری امت کے بدترین لوگ وہ ہوں گے جنہیں ناز و نعمت والی غذائیں ملی ہوں گی اور اسی پر ان کے جسموں کی پرورش ہوئی ہوگی۔

لیکن اس حدیث کے متعلق چند امور پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تو یہ کہ اس حدیث کے زیادہ تر الفاظ میں ہمیشہ اچھا کھانے اور اچھا پہننے کے ساتھ ساتھ تشدق فی الکلام کا بھی ذکر ہے جس کا معنی ہے بے احتیاطی سے زیادہ باتیں کرنا جس میں عموماً بہت سی گناہ کی باتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں یا اس انداز سے بات کرنا جس سے مخاطب کے ساتھ استہزاء نمایاں ہو۔[1] یہ چیز عموماً ناز و نعمت اور پر تعیش زندگی کی وجہ سے پیدا ہو ہی جاتی ہے گویا مذکورہ وعید ان تمام اوصاف کے مجموعے پر ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر وصف کا اس وعید کے مستحق ہونے میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسند احمد وغیرہ کی روایت میں **یاکلون الوان الطعام** کی بجائے **یطلبون الوان الطعام والوان الثیاب** کے الفاظ ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ وعید پر تعیش زندگی کی طلب اور شوق پر ہے محض اچھی چیزیں کھانے پر نہیں۔[2]

---

(۱) السراج المنیر ج ۳/ص ۲۳۹...... (۲) سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی ج ٤/ص ٥١٣

(۴)...... مشکوٰۃ کے کتاب الاطعمہ ہی میں نمبر ۲۲ پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے جس میں حضور اقدس ﷺ کے یہ الفاظ بھی ہیں: **نعم الادام الخل۔** "سرکہ بہترین سالن ہے۔"

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معنی هذا الكلام: الاقتصاد فی الما كل ومنع النفس عن ملاذ الاطعمة كانه يقول: اءتدموا بالخل وما كان فی معناه مما تخف مؤمنته ولا يعز وجوده ولا تتأنقوا فی المطعم فان تناول الشهوات مفسدة للدين مسقمة للبدن۔[1]

اس حدیث کا مقصد کھانے میں میانہ روی اختیار کرنا اور نفس کو لذیذ کھانوں سے روکنا ہے، گویا آنحضرت ﷺ یہ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ سرکہ اور اس جیسی کم مشقت اور کم قیمت چیزیں جو کمیاب نہیں ہوتیں کو ہی بطور سالن استعمال کرلیا کرو اور کھانے میں زیادہ تکلف سے کام نہ لیا کرو اس لئے کہ خواہشات کو حاصل کرنا دین کو فاسد اور بدن کو بیمار کر دیتا ہے۔

(۵)...... بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے:

للقلب فرحة عند اكل اللحم وما دام الفرح بامر الا اشر وبطر فمرة ومرة۔[2]

ترجمہ ...... گوشت کھاتے وقت دل کو ایک خوشی حاصل ہوتی ہے اور جسے بھی مسلسل خوشی حاصل رہے وہ سرکش اور متکبر ہو جاتا ہے اس لئے گوشت کبھی کبھار کھایا کرو۔

لیکن اس حدیث کو حافظ ابو الفضل المقدسی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے موضوعات میں شمار کیا ہے، اگر یہ حدیث موضوع نہ بھی ہو تو کم از کم انتہائی ضعیف ضرور ہے۔[3]

---

(۱) معالم السنن مع مختصر سنن ابی داؤد ج ۵/ ص ۳۲۸

(۲) شعب الایمان ج ۵/ ص ۳۲

(۳) ذكره الحافظ ابو الفضل المقدسی فی تذكرة الموضوعات ص ٤٤ وقال: فيه احمد بن عيسى الختساب التينسی هو كذاب وذكره الحافظ فی لسان الميزان ج ۱/ ص ۲٤۱ فی ترجمة احمد بن عيسى هذا وقال: قال ابن عدی: له مناكير وقال ابن طاهر: كذاب يضع الحديث وقال ابن حبان فی ترجمته: كان يروی مناكير عن المشاهير والمقلوبات عن الثقات لا يجوز الاحتجاج بما انفرد به وقال مسلمة: كذاب حدث باحاديث موضوعة۔

قلت: تابع احمد بن عيسى عبد الله بن محمد بن المغيرة عند البيهقی فی شعب الايمان ج ۵/ ص ۳۲ لكن عبد الله بن محمد بن المغيرة هو الاخر ضعيف جدا ذكره الحافظ فی اللسان ج ۳/ ص ۳۳۳ وقال: قال ابو حاتم: ليس بقوی قال ابن يونس: منكر الحديث قال ابن عدی: عامة ما يرويه لا يتابع عليه ثم قال بعد سرد مروياته منها الحديث المذكور ان للقلب فرحة .... الخ قلت: وهذه موضوعات قال النسائی: روى عن الثوری ومالك بن مغول احاديث كانا اتقى الله ان يحدثا بها وهذا الحديث ايضا مما رواه عن الثوری۔

(۶)......امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

ایاکم واللحم فان لہ ضراوۃ کضراوۃ الخمر۔(۱)

"تم (زیادہ) گوشت کھانے سے بچو اس لئے کہ اس کی بھی ایسے ہی عادت پڑ جاتی ہے جیسے شراب کی۔"

تقریباً یہی مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

یا بنی تمیم! لا تدیموا اکل اللحم فان لہ ضراوۃ کضراوۃ الخمر۔(۲)

"اے بنی تمیم! ہمیشہ گوشت ہی نہ کھاتے رہا کرو اس لئے کہ گوشت کی بھی ویسے ہی عادت ہو جاتی ہے جیسے شراب کی۔"

حضرت عروۃ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ یہ عیب کی بات سمجھی جاتی تھی کہ آدمی گوشت کے بغیر صبر نہ کر سکے۔(۳)

یہاں پر یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے التکشف ص ۵۶۸ میں تیسیر سے نقل کرتے ہوئے موطا امام مالک کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا ارشاد نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ زائد ذکر فرمائے ہیں:

وان اللہ یبغض اھل البیت اللحمیین۔

"اور اللہ تعالیٰ ایسے گھر والوں کو پسند نہیں کرتے جنہیں گوشت کھانے کی (لازمی) عادت ہو جائے۔"

لیکن موطا کے مطبوعہ نسخوں میں حضرت عمر کا مذکورہ بالا ارشاد تو ہے لیکن اس میں یہ آخری جملہ **ان اللہ یبغض .... الخ** نہیں ہے۔(۴) اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ نے بھی اوجز کے اندر اس جملے کا کوئی ذکر نہیں فرمایا حالانکہ جہاں موطا کے نسخوں میں اختلاف ہو وہاں حضرت شیخ رحمہ اللہ ضرور وضاحت فرمادیا کرتے ہیں۔

ہاں البتہ بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں کعب احبار کا قول نقل کیا ہے اس میں مذکورہ بالا جملہ بھی ہے۔(۵) سیوطی رحمہ اللہ نے الدر المنثور میں بیہقی کے حوالے سے ہی حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:

ان اللہ یبغض البیت اللحم۔ "اللہ تعالیٰ گوشت والے گھر کو ناپسند فرماتے ہیں۔"

حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں کے صاحبزادے مطرف سے پوچھا گیا کہ گوشت والے گھر سے کیا مراد ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا گھر جس میں لوگوں کی غیبتیں کی جائیں۔(۶) یہی

---

(۱) موطا مع اوجز المسالک ج ۱۴/ص ۳۴۸ ...... (۲) مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸/ص ۱۲۸ ...... (۳) مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸/ص ۱۲۹
(۴) موطا امام مالک ص ۷۱۸......(۵) شعب الایمان ج ۵/ص ۳۳......(۶) الدر المنثور، شعب الایمان ج ۵/ص ۳۰۷

تفسیر امام بیہقی رحمہ اللہ نے سفیان ثوری رحمہ اللہ سے بھی نقل کی ہے۔[۱] نیز یہ بھی خیال رہے کہ مذکورہ (**ان الله یبغض البیت اللحم**) حدیث کی سند کے دوراوی غیاث بن کلوب اور الحسن بن الفضل بن السمح ضعیف ہیں۔اس پر جرح حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔[۲]

(۷)...... امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے راستے میں ملاقات ہوگئی، اس وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک خادم گوشت اٹھائے ہوئے تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ہمیں گوشت کی خواہش ہوئی اس لئے میں نے ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

ما یرید احدکم ان یطوی بطنه عن جاره او ابن عمه این تذهب عنك هذه الایة: اذهبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا و استمتعتم بها۔[۳]

ترجمہ ...... کیا تم اپنے پڑوسی یا چچازاد بھائی کی خاطر پیٹ ذرا خالی رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے، یہ آیت تم سے کہاں مخفی ہوگئی (جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) تم اپنی لذتیں دنیوی زندگی میں ختم کر چکے اور ان سے فائدہ (جو اٹھانا تھا) اٹھا چکے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أکلما اشتهیت شیئا اشتریته۔ "جب بھی تمہارا کسی چیز کو دل چاہے اسے لازمی خرید بھی لیتے ہو؟"

نتائج بحث ...... اوپر پیش کردہ دونوں طرف کے دلائل میں غور کرنے سے مندرجہ ذیل امور سمجھ میں آتے ہیں اور انہی امور کو ذہن میں رکھنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں طرف کی آیات واحادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۱)............ اصل حکم شریعت یہی ہے کہ لذیذ اور مرغوب کھانے بغیر طلب و جستجو کے ملیں تو ان میں کوئی

---

(۱) شعب الایمان ج ۵/ص ۳۳......

(۲) اما غیاث بن کلوب فقال الحافظ فی اللسان ج ٤/ص ٤٢٣ ضعفه الدارقطنی قال البیهقی غیاث هذا مجهول (ملخصًا) واما الحسن بن الفضل فقال الحافظ فیه: قال ابو الحسین المناوی اکثر الناس عنه ثم انکشف فترکوه وخرقوا حدیثه۔ (لسان المیزان ج ۲/ص ۲۴۴)

(۳) موطا مع اوجز المسالک ج ۱۴/ص ۳۴۹

قباحت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اسی طرح اعتدال کے ساتھ ان کی طلب و جستجو بھی جائز ہے اس لئے کہ:

(الف)......اوپر ذکر کردہ نصوص میں سے پہلی قسم کی نصوص زیادہ بھی ہیں صحت و ثبوت کے معیار کے اعتبار سے بلند تر بھی، ان میں کچھ قرآنی آیات ہیں اور احادیث بھی بیشتر ایسی ہیں جن کی سندوں پر اعتراض کی گنجائش نہیں جبکہ دوسری طرف کی بیشتر احادیث انتہائی ضعیف ہیں یا اپنے مطلب پر ان کی دلالت اتنی واضح نہیں۔

(ب)......لذیذ کھانوں کی صورت میں شکر کی توفیق زیادہ ہوتی ہے اور یہ شکر دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے جبکہ ترک لذت کی صورت میں اول تو شکر کی توفیق ہی شاذونادر ہوتی ہے اور اگر توفیق مل بھی جائے تو عموماً وہ شکر زبان تک محدود ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ترک لذت کے اہتمام کی وجہ سے اپنے اوپر عجب اور خود پسندی کی نظر ہونے لگتی ہے اور آدمی اس خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہت کم مستفید ہو رہا ہوں جس سے ایک طرف تو عبدیت جو کہ پورے دین کی اصل روح ہے سے محرومی ہو جاتی ہے، دوسری طرف شکر کی توفیق بھی سلب ہو جاتی ہے جبکہ شکر ان انتہائی اہم مقصودی درجے کی عبادات میں سے ہے جن کا سلسلہ جنت میں بھی جاری رہے گا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ اپنے دور کے مجدد تصوف و سلوک حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ "میاں اشرف علی! پانی جب بھی پینا ٹھنڈا پینا۔" اور حکمت اس کی یہ بیان فرمائی کہ اگر گرم پانی پیو گے تو صرف زبان الحمد للہ کہے گی اور ٹھنڈا پانی پینے کی صورت میں روئیں روئیں سے بے ساختہ الحمد للہ نکلے گا۔

(ج)...... بعض اوقات نفس کو ترک لذات پر مجبور کرنے کی وجہ سے طبعت میں خاص قسم کی افسردگی اور اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے جو عبادت میں مضر اور توجہ الی اللہ میں مخل ثابت ہوتی ہے، اس کے برعکس حد جواز اور حد اعتدال میں رہتے ہوئے لذات سے بھی جی خوش کر لیا جائے تو طبیعت میں نشاط پیدا ہو کر کیف عبادت اور توجہ الی اللہ میں ترقی ہوتی ہے۔ عبادت میں نشاط بھی شریعت میں مطلوب و مقصود ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

علیکم بما تطیقون من الاعمال فان اللہ لا یمل حتی تملوا۔

ترجمہ ...... تم اتنے ہی اعمال اختیار کیا کرو جن کی تمہارے اندر ہمت ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنا فضل فرمانے سے نہیں اکتاتے بلکہ تم خود ہی اکتا جاؤ گے۔[2]

---

(۱) دیکھئے! "اسلام کا فلسفہ آداب" کے زیر عنوان نمبر ۲...... (۲) صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۳/ص ۳۶، ج ۱/ص ۱۰۱

اسی طرح ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ نے دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی دیکھی، آپ کے پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے باندھ رکھی ہے، رات کو جب نماز میں کھڑے تھک جاتی ہیں تو اس کا سہارا لے لیتی ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ رسی کھول دو، جب تک نشاط ہو نماز پڑھتی رہے جب طبیعت میں کسل پیدا ہو جائے تو بیٹھ جائے۔(۱)

ان احادیث سے عبادت میں نشاط کی اہمیت واضح ہو گئی۔ جس طرح عبادت کی کثرت اس نشاط کو کم کرنے کا باعث بنتی ہے ایسے ہی آدمی کا طرز زندگی خصوصاً اپنے اوپر ضرورت سے زائد پابندیاں عائد کرنے کا انداز بھی اس پر منفی اثرات مرتب کر دیتا ہے۔

(۲)........لذیذ کھانوں کی مشروعیت و مطلوبیت اگرچہ ثابت ہے لیکن اس میں حد اعتدال کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل صورتیں طلب لذت کے اندر بے اعتدالی میں داخل ہیں۔

(۱)........ایک ہے لذیذ کھانا بغیر طلب و کاوش کے ملنے پر خوشی سے کھا لینا یا بے تکلفی کی جگہ میں بسہولت میسر آنے کی توقع ہو تو طلب کر لینا، یہ تو خود حضور ﷺ کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ اس سے زائد جستجو اور کوشش اگرچہ جائز ذریعے سے ہو کم از کم خواص کے لئے مناسب نہیں۔ حضور اقدس ﷺ کے بعض کھانوں کو پسند فرمانے کا مطلب بھی خطابی اور ابن التین نے یوں بیان کیا ہے:

لم یکن حبه صلی الله علیه وسلم علی معنی کثرة التشهی لها وشدة نزاع النفس الیها وانما کان ینال فیها اذا حضرت الیه نیلا صالحا فیعلم بذلك انها تعجبه۔

"حضور ﷺ کے ان کھانوں کو پسند فرمانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی طبیعت ان کی طرف زیادہ مائل ہوتی تھی اور آپ کے دل میں ان کی شدید خواہش پیدا ہوتی تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کھانے جب آپ کے سامنے پیش کیے جاتے تو انہیں اچھی مقدار میں تناول فرماتے جس سے اندازہ ہو جاتا کہ آپ انہیں پسند فرماتے ہیں۔" (۲)

(۲)........زندگی میں بشاشت و راحت کی اہمیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے، یہ آدمی کو حسب منشا کھانے پینے اور آرام سے باز رکھتا ہے لہٰذا جب ضرورت پوری ہو جائے تو جلدی گھر لوٹ آنا چاہئے۔(۳)

اس کی حکمت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ گھر کے اندر رہنے میں راحت ہے جو کہ دین و دنیا کی بہتری کے لئے معین و مددگار ہے۔(۴)

---

(۱) صحیح بخاری مع فتح الباری ج۳/ص۳۶ ...... (۲) فتح الباری ج۹/ص۵۵۷ ...... (۳) صحیح البخاری مع فتح الباری ج۳/ص۶۲۲

(۴) فتح الباری ج۳/ص۶۲۳

(۳)......... کام و دہن کی لذت کا ایسا شوق جو انسان کو عملاً حرام کے دائرے میں داخل کردے یہ تو خطرناک قسم کی بے اعتدالی ہے ہی، لذات میں ایسا انہماک بھی مضر ہے جس سے انسان کی توجہ زندگی کے مقاصد اصلیہ سے ہٹ جائے اور وہ انہی لذائذ کا ہو کر رہ جائے اور من پسند لذیذ کھانوں کی عدم دستیابی اس کے لئے پریشانی کا سبب بن جائے۔ لذات کی شرعاً مطلوبیت و مشروعیت کی ایک حکمت اوپر یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ ان سے طبعی نشاط حاصل ہوتا ہے، یہ مقصد بھی اسی وقت تک حاصل ہو سکتا ہے جب تک کہ لذت طلبی، حرص اور شدید انہماک کی حد تک نہ پہنچی ہو وگرنہ یہی لذت جمعیت خاطر برباد کرنے کا باعث بھی بن سکتی ہے، اس لئے کہ جس چیز کو دل چاہے وہ فوراً مل بھی جائے یہ صرف جنت کی خصوصیت ہے، دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کہ گوشت کے نشے سے بچو کا بھی یہی مقصد ہے اور یہی راز ہے حضرت عروہ کے اس قول کا کہ اس بات کو عیب سمجھا جاتا تھا کہ آدمی گوشت کے بغیر صبر نہ کر سکے۔

لذیذ کھانوں کے اختیار کرنے کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی گئی تھی کہ اس سے شکر کی توفیق زیادہ ہوتی ہے، یہ بھی تبھی ہے جبکہ لذت کی حرص دل میں پیدا نہ ہونے دی جائے وگرنہ یہی لذتیں بعض اوقات انسان سے قناعت جیسی سکون وراحت رساصفت چھین کر اسے بے صبرا اور ناشکرا بنا دیتی ہیں، مطلوبہ معیار نہ ملنے پر صبر کا دامن ہاتھ سے نکل جائے گا اور اپنے ذہن میں طے کئے ہوئے معیار سے اس کے زعم میں کم تر نعمتوں کی ناقدری وناشکری بلکہ زبان سے ان کی توہین میں مبتلا ہو جائے گا اور یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نعم الادام الخل، و کفی بالمرء شرا ان یتسخط ما قرب الیه۔[1]

ترجمہ ...... سرکہ ایک اچھا سالن ہے، آدمی کے برا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے سامنے کھانے کے لئے پیش کی جانے والی چیز کی وجہ سے ناراض ہو جائے۔

(۴)......... لذت طلبی میں بے اعتدالی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی کو لذیذ کھانوں کا شوق خود غرض اور دوسروں کی ضروریات سے غافل بنا دے، اسلامی تعلیم تو یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کی خاطر اپنی ضرورت یا شکم پری میں کمی کر لے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آگے آرہا ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو کو اور دو کا چار کو کافی ہو جانا چاہئے، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم دوسروں کی شدید ضرورت کے پیش نظر اپنی خواہشات کی قربانی کے لئے تو تیار ہونا چاہئے۔

(۱) شعب الایمان ج۵/ص۸۵

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گوشت خریدنے پر جو اعتراض فرمایا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے جیسا کہ ترک لذت کی احادیث کے سلسلے نمبر ۷ پر نقل کردہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ علا باجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات ایسے حالات میں فرمائی ہے جبکہ عام لوگ سخت تنگ حالی میں مبتلا تھے۔[1] حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ بات رمادہ والے سال فرمائی تھی۔[2]

رمادہ والا سال ۱۸ھ کو کہا جاتا ہے، اس سال حجاز میں بڑا شدید قحط پڑا تھا، اس کو عام الرمادۃ کہنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ خشک سالی کی وجہ سے زمین کا رنگ راکھ (جسے عربی میں رمادہ کہتے ہیں) کی طرح ہو گیا تھا اور مٹی بھی راکھ کی طرح اڑتی تھی، اس قحط کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایثار، غمخواری اور مواسات کے بے مثل مناظر سامنے آئے، قحط سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روٹی گھی اور دودھ میں بگھو کر دی جاتی تھی لیکن اس موقع پر آپ نے یہ فیصلہ فرمالیا تھا کہ لوگوں کے خوشحال ہونے تک میں گھی استعمال نہیں کروں گا۔ خلاف عادت ہونے کی وجہ سے گھی چھوڑنے میں آپ کو بڑی مشقت اٹھانا پڑتی، معدہ بھی خراب ہو گیا تھا، بعض اوقات خطبے کے دوران پیٹ سے گڑ گڑ کی آواز آتی لیکن اپنے پیٹ کو مخاطب کر کے فرماتے کہ جب تک گھی اوقیوں میں (یعنی سستے داموں) نہیں بکنے لگ جاتا اس وقت تک تمہیں اسی کی عادت ڈالنا ہوگی۔ اس ریاضت و مجاہدہ کی وجہ سے آپ کا رنگ بھی سیاہ پڑ گیا تھا اور ضعف بھی کافی ہو گیا تھا۔[3]

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ جن احادیث و آثار میں طلب لذت کی ناپسندیدگی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد مذکورہ بالا نوعیت کی بے اعتدالیوں سے منع کرنا ہے، مطلقاً لذات یا ان کی خواہش کو مذموم قرار دینا نہیں۔

صوفیہ کا مجاہدہ ترک لذات:-

(۵) .... مذکورہ بالا گفتگو سے جہاں یہ بات واضح ہو گئی کہ حلال دائرے میں رہتے ہوئے لذیذ اشیاء کھانے پر شریعت نے کوئی قدغن عائد کی ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے قابل ملامت یا ایمانی و روحانی کمال کے منافی قرار دیا ہے وہیں یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ لذائذ میں انہماک بعض اوقات انسان کو اصل مقاصد سے غفلت، حرص، طمع، ناشکری، بے صبری اور خود غرضی جیسے مہلک رذائل میں مبتلا کر دیتا ہے بلکہ بعض اوقات

(۱) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۳۴۹ ...... (۲) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۳۵۰

(۳) شعب الایمان ج ۵ / ص ۳۵، ۳۷، البدایہ والنہایہ ج ۷ / ص ۹۰، ۹۱، موطا امام مالک مع اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۳۴۰

ارتکاب حرام کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے اس لئے اس جائز لذت طلبی کو حد اعتدال کے اندر رکھنا ضروری ہے۔

ایک شخص ایسا ہے جس کا نفس طلب لذت کی حدود اعتدال کو پھلانگ چکا ہے وہ مذکورہ بالا رذائل میں مبتلا ہو چکا ہے یا عنقریب ان کا نشانہ بن جانے کا خطرہ ہے اس کو دوبارہ حد اعتدال میں لانے کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں ہے اور اس بات سے بھی اختلاف ممکن نہیں کہ ایک کاغذ اگر ایک طرف کو مڑا ہوا ہے تو اسے سیدھا کرنے کے لئے محض ہاتھ سے پکڑ کر سیدھا کر دینا کافی نہیں بلکہ اسے کچھ دیر کے لئے دوسری جانب موڑ کر رکھنا ہوگا، اسی طرح بے اعتدالی کے شکار نفس کے علاج یا حفظ ماتقدم کیلئے بعض اوقات اسے محض اعتدال کا درس دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اسے لذات کے اس دائرے سے بھی دور رکھنا پڑتا ہے جو عام حالات میں حد اعتدال سے باہر نہیں ہوتا۔ مشائخ صوفیہ بعض اوقات اپنے زیر تربیت مریدین کو لذات میں بہت زیادہ تقلیل کی تعلیم دیا کرتے ہیں اس کا منشا بھی یہی اصول ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تقلیل طعام کا مجاہدہ بے اصل نہیں ہے، اسی طرح تقلیل لذات والے مجاہدے کا ثبوت بھی قرآن وحدیث، اقوال سلف اور فقہاء ومحدثین کے کلام سے ملتا ہے۔

سد ذریعہ تو فقہاء کے ہاں ایک مستقل باب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز کسی حرام یا غلط کام کا ذریعہ بن سکتی ہو اگرچہ بذات خود وہ جائز ہو اس سے بھی منع کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اصل حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث بھی ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام سے اجتناب کے ساتھ ساتھ مشتبہ امور سے بھی بچنے کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مشتبہات کو بھی چھوڑ دے گا وہ واضح حرام کاموں سے زیادہ بہتر طریقہ سے بچ سکے گا اور جو شخص ان مشتبہ امور میں پڑنے کی جرات کرے گا اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ عنقریب واضح حرام کاموں میں پھنس جائے۔ معاصی کی حیثیت اس چراگاہ جیسی ہے جو بادشاہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور کسی دوسرے کو اپنے جانور لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اب جو شخص اس چراگاہ کے قریب اپنے جانور چراتا ہے (تو اگرچہ یہ بذات خود ممنوع نہیں ہے لیکن) یہ خطرہ ضرور ہے کہ اس کے جانور چرتے چرتے اس چراگاہ کے اندر جا گھسیں (اس لئے چراگاہ کے قریب جانے سے بھی بچنا چاہئے)۔[1]

صوفیہ کا بطور معالجہ لذائذ سے منع کرنا یا ان میں تقلیل کرانا بھی درحقیقت اسی اصول پر مبنی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ بات صرف صوفیہ کے ہاں نہیں بلکہ فقہاء ومحدثین کے ہاں بھی ملتی ہے۔ یہاں صرف دو حوالے ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ ایک حدیث سے اچھے کھانوں کی ترغیب ثابت کرنے کے بعد ابن بطال کے حوالے

---

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری ج۵ / ص۲۹۰

سے فرماتے ہیں: **انما کرہ السلف الادمان علی اکل الطیبات خشیة ان یصیر ذلك عادة فلا تصبر النفس علی فقدھا۔**[1]

"سلف نے اچھے کھانوں میں انہماک کو صرف اس خطرے کے پیش نظر ناپسند کیا ہے کہ یہ کھانے اس کی عادت بن جائیں اور ان کے نہ ملنے کی صورت میں نفس کا صبر کرنا مشکل ہو جائے۔"

قرآن کریم کی آیت **اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا** ۔بنیادی طور پر کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کو گوشت کا شوق پورا کرنے سے منع کرتے ہوئے اس آیت کا حوالہ دیا ہے۔[2]

اس کی توجیہ میں امام بیہقیؒ نے علامہ حلیمیؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"یہ آیت چونکہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ۔

ترجمہ ...... آج تمہیں ذلت والا عذاب دیا جائے گا۔

لیکن اس جیسی صورتحال کا ان مومنین میں بھی خطرہ ہو سکتا ہے جو جائز اچھے کھانوں میں منہمک ہیں اس لئے کہ جو شخص ان کا عادی ہو جاتا ہے اس کا نفس دنیا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ خواہشات اور لذتوں میں پھنس کر رہ جائے، جب ایک خواہش میں نفس کی بات مانے تو وہ دوسری خواہش لے کر کھڑا ہو جائے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ اس کیلئے کسی بھی خواہش کے معاملے میں نفس کی مخالفت ممکن نہ رہے اور اس کے لئے عبادت و بندگی کا راستہ بند ہو جائے۔ جب یہ صورتحال ہو جائے گی تو یہ شخص بھی اس آیت کا مصداق بن جائے گا اور اسے بھی یہ کہا جائے گا کہ تم نے اپنی لذتیں دنیوی زندگی میں حاصل کر لیں اور ان سے فائدہ اٹھالیا (اور اس انہماک کی وجہ سے آخرت کے لئے کچھ نہیں کیا) لہٰذا آج تمہیں رسوا کن عذاب چکھایا جائے گا۔ لہٰذا یہ اچھی بات نہیں کہ نفس کو ابتداء میں تو ایسی باتوں کو عادی بنالیا جائے جس سے وہ حرص میں مبتلا ہو جائے پھر اسے قابو کرنا مشکل ہو جائے، اس کی بجائے شروع ہی سے اسے میانہ روی کی مشق کرانی چاہئے، اس لئے کہ یہ آسان ہے اس سے کہ پہلے تو اسے بگاڑ کا عادی بنا لیا جائے، پھر اسے اصلاح کی طرف لانے کے لئے مشقت اٹھانا پڑے۔"[3]

---

(۱) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۵۵ ...... (۲) دیکھئے! طلب لذت کی ناپسندیدگی کے دلائل میں سلسلہ نمبر ۷ ...... (۳) شعب الایمان ج ۵/ ص ۳۵، الترغیب والترہیب ج ۴/ ص ۲۰۳

نوٹ...... شعب الایمان کے مطبوعہ نسخے میں کچھ اغلاط ہیں اس لئے یہ ترجمہ الترغیب والترہیب کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔

لیکن تقلیل لذات کا یہ مجاہدہ بھی بعض اوقات حدود اعتدال سے نکل کر ہندوانہ جوگیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس سے بچنے کے لئے درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱)......... یہ بات ذہن میں اچھی طرح مستحضر رہے کہ ان لذتوں کا ترک محض معالجہ کے طور پر ہے، شریعت میں بذات خود مقصود اور کوئی کمال نہیں ہے، امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

لم ینقل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ امتنع عن طعام لاجل طیبہ قط۔[۱]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے کبھی کسی کھانے کا انکار محض اس کے لذیذ ہونے کی وجہ" سے فرمایا ہو۔"

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر لذتوں کا چھڑانا شریعت میں بذات خود مقصود ہوتا تو غلبہ شہوت کی ایسی صورت میں جبکہ گناہ میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو صرف روزے سے اس تقاضے کو دبانے کا حکم دیا جاتا جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جائز طریقے سے اس تقاضے کو پورا کرنے کی صورت تجویز کرتے ہوئے نکاح کا حکم دیا، مالی حالات کی وجہ سے اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں بکثرت روزے رکھنے کا امر فرمایا اس لئے ترک لذات کو مقصود بالذات سمجھ لینا بہت بڑی جہالت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندو جوگیوں اور اس طرح کے دوسرے وحی الٰہی کی روشنی سے عاری اہل ریاضت کے ہاں نفس کو مارنا مقصود ہے جبکہ شریعت کا منشا اسے مارنا نہیں بلکہ مہذب بنانا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنا، حلال لذتوں میں بہت زیادہ انہماک و تکلف سے گریز ہی کافی ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بعض لذات کے ترک کا اہتمام صرف مخصوص حالات میں معالجہ کی نیت سے ہی کیا جا سکتا ہے، اسے مقصود شریعت سمجھ لینا اس کو بدعت کی حدود میں داخل کر سکتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے تو اس بات پر یہاں تک زور دیا ہے کہ بعض صوفیہ کے غلبہ محبت الٰہی کی وجہ سے لذات سے عدم التفات کو بھی سنت قرار نہیں دیا، آپ فرماتے ہیں: بعض اوقات اس وجہ سے لذات متروک ہو جاتی ہیں کہ غلبہ محبت الٰہی میں لذات کی طرف التفات نہیں رہتا، سو یہ ترک غیر اختیاری ہے، نہ سنت ہے نہ بدعت۔[۲]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض صوفیہ کی مذکورہ کیفیت بھی عدم اہتمام لذت ہے نہ کہ اہتمام ترک لذت۔

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن ج ۷/ ص ۱۹۸...... (۲) شریعت و طریقت ص ۷٦

(۲)..........جب یہ طے ہو گیا کہ لذات کا یہ ترک بذات خود مقصود نہیں صرف ایک علاج ہے جو بوقت ضرورت شدیدہ اختیار کیا جاسکتا ہے تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس ترک کا اہتمام صرف اسی صورت میں کرنا چاہئے جبکہ متعلقہ مفاسد سے بچنے کا اور راستہ نہ ہو، متبادل راستہ موجود ہوتے ہوئے کسی حلال کے ترک کا اہتمام مناسب نہیں۔اس کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ غلبہ شہوت اور اندیشہ معصیت کی صورت میں پہلے نکاح کا حکم ہے،اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں کثرت صوم کا۔

دوسری دلیل حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااور عرض کیا کہ جب میں گوشت کھاتا ہوں تو طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور شہوت کا غلبہ ہو جاتا ہےاس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔** ’’اے ایمان والو!تم ان اچھی چیزوں کواپنے اوپر حرام مت کروجو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں۔‘‘ (۱)

اس روایت کا سیاق بظاہر یہی بتارہا ہے کہ یہ شخص گوشت کو بطور مسئلہ شرعیہ اپنے اوپر حرام نہیں سمجھتا تھا بلکہ گناہ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اس نے گوشت نہ کھانے کا اپنے اوپر التزام کر لیا تھا جیسا کہ روایت کے الفاظ **فحرمت اللحم علی نفسی** اس پر دال ہیں۔اس کے اسی ذاتی قسم کے التزام کو بھی پسند نہیں کیا گیا،اس سے معلوم ہوا کہ سد ذریعہ کی بھی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں،یہ نہیں کہ جس چیز کے بھی ذریعہ حرام بننے کا امکان پیدا ہو جائے اس سے بچنے کا پورا اہتمام شروع کر دیا جائے اگرچہ اس مفسدہ سے بچنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو۔

(۳)..........ترک یا تقلیل لذات کے مذکورہ مجاہدے میں اس بات کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے کہ اس قسم کی کوئی پابندی اپنی مرضی سے نہ ہو بلکہ کسی شیخ کامل کی تجویز کے مطابق ہو۔جس طرح جسمانی صحت کے حصول کے لئے بعض اچھی غذاؤں سے پرہیز بھی ناگزیر ہوتی ہے لیکن کامل طبیب سے پوچھے بغیر پرہیز کا سلسلہ مفید ہونے کی بجائے سوء تغذیہ وغیرہ کا باعث بن کر الٹا مضر بھی ہو سکتا ہے۔اسی طرح روحانی علاج کے لئے بھی پرہیز کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج تبھی حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ طبیب روحانی کی تجویز اور مشورے سے ہو۔یہ بات شرعی و عقلی اصولوں کی روشنی میں بالکل واضح ہونے کے علاوہ اوپر ذکر کردہ روایت سے بھی سمجھ میں آتی ہے۔گوشت سے پرہیز کا التزام کرنے والے کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے اوپر یہ پابندی محض اپنی ذاتی رائے سے عائد کر لی تھی۔

---

(۱) اخرجه الترمذی وحسنه وابن جریر وابن ابی حاتم وابن عدی فی الکامل والطبرانی وابن مردویه (الدر المنثور ج۲/ص۳۰۷ واحکام القرآن للجصاص ج۲/ص۴۵۲

اسلام کا فلسفہ آداب

ہر جاندار چیز اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کھانے پینے جیسی سرگرمیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے لیکن ایک انسان اور عام حیوان میں یہ فرق ہے کہ حیوانات اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں کسی خاص ضابطے یا اصول کے پابند نہیں۔ جیسے اور جہاں سے دل چاہتا ہے کھاتے اور پیتے ہیں جبکہ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ ڈھب اور سلیقے سے کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ملت میں زندگی کی تمام سرگرمیوں کے لئے کچھ رسوم و آداب مقرر ہیں جو ان سرگرمیوں کو ان کے تصور کے مطابق مذہب اور اس قوم و ملت کے بنیادی اقدار و نظریات کا عکاس بناتے ہیں۔ انسان کے اسی فطری تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے بھی عبادات کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ جیسی اجتماعی و سماجی تقریبات سے لے کر کھانے پینے جیسی انفرادی ضروریات کو پورا کرنے تک تمام شعبہ ہائے زیست کے لئے کچھ قواعد اور آداب مقرر فرمائے ہیں تاکہ ان سرگرمیوں سے صرف ضروریات زندگی پورا کرنے، کام و دہن کی لذت یا خواہشات کی تسکین کا ہی فائدہ حاصل نہ ہو بلکہ ان میں سلیقہ مندی اور تہذیب پیدا کی جائے اور انہیں مقاصد شریعت کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔

مسند الہند حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مختلف اقوام نے ان رسوم و آداب کے لئے مختلف چیزوں کو بنیاد بنایا ہے۔ بعض نے طبعی سائنس پر ان کی بنیاد رکھی اور تجربے اور طب کی رو سے مفید طریقوں کو اختیار کرلیا اور مضر کو چھوڑ دیا۔ بعض نے اپنی ملت کے دیئے ہوئے "قوانین احسان" یعنی اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے والی اقدار کو بنیاد بنایا اور بعض اقوام نے اپنے بادشاہوں، حکماء و مفکرین یا عبادت گزاروں کی مشابہت کو اس معاملے میں اصل قرار دیا، بعض نے ان کے علاوہ اور بنیادوں پر ان رسوم و آداب کی عمارت کو استوار کیا، ان میں مفید پہلو بھی ہیں اور مضر بھی اور بعض ایسے بھی ہیں جو نفع و ضرر دونوں سے خالی ہیں۔ ان پہلوؤں کی تحقیق و تنقیح ان مصالح کا حصہ ہے جن کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے چھ ایسے اصول ذکر فرمائے ہیں جن پر عموماً یہ اسلامی آداب مبنی ہوتے ہیں۔ احادیث نبویہ میں غور کرنے سے کچھ اور اصول بھی سمجھ میں آتے ہیں، ذیل میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ذکر کردہ اصول مزید اضافات کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں۔ ان کا ذہن میں رہنا انشاء اللہ تفصیلی آداب کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

(۱)..........شاہ صاحب فرماتے ہیں: ان کاموں (کھانے، پینے، پہننے وغیرہ) میں مشغولی اللہ کی یاد بھلا دیتی اور

دل کی صفائی کو خراب کر دیتی ہے۔ غفلت کے اس زہر کا علاج کسی تریاق سے ضروری ہے اور وہ تریاق یہ ہے کہ ان کاموں سے پہلے، ان کے دوران اور ان کے بعد کچھ اذکار مسنون قرار دیئے گئے ہیں جو نفس کو انہی دنیوی دھندوں پر مطمئن ہونے سے روکتے ہیں، اس لئے کہ ان میں ایسا مضمون ہوتا ہے جو منعم حقیقی کو یاد دلاتا اور ذہن کو اس مقدس ہستی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔[1]

(۲)............ ذکر اللہ کے بعد ان آداب کا دوسرا بڑا بنیادی اصول حق تعالیٰ کا شکر ہے۔ اصل میں منشائے شریعت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی کام اور لمحہ ذکر اور شکر سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ ذکر و شکر محض باعث اجر عمل ہی نہیں بلکہ بذات خود لذیذ ترین نعمتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنت جو دار العمل نہیں صرف دار الجزا اور نعمتوں کا مرکز ہے وہاں بھی ذکر و شکر کا سلسلہ جاری رہے گا، وہاں کی تو ہر مجلس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن پر ختم ہوگی، سورۂ یونس میں ہے: وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا قول نقل کیا ہے:

وَقَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحُزْنَ۔ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَکُوْر۔

ترجمہ ...... اہل جنت کہیں گے: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم سے تکلیف و مشقت کو دور کر دیا۔

کھانے پینے میں شکر کی روح پھونکنے کے لئے کئی آداب سکھائے گئے ہیں، ایک تو کھانے کے بعد جو دعائیں سکھائی گئی ہیں جن کی تفصیل حدیث نمبر ؟؟ کے تحت آرہی ہے وہ بھی کلمات شکر پر مشتمل ہیں، پینے کے بعد بھی الحمد للہ کہنا آداب میں سے ہے، کھاتے وقت بیٹھنے میں عبدیت اور تواضع کا انداز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس کے علاوہ جا بجا ایسی تعلیمات دی گئی ہیں جن سے نعمت کی قدر دانی کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ جیسے برتن صاف کرنا، ہاتھ دھونے یا صاف کرنے سے پہلے لگے ہوئے کھانے کے اجزاء چاٹ لینا، گرا ہو لقمہ صاف ہونے کی صورت میں کھالینا وغیرہ

(۳)............ عموماً ذکر و عبادت میں شیطانی وساوس اور دخل اندازی سے بچنے کا اہتمام تو ہوتا ہے لیکن ایک مؤمن کامل کا مطمح نظر چونکہ اپنی پوری زندگی مرضی الٰہی کے مطابق بنانا اور اسے کیفیت احسان سے مزین کرنا ہوتا ہے اس لئے اسے زندگی کے ہر لمحے میں اور ہر موڑ پر ابلیسی سازشوں کے جال اور شیطانی اثرات بد سے محفوظ رہنے کا اہتمام والتزام کرنا چاہئے۔[2] شیطانی اثرات سے حفاظت کے لئے مندرجہ ذیل امور کی تعلیم دی گئی ہے:

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲/ص ۱۷۹......(۲) دیکھئے! اسی باب کی حدیث نمبر ۹

(الف)...... ان مواقع پر ذکر اللہ کا حکم اس لئے دیا گیا کہ شیطان کے خلاف مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار ذکر اللہ ہی ہے، شیطان قلب ذاکر پر وسوسہ اندازی نہیں کرتا۔

(ب)...... شیطان کا سب سے خطرناک وصف ناشکری ہے، وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل) زبانی شکر اور اپنے طرز عمل سے نعمت کی قدر دانی کا انداز شیطانی اثرات کے خلاف دوسرا مؤثر ہتھیار ہے۔

(ج)...... شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: بعض افعال اور ہیئتیں ایسی ہیں جو شیطانی مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں اس طور پر کہ اگر شیاطین کسی کو خواب یا بیداری میں نظر آئیں تو ان افعال اور ہیئات میں سے ان کے اندر کچھ نہ کچھ ضرور ہوں گی، ان ہیئات کے ساتھ متصف ہونا ان سے قرب اور ان کے برے اوصاف کے نفوس میں اثر انداز ہونے کا باعث ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انہیں مصلحت کے مطابق مکروہ یا حرام قرار دے کر ان سے منع کیا جائے جیسے ایک پاؤں میں جوتا پہن کر چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا۔[1]

مذکورہ بالا عبارت میں حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصد ان کاموں سے ممانعت کی حکمت بیان فرمانا ہے جنہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطانوں کا کام یا طریقہ قرار دیا ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے، ایسے کاموں کے ارتکاب میں ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑنا ایک فطری امر ہے اس لئے جب شیاطین والی ہیئت اختیار کی جائے گی تو ان کی بری عادات اور اخلاق بھی انسان میں منتقل ہوں گے۔

دوسرے جب ان جیسی یا ان کی پسندیدہ ہیئت اختیار کی جائے گی تو وہ اسے اپنا بھائی تصور کرنے لگیں گے اور اسے ورغلانے کا داعیہ ان میں شدت اختیار کرلے گا اور اس شخص کو راہ راست سے ہٹانے کی ان میں طمع پیدا ہوگی۔ قطع طمع الشیطان شریعت کا ایک مستقل باب ہے، بہت سے احکام شریعت نے دیئے ہی اس مقصد کے لئے ہیں کہ ان پر عمل کی وجہ سے شیطان کو ابتداء ہی سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ فرض نمازوں سے پہلے سنتوں کے مشروع ہونے کی حکمت بھی فقہاء کے بیان کے مطابق شیطان کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہ مؤمن جب غیر فریضہ کے بارے میں تیرے زیر اثر نہیں آیا تو فرض کے معاملہ میں اسے گمراہ کرنے کا امکان بدرجہ اولیٰ نہیں رہا۔

(۴)......... بعض آداب کا مقصد یہ ہے کہ ان کی وجہ سے کھانے، پینے، پہننے وغیرہ معمولات زندگی اور ان کے وسائل و اسباب میں برکت حاصل ہوتی ہے، مثلاً متعدد احادیث سے کھانے کے شروع میں اللہ کا نام لینے کا ایک فائدہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ باعث برکت ہے۔ کھانا ناپ کر یا تول کر پکانا بھی برکت کا ایک ذریعہ

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲/ص ۱۷۹

ہے، کھانا اکٹھے کھانے سے بھی برکت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ کھانا برتن کے درمیان سے کھانے کی بجائے کنارے سے کھانا چاہئے اس لئے کہ برکت درمیان میں نازل ہوتی ہے۔ (برکت کے مفہوم اور اس کی حقیقت پر تفصیلی روشنی حدیث نمبر ا کی تشریح کے ضمن میں ڈالی جائے گی۔)

(۵)......... بعض آداب کا مقصد انسان کو دنیوی تکلیف، مشقت اور الجھن سے بچانا اور راحت و آرام پہنچانا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے، اس میں دوسری حکمتوں کے علاوہ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ منہ لگا کر پانی پینے سے یکدم پانی کا دباؤ پڑ کر اچھو وغیرہ لگ سکتا ہے یا کم از کم پانی بے قابو ہو کر کپڑوں پر گر سکتا ہے۔ (تفصیل باب الاشربہ کے تحت آ رہی ہے) بیک وقت دو کھجوریں منہ میں ڈالنے سے ممانعت کی ایک حکمت بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یہی بیان فرمائی ہے کہ اس میں بیک وقت دو گٹھلیاں منہ میں آ جانے سے نقصان کا خطرہ ہے۔[1] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کے ہاتھوں کو چکنائی لگی ہوئی ہو وہ اسی حالت میں ہاتھوں کو دھوئے بغیر سو جائے اور اسے کوئی نقصان پہنچ جائے تو صرف اپنی ذات کو ملامت کرے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک اچھا خاصا حصہ ایسا ہے جس کا مقصد اہل ایمان کو دنیوی تکالیف سے بچانا ہے۔

(۶)......... کھانے کے آداب کا ایک بڑا مقصد نظافت و ستھرائی کا اہتمام بھی ہے جو کہ طہارت و پاکیزگی سے بھی اگلا درجہ ہے اس لئے کہ طہارت کا حاصل ایسی چیزوں سے دوری اور اجتناب ہے جنہیں شریعت نے نجس اور ناپاک قرار دیا ہے اور ان کے ہوتے ہوئے عبادت نہیں ہو سکتی جیسے بول و براز وغیرہ اور نظافت کا مقصد ایسی چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرنا ہے جو اگرچہ شرعاً ناپاک نہیں ہیں لیکن انسانی فطرت انہیں گندا اور قابل نفرت سمجھتی ہے، اس مقصد کے لئے دیئے گئے احکام میں سے کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ہے، اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالی کی ٹوٹی ہوئی جگہ پر منہ لگا کر کچھ پینے سے منع فرمایا، اس لئے کہ ایسی جگہ پر عموماً میل کچیل زیادہ جمتی ہے اور دھونے سے بھی جلدی صاف نہیں ہوتی۔

(۷)......... بعض ایسے کاموں سے بھی منع کیا گیا ہے جو اگرچہ طہارت اور نظافت کے خلاف تو نہیں لیکن لطافت ذوق کے خلاف ضرور ہیں۔ ان کی مثال میں دائیں ہاتھ سے کھانے کے حکم اور بائیں ہاتھ کے ساتھ کھانے سے ممانعت کو پیش کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس کی منجملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کو ہاتھ دو قسم کے کاموں کے لئے استعمال کرنا پڑتے ہیں، ایک وہ کام جو گھٹیا اور گھن کے قابل سمجھے جاتے ہیں جیسے ناک صاف کرنا اور استنجاء وغیرہ، دوسرے وہ کام ہیں جو صاف ستھرے سمجھے جاتے ہیں جیسے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ / ص ؟؟

کھانا پینا وغیرہ۔ اب اگر ایک شخص ایک ہاتھ سے مثلاً استنجاء کرتا ہے اور اسی ہاتھ سے کھاتا بھی ہے تو یہ طہارت و نظافت کے خلاف تو نہیں اس لئے کہ اس وقت اس پر کسی نجاست یا گندگی کا کوئی بھی اثر نہیں ہے البتہ یہ بات لطافت ذوق کے خلاف ضرور ہے کہ جس ہاتھ کو پہلے گندگی لگی ہوئی تھی اسی کو کھانے کے لئے بھی انسان استعمال کرے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

کانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیمنی لطھورہ وطعامہ وکانت یدہ الیسری لخلائہ وما کان من اذی۔

ترجمہ ...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ وضو اور کھانے کے لئے مختص تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء اور گندگی والے کاموں کے لئے۔[1]

(۸) .... بعض آداب کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ کھانا سہولت و راحت کی حالت میں دلجمعی کے ساتھ کھایا جائے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کھانا کھاتے وقت جوتے اتار لیا کرو اس لئے کہ اس سے تمہارے قدموں کو زیادہ راحت ملے گی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو برکت اور ایسے ہی چل چلاؤ میں کھالینے کو بے برکتی کا باعث قرار دیا ہے اس لئے کہ تجربہ ہے کہ دوسری صورت میں انسان کا معدہ تو بھر جاتا ہے لیکن طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔[2]

(۹) .... بعض آداب کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کھانے کی لذت و خوشگواری میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس طرح کھانے کی نوع اور اس کی تیاری کے طریقہ کار کا اس کی لذت پر اثر مرتب ہوتا ہے اسی طرح کھانے کے طریقے سے بھی لذت میں فرق آجاتا ہے، اسلئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت چھری سے کاٹ کر کھانے کی بجائے دانتوں سے نوچ کر کھانے کو پسند فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس سے گوشت ہضم بھی آسانی سے ہوتا ہے اور خوشگوار بھی زیادہ لگتا ہے۔

(۱۰) .... بعض آداب کی تعلیم طبی فوائد کی بنیاد پر دی گئی ہے جیسے پانی کو تین سانسوں میں پینے کا حکم! اس کی وجہ حضور اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ اس سے پانی بسہولت ہضم ہوتا ہے اور پیاس بھی جلدی بجھتی ہے۔

(۱۱) .... کھانے کی بعض ہیئات اور طریقوں سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ تہذیب اور سلیقہ مندی کے خلاف ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: اور ان (بنیادی اصولوں) میں سے ایک یہ ہے کہ ایسی ہیئتوں سے بچا جائے جو وقار کے منافی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان ان بدوؤں سے مل جاتا ہے جو نوع انسانی کے احکام میں مشغول نہیں ہیں۔[3]

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۴۲، باب آداب الخلاء...... (۲) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲/ ص ۱۸۵...... (۳) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲/ ص ۹۷۹

(۱۲)........... جہاں شریعت نے کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں بے ڈھنگا پن اور بدویت کو ناپسند کیا ہے وہیں ان امور میں تمدن کے اندر غلو جو تکلف کی حدود میں داخل ہو جائے جیسا کہ اس زمانے میں عجمیوں کا دستور تھا سے بچنے پر بھی زور دیا گیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ان اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عجمی جس ترفہ بالغ اور دنیوی زندگی پر بہت زیادہ مطمئن ہو جانے کے عادی ہیں اس میں ان کی مخالفت اختیار کی جائے، اس صورتحال نے ان کو اللہ کی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور طلب دنیا کو بڑھا کر لذات کو ان کے دلوں میں رچا دیا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ریشم، تصاویر اور سونے چاندی کے برتنوں کی حرمت کو بھی اسی اصول میں داخل فرمایا ہے۔

کھانے کے غیر منصوص آداب:-

سرسری تتبع اور غور سے سمجھ میں آنے والے یہ چند بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے کھانے پینے کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے، جن طور طریقوں سے یہ مقاصد حاصل ہوں گے وہ شرعاً مطلوب ہیں اور جن سے ان مقاصد کی نفی ہوتی ہو وہ شرعاً ناپسندیدہ سمجھے جائیں گے۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ بعض بزرگوں نے کھانے کے کچھ ایسے آداب ذکر فرمائے ہیں جو بظاہر کسی حدیث میں نہیں ملتے مثلاً امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین میں ایسے آداب بکثرت مذکور ہیں ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ آداب اگرچہ صراحتاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں لیکن آپ کی احادیث مبارکہ سے سمجھ میں آنے والے بنیادی اصولوں کے تحت داخل اور آداب منصوصہ کے بنیادی مقاصد کے حصول میں معاون ہیں مثلاً بعض منصوص آداب کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ ان کے ہضم پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں جیسے تین سانس میں پانی پینا، گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھانا وغیرہ، اس سے یہ معلوم ہوا کہ کھانے پینے کا ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے ہضم میں سہولت ہو مقاصد شریعت میں داخل ہے، اسی بنیاد پر امام غزالی وغیرہ نے کھانے کے آداب میں لقمے کو اچھی طرح چبانا لکھ دیا اس لئے کہ اس سے بھی مذکورہ بالا مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ مشکیزے کو منہ لگا کر پینے سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں کئی اعتبار سے نقصان کا خطرہ ہے، اسی کے پیش نظر پینے کے آداب میں یہ بات بھی لکھ دی کہ گلاس منہ کو لگانے سے پہلے ایک دفعہ اسے دیکھ لینا چاہئے لہٰذا ان آداب پر اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ ان کا ذکر صراحتاً کسی حدیث میں نہیں ملتا ناواقفیت کی دلیل ہے جیسا کہ ان آداب کو منصوص آداب (حدیثوں میں صراحتاً مذکور آداب) والی اہمیت دینا حدود سے تجاوز اور غلو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آداب دو طرح کے ہیں: ایک آداب منصوصہ یعنی وہ آداب جن کا ذکر قرآن

وحدیث میں صراحتاً ہے، دوسرے آداب غیر منصوصہ یا آداب مستنبطہ یعنی وہ آداب جو اگرچہ صراحتاً کسی حدیث میں مذکور نہیں لیکن ان کا آداب منصوصہ میں غور کر کے اسی طرح استنباط کیا گیا ہے جیسے عام مسائل فقہ میں قیاس کے ذریعے استنباط ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے قسم کے آداب کی شرعی حیثیت دوسرے قسم کے آداب سے زیادہ ہوگی۔

پھر آداب مستنبطہ بھی دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن سے مقاصد شریعت کا حصول انتہائی واضح ہے، کسی محدود تجربے پر مبنی نہیں ہے جیسے کھانا اچھی طرح چبا کر کھانے سے ہضم میں مدد ملنا، پانی کے گلاس کو دیکھ کر پینے سے احتیاط کا مقصد حاصل ہونا وغیرہ۔ دوسرے وہ آداب جن سے کسی مقصود شریعت کا حصول محدود تجربے پر مبنی ہوتا ہے جیسے امام غزالیؒ نے کھانے کے آداب میں لکھا ہے کہ کھانے کے دوران پانی زیادہ نہ پیے، صرف اس وقت پانی پیے جبکہ لقمہ حلق میں پھنس جائے یا شدید پیاس لگ جائے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے پانی نہ پینے کی صورت میں معدے کو کھانا ہضم کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے اسے معدے کی دباغت قرار دیا ہے۔[1]

ظاہر ہے کہ ایک محدود تجربے کی بنیاد پر کہی گئی بات علاقے یا کھانے کی نوعیت کی تبدیلی سے بدل بھی سکتی ہے۔ بعض حالات میں پانی وغیرہ سے معدے میں برودت کا پیدا کرنا انہضام میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے، بعض کھانے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں خود تیزی ایسی ہو کہ معدے کو ٹھنڈی چیز کی ضرورت ہو، اس میں اطباء کی تحقیقات مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔

دوسری قسم کے آداب کو اگر محض مفید تجربے کے طور پر قبول کر لیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں اگرچہ وہ حدیث سے ثابت نہ ہوں، اس حیثیت سے اس طرح کے آداب ایسی شخصیات سے بھی ثابت ہیں جن کا حدیث میں تثبت اور پختگی مشہور و معروف ہے مثلاً امام احمدؒ ناخن الٹا کاٹنے کو پسند فرماتے تھے اس لئے کہ یہ آنکھ دکھنے کی بیماری سے حفاظت کے لئے مفید ہے۔ ناخن الٹی ترتیب سے کاٹنے کا ایک طریقہ معروف محدث حافظ عراقیؒ نے بھی ذکر فرمایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ میں نے اسے رمد (آنکھ دکھنا) سے حفاظت کے لئے مجرب پایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی وضاحت فرمادی کہ اس معنی میں جو حدیث ذکر کی جاتی ہے وہ بے اصل ہے۔[2]

---

(۱) احیاء العلوم مع اتحاف السادۃ المتقین ج ۵ / ص ۲۱۹

(۲) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۲۲۸، حافظ عراقی کی ترتیب یہ ہے: پہلے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پھر چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی، پھر انگوٹھا، پھر درمیانی بڑی انگلی، پھر چھوٹی انگلی، پھر بائیں ہاتھ کی انگلیاں اسی ترتیب سے، پھر دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی، پھر درمیانی، پھر انگوٹھا، پھر چھوٹی کے ساتھ والی انگلی، پھر انگوٹھے کے ساتھ والی، اس کے بعد بائیں پاؤں کا انگوٹھا، پھر درمیان والی، پھر چھوٹی انگلی، پھر انگوٹھے کے ساتھ والی، پھر چھوٹی انگلی کے ساتھ والی۔

لیکن عوام کے لئے چونکہ حدود شرعیہ اور فرق مراتب کا خیال رکھنا مشکل ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان کے سامنے آداب بیان کرتے ہوئے اس قسم کے آداب کا ذکر نہ کیا جائے، اگر کرنا بھی ہو تو حقیقت حال کی پوری وضاحت کر دینی چاہئے۔

ارشادی آداب اور تشریعی آداب:-

پھر کچھ آداب کی تعلیم اس لئے دی ہے کہ وہ بذات خود شریعت میں مقصود ہیں اور ان سے انسان کے دین میں براہ راست ترقی اور درجات میں اضافہ ہوتا ہے جیسے کھانے اور پینے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا، کھانے کے بعد مخصوص دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، کھانے کی ناقدری والے کاموں سے بچنا وغیرہ اور بعض آداب کی تعلیم محض امت کو کسی دنیوی فائدے کے حصول یا کسی دنیوی ضرر سے بچانے کے لئے دی گئی ہے وہ براہ راست دینی ترقی کا ذریعہ نہیں اگرچہ بالواسطہ طور پر ان سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جیسے جوتا اتار کر کھانے کا حکم، گوشت کا چھری سے کاٹ کر کھانے کی بجائے دانتوں سے نوچ کر کھانے کا حکم، پیلو کا پھل کھانا ہو تو کالا کالا چن کر کھانا۔ پہلی قسم کے آداب کو آداب مقصودہ یا آداب تشریعیہ کہہ سکتے ہیں اور دوسری قسم کے آداب ارشادی آداب کہلاتے ہیں۔ پہلی قسم کے آداب دین کے باقاعدہ مسائل ہیں اور ان کا کرنا کار ثواب ہے۔ ان کے ترک پر اگرچہ کوئی گناہ نہیں لیکن یہ دین کی زینت اور چاشنی میں کمی کا باعث ضرور ہے۔ دوسری قسم کے آداب پر عمل کرنے سے ایک تو مطلوبہ فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ جس کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی ہے یا خاص نقصان سے محفوظ ہو جائے گا جو اس ادب کی حکمت ہے۔ دوسرے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و اطاعت کی نیت سے یہ کام کرنا باعث برکت و سعادت بھی ہوگا۔ اس نیت کی وجہ سے ایمان اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ترقی بھی ہوگی لیکن ان کا ترک اس طرح کی محرومی اور دینی نقصان کا باعث نہیں جس طرح کا پہلی قسم کے آداب کا ترک۔

اسلام میں آداب کی اہمیت اور ان کا صحیح مرتبہ و مقام:-

پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ جس طرح دنیا کے ہر دھرم، تہذیب اور مذہب میں انسانی زندگی کو باسلیقہ اور اپنی اقدار سے ہم آہنگ بنانے کے لئے آداب کی تعلیم کی گئی ہے اسی طرح اسلام نے بھی انتہائی اعلیٰ وارفع مقاصد کے حصول اور مسلمان کے دین اور دنیا کو سنوارنے کے لئے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق آداب سکھائے ہیں، کھانے پینے کے آداب کے بنیادی اصول و مقاصد پہلے بیان ہو چکے ہیں، ان میں سرسری غور

کرنے سے ہی اسلامی آداب کی اہمیت وضرورت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

آداب کے بارے میں عام طور پر دو غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ آداب کے حق میں تفریط سے کام لیتے ہیں اور یہ سوچ کر کہ یہ فرض وواجب تو ہیں نہیں ان کی عادت بنانے کی فکر نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات ان کے اہتمام کو فضول کام سمجھنے لگ جاتے ہیں، یہ نقطہ نظر درست نہیں اس لئے کہ بیشتر آداب کی حیثیت اگرچہ فرض وواجب کی نہیں لیکن یہ دین کے لئے زینت کا باعث اور اس میں چاشنی پیدا کرنے کا ذریعہ ضرور ہیں جس طرح لباس میں ضروری درجہ تو صرف بدن ڈھانپنا ہے لیکن عملاً اس ضروری درجے کے حصول کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہر شخص کسی نہ کسی درجے میں زینت کا اہتمام بھی ضرور کرتا ہے، کم از کم لباس میں بالکل بے ڈھنگا پن پسند نہیں کرتا، اگر شلوار قمیص بالکل مختلف رنگ کی ہوں، ان میں کوئی میچنگ اور مناسبت نہ ہو تب بھی لباس کا بنیادی مقصد اور ضروری درجہ حاصل ہے لیکن لباس کی خوشنمائی جاتی رہی، ایسا لباس پہن کر اس شخص کا اپنا جی خوش ہو گا، نہ دوسروں کا، کھانے کا بنیادی مقصد غذائیت کا حصول ہے، یہ مقصد پاک بے مزہ یا بدمزہ یا بے ڈھنگے انداز سے برتن میں ڈالے ہوئے کھانے سے بھی حاصل ہو جائے گا لیکن اس صورت میں کھانے کا صحیح لطف برقرار نہیں رہے گا اور بالواسطہ اس کا اثر کھانے کے بنیادی مقصد پر بھی مرتب ہو گا اس لئے کہ ایسی صورت میں کھانا اچھی طرح نہیں کھایا جائے گا اور مطلوبہ غذائیت جسم کو حاصل نہیں ہو گی۔

یہی حال اسلامی آداب کا ہے، ان سے انسانی زندگی کو زینت ملتی اور دین کی حلاوت نصیب ہو کر اس میں ترقی ہوتی ہے۔ صرف فرائض اور واجبات پورا کرنے والا اور آداب کا اہتمام نہ کرنے والا دین کی چاشنی سے محروم رہتا ہے، اس کے دین میں روکھا سوکھا پن ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے دین میں زیادہ ترقی نصیب نہیں ہوتی اور بالواسطہ طور پر اس کا اثر بعض اوقات فرائض وواجبات اور حلال وحرام پر بھی مرتب ہو جاتا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ سستی وکاہلی اور شرعی پابندیوں سے جی چرانا انسانی طبیعت کا ایک حصہ ہے، آداب وسنن کا اہتمام ایک بند ہے جو فرائض اور واجبات کو طبعی سستی وکاہلی کے سیلاب سے تحفظ فراہم کرتا ہے، ایسی صورت میں انسانی طبیعت پر مذکورہ سستی کا غلبہ ہو بھی تو اس کا اثر آداب وسنن تک محدود رہتا ہے، اگر آداب وسنن کا اہتمام ہی نہ ہو تو اگرچہ سستی وغیرہ طبعی تقاضوں کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے فرائض و واجبات میں کوتاہی سے بچنا ممکن ہوتا ہے لیکن عملاً عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ مذکورہ طبعی تقاضے غالب آ کر انسان کو یا تو فرائض کے اندر کوتاہی میں مبتلا کر دیتے ہیں یا یہ شخص کسی ناجائز کام کا مرتکب ہو جاتا ہے اس لئے سنن وآداب کا اہتمام دینداری کے تحفظ کا اہم ذریعہ ہے۔

دوسری طرف بعض لوگ آداب کے معاملے میں غلو اور افراط میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ بھی درست نہیں بلکہ دین کے ہر جز کو اس کے صحیح مرتبہ و مقام پر رکھنا ضروری ہے۔ آداب کے معاملے میں غلو اور افراط سے بچنے کے لئے درج ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(۱)........... آداب کے بارے میں ذخیرہ حدیث میں غور کرنے سے جو بات سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان کی ترغیب دی ہے اور خود بھی انہیں اپنایا ہے لیکن ان کے لئے آپ نے بہت زیادہ تکلف سے کام نہیں لیا، جہاں بسہولت آداب کی رعایت ممکن ہوئی آپ نے فرمالی لیکن جہاں کوئی عذر اس میں رکاوٹ بنا وہاں آپ نے ان آداب کے لئے زیادہ مشقت اٹھانا اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا پسند نہیں فرمایا، کسی سستی و کاہلی یا سہل انگاری کی وجہ سے نہیں بلکہ آداب کا صحیح مرتبہ و مقام پیش نظر ہونے کی وجہ سے اور دوسروں پر حقیقت واضح کرنے کے لئے۔

ایسی بہت سے مثالیں ملتی ہیں جہاں آپ نے معمولی نظر آنے والے اعذار کی وجہ سے کسی ادب کو چھوڑ دیا۔ پانی پینے کے آداب میں سے ہے کہ بیٹھ کر پیا جائے، اسی طرح مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پینے سے بھی آپ نے منع فرمایا ہے لیکن ترمذی میں حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضور اقدس ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ایک لٹکتے ہوئے مشکیزے کو منہ لگا کر آپ نے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا۔[1]

وجہ یہ تھی کہ یہاں پانی نکال کر پینے کے لئے برتن مہیا کرنا بسہولت ممکن نہیں تھا اس لئے آپ نے مشکیزے ہی کو منہ لگا کر پانی نوش فرمالیا، اسی طرح آپ نے بیٹھ کر پینے کے لئے لٹکے ہوئے مشکیزے کو نیچے اتارنے کے تکلف کی ضرورت بھی محسوس نہیں فرمائی۔

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا بھی آدابِ طعام میں سے ہے اور احادیث سے ثابت ہے لیکن کتاب الاطعمہ ہی کے اندر ایسے بہت سے واقعات آئیں گے جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے کھانا کھایا لیکن کھانے سے پہلے یا بعد میں ہاتھ نہیں دھوئے گئے، وجہ یہ تھی کہ اس ماحول میں پانی مہیا کرنا اور ہاتھ دھونے کا بند و بست کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تھا لیکن مشکل ضرور تھا۔

(۲)........... آداب کے اہتمام کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف میں ڈالنا یا ایسا انداز اختیار کرنا جس سے کسی کی سبکی کا امکان ہو غلو میں داخل اور ناجائز ہے۔ ثقہ روایت سے سننے میں آیا ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کچھ احباب کے ساتھ ایک دعوت میں تشریف لے گئے جس میں ایک مولانا صاحب جو آداب کا بہت زیادہ اہتمام فرمانے والے تھے بھی شریک تھے، کھانا چنا گیا

---

(۱) مشکوۃ ص ۳۷۱، باب الاشربہ

اور سب حضرات نے کھانا شروع فرمادیا لیکن وہ مولانا زور سے بول اٹھے کہ میرے ہاتھ دھلوائے جائیں، میں تو ہاتھ دھوئے بغیر کھانا شروع نہیں کروں گا، اس پر حضرت رحمہ اللہ نے اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہاتھ دھونا جو محض ایک ادب ہے اس کا تو آپ نے خیال رکھا لیکن اس کے ساتھ کئی گناہوں میں مبتلا ہو گئے، ایک تو صاحب خانہ کی تحقیر ہوئی کہ انہوں نے ہاتھ دھونے کا بندوبست نہیں کیا، دوسرے ممکن ہے کہ اس کا انتظام صاحب خانہ کے لئے کسی وجہ سے مشکل اور دقت کا باعث ہو، ہاتھ دھونے کا مطالبہ کر کے انہیں ایک تکلیف میں مبتلا کر دیا، مسلمان کی تحقیر و تذلیل اور تکلیف دہی دونوں حرام اور گناہ ہیں، اس کے علاوہ اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس ادب کا صرف مجھے اہتمام ہے، باقی حاضرین مجلس اس میں کوتاہ ہیں۔

(۳)............ جو شخص کسی ادب کا اہتمام یا اس پر عمل نہیں کرتا تو اس پر اس کے سامنے یا اس کی عدم موجودگی میں اعتراض کرنا بھی غلو کا ایک حصہ ہے، البتہ تربیت کے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں۔

كتاب الأطعمة

الفصل الاوّل

(۱)-----عن عمر بن ابی سلمة قال: كنت غلامًا فی حجر رسول الله صلی الله علیه وسلم وكانت یدی تطیش فی الصحفة، فقال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم: سم الله وكل بیمینك وكل مما یلیك۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں آنحضرت ﷺ کی پرورش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ برتن میں گردش کر رہا تھا تو آپ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ بسم اللہ پڑھو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنی سمت سے کھاؤ۔[1]

تشریح ...... "غلامًا" پیدائش سے بالغ ہونے تک بچے کو غلام کہا جاتا ہے چنانچہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نابالغ ہی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔

"حجر" اس لفظ کے کئی معنی ہیں، یہاں یہ لفظ پرورش اور تربیت کے معنی میں ہے۔

"الصحفة" بڑا برتن جس میں عموماً پانچ افراد کھانا کھا سکتے ہوں۔

اس حدیث میں کھانے کے تین آداب بیان فرمائے گئے ہیں:

(۱)...... کھانا کھاتے وقت اللہ کا نام لینا۔

(۲)...... دائیں ہاتھ سے کھانا۔

---

(۱) قال الحافظ: قوله: فی حجر رسول الله صلی الله علیه وسلم بفتح الحاء المهملة وسكون الجیم ای فی تربیته وتحت نظره وانه یربیه فی حضنه تربیة الولد، قال عیاض: الحجر یطلق علی الحضن وعلی الثوب فیجوز فیه الفتح والكسر واذا ارید به معنی الحضانة فبا لفتح لا غیر فان ارید المنع من التصرف فبالفتح فی المصدر وبالكسر فی الاسم لا غیر۔(فتح الباری ج۹/ص ۵۲۲)

قال ابن منظور: والصحفة كالقصعة .... وهی تشبع الخمسة ونحوهم والجمع صحاف وفی التنزیل: یطاف علیهم بصحاف من ذهب .... والصحیفة اقل منها وهی تشبع الرجل وكانه مصغر لا مكبر له، قال الكسائی: اعظم القصاع الجفنة ثم القصعة تلیها تشبع العشرة ثم الصحفة تشبع الخمسة، ونحوهم ثم الملكلة تشبع الرجلین والثلاثة ثم الصحیفة تشبع الرجل، اقول: وبه ظهران ما قال الحافظ: والصحفة ما تشبع الخمسة ونحوهم وهی اكبر من القصعة۔ (فتح الباری ج۹/ص ۵۲۲) فیه نظر۔

(۴)......اپنی جانب سے کھانا۔

یہاں ان آداب کی قدرے تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا

اللہ کا نام لینے میں حکمتیں اور فوائد:۔

کھانے یا پینے کے شروع میں اللہ کا نام لینے سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں، مثلاً:

(۱)..........اللہ کا ذکر ہو جاتا ہے اور ذکر اللہ کی توفیق بذات خود مؤمن کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔[۱]

(۲)..........اللہ کا نام لینا شکر کا ایک شعبہ ہے گویا اس میں بندے کا یہ اعتراف مضمر ہوتا ہے کہ کھانے یا پینے کے لئے جو کچھ مجھے ملا ہے وہ میرے اپنے کسی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ منعم حقیقی کا محض فضل و احسان ہے، اس کے برعکس اللہ کا نام لئے بغیر کھانا پینا شروع کر دینا اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کے دل میں اس نعمت کی خاص قدر نہیں ہے۔ کنز العمال میں حضرت عبداللہ بن یسر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم فارس اور روم کی زمینیں فتح کرو گے اور کھانے کی کثرت ہوگی جس کی وجہ سے کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جائے گا۔[۲] یعنی فراوانی کی وجہ سے کھانے کی قدر نہیں رہے گی جس کی وجہ سے اللہ کا نام لینا بھی یاد نہیں رہا کرے گا۔

(۳)..........اللہ کا نام لینے کی برکت سے کھانا شیطانی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔[۳]

(۴)..........ذکر اللہ سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے، آج کے مادی دور نے جس میں ہر چیز کو مادی پیمانوں سے ناپا جاتا ہے، ہمیں برکت کی حقیقت سے ناآشنا بنا دیا اور اس کی اہمیت و ضرورت کو دھندلا دیا ہے، آج جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاں کام کرنے سے برکت حاصل ہوگی تو یہ جملہ ہماری طبیعت میں عموماً ذرا سی جنبش اور اٹھان پیدا نہیں کر پاتا، اس لئے کہ ہماری نظروں میں "برکت" تقریباً ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے برکت کے مفہوم پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ برکت سے متعلق احادیث کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

---

(۱) مزید دیکھئے! "اسلام کا فلسفہ آداب" کے زیر عنوان نمبر ا

(۲) کنز العمال ج ۱۵/ ص ۲۵۰ حدیث نمبر ۴۰۸۱۰، حدیث کی سند کی تحقیق نہیں کی گئی۔

(۳) شیطانی اثرات کی تفصیل حدیث نمبر ۳ کے تحت آئے گی۔

برکت کا مفہوم:-

مشہور لغوی ابن منظور نے برکت کے درج ذیل معانی ذکر کئے ہیں:

(۱)..........**النماء والزیادة**۔ کسی چیز کی بڑھوتری اور اضافہ۔

(۲)..........سعادت و نیک بختی، فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا تھا: **رَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ**۔[1] فراء نے برکات کی تفسیر سعادات سے کی ہے۔

(۳)..........دوام و پائیداری، درود شریف میں جو آتا ہے: **بارك على محمد**۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ابن منظور فرماتے ہیں: **ای اثبت له وادم ما اعطیته من التشریف والکرامة**۔ عربی زبان میں **برك البعیر** کا معنی ہوتا ہے اونٹ کا کسی جگہ جم کر بیٹھ جانا اور جلدی نہ اٹھنا، عربی میں **بركة** حوض کو کہتے ہیں اس لئے کہ اس میں پانی دیر تک کھڑا رہتا ہے۔

(۴)..........برکت کا ایک معنی ہر خیر میں کثرت بھی ہے: **ابترکت السحابة** کا معنی ہوتا ہے بادلوں کا خوب برسنا۔

برکت کا صحیح اور مربوط مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے یہاں دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں، ایک حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا اور دوسرا شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا، یہ دونوں اقتباسات اگرچہ کچھ طویل ہیں لیکن ان سے انشاء اللہ برکت کا مفہوم اور اس کی اہمیت و ضرورت سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''برکت میں یہ بات داخل ہے کہ دل سیر ہو جائے، آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، دلجمعی حاصل ہو اور آدمی ایسا لالچی نہ بنے کہ کھاتا تو رہے لیکن جی نہ بھرے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض دو آدمیوں میں سے ہر ایک کے پاس سو سو درہم ہوتے ہیں لیکن ایک شخص ایسا ہے جسے ہر وقت فقر کا کھٹکا لگا رہتا ہے، لوگوں کے اموال کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنا مال ایسی جگہ خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جہاں اسے دین یا دنیا کا فائدہ پہنچے اور دوسرا شخص طمع و لالچ اور سوال سے بچنے والا ہے، ناواقف شخص اسے غنی سمجھتا ہے، یہ شخص اپنی معیشت میں میانہ روی اختیار کرتا ہے، پس دوسرے شخص کو اس کے مال میں (تھوڑا ہونے کے باوجود) برکت دی گئی ہے اور پہلا شخص برکت سے خالی ہے۔''

اب سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے ایک طویل مضمون کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

---

(۱) سورۃ الھود: ۷۳

''اس دنیا میں راحت و آرام کے جتنے مادی وسائل کی تلاش میں ہم دن رات سرگرداں ہیں، وہ راحت و آرام کے وسائل واسباب ضرور ہیں لیکن بذات خود راحت و آرام نہیں ہیں۔ وہ روپیہ پیسہ ہو، زمین جائیداد ہو، کوٹھی بنگلے ہوں، نوکر چاکر ہوں، کاریں اور ہوائی جہاز ہوں، بیوی بچے اور عزیز رشتہ دار ہوں یہ سب چیزیں راحت و آرام یا سکون واطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ تو ہیں لیکن ان میں لازمی طور پر ہمیشہ آرام پہنچانے اور سکون عطا کرنے کی بذات خود طاقت نہیں ہے لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو یہ تمام چیزیں میسر ہوں اسے ہر حال میں ان کا آرام ضرور نصیب ہو۔ کتنے لوگ ہیں جن کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل ہے، جو عالیشان کوٹھیوں میں رہتے اور پرشکوہ کاروں میں سفر کرتے ہیں لیکن ان تمام اسباب راحت کے باوجود ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو انہیں آرام و سکون میسر نہیں، وہ کسی ایسے کرب میں مبتلا ہیں جس نے مال و دولت کے ان تمام مظاہر کو ان کے حق میں بیکار بنا کر رکھ دیا۔ ایک شخص کے دستر خوان پر انواع واقسام کے قیمتی کھانے چنے ہوئے ہیں، تازہ اور لذیذ پھلوں کا انتخاب مہیا ہے، صاف ستھرے برتن سجے ہوئے ہیں، ماحول پرکیف خوشبو سے معطر ہے تو لذت کے سارے اسباب بظاہر موجود ہیں لیکن اگر اس کا معدہ خراب ہے تو لذت کے یہ سارے اسباب مل کر بھی اسے لذت عطا نہیں کر سکتے یا اگر معدہ بھی ٹھیک ہے لیکن کوئی شدید ذہنی پریشانی لاحق ہے جس نے بھوک اڑا رکھی ہے تو یہ تمام لذیذ کھانے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور اسے لذت کی نعمت عطا نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف ایک محنت کش مزدور یا کسان ہے، وہ چار پانچ گھنٹے کی مشقت اٹھانے کے بعد جب کھانے کے لئے اپنی گٹھڑی کھولتا ہے تو بظاہر اس میں صبح کی پکی ہوئی معمولی ساگ روٹی ہے لیکن اس کا معدہ صحت مند اور اس کی بھوک بھرپور ہے، اسے یقیناً اسی بھوک کے عالم میں ساگ روٹی سے وہ لذت حاصل ہو جاتی ہے جو بیمار معدے کے دولت مند شخص کو انواع واقسام کے کھانوں میں نصیب نہ ہو سکی، پھر جب رات کے وقت وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنی کھردری چارپائی پر پہنچتا ہے تو نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہیں اور وہ اس ننگی چارپائی پر لیٹتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر صبح کو چاق و چوبند اٹھتا ہے، اس کے پاس نہ مسہری تھی، نہ گداز بستر تھا، نہ ائیر کنڈیشنڈ کمرہ تھا، نہ روم اسپرے کی مہک تھی لیکن اس کھردری چارپائی پر بھی اسے وہ راحت میسر آگئی جو اس دولت مند کو ائیر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں بھی میسر نہیں آئی تھی۔

اس قسم کی دسیوں مثالیں روزمرہ ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن میں ایک شخص لذت اور راحت سے محروم ہوتا ہے اور دوسرا شخص بہت معمولی ساز و سامان کے باوجود اس سے کہیں زیادہ ذہنی سکون اور اطمینان سے سرشار۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں راحت و آرائش کے جتنے وسائل ہیں ان سے

واقعتاً لذت اور راحت حاصل ہونا کچھ ایسے عوامل پر موقوف ہے جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں۔ انسان روپیہ خرچ کر کے راحت کے اسباب تو خرید سکتا ہے لیکن وہ عوامل پیسے سے نہیں خریدے جاسکتے جن کی وجہ سے ان اسباب میں حقیقی راحت و آرام عطا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان دن رات ایک کر کے دولت کما سکتا ہے، بنگلے بنا سکتا ہے، کاریں خرید سکتا ہے، ملیں کھڑی کر سکتا ہے لیکن ان چیزوں سے حقیقی لطف اور واقعی آرام حاصل کرنے کے لئے جو صحت درکار ہے، جن پر سکون گھریلو تعلقات کی ضرورت ہے اور جو ذہنی سکون ناگزیر ہے وہ نہ تو روپے پیسے کے بل پر حاصل کیا جاسکتا ہے نہ اسے کوئی مشین تیار کر سکتی ہے، وہ کلی طور پر انسان کی حدود اختیار سے ماوراء ہے، وہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس عطا میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اگر چاہے تو یہ چیزیں عطا کر کے پھونس کے جھونپڑے کو جنت بنادے اور اگر چاہے تو یہ چیزیں سلب کر کے عالیشان محل کو انگاروں کے فرش میں تبدیل کردے۔

"اللہ تعالیٰ کی یہ عطا جو بلاشرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اسی کا نام "برکت" ہے۔ یہ "برکت" حاصل ہو تو تھوڑی چیز بھی کافی ہو جاتی ہے اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور "برکت" مفقود ہو تو دولت کے ڈھیر بھی انسان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اسی "برکت" کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر دنیا کے کسی ساز و سامان سے وقتی طور پر کچھ راحت مل بھی رہی ہے تو اس کا انجام بھی بخیر ہو۔ اگر ایک ڈاکو لاکھوں روپیہ لوٹ کر تین دن تک خوب مزے اڑائے اور چوتھے دن جیل میں پہنچ جائے تو وہ تین دن کے مزے کس کام کے؟ لہٰذا دنیا کا ہر لطف، لذت اور آرام اسی وقت قابل قدر ہے جب اس کا انجام کسی بڑی تکلیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور "برکت" کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے۔

اب "برکت" دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہوئی۔ ایک یہ کہ راحت کا جو بظاہری سبب ہمیں نظر آرہا ہے وہ واقعتاً لذت یا آرام پہنچائے اور کوئی ایسی حالت پیدا نہ ہو جو اس کا مزہ کرکرا کر ڈالے اور دوسرے یہ کہ اس کا انجام بھی بخیر ہو اور اس سے حاصل ہونے والی ظاہری لذت یا آرام کا نتیجہ خراب نہ ہو۔"[1]

پھر انجام اچھا ہونے میں یہ بھی داخل ہے کہ دنیوی اعتبار سے اس پر اچھے نتائج مرتب ہوں، کھانا صحت و قوت حاصل ہونے کا ذریعہ بنے کسی بیماری اور تکلیف کا باعث نہ بنے، روپیہ پیسہ بے مقصد مصارف میں ضائع ہونے سے بچا رہے اور یہ بھی داخل ہے کہ دینی اور اخروی اعتبار سے بھی اس کا انجام اچھا ہو، کھانے سے جو قوت و نشاط حاصل ہو وہ نیکی میں ترقی اور عبادات میں مزید رغبت کا باعث ہو، طبیعت میں گناہوں کے تقاضے پیدا نہ کرے۔

---

(۱) ماہنامہ الصیانہ شوال ۱۴۱۸ھ ص ۳۱ تا ۳۴

کھانے کے شروع میں اللہ کا نام لینے کا حکم:۔

اکثر علماء کے نزدیک کھانے پینے کے شروع میں اللہ کا نام لینا مستحب ہے، واجب نہیں۔ بعض حضرات نے اسے واجب قرار دیا ہے۔[1] لیکن صحیح بات پہلی ہی ہے، واجب کہنے والوں کے پیش نظر غالبًا یہ بات ہوگی کہ احادیث میں اللہ کا نام لینے کا امر ہے اور امر اصل میں وجوب کے لئے ہوتا ہے لیکن اس کے متعلق یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ آداب کے اندر جب امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو وہ عمومًا استحباب کے لئے ہی ہوتا ہے الا یہ کہ اس کے خلاف قرینہ موجود ہو اس لئے کہ ادب کی تعلیم کا مقصد آخرت کے کسی عذاب سے بچانا نہیں بلکہ سعادت و برکت حاصل کرنا اور زندگی کو شائستہ و مہذب بنانا ہوتا ہے چنانچہ کھانے پر بسم اللہ کہنے کے بارے میں مجموعی طور پر تمام احادیث سامنے رکھنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام نہ لینا برکت و سعادت سے محرومی کا سبب تو ہے لیکن کسی اخروی عذاب اور وعید کا سبب نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے واجب کہنے والوں کا ایک استدلال یہ بھی نقل کیا ہے کہ اسی حدیث میں دائیں ہاتھ سے کھانے کا بھی امر ہے اور اسے عمومًا واجب کہا جاتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ بسم اللہ کہنے کو بھی واجب قرار دیا جائے لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں اس لئے کہ دائیں ہاتھ سے کھانے کا صرف امر ہی نہیں بلکہ بائیں ہاتھ سے نہی بھی ہے (یعنی اس سے منع کیا گیا ہے) اور یہ صورتحال بسم اللہ کے بارے میں نہیں ہے۔

اللہ کا نام کن لفظوں میں لیا جائے:۔

اکثر احادیث میں لفظوں کی تعیین کے بغیر اللہ کا نام لینے کا حکم ہے لیکن ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اذا اکل احدکم طعامًا فلیقل بسم اللہ فان نسی فی اولہ فلیقل: بسم اللہ اولہ و آخرہ۔** "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے لگے تو کہے: بسم اللہ، اگر شروع میں بھول جائے تو کہے: **بسم اللہ اولہ و آخرہ**۔"[2]

اس حدیث سے لفظوں کی تعیین بھی ہوگئی کہ بسم اللہ کہے، اسی حدیث کا مضمون ابوداؤد میں حضرت امیہ بن مخشی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[3]

---

(۱) فتح الباری ج۹/ص۵۲۲ ...... (۲) فتح الباری ج۹/ص۵۲۱ ...... (۳) (حوالہ سابقہ) ویؤیدہ ایضاً حدیث عائشۃ عند احمد والبیھقی وحدیث انس عند الضیاء وابن السنی وابن عباس عند الحاکم والطبرانی والبیھقی راجع۔ (کنز العمال ج۱۵/ص۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۶)

کنزالعمال میں حاکم کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں بسم اللہ وبرکۃ اللہ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے، اگرچہ کسی حدیث میں اس کا صریح ذکر نہیں ملتا لیکن شائد کثرت ذکر کی وجہ سے علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے یہاں دو باتیں اور ذکر فرمائی ہیں، پہلی تو یہ کہ پہلے لقمہ کے ساتھ بسم اللہ اور دوسرے کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن اور تیسرے کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے۔ دوسری یہ کہ ہر لقمہ کے ساتھ بھی بسم اللہ کہتا رہے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دونوں باتوں کو بلادلیل قرار دیا ہے۔[3]

پہلی بات کی تو خود امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی کوئی دلیل ذکر نہیں فرمائی، دوسری بات کی وجہ امام غزالی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ کھانے کی حرص اور اس کی طرف توجہ کی وجہ سے ذکر اللہ سے غفلت نہ ہو۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی اس بات کو بطور علاج اور وسیلہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے، باقاعدہ آداب طعام میں شمار کرنا مشکل ہے اس لئے کہ ایک تو کثرت ذکر آداب طعام میں سے نہیں بلکہ آداب حیات میں سے ہے، دوسرے شریعت میں ذکر لسانی کی کثرت اگرچہ مطلوب ہے لیکن اس درجہ کی مطلوبیت کہ کھانے کے لقموں کے درمیان میں بھی زبان سے ذکر اللہ جاری ہو محتاج دلیل ہے، بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تعامل سے اس قدر اہتمام کا ثبوت نہیں ملتا۔

بسم اللہ آہستہ کہے یا اونچی آواز سے :-

کھانے کی اصل سنت تو آہستہ کہنے سے بھی ادا ہو جائے گی البتہ جہاں دوسروں کو یاد دلانے اور توجہ دلانے کا موقع ہو وہاں جہراً کہنے سے تبلیغ و تذکیر کا ثواب بھی مل جائے گا۔

اگر شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے :-

اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو جب یاد آئے بسم اللہ اولہ و آخرہ کہہ لے، اس سے پہلے کھائے ہوئے کھانے کی بے برکتی بھی زائل ہو جاتی ہے۔

---

(۱) کنزالعمال ج ۱۵/ ص ۲۵۶، حدیث نمبر ۴۰۸۴۳ ...... (۲) احیاء العلوم مع اتحاف ج ۵/ ص ۲۱۷ ...... (۳) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۲۱

اجتماعی کھانے میں ایک کی تسمیہ کافی ہے یا نہیں:-

اگر کئی آدمی مل کر کھانا کھا رہے ہوں تو بعض کا بسم اللہ پڑھنا کافی ہے یا سب کا پڑھنا ضروری ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ مستحب تو یہی ہے کہ سب بسم اللہ پڑھیں مگر کسی ایک کے پڑھنے سے بھی اصل سنت ادا ہو جاتی ہے۔[1]

احقر کے فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ یہاں دو وضاحتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اگرچہ ایک کے پڑھ لینے سے اصل سنت ادا ہو جائے گی مگر بسم اللہ پڑھنے کا ثواب صرف پڑھنے والے کو ہی ملے گا۔ سب کو ثواب حاصل ہونے کی صورت یہ ہے کہ سب بسم اللہ پڑھیں۔ دوسری بات یہ کہ بسم اللہ پڑھنے کا ایک مقصد حصول برکت اور شیطان کے اثرات سے بچنا ہے۔ بعض احادیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مقصد حاصل ہونے کے لئے تمام شرکاء کا بسم اللہ پڑھنا شرط ہے، اگر ایک شخص بھی بسم اللہ پڑھنے کے بغیر کھانے میں شریک ہو گیا تو شیطان کے کھانے پر اثر انداز ہونے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی اور کھانے میں بے برکتی ہو جائے گی۔ شائد حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے ارشاد میں "اصل سنت" حاصل ہونے کی قید انہی دو باتوں کے پیش نظر لگائی گئی ہو۔

اس دوسری بات کی دلیل اسی باب کی حدیث نمبر ۴۰ ہے جو فصل ثانی کی پہلی حدیث ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا جا رہا تھا، شروع میں کھانے میں بہت زیادہ برکت تھی، آخر میں بہت زیادہ بے برکتی محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کیا تھا، اس لئے برکت حاصل تھی پھر یہ شخص آیا اور اللہ کا نام ذکر کئے بغیر کھانے لگا، اس کی وجہ سے بے برکتی ہو گئی۔

یہاں تمام شرکاء نے بسم اللہ پڑھی تھی، صرف ایک کے نہ پڑھنے کی وجہ سے بے برکتی ہو گئی۔ ایک ایسا ہی واقعہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یاکل طعاماً فی ستة من اصحابہ فجاء اعرابی فاکلہ بلقمتین فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما انہ لو ذکر اسم اللہ کفاکم۔[2]

ان احادیث کی وجہ سے دو باتوں میں سے ایک بات کہنا ضروری ہے، یا یہ کہا جائے کہ اجتماعی کھانے میں ایک شخص بھی ایسا ہو جس نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو تو کھانے میں بے برکتی ہو جاتی ہے یا یہ کہا جائے کہ ایک

(۱) روضۃ الطالبین ج ۷ / ص ۳۴۱، شرح مسلم للنووی ج ۲ / ص ۱۷۱

(۲) شعب الایمان للبیہقی ج ۵ / ص ۷۴، ترمذی ج ۲ / ص ۸ وقال ھذا حدیث حسن صحیح۔

وقت میں جو لوگ اکٹھے کھانا شروع کریں ان میں سے کسی ایک کا بسم اللہ پڑھنا کافی ہے، ان میں سے دوسروں کا نہ پڑھنا رافع برکت نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی شخص شرکاء کے ساتھ کھانا شروع نہ کرے بلکہ بعد میں شریک ہو تو اس کے بسم اللہ نہ پڑھنے سے تمام کھانے سے برکت جاتی رہتی ہے، اگرچہ پہلے سب نے بسم اللہ پڑھی ہو۔

دائیں ہاتھ سے کھانا:-

حدیث میں کھانے کا دوسرا ادب یہ بیان کیا گیا ہے کہ کھانا دائیں ہاتھ سے کھایا جائے، اس کے بارے میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(۱) اس ادب کی حکمت۔ (۲) دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم۔ (۳) کھاتے ہوئے بایاں ہاتھ ساتھ ملانے کا حکم۔

(۱) اس ادب کی حکمت ......

(۱)......... دائیں ہاتھ کو بائیں پر فضیلت حاصل ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اچھے کاموں کے لئے اسے ہی استعمال کیا جائے۔

(۲)......... بائیں ہاتھ سے کھانا شیطانی کام ہے، اس سے تشبہ بالشیطان لازم آتا ہے۔[۱]

(۳)......... لطافت ذوق کا تقاضا یہ ہے کہ صفائی و ستھرائی والے کاموں اور گندگی والے کاموں کے الگ الگ ہاتھ استعمال ہوں۔[۲]

(۲) دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم...... دائیں ہاتھ سے کھانا واجب ہے یا صرف سنت اور مستحب، اس میں اختلاف ہوا ہے، جمہور علماء کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا مستحب اور بائیں ہاتھ سے کھانا خلاف ادب اور مکروہ تنزیہی ہے جبکہ بعض علماء جن میں ابن العربی، سبکی اور بویطی شامل ہیں کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا واجب اور بائیں ہاتھ سے کھانا ناجائز ہے، امام شافعیؒ نے بھی متعدد جگہ پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔[۳]

جمہور کا استدلال بظاہر اس بات سے ہو گا کہ آداب کے سلسلے میں اکثر اوامر استحباب کے لئے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا، چنانچہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **هذا الامر على جهة الندب لانه من باب تشريف اليمين على الشمال**۔[۴]

---

(۱) اس کی تفصیل "اسلام کا فلسفہ آداب" کے زیر عنوان نمبر ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) تفصیل دیکھئے مذکورہ عنوان کے تحت نمبر ۷

(۳) اوجز المسالک ج ۱۴/ ص ۲۴۸

(۴) حوالہ بالا

جو حضرات اسے واجب قرار دیتے ہیں ان کی ایک دلیل حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھ کر دائیں ہاتھ سے کھانے کا امر فرمایا، اس نے جواب میں کہا: **لا استطیع**۔ "میں تو دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا۔" حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا استطعت**۔ "تم دائیں ہاتھ سے کھا ہی نہ سکو۔" چنانچہ اس کا ہاتھ ایسا مفلوج ہوا کہ اس کے بعد وہ اسے دوبارہ اوپر نہ اٹھا سکا۔[1]

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی مستحب کام کے چھوڑنے پر بددعاء نہیں فرما سکتے، آپ کا بددعا فرمانا دائیں ہاتھ سے کھانے کے وجوب اور بائیں ہاتھ سے کھانے کی حرمت کی دلیل ہے لیکن اس استدلال پر یہ قوی اشکال ہو سکتا ہے کہ یہاں آپ کے بددعا فرمانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جھوٹا عذر بیان کر کے آپ کی نصیحت کو رد کر دیا تھا اور اس کا منشا تکبر تھا، چنانچہ اسی حدیث میں یہ لفظ ہیں: **ما منعه الا الکبر**۔ لہٰذا آپ کی بددعا اس کے تکبر کی وجہ سے ہے، بائیں ہاتھ سے کھانے کی وجہ سے نہیں۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ حضرت سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بھی طبرانی نے روایت کیا ہے۔[2] اس میں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں روایت کی گئی جس کی وجہ سے اسے تکبر پر محمول کیا جائے لہٰذا اس کی سند اگر صحیح ہے تو یہاں بھی ایسی کوئی بات ضرور موجود ہو گی جو بددعا کا باعث بنی ہو گی اس لئے کہ بائیں ہاتھ سے کھانے کو ناجائز تسلیم کر لیا جائے تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ محض ناجائز کام دیکھ کر بددعا فرمانے کی نہیں تھی شائد اسی وجہ سے زرقانی نے اس حدیث کو بھی تکبر کی وجہ سے بددعا کرنے پر محمول کیا ہے۔[3] نیز اس حدیث کو بددعا کی بجائے پیش گوئی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ اس کے ساتھ ایسا ہو جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایسا ہو گا۔

قائلین وجوب کی دوسری دلیل یہ ہے کہ احادیث میں صرف دائیں ہاتھ سے کھانے کا امر ہی نہیں بلکہ بائیں ہاتھ کے ساتھ کھانے سے نہی بھی ہے اور اسے شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے جو دائیں ہاتھ کے ساتھ کھانے کے وجوب کی دلیل ہے۔

بہر حال اتنی بات واضح ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانے کو واجب قرار نہ بھی دیا جائے تب بھی یہ باقی آداب کی نسبت کافی تاکیدی قسم کا ادب ضرور ہے۔

یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے جبکہ کوئی عذر نہ ہو، اگر کسی عذر کی وجہ سے بائیں ہاتھ سے کھایا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم مع تکملہ فتح الملہم ج ۴/ ص ۶)...... (۲) اوجز المسالک ج ۱۴/ ص ۲۴۵)...... (۳) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۲۳

(۴) کھاتے ہوئے بایاں ہاتھ شامل کر لینا......ایک شخص کھا تو دائیں ہاتھ سے رہا ہے لیکن کسی وجہ سے بایاں ہاتھ بھی ساتھ شامل کر لیتا ہے، اس کا کیا حکم ہے، دو ضعیف حدیثوں سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، ایک حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی حدیث جسے طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں ککڑی اور بائیں میں تازہ کھجور دیکھی، آپ ایک مرتبہ اس میں سے تناول فرماتے تھے اور ایک مرتبہ اس میں سے۔ دوسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے جسے ابو نعیم نے کتاب الطب میں روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ دائیں ہاتھ میں اور کھجور بائیں ہاتھ میں پکڑ لیتے تھے اور دونوں کو ملا کر کھاتے تھے۔[1]

نیز اگر کوئی شخص اصل تو دائیں ہاتھ سے کھا رہا ہو لیکن بائیں ہاتھ کو بھی کسی وجہ سے شامل کر لے تو عرفاً اسے بائیں ہاتھ سے کھانا شمار نہیں کیا جاتا، اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ یہ صورت بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت میں داخل نہیں ہونی چاہئے لیکن دائیں ہاتھ سے کھانے کے حکم کی جو حکمتیں شروع میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے تیسری حکمت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کی چیز کو بایاں ہاتھ لگانا مطلقاً ممنوع ہو، اس سلسلے میں فیصلہ کن بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بائیں ہاتھ کو ضمناً شامل کر لینا اگرچہ ناجائز نہیں ہے اور اس سے ترک واجب لازم نہیں آتا لیکن بلا ضرورت اس سے گریز اولیٰ اور مستحسن ہے۔

اپنے سامنے سے کھانا:۔

اس حدیث میں کھانے کا تیسرا ادب یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ کھانا اپنے سامنے سے کھایا جائے، اس ادب کی بھی قدرے تفصیل پیش خدمت ہے۔

اس حکم کی حکمتیں......اپنے سامنے سے کھانے اور دوسری جانب سے یا درمیان سے نہ کھانے میں بھی کئی حکمتیں ہیں، مثلاً:

(۱)..........اسی باب کی حدیث نمبر ۴۸ میں یہ آرہا ہے کہ کھانا درمیان سے نہ کھانا باعث برکت ہے۔

(۲)..........برتن میں بلا مقصد ادھر ادھر ہاتھ مارنا بے ڈھنگا پن اور بد سلیقگی کی علامت ہے۔

(۳)..........بلا مقصد ہر طرف ہاتھ گھمانا حرص کی بھی علامت ہے۔

(۴)..........اگر کئی آدمی مل کر کھا رہے ہیں تو اپنے سامنے والی جگہ چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سے لقمہ اٹھانے سے اسے گھن آئے گی یا کم از کم اس کی طبیعت پر بار ہو گا۔

---

(۱) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۷۳

(۵)............ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا کسی کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اور دلالت حال سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ پیش کرنے والے کی طرف سے ہر ایک کو اپنے سامنے والا حصہ ہی کھانے کی اجازت ہے، اس صورت میں دوسری طرف سے کھانا ایک تو مالک کی اجازت کے بغیر ہوگا دوسرے اس میں دوسرے کے حق میں دست درازی بھی ہے لیکن عملاً ایسی صورتحال کم ہی پیش آتی ہے۔

(۶)............ اگر کوئی شخص تنہا بھی کھا رہا ہے تب بھی بعض کھانوں میں کھانے کی شکل بلاوجہ بدنما سی ہو جاتی ہے، اگر کھانا بچ جائے تو وہ دوسرے کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں رہتا اور کسی اور شخص کا اسے کھانے کو جی بھی نہیں چاہے گا، ایسا عموماً ان کھانوں میں ہوتا ہے جو شوربے وغیرہ کی طرح بالکل پتلے بھی نہیں ہوتے اور کھجوروں کی طرح بالکل الگ الگ بھی نہیں جیسے ثرید اور چاول وغیرہ۔

یہ حکم کس حالت میں ہے؟ ...... اپنے سامنے سے کھانے کے بارے میں احادیث میں بظاہر تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے، اس حدیث میں، اسی طرح اس باب کی حدیث نمبر ۴۸ میں اپنے سامنے سے کھانے کا امر ہے لیکن اسی باب کی حدیث نمبر ۱۹ میں یہ آرہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک درزی کی دعوت پر اس کے گھر تشریف لے گئے، اس نے شوربا پیش کیا جس میں بوٹیاں اور لوکی تھا، آپ شوربے کے اندر سے لوکی کے ٹکڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تناول فرما رہے تھے۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے سے کھانے کا اہتمام نہیں فرمایا، ان دونوں قسم کی حدیثوں کے بارے میں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ الگ الگ حالتوں پر محمول ہیں، بعض حالات میں دوسری طرف سے کھانا ناپسندیدہ ہوتا ہے اور بعض حالات میں ایسا نہیں ہوتا لیکن اس کی تفصیل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱)............ اگر کھانا ایک ہی قسم کا ہو تو دوسری طرف سے کھانا درست نہیں، اگر کھانا مختلف قسم کا ہے جیسے ایک ہی برتن میں انگور بھی ہیں اور کھجوریں بھی یا قسم تو ایک ہے لیکن نوعیت مختلف ہے مثلاً ہیں تو ساری کھجوریں ہی لیکن مختلف انواع کی ہیں تو حسب منشا چیز حاصل کرنے کے لئے دوسری طرف ہاتھ بڑھا لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اکثر علماء نے اس مسئلے میں یہی تفصیل بیان فرمائی ہے اور اس کی دلیل حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اس باب کے نمبر ۷۰ پر آرہی ہے۔

(۲)............ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ یقین یا ظن غالب ہو کہ ادھر ادھر سے کھانا ساتھ کھانے والے کو گراں نہیں گزرے گا تو ایسا کرنا جائز ہے ورگرنہ درست نہیں چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب کا عنوان قائم کیا ہے: باب من تتبع حوالی القصعة اذا لم یعرف منه کراهیة۔ اور اس

کے تحت اوپر ذکر کردہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث پیش کی ہے جس میں لوکی کے ٹکڑے تلاش کرنے کا ذکر ہے۔[۱]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہاں مقصود حضرت عکراش رضی اللہ عنہ والی حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ کرنا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کا کھانا ہو تو دوسری طرف ہاتھ بڑھانا خلاف ادب ہے ورنہ نہیں۔[۲] چنانچہ اس حدیث کے ایک راوی ہیں العلاء بن الفضل۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اس حدیث کے روایت کرنے میں متفرد ہیں یعنی صرف وہی روایت کر رہے ہیں۔[۳] ان کے بارے میں ذہبی نے کہا ہے: **صدوق ان شاء الله**۔ لیکن دوسرے اکثر محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا، عباس بن عبد العظیم نے کہا ہے کہ حدیث عکراش اس نے خود وضع کی ہے۔ ابن حبان نے یہ کہا ہے کہ اگر دوسرے ثقہ راوی ان کی موافقت کر رہے ہوں تو ان کی روایت قبول کی جاسکتی ہے اگر متفرد ہو تو اس کی روایت سے استدلال کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔[۴]

اسی کے ہم معنی ایک اور حدیث بھی مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **كان اذا اتى بطعام أكل مما يليه واذا اتى بالتمر جالت يده**۔ "جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھانا لایا جاتا تو اپنی جانب سے تناول فرماتے اور کھجوریں لائی جاتیں تو آپ کا ہاتھ ادھر ادھر گھومتا۔"[۵] لیکن یہ حدیث بھی انتہائی ضعیف ہے بلکہ اسے موضوع قرار دیا گیا ہے۔[۶]

(۳) .... علامہ کرمانی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کھانے کی صورت میں دوسری طرف سے کھانے کی گنجائش ہے، کسی کے ساتھ کھانے کی صورت میں خلاف ادب ہے۔ کرمانی نے بنیاد حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث کو ہی بنایا ہے لیکن اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔[۷]

(۴) .... امام مالکؒ سے یہ منقول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اہل خانہ اور خدام کے ساتھ کھانا کھا رہا ہو تو دوسری طرف سے کھانا جائز ہے۔[۸] کیونکہ ان کے ساتھ بے تکلفی کی وجہ سے ان پر گرانی کا خطرہ نہیں ہوتا۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو درحقیقت ان مذکورہ اقوال میں کوئی اختلاف اور تعارض نہیں، ساری ہی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، اوپر کی تفصیل سے جو خلاصہ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر دوسری طرف

---

(۱) صحیح بخاری مع فتح الباری ج۹/ص ۵۲۴ ...... (۲) حوالہ مذکورہ ...... (۳) جامع ترمذی ...... (۴) میزان الاعتدال ج ۳/ص ۱۰۴، تہذیب التہذیب ج ۷/ص ۷۳، ج ۸/ص ۱۹۰ ...... (۵) الجامع الصغیر مع شرحہ السراج المنیر ج ۴/ص ۷۴ ...... (۶) حوالہ بالا، فیض القدیر سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۲/ص ۳۰۵، حدیث نمبر ۹۰۵ ...... (۷) فتح الباری ج۹/ص ۵۲۴ ...... (۸) حوالہ مذکورہ

ہاتھ بڑھانے سے دوسرے مسلمان کی ایذارسانی کا واضح خطرہ ہو یا بچا ہوا کھانا ضائع ہونے کا غالب گمان ہو تو ایسا کرنا درست نہیں، خاص طور پر جبکہ کھانا ایک ہی نوعیت کا ہو، اسی طرح اگر دوسری طرف سے کھانے میں کسی کی حق تلفی کا خطرہ ہو یا مالک کی صریح یا دلالۃً اجازت کے بغیر کھانے کی صورت بنتی ہو تو بھی ایسا کرنا ناجائز ہے، اگر مذکورہ مفاسد میں سے کوئی مفسدہ لازم نہیں آرہا تو دوسری طرف سے بلا مقصد کھانا ادب اور شائستگی کے خلاف ہے لیکن اگر ایسا کرنے کا کوئی مقصد موجود ہے مثلاً کھانا کئی انواع واقسام کا ہے اور اپنی پسند کی چیز دوسری طرف ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

فوائد حدیث......

اس حدیث سے کئی فوائد مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً:

(۱)..........اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کی تربیت اور ان کو آداب سکھانے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

(۲)..........امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر حال میں مستحسن ہے حتیٰ کہ کھانے کی حالت میں بھی بشرطیکہ حدود میں رہتے ہوئے، حکمت کے ساتھ، مقتضائے حال کے مطابق ہو۔

(۳)..........اس سے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی سمجھ میں آئی، ایک تو اس لئے کہ حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت رہے ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت عمر بن ابی سلمہ کا یہ لفظ بھی ہے: **فما زالت تلك طعمتي بعد۔** "اس کے بعد میرا کھانے کا انداز ہمیشہ یہی رہا۔" اس سے کمال اتباع سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۴)..........کھانے کے شرکا میں سے اگر کسی کو سنت کا علم نہ ہو اور خلاف سنت کام کر رہا ہو تو اس کو سنت کی تعلیم کر دینا مناسب ہے۔

(۲)-----عن حذیفة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الشيطان يستحل الطعام ان لا يذكر اسم الله عليه۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک کھانے پر اللہ کا ذکر نہ کرنے کی وجہ سے شیطان کھانے کو حلال سمجھ لیتا ہے۔

حاصل حدیث...... حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کھانے میں شروع میں یا درمیان میں کسی بھی وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے تو شیطان کے لئے کھانے پر اثر انداز ہونے اور کھانے میں شرکت کی گنجائش حاصل ہو جاتی ہے **ونعوذ بالله من شر الشيطان وشركه۔**

(۳)----وعن جابر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا دخل الرجل بيته فذكر الله عند دخوله وعند طعامه قال الشيطان: لا مبيت لكم ولاعشاء، واذا دخل ولم يذكر الله عند دخوله قال الشيطان: ادركتم المبيت واذا لم يذكر الله عند طعامه قال: ادركتم المبيت والعشاء۔ (رواه مسلم)

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اور داخل ہوتے ہوئے اور کھانے کے وقت اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان (اپنے ساتھیوں کو) کہتا ہے کہ تمہارے لئے (یہاں) نہ رات رہنے کی جگہ ہے اور نہ رات کا کھانا ہے اور جب آدمی گھر جاتا ہے اور جاتے ہوئے اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کہتا ہے کہ تمہیں رات رہنے کی جگہ مل گئی اور جب کھانے کے وقت اللہ کا نام نہ لے تو کہتا ہے کہ تمہیں رات رہنے کی جگہ بھی مل گئی اور کھانا بھی مل گیا۔

شیاطین و جنات کے کھانے پینے کا مطلب:-

گزشتہ حدیث میں آیا تھا کہ اگر کھانے پر اللہ کا نام لیا جائے تو شیطان اسے اپنے لئے حلال سمجھ لیتا ہے جس کا مطلب بظاہر یہی نکلتا ہے کہ وہ ہی کھانے میں شریک ہو جاتا ہے، اس زیر بحث حدیث میں بھی شیاطین کے کھانے پینے کا ذکر ہے، اسی طرح آگے حدیث نمبر ۵ میں بھی آرہا ہے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے، اسی باب کی حدیث نمبر ۴۳ میں کھانا کھانے کے بعد اسے قے کرنے کا بھی ذکر ہے، ان احادیث سے جو عملی سبق حاصل ہو رہا ہے وہ تو صرف اتنا ہے کہ بغیر ذکر اللہ کے کھانے یا بائیں ہاتھ سے کھانے سے گریز کرنا چاہئے اس لئے کہ ان دونوں کاموں سے شیطانی اثرات شامل ہو کر کھانے میں بے برکتی کا باعث بن جاتے ہیں۔

البتہ حل حدیث کے نقطہ نظر سے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ جنات کی طرف جو کھانے پینے اور ان جیسے افعال کی نسبت کی گئی ہے اس کا مطلب اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں شارحین حدیث کے مختلف اقوال ہیں: بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہاں کھانے پینے کی شیاطین کی طرف نسبت حقیقی معنی کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ شیطان کے بائیں ہاتھ سے کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کو بہکا کر بائیں ہاتھ سے کھانے پر آمادہ کرتا ہے یا انسانوں کے بائیں ہاتھ سے کھانے پر خوش ہوتا ہے، اسی طرح بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے شیطان کے کھانے میں شریک ہونے یا اس

کے حلال سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کھانے کی برکت زائل کر دیتا ہے اور قے کرنے سے مراد زائل شدہ برکت کا واپس آجانا ہے۔

لیکن اکثر شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ احادیث اپنے ظاہر پر محمول ہیں یعنی شیاطین سچ مچ کھاتے اور پیتے ہیں اس لئے کہ شیاطین کا کھانا اور پینا عقلاً ناممکن نہیں ہے اور احادیث میں کھانے اور پینے ہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انہیں اپنے ظاہری معنی سے ہٹا کر دوسرے معنی پہنانے کی ضرورت نہیں۔

البتہ یہاں شارحین حدیث نے دو بحثیں اور چھیڑی ہیں، ایک یہ کہ جنات و شیاطین کے کھانے پینے کی صورت اور کیفیت کیا ہوتی ہے، کیا وہ انسانوں کی طرح کھاتے اور پیتے ہیں یا ان کا کھانا پینا محض سونگھنا ہوتا ہے، دونوں ہی قول ہیں، دوسرے یہ کہ تمام جنات و شیاطین کھاتے پیتے ہیں یا ان کی بعض قسمیں ایسا کرتی ہیں، بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ تمام جنات و شیاطین کھاتے اور پیتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی مختلف انواع ہیں، بعض بالکل ہوا کی طرح ہوتے ہیں وہ کھاتے پیتے بھی نہیں اور نکاح وغیرہ بھی نہیں کرتے اور بعض قسمیں ایسی ہیں جن کے لئے کھانا پینا اور نکاح و تناسل بہت سے حیوانی لوازم ثابت ہیں لیکن حدیث سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ یہ کھاتے اور پیتے ہیں، کھانے پینے کی مزید تفصیلات پر عمل موقوف نہیں اس لئے یہاں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

(٤)-----وعن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا اكل احدكم فلياكل بيمينه واذا شرب فليشرب بيمينه۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھائے تو اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پیئے تو اپنے دائیں ہاتھ سے پیئے۔

(٥)-----وعنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ياكلن احدكم بشماله ولا يشربن بها فان الشيطان ياكل بشماله ويشرب بها۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے بائیں ہاتھ سے ہرگز نہ کھائے اور بائیں ہاتھ سے ہرگز نہ پیئے، اس لئے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور اسی سے پیتا ہے۔

حاصل حدیث ...... اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا پینا شیطان کا کام ہے لہٰذا بائیں ہاتھ سے کھانا، پینا شیطان کے ساتھ تشبہ ہے، تشبہ بھی اس کے معیوب ہونے کی وجوہ میں سے ایک وجہ ہے۔

(٦)----وعن كعب بن مالك قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأكل بثلاثة اصابع و يلعق يده قبل ان يمسحها۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے کھانا تناول فرماتے تھے اور اپنے ہاتھ کو پونچھنے سے پہلے چاٹ لیا کرتے تھے۔

حاصل حدیث ...... اس حدیث سے کھانے کے دو ادب سمجھ میں آرہے ہیں، ایک یہ کہ کھانا تین انگلیوں سے کھایا جائے، دوسرے یہ کہ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھوں کو دھونے یا صاف کرنے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لیا جائے، ان دونوں کی قدرے تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

کھانے میں کتنی انگلیاں استعمال کی جائیں:-

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیاں استعمال فرماتے تھے، تین سے زیادہ انگلیاں بلا ضرورت استعمال کرنا اگرچہ جائز ہے، گناہ نہیں لیکن خلاف ادب ضرور ہے اس لئے کہ ایک تو یہ حرص کی علامت ہے، دوسرے اس سے لقمے بھی بڑے بڑے بنیں گے اور تیسرے دیکھنے میں بھی ایسا کرنا بد تہذیبی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اگر کھانے کی نوعیت ایسی ہو کہ لقمہ سنبھالنے کے لئے تین انگلیاں ناکافی ہوں تو چوتھی یا پانچویں انگلی ملا لینا خلاف ادب بھی نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن ابی شیبہ نے زہری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پانچ انگلیوں سے کھانا تناول فرماتے تھے۔[1]

آپ کا تین یا پانچ انگلیوں سے کھانا مختلف حالات کے اعتبار سے تھا، اگر تین انگلیوں سے لقمہ آسانی سے سنبھالا جاسکتا تو تین انگلیاں استعمال فرماتے ورنہ تین سے زیادہ۔

بلا ضرورت تین سے زیادہ انگلیاں استعمال کرنا تو خلاف ادب ہے ہی، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سے کم انگلیاں استعمال کرنا بھی خلاف ادب ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایک باغ میں گیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ج۸/ص۱۱۱، راجع ایضاً فتح الباری ج۹/ص۵۷۸ ونقل ابن قدامة عن احمد تضعيف هذا الحديث۔ (المغنی ج۷/ص۱۵) وقال ابن العربی يدل على الاكل بالكف كلهما انه صلى الله عليه وسلم يتعرق العظم وينهش اللحم ولا يمكن ذلك عادة الا بالكف كلهما الخ۔ (فتح الباری ج۹/ص۵۷۸)

چلتے ہوئے کھجوریں تناول فرمارہے تھے، آپ نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور فرمایا: **لا تاکل باصبعین فانها اکلة الشیطان**۔ "دوانگلیوں سے مت کھاؤ، اس لئے کہ یہ شیطان کے کھانے کا طریقہ ہے۔" (۱)

اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ اس میں تکبر کا شائبہ اور کھانے سے لاپرواہی برتنے کا انداز ہے۔

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا:۔

اس ادب کی اصل وجہ تو وہی ہے جو اگلی حدیث میں صراحتاً آ رہی ہے کہ انگلیوں پر کھانے کے جو اجزاء لگے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ انہیں کے اندر برکت ہو، انگلیاں چاٹے بغیر ان اجزاء کو دھو ڈالنا یا صاف کر لینا برکت سے محرومی کا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ بھی اس میں حکمتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً قاضی عیاض نے ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ چاٹے بغیر انگلیاں صاف کرنے میں کھانے کے قلیل اجزاء کی بے قدری اور تحقیر ہے، بعض حضرات نے یہ وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ چاٹے بغیر صاف کرنے کی صورت میں جس رومال یا تولیے وغیرہ سے صاف کرے گا وہ زیادہ خراب ہو گا۔

انگلیاں چاٹنے کی حیثیت:۔

ہاتھ صاف کرنے سے پہلے انگلیاں چاٹنے کا امر استحباب کے لئے ہے، وجوب کے لئے نہیں۔

بعض عقل پرستوں کی تردید ...... بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا ناپسندیدہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسا کام ہے جس سے انسان کو گھن آتی ہے، علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے دماغوں اور عقلوں کو ناز و نعمت نے خراب کر دیا ہے، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ کھانے کے جو اجزاء چاٹے جا رہے ہیں یہ اسی کھانے کا حصہ ہیں جو ابھی مزے لے لے کر کھا رہے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چاٹنے کے لئے انگلیوں کو ہونٹوں کے اندر لانا پڑے گا، تو اس سے زیادہ تو انگلیاں کلی کرتے وقت دانت صاف کرنے کے لئے بھی انسان منہ میں ڈال لیتا ہے، اس میں کبھی گھن یا بدتہذیبی محسوس نہیں کی گئی (حالانکہ یہ کام اجتماعی کھانوں کے بعد عموماً لوگوں کے سامنے بھی ہوتا ہے) البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کھانے کے درمیان انگلیاں چاٹنے کو ناپسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ لعاب دار انگلیاں دوبارہ کھانے میں داخل کرنا پڑیں گی۔ (۲)

---

(۱) مجمع الزوائد ج۵/ص۲۸ وقال الهیثمی: رواه الطبرانی وفیه ابن لهیعة وحدیثه حسن وبقیة رجاله رجال الصحیح۔

(۲) فتح الباری ج۹/ص۵۷۸

انگلیاں چاٹنے کی ترتیب:-

طبرانی نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث روایت کی ہے جس سے انگلیاں چاٹنے کی ترتیب بھی معلوم ہوئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ تین انگلیوں سے کھانا تناول فرماتے تھے، یعنی انگوٹھے اور ساتھ والی دو انگلیوں سے اور کھانے کے بعد تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے، پہلے درمیان والی انگلی چاٹتے تھے، پھر اس کے ساتھ والی یعنی شہادت کی انگلی اور سب سے آخر میں انگوٹھا۔(۱)

فوائد حدیث......

(۱)..........اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری نہیں، انگلیاں چاٹ کر ہاتھوں کو کسی چیز سے پونچھ لینا بھی درست ہے، اگرچہ ہاتھ دھولینا مستحب ہے بالخصوص جبکہ چکناہٹ والی چیز کھا کر سونے کا ارادہ ہو۔

(۲)..........انسان کو برکت کا حریص ہونا چاہئے، جہاں سے بھی برکت حاصل ہونے کا امکان ہو، اس کے حصول کی کوشش کرے۔

(۳)..........اللہ تعالیٰ کی معمولی سی نظر آنے والی نعمت کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ انگلیوں پر لگے ہوئے کھانے کے اجزاء بظاہر معمولی نظر آتے ہیں، ان کی بھی قدردانی کا حکم ہے، اس معاملے میں بعض بزرگوں سے بہت زیادہ اہتمام منقول ہے، شیخ القراء شاطبی وقت حضرت مولانا قاری فتح محمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ کھانے کے بعد کلی کرنے سے پہلے ایک گھونٹ منہ میں ڈال کر اور اسے حرکت دے کر پی لیتے تھے تاکہ کھانے کے ذرات باہر نہ گریں اور ضائع نہ ہوں۔

(۷) -----عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بلعق الاصابع والصحفة وقال: انکم لا تدرون فی ایة البرکة۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں اور رکابی کو چاٹنے کا حکم فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کونسے لقمے میں برکت ہوگی۔

قولہ: ایة البرکة، المضاف الیہ محذوف ای ایة اکلة او ایة لقمة وفی صحیح مسلم ج ۴/ص ۴ تکملة فتح الملہم ایہ البرکة ای ای طعامہ کما وقع مصرحًا فی بعض روایات مسلم۔

(۱) فتح الباری ج ۹/ص ۵۷۹، مجمع الزوائد ج ۵/ص ۳۱

حاصل حدیث......اس حدیث سے کھانے کا ایک نیا ادب یہ معلوم ہوا کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد برتن کو بھی چاٹ لینا چاہئے یعنی کھانے کے تھوڑے سے اجزاء جو برتن میں بچ گئے ہوں انہیں بھی اکٹھا کر کے کھالیا جائے، مقصد اس کا بھی کھانے کے اجزاء کو بے قدری اور ضیاع سے بچانا اور برکت کا حاصل کرنا ہے۔ اسی باب کی حدیث نمبر ۵۵ میں آرہا ہے کہ جو شخص کھانے کے بعد برتن کو چاٹ لیتا ہے، برتن اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے، اسی جیسا مضمون اس باب کی سب سے آخری حدیث میں بھی آرہا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حدیث میں برتن صاف کرنے کا حکم ہے، برتن میں موجود کھانا ختم کرنے کا نہیں، یعنی یہ حدیث اس صورت کے متعلق ہے جبکہ کھانا کھایا جا چکا ہے برتن کے ساتھ لگے ہوئے چند اجزاء باقی ہیں، اب ظاہر ہے کہ اگر انہیں صاف نہیں کرے گا تو یہ اجزاء دھل کر نالیوں میں بہہ جائیں گے۔ اگر برتن میں کھانا معتد بہ مقدار میں بچا ہوا ہے جو سنبھال کر رکھا اور کسی دوسرے مصرف میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا اس کو ختم کرنے کی صورت میں طبیعت پر بار ہونے کا خطرہ ہے تو اس کے متعلق یہ حدیث نہیں ہے، اسی طرح اگر کھانے کے بچے ہوئے قلیل اجزاء طبیعت کے ناموافق ہیں مثلاً کھانے میں چکنائی زیادہ تھی جو آخر میں ایک طرف بچالی گئی ہے جو اس کے لئے ناموافق ہے تو اسے صاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کا ایک منشا چونکہ کھانے کو ضیاع سے بچانا بھی ہے اس لئے کسی برتن سے پلیٹ وغیرہ میں کھانا نکالتے وقت اس کا خیال رکھا جائے کہ اتنا ہی کھانا نکالا جائے جسے کھائے جانے کی توقع ہو۔

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے ایک اور سوال کا جواب بھی سمجھ میں آگیا، وہ یہ کہ برتن صاف کرنے کا حکم اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ برتن میں بچے ہوئے کھانے کے اندر برکت ہے بظاہر زیادہ کھانے کی ترغیب ہے حالانکہ زیادہ کھانا شرعاً پسندیدہ نہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ یہ حدیث اس صورت میں ہے جبکہ کھانا ختم ہو چکا ہو، صرف معمولی سے اجزاء برتن میں لگے ہوئے رہ گئے ہیں، ظاہر ہے کہ انہیں کھالینا کثرت اکل میں داخل نہیں، اگر زیادہ مقدار میں کھانا بچا ہوا ہے تو اگرچہ اس میں بھی برکت کا احتمال ہے لیکن یہ برکت دوسرے وقت میں یا دوسرے شخص کے استعمال میں بھی آسکتی ہے۔

(۸) ----- عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا اکل احدکم فلا یمسح یدہ حتی یلعقھا او یلعقھا۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو اپنے ہاتھ

اس وقت تک نہ پونچھے جب تک کہ اسے چاٹ نہ لے یا چٹوا نہ لے۔

تشریح حدیث...... اس حدیث میں کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کے علاوہ چٹوانے کا بھی ذکر ہے، دوسرے شخص کو چٹوانا اس وقت ہے جبکہ یہ یقین ہو کہ وہ اس میں گھن محسوس نہیں کرے گا بلکہ باعث برکت و مسرت خیال کرے گا جیسا کہ اپنا مرید یا شاگرد وغیرہ یا جس شخص کو بھی اس کے ساتھ محبت کا گہرا تعلق ہو مثلاً بیوی۔

(۹) ----- وعن جابر قال سمعت النبی ﷺ یقول ان الشیطان یحضر احدکم عند کل شئی من شانہ حتی یحضرہ عند طعامہ فاذا سقطت من احدکم اللقمة فلیمط ماکان بھا من اذی ثم لیاکلھا ولا یدعھا للشیطان فاذا فرغ فلیلعق اصابعہ فانہ لا یدری فی ای طعامہ یکون البرکة۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ شیطان تمہارے ہر کام کے وقت موجود ہوتا ہے حتیٰ کہ انسان کے کھانے کے وقت بھی انسان کے پاس موجود ہوتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی شخص سے لقمہ گر جائے تو اس پر جو ناپسندیدہ چیز لگ گئی ہے اسے دور کر لے اور اسے کھالے اور اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑے اور جب کھانے سے فارغ ہو تو اپنی انگلیاں چاٹ لے اس لئے کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کے کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہوگی۔

تشریح حدیث...... عبادات کے اندر شیطان کی رخنہ اندازی اور اس سے بچنے کی فکر تو عموماً کی ہی جاتی ہے اس لئے کہ اس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ بندگی، اپنے مولیٰ کی طرف توجہ اور اس کی رضا و خوشنودی سمیٹنے کا وقت ہے لیکن اسلام چونکہ ایسا دین ہے جس کا تعلق ہر شعبہ زندگی کے ساتھ ہے اور مومن کامل کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر لمحہ زندگی اور اپنے ہر کام کو قرب الٰہی میں ترقی کا ذریعہ بناتا ہے اس لئے اسے صرف عبادات ہی میں نہیں بلکہ تمام معمولات زندگی میں بھی شیطانی اغواء اور اس کے اثرات بد سے محفوظ رہنے کا اہتمام کرنا چاہئے، یہی اصول اس حدیث کے اندر سکھانا مقصود ہے۔

گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھانا:-

اس اصول کے انطباق کے لئے یہاں کھانے کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور اس میں شیطانی اثرات

سے حفاظت کا ایک طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو لقمہ گر جائے اسے صاف کر کے کھالیا جائے، یہ رزق کی قدر اور اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کا عملی مظاہرہ ہے جبکہ شیطان کا ایک بڑا وصف ناشکری ہے: وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا۔ اس لئے شکر اس کی دخل اندازی کے آگے ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔[1]

یہ ادب اس صورت میں ہے جبکہ لقمہ پاک جگہ پر گرا ہو، اگر لقمہ ناپاک جگہ پر گرا اور ناپاکی اس انداز سے لقمے کے ساتھ خلط ملط ہو گئی کہ اسے الگ کرنا مشکل ہو گیا تو اسے اٹھا کر کھانا جائز نہیں ہے، اگر ناپاکی تو الگ کی جاسکتی ہے لیکن باقی بچا ہوا لقمہ کھانے سے گھن آتی ہے یا وہ لقمہ کسی پاک لیکن قابل نفرت چیز کے ساتھ مل گیا جس کی وجہ سے اسے کھانا مشکل معلوم ہوتا ہے، اس کے نہ کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

(۱۰)-----وعن ابی جحیفة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لآ اکل متکئًا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔

حضور اقدس کے ٹیک لگا کر نہ کھانے کی وجہ:-

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اپنے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا، اس کی وجہ کے سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ کے پاس ایک فرشتہ آیا جو اس سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا تھا، اس نے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ عبد اور نبی بن جائیں یعنی نبوت کے ساتھ ساتھ آپ پر عبدیت اور بندگی کا غلبہ ہو یا بادشاہ اور نبی بن جائیں، حضور اقدس ﷺ نے جبرئیل امین کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسا کہ آپ ان سے مشورہ طلب کر رہے ہوں، جبرئیل نے اشارے سے کہا کہ تواضع اختیار کیجئے، چنانچہ آپ نے بندگی والے نبی بننے کو ترجیح دی، اس کے بعد کبھی آپ نے ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔[2]

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیک لگا کر ایک دفعہ کھایا ہے جسے دیکھ کر جبریل علیہ السلام نے آپ کو منع کر دیا، اس کے بعد آپ نے کبھی ٹیک لگا کر نہیں کھایا، مجاہد کی

---

(۱) مزید دیکھئے! "اسلام کا فلسفہ آداب" کے عنوان کے تحت نمبر ۳

(۲) قال الحافظ: هذا مرسل او معضل وقد وصله النسائی من طریق الزبیدی عن الزهری عن محمد بن عبد الله بن عباس قال: کان ابن عباس یحدث فذکر نحده۔ (فتح الباری ج ۹/ ص ۵۴۱)

ایک مرسل روایت میں آتا ہے کہ آپ نے کھانے کے دوران ٹیک لگانے والی ہیئت کو جب ترک فرمایا تو یہ بھی فرمایا: اللّٰهم انی عبدك ورسولك۔[1]

کیا یہ ادب حضور اقدس ﷺ کے ساتھ خاص ہے؟

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے کھانے کے دوران ٹیک نہ لگانے کا باعث عبدیت و تواضع کا وہ اعلیٰ مقام ہے جو آپ کو عطا کیا گیا تھا، نیز اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے صرف اپنی ذات کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، ان امور کے پیش نظر بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ ادب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضور اقدس ﷺ جس خاص مقام عبدیت کا حق ادا کرنے کے لئے ٹیک لگانے سے گریز فرماتے تھے وہ تو کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اتباع ایک امتی کے لئے بذات خود سعادت ہے نیز ٹیک لگا کر کھانا تواضع کے خلاف ہے اور تواضع کا حکم امتیوں کے لئے بھی ہے، اس لئے یہ ادب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے ابن عدی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے وقت بائیں ہاتھ پر ٹیک لگانے سے منع فرمایا ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس ادب کی جو اہمیت و تاکید حضور اقدس ﷺ کے لئے تھی وہ دوسروں کے لئے نہیں ہو سکتی۔

متکئا کھانے کا مطلب:-

اتکاء کا معروف معنی ٹیک لگانا ہی ہے یعنی جسم کو کسی جانب جھکا کر کسی چیز کا سہارا لینا، ابن الجوزی وغیرہ نے یہاں حدیث میں بھی یہی معنی مراد لیا ہے، امام مالک رحمہ اللہ کی کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔[1] لیکن علامہ خطابی رحمہ اللہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ یہاں اتکاء سے مراد ہے زمین یا کسی بھی چیز پر اچھی طرح جم کر بیٹھ جانا جس سے یہ اندازہ ہو کہ یہ شخص خوب ڈٹ کر کھانا چاہتا ہے، اس میں چونکہ کثرت اکل کا شائبہ پایا جاتا ہے اس لئے یہ ناپسندیدہ ہے، اس لئے آدمی کو کھانے کے لئے اس انداز سے بیٹھنا چاہئے جس سے یہ لگے کہ یہ شخص ابھی اٹھنے والا ہے۔

لیکن پیچھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹیک لگا کر نہ کھانے کی وجہ کے تحت جو احادیث گزری

---

(١) حوالہ بالا......(٢) فتح الباری ج ٩/ ص ٥٤١

ہیں ان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس ادب کا منشاء قلت طعام نہیں بلکہ تواضع ہے اور ظاہر ہے کہ اتکاء (ٹیک لگانا) تواضع کے منافی تب ہوگا جبکہ پہلا معنی مراد لیا جائے، اگر اس ادب کا منشاء قلت اکل ہوتا تو دوسرا معنی مراد لیا جاسکتا تھا، اس لئے یہاں پہلا معنی ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

ٹیک لگا کر کھانے کا حکم:۔

یہ بات تو واضح ہے کہ کسی عذر یا ضرورت کی وجہ سے ٹیک لگا کر کھانے میں کوئی حرج نہیں، بلا عذر اور بلا ضرورت ٹیک لگانے کا کیا حکم ہے، اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس سے گریز فرماتے تھے اور ضعیف حدیث کے مطابق آپ نے امت کو بھی اس سے منع فرمایا ہے، دوسری طرف بعض صحابہ و تابعین سے ایسے آثار بھی مروی ہیں جن سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، عطا فرماتے ہیں کہ ہم ٹیک لگا کر کھالیا کرتے تھے، حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے مدمقابل لشکر میں ایک دفعہ ایک بڑا مضبوط اور بہادر شخص تھا جسے "ہزار مرد" کہا جاتا تھا یعنی وہ ایک شخص ہزار کے برابر تھا، حضرت خالد بن الولید بھی سیف من سیوف اللہ (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) تھے، آپ نے اسے قتل کیا اور قتل سے فارغ ہو کر کھانا منگوایا اور اس کی لاش کے ساتھ ٹیک لگا کر کھانا کھایا، حضرت عبداللہ بن عباس، عبیدۃ سلمانی اور ابن سیرین سے بھی ٹیک لگا کر کھانا ثابت ہے۔[1] حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ و تابعین ٹیک لگا کر کھانے کو ناپسند کرتے تھے تاکہ ان کے پیٹ بڑے نہ ہو جائیں۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے میں طبی کراہت ہے، شرعی نہیں۔

دونوں طرف کی روایات کو جمع کرتے ہوئے بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ ٹیک نہ لگانے کا حکم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے، بعض حضرات نے صحابہ و تابعین کے عمل کو ضرورت پر محمول کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان آثار کو ضرورت پر محمول کرنا مشکل ہے۔[3] اس لئے صحیح یہ ہے کہ ٹیک لگا کر کھانا جائز تو ہے لیکن خلاف اولیٰ ہے یعنی ادب کا مقتضا یہی ہے کہ ٹیک لگانے سے بچا جائے۔

یہ ادب کس صورت میں ہے؟

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ ادب ان چیزوں کے بارے میں ہے جنہیں باقاعدہ کھانے کے

---

(۱) یہ تمام آثار مصنف ابن ابی شیبہ ج۸/ ص ۱۲۵، ۱۲۶ سے لئے گئے ہیں۔..... (۲) حوالہ بالا ...... (۳) فتح الباری ج۹/ ص ۵۴۲

طور پر کھایا جاتا ہے، وہ چیزیں جنہیں باقاعدہ کھانا سمجھ کر نہیں کھایا جاتا، چلتے پھرتے بھی انہیں چبایا اور کھایا جاتا ہے جیسے دانے وغیرہ اسی طرح ٹافی، پان وغیرہ انہیں ٹیک لگا کر کھانے میں کوئی حرج نہیں چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لیٹ کر کیک کھانا منقول ہے۔(۱)

کھانے کے وقت بیٹھنے کی ہیئت کیا ہو؟

کھانا کھاتے وقت کسی خاص ہیئت کی شریعت نے تعیین نہیں کی، بس اتنا حکم ہے کہ ٹیک لگانے سے بچا جائے، تواضع اختیار کی جائے، اجتماعی کھانے میں زیادہ آدمی ہونے کی صورت میں اس انداز سے بیٹھا جائے کہ دوسروں کے لئے گنجائش نکل آئے ان امور کی رعایت رکھتے ہوئے جو بھی ہیئت بیٹھنے کی اختیار کر لی جائے درست ہے، بعض بزرگوں نے بیٹھنے کے چند طریقوں کا ذکر کیا ہے مثلاً دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھنے یا دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں پاؤں پر بیٹھے۔(۲) اس کا مقصد بھی بطور مثال چند طریقوں کی راہنمائی کرنا ہے، بیٹھنے کے مسنون یا جائز طریقوں کا ان میں انحصار بیان کرنا نہیں ہے۔

ہمارے ہاں بعض لوگ چوکڑی مار کر کھانے کو مکروہ سمجھتے ہیں بلکہ بعض اوقات اس پر شدید انکار بھی کیا جاتا ہے، یہ درست نہیں اس لئے کہ عام مجالس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آلتی پالتی مار کر (چوکڑی مار کر) بیٹھا کرتے تھے حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ارشاد ہے:

آکل کما یاکل العبد و اجلس کما یجلس العبد۔(۳)

ترجمہ ...... میں ایسے ہی کھاتا ہوں جیسے ایک بندہ کھاتا ہے اور ایسے بیٹھتا ہوں جیسے ایک بندہ بیٹھتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تربع (چوکڑی مارنا) کو عبدیت کے منافی نہیں سمجھا، اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر نفل پڑھ رہا ہو تو حنفیہ کے ہاں معروف تو یہی ہے کہ قرأت کے لئے بھی تشہد کے انداز سے بیٹھے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ایک روایت اور امام محمد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے۔(۴) اس سے بھی معلوم ہوا کہ بیٹھنے کی یہ حالت عبدیت کے منافی نہیں ہے، اس لئے کھانے کے وقت اس انداز سے بیٹھنے میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

البتہ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے اتکاء کی جو تفسیر فرمائی ہے، آلتی پالتی مارنا اس کے خلاف ضرور ہے لیکن پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ بات تب درست ہوتی جبکہ اس حدیث کا منشاء قلت اکل ہوتا جبکہ مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا منشاء تواضع اور عبدیت ہے البتہ اگر کوئی شخص آداب غیر منصوصہ کے

---

(۱) دیکھئے! احیاء علوم الدین مع اتحاف السادۃ المتقین ج ۵ / ص ۲۱۵ ...... (۲) فتح الباری ...... (۳) مشکوٰۃ ص ۵۲۱ ...... (۴) طحطاوی علی المراقی ص ۲۲۰

قبیل سے سمجھتے ہوئے اس طرح بیٹھنے سے بھی گریز کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں لیکن اس طرح بیٹھنے والوں پر انکار کرنا یا ان کے فعل کو خلاف ادب قرار دینا درست نہیں۔

(۱۱)-----عن قتادة عن انس، قال: ما اکل النبی صلی اللہ علیه وسلم علی خوان ولا فی سکرجة ولا خبز لـه مرقق قیل لقتادة: علی ما یاکلون قال: علی السفر۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خوان (میز یا تپائی) پر کھانا نہیں کھایا، نہ ہی کبھی چھوٹی چھوٹی رکابیوں میں کھایا اور نہ ہی آپ کے لئے کبھی چپاتی پکائی گئی، قتادہ سے پوچھا گیا کہ وہ کس چیز پر رکھ کے کھانا کھاتے تھے انہوں نے کہا دستر خواں پر۔(۱)

حل الفاظ......

خِوَان ......تپائی اور میز وغیرہ جس پر کھانا رکھ کر کھایا جائے تاکہ کھانا اونچا ہو جائے اور بار بار جھکنا نہ پڑے، اسی کو عربی زبان میں "مائدة" بھی کہہ دیا جاتا ہے، بعض اوقات دونوں لفظوں کے استعمال میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے اوپر کھانا رکھا ہوا ہو تو اسے خوان کہہ دیا جاتا ہے اور اگر کھانا نہ ہو تو مائدہ کہہ دیا جاتا ہے۔

سُکُرُجَہ ...... فارسی زبان سے عربی میں منتقل ہوا ہے، اس کا اصل معنی ہے وہ برتن جس میں سرکہ ڈال کر پیش کیا جائے، عموماً اس سے مراد چھوٹی چھوٹی رکابیاں اور پیالیاں ہوتی ہیں جن میں چٹنیاں وغیرہ ڈال کر پیش کی جاتی ہیں۔

---

(۲) اما الخوان فالمشهور فیه کسر المعجمة ویجوز ضمها وفیه لغة ثالثة اخوان بکسر الهمزة وسکون الخاء وسئل ثعلب: هل یسمی الخوان لانه یتخون ما علیه ای ینتقص؟ فقال: ما یبعد قال الجوالیقی: والصحیح انه اعجمی معروف، ویجمع علی اخونة فی القلة وخون مضموم الاول فی الکثرة وقال غیره: الخوان المائدة ما لم یکن علیها طعام۔

سکرجة بضم السین والکاف والراء الثقیلة بعد ها جیم مفتوحة .... ونقل عن ابن مکی انه صوب فتح الراء وبهذا جزم التوربشتی لانه فارسی معرب والراء فی الاصل مفتوحة ولا حجة فی ذلك لان الاسم الاعجمی اذا نطقت به العرب لم تبقه علی اصله غالبًا .... قال ابن مکی هی صحاف صغار یوکل فیها ومنها الکبیر والصغیر فالکبیرة تحمل قدرست اواق وقیل ما بین ثلثی اوقیة الی اوقیة۔

السفر جمع سفرة اصلها الطعام الذی یتخذه المسافر واکثر ما یصنع فی جلد فنقل اسم الطعام الی ما یوضع فیه کما سمیت الزاد راویة۔ (فتح الباری ج۹/ص ۵۳۲، بتغیر و حذف)

مرقق ...... نرم اور پتلی روٹی جو اچھی طرح چھنے ہوئے آٹے یا میدے سے تیار کی جاتی ہے۔

تشریح حدیث ...... اس حدیث کا اصل مقصد تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت اور آپ کی زندگی کی سادگی کو بیان کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زندگی کا بیشتر حصہ فقر و فاقہ میں گزارا، اسی سلسلے میں اگلی اور اس سے پیوستہ حدیث آرہی ہے۔ اس موضوع کی پوری تفصیل انشاء اللہ کتاب الرقاق میں آئے گی، یہاں اتنا اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقر اختیاری تھا، اگر آپ چاہتے تو بہت زیادہ مال و دولت سمیٹ کر شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ والی زندگی بھی گزار سکتے تھے، آپ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپ چاہیں تو احد پہاڑ کو آپ کے لئے سونا بنا دیا جائے لیکن آپ نے بے شمار حکمتوں کی وجہ سے یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی۔

ان چیزوں کے استعمال نہ کرنے کی وجہ:-

حدیث میں تین چیزوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے انہیں استعمال نہیں فرمایا، اس کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ آپ نے اپنے لئے چونکہ زہد و قناعت اور سادگی والی زندگی کو کئی حکمتوں کے پیش نظر اختیار فرمالیا تھا اسی لئے جو مال و دولت آپ کو ملتا، اسے بھی جلدی ہی اللہ کے راستے میں لٹا دیتے، یہی حال امہات المؤمنین کا رہا، اس لئے اس قسم کے تکلفات کی عموماً گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی البتہ شارحین حدیث نے خوان اور سکرجہ کے عدم استعمال کی بعض وجوہ ذکر کی ہیں، مثلاً "خوان" (میز یا تپائی) کے استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ اس کا منشاء بسا اوقات تکبر ہوتا ہے کہ کھانا اونچا کر لیا جائے تاکہ بار بار سر جھکانا نہ پڑے (اگرچہ کھانا اونچا کرنے کا مقصد لقمہ حاصل کرنے میں سہولت بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ عنقریب امام غزالیؒ کی عبارت میں آئے گا) اور حضور علیہ السلام نے کھانے پینے کے انداز میں تواضع و عبدیت کا خصوصی اہتمام فرمایا ہوا تھا اس لئے آپ ایسی چیز سے بھی گریز فرماتے تھے جس میں تواضع اور عبدیت کے اندر کمی کا شائبہ بھی ہو۔

خوان کو استعمال نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اس زمانے میں عربوں میں مروج نہیں تھا اس لئے بسہولت دستیاب بھی نہیں ہوتا ہوگا، چنانچہ قرطبی رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں:

هو شئی محدث فعلته الاعاجم وما كانت العرب لتمتهنها۔[1]

ترجمہ ...... یہ ایک نئی چیز ہے جسے عجمی لوگ استعمال کیا کرتے تھے، عرب ایسے نہیں تھے کہ اسے استعمال کرتے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی ج ۶/ص ۳۷۳

اسی طرح قرطبی نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے: **الاکل علی الخوان فعل الملوك وعلی المندیل فعل العجم وعلی السفرة فعل العرب وهو السنة** ۔ ”خوان پر کھانا بادشاہوں کا طریقہ ہے، رومال پر کھانا عجمیوں کا اور سفرہ (چمڑے وغیرہ کا دستر خوان) پر کھانا عربوں کا طریقہ ہے اور سنت بھی یہی ہے۔“ (۱)

سکرجہ (چھوٹی رکابیاں) استعمال نہ کرنے کی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درج ذیل وجوہ ذکر کی ہیں:

(۱)............ اس زمانے میں یہ عربوں میں بنتی اور مروج نہیں تھیں، گویا بسہولت میسر نہیں ہوتی تھیں۔

(۲)............ اس زمانے میں ایک ہی بڑے برتن میں مل کر کھانے کا رواج تھا، چھوٹے چھوٹے برتنوں کا استعمال اس کے خلاف تھا۔

(۳)............ سکرجہ کا استعمال اسی زمانے میں جہاں ہوتا تھا عموماً جوارشات اور چٹنیوں کے لئے ہوتا تھا تاکہ کھانا ہضم کرنے میں سہولت ہو، یہاں اتنا کھایا ہی نہیں جاتا تھا کہ اسے ہضم کرنے کے لئے یہ پاپڑ بیلنے پڑیں بلکہ تھوڑی سی بھوک رکھ کر ہاتھ کھینچ لئے جاتے تھے۔ (۲)

ان تینوں باتوں کا حاصل بھی رواج اور ضرورت نہ ہونا ہے۔

کسی چیز کو حضور اقدس ﷺ کا استعمال نہ کرنا:-

احادیث میں متعدد اشیاء کے بارے میں آرہا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے انہیں استعمال نہیں فرمایا، کسی چیز کے بارے میں محض اتنی بات دیکھ کر کہ آنحضرت ﷺ نے اسے استعمال نہیں فرمایا اس کے ناجائز، مکروہ یا خلاف سنت ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے اول تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کام اس زمانے میں مروج تھا یا وہ چیز اس علاقے میں عام مہیا ہو جاتی تھی یا نہیں۔ اگر وہ چیز اس زمانے میں دستیاب تھی یا وہ کام اس وقت مروج تھا، اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ نے اسے استعمال یا اختیار نہیں فرمایا تو دیکھا جائے گا کہ آپ کے اس ترک کی وجہ کیا ہے، اگر ترک کی وجہ یہ تھی کہ اس میں کوئی شرعی قباحت پائی جاتی تھی تو اس قباحت کے مطابق اسے ناجائز، مکروہ یا خلاف اولیٰ کہا جائے گا، اگر اس میں کسی شرعی قباحت کا پایا جانا واضح طور پر ثابت نہ ہو تو محض آنحضرت ﷺ کے ترک کی وجہ سے اسے ناجائز، مکروہ اور خلاف اولیٰ وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ **الا ان تکون دواعی استعماله متوفرة فیقال: انه لو کان مباحا لفعله النبی صلی الله علیه وسلم ولو مرة بیانا للجواز** ۔ اس لئے کہ آپ کے ترک کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً کوئی ایسی وجہ ہو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص ہو جیسے آپ نے کچا پیاز یا لہسن نہیں کھایا اس وجہ سے کہ آپ ہر وقت وحی کے

---

(۱) ایضاً ج ٦ / ص ٣٧٤ ...... (٢) فتح الباری ج ٩ / ص ٥٣٢

لئے تیار رہتے تھے، یا وہ چیز آپ کو طبعی طور پر اچھی نہ لگتی ہو جیسا کہ اسی باب کی حدیث نمبر ۱۴ سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو اگر کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی تو اسے چھوڑ دیتے تھے لیکن اس میں عیب نہیں نکالتے تھے، یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے سادگی، زہد و قناعت یا تنگدستی کی وجہ سے چھوڑا ہو جیسے آپ کا چپاتی نہ کھانا، یا جو کا آٹا بھی بغیر چھاننے کے استعمال فرمانا، اسی طرح کی بے شمار وجوہ ہو سکتی ہیں۔

اگر وہ چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام پائی ہی نہ جاتی تھی تو اس کا عدم استعمال تو کسی طرح بھی اس کے ناجائز، مکروہ، خلاف اولیٰ یا خلاف سنت ہونے کی دلیل نہیں، البتہ اس چیز پر دوسرے دلائل شرعیہ کی روشنی میں غور کیا جائے گا، اگر اس سے شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد حاصل ہو رہا ہے تو وہ چیز مستحسن ہو گی جیسے کھانے کے بعد ہاتھ دھوتے ہوئے اشنان (صابن) استعمال کرنا (جس کا ذکر آگے امام غزالی کی عبارت میں آرہا ہے) اور اگر اس میں کوئی قابل ذکر مفسدہ شرعیہ لازم آرہا ہے تو اس سے منع کیا جائے گا اور اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں پائی جارہی تو عام جائز کام ہو گا۔

ہم نے جو اوپر عرض کیا کہ محض یہ دیکھ کر کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں چیز کو استعمال نہیں کیا، اس کے مکروہ ہونے کا فیصلہ کر دینا درست نہیں، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل فرما رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خوان پر کھانا نہیں کھایا لیکن ابن ماجہ میں ہے کہ قتادہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے تو ان کا خباز (روٹیاں پکانے والا) کھڑا روٹیاں پکا رہا ہوتا اور آپ کا خوان رکھا ہوا ہوتا تھا یعنی کھانے کے لئے۔[1]

یہاں خود حضرت انسؓ سے خوان کا استعمال ثابت ہو رہا ہے۔ اسی طرح یہاں حضرت انسؓ فرما رہے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے کبھی چپاتی نہیں تناول فرمائی، اسی باب کی حدیث نمبر ۱۳ میں حضرت سہلؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے کبھی چھنا ہوا آٹا استعمال نہیں فرمایا، حضرت انسؓ آپ کے ہر وقت ساتھ رہنے والے خادم تھے، انہیں بھی اس صورت حال کا ضرور علم ہو گا، اس کے باوجود طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ کا باورچی آپ کے لئے میدے کو گھی میں گوندھ کر اس کی روٹی تیار کیا کرتا تھا۔[2] معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے حضور اقدس ﷺ کے ان چیزوں کے عدم استعمال کو کراہت کی دلیل نہیں سمجھا۔

یہاں امام غزالی رحمہ اللہ کی ایک عبارت کا اقتباس نقل کر دینا مفید معلوم ہوتا ہے، یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن انشاء اللہ بصیرت کا باعث ہو گا، امام غزالی رحمہ اللہ نے پہلے تو بعض بزرگوں کا قول نقل کیا ہے کہ چار چیزیں نئی ایجاد شدہ ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھیں، میز یا تپائی، آٹا

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۴۷...... (۲) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۳۱

چھاننے کی چھننی، اشنان (صابن) اور پیٹ بھر کر کھانا، اس کے بعد فرماتے ہیں:

واعلم انا وان قلنا الاكل على السفرة اولى فلسنا نقول الاكل على المائدة منهى عنه نهى كراهة او تحريم اذ لم يثبت فيه نهى وما يقال: انه ابدع بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم فليس كل ما ابدع منهيا بل المنهى بدعة تضاد سنة ثابتة وتدفع امرا من الشرع مع بقاء علته بل الابداع قد يجب فى بعض الاحوال اذا تغيرت الاسباب وليس فى المائدة الارفع الطعام عن الارض لتيسير الاكل وامثال ذلك مما لا كراهة فيه والاربع التى جمعت فى انها مبدعة ليست متساوية بل الاشنان حسن لما فيه من النظافة والاشنان اتم فى التنظيف وكانوا لا يستعملونه لانه ربما كان لا يعتاد عندهم اولا يتيسرأ وكانوا مشغولين باموراهم من المبالغة فى النظافة فقد كانوا لا يغسلون اليد ايضا وكان مناد يلهم أخمص اقدامهم وذلك لا يمنع كون الغسل مستحبا واما المنخل فالمقصود منه تطييب الطعام وذلك مباح مالم ينته الى النغم المفرط واما المائدة فتيسير للاكل وهو ايضا مباح ما لم ينته الى الكبر التعاظم۔

عبارت کا حاصل یہ ہے:

''یہ خیال رہے کہ اگرچہ ہم نے یہ کہا ہے کہ دستر خوان پر کھانا زیادہ بہتر ہے لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ میز وغیرہ پر کھانا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہے، اس لئے اس سے نہی (منع کرنا) کہیں ثابت نہیں، باقی یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کا استعمال حضور ﷺ کے بعد شروع ہوا ہے تو ہر نئی ایجاد شدہ چیز ممنوع نہیں ہوتی بلکہ ممنوع تو ایسی بدعت ہے جو سنت کے مقابلے میں ہو اور شریعت میں ثابت شدہ کسی مسئلے کو اس کی علت کے باقی رہتے ہوئے ختم کر دے بلکہ نئی چیز بعض حالات میں اسباب کے بدل جانے کی وجہ سے واجب بھی ہو جاتی ہے اور مائدہ (میز یا تپائی) میں صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کھانے میں سہولت کے لئے اسے زمین سے اونچا کر لیا جاتا ہے یا اس طرح کے اور فوائد ہوتے ہیں جن میں کوئی کراہت نہیں۔

وہ چار باتیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نئی ہیں تو یہ سب حکم میں برابر نہیں ہیں بلکہ اشنان (صابن) تو مستحسن ہے اس لئے کہ اس سے اچھی طرح نظافت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے کہ ہاتھ دھونا نظافت کیلئے ہی مستحب ہے اور اشنان سے مکمل نظافت حاصل ہو جاتی

ہے (کہ چکنائی اچھی طرح اتر جاتی ہے) اور صحابہ کرام اسے اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ ان کے ہاں اس کا رواج نہیں تھا یا دستیاب نہیں ہوتا یا ان کی زیادہ توجہ ایسے کاموں کی طرف تھی جو نظافت میں مبالغے سے اہم تھے، بعض اوقات وہ ہاتھوں کو دھویا بھی کرتے تھے (پانی کی ان کے ہاں فراوانی نہیں تھی) اور (ضروری ضروری صفائی حاصل کرنے کیلئے بعض اوقات) ان کے پاؤں کے تلوے ہی رومال کا کام دے دیتے تھے لیکن (ان کا مخصوص حالات واسباب کی وجہ سے) ایسا کرنا ہاتھ دھونے کے استحباب کے منافی نہیں ہے۔

جہاں تک چھنی کا تعلق ہے اس کا مقصد کھانے کو اچھا اور لذیذ بنانا ہے اور یہ مقصد جائز ہے بشرطیکہ بہت زیادہ ناز و نخرے تک نہ پہنچنے پائے۔ باقی رہا میز وغیرہ تو یہ کھانے میں سہولت کے لئے ہے اور جائز ہے جبکہ تکبر اور اکڑفوں کی حالت تک نہ پہنچے۔" (۱)

چھری کانٹے سے کھانا:-

مذکورہ تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ جو چمچہ یا چھری کانٹے سے کھانے کو مکروہ یا خلاف سنت قرار دیتے ہیں، یہ درست نہیں، یہ تب ہوتا جبکہ اس زمانے میں اس ماحول میں یہ چیزیں مروج اور دستیاب ہوتیں، اس کے باوجود آپ انہیں استعمال نہ فرماتے بلکہ اگر کسی وجہ سے ہاتھ دھونے کا موقع نہ ہو تو چمچہ وغیرہ استعمال کر لینا مقاصد شریعت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے جس کی تفصیل حدیث نمبر ۴۹ کے تحت ہاتھ دھونے کے مسئلہ پر گفتگو سے معلوم ہو گی ان شاء اللہ۔ البتہ اگر کوئی شخص حصول سعادت کے لئے ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ہی کھانے کا اہتمام کرتا ہے تو یہ جذبہ بھی مبارک ہے لیکن اس بنیاد پر کسی کی دل یا زبان سے تحقیر جائز نہیں۔

میز کرسی پر کھانے کا حکم:-

میز کرسی پر کھانے پر شرعاً دو اشکال ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کرسی پر بیٹھ کر کھانا ٹیک لگا کر کھانے کی ایک شکل ہے لیکن ٹیک لگا کر کھانے کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ جائز ہے اگرچہ اس سے بچنا اولیٰ ہے نیز کھانے کی کرسی کے پیچھے اگرچہ ٹیک لگانے کی جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے لیکن عموماً کھانے کے دوران اسے استعمال نہیں کیا جاتا یا کم از کم اس پر ٹیک لگانے سے احتراز ممکن ضرور ہے۔

---

(۱) احیاء علوم الدین مع الاتحاف ج ۵ / ص ۲۱۴

دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہ خوان پر کھانے کی ایک شکل ہے، اس کا حکم امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ جائز ہے، یہ بھی گزر چکا ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی اسے استعمال فرمایا ہے نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر بن زید سے بھی اس کا استعمال مروی ہے۔

اس پوری تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ میز کرسی کے بارے میں اصل حکم یہی ہے کہ اس پر کھانا جائز اور مباح ہے لیکن حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی عمومی عادت چونکہ فرش پر کوئی چیز بچھا کر کھانے کی تھی اس لئے بہتر اور باعث برکت وسعادت یہی ہے کہ اسی انداز سے کھانا کھایا جائے لیکن اگر کسی وجہ سے میز کرسی پر بھی کھانا پڑ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح میز کرسی پر کھانے والے کو مورد تنقید بنانا بھی درست نہیں۔

البتہ بعض اکابر نے یہ فرمایا ہے کہ میز کرسی پر کھانا اگرچہ بذات خود مباح ہے لیکن نصاریٰ کے ساتھ تشبہ کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ بات درست ہو لیکن ہمارے زمانے میں میز کرسی پر کھانا پوری دنیا میں اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب یہ کسی قوم یا مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں اس لئے ناقص خیال میں یہی آتا ہے کہ ہمارے دور میں اصل حکم لوٹ آئے گا جو کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی اس کا استعمال جائز ہے اگرچہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ فرشی دستر خوان پر کھانا کھایا جائے۔ اس بات کی تائید حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک وعظ کے درج ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

> میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز ناجائز ہے بلکہ وہ ناجائز ہے جس کو خصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری قوم کے ساتھ وہ جائز ہے، مونڈھے کرسی میں امتیازی شکل نہیں رہی وہ کسی خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی اس لئے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں امتیازی شکل باقی ہے اس لئے ناجائز ہے، اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دیکھ کر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے ورنہ تشبہ نہیں چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کرسی مونڈھے میں ایسا نہیں ہے اس پر دوسری چیزوں کو قیاس کرلو۔ (۱)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، فرمایا:

> میز کرسی پر کھانے کی قباحت وکراہت میں بعض مقامات (علاقوں) میں تامل ہوتا ہے (یعنی مسئلہ قابل غور بن جاتا ہے) کیونکہ ان مقامات میں یہ عام طور سے مشہور

---

(۱) حقیقت مال وجاہ ص ۱۴۳، مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

ہو چکا ہے اور عام ہو جانے اور شہرت کی وجہ سے تشبہ سے نکل جائے گا مگر پورا عام نہیں ہوا اس لئے دل میں کچھ کھٹک سی رہتی ہے جب تک دل میں کھٹک ہے تو پھر تشبہ کی وجہ سے (بھی) ناجائز رہے گا۔

(۱۲)-----وعن انس رضی الله عنه قال ما اعلم النبی ﷺ رای رغیفا مرققا حتی لحق بالله ولا رای شاۃ سمیطا بعینه قط۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی چپاتی دیکھی یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جا ملے اور نہ ہی آپ نے کھال سمیت کبھی بھنی بکری دیکھی (کھانا تو دور کی بات رہی)۔

تشریح ...... سمیط یا سموط اس بکری کو کہا جاتا ہے جسے ذبح کرنے کے بعد بال کھینچ کھینچ کر اتار لئے جائیں، پھر کھال سمیت پکا لیا جائے عموماً اسے بھاپ سے پکایا جاتا تھا، حدیث کا مقصد ایسی بکری کا عدم جواز یا اس کی کراہت بیان کرنا نہیں ہے بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد بیان کرنا مقصود ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس طرح کی بکری میں دو طرح سے تعیش پسندی پائی جاتی ہے، ایک اس طرح سے کہ عموماً ایسا بکری کے چھوٹے بچے کے ساتھ کیا جاتا تھا، اگر اس کے بڑا ہونے کا انتظار کیا جاتا تو اس کی قیمت بڑھ جاتی، دوسرے اس لئے کہ اگر کھال اتار کر پکایا جائے تو کھال کسی اور کام میں استعمال ہو سکتی ہے لیکن اس وجہ سے اس طرح بھنی بکری کو وسعت کے حالات میں ناجائز اور مکروہ نہیں کہا جا سکتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کھانے کو لذیذ بنانے کے لئے اس پر مزید خرچہ کیا جائے۔

(۱۳)-----عن سهل بن سعد، قال: ما رای رسول الله صلی الله علیه وسلم النقی من حین ابتعثه الله حتی قبضه الله وقال: ما رای رسول الله صلی الله علیه وسلم منخلا من حین ابتعثه الله حتی قبضه الله قیل کیف کنتم تاکلون الشعیر غیر منخول؟ قال: کنا نطحنه وننفخه فیطیر ما طار وما بقی ثریناه فاکلناه۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ ...... حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بعثت سے لے کر انتقال تک کبھی میدے کی روٹی نہیں دیکھی اور انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت سے لے کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا آٹا چھاننے والی چھلنی نہیں دیکھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبض فرما لیا، ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگ بے

چھنے جو (کا آٹا) کیسے کھالیتے تھے، انہوں نے فرمایا کہ ہم اسے پیستے تھے اور اس پر پھونک مارتے تھے، (موٹا موٹا) جو اڑنا ہوتا تھا اڑ جاتا، باقی کو بگھو لیتے اور کھالیتے۔

النقي: اى خبز الدقيق الحوارى وهو النظيف الابيض۔

منخلا: بضم الميم ما ينخل به الدقيق قال الكرمانى نخلت الدقيق اى غربلته قال الحافظ الاولى ان يقول اخرجت منه النخالة۔

تشریح ...... یہ جو فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد میدے کی روٹی نہیں دیکھی، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آپ نے بعثت سے قبل دیکھی ہو، خاص طور پر جبکہ آپ نے تجارتی قافلے کے ساتھ شام کی طرف سفر فرمایا تھا اس لئے کہ شام رومیوں کے ماتحت تھا اور رومیوں میں ایسی چیزیں کافی مروج تھیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ بھی ثابت فرمایا ہے کہ کھانے کی چیز میں پھونک مارنے سے جو ممانعت آتی ہے وہ پکے ہوئے کھانے کے بارے میں ہے، کچی چیز کے بارے میں نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں جو کے آٹے میں پھونک مارنے کا ذکر ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ضرورت کے موقع پر پھونک مارنا جائز ہے خصوصاً جبکہ اس سے دوسروں کو گھن آنے کا خطرہ نہ ہو۔ یہاں بھی ضرورت تھی اس لئے کہ آٹے کا موٹا موٹا حصہ الگ کرنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔

(١٤) ----- وعن ابى هريرة قال: ما عاب النبى صلى الله عليه وسلم طعامًا قط، ان اشتهاه اكله وان كرهه تركه۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے کبھی کسی کھانے کا عیب نہیں نکالا، اگر کھانے کو دل چاہا تو کھالیا، اگر کھانا پسند نہ ہوا تو اسے چھوڑ دیا۔

تشریح ......

کھانے کی چیز میں عیب نکالنے کا حکم:-

کھانے کی چیز میں عیب نکالنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، ہر ایک کا حکم الگ الگ لکھا جاتا ہے:

(۱) .... کھانے میں عیب اس انداز سے نکالنا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے خلق پر اعتراض ہو یعنی یہ تاثر ابھرے کہ یہ چیز بذات خود بے کار ہے اور اس کی پیدائش ہی نعوذ باللہ غلط ہے، اس طرح کا عیب نکالنا ظاہر ہے کہ ناجائز ہے۔

(۲)........... عیب نکالنے کا مقصد محض اپنی طبیعت اور مزاج بیان کرنا ہی ہو کہ یہ چیز طبعی طور پر مجھے پسند نہیں، یہ اگرچہ جائز ہے لیکن بلا مقصد ایسا کرنا مناسب نہیں، حضور ﷺ نے بھی بعض جانوروں کے گوشت کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا لیکن یہ اس لئے فرمایا کہ آپ کے تناول نہ فرمانے کی وجہ سے بعض صحابہ نے سوال کیا تھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ یہ مجھے ناپسند ہے۔

(۳)........... کھانے کی چیز کا عیب اس انداز سے بیان کرنا کہ اس سے اعتراض کسی بندے پر ہو مثلاً یہ کہنا کہ کھانے میں نمک مرچ کم ہے یا زیادہ ہے، کھانا کچا ہے، زیادہ پکا ہوا ہے وغیرہ یا کوئی شخص پھل لے کر آیا ہے تو یہ کہنا کہ پھل کچا ہے یا گلا ہوا ہے کہ اس میں درحقیقت لانے والے کے سلیقہ پر اعتراض کرنا مقصود ہوتا ہے ایسی حالت میں بھی بلا ضرورت عیب نکالنے سے بچنا چاہئے خصوصاً جبکہ تیار کرنے والے یا لانے والے کی دل شکنی کا خطرہ ہو البتہ اگر وہ شخص ایسا ہو کہ اس کی تربیت اور اسے سلیقہ سکھانا اس کی ذمہ داری ہو تو اصول تربیت کا خیال رکھتے ہوئے عیب بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح کھانا تیار کرنے والا یا لانے والا شخص اپنے زیر تربیت تو نہیں ہے لیکن نصیحت اور خیر خواہی کے طور پر اسے عیب سے مطلع کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ اس سے بچنے کی کوشش کرے، اسی طرح ملازم کو بھی کھانے وغیرہ کی تیاری اور اس کی خریداری میں نقص سے آگاہ کر دینا درست ہے۔

کھانے کی تعریف:-

آنحضرت ﷺ کے کھانے میں عیب نہ نکالنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایسا کرنا درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص نے کھانے کو مقاصد زندگی میں شامل کر رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ اس سے کوسوں دور تھے، یہی وجہ ہے کہ شمائل ترمذی میں ہے کہ آپ جس طرح کھانے کا عیب نہیں نکالتے تھے اسی طرح اس کی تعریف بھی نہیں کیا کرتے تھے اس لئے کہ کھانے کی تعریف کرنا بھی حرص کی علامت ہے البتہ اگر مقصود کھانا تیار کرنے والے کی حوصلہ افزائی اور اس کا دل بڑھانا ہو تو کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

(۱۵)-----وعنه ان رجلا كان ياكل اكلا كثيرا فاسلم فكان ياكل قليلا فذكر ذالك للنبى صلى الله عليه وسلم فقال: ان المؤمن ياكل فى معى واحد والكافر ياكل فى سبعة امعاء، رواه البخارى وروى مسلم عن ابى موسٰى وابن عمر المسند منه فقط وفى اخرى له عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ضافه ضيف وهو كافر فامر رسول الله صلى الله عليه وسلم بشاة فحلبت فشرب حلابها ثم اخرى فشربه ثم اخرى فشربه حتى شرب حلاب

سبع شياه ثم انه اصبح فاسلم، فامر له رسول الله صلى الله عليه وسلم بشاة فحلبت فشرب حلابها ثم امر باخرى فلم يستتمها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم المؤمن يشرب فى معى واحد والكافر يشرب فى سبعة امعاء۔

ترجمہ ...... اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص تھا جو (پہلے تو) بہت زیادہ کھایا کرتا تھا مگر جب مسلمان ہوا تو کم کھانے لگا چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ مؤمن تو ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس روایت کو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جس میں (یہ واقعہ مذکور نہیں ہے بلکہ) محض آنحضرت ﷺ کا ارشاد مذکور ہے لیکن مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں یوں ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کے ہاں ایک مہمان آیا جو کافر تھا، رسول کریم ﷺ نے اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری دوہی گئی اور اس کافر نے اس دودھ کو پی لیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے دوسری بکری دوہی گئی، وہ اس دودھ کو بھی پی گیا یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ پھر جب صبح ہوئی تو وہ مسلمان ہو گیا، رسول کریم ﷺ نے (اس وقت بھی) اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری دوہی گئی اور اس نے اس کا دودھ پی لیا، پھر آپ ﷺ نے دوسری بکری دوہنے کا حکم دیا (بکری دوہی گئی) لیکن (اب) وہ اس کا پورا دودھ نہ پی سکا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔"

تشریح ...... یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن پر محدثین اور شارحین حدیث نے طویل بحثیں فرمائی ہیں، یہاں ضروری چند منتخب باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

نتڑیوں کی تعداد:-

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتڑیوں کی کل تعداد سات ہے، حافظ ابن حجر اور قاضی عیاض وغیرہ نے اطباء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں کہ معدہ سمیت کل آنتیں سات ہیں لیکن اصل مقصود آنتوں کی تعداد بیان کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ کافر کی خوراک مؤمن سے کئی گنا زیادہ ہوتی

ہے، سات کا عدد عربی زبان میں محض تکثیر یعنی کثرت بتانے کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔

حدیث کا مطلب اور ایک اشکال کا جواب:-

حضور ﷺ نے جو فرمایا کہ مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں، اس کے بنیادی طور پر دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ مقصود اہل ایمان کو قلت اکل کی ترغیب دینا ہے یعنی بسیار خوری کافروں کو تو زیب دیتی ہے اس لئے کہ ان کے لئے دنیوی عیش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، مؤمن جس کا مقصود اصلی آخرت کی زندگی ہے وہ کھانے پینے ہی کو مقصود حیات سمجھ کر اس کی کثرت میں مبتلا نہیں ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد امر واقعہ بتانا ہے کہ مؤمن کم کھانے کا عادی ہوتا ہے اور کافر اس کے مقابلے میں زیادہ کھانے کا، اسی مطلب کے مطابق یہ اشکال ہوتا ہے کہ ہم بعض اوقات دیکھتے ہیں کہ کسی مؤمن کی خوراک کسی کافر سے کافی زیادہ ہوتی ہے۔ حدیث میں اور ہمارے اس مشاہدے میں تطبیق کی کیا شکل ہوگی، اس کے جواب میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن زیادہ عام فہم اور دل کو لگنے والی باتیں حسب ذیل ہیں:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہاں مقصود ایسا قاعدہ کلیہ بیان کرنا نہیں ہے جس میں استثناء ہی نہ ہو سکے بلکہ مقصد ایک عمومی اور اکثری واقعہ بیان کرنا ہے کہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ مؤمن کی خوراک کافر کے مقابلے میں کم ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھار اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

پھر مؤمن کی خوراک جو کم ہوتی ہے تو اس کا اصل سبب ایمان اور ایمانی کیفیات اور نورانیت وغیرہ ہیں، یہ چیزیں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنا ہی مؤمن اور کافر کا تفاوت بھی زیادہ واضح ہوگا اور ایمان جتنا کمزور ہوگا اتنا ہی بسیار خوری اور قلت اکل کا یہ فرق کم ہوتا چلا جائے گا، اسی بات کو بعض حضرات محدثین نے یوں بیان کیا ہے کہ حدیث میں مؤمن سے مراد مؤمن کامل ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ذکر اللہ کے اندر یہ تاثیر ہے کہ اس سے غذائے جسمانی کم ہو جاتی ہے اور ذکر اللہ جو کہ غذائے روحانی ہے کسی درجے میں غذائے جسمانی کے قائم مقام ہو جاتا ہے چنانچہ دجال کے زمانے میں جب اہل ایمان سخت مشکل حالت میں ہوں گے، حدیث میں آتا ہے کہ تسبیح و تہلیل ان کے لئے غذا کا کام دے گی۔

پھر اوپر یہ جو کہا گیا کہ کافر عموماً مؤمن سے زیادہ کھاتا ہے اس کا عملی جائزہ لینے میں ایک غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جائزہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دو شخص ایسے لئے جائیں جو عمر اور جسمانی صحت وغیرہ کے اعتبار سے برابر ہوں لیکن ان میں سے ایک مؤمن ہو دوسرا کافر، کافر میں قلت اکل کے دوسرے اسباب مثلاً معدے کی

کمزوری یا اس کا جوگی پن وغیرہ موجود نہ ہو اسی طرح مؤمن میں کثرت اکل کے دوسرے اسباب مثلاً قد کاٹھ بڑا ہونا اور معدے کا بالکل صحیح اور تندرست ہونا وغیرہ کافر سے زیادہ نہ ہوں، یہی بات حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک وعظ "جمال الجلیل" میں بیان فرمائی ہے، حضرت کے اس وعظ کا اقتباس نقل کر دینا انشاء اللہ بصیرت کا باعث ہوگا، حضرت فرماتے ہیں:

صوفیہ کے واقعات تو اس پر شاہد عدل ہیں کہ ذکر اللہ ان کی غذا بن جاتا ہے اور غذائے جسمانی کا کام دیتا ہے، مشاہدہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے کی غذائے جسمانی کم ہو جاتی ہے یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے سے پہلے جس قدر اس کی غذا تھی اس سے اب کم ہو جائے گی، یہ مطلب نہیں کہ اس کی غذا ہر شخص سے کم ہو جائے گی اور دنیا میں کوئی اس سے کم کھانیوالا نہ ہوگا بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ خود اس شخص کی غذا جو ذکر سے پہلے تھی بعد اشتغال بالذکر کے کم ہو جائے گی اور یہی جواب ہے اس اشکال کا جو حدیث پر کیا گیا ہے کہ **المؤمن یاکل فی معا واحد والکافر یاکل فی سبعة امعاء** حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ "مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔" جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کی خوراک کافر سے کم ہوتی ہے، اس پر بعض کو اشکال پیش آتا ہے کہ ہم تو بعض مسلمانوں کی خوراک کافروں سے زیادہ دیکھتے ہیں، جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مسلمان کی خوراک ہر کافر سے کم ہوتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر کافر مسلمان ہو جائے تو اسلام کے بعد اس کی خوراک پہلے سے گھٹ جائے گی اور کفر کی حالت میں وہ جتنا کھاتا تھا اب اس سے کم کھائے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ کفر میں خاصہ ہے کہ اس سے دنیا کی حرص بڑھتی ہے، کافر کھانے کے وقت صرف پیٹ ہی نہیں بھرتا بلکہ نیت بھی بھرتا ہے اور مسلمان صرف پیٹ بھرتا ہے، اگر کسی کو اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے حدیث کا مطلب تو ایسا بیان کیا جس کے سمجھنے کیلئے کسی کافر کے اسلام کا انتظار کرنا پڑے گا تو میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم اسلام لانے والے کافر کا انتظار نہ کر سکو تو اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم دو آدمی یکساں تن و توش کے ایک حالت کے لے لو، ایک مسلمان ایک کافر، پھر ان کی خوراک کا موازنہ کرو تو یقیناً مسلمان کو کافر سے کم خوراک پاؤ گے اور تم کو جو اس میں اشکال ہوا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تم نے بعض جگہ صرف یہ دیکھ لیا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہے، دوسرا کافر ہے اور مسلمان کی خوراک کافر سے زیادہ ہے، یہ نہیں دیکھا کہ

مسلمان تندرست و توانا ہے اور کافر کمزور ہے یا مسلمان کئی وقت کا فاقہ زدہ ہے اور کافر فاقہ زدہ نہیں یا مسلمان تو پوری خوراک کھا رہا ہے اور بچانے کی فکر نہیں کرتا اور کافر اپنی پوری خوراک نہیں کھا رہا بلکہ بخل کی وجہ سے پیٹ کاٹ کر کفایت کرنا چاہتا ہے تو ایسی اختلافی حالت میں موازنہ نہیں ہو سکتا بلکہ موازنہ کی صورت وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی کہ جس قوت و صحت و جسم کا مسلمان ہو اسی جیسا کافر بھی ہو اور دونوں یکساں حالت میں ہوں، ایک دوسرے سے زیادہ فاقہ زدہ نہ ہوں اور دونوں اپنی خوراک کے موافق کھا رہے ہوں۔ (۱)

حدیث میں واقعہ کس کا ہے؟

اوپر حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں اس شخص کا واقعہ بھی مذکور ہے جو ابتداء میں کافر تھے تو ایک ہی وقت میں سات بکریوں کا دودھ پی گئے، اگلے دن مسلمان ہو جانے کے بعد ایک بکری کا دودھ تو بآسانی پی لیا لیکن دوسری کا دودھ پورا نہ پی سکے۔ یہ واقعہ کس کا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے زیادہ رجحان اس طرف ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ حضرت جہجاہ غفاریؓ کا ہے، ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ان کا واقعہ خود ان کی زبانی روایت کیا ہے کہ یہ اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ وفد بن کر حضور اقدس ﷺ کے ہاں حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ہر شخص ایک ایک شخص کو بطور مہمان لے جائے، ان کے باقی ساتھیوں کو تو کوئی نہ کوئی اپنے ساتھ لے گیا، یہ لمبے تڑنگے آدمی تھے، انہیں حضور اقدس ﷺ اپنا مہمان بنا کر اپنے ساتھ لے گئے، وہاں سات بکریوں کا دودھ نکالا گیا جو یہ سارا کا سارا پی گئے، پھر ایک ہنڈیا پکی ہوئی لائی گئی، اسے بھی کھا گئے، ام ایمنؓ نے کہا کہ جس شخص نے زیادہ کھا کر حضور اقدس ﷺ کو بھوکا رکھا، اللہ تعالیٰ اسے بھوکا رکھے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کہو، اس نے اپنا رزق کھایا ہے۔ اگلے دن یہ مسلمان ہو گئے اور دوسری بکری کا دودھ بھی نہ پی سکے، اس پر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔

اسی سے ملتے جلتے واقعات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابوبصرۃ غفاری رضی اللہ عنہ، فضلۃ بن عمر، ابوغزوان اور ثمامۃ بن اثال کے بارے میں بھی نقل کئے ہیں۔ (۲)

(۱۶)-----وعنه قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: طعام الاثنين كافي الثلاثة وطعام الثلاثة كافي الاربعة۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے

---

(۱) مجموعہ مواعظ "جزاو" ص ۲۴، ۲۵ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان...... (۲) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۳۸

فرمایا کہ دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو جاتا ہے اور تین کا کھانا چار کو کافی ہو جاتا ہے۔

(۱۷)----وعن جابر رضی الله عنه قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم، یقول: طعام الواحد یکفی الاثنین وطعام الاثنین یکفی الاربعة وطعام الاربعة یکفی الثمانیة۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو کافی ہو جاتا ہے اور دو آدمیوں کا کھانا چار کو کافی ہو جاتا ہے اور چار آدمیوں کا کھانا آٹھ کو کافی ہو جاتا ہے۔

تشریح ......دونوں حدیثوں کا اصل مقصد دو باتوں کی ترغیب دینا ہے:

(۱)...... قناعت، ایثار اور غمخواری سے کام لیا جائے، اگر ایک شخص کے پاس کھانا ہو جس سے وہ پیٹ بھر سکتا ہو تو اسے چاہئے کہ کسی ایسے شخص کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلے جس کے پاس کھانا نہیں ہے، اس لئے کہ جتنے کھانے سے ایک شخص اچھی طرح سیر ہوتا ہے اتنے سے دو آدمیوں کا اتنا گزارا ہو سکتا ہے کہ بھوک مٹ جائے، اسی طرح جس کھانے سے دو آدمی سیر ہو سکتے ہیں اس سے تین یا چار کا گزارا ہو سکتا ہے اور کھانے کی قلت کی صورت میں گزارے ہی پر اکتفا کرنا چاہئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی قحط والے سال میں یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ میں ہر گھر والوں کے ساتھ جن کے پاس پوری خوراک موجود ہے، افراد خانہ کی تعداد کے برابر بھوکوں کو شامل کروں اور آپ نے فرمایا کہ آدمی اپنی آدھی خوراک پر کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔[1]

(۲)...... بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد اکٹھے کھانا کھانے کی ترغیب بھی ہے چنانچہ طبرانی نے اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **کلوا جمیعا ولا تفرقوا فان طعام الواحد یکفی الاثنین۔** "تم مل کر کھاؤ اور متفرق ہو کر مت کھاؤ اس لئے کہ ایک شخص کا کھانا دو کو کافی ہو جاتا ہے۔"[2]

مسند بزاز میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث ہے، اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں: **وید الله علی الجماعة۔**[3]

ایک تعارض اور اس کا حل

...... حدیث نمبر ۱۶ اور حدیث نمبر ۱۷ میں بظاہر تعارض نظر آرہا ہے اس لئے کہ حدیث نمبر ۱۶ سے معلوم ہو رہا ہے کہ دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو سکتا ہے جبکہ اس سے اگلی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دو کا کھانا چار کے لئے کافی ہو سکتا ہے، پہلی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ

---

(۱) اوجز المسالک ج ۱۴/ ص ۲۸۹ ...... (۲) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۳۵ ...... (۳) حوالہ سابقہ

چار شخصوں کو تین کا کھانا کافی ہوگا جبکہ دوسری حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ چار آدمیوں کو دو کا کھانا بھی کافی ہو جائے گا۔

لیکن غور کیا جائے تو دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا اس لئے کہ اول تو حدیث کا مقصد خاص تعداد اور مقدار کا تعین کرنا نہیں ہے کہ کتنا کھانا کتنے آدمیوں کے لئے کافی ہو سکتا ہے بلکہ اصل مقصود مواسات اور ہمدردی کی تعلیم ہے کہ کھانا تھوڑا ہونے کی صورت میں بجائے اس کے کہ چند آدمی پیٹ بھر کر کھائیں اور باقی بھوکے رہیں اس کھانے میں زیادہ آدمیوں کو شامل کر لیا جائے تاکہ ہر ایک کی کم از کم ضرورت تو پوری ہو جائے نیز جب دو شخصوں کا کھانا چار کے لئے کافی ہو سکتا ہے تو تین کے لئے بطریق اولیٰ کافی ہو سکتا ہے، اسی طرح جب چار آدمیوں کو دو کا کھانا کفایت کر سکتا ہے تو تین کا تو لازماً کافی ہوگا اس لئے دونوں حدیثوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں۔

اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایتوں میں ایک ہی جملے میں دو عددوں کا ذکر موجود ہے مثلاً ابن ماجہ کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

طعام الواحد يكفى الاثنين وان طعام الاثنين يكفى الثلاثة والاربعة وان طعام الاربعة يكفى الخمسة والستة۔[1] ”ایک شخص کا کھانا دو کو کافی ہو جائے گا اور یقیناً دو کا کھانا تین کو اور چار کو کفایت کر سکتا ہے اور چار کا کھانا پانچ اور چھ شخصوں کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔“

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی معروف حدیث جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر مہمان آنے اور مہمانوں کو کھانا دیر سے ملنے کی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ناراضگی کا ذکر ہے میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس شخص کے پاس دو شخصوں کا کھانا ہو وہ تیسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جائے اور جس کے پاس چار کا کھانا ہو وہ پانچویں بلکہ چھٹے کو بھی ساتھ لے جائے۔[2]

فائدہ...... اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے پاس کھانا تھوڑا ہو تو اسے معمولی سمجھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچائے نہیں اس لئے کہ تھوڑا کھانا بھی فائدے سے خالی نہیں، اگر اس سے پوری طرح سیری نہ بھی ہو تو کسی درجے میں بھوک ختم یا کم تو ضرور ہوگی۔

(۱۸)-----وعن عائشة رضى الله عنها قالت: سمعت رسول الله ﷺ يقول:

التلبينة مجمة لفواد المريض تذهب ببعض الحزن۔ (متفق عليه)[3]

(۱) فتح الباری ج۹/ص۵۳۵ ...... (۲) حوالہ سابقہ ...... (۳) قوله: مجمة بفتح الجيم والميم الثقيلة اى مكان الاستراحة وروبت بضم الميم اى مريحة والجمام بكسر الجيم الرحة وجم الفرس ذهب اعياؤه۔ (فتح الباری ج۹/ص۵۵۰)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تلبینہ مریض کے دل کو سکون پہنچاتا اور بعض غموں کو دور کرتا ہے۔

تشریح حدیث......

تلبینہ اور اس کے فوائد:-

یہ ایک پینے والی غذا ہے جو عموماً "جو" کو پکا کر اس کا پانی چھان کر تیار کی جاتی تھی، گویا آب جو ہی کا دوسرا نام تلبینہ ہے، اس میں بعض اوقات شہد یا دودھ یا دونوں کو شامل کر لیا جاتا تھا، اسے تلبینہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا قوام اور بعض اوقات اس کا رنگ بھی "لبن" (دودھ) جیسا ہوتا ہے، یہ عموماً پسے ہوئے جو کو آگ پر جوش دے کر تیار کیا جاتا تھا، بعض اوقات ثابت جو یا آٹے کی چھان سے بھی تیار ہوتا تھا، بعض حضرات نے تلبینہ کا ترجمہ جو کا دلیہ بھی کیا ہے۔

مشکوٰۃ کے اسی باب کی حدیث نمبر ۱۷ میں اسی سے ملتی جلتی چیز "حساء" کا بھی ذکر ہے، "حساء" اصل میں ہر پینے والی غذا کو کہا جاتا ہے خصوصاً جو گھونٹ گھونٹ کر کے پی جائے، بعض شارحین کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تلبینہ پسے ہوئے جو سے تیار ہوتا تھا اور "الحساء" ثابت جو سے، اول الذکر میں غذائیت اور جو کا اثر زیادہ ہوتا تھا اور دوسرے میں لطافت زیادہ ہوتی تھی۔ جس طرح تلبینہ کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں شہد اور دودھ وغیرہ بعض چیزیں شامل کر لی جاتی تھیں، اسی طرح حساء میں بھی کیا جاتا تھا۔

مجموعہ احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تلبینہ اور حساء میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اس لئے ان کا اطلاق ایک دوسرے کی جگہ ہوتا رہتا ہے چنانچہ احادیث میں دونوں کے ایک جیسے فوائد ذکر کئے گئے ہیں، اسی طرح مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث ذکر کی گئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **علیکم بالبغیض النافع التلبینة یعنی الحساء۔**[۱] اس میں تلبینہ کی تفسیر الحساء سے کی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان کے خاندان میں کوئی فوتگی ہو جاتی اور مہمان عورتیں واپس چلی جاتیں تو آپ اہل خانہ کے لئے تلبینہ تیار کرواتیں اور ثرید بنوا کر اس کے اوپر یہ تلبینہ ڈال دیتیں اور اہل خانہ کو اس کے کھانے کا حکم دیتیں اور فرماتیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تلبینہ مریض کے دل کو سکون پہنچاتا اور کسی قدر غم کو زائل کرتا ہے۔[۲]

---

(۱) فتح الباری ج۱۰/ ص ۱۴۷......(۲) صحیح البخاری مع فتح الباری ج۹/ ص ۵۵۰

اوپر ابن ماجہ اور احمد کے حوالے سے جو حدیث نقل کی گئی ہے اس میں تلبینہ اور حساء کو **البغیض النافع** کہا گیا ہے یعنی ایسی چیز جو ذائقہ کے اعتبار سے مریض کو ناپسند ہوتی ہے لیکن اس کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے۔

اسی باب کی حدیث نمبر ا ے میں آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کسی کو بخار ہو جاتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسے حساء پلانے کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ یہ غمگین کے دل کو تقویت پہنچاتا اور بیمار کے فؤاد کو صاف کرتا ہے۔ فؤاد دل کو کہتے ہیں لیکن بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ یہاں مراد معدے کا اوپر والا حصہ ہے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ابن القیم رحمہ اللہ نے ایک روایت ذکر فرمائی ہے جس میں فؤاد کی جگہ بطن کا لفظ ہے۔[۱]

اوپر ذکر کردہ احادیث سے تلبینہ اور حساء کے بنیادی فوائد جو معلوم ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱)...... اس سے غمگین شخص کا غم ہلکا ہوتا ہے یعنی اس میں قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔

(۲)...... مریض کے دل کو سکون پہنچتا ہے۔

(۳)...... مریض کے معدے کو تقویت ملتی اور اس کی تطہیر ہوتی ہے۔

ان فوائد کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس سے غذائیت اور قوت تو کافی حاصل ہو جاتی ہے لیکن طبیعت اور معدے پر بوجھ نہیں بنتا، ابن القیم رحمہ اللہ نے اس سے غم دور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ غم اور پریشانی سے مزاج میں ٹھنڈک پیدا ہوتی اور حرارت غریزیہ کمزور ہو جاتی ہے اور یہ غذا حرارت غریزیہ کو تقویت دیتی ہے۔[۲]

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ تلبینہ مختلف طریقوں سے بنایا جاتا تھا، کس حالت میں کس قسم کے شخص کے لئے کونسا طریقہ مفید ہوگا اور کتنی مقدار میں اس کا استعمال کرنا چاہئے یہ تفصیلات حدیث میں بیان نہیں کی گئیں بلکہ انہیں ہر علاقے اور زمانے کے ماہرین کے تجربے پر چھوڑ دیا گیا ہے، کسی کے لئے ثابت جو کا تلبینہ زیادہ مفید ہوگا، کسی کے لئے پسے ہوئے جو کا اور کسی کے لئے آٹے کی چھان کا، کسی کے لئے زیادہ جوش دے کر اور زیادہ اثر نکال کر استعمال کرنا بہتر ہوگا، کسی کے لئے تھوڑے اثر والا، کسی کے لئے دودھ یا شہد وغیرہ کی آمیزش کے ساتھ مفید ہوگا، کسی کے لئے اس کے بغیر، ان تمام امور کا فیصلہ ایک ماہر طبیب ہی کر سکتا ہے۔[۳]

البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بظاہر مریض کے لئے ثابت جو کا پانی مفید ہوگا اس لئے کہ

---

(۱) زادالمعاد ج ۳/ ص ۱۰۲...... (۲) زادالمعاد ج ۳/ ص ۱۰۲

(۳) **قال الحافظ فی فتح الباری ج ۱۰/ص ۱۴۷ وینبغی ان یختلف الانتفاع بذلک بحسب اختلاف العادۃ فی البلاد ولعل اللائق بالمریض ماء الشعیر اذا طبخ صحیحا وبالحزین اذا طبخ مطحونا۔**

یہ ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور غمگین کے لئے پسے ہوئے جو اس لئے کہ اس میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے۔

اس موضوع کی مزید لغوی اور محدثانہ تحقیق کے لئے درج ذیل حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) لسان العرب ج ۱۳/ ص ۳۷۶، ج ۱۴/ ص ۱۷۶، ۱۷۷ (۲) فتح الباری ج ۹/ ص ۵۵۰، ج ۱۰/ ص ۱۴۶ (۳) زاد المعاد ج ۳/ ص ۱۰۲

مزید طبی فوائد و تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو: (۱) زاد المعاد ج ۳/ ص ۱۰۲ طب نبوی اور جدید سائنس ج ۱/ ص ۵۹-۷۴ از ڈاکٹر خالد غزنوی

(۱۹) ----- وعن انس ان خیاطا دعا النبی صلی اللہ علیه وسلم لطعام صنعه فذهبت مع النبی صلی اللہ علیه وسلم فقرب خبز شعیر ومر قافیه دباء وقدید فرایت النبی صلی اللہ علیه وسلم یتتبع الدبا من حوالی القصعة فلم ازل احب الدباء بعد یومئذ۔ (متفق علیه)[1]

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (وہ فرماتے ہیں) کہ ایک درزی نے رسول اللہ ﷺ کو ایک کھانے پر مدعو کیا جو اس نے رسول اللہ ﷺ کے لئے تیار کیا تھا، میں بھی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ گیا، اس (میزبان) نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں جو کی روٹی اور ایسا شوربا پیش کیا جس میں کدو اور خشک گوشت کے ٹکڑے تھے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ برتن کے کناروں سے کدو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تناول فرما رہے تھے، اس وجہ سے اس دن کے بعد سے میں کدو کو پسند کرتا رہا ہوں۔

حضور اقدس ﷺ کو کدو پسند تھا:-

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کدو کو پسند فرمانے کا ذکر ہے، حدیث میں لفظ "دباء" کا ہے جس کے معنی کدو کے ہیں، بعض روایات میں "دباء" کی جگہ "قرع" کا لفظ ہے، اس کا معنی بھی

(۱) الدبّاء بضم الدال المهملة وتشدید الموحدة ممدود ویجوز القصر حکاه القزاز وانکره القرطبی هو القرع وقیل خاص بالمستدیر منه .... وهو الیقطین ایضا واحده دباة ودبة وکلام ابی عبید الهروی یقتض ان الهمزة زائدة انه اخرجه فی "دبب" واما الجوهری فاخرجه فی المعتل علی ان همزتة منقلبة وهو اشبه بالصواب لکن قال الزمخشری لاندری هی منقلبة عن واو اوباء۔ (فتح الباری ج ۹/ ص ۵۲۵ وراجع ایضا لسان العرب ج ۱۴/ ص ۲۴۹)

قدید هو اللحم المملوح المجفف فی الشمس فعیل بمعنی مفعول۔ (لسان العرب ج ۳/ ص ۳۴۴)

یہی ہے البتہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "دباء" اس کدو کو کہا جاتا ہے جو گول ہو، اسی کو قرآن کریم اور بعض احادیث میں "یقطین" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔[۱]

ابن القیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ "یقطین" کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے عام ہے، یہ تربوز، ککڑی اور کھیرے وغیرہ کو شامل ہے، زمین پر پھیلنے والی ہر بیل کو یقطین کہہ دیا جاتا ہے، یہی بات مبرد وغیرہ ائمہ لغت نے کہی ہے۔[۲]

یقطین کا لفظ اگرچہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے عام ہے لیکن قرآن کریم میں اس سے مراد کدو ہی ہے چنانچہ بعض احادیث میں اسے یونس علیہ السلام کا پودا قرار دیا گیا ہے۔[۳]

کدو کے فوائد:-

یہاں پر محدثین نے اپنے تجربات اور اطباء کی تحقیقات کے مطابق کدو کے بہت سے فوائد ذکر کئے ہیں، ابن القیم رحمہ اللہ نے جو فوائد ذکر فرمائے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱)..........اس کا مزاج ٹھنڈا اور تر ہے اس لئے گرم مزاج والوں کے لئے اس سے زیادہ نفع مند کوئی چیز نہیں ہے البتہ سرد مزاج اور بلغمی مزاج والوں کے لئے یہ اتنا مناسب نہیں ہے۔

(۲)..........کدو کے اوپر گوندھا ہوا آٹا لگا کر اسے تنور وغیرہ میں بھونا جائے، آٹا اتار کر اندر سے جو پانی نکلے وہ بخار کی شدت کو کم کرتا ہے۔

(۳)..........یہ پانی پیاس کی شدت بھی کم کرتا اور عمدہ غذا کا کام دیتا ہے۔

(۴)..........کدو کا پانی پینا یا اس سے سر کو دھونا گرمی کی وجہ سے ہونے والے سر درد میں مفید ہے۔

(۵)..........یہ ایک لطیف اور زود ہضم غذا ہے اور قبض کشا بھی ہے۔

اس کے علاوہ اسے دماغ کے لئے بھی مفید قرار دیا گیا ہے، ترطیب و تقویت دماغ کے لئے تخم کدو کا استعمال قدیم اطباء کے ہاں معروف اور مجرب ہے۔

بعض جدید تجربات نے بھی اس کے فوائد کی توثیق کی ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: طب نبوی اور جدید سائنس ج ۲/ص ۲۷۷-۲۸۶ از ڈاکٹر خالد غزنوی

فوائد حدیث......

(۱)......اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بڑے مرتبہ کے آدمی کو معمولی پیشے والے شخص کی دعوت

---

(۱) سورۃ الصّٰفّٰت: ۱۴۶......(۲) زاد المعاد ج ۳/ص ۱۹۵، تفسیر قرطبی ج ۱۵/ص ۱۲۹......(۳) تفسیر قرطبی ج ۱۵/ص ۱۲۸

قبول کرنے اور اس کا کھانا کھانے میں عار محسوس نہیں کرنی چاہئے۔

(۲)...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس درزی کی دعوت قبول کرنے سے آپ کی تواضع اور اپنے صحابہ کے ساتھ حسن سلوک اور نرم برتاؤ بھی سمجھ میں آتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کرنے والا شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام تھا۔(۱)

(۳)...... اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مہمان اگر دستر خواں سے چیزیں اٹھا کر ایک دوسرے کو کھانے کے لئے پیش کریں تو یہ جائز ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہے جبکہ ایک دستر خواں ہو، اگر الگ الگ دستر خواں ہوں تو ایک دستر خواں کی چیز دوسرے دستر خواں والے کے سامنے پیش کرنا درست نہیں لیکن اگر میزبان کی صراحتاً یا دلالتاً اجازت ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

(۴)...... عربوں کی اصل روایت یہ تھی اور بہتر طریقہ بھی یہی ہے کہ میزبان مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو لیکن اگر کوئی عذر ہو اور مہمان کے ساتھ بے تکلفی کی وجہ سے اسے برا بھی نہ لگے تو خود شریک نہ ہونا بھی درست ہے۔ یہ بات اس حدیث سے معلوم ہو رہی ہے اس لئے کہ صحیح بخاری میں اس حدیث کے اندر ایک جگہ یہ لفظ بھی ہیں: **فقدم الیه قصعة فیها ثرید قال: واقبل علی عمله۔**(۲) یعنی وہ کھانا آپ کی خدمت میں پیش کر کے اپنے کام کے لئے چلا گیا۔ اس میزبان کے چلے جانے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کام ایسا فوری نوعیت کا ہو کہ اس کے لئے اسی وقت جانا ضروری ہو اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ کھانا کم ہو اور میزبان یہ چاہتا ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ تناول فرمالیں، اب آپ کے سامنے فارغ بیٹھنا اسے اچھا نہیں لگا اس لئے کسی کام کو بہانہ بنا کر آپ سے اجازت لے کر چلا گیا۔

(۵)...... اس حدیث سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت زیادہ محبت کئی طریقے سے سمجھ میں آرہی ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کدو پسند فرماتے اور اس کے قتلے تلاش کر رہے ہیں تو میں ان قتلوں کو اکٹھے کر کے آپ کے سامنے پیش کرنے لگ گیا اور خود اس میں سے نہیں کھاتا تھا۔ **فلما رایت ذلك جعلت القیه الیه ولا آكله۔**(۳)

دوسرے اس وجہ سے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کدو ہمیشہ پسند رہا حالانکہ طبعی پسند یا ناپسند غیر اختیاری معاملہ ہوتا ہے اس میں اتباع ضروری بھی نہیں لیکن جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو آدمی طبعی امور میں بھی محبوب کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، جامع ترمذی میں ابو طالوت سے روایت

---

(۱) فتح الباری ج۹/ ص ۵۲۷...... (۲) صحیح بخاری مع فتح الباری ج۹/ ص۵۵۱...... (۳) صحیح مسلم مع تکملۃ فتح الملہم ج۴/ ص ۴۴

ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس گیا وہ اس وقت کدو تناول فرمارہے تھے اور یہ ارشاد فرمارہے تھے:

یا لك شجرة ما احبك لحب رسول الله صلی الله علیه وسلم ایاك۔[1]

ترجمہ...... تو مجھے کتنا پسند ہے اس وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے پسند فرماتے تھے۔

(۲۰)-----عن عمرو بن امیة رضی الله عنه انه رای النبی صلی الله علیه وسلم یحتز من کتف شاة فی یده فدعی الی الصلاة فالقاها والسکین التی یحتز بها ثم قام فصلی ولم یتوضأ۔ (متفق علیه)

ترجمہ...... حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بکری کی ایک دستی میں سے کاٹ کاٹ کر تناول فرمارہے ہیں جو کہ ہاتھ میں تھی، آپ کو نماز کے لئے بلایا گیا تو آپ نے اس دستی کو بھی رکھ دیا اور اس چھری کو بھی جس سے آپ کاٹ رہے تھے، پھر آپ اٹھے اور نماز پڑھی لیکن (نیا) وضو نہیں کیا۔

گوشت چھری سے کاٹ کر کھانا:-

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت چھری سے کاٹ کاٹ کر کھایا ہے، یہی بات اس باب کی حدیث نمبر ۳۷ یعنی تیسری فصل کی پہلی حدیث سے بھی معلوم ہوگی، اسی باب کی حدیث نمبر ۵۱ جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں یہ آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو دانتوں سے نوچ کر تناول فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں طریقے جائز ہیں۔

البتہ اسی باب کی حدیث نمبر ۵۲ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میں چاقو کے ساتھ گوشت کاٹ کر کھانے سے منع فرمایا گیا اور اسے عجمیوں کا طریقہ قرار دیا گیا ہے جو بظاہر زیر بحث حدیث کے خلاف ہے، اس کے متعلق درج ذیل باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

(۱)...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث سنداً ضعیف ہے جیسا کہ خود صاحب مشکوۃ نے امام ابوداؤد اور امام بیہقی سے یہ بات نقل کر دی ہے جبکہ زیر بحث حدیث جس سے چھری سے کاٹ کر کھانے کی اجازت معلوم ہو رہی ہے۔ بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے اس لئے اسے ترجیح ہوگی۔

(۲)...... البتہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی تائید دو اور حدیثوں سے ہوتی ہے ان میں سے ایک تو

---

(۱) جامع ترمذی ج ۲/ ص ۷، باب ما جاء فی اکل الدبا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کا مضمون بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب قریب ہے البتہ اس میں روٹی کو چاقو کے ساتھ کاٹنے سے بھی نہی ہے لیکن یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ (۱)

دوسری حدیث حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کی ہے جسے امام ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: **انهسوا اللحم نهسا فانه اهنا وامرا** ۔(۲) ”گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھاؤ، اس لئے کہ وہ زیادہ لذت کا باعث اور زیادہ خوشگوار ہوتا ہے۔“

سند اس حدیث کی بھی ضعیف ہے لیکن تعدد طرق کی وجہ سے حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

(۳)...... لیکن حدیث صفوان میں گوشت کاٹ کر کھانے سے ممانعت نہیں ہے، صرف دانتوں سے نوچ کر کھانے کی ترغیب ہے اور وہ بھی بعض دنیوی فوائد اور مصالح کی بنیاد پر۔

مذکورہ امور کے پیش نظر پوری بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ گوشت وغیرہ چھری سے کاٹ کر کھانا بلا کراہت جائز ہے البتہ بعض فوائد کے پیش نظر نوچ کر کھانے کی ترغیب دی گئی ہے خصوصاً جبکہ گوشت اچھی طرح گلا ہوا ہو اور دانتوں سے نوچنے میں دقت محسوس نہ ہوتی ہو، دوسرے لفظوں میں دانتوں سے نوچ کر کھانے کا امر ارشادی ہے، اس میں شرعی مسئلہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ (۳)

آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو:-

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پکا ہوا گوشت کھانے کے بعد تازہ وضو کئے بغیر ہی نماز پڑھائی ہے۔

(۲۱)-----وعن عائشة رضی الله عنها قالت: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یحب الحلواء والعسل۔ (رواہ البخاری)

---

(۱) قال الهیثمی: رواه الطبرانی وفیه عباد بن کثیر الثقفی وهو ضعیف (مجمع الزوائد ج۵/ص ۴۰) وضعفه کذلك العراقی فی تخریج الاحیا ج۳/ص ۵ وذکر العراقی حدیث ابی هریرة فی النهی عن قطع الخبز وقال فیه نوح بن ابن مریم وهو کذاب۔

(۲) ترمذی ج۲/ص ۵، وقد ضعف هذا الحدیث من اجل عبد الکریم بن ابی المخارق لکن رواه الطبرانی فی الکبیر ج۸/ص ۴۸ من وجوه اخری ویراجع ایضا فتح الباری ج۹/ص ۵۴۷

(۳) وقد حمل بعضهم حدیث عمرو بن امیة علی مالا یکون نضیجا جیدا لکن فیه جعل الحدیث المتفق علی صحته تابعا لحدیث لم یبلغ درجة الصحة ومقیدا به۔

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کو حلوہ اور شہد پسند تھے:-

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم "حلوی" اور شہد کو پسند فرماتے۔ "حلوی" اور "حلواء" دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں، ان سے مراد معروف پکا ہوا حلوہ بھی لیا جاتا ہے اور ہر میٹھی چیز پا بھی یہ لفظ بول دیئے جاتے ہیں۔[1]

حدیث میں بھی دونوں معانی مراد لئے جا سکتے ہیں، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں "الحلوی" اور "الحلواء" سے مراد ہر میٹھی چیز ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میٹھی چیز پسند تھی، اس پر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوگا کہ اس میں تو شہد بھی داخل ہے، اس کو الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ شہد کو الگ ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کو اگرچہ ہر میٹھی چیز پسند تھی لیکن شہد خصوصیت کے ساتھ زیادہ پسند تھا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "الحلوی" سے مراد تیار کیا ہوا اور پکا ہوا حلوہ ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا کہ حدیث میں تیار کیا ہوا حلوہ مراد نہیں ہے اس لئے کہ ایسا حلوہ تو حضور ﷺ نے دیکھا ہی نہیں ہے لیکن یہ رائے درست نہیں ہے بلکہ زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تیار کیا ہوا حلوہ ہی مراد ہے، علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "حلوی" کا لفظ بولا ہی اس چیز پر جاتا ہے جس کو خود تیار کیا گیا ہو، فطری طور پر میٹھی چیز پر یہ لفظ بولا ہی نہیں جاتا نیز حضور ﷺ سے تیار کیا ہوا حلوہ تناول فرمانا بھی ثابت ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ شہد، گھی اور آٹے سے لدی ہوئی اونٹنی لئے جارہے ہیں، حضور ﷺ نے (بے تکلفی کی وجہ سے) فرمایا کہ اونٹنی بٹھاؤ، انہوں نے اونٹنی بٹھائی، پھر آپ نے ایک دیگچی منگوائی اور اس میں شہد، گھی اور آٹا ڈالا، پھر آپ کے حکم پر اس کے نیچے آگ جلائی گئی یہاں تک کہ وہ پک گیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کھاؤ، چنانچہ حضور ﷺ نے بھی اسے تناول فرمایا، علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔[2]

---

(۱) هی عند الاصمعی بالقصر تکتب بالیاء وعند الفراء بالمد تکتب بالالف وقیل: تمد وتقصر قال اللیث: الاکثر علی المد وهو کل حلو یوکل وقال الخطابی: لا یطلق اسم الحلوی الا علی ما دخلته الصنعة وفی المخصص لابن سیدة: هی ما عولج من الطعام بحلاوة وقد تطلق علی الفاکهة۔ (فتح الباری ج۹/ ص۵۵۷)

(۲) قال الهیثمی: رواه الطبرانی فی الثلاثة ورجال الصغیر والاوسط ثقات۔ (مجمع الزوائد ج۵/ ص۴۱)

(۲۲)-----عن جابر رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ سأل اھلہ الادم: فقالوا: ما عندنا الاخل فدعا بہ فجعل یاکل بہ ویقول: نعم الادام الخل۔ (رواہ مسلم)[1]

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے گھر والوں سے سالن طلب فرمایا، گھر والوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو صرف سرکہ ہے، چنانچہ آپ نے وہی منگوایا اور اس کے ساتھ (روٹی) تناول فرمانے لگے اور یہ ارشاد فرمانے لگے کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔

سرکہ اچھا سالن ہے:-

اس حدیث کی تشریح میں علامہ خطابی اور قاضی عیاض وغیرہ نے فرمایا ہے کہ حدیث کا مقصد سرکہ کی فضیلت بیان کرنا نہیں بلکہ قناعت کی ترغیب دینا ہے یعنی اچھے اور لذیذ سالن کا مل جانا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن اس کی ایسی طلب اور اس میں ایسا انہاک جس کی وجہ سے اچھا اور لذیذ سالن نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہو جائے اور لقمہ ہی حلق سے نیچے نہ اترے یہ مناسب نہیں ہے بلکہ جیسا کیسا ملے کھالے، اگر گزارہ کرنا ہو تو کوئی بھی چیز سالن کا کام دے دیتی ہے، سرکہ سے بھی سالن کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے اس سے اتفاق نہیں کیا، ان کی رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد سرکہ کی تعریف کرنا ہی ہے اس لئے کہ صحیح مسلم کی بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ جملہ سننے کے بعد میں ہمیشہ سرکہ کو بہت پسند کرتا رہا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بہرحال اس جملے کا مقصد سرکہ کی تعریف ہی سمجھے تھے۔

لیکن حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہ کی عاشقانہ اداؤں کا حصہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ حدیث کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے، ظاہر حدیث پر پوری طرح عمل کی کوشش کیا کرتے تھے، صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد تو یہاں قناعت کی ترغیب اور لذات میں انہماک سے منع کرنا ہی ہے تاہم سرکہ کی فضیلت بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ آپ نے اسے اچھا سالن قرار دیا ہے۔

(۲۳)----- عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ قال: قال النبی صلی اللہ علیہ

---

(۱) قال الطیبی: الادام اسم لما یؤتدم بہ ویصطبغ وحقیقتہ ما یوتدم بہ الطعام ای یصلح وھذا یجیء لما یفعل بہ کثیرا کالرکاب لما یرکب بہ والحرام لما یحرم بہ)

وسلم: الكماة من المن وماؤها شفاء للعين ، متفق عليه وفى رواية لمسلم: من المن الذى انزل الله تعالىٰ علىٰ موسىٰ عليه السلام۔

ترجمہ ...... حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ اس من میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا۔

کھمبی من میں سے ہے:۔

کماہ ایک خود رو نبات ہے جسے اردو میں کھمبی اور انگریزی میں مشروم (Mushroom) کہا جاتا ہے۔[1] علم نباتات میں اسے فنگس (Fungus) کے خاندان سے شمار کیا جاتا ہے، اس کی بے شمار اقسام ہیں، جن میں سے کھانے کے لئے سب سے زیادہ مشہور سفید رنگ کی کھمبی ہے۔

حدیث شریف میں اس کو من کہا گیا ہے، من کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک معنی من کا ہوتا ہے احسان اور فضل، یہاں یہ معنی مراد لئے جائیں تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ کھمبی اللہ کے فضل میں سے ہے، دوسرے معنی اس کے ہیں وہ من جو اللہ تعالیٰ نے وادی تیہ میں بنی اسرائیل کو عطا فرمایا تھا جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے: **وانزلنا عليكم المن والسلوى**۔ اس حدیث میں اگرچہ بعض حضرات نے پہلے معنی بھی مراد لئے ہیں لیکن ہمارے پیش نظر مسلم کی روایت کے یہ لفظ **من المن الذى انزل الله على موسىٰ عليه السلام** سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ یہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں چنانچہ اکثر شارحین حدیث یہی معنی مراد لیتے ہیں۔

پھر جن حضرات نے بنی اسرائیل والا من مراد لیا ہے ان کی اس میں بحث چلی ہے کہ کھمبی کے اس من میں سے ہونے کا کیا مطلب ہے، خطابی وغیرہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ حدیث کا یہ

---

(۱) قال ابن القيم : قال ابن الاعرابى: الكماة جمع واحده كمء وهذا خلاف قياس العربية، فان ما بينه وبين واحده التاء فالواحد منه بالتاء واذا حذفت كان للجمع وهل هو جمع او اسم جمع على قولين مشهورين قالوا ولم يخرج عن هذا الا حرفان كماة وكمء وخباة وخب وقال غير ابن الاعرابى بل هى على القياس الكمأة للواحد والكمء للكثير وقال غيرهما: الكمأة تكون واحدا وجمعا واحتج اصحاب القول الاول بانهم جمعوا كماة على اكمؤ قلت: وقد جاء الجمع على اكمؤ فى حديث ابى هريرة عند الترمذى۔ (زاد المعاد ج ۳ / ص ۱۸۱)

مقصد نہیں کہ کھمبی سچ مچ اس من و سلویٰ کا حصہ تھی جو بنی اسرائیل کو عطا کیا گیا تھا بلکہ یہاں مقصود کھمبی کو اس من کے ساتھ تشبیہ دینا ہے کہ جیسے من و سلویٰ بنی اسرائیل کو محنت و مشقت کے بغیر حاصل ہوا تھا، اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو اگانے کے لئے انسان کو کوئی محنت اور مشقت نہیں کرنی پڑتی بلکہ خودرو ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ واقعی کھمبی بنی اسرائیل کے من میں شامل تھی، حدیث کے ظاہری الفاظ اسی تشریح کے زیادہ قریب ہیں اور یہ بات عقلاً بعید بھی نہیں ہے اس لئے حدیث کو اپنے ظاہری معنی سے ہٹانے کی بظاہر ضرورت نہیں ہے، رہی یہ بات کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ من ترنجبین شکل کی کوئی چیز تھی تو ہو سکتا ہے کہ من میں کئی چیزیں شامل ہوں، ترنجبین بھی ہو اور کھمبی بھی۔

کھمبی کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ارشاد فرمانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ عرب اسے زمین کی چیچک کہا کرتے تھے اور اسی وجہ سے بعض لوگ اسے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔

کھمبی کے فوائد ...... قدیم اطباء نے کھمبی کے بہت سے فوائد گنوائے ہیں، مقوی باہ، مدر بول، مخرج بلغم اور دودھ پیدا کرنے والی ہے، ہر نیا میں اس کا لیپ مفید قرار دیا گیا ہے، خون بڑھاتی ہے، جدید مشاہدات اور تجربات سے بھی اس کی افادیت واضح ہو رہی ہے چنانچہ یورپ وغیرہ کے ہوٹلوں میں اس کا شمار مقبول ڈشوں میں ہوتا ہے، اب اسے خود اگانے کے طریقے ایجاد کر لئے گئے ہیں اور اس کا وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا ہے۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کھمبی کے جس طرح بہت سے فوائد ہیں اسی طرح اس میں بعض ضرر اور نقصان کے پہلو بھی ہیں، بعض اوقات پیٹ میں خرابی اور اعصاب میں کمزوری پیدا کرتی ہے، زہریلے اثرات کی حامل ہوتی ہے اس لئے یہاں دو باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں، ایک یہ کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ کھمبی کی پچاسوں قسمیں ہیں، ان میں سے بعض مفید ہیں اور بعض مضر، مثلاً سفید کھمبی کو مفید شمار کیا گیا ہے اور کالی چھتری والی کھمبی (جسے ویدک طب اور پنجابی زبان میں "پد بھیڑا" کہا جاتا ہے) مضر ہے، حدیث میں کھمبی کی تمام اقسام کو من و سلویٰ میں سے قرار دینا مقصود نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ جو قسمیں مفید ہیں ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو اکیلی استعمال کی جائیں تو نقصان دیتی ہیں اور دوسری اشیاء کے ساتھ ملا کر استعمال کی جائیں تو فائدہ مند ہوتی ہیں مثلاً ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس کو پکاتے وقت اس کے ساتھ صعتر کو ضرور شامل کرنا چاہئے، یہ اس کے لئے مصلح ہے۔

پھر جو چیز اکیلی بھی مفید ہو اس کو زیادہ مقدار میں استعمال کرنا بعض اوقات نقصان دہ ہوتا ہے، اسی

طرح مفید چیز بعض طبیعتوں اور مزاجوں کے لئے مضر بھی ہو سکتی ہے۔

کھمبی کون سی کھانی چاہئے، کتنے کھانی چاہئے، کس چیز کے ساتھ کھانی چاہئے اور کتنی مقدار میں کھانی چاہئے یہ سوالات ایسے ہیں جن کا جواب اطباء کے تجربات و مشاہدات پر چھوڑ دیا گیا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص طبیب کی رائے کے بغیر استعمال کرتا ہے اور اسے کوئی نقصان ہو جاتا ہے یا کسی طبیب کے مشورے سے استعمال کرنے کے باوجود کسی نقصان کا شکار ہو جاتا ہے تو یہ اس کی اپنی یا اس کے طبیب کی غلطی ہے، اس کی وجہ سے حدیث کی صداقت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہاں پر ابن القیم رحمہ اللہ نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ اگر کھمبی اس من کا حصہ ہے جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی تو اس میں نقصان اور ضرر کا یہ پہلو کہاں سے آ گیا، اس صورت میں تو اسے خیر محض ہونا چاہئے تھا، ابن القیم رحمہ اللہ نے خود ہی اس سوال کا بڑی تفصیل سے جواب دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات جب کوئی چیز شروع شروع میں آتی ہے تو وہ سراپا خیر ہی ہوتی ہے لیکن اس عالم میں رہنے کے بعد اس کی اشیاء اور اسباب سے مسلسل واسطہ پڑتے رہنے سے وہ چیز ان کا اثر قبول کرتی ہے اور یوں اس میں بعض نقصانات بھی شامل ہو جاتے ہیں اور جن اسباب کے اثر کی وجہ سے ایسی اشیاء میں نقصانات پیدا ہوتے ہیں ان میں سر فہرست بندوں کے گناہ اور ان سے سرزد ہونے والی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں ہیں۔[1]

کھمبی کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے ...... اس حدیث میں دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ کھمبی کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے، اس حدیث کی تشریح میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں کھمبی سے مراد کھمبی سے نکلا ہوا پانی نہیں ہے بلکہ کھمبی کی پیدائش کا سبب بننے والا یعنی بارش کا پانی مراد ہے لیکن عام شارحین حدیث نے اس تشریح کو الفاظ حدیث سے بعید قرار دیتے ہوئے اس سے اتفاق نہیں کیا، صحیح یہی ہے کہ یہاں کھمبی کا اپنا پانی ہی مراد ہے اور اسی کو آنکھوں کے لئے شفا قرار دینا مقصود ہے۔ اگر کسی زمانے تک اطباء کے تجربات اور ان کے علم سے اس کے آنکھوں کے لئے مفید ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی تو اس سے متاثر ہو کر حدیث میں دور دراز کی تاویل کا راستہ اختیار کر لینا کوئی پسندیدہ طرز فکر نہیں سمجھا گیا۔

نیز ابن قیم رحمہ اللہ نے شیخ ابن سینا اور ان کے استاذ مسیحی اور دوسرے بعض قدیم اطباء کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اس کا پانی رمد (آنکھ دکھنا) جو گرمی کی وجہ سے ہو اس کے لئے مفید ہے اور یہ بینائی کو تیز کرتا اور نکھارتا ہے خاص طور پر جبکہ اسے اثمد سرمہ میں ڈال کر پیس کر آنکھوں میں ڈالا جائے۔[2]

ترمذی کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا تجربہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی ایک

---

(۱) ملاحظہ ہو: زاد المعاد ج ۳/ص ۱۸۲ طبع مصر..... (۲) ملاحظہ ہو: زاد المعاد ج ۳/ص ۱۸۳

باندی چندھی تھی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کھمبی کا پانی نچوڑ کر کچھ دن اس کی آنکھوں میں ڈالا تو وہ تندرست ہو گئی، اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ کے بعض مشائخ سے نقل کیا ہے کہ کھمبی کے پانی کے استعمال سے ان کی بینائی لوٹ آئی۔[۱]

جدید مشاہدات اور تجربات سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ کھمبی میں جراثیم کش اجزاء موجود ہوتے ہیں اس لئے اس کے پانی کا آنکھوں کی بعض امراض میں مفید ہونا بعید از قیاس نہیں، ہومیو پیتھی طریقہ علاج میں تو زہریلی کھمبی پر مبنی بعض ادویہ جیسے Agoricus جن علامات کے لئے استعمال کی جاتی ہیں ان مین سر میں چکر آنا، روشنی بری لگنا، معمولی کام سے آنکھوں پر بوجھ پڑنا، ایک کے دو نظر آنا، پلکیں پھڑ پھڑانا شامل ہیں۔[۲]

تاہم یہ قدیم و جدید طبی تجربات نہ بھی ہوتے تب بھی اصل یہی ہے کہ حدیث کو اپنے ظاہری معنی سے ہٹا کر اس میں دور دراز کی تاویل نہ کی جائے اس لئے کہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ایک چیز کی افادیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں، ایک عرصے تک اطباء اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن آخر کار نئے تجربات اور تحقیقات سے بھی اس کی سچائی ثابت ہو جاتی ہے لہٰذا احادیث میں بیان کردہ حقیقت کو اگر آج اطباء اور سائنس دان درست تسلیم نہیں کرتے تو ہو سکتا ہے کہ کل کرلیں، ہمارا اعتقاد ان طبی اور سائنسی تحقیقات کی وجہ سے نہیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ارشاد کی وجہ سے ہے۔

(۲٤)----- وعن عبد الله بن جعفر رضى الله عنه قال رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم ياكل الرطب بالقثاء۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ تر کھجوریں ککڑی کے ساتھ تناول فرما رہے تھے۔

ککڑی اور کھجور ملا کر کھانے کا طریقہ دوسری روایات میں آتا ہے کہ ایک لقمہ اس میں سے لیتے اور ایک اس میں سے۔[۳] اس طرح دونوں چیزیں منہ میں جمع ہو جاتی تھیں، بعض روایات میں آتا ہے کھجور آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی اور ککڑی بائیں ہاتھ میں۔[۴]

دونوں چیزوں کو اس طرح ملا کر کھانے میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ کھجور تاثیر کے اعتبار سے گرم ہے اور ککڑی سرد، دونوں کو جمع کرنے سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

---

(۱) تکملہ فتح الملہم ج۴/ص۵۶ ...... (۲) تفصیل ملاحظہ ہو! طب نبوی اور جدید سائنس ج۱/ص۲۹۰-۳۰۰ از ڈاکٹر خالد غزنوی

(۳) فتح الباری ج۹/ص۵۷۳ ...... (۴) فتح الباری ج۹/ص۵۷۳

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کھجور میں مٹھاس زیادہ ہونے کی وجہ سے خاص قسم کی تیزی اور بھاری پن ہوتا ہے جب کہ ککڑی پھیکی ہوتی ہے دونوں کو ملانے سے ذائقہ میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں کہ انسان اشیاء کے قدرتی ذائقے ہی سے مستفید ہو بلکہ مختلف چیزوں کو ملا کر نیا ذائقہ تخلیق کرنا بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

ان دونوں چیزوں کو ملا کر استعمال کرنے کا ایک فائدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میری رخصتی سے قبل میرے والدین کی خواہش ہوئی کہ میرا کچھ وزن بڑھ جائے اور میں موٹی ہوں جاؤں، مجھے بہت کچھ کھلایا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا آخر کار مجھے ککڑی اور کھجوریں ملا کر کھلائی گئیں جس سے میں کچھ موٹی ہو گئی۔ (۱)

اس حدیث سے علماء نے اس بات پر بھی استدلال کیا ہے کہ ایک وقت میں مختلف انواع کے کھانے کھانا جائز ہے۔

(۲۵)----- عن جابر رضی الله عنه قال: کنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بمر الظهران نجني الكباث، فقال: عليكم بالأسود منه فإنه أطيب، فقيل: أكنت ترعى الغنم؟ قال: نعم، وهل من نبي إلا رعاها۔ (متفق عليه)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضور اقدس ﷺ کے ساتھ مر الظہران (مکہ کے قریب ایک جگہ) میں پیلو کے دانے چن رہے تھے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: تم ان میں کالے دانوں کو لو اس لئے کہ وہ زیادہ اچھے (اور لذیذ) ہوتے ہیں، عرض کیا گیا: کیا آپ بکریاں چرایا کرتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں اور کیا کوئی ایسا نبی بھی ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔

الکباث کی تفسیر بخاری کے بعض نسخوں میں "ورق الاراک" یعنی پیلو کے پتوں سے کی گئی ہے لیکن راجح یہ ہے کباث ثمر الإراك کو کہتے ہیں یعنی پیلو کا درخت جس کی جڑ سے عموماً مسواک بنائی جاتی ہے اس کا پھل جو دانوں کی شکل میں ہوتا ہے، یہ دانے سے پک کر سیاہ ہو جاتے ہیں، اس سے پہلے اگر ان کو کھایا جائے تو منہ خشک کرتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ کالے کالے دانے چنو اس لئے کہ وہ زیادہ لذیذ ہوتے ہیں تو صحابہ نے سوال کیا کہ کیا آپ بکریاں چراتے رہے ہیں اس لئے کہ اس طرح کی چیزوں کا تجربہ

---

(۱) ابو داؤد ج ۲/ ص ۹۸۹ کتاب الطب و فتح الباری ج ۹/ ص ۵۷۳

چرواہوں کو زیادہ ہوتا ہے، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف میں نے ہی نہیں تمام انبیاء نے بکریاں چرائی ہیں۔

انبیاء کے بکریاں چرانے میں حکمت:-

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بکریاں چراونے میں علماء نے کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً:

(۱)......... باطنی استعداد کی ترقی کے لئے خلوت اور قطع علائق یا تعلقات میں کمی بہت اہم ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی آغاز وحی سے پہلے خلوت کا داعیہ پیدا کر دیا گیا تھا، بکریاں چرانا بھی خلوت کی ایک شکل ہے اس لئے کہ چراوہے کو صبح سویرے بکریاں لے کر نکلنا ہوتا ہے اور شام ڈھلے تھکا ماندہ واپس آتا ہے اس لئے لوگوں کے معاملات اور جھگڑوں سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا، خلوت کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انسان الگ تھلگ ہو کر عبادت میں مصروف ہو جائے اس کے بھی اپنے فوائد ہیں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلوت کی شکل ایسی ہو کہ خلوت کرنے والے کو یہ احساس تک نہ ہو کہ میں خلوت اختیار کئے ہوئے ہوں بلکہ وہ خود کو عام نوعیت کے کام اور کسب معاش میں مصروف سمجھے، اس طریقے میں بھی کئی فوائد ہیں، بکریاں چرانے سے دوسری قسم کے فوائد بہت احسن طریقے سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۲)......... ہر جانور کا ایک مزاج ہوتا ہے، اس جانور کے ساتھ رہنے سے اس کے اثرات بھی انسان میں منتقل ہوتے ہیں، بکری میں مسکنت ہوتی ہے، بکریاں چرانے سے یہ وصف انسان میں بھی منتقل ہوتا ہے، بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ ایسے جانور جن پر سوار ہوا جاسکتا ہے کے چرانے سے انسان میں کسی قدر بڑائی بھی پیدا ہو سکتی ہے، جب کہ بکریاں چرانے میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتی۔

(۳)......... بکری ادھر ادھر پھرنے اور اچھلنے کودنے والا جانور ہے، اس لئے اس کے ریوڑ کو قابو رکھنا خاصا مشکل اور اعصاب شکن کام ہے۔ اس طرح کے کام میں طبیعت میں جھنجلاہٹ پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے، دوسری طرف یہ جانور نازک ہے اس لئے اس کو مارا بھی نہیں جاسکتا، اس لئے بکریاں چرانے سے تحمل، بردباری اور شفقت وغیرہ اوصاف کی تربیت ہوتی ہے جو پیغمبرانہ دعوت کے کام کے لئے بہت ضروری ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی تواضع اور صحابہ سے بے تکلفی:-

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مل کر اور بے تکلف ہو کر رہا کرتے تھے اور ہر طرح کے موضوع پر صحابہ سے بات کرتے تھے، مصنوعی اور عرفی

متانت ووقار سے دور رہتے تھے۔

(٢٦)-----وعن ابن عمر، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يقرن الرجل بين التمرتين حتى يستأذن أصحابه۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی آدمی دو کھجوروں کو جمع کر کے کھائے یہاں تک کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اجازت لے لے۔

تشریح ......اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حتی یستاذن اصحابہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ مرفوع حدیث کا حصہ ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا قول ہے، تو اس حدیث کے ایک راوی شعبہ کو اس میں تردد ہو گیا ہے کہ یہ جملہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے یا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً نقل کیا ہے لیکن دوسری روایات کے پیش نظر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً ثابت ہے۔[1]

اب حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو دو کھجوریں ملا کر نہیں کھانا چاہئے اور اگر ایسا کرنا ہو تو اپنے ساتھیوں سے اجازت لے لینی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قران بین التمر سے منع فرمایا اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں اور جب وہ وجہیں پیش نظر ہوں گی تو حکم سمجھنا بھی آسان ہو گا۔

قران بین التمر سے منع کرنے کی وجوہ:-

(۱)...... ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات وہ کھجوریں مشترک ہوتی ہیں مثلاً دو تین آدمیوں نے پیسے ملا کر اکھٹی خرید لیں تو سب کا ان میں برابر کا حق ہے اب باقی ایک ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال رہے ہیں اور یہ بیک وقت دو دو کھجوریں ڈال رہا ہے، تو گویا دوسروں کا حق بھی اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہے یا بعض اوقات وہ کھجوریں دوسرے کی ملکیت ہوتی ہیں اپنی ملکیت ہوتی ہی نہیں ہیں مثلاً ایک آدمی نے کئی مہمانوں کے سامنے کھجوریں رکھیں تو ملکیت تو مضیف کی ہیں یعنی میزبان کی ہیں اور مہمانوں کے لئے محض اباحت ہے اور سب کو اس نے کھانے کا برابر حق دیا ہے لیکن ایک آدمی دو دو کھجوریں منہ میں ڈال رہا ہے تو وہ اپنے حق سے

---

(۱) فتح الباری فی الاطعمۃ باب القران فی التمر ج۹ / ص ۳۶۹

زائد وصول کر رہا ہے ایک وجہ تو یہ ہے۔

(۲)...... دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر دوسرے کا حق نہ بھی ہو مثلاً اپنی چیز ہے تب بھی دو دو کھجوریں اکھٹی منہ میں ڈالنا ایک تو ذرا بد تہذیبی سے لگتی ہے، سلیقے اور شائستگی کے منافی بات ہے دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا اور دوسرے یہ حرص اور شرہ کی علامت ہے، شرہ کا معنی ہوتا ہے "کھانے کا بہت زیادہ لالچ" اس لئے بھی یہ پسندیدہ بات نہیں ہے۔

قران کا حکم:۔

اب آیئے کہ قران کا حکم کیا ہے، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قران بین التمر یعنی دو کھجوریں ملا کر کھانے سے منع فرمایا تھا لیکن جب کھجوروں میں وسعت ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی، تو اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ حکم منسوخ ہو گیا لیکن یہ حقیقت میں نسخ نہیں ہے بلکہ علت کی وجہ سے حکم کا ختم ہونا ہے، حکم میں تفصیل یہ ہے کہ یہ دیکھیں گے کہ ان کھجوروں میں دوسروں کا حق متعلق ہے یا نہیں، اگر اس میں دوسروں کا حق متعلق ہے تو دوسروں کی صراحتاً یا دلالۃً اجازت کے بغیر دو دو کھجوریں اکھٹی کھانا ناجائز ہے لیکن اگر صراحۃً باقی ساتھیوں سے اجازت لے لی جائے کہ میں دو دو اکھٹی کھجوریں منہ میں ڈالنا چاہتا ہوں آپ مجھے اجازت دے دیں اور وہ صراحۃً اجازت دے دیں یا صراحۃً تو اجازت نہ ہو لیکن دلالۃً اجازت ہو، دلالۃً کا مطلب یہ ہے کہ یہ یقین یا ظن غالب ہو کہ میں زیادہ کھجوریں بھی کھا جاؤں گا تو باقی اہل حقوق برا نہیں مانیں گے تو اس صورت میں دو دو کھجوریں ملا کر کھانا ناجائز نہیں ہے، اس کو بعض حضرات نے یوں بھی تعبیر کر دیا ہے کہ اگر کھجوروں کی قلت ہو تو پھر بغیر اجازت کے کھانا جائز نہیں ہے اور اگر کھجوروں کی قلت نہ ہو تو پھر بغیر اجازت کے کھانا بھی جائز ہے لیکن اصل مدار قلت اور کثرت پر نہیں ہے بلکہ اصل مدار دلالۃً یا صراحۃً اجازت پر ہے لیکن ان حضرات نے قلت اور کثرت پر حکم اس لئے لگایا کہ عام طور پر جب کسی چیز کی قلت ہوتی ہے تو دوسرے ساتھی خوش نہیں ہوتے اس بات پر کہ کوئی آدمی اپنے حق سے زیادہ وصول کر لے لیکن جب کسی چیز کی قلت نہیں ہوتی اچھی خاصی مقدار میں ہوتی ہے ہر ایک کو پتہ ہے کہ جتنی میں نے کھانی ہے اتنی مل ہی جائے گی تو بظاہر کوئی زیادہ کھا لے تو دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اگر کھجوروں کے ساتھ دوسروں کا حق متعلق نہ ہو یا دوسروں کا حق متعلق تو تھا لیکن صراحۃً یا دلالۃً ان کی اجازت موجود ہے تو دو دو کھجوریں یا زیادہ کھجوریں ملا کر کھانا ناجائز نہیں ہے، لیکن خلاف ادب ہے یعنی

شائستگی اور تمیز کے خلاف ہے لیکن جو باتیں محض اس طریقے سے خلاف ادب ہوتی ہیں، شائستگی اور تہذیب کے خلاف ہوتی ہیں ان میں تھوڑے تھوڑے معمولی اعذار کی وجہ سے کافی گنجائش ہوتی ہے لہٰذا اس صورت میں بہتر اور اصل تو یہی ہے کہ ایک ایک کھجور منہ میں ڈالے لیکن اگر کوئی عذر ہو اگرچہ معمولی سا ہو مثلاً کہیں جلدی جانا ہے تو ایسی صورت میں دو دو کھجوریں منہ میں ڈال رہا ہے تو بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

قران کا حکم کھجوروں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز کے اندر ہے ہر وہ چیز جس کا ایک ایک دانہ منہ میں اٹھا کر ڈالا جاتا ہے اس میں بھی یہی تفصیل ہوگی، یہ قید میں نے اس لئے لگائی ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ایک ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالا جاتا مثلاً چنے ہیں، تو آپ کہیں کہ قران چونکہ ناجائز ہے اس لئے ایک ایک چنا منہ میں ڈالیں گے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ قران ہر چیز میں ہوتا ہے حتیٰ کہ آپ کہیں سفر کر رہے ہیں اور دو سیٹیں اکٹھی ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ نے بھی اتنے ہی پیسے دیئے ہیں اور آپ کے برابر والے نے بھی اتنے ہی پیسے دیئے ہیں اب دونوں کا حق اس سیٹ پر ہے، آپ اپنے حق سے زائد لیں اس انداز سے کھل کر بیٹھیں کہ دوسرے کی سیٹ پر بھی قبضہ ہو جائے یا اپنی سیٹ کے کچھ حصے پر اپنا بیگ رکھ لیں اس انداز سے کہ آپ کے جسم کا کچھ حصہ دوسرے کی سیٹ پر چلا جائے اور اس کی وجہ سے وہ تنگ ہو تو یہ بھی اس قران میں داخل ہو جائے گا جو ممنوع ہے اس لئے کہ دونوں کا حق متعلق تھا اور آپ نے اپنے حق سے زائد لے لیا اس انداز سے کہ دوسرے کو گرانی اور تکلیف ہو رہی ہے ہاں البتہ اگر اس کو گرانی اور تکلیف نہ ہو مثلاً بے تکلف ساتھی ہے یقین ہے کہ وہ تکلیف محسوس نہیں کرے گا یا وہ اتنا دبلا پتلا ہے کہ وہ کھل کر بھی بیٹھ جائے تب بھی سیٹ پر گنجائش نکل آتی ہے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے اسی طریقے سے اگر غیر اختیاری طور پر ایسے ہو جائے کہ آدمی کا جسم اتنا وزنی ہے کہ موٹا ہے کہ دوسرے کو تنگی ہوتی ہے تو وہ ظاہر ہے کہ یہ غیر اختیاری بات ہے ہاں البتہ اگر کسی آدمی کا جسم معتد بہ حد سے بھی زیادہ ہو تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ دو سیٹیں لے لے۔

(۲۷)-----وعن عائشة (رضى الله عنها) ان النبى صلى الله عليه وسلم قال: لا يجوع اهل بيت عندهم التمر وفى رواية: قال: ياعائشة بيت لا تمر فيه جياع اهله قالها مرتين او ثلاثـًا۔ (رواه مسلم)

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسے گھر والے بھوکے نہیں ہوتے جن کے پاس کھجور موجود ہو اور ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ ایسا گھر جس میں کھجوریں نہ ہوں اس گھر والے بھوکے ہیں یہ بات آپ نے دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمائی۔

تشریح ...... اس حدیث کے مطلب میں بھی وہی دو احتمال ہیں جو سر کے والی حدیث میں تھے، پہلا احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مقصد کھجور کی مدح اور تعریف کرنا ہے کہ یہ اتنی اہم چیز ہے کہ جس گھر میں اور چیزیں موجود ہیں لیکن کھجور موجود نہیں ہے تو یہ سمجھو کہ اس گھر کے اندر بھوک موجود ہے، دوسرا مطلب اور یہی راجح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد قناعت کی ترغیب دینا ہے کہ جیسا مل جائے اسی پر اکتفا کر لینا چاہئے بلاوجہ اپنی غربت اور تنگ دستی کے تصورات میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اس زمانے میں اصل میں کھجور عام تھی اس کو ذرا ہلکی اور معمولی چیز سمجھا جاتا تھا آپ کے فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ گھر میں گندم وغیرہ نہیں ہے یا اور اچھی چیزیں کھانے کی نہیں ہیں لیکن کھجوریں موجود ہیں تو یہ مت سوچو کہ ہم بھوکے ہیں، غریب ہیں، تنگ دست ہیں بلکہ یہ خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کھجوریں ہی دے دی ہیں پیٹ بھرنے کو بہر حال کچھ نہ کچھ موجود ہے اس لئے اللہ کے فضل سے ہمارے گھر میں کوئی بھوک وغیرہ نہیں ہے صحیح گزارہ ہو رہا ہے۔

(۲۸) ----- وعن سعد، قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: من تصبح بسبع تمرات عجوة لم يضره ذلك اليوم سم ولا سحر۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالے تو اس دن اس کو کوئی زہر بھی نقصان نہیں دے گا اور کوئی جادو بھی نقصان نہیں دے گا۔

(۲۹) ----- وعن عائشة (رضى الله عنها) ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن فى عجوة العاليه شفا، وإنها ترياق اول البكرة۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالیہ کی عجوہ کھجور میں شفاء ہے اور یہ صبح صبح کے وقت تریاق ہے۔

عجوۃ کی فضیلت:۔

ان دو حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عجوۃ کی فضیلت بیان فرمائی ہے، عجوۃ کھجور کی ایک خاص قسم ہوتی ہے مدینہ منورہ میں بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے لیکن مدینہ کے علاوہ اور ملکوں میں بھی ہوتی ہے، مدینے کی عجوۃ رنگت میں کالی سیاہ ہوتی ہے اور ذرا گولائی کی طرف مائل ہوتی ہے، ان حدیثوں میں مطلقاً عجوۃ کی فضیلت نہیں بلکہ مدینے کی عجوۃ کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ دوسری روایت میں عجوۃ العالیۃ کا لفظ ہے، اصل میں مدینہ منورہ کے دو اطراف تھے ایک وہ حصہ تھا جو مدینہ منورہ سے نشیب کی طرف

تھااس کو سافلہ کہا جاتا تھااور دوسرا حصہ وہ تھاجو مدینہ منورہ سے بلندی کی طرف تھااسے عالیۃ کہا جاتا تھااور اس طرف کئی بستیاں آباد تھیں اور ان بستیوں کے مجموعے کو عوالی کہا جاتا تھا، تو مدینہ کا جو سافلہ تھااس میں خاص باغات اور کھیتیاں وغیرہ نہیں تھیں اور جو عالیۃ تھاذراسر سبز تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ عالیہ کی کھجور اس سے مراد بظاہر مدینے کی کھجور ہے کیونکہ مدینہ منورہ میں زیادہ تر کھجوریں وغیرہ عالیہ ہی کے اندر ہوتی تھیں خاص طور پہ عجوۃ کھجوریں۔

اس کی فضیلت میں دو باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں:

(۱)......... ایک تو یہ کہ اس کے اندر شفاء ہے، شفاء ہونا تو مطلقاً بیان فرمایا کہ جس وقت کھائی جائیں اور جس تعداد میں بھی کھائی جائیں ہاں البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ کون سی بیماری سے شفاء ہے اور کس بیماری میں کس طریقے سے استعمال کرنا چاہئے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجربے پر چھوڑ دیا ہے۔

(۲)......... دوسری فضیلت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ زہر کا تریاق ہے بلکہ زہر کے بارے میں دو باتیں ارشاد فرمائیں: ایک تو یہ کہ زہر کا تریاق ہے۔ دوسری یہ کہ زہر کے لئے حفظ ماتقدم کا کام دیتی ہے لیکن تریاق ہونا اس وقت ہے جب کہ اس کو صبح صبح کھایا جائے اسی طریقے سے حفظ ماتقدم کا کام بھی تب دے گی جب کہ اسے صبح صبح کھایا جائے اور سات کی تعداد میں کھایا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ سات کی تعداد میں اور زہر میں کیا مناسبت ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ اس میں کوئی تاثیر بتائی گئی ہوگی اس کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی البتہ ہر چیز کی تاثیر کے لئے کچھ شرطیں ہوتی ہیں ممکن ہے کہ عجوۃ کھجور کی یہ تاثیر کہ یہ زہر کے لئے تریاق ہے اور زہر سے محفوظ رہنے کے لئے حفظ ماتقدم کا کام دیتی ہے اس کے لئے بھی کچھ شرطیں ہوں اور وہ شرطیں تجربے پر چھوڑ دی گئی ہوں لہٰذا اگر کسی جگہ پر یہ اثر محسوس نہ ہو تو وہ یا تو اعتماد اور ایمان کی کمی کی وجہ سے ہوگا یا اس وجہ سے ہوگا کہ اس اثر کے لئے کوئی شرط تھی وہ شرط وہاں نہیں پائی گئی۔

تیسری بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ جو آدمی صبح کے وقت سات عدد عجوہ کھجوریں کھالے تو اس دن اس پر جادو کا اثر نہیں ہوگا، اس سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات آپ کو بذریعہ وحی بتلائی گئی ہوگی جادو کے بچاؤ میں اور عجوہ کھجور میں کوئی خاص مناسبت ہوگی البتہ زہر سے حفاظت کی عقلی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کھجور میں طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے اور جب طاقت آئے گی تو جسم کی قوت مدافعت بھی بڑھ جائے گی، اگر قوت مدافعت بڑھ جائے گی تو جسم کے لئے زہر کا مقابلہ آسان ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ زہر سے بچاؤ تب ہی ہو گا کہ وہ زہر اتنا ہو جتنی کہ کھجور کھانے سے اس کے جسم میں قوت مدافعت پیدا ہوئی ہے اور اگر اس کے جسم میں کھجور سے قوت مدافعت تھوڑی پیدا ہوئی ہے یا پہلے ہی بہت تھوڑی تھی اور کھجور ر کھانے سے وہ کچھ بڑھ گئی ہے لیکن جتنی ہونی چاہئے اس سے پھر بھی کم ہے پھر اگر زہر کھالے تو ممکن ہے کہ اس زہر کا اثر ہو جائے۔

(۳۰)-----وعنها، قالت: كان يأتي علينا الشهر مانوقد فيه ناراً إنما هو التمر والماء، إلا ان يؤتى باللحيم۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم پر بعض اوقات پورا پورا مہینہ گزر جاتا تھا ہم اس میں آگ نہیں جلاتے تھے بلکہ صرف کھجور اور پانی ہوتا تھا الّا یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجائے۔

تشریح ...... بعض اوقات پورا پورا مہینہ گزر جاتا تھا کہ کھانے کے لئے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی تھی صرف کھجور اور پانی پر ہی گزارا ہوتا تھا ہاں کبھی کبھی ہدیے کے طور پر تھوڑا سا کہیں سے گوشت آجاتا تھا اس دن گھر میں چولہا جلنے کی نوبت آجاتی تھی، گوشت پکا لیتے تھے، یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابتداء میں مسلمانوں کے عمومی حالات تنگی کے تھے، سو اس زمانے میں ازواج مطہرات کے لئے بھی تنگی تھی لیکن جب عمومی حالات بہتر ہوئے تو اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سال کا نفقہ کافی مقدار میں اکٹھا دے دیا کرتے تھے البتہ ازواج مطہرات عموماً اس کا صدقہ اور خیرات کر دیا کرتی تھیں اس کے بعد جو تنگی ہوتی تھی وہ ان کے اپنے اختیار سے ہوتی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تنگی میں نہیں ڈالتے تھے۔

(۳۱)-----وعنها، قالت: ما شبع آل محمد يومين من خبز بر إلا وأحدهما تمر۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ محمد ﷺ کے گھر والوں نے دو دن مسلسل گندم کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا مگر ان میں سے ایک کھجور ہوتی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ اول تو گندم کی روٹی پیٹ بھر کر ملتی نہیں تھی اور اگر کبھی مل بھی جاتی تھی تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ دو دن مسلسل گندم کی روٹی ملی ہو اور پیٹ بھر کر ملی ہو بلکہ اگر ایک دن گندم کی روٹی پیٹ بھر کر مل بھی گئی تو دوسرے دن کھجوروں پر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔

(۳۲)-----وعنها، قالت: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وما شبعنا من الاسودين۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حال میں انتقال ہوا کہ ہم نے کھجور اور پانی سے بھی پیٹ نہیں بھرا۔

تغلیب ...... حدیث میں اسودین کا لفظ ہے، اسودین سے مراد کھجور اور پانی ہے، کھجور تو واقعی کالی ہوتی ہے پانی اگرچہ کالا نہیں ہوتا لیکن عربوں کے ہاں ایک اسلوب چلتا ہے جس کو تغلیب کہتے ہیں یعنی دو چیزوں کے لئے بعض اوقات الگ الگ لفظ بولنے کی ضرورت ہوتی لیکن دونوں کو ایک ہی حکم میں کر کے ایک ہی لفظ دونوں کے لئے بول دیا جاتا ہے جیسے ماں اور باپ تو ماں کے لئے ام کا لفظ ہونا چاہئے اور باپ کے لئے اب کا ہونا چاہئے لہٰذا جب ماں اور باپ کا ذکر کرنا ہو تو اُب و اُم کہنا چاہئے یا والد و والدہ کہنا چاہئے تھا لیکن اس میں ذرا تطویل ہو جاتی ہے اس لئے ماں کو بھی باپ ہی کی طرح فرض کر کے ابوین کہہ دیا جاتا ہے یا دونوں کو والدین کہا جاتا ہے حالانکہ والدین یہ صرف والد کا تثنیہ ہے والدہ کا نہیں ہے کیونکہ والدہ کا تثنیہ تو والدتین آتا ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کے لئے الگ لفظ بولے جانے چاہئیں کہ شمس و قمر لیکن آسانی کے لئے دونوں کو قمرین کہہ دیا جاتا ہے اسی طریقے سے یہاں کھجور اور پانی کے لئے الگ الگ لفظ بولنا چاہئے تھا کھجور کے لئے تمر کا لفظ ہوتا یا اسود کا لفظ ہوتا اور پانی کے لئے ماء کا لفظ ہوتا "اسود و ماء" لیکن تغلیباً دونوں کو اسودین کہہ دیا گیا۔

حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ ہمارا پیٹ کھجور اور پانی سے بھی نہیں بھرتا تھا یعنی کھجور اور پانی بھی پیٹ بھرنے کی مقدار نہیں ہوتے تھے۔

سوال ...... اس پر سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ کھجوروں کی اتنی قلت کسی زمانے میں رہی ہے کہ پیٹ بھرنے کی مقدار کھجور بھی نہیں ملتی تھی لیکن مدینہ منورہ میں پانی کی اگرچہ قلت تھی لیکن اتنی قلت نہیں تھی کہ پیٹ بھرنے کے لئے بھی پانی نہ ملے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہمارا کھجور اور پانی سے پیٹ نہیں بھرتا تھا؟

جواب ......

(۱)......... ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ بات بھی تغلیباً کہی گئی ہے۔

(۲)......... دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربوں کی عادت تھی کہ وہ پیٹ بھر کر پانی اس صورت میں پیتے تھے جب کہ معتد بہ مقدار میں کچھ کھایا پیا بھی ہو اور یہ سمجھتے تھے کہ خالی پیٹ پانی پینا مضر ہوتا ہے لہٰذا جب کھجور کھانے کو نہیں ملتی تھی تو پانی بھی احتیاط سے پیا جاتا تھا اور کھجور تھوڑی ملتی تھی تو پانی بھی تھوڑا پیا جاتا تھا، اس لئے یہ کہنا ٹھیک ہے کہ نہ ہم کھجور سے پیٹ بھرتے تھے اور نہ ہی پانی سے پیٹ بھرتے تھے۔

الفاظ حدیث کے متعلق ایک وضاحت ...... یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ اس حدیث کے

بارے میں صاحب مشکوٰۃ نے ''متفق علیہ'' کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی ہے جب کہ بخاری میں ان لفظوں کے ساتھ یہ حدیث موجود نہیں ہے، بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے لیکن اس میں لفظ بالکل برعکس ہیں مثلاً ایک جگہ بخاری کے لفظ یہ ہیں: **توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین شبعنا من الاسودین۔**[1]

دوسری جگہ بخاری کے لفظ ہیں: **توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد شبعنا من الأسودین۔**[2]

اس سے تو یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہوا ہے اس وقت ہم پیٹ بھر کر کھجوریں کھانے لگ گئے تھے، یہ بات کہ ہمیں پیٹ بھر کر کھجوریں بھی نہیں ملتی تھیں بخاری میں موجود نہیں ہے تو پھر صاحب مشکوٰۃ نے متفق علیہ کیسے کہہ دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشکوٰۃ کے دو نسخے ہیں بعض نسخوں میں یہاں متفق علیہ اور بعض نسخوں میں رواہ مسلم ہے اور دوسرا نسخہ زیادہ صحیح ہے اور مسلم میں واقعتاً یہ حدیث موجود ہے لیکن مسلم میں ان لفظوں کے ساتھ بھی یہ حدیث مذکور ہے جن لفظوں کے ساتھ بخاری میں ہے۔[3]

تعارض...... اب یہ ایک نئی بحث پیدا ہو گئی کہ اس حدیث کے لفظ دو طرح کے ہو گئے ایک میں آتا ہے ''**شبعنا**'' اور ایک میں آتا ہے ''**ما شبعنا**'' ان میں سے صحیح کون سا ہے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''**شبعنا**'' کو ترجیح دی ہے جس میں ''**شبع**'' یعنی سیر ہونے کو ثابت کیا گیا ہے، یہ روایت زیادہ صحیح ہے۔[4]

اس لئے کہ اکثر راوی اسی طریقے سے روایت کرتے ہیں ''**ما شبعنا**'' کا لفظ صرف ایک راوی ابو احمد الزبیری روایت کرتے ہیں ان کے علاوہ کوئی اور راوی نفی کا صیغہ روایت نہیں کرتا، اس لئے راجح وہ روایت ہے جس میں شبع کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ابتداء میں واقعی کھجوروں کی بھی قلت تھی لیکن فتح خیبر کے بعد کھجوروں کی قلت ختم ہو گئی۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے صحابہ فرماتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا کہ اب ہم کھجور کم از کم پیٹ بھر کر کھالیا کریں گے۔[5]

(۳۳)----- وعن النعمان بن بشیر، قال: الستم فی طعام و شراب ما شئتم لقد رأیت نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم وما یجد من الدقل مایملا بطنه۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ...... حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا

(۱) صحیح البخاری فی الاطعمۃ باب من اکل حتی شبع ج ۲ / ص ۸۱۱...... (۲) صحیح البخاری فی الاطعمۃ باب الرطب والتمر ۲: ۸۱۸

(۳) صحیح مسلم کتاب الزھد فصل فی بیان ان معیشۃ النبی ﷺ ج ۲ / ص ۴۱۰...... (۴) فتح الباری لابن حجر فی الاطعمۃ باب من اکل حتی شبع ج ۹ / ص ۴۳۵

(۵) صحیح البخاری باب غزوۃ خیبر قبیل باب استعمال النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی اہل خیبر ج ۲ / ص ۶۰۹

کہ کیا تم ان چیزوں کے کھانے اور پینے کے اندر نہیں ہو جنہیں تم چاہتے ہو تمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے اس حال میں دیکھا کہ آپ ہلکی کھجوروں میں سے بھی اتنی کھجوریں نہیں پاتے تھے جو آپ کے پیٹ کو بھر سکیں۔

دقل! یہ کھجور کی خاص قسم تھی جو ردی اور معمولی سمجھی جاتی تھی مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیٹ بھرنے کے لئے معمولی کھجوریں بھی نہیں ملا کرتی تھیں اور تمہیں آج اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کے لئے بہت کچھ دے رکھا ہے جو چاہتے ہو کھاتے ہو اور جو چاہتے ہو پیتے ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی یہ بات ابتدائی دور کی ہے وگرنہ آخر میں یہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ کم از کم کھجوروں کی فراوانی ہو گئی تھی۔

یہاں حضرت نعمان بن بشیر نے فرمایا: لقد رأيت نبيكم میں نے تمہارے نبی کو اس حالت میں دیکھا، تو تمہارے نبی کیوں کہا؟ یہ تعبیر اختیار کی ہے مخاطب کے ذہن میں اس بات کی اہمیت بٹھانے کے لئے کہ جس ہستی کی میں بات کر رہا ہوں اور جس کی یہ حالت ذکر کر رہا ہوں وہ ایسی ہستی ہے جس کو تم بھی اپنا نبی سمجھتے ہو صرف یہ نہیں کہ ہم نے ان کی صحبت اٹھائی ہے، ہمارے نبی ہیں، ہمیں ان کی اتباع کرنی چاہئے، ان کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہئے بلکہ تمہیں بھی ان کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

(٣٤)-----وعن أبي أيوب، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أتي بطعام أكل منه وبعث بفضله إلي وإنه بعث إلي يوما بقصعة لم يأكل منها لأن فيها ثومًا فسألته: أحرام هو، قال: لا، ولكن أكرهه من أجل ريحه قال: فإني أكره ما كرهت - (رواه مسلم)

ترجمہ...... حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی کھانا لایا جاتا تو آپ اس میں سے کچھ کھا لیتے اور اس کا بچا ہوا میری طرف بھیج دیتے اور آپ نے ایک دن میری طرف ایک بڑا پیالہ بھیجا جس میں سے آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اس لئے کہ اس کے اندر لہسن تھا تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کیا یہ حرام ہے تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ اسے اس کی بدبو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے عرض کیا کہ میں بھی اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جس کو آپ ناپسند کرتے ہیں۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے نئے نئے مدینے میں آئے تھے اور آپ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں قیام فرمایا۔ حضرت ابو ایوب انصاری کے مکان کے دو حصے تھے ایک نیچے والا اور ایک اوپر والا، حضرت ابو ایوب انصاری نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ بات تو ہمیں اچھی نہیں لگتی کہ ہم اوپر ہوں اور آپ نیچے ہوں، اس میں آپ کی بے ادبی محسوس ہوتی ہے اس لئے آپ اوپر والا حصہ لے لیں اور ہم نچلے حصے میں رہ لیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں میرے لئے بھی نیچے رہنے میں سہولت ہے اور مجھ سے ملنے جلنے کے لئے لوگ آتے ہیں ان کے لئے بھی آسانی نچلی منزل کے اندر ہی ہے، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قبول فرما لیا ٹھیک ہے آپ نیچے رہیں ہم اوپر رہ لیتے ہیں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا جذبہ ادب اور راحت رسانی:-

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف ادب کا تقاضا ہو اور دوسری طرف راحت رسانی کا تقاضا ہو تو راحت رسانی کو ادب اور تعظیم پر ترجیح دینی چاہئے، ادب تو یہی تھا کہ حضرت ابو ایوب انصاری نیچے رہتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت اس میں تھی کہ ابو ایوب انصاری اوپر رہتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیچے رہتے، چنانچہ کچھ دن تو اسی طریقے سے قیام فرمایا۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوپر بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ رہتے تھے کہ کہیں ہماری نقل و حرکت کی وجہ سے یا کسی اور چیز کی وجہ سے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو۔ حضرت ابو ایوب انصاری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ چھت پہ پانی گر گیا، ظاہر ہے چھت معمولی قسم کی تھی، اب یہ خطرہ تھا کہ وہ پانی نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹپکے گا تو ہمارے پاس روئی کا ایک لحاف تھا تو ہم نے جلدی سے وہ لحاف اس پانی پر ڈال دیا تاکہ لحاف سارے پانی کو چوس لے اور نیچے کوئی قطرہ جا کر نہ گرے، وہ لحاف سارا گیلا ہو گیا ہم نے بغیر لحاف کے راتیں گزارنا گوارا کر لیا لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پانی کا ایک تھوڑا سا قطرہ بھی گرے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اندازہ ہوا کہ اوپر ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت پر گرانی ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر رہ رہے ہیں اور یہ بہت زیادہ مشقت برداشت کر رہے ہیں اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ کہا کہ آپ نیچے آجائیں ہم اوپر چلے جاتے ہیں، اس طریقے سے تبادلہ کر لیا۔

کھانا بچانے اور بچا ہوا واپس بھیجنے کی وجہ:۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کسی بڑے برتن کے اندر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا لے کر جاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا تناول کرنا ہوتا تناول فرما لیتے اور اور باقی بچا ہوا حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیتے۔ بچا ہوا واپس کیوں بھیجتے تھے، کیوں بچاتے تھے اس کی ایک تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سخاوت کی وجہ سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی وجہ سے بھیجتے اتنا زیادہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ختم نہیں ہوتا ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر مہمان پورا کھانا کھا کر تو ختم کر دے تو میزبان کو یہ تردد ہو سکتا ہے کہ پتہ نہیں مہمان کا پیٹ بھرا یا نہیں بھرا، ہو سکتا ہے اس کو زیادہ کھانے کی حاجت ہو لیکن جب وہ کچھ بچا کر بھیجے گا تو میزبان کو یقین ہو جائے گا کہ اس کو اور کھانے کی ضرورت نہیں تھی اگر اور ضرورت ہوتی تو یہ جو بچا کر بھیجا ہے اسے کھا لیتے تو میزبان کی تسلی اور اطمینان کے لئے بھی اس طرح بعض اوقات کر لیا جاتا ہے یہ بھی ادب کی بات ہے۔

لہسن اور پیاز کا حکم امت کے لئے:۔

لہسن اور پیاز کے حکم کے بارے میں احادیث مختلف ہیں مثلاً بعض احادیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھانے سے منع فرمایا ہے اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی اجازت دی لیکن یہ فرمایا کہ لہسن اور پیاز کھا کر مجلس اور مسجد کے اندر نہ آؤ اس لئے کہ بدبو کی وجہ سے دوسرے ہم نشینوں کو تکلیف ہو گی اور مسجد میں آنے کی صورت میں فرشتوں کو ایذاء ہو گی چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس سے اگلے نمبر پر آرہی ہے، اس میں یہی بات بیان کی گئی ہے البتہ اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہنڈیا لائی گئی جس میں کچھ ترکاریاں وغیرہ تھیں اور اس میں لہسن، پیاز بھی تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میرے صحابہ کے قریب کرو کہ وہ کھا لیں میں نہیں کھاؤں گا اس لئے کہ ''فانی اناجی من لا تناجی'' میں ان لوگوں سے مناجات کرتا ہوں جن سے تم نہیں کرتے، اب حکم کیا ہے۔ مجموعہ احادیث میں غور کرنے سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ لہسن اور پیاز کا کھانا ناجائز یا مکروہ نہیں ہے بلکہ جائز ہے، کچا کھانا بھی جائز ہے اور پکا ہوا کھانا بھی جائز ہے البتہ اگر کچا کھایا ہو تو جب تک منہ میں بدبو موجود ہے اس وقت تک مجلس یا مسجد میں نہیں آنا چاہئے

ایسے وقت کچا پیاز یا لہسن کھانا چاہئے جب کہ اس کے بعد مسجد میں جانے کا وقت نہ ہو یا اگر جانا ہی ہو تو کسی طریقے سے مثلاً مسواک وغیرہ کر کے یا کسی اور طریقے سے اس کی بدبو منہ سے زائل کر کے جائے اور اگر اسے اچھی طرح پکا لیا گیا ہو تو پھر چونکہ اس کی بدبو ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے اس لئے اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، یہ حکم امت کے لئے ہے۔

لہسن اور پیاز کے بارے میں حضور ﷺ کا معمول:۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باوجود جائز ہونے کے پیاز اور لہسن سے پرہیز کیا کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت فرشتوں کی آمد و رفت رہتی تھی اور کسی بھی وقت آپ پر وحی آسکتی تھی اس لئے آپ معمولی سے وقت کے لئے بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کے منہ کے اندر بدبو پیدا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیاز یا لہسن سے پرہیز کرنا اس کی بدبو کی وجہ سے تھا لہٰذا بظاہر آپ کا یہ پرہیز کچے پیاز اور لہسن سے تھا یا ایسے پکے ہوئے پیاز یا لہسن سے تھا جس کو پورے طور پر پکایا نہ گیا ہو اور اس میں ابھی بدبو موجود ہو لیکن جس پیاز یا لہسن کو اچھی طرح پکا کر اس کی بدبو کو زائل کر دیا گیا ہو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پرہیز نہیں فرماتے تھے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری کھانا تناول فرمایا اس کے اندر لہسن موجود تھا لیکن بظاہر پکا ہوا ہوگا۔[1]

(۳۵)-----وعن جابر، أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من اکل ثومًا أو بصلاً، فلیعتزلنا أوقال: فلیعتزل مسجدنا أو لیقعُد فی بیته وإن النبی صلی اللہ علیه وسلم أتی بقدرٍ فیه خضرات من بقول، فوجد لها ریحًا، فقال: قربوها إلی بعض اصحابه، وقال: کل، فإنی اناجی من لا تناجی۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی لہسن یا پیاز کھائے اسے چاہئے کہ وہ ہم سے الگ رہے یا یوں فرمایا کہ ہماری مسجد سے الگ رہے یا یوں فرمایا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہنڈیا لائی گئی جس میں ان ترکاریوں میں سے تازہ ترکاریاں تھیں یعنی پیاز یا لہسن تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بو محسوس

---

(۱) ابوداؤد فی الاطعمۃ باب فی اکل الثوم ج ۲/ ص ۱۸

کی تو آپ نے اپنے بعض صحابہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ اس کے قریب کر دو اور اس صحابی سے کہا کہ اسے کھالے اس لئے کہ میں ایسے لوگوں سے سرگوشی کرتا ہوں جن سے تم مناجات نہیں کرتے۔

(۳۶)-----وعن المقدام بن معدی کرب، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال: کیلوا طعامکم یبارك لکم فیه۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ ...... حضرت مقدام بن معد یکرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے کھانے کا کیل کر لیا کرو یعنی ناپ لیا کرو تمہیں اس میں برکت دی جائے گی۔

کھانا ناپ تول کر پکاؤ:-

حاصل یہ ہے کہ جو کوئی کھانا وغیرہ پکانا ہو تو اسے ناپ کر یا تول کر پکاؤ اس میں برکت ہو گی لیکن بعض احادیث سے اس کے خلاف ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ کیل یا وزن کرنے سے برکت ختم ہو جاتی ہے مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ہمارے گھر میں تھوڑے سے جو موجود تھے میں کئی دن تک اسے پکاتی رہی ان میں ایسی برکت ہوئی کہ ختم نہیں ہو رہے تھے لیکن ایک دن میں نے انہیں ناپ لیا دیکھتے ہیں کہ پیچھے کتنا بچا ہوا ہے تو جب کیل کیا تو اس کی برکت ختم ہو گئی اور ایک آدھ دن میں وہ ختم ہو گئے۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ کیل سے برکت ختم ہو جاتی ہے، اس طرح کے اور بھی بعض واقعات باب المعجزات میں انشاء اللہ تعالیٰ آئیں گے تو بظاہر دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

اس کے جواب میں بعض محدثین نے تو یہ کہا ہے کہ یہاں کیل سے مراد پکانے یا کھانے کے وقت کا کیل نہیں ہے بلکہ خریدنے کے وقت کا کیل یا وزن ہے کیونکہ خریدتے وقت کیل یا وزن کر کے آپ خریدیں گے تو بیع معلوم جائے گی اور نزاع کا خطرہ نہیں ہو گا، تو بیع بے غبار طور پر صحیح ہو جائے گی شریعت کے مطابق بیع ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ جو چیز شریعت کے مطابق خریدو گے اس مین برکت ہو گی اور اگر تول کر نہیں لیتے ویسے اندازے سے لے لیتے ہیں تو بیع وزن کی بنیاد پر ہوئی لیکن وزن نہیں کیا یا بیع ہوئی ہے کیل کی بنیاد پر

---

(۱) عن عائشة قالت توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما فی بیتی من شی یأکله ذو کبد الا شطر شعیر فی رف لی فاکلت منه حتی طال علی فکلته ففنی (صحیح البخاری کتاب الجہاد باب نفقۃ نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ ج ۱/ص ۴۳۷)

لیکن کیل نہیں کیا تو یہ خلاف شریعت ہے۔ البتہ اگر اشارے سے بیع ہوئی ہے کہ یہ گندم کا ڈھیر آپ کو اتنے میں بیچتا ہوں اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے لیکن اگر بیع وزن کی بنیاد پر ہوئی ہے کہ اتنی چیز لیتا ہوں یا اتنے چاول تمہیں بیچتا ہوں جب اس سے لینے لگے تو تولایا ناپا نہیں ہے تو یہ خلاف شریعت ہے اور ظاہر ہے کہ جب بیع ہی خلاف شریعت ہو گئی تو اس میں برکت کہاں سے آئے گی تو کھانے یا پکانے کے وقت کیل کرنا مراد نہیں ہے بلکہ خریدنے کے وقت کیل کرنا یا وزن کرنا مراد ہے تاکہ یہ بیع شریعت کے مطابق ہو جائے گی۔

لیکن یہ توجیہ بہر حال بعید ہے صحیح بات وہ معلوم ہوتی ہے جو ہمارے بعض بزرگوں نے ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں کیل کرنا دو طرح کا ہوتا ہے:

(۱)..........ایک کیل کرنا اس کھانے کی مقدار معلوم کرنے کے لئے جو اس وقت آپ تیار کرنا اور پکانا چاہتے ہیں۔

(۲)..........دوسرا وزن یا کیل کرنا اس کھانے کا جو پیچھے بچا ہوا ہے تاکہ یہ پتہ چلے کہ پیچھے کتنا رہ گیا ہے، پہلا کیل باعث برکت ہے یعنی جو آپ پکانا چاہتے ہیں، جو نکال رہے ہیں اس کی مقدار معلوم کرنے کے لئے آپ وزن وغیرہ کر رہے ہیں تو یہ باعث برکت ہے اس لئے کہ یہ انتظام کی دلیل ہے اس میں کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اگر آپ اندازے سے کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ کھانے والے تھوڑے ہوں آپ زیادہ پکالیں تو کھانا ضائع ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھانے والے زیادہ ہوں اور آپ تھوڑا پکالیں تو سب کا پیٹ نہیں بھرے گا تو بے انتظامی ہو جائے گی۔

اسی طریقے سے اگر آپ ناپ کر یا تول کر نہیں نکالتے اندازے سے نکال رہے ہیں تو آپ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں نے مثلاً آٹا تھوڑا خرچ کیا ہے یا چاول تھوڑے خرچ کئے ہیں لیکن حقیقت میں زیادہ خرچ کر چکے ہیں تو جب ختم ہو جائے گا تو آپ کو یہ احساس ہو گا کہ میں نے تو تھوڑے تھوڑے نکالے تھے ختم کیسے ہو گئے تو کسی نوکر پر کسی ملازم پر شبہ کریں گے یا گھر میں کسی آنے والے پر شبہ کریں گے لیکن جب آپ کیل کریں گے تو اس قسم کی بدگمانی سے بچ جائیں گے لہٰذا جو کھانا آپ نکال رہے ہیں اس کا وزن یا کیل کرنا یہ ایک انتظام کی بات ہے اس لئے اس میں برکت ہے لیکن جو پیچھے بچا ہوا ہے مثلاً آپ نے ایک کلو آٹا نکال لیا یا جتنا نکالنا تھا نکال لیا لیکن اب یہ دیکھ رہے ہیں پیچھے کتنا بچا ہوا ہے یہ دیکھنا خلاف توکل ہے اس لئے اس میں بے برکتی ہو سکتی ہے۔

(۳۷)----- وعن أبی أمامة أن النبی صلی الله علیه وسلم کان إذا رفع مائدته قال: الحمدُ للهِ حمداً کثیراً أطیباً مبارکاً فیهِ غیرَ مَکفی ولا مُودَّع ولا مُستغنی عنه ربَّنا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا جب دستر خوان اٹھایا جاتا تو آپ یہ فرماتے: **الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه غير مكفي ولا مودع ولا مستغنى عنه ربنا** ۔ کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، بہت زیادہ تعریفیں، پاکیزہ تعریفیں، ایسی تعریفیں جس میں برکت دی گئی ہو جس پر اکتفانہ کیا گیا ہو اور جس کی طلب کو چھوڑا نہ گیا ہو اور جس سے استغناء نہ برتا گیا ہو اے ہمارے رب۔

لفظ غیر اور ربّنا کا اعراب:-

یہاں پر اس دعا کی وجہ اعراب میں محدثین نے کافی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں لیکن مختصر سی بات یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں "غیر" پر دو اعراب نقل کئے گئے ہیں رفع بھی اور نصب بھی اسی طریقے سے "ربّنا" اس میں بھی دو اعراب مشہور ہیں ایک رفع اور ایک نصب۔ اگر ربّنا کو مرفوع پڑھیں تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ غیر کو بھی مرفوع پڑھا جائے اس صورت میں آسان کی ترکیب یہ ہے کہ ربّنا مبتداء مؤخر اور **غير مكفي ولا مودع ولا مستغنى عنه**، یہ خبر مقدم ہے۔ اب مطلب یہ ہو گا کہ ہمارا رب ایسا ہے جس سے اکتفاء نہیں کیا گیا یا جس کو کوئی اور کافی نہیں ہوتا یعنی وہ تو دوسروں کے لئے کافی ہوتا ہے دوسرے اس کے لئے کافی نہیں ہوتے اس لئے کہ اس کو دوسروں کی ضرورت نہیں ہے اور وہ ہمارا رب ایسا ہے جس کی طلب کو ہم نے چھوڑا نہیں ہے، کسی بھی وقت اس کی طلب کو اور اس کی رضا کی طلب کو نہیں چھوڑ سکتے اور وہ ہمارا رب ایسا ہے جس سے ہم کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے تمام تعریفیں ایسے رب کے لئے ہیں۔

دوسرا قول زیادہ مشہور اور راجح یہ ہے کہ غیر کو آپ منصوب پڑھیں تو اس صورت میں یہ حال ہو گا کس سے حال ہے اس میں کئی احتمال ہیں:

(۱)......... ایک احتمال یہ ہے کہ یہ حال ہے حمد سے تو معنی ہو گا کہ ایسی حمد جس پر اکتفاء نہیں کیا گیا یعنی ایسا نہیں ہے کہ اب تو ہم نے حمد کر لی اس کو کافی سمجھ لیا بلکہ آئندہ بھی حمد کرتے رہیں گے اور ایسی حمد جس کی طلب کو چھوڑا نہیں گیا بلکہ آئندہ بھی ہم اللہ سے حمد کی توفیق کے طالب ہیں اور ایسی حمد جس سے ہم اپنے آپ کو مستغنی نہیں سمجھتے۔

(۲)......... دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حال ہو لفظ "اللہ" سے اس صورت میں وہی معنی ہو گا جو ربنا کو مبتداء بنانے کی صورت میں تھا۔ اس صورت میں بھی یہ سارے اوصاف اللہ تعالیٰ کے تھے اب بھی یہ سارے اوصاف اللہ تعالیٰ کے ہوں گے۔

(۳)........... تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حال ہے لفظ "طعام" سے اگرچہ طعام پہلے مذکور نہیں ہے لیکن قرینہ مقامیہ سے سمجھ میں آرہا ہے کیونکہ کھانا کھانے کے بعد یہ دعاء پڑھی جارہی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ اس کھانے پر ہم اکتفاء نہیں کرتے کہ اور کی ہمیں ضرورت نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے اور ہم اس کی طلب کو چھوڑنے والے نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے مزید کے طالب ہیں کہ جیسے اب اپنا فضل فرمایا آئندہ بھی اپنا فضل فرمائیں گے اور اپنے آپ کو ہم اس کھانے سے مستغنی نہیں سمجھتے بلکہ اللہ کی اس نعمت کے محتاج سمجھتے ہیں۔
یہ ساری گفتگو اس وقت ہے جب کہ غیر منصوب ہو تو اس صورت میں ربنا کو بھی منصوب پڑھیں تو بہتر ہوگا۔
یہ منصوب کیوں ہے اس میں سب سے آسان بات یہ ہے کہ یہ منصوب علی النداء ہے یعنی منادی ہونے کی وجہ سے منصوب "یاربنا" اے ہمارے رب۔

(۳۸)-----وعن أنس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ الله تعالیٰ ليرضى عن العبد أن يأكل الأكلة فيحمده عليها، أو يشرب الشربة فيحمده عليها۔ (رواه مسلم)

وسنذكر حديثي عائشة وأبي هريرة: ما شبع آل محمد، وخرج النبي صلى الله عليه وسلم من الدنيا في باب فضل الفقراء إن شاء الله تعالىٰ۔

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس بات کی وجہ سے راضی ہو جاتے ہیں کہ وہ کوئی ایک دفعہ کا کھانا کھاتا ہے یا لقمہ کھاتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے یا ایک مرتبہ کوئی چیز پیتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے:

أن يأكل الاكله ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے ایک دفعہ کا کھانا اور اگر "اُکلة" ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ تو اس کا معنی ہوگا ایک لقمہ۔

(۳۹)-----عن أبي أيوب، قال: كنا عند النبي صلى الله عليه وسلم فقرب طعام فلم أر طعامًا كان أعظم بركة منه أولَّ ما أكلنا، ولا أقلَّ بركة في آخره، قلنا: يا رسول الله! كيف هذا؟ قال: إنَّا ذكرنا اسم الله عليهِ حين أكلنا، ثمَّ قعد من أكل ولم يسم الله فاكل معه الشطان۔ (رواه في شرح السنه)

ترجمہ ...... حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ کھانا آپ کے قریب کیا گیا تو میں نے کوئی

کھانا ایسا نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ برکت والا ہو اس وقت جب کہ ہم نے شروع شروع میں کھایا اور نہ ہی اس سے کم برکت والا کوئی کھانا دیکھا، اس کے آخر میں تو ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کیسے ہو گیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہم نے جس وقت کھانا شروع کیا تھا ہم نے اس پر اللہ کا نام لیا تھا پھر ایسا شخص آکر بیٹھ گیا جس نے کھایا اور اللہ کا نام نہیں لیا تو اس کے ساتھ شیطان بھی کھانے لگ گیا۔

(٤٠)-----وعن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أكل أحد كم فنسي أن يذكر الله على طعامه، فليقل: بسم الله أوَّله و آخره۔ (رواه الترمذي و أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھائے اور اپنے کھانے پر اللہ کا نام لینا بھول جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ یوں کہے: **بسم الله اوّله و آخره۔**

کھانے کے درمیان کی دعا:-

اگر کھانے کے شروع میں اللہ کا نام لینا یاد نہیں رہا لیکن کھانے کے درمیان میں اللہ کا نام لینا یاد آ گیا تو اب اس وقت اللہ کا نام لے لینا چاہئے اور ان الفاظ میں لینا چاہئے: **بسم الله اوله و آخره۔**

اوّله و آخره سے مراد یہ ہے کہ میں اس کے تمام اجزاء پر اللہ کا نام لیتا ہوں وہ اجزاء جو کھائے جا چکے ہیں ان پر بھی اور جو اجزاء کھائے جائیں گے ان پر بھی اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ جو اجزاء اب کھانے ہیں ان میں بھی برکت آ جائے گی اور جو اجزاء کھائے جا چکے ہیں ان کی بے برکتی بھی دور ہو جائے گی۔

(٤١)-----وعن أمية بن مخشي، قال: كان رجل يأكل فلم يسم حتى لم يبق من طعامه إلا لقمة، فلمّا رفعها إلى فيه قال: بسم الله أوَّله و آخره، فضحك النبي صلى الله عليه وسلم ثمَّ قال: ما زال الشيطان يأكل معه، فلمّا ذكر اسم الله استقاء ما في بطنه۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت امیہ بن مخشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا اور اس نے اللہ کا نام نہیں لیا یہاں تک کہ اس کے کھانے میں سے ایک لقمہ باقی بچ گیا پھر جب اس نے اپنے لقمے کو اپنے منہ کی طرف اٹھایا تو کہا: **بسم الله اوله و آخره** تو نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے پھر فرمایا کہ شیطان اس شخص کے ساتھ کھاتا رہا ہے جب اس نے اللہ کا نام لیا تو اس نے اس چیز کی قے کر دی جو اس کے پیٹ میں تھی۔

تشریح ...... قے کرنے کا مطلب میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اگر شیطان کے کھانے سے مراد حقیقتاً اس کا کھانا ہے تو قے کرنے سے مراد بھی حقیقتاً قے کرنا ہوگا اور اگر شیطان کے کھانے سے مراد ہے برکت زائل کرنا تو قے کرنے سے مراد یہ ہوگا کہ جو برکت اس نے چھین لی تھی وہ واپس آگئی ہے۔

(٤٢)----وعن أبی سعید الخدری، قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا فرغ من طعامہ قال: الحمد للہ الذی أطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین۔ (رواہ الترمذی وأبو داؤد وابن ماجہ)

ترجمہ ...... حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے کھانے سے فارغ ہوتے تو یوں فرماتے: **الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔**

تشریح ...... اس میں اصل تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے، کھانے اور پینے پر کیونکہ اس کا موقع ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا بھی ذکر کر دیا اس طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی جو جسمانی نعمتیں ہیں یہ بھی بہت بڑی نعمتیں ہیں اس پر شکر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی روحانی نعمتیں اسلام اور ایمان وغیرہ ان سے بھی زیادہ اہم اور ان سے بھی زیادہ قابل شکر ہیں۔

(٤٣)----وعن أبی ہریرۃ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الطاعم الشاکر کالصائم الصابر۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی عن سنان بن سنۃ عن ابیہ)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کی طرح ہے۔

تشریح ...... مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی روزہ رکھتا ہے تو ظاہر ہے روزے میں صبر بھی کرنا پڑے گا، اس کو روزے کا ثواب بھی ملے گا اور دوسرا آدمی روزہ نہیں رکھتا بلکہ سارا دن کھاتا پیتا ہے لیکن جو چیز بھی کھاتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو دیکھنے میں یہ شخص عبادت گزار نہیں ہے، اس نے روزہ نہیں رکھا لیکن اللہ تعالیٰ کی نظر میں ثواب کے اندر یہ اس روزہ دار کی طرح ہے کہ روزہ دار صبر کا ثواب حاصل کر رہا ہے اور یہ شکر کا، اس طرح دونوں برابر ہو گئے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ نفس اجر میں دونوں شریک ہیں اس بات میں دونوں شریک ہیں کہ اجر ملے گا لیکن کسی کو زیادہ ملے گا کسی کو کم یا برابر ملے گا اس سے بحث کرنا مقصود نہیں۔

(٤٤)-----وعن أبی أیوب، قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم إذا أکل أوشرب قال: الحمدُ للہ الذی أطعم وسقی، وسوَّغه، وجعل له مخرجًا۔ (رواہ أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ کھاتے یا پیتے تو یوں فرماتے: **الحمدُ للہ الذی أطعم وسقی، وسوَّغه، وجعل له مخرجًا** کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے کھلایا اور پلایا اور اسے خوشگوار بنایا اور اس کے لئے نکلنے کا راستہ بنایا۔

جو چیز بھی انسان کھاتا اور پیتا ہے دیکھنے میں لگ رہا ہے کہ یہ ایک نعمت ہے لیکن درحقیقت اس میں دو نعمتیں ہیں: ایک نعمت یہ ہے کہ کھانے یا پینے کی چیز آسانی سے حلق سے نیچے اترتی ہے اگر خدانخواستہ وہ حلق میں پھنس جائے یا پانی کا گھونٹ گلے میں پھنس جائے یا کسی غلط نالی کے اندر چلا جائے معمولی سا قطرہ بھی پھنس جائے تو انسان کے لئے وبال بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے حلق کے اندر ایسا نظام بنایا ہوا ہے کہ انسانی جسم خود فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی چیز کو کدھر لے کے جانا ہے وہاں سانس کی نالی بھی ہے اور دوسری نالیاں بھی ہیں لیکن جب کھاتے یا پیتے ہیں تو وہ چیز اپنی اصل جگہ ہی جاتی ہے اور وہاں سے کھانے اور پینے کی چیز آسانی سے معدے کے اندر چلی جاتی ہے، تو اس طریقے سے آسانی سے حلق سے نیچے اتر جانا یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور پھر اس کا فضلات کی شکل میں پیشاب اور پاخانے کی صورت میں بآسانی خارج ہو جانا یہ اللہ کی دوسری بڑی نعمت ہے، پانی پی رہا ہے لیکن اگر خدانخواستہ پیشاب بند ہو جائے تو آدمی کی جان پہ بن جاتی ہے، اسی طریقے سے کھا رہا ہے لیکن فضلات نکلنا مشکل ہو جائے تو آدمی کے لئے بہت تکالیف کا باعث بنتی ہے۔

(٤٥)-----وعن سلمان، قال: قرأت فی التوراۃ أن برکة الطعام الوضوء بعدہ فذکرتُ ذلك للنبی صلی اللہ علیه وسلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: برکة الطعام الوضوء قبله والوضوءُ بعدہ۔ (رواہ الترمذی وأبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا کہ کھانے کی برکت اس کے بعد منہ ہاتھ دھونا ہے تو میں نے حضور ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ کھانے کی برکت اس سے پہلے ہاتھ دھونا ہے اور اس کے بعد۔

(٤٦) ----- وعن ابن عباس، أن النبى ﷺ خرج من الخلاء، فقدم إليه طعام، فقالوا: ألا نأتيك بوضوء قال: إنما أمرت بالوضوء إذا قمت إلى الصلاة۔

(رواه الترمذی وأبو داؤد والنسائی ورواه ابن ماجة، عن ابی هريرهؒ)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اس للہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلے تو آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے لئے وضو کا پانی نہ لائیں تو آپ کے فرمایا کہ مجھے وضو کا حکم صرف اس وقت دیا گیا ہے جب کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہوں۔

تشریح ...... یہاں دو مسئلے ہیں: پہلا مسئلہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا ہے اور دوسرا مسئلہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا۔

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا:-

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا سنت ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا سنت نہیں چنانچہ امام مالک اور امام شافعی سے اس طرح نقل کیا گیا ہے، اسی طرح امام ترمذی نے سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کو ناپسند سمجھتے تھے۔[1] اور دوسرا قول یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا کھانے کے آداب میں سے ہے۔

پہلے قول والوں کے دلائل ...... ان کی ایک دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیت الخلاء سے واپس تشریف لائے تو صحابہ نے عرض کیا کہ ہم وضو کا پانی لائیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے وضو کا حکم صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہوں، کھانے کے وقت مجھے وضو کا حکم نہیں دیا گیا۔ تو وہ حضرات کہتے ہیں کہ وضو کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک لغوی معنی اور ایک شرعی معنی، لغوی معنی کے اعتبار سے وضو ہاتھ دھونے کو کہتے ہیں لہٰذا یہاں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو نہیں فرمایا یعنی ہاتھ نہیں دھوئے بلکہ بغیر ہاتھ دھونے کے آپ نے کھانا تناول فرمایا۔

دوسری دلیل ...... دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کے سنت یا مستحب یا آداب میں سے ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا دلیل صحیح سے ثابت نہیں اس لئے کہ

---

(۱) جامع الترمذی کتاب الاطعمۃ تحت باب فی ترک الوضوء قبل الطعام ج ۲/ص ٦

اس میں صرف حضرت سلمان فارسی کی حدیث ہے کہ میں نے تورات میں یہ پڑھا کھانے کی برکت یہ ہے کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھولئے جائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ کھانے کی برکت یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہاتھ دھوئے جائیں اور اس کے بعد بھی۔ یہ حدیث سنداً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس کے ایک راوی ''قیس بن ربیع'' ہیں ان پر محدثین نے جرح کی ہے اور انہیں ضعیف قرار دیا ہے، جب یہ حدیث ضعیف ہوئی تو معلوم ہوا کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھونا دلیل صحیح سے ثابت نہیں اور جو چیز دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو اس کو سنت یا مستحب سمجھنا بھی درست نہیں اس لئے کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کو سنت یا مستحب کہنا بھی ٹھیک نہیں۔

دوسرے قول والوں کے دلائل ...... جو حضرات کہتے ہیں کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھونا آداب میں سے ہے، ان کی ایک دلیل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **برکة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده**۔(1) کہ کھانے کی برکت یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہاتھ دھوئے جائیں اور اس کے بعد بھی ہاتھ دھوئے جائیں۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث پر قیس بن ربیع کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے اور قیس بن ربیع کو واقعی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن سب محدثین نے اس کو ضعیف قرار نہیں دیا بلکہ بعض نے توثیق بھی کی ہے۔

دوسرا یہ کہ جن حضرات نے قیس کو ضعیف قرار دیا ہے انہوں نے ان کی عدالت پر کسی اعتراض کی وجہ سے ضعیف قرار نہیں دیا بلکہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے اور جو راوی عادل ہو لیکن اس کی حفظ اور یادداشت میں کمی ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے لہٰذا یہ حسن ہے اور جس طرح حدیث صحیح قابل استدلال ہوتی ہے اسی طرح حدیث حسن بھی قابل استدلال ہوتی ہے۔

اسی طرح اس حدیث اور اس مضمون کی تائید دوسری بہت ساری احادیث سے ہوتی ہے۔ یہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں لیکن مجموعی طور پر حضرت سلمان فارسی کی اس حدیث کے لئے مؤید ضرور ہیں۔

(۱) ...... مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من احب ان یکثر خیر بیته فلیتوضأ اذا حضر غداءه واذا رفع**۔(2) یعنی جو آدمی یہ چاہئے کہ اس کے گھر میں خیر کثرت سے ہو جائے اس وقت اس کو چاہئے کہ جب اس کا کھانا لایا جائے اس وقت بھی وہ ہاتھ دھوئے اور جب اس کا کھانا اٹھایا دیا جائے اس وقت بھی ہاتھ دھوئے۔

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب الاطعمۃ الفصل الثانی / ص ۳۶۶: ج ۲...... (۲) سنن ابن ماجه فی الاطعمه باب الوضوء عندالطعام / ص ۲۳۴

اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے اس کی سند البتہ ضعیف ہے بلکہ آگے بھی روایتیں ضعیف پیش کر رہے ہیں ان میں سے اکثر کی سندیں ضعیف ہیں چند ایک ہیں جن کی سند قابل قبول ہے لیکن یہ روایتیں اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ ان سے استدلال کرنا مقصود نہیں بلکہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تائید مقصود ہے۔

(۲)...... حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الوضوء قبل الطعام ينفي الفقر وبعده ينفي اللمم۔[1]

کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا فقر کو دور کرتا ہے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا بیماری یا جنوں کو دور کرتا ہے۔

لمم کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں بیماری یا جنوں یہ حدیث ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کی ہے لیکن اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی۔

(۳)...... کنز العمال میں طبرانی کے حوالے سے حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الوضوء قبل الطعام حسنة وبعد الطعام حسنتان۔[2]

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا ایک نیکی ہے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا دو نیکیاں ہیں۔

(۴)...... کنز العمال میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **الوضوء قبل الطعام وبعده ينفي الفقر وهو من سنن المرسلين۔**[3]

(۵)...... حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کنز العمال میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **سعة الرزقه وردع سنة الشيطن الوضوء قبل الطعام وبعده۔**[4]

کہ رزق کی وسعت اور شیطان کے طریقے کو دور کرنے کا ذریعہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ہے۔

(۶)...... ابن ماجہ اور بیہقی کی شعب الایمان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ ایک دفعہ ہم پانی کے ایک تالاب کے پاس سے گزرے تو ہم براہ راست تالاب کو منہ لگا کر پانی پینے لگے یہ بھی عربوں کے ہاں ایک طریقہ چلتا تھا اس کو کرع کہتے ہیں۔ آگے باب الاشربہ میں اس کا حکم ان شاء اللہ آجائے گا، تو ہم

---

(۱) المغنی لابن قدامہ کتاب الولیمہ فصل فی آداب الطعام / ص ۲۱۱: ج ۱۰

(۲) کنز العمال کتاب المعیشہ الفصل الاول فی آداب الاکل / ص ۲۴۲: ج ۱۵ حدیث نمبر ۴۰۷۶۰ و ۴۰۷۶۱

(۳) ایضاً ...... (۴) ایضاً

کرع کے طور پر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تکرعوا ولکن اغسلوا ایدیکم ثم اشربوا فیھا فانہ لیس اناء اطیب من الید۔[1]

ترجمہ ...... براہ راست منہ لگا کر پانی نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھولو پھر اپنے ہاتھوں کے اندر پانی پیؤ اس لئے کہ ہاتھوں سے زیادہ پاکیزہ برتن کوئی اور نہیں۔

تو اگر گلاس وغیرہ نہیں ہے پیالہ نہیں ہے تو ہاتھ اچھا خاصہ پیالہ ہے یہاں دیکھئے ایک تو حضور ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے پانی پینے کا حکم فرمایا اور براہ راست منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا اور دوسرے یہ فرمایا کہ پانی پینے سے پہلے ہاتھ دھولو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہاتھوں کے بارے میں احتمال ہے کہ شاید ان میں نظافت نہ ہو وہ صاف ستھرے نہ ہوں اگر برتن کے اندر پانی پینا ہوتا پھر تو پانی ہاتھوں کو لگ کر منہ میں نہیں جانا تھا لیکن اس صورت میں جب کہ پانی ہاتھوں کے ساتھ پی رہے ہو پانی ہاتھوں کو لگ کر منہ میں جائے گا اس لئے آپ نے فرمایا: ہاتھوں کو دھو لینا چاہئے اور یہی وجہ کھانے کے اندر بھی پائی جاتی ہے جب کہ ہاتھ کے ساتھ کھائے گا تو وہ کھانا ہاتھوں کو لگ کر منہ میں جائے گا، تو اگر آدمی بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھائے تو ممکن ہے کہ ہاتھ صاف نہ ہوں اور ان پر نامناسب چیز لگی ہو اور وہ کھانا جو منہ کے اندر جائے گا وہ غیر نظیف اور ایسا کھانا ہو گا جو صفائی والا نہیں ہو گا لہٰذا اس حدیث سے جیسے پینے سے پہلے ہاتھ دھونا ثابت ہو رہا ہے اسی طرح کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونا ثابت ہو رہا ہے۔

یہ جتنی بھی روایتیں ہیں یہ ساری کی ساری حضرت سلمان والی حدیث کی تائید کرتی ہیں۔

(۷)...... اس کے علاوہ اس کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جو سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی سو کر اٹھے اور وضوء وغیرہ کرنے لگے تو اس کو چاہئے کہ ہاتھوں کو براہ راست پانی میں نہ ڈالے بلکہ پانی میں ڈالنے سے پہلے انہیں دھوئے پھر پانی میں ڈالے۔[2] شارحین حدیث نے اس کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں استنجاء بالماء کا رواج بہت کم تھا اس لئے کہ پانی کی قلت بہت ہوتی تھی اس لئے زیادہ تر ڈھیلوں سے استنجاء کیا جاتا تھا اور رات کے وقت جب سوتے تھے تو جسم پر پسینہ آجاتا تھا جس میں اس نجاست کے پھیلنے کا امکان ہوتا تھا جو ڈھیلے کی وجہ سے کم تو ہو گئی لیکن بالکل زائل نہیں ہوئی اور یہ بھی احتمال تھا کہ رات کو سوتے وقت نجاست والی جگہ پر ہاتھ لگ گیا اور آدمی کا ہاتھ بھی ناپاک ہو گیا ہو اس

---

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الاشربہ الشرب بالاکف والکرع / ص ۲۴۵ ایضا بیہقی شعب الایمان فی المطاعم والمشارب الشرب بالید الخ / ص ۱۱۹:۵

(۲) مشکاۃ المصابیح کتاب الطہارۃ الفصل الاول باب سنن الوضوء / ص ۴۵ ج ۱

کا حاصل یہ ہے کہ اس کا تعلق طہارت کے ساتھ ہے۔

دوسری علت اس کی یہ بیان کی گئی ہے اور یہ بظاہر راجح معلوم ہوتی ہے کہ محض طہارت کے ساتھ اس کا تعلق نہیں بلکہ نظافت کے ساتھ بھی ہے اگرچہ استنجاء بالماء بھی کیا ہوا ہو یا ناپاکی والی جگہ میں ہاتھ لگنے کا امکان نہ بھی ہو تب بھی یہ امکان تو ضرور ہے کہ رات کو ہاتھ ایسی جگہوں پر لگتا رہا ہو جو اگرچہ ناپاک نہیں لیکن نظیف بھی نہیں ہے مثلاً پسینے کی جگہوں پر ہاتھ لگتا ہو، بغلوں میں رات کو خارش کرتا رہا ہو، سوتے وقت ناک میں انگلیاں ڈالتا رہا ہو تو یہ جگہیں ناپاک تو نہیں لیکن خلاف نظافت ہیں جب اسی طرح کا ہاتھ کم پانی میں براہ راست ڈالو گے تو وہ پانی بھی نظیف نہیں رہے گا تو محض اس احتمال پر کہ کوئی خلاف نظافت چیز ہاتھ پر لگ گئی ہوگی آپ نے دھونے کا حکم فرمایا یعنی پہلے ہاتھ دھولو پھر برتن میں ڈالو جس میں سے تم نے وضو کرنا ہے حالانکہ جب وضو کرنا ہے تو اس میں پانی زیادہ تر باہر استعمال ہونا ہے اندر نہیں جب کہ کھانے اور پینے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ جسم کے اندر جاتا ہے۔ جب جسم سے باہر استعمال ہونے والے پانی میں نظافت کا اتنا اہتمام ہے تو جو چیز انسان کے منہ میں اور پیٹ میں جائے گی اس میں شریعت کے مزاج میں نظافت کا کتنا اہتمام ہوگا اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ تو جب وہاں خلاف نظافت کے احتمال کی وجہ سے ہاتھ دھونے کا حکم ہے تو یہاں بھی خلاف نظافت کے احتمال کی وجہ سے ہاتھ دھونے کا حکم ہوگا اس لئے کہ آدمی دن بھر کی مصروفیت میں مختلف جگہوں پر ہاتھ لگاتا رہتا ہے، کبھی تو ایسی چیز کو ہاتھ لگاتا ہے جو اتنی صاف نہیں ہوتی، اس کے علاوہ اپنے جسم کے بھی ایسے حصوں پر ہاتھ لگ سکتا ہے جس میں پسینہ وغیرہ ہو یا جسم کے کسی حصے میں خارش ہے تو خارش والے حصے پر ہاتھ مل رہا ہے تو صرف پسینے کی گندگی نہیں بلکہ خارش کی بیماری یا اسی بیماری کے جراثیم ہاتھ کو لگ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے اسی ہاتھ سے اس نے اپنے ناک کے اندر صفائی کی ہو، اس ہاتھ سے اسی انگلی سے اس نے کان میں خارش کی ہو، یہی ہاتھ اس نے سر کے بالوں میں بالوں کو ٹھیک کرنے کیلئے ڈالے ہوں۔ یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان کی فطرت اپنے اندر گوارا نہیں کرتی، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ اگرچہ ہاتھوں کو کوئی خلاف نظافت چیز لگی ہوئی نظر نہیں آرہی لیکن خلاف نظافت کا احتمال قوی ضرور موجود ہے۔ لہٰذا شریعت جس نظافت اور ستھرائی کا تقاضا کرتی ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھولئے جائیں، یہ حدیث صحیح ہے کہ صبح کو اٹھو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے قبل ہاتھ دھولو، اس علت کا تقاضا یہ ہے کہ کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھولئے جائیں۔

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا امر تعبدی نہیں:۔

البتہ اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا امر تعبدی نہیں ہے کہ بہر حال

ہاتھ دھو لینے مطلوب ہوں ہاتھوں کی نظافت کا یقین ہی ہو بلکہ ایسا ادب ہے جو در حقیقت ایک خاص علت کی وجہ سے ہے وہ یہ کہ امکان موجود ہے کہ ہاتھوں کوئی نامناسب چیز لگی ہو، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہاتھوں کی نظافت کا یقین ہو تو پھر ہاتھوں کو دھونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس صورت میں ہاتھ دھونا کھانے کے آداب میں سے نہیں ہوگا مثلاً ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وضو کر کے آیا ہے، غسل کر کے آیا ہے اور یہ یقین ہے کہ اتنے عرصہ میں کسی ایسی چیز پر ہاتھ نہیں لگا، اس صورت میں ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر سورہ اعراف کی تفسیر میں امام مالک کا یہی قول نقل کیا ہے۔ عام طور پر تو امام مالک کا یہی قول نقل کیا جاتا ہے، وہ ہاتھ دھونے کو ناپسند کرتے تھے، لیکن قرطبی نے امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ اگر ہاتھ صاف ستھرا ہے تو اس کے دھونے کو امام مالک ناپسند سمجھتے تھے کیونکہ جب ہاتھوں کی نظافت کا یقین ہے تو پھر ہاتھ دھونا محض ایک تکلف ہے، بظاہر امام مالک کی یہ بات کافی قوی اور مضبوط معلوم ہوتی ہے۔[1]

پہلے قول والوں کے دلائل کے جواب......

پہلا جواب...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کے جواب میں ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں وضوء سے مراد وضوء لغوی نہیں بلکہ وضوء شرعی مراد ہے کیونکہ آپ نے یوں فرمایا کہ مجھے وضو کا حکم صرف اس وقت دیا گیا ہے جب میں نماز کے لئے کھڑا ہوں اور نماز کے لئے وضو محض ہاتھ دھونا نہیں ہوتا بلکہ باقاعدہ شرعی وضو ہوتا ہے لہٰذا اس حدیث سے وضو شرعی کی نفی ہو رہی ہے، وضو لغوی یعنی ہاتھ دھونے کی نفی نہیں ہو رہی لیکن اگر تھوڑا سا غور کریں تو بظاہر اس سے وضو لغوی کی بھی نفی ہو رہی ہے مراد اگرچہ وضو شرعی ہے لیکن وضو لغوی کی بھی نفی ہو رہی ہے۔ کیونکہ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ انہوں نے وضو شرعی کے لئے پانی لانے کا کہا ہو تب بھی اتنی بات واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی لانے سے منع فرمایا تھا۔ بظاہر یہی ہے کہ لایا ہی نہیں گیا جب پانی لایا ہی نہیں گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بھی نہیں دھوئے لہٰذا یہ جواب اتنا مضبوط نہیں ہے۔

دوسرا جواب...... البتہ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہاتھ دھونا کھانے کے آداب میں سے ہے، کوئی واجبات یا سنن مؤکدہ میں سے نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے آداب میں زیادہ تکلف نہیں فرماتے تھے اور دوسرا یہ کہ بعض اوقات بیان جواز کے لئے اس چیز کو چھوڑنا بھی جائز ہے، آپ اس ادب

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، سورۃ اعراف، پ۸ آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ (۱۳) تحت المسئلہ السادسۃ ج۷/ص۱۹۴ المکتبہ العربیۃ القاھرۃ

کو ترک فرمادیا کرتے تھے لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہاتھ دھونا کھانے کے آداب میں سے ہی نہیں۔

دوسری دلیل کا جواب ...... ان کا دوسرا استدلال اس سے تھا کہ حضرت سلمان فارسی والی حدیث ضعیف ہے تو اس کا جواب ہو گیا کہ یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ حسن ہے اور پھر اس کی تائید اور بہت ساری احادیث سے ہو رہی ہے۔ اب تک جو ہم نے گفتگو کی ہے اس سے ایک اور چیز کا جواب بھی ہو گیا وہ یہ کہ جو حضرات کہتے ہیں کہ ہاتھ دھونا آداب میں سے نہیں انہوں نے بعض صحابہ کے آثار سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً ابن ابی شیبہ نے اپنی "مصنف" میں حضرت عمر کا اثر نقل کیا ہے کہ حضرت عمر خود قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آئے، کھانا پیش کیا گیا تو کسی نے عرض کیا کہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی لاؤں؟ تو حضرت عمر نے فرمایا کہ میں نے استنجا بائیں ہاتھ سے کیا اور کھانا دائیں ہاتھ سے کھاؤں گا اس لئے ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں۔[1]

اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا کہ کسی آدمی کو کھانے کے لئے کہا گیا، اس نے کہا میں تو ابھی پیشاب کر کے آیا مطلب یہ کہ ہاتھ دھونے ہیں۔ تو حضرت ابن مسعود نے فرمایا: تم نے پیشاب اپنے ہاتھ پر تو نہیں کیا، یہ بھی ابن ابی شیبہ ہی نے روایت نقل کی ہے۔[2] اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے یہ اس وجہ سے کہا کہ یہاں ہاتھ کے صاف ہونے کا یقین تھا زیادہ سے زیادہ بات استنجاء کی ہے تو استنجاء کے لئے بایاں ہاتھ استعمال کیا ہے اور دایاں ہاتھ صاف ہے، اس لئے فرمایا کہ دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اگر غور کریں تو انہیں دو اثروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ میں بہر حال کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا تصور ضرور پایا جاتا تھا تبھی تو یہ سوال پیدا ہوا۔ اگر اس زمانے میں ہاتھ دھونے کا تصور ہی نہیں تھا تو یہاں سوال ہی پیدا نہ ہوتا البتہ ان اثروں سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ صحابہ اکرام اس طرح کے آداب میں زیادہ تکلف اور تعمق سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔

کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا حکم:-

کھانے کے بعد ہاتھ دھونا کئی احادیث سے ثابت ہے ان میں سے کچھ حدیثیں تو پچھلے مسئلہ کے ضمن میں گزر چکی ہیں مثلاً حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کہ کھانے کی برکت یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہاتھ دھوئے جائیں اور بعد میں بھی۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبه فی الاطعمه فی الرجل یخرج من المخرج فیاکل قبل ان یتوضأ ج۵/ص۵۵۸ ایضاً شعب الایمان للبیهقی الفصل الرابع ج۵/ص۶۹

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ / ص۵۵۸: ج۵

اس طرح اس کی تائید میں جو روایات ہم نے ذکر کی ہیں ان میں سے بھی بعض کے اندر کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونے کا ذکر ہے اور بعد میں بھی، اس کے علاوہ کچھ اور روایتیں بھی ہیں جن سے کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اسی فصل کے اندر آگے چل کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آرہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

من بات وفي يده غمر لم يغسله فاصابه شئ فلا يلومن الانفسه۔

کہ جس آدمی نے اس حالت میں رات گزاری کہ اس کے ہاتھ میں کوئی نامناسب چیز کوئی چکنائی لگی ہوئی تھی اور اس نے اس چکنائی کو دھویا نہیں اس وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچ گیا یعنی اس کی چکنائی کی وجہ سے کسی چیز نے کاٹ لیا تو وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے۔ یعنی جو اسے تکلیف پہنچی ہے یہ اس کی اپنی غلطی کا نتیجہ ہے اسے چاہئے تھا کہ چکنائی والے ہاتھوں کو دھو کر سوتا، یہاں چکنائی سے دھونے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اگر چکنائی دھوئے گا نہیں تو نقصان کا خطرہ ہے، رات کو سوتے وقت بھی نقصان کا خطرہ ہے لیکن کسی درجہ میں نقصان کا خطرہ جاگتے ہوئے بھی ہے کہ کھانا کھانے کے اجزاء ہاتھ کو بھی لگے ہوئے تھے چکنائی، مرچیں، نمک وغیرہ اور اسی ہاتھ سے آنکھوں میں خارش کرلی تو آنکھوں میں تکلیف ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الاطعمہ میں **المضمضةبعد الاطعام** [1] باب قائم کیا ہے اور اس میں حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے بعد کلی کرلینی چاہئے تو جب منہ کے اندر کھانے کے اجزاء لگے ہوئے ہیں جو کہ کھانے کا اصل محل ہے اور ہاتھ تو کھانے کا اصل محل بھی نہیں اسے صاف کرنا بطریق اولیٰ مطلوب ہوگا۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دودھ پینے کے بعد کلی ضرور کرلینی چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پینے کے بعد کلی فرمائی اور یہ فرمایا: **ان له دسما** کہ کلی میں نے اس لئے کی کہ دودھ میں چکناہٹ ہوتی ہے اور وہ چکناہٹ منہ کے اندر باقی رہے گی۔

اسی طرح صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک انصاری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھاچکے اور ہاتھ بھی دھو لئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا پڑھی جو کافی لمبی دعا ہے، روایت میں یہ الفاظ ہیں:

فلما طعم وغسل يدهٗ قال: الحمد لله الذى اطعم من الطعام وسقى من الشراب وكسى من العرى وهدى من الضلالة وبصر من العمى وفضل على كثير ممن خلق تفضيلا

---

(۱) صحیح البخاری کتاب الاطعمۃ / ص ۸۲۰: ج ۲

الحمد للہ رب العلمین۔[1]

یہاں دیکھئے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا صراحۃً ثابت ہے، اس کو حاکم نے بھی اپنی صحیح میں اندر روایت کیا ہے اور اسے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی حاکم کے اس فیصلے میں موافقت کی ہے۔

کنز العمال میں ابن عدی کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **اذا اکل احدکم طعاما فلیغسل یدہ من وضر اللحم۔**[2] کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھالے تو اسے چاہئے کہ گوشت کی چکنائی سے اپنے ہاتھوں کو دھولے یعنی اپنے ہاتھوں سے گوشت کی چکنائی کو زائل کردے۔

البتہ اس میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض صحابہ فرماتے ہیں کہ جب ہم کھانا کھاتے تھے تو صرف ہم اتنا کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں کو کنکریوں کے ساتھ صاف کر لیتے تھے۔

اسی طریقے سے فصل اول میں حدیث گزری ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں کو پونچھنے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا چاہئے، اس میں بھی ہاتھوں کے پونچھنے کا ذکر ہے دھونے کا ذکر نہیں۔

(۱)............اس کا ایک جواب یہ ہے کہ دھونا تب مطلوب ہے جب کہ پانی مہیا ہو وہاں خاص طور پر جب مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تو وہاں ظاہر ہے کہ قریب میں پانی مہیا نہیں ہوتا تھا، اس لئے ہاتھوں کو پونچھنا ہی پڑتا تھا۔

(۲)............دوسرے مقصود ہاتھوں سے چکنائی وغیرہ سے صاف کرنا ہے اس کا کامل طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ دھولئے جائیں لیکن فی الجملہ مقصود تولیئے یا کسی اور کپڑے وغیرہ سے صاف کر لینے میں حاصل ہو جاتا ہے، یہ مقصود حاصل کرنے کا ادنیٰ طریقہ ہے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو دھولیا جائے۔ آج کل ایک خاص قسم کے ٹشو پیپر چلتے ہیں جن کو Wet tissue کہتے ہیں۔ ان سے اگر ہاتھ صاف کر لئے جائیں تو چکنائی اتر جاتی ہے، ہاتھ بالکل صاف ہو جاتے ہیں اور ہوائی جہاز وغیرہ میں بعض اوقات یہ ذرا بڑے سائز کے تولیئے کی شکل میں ہوتے ہیں، تو آیا اس سے سنت پوری ہو جاتی ہے یا نہیں؟ تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سنت کا جو مقصود او رمعنی ہے وہ حاصل ہو جائے گا لیکن سنت کے ظاہر پر عمل کر لینے پر ایک خاص برکت ہوتی ہے اس برکت سے محرومی رہے گی۔ چونکہ ایک درجہ میں عام کپڑے سے پونچھ لینا بھی کافی ہے تو اگر کوئی ایسا کپڑا ہے کہ جس میں ہاتھ صاف کرنے والا مواد لگا ہوا ہے تو بطریق اولیٰ اس سے فی الجملہ سنت ادا ہو جائے گی لیکن سنت کی ظاہری شکل پر بھی عمل ہو جائے تو یہ زیادہ برکت کا باعث ہے۔

---

(۱) صحیح ابن حبان فی الاطعمہ باب آداب الاکل بعنوان ذکر ما لحمد العبد ربہ جل و علا بعد غسلہ یدہٗ من الغمر من طعام اکلہ/ص ۳۲۶: ج ۷ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان۔

(۲) کنز العمال فی آداب الاکل / ص ۲۴۴: ج ۱۵ احدیث نمبر ۴۰۷۷۰

(٤٧)-----وعن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم: أنه أتي بقصعة من ثريد فقال: كُلوا من جوانبها، ولا تأكلوا من وسطها، فإن البركة تنزل في وسطها۔ رواه الترمذي وابن ماجه والدارمي وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح وفي رواية أبي داؤد قال: إذا أكل أحدكم طعامًا فلا يأكل من أعلى الصحفة، ولكن يأكل من أسفلها، فإن البركة تنزل من أعلاها۔

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ثرید کا ایک بڑا برتن لایا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے اطراف میں سے کھاؤ اور اس کے درمیان میں سے نہ کھاؤ اس لئے کہ برکت اس کے درمیان میں نازل ہوتی ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھائے تو وہ برتن کے اوپر والے حصے یعنی درمیان میں سے نہ کھائے بلکہ اس کے نچلے حصے یعنی اس کے اطراف میں سے کھائے اس لئے کہ برکت درمیان والے حصہ میں نازل ہوتی ہے۔

(٤٨)-----وعن عبد الله بن عمرو، قال: مارئي رسول الله صلى الله عليه وسلم يأكل متكئاً قط ولا يطأعقبه رجلان۔ (رواه ابوداؤد)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی آپ کے نشان کے قدم پر دو آدمی چلتے تھے۔

ٹیک لگا کر کھانے کی بحث تو پیچھے گزر چکی ہے دوسری بات یہ آئی ''ولا یطاعقبہ رجلان'' کہ آپ کے پیچھے پیچھے کبھی دو آدمی نہیں چلا کرتے تھے اس کا کیا مطلب؟ تو بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم قافلے یا لشکر وغیرہ میں روانہ ہوتے تھے تو قافلے اور لشکر کے آگے نہیں چلتے تھے کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر پیچھے رہتے تھے تاکہ کمزور وغیرہ کا خیال بھی رکھیں تو دو آدمی آپ کے پیچھے نہیں چلتے تھے۔

لیکن زیادہ صحیح مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع بیان کرنا مقصود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہوں کی طرح ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ چلنے کے عادی نہیں تھے کہ ہر وقت جب بھی کہیں جا رہے ہوں تو پیچھے نوکر خادم وغیرہ ساتھ ساتھ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کا انداز یہ نہیں تھا

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تواضع کے طریقے سے چلتے تھے۔ بادشاہوں اور سرداروں کے ہاں اس طرح کی چیزوں کا جو اہتمام ہوتا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نہیں تھا۔

رجلان تثنیہ کا صیغہ ذکر کرنے کی وجہ:۔

یہاں تثنیہ کا صیغہ لائے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی بطور خادم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو جائے تو اس کے منافی نہیں کہ ایک آدمی کی بہر حال ضرورت ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایک ساتھ چلے گا تو تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ہی چلے گا۔

(۴۹)-----وعن عبد الله بن الحارث بن جزء قال: أتي رسول الله صلى الله عليه وسلم بخبز ولحم وهو في المسجد، فأكل وأكلنا معه ثم قام فصلى، وصلينا معه ولم نزد على أن مسحسنا أيدينا بالحصباء۔ (رواه ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزء سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روٹی اور گوشت لایا گیا اس حال میں کہ آپ مسجد میں تھے تو آپ نے اسے تناول فرمایا تو ہم نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھایا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور آپ نے نماز پڑھائی اور ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور ہم نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ اپنے ہاتھوں کو کنکریوں کے ساتھ پونچھ لیں۔

آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء کا حکم:۔

اس سے یہ بات تو سمجھ میں آئی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔

مسجد میں کھانا کھانے کا حکم:۔

دوسرا مسئلہ مسجد میں کھانا کھانے کا حکم کیا ہے؟ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر کھانا تناول فرمایا اس میں مسئلہ یہ ہے کہ معتکف کے لئے مسجد میں کھانا کھانا جائز ہے۔

غیر معتکف کے لئے مسجد میں کھانے کا حکم:۔

لیکن غیر معتکف کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں جاتا ہی کھانا کھانے کے لئے

ہے مسجد میں داخل ہی کھانا کھانے کے لئے ہوتا ہے یہ ناجائز ہے البتہ اگر مسجد میں عبادت وغیرہ کے لئے گیا ہے مثلاً نماز، ذکر، تلاوت وغیرہ کے لئے لیکن اتفاقاً وہاں کوئی کھانے کی چیز آگئی اس کا کھانا جائز ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مسجد کی تلویث کا خطرہ نہ ہو یعنی اس کے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(٥٠)-----وعن أبی هریرة، قال: أتی رسول الله صلی الله علیه وسلم بلحم، فرفع إلیه الذراع وكانت وتعجبه فهس منها۔ (رواه الترمذی وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوشت لایا گیا تو آپ کی طرف دستی بڑھائی گئی کیونکہ آپ کو دستی پسند تھی آپ نے اس سے نوچ نوچ کر کھایا۔

(٥١)-----وعن عائشة، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا تقطعوا اللحم بالسكین، فإنه من صنع الأعاجم وانهسوهُ فإنه اهنأ وأمرأ۔ (رواه أبو داؤد والبیهقی فی شعب الإیمان وقالا: لیس هو بالقوی)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گوشت کو چاقو کے ساتھ نہ کاٹو اس لئے کہ یہ عجمیوں کے طریقے میں سے ہے اور اسے نوچ کر کھاؤ اس لئے کہ یہ زیادہ لذت کا باعث ہے اور زیادہ ہضم کا ذریعہ ہے۔

(٥٢)-----وعن أم المنذر، قالت: دخل علیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم ومعه علی ولنا دوال معلقةٌ، فجعل رسول الله صلی الله علیه وسلم یأكل وعلی معه یأكلُ، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لعلی: مه یاعلی! فإنك ناقةٌ قالت: فجعلت لهم سلقاً وشعیراً، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: یاعلی! من هذا فأصب فإنه أوفق لك۔ (رواه أحمد والترمذی وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ام المنذر سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ہمارے ہاں کچھ خوشے لٹکے ہوئے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانے لگے حضرت علی بھی ساتھ کھانے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! رک جاؤ اس لئے کہ تم بیماری سے نئے نئے اٹھے ہو، حضرت ام منذر فرماتی ہیں کہ میں نے چقندر اور جو تیار کئے تو آپ نے فرمایا: اے علی! اس میں سے لے لو اس لئے کہ یہ تمہارے زیادہ موافق ہے۔

تشریح ...... ناقہ یہ نقاہت سے مشتق ہے، نقاہت کا معنی ہے ایسی حالت کہ جس میں آدمی بیمار تو نہ ہو لیکن بیماری سے نیا نیا اٹھا ہو یعنی بیماری تو زائل ہو چکی ہو لیکن اس کے کمزوری وغیرہ کے آثار باقی ہوں جیسے بیماری کی حالت میں پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے ایسے ہی کمزوری میں بھی پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ کہیں بیماری دوبارہ نہ لوٹ آئے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نقاہت کی حالت میں تھے آپ کی بیماری واضح نہیں ہے کہ کون سی بیماری تھی کہ کھجوریں اس کے موافق نہ تھیں اس لئے آپ نے کھجوریں کھانے سے منع فرمادیا البتہ جب دوسری چیز آئی یعنی چقندر اور جو کا مجموعہ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھانے کا حکم فرمایا، پرہیز کرنے سے معلوم ہوا کہ مریض اور نقاہت والے کے لئے پرہیز اچھی چیز ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔

(۵۳)-----وعن أنس، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعجبه الثفلُ۔ (رواه الترمذي والبيهقي في شعب الايمان)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھرچن پسند تھی۔

تشریح ...... ثفل کھانے کے اس حصے کو کہتے ہیں جو نیچے ہوتا ہے اور عام طور پر برتن کے ساتھ لگ جاتا ہے خاص طور پر چاول وغیرہ میں۔ بعض نے کھرچن پسند ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ آپ کی تواضع اور قناعت اس کا باعث تھی کہ کھانے کا نیچے کا لگا ہوا حصہ عام طور پر گھٹیا اور معمولی سمجھا جاتا ہے اور لوگ اسے صاف بھی نہیں کرتے بلکہ دھو کر پھینک دیتے ہیں تو آپ اس کو شوق سے تناول فرماتے تھے۔
دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے اور بظاہر معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ کو کھرچن لذیذ ہونے کی وجہ سے پسند تھی۔

(۵٤)-----وعن نبيشة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: من أكل في قصعة فلحسها استغفرت له القصعة۔ (رواه احمد والترمذي وابن ماجه والدارمي وقال الترمذي: هذا حديث غريب)

ترجمہ ...... حضرت نبیشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی کسی برتن میں کھانا کھائے اور اسے چاٹ لے یعنی صاف کر دے تو وہ برتن اس کے لئے استغفار کرتا ہے۔

(۵۵)-----وعن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من بات وفي يده غمر لم يغسله فأصابه شي فلا يلو منَّ إلّا نفسه۔ (رواه

الترمذي وأبو داؤد وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی اس حال میں رات گزارے کہ اس کے ہاتھ میں چکناہٹ جسے اس نے دھویا نہ ہو اس وجہ سے اسے کوئی چیز تکلیف پہنچادے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

مطلب یہ ہے کہ جو تکلیف غیر اختیاری طور پر آجائے تو اس پر صبر کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ اجر و ثواب ملے گا اور درجات بلند ہوں گے لیکن جو تکلیف آدمی کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اپنے سر لے لیتا ہے تو ایسی تکلیف آنا اچھی بات نہیں یہ آدمی کے لئے باعث عار اور قابل مذمت ہے۔

(٥٦) ----وعن ابن عباس، قال: كان أحب الطعام إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الثريد من الخبز والثريد من الحيس۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانوں میں سے سب سے زیادہ پسند روٹی کا ثرید اور کھجوروں وغیرہ کا ثرید تھا یا حلوے کا ثرید۔

ثريد من الخبز:-

اس کا معنی یہ ہے کہ روٹی کے ٹکڑے کر کے کسی شوربے وغیرہ میں بھگو دیئے جائیں اور اچھے طریقے سے گھلا دیئے جائیں، اس زمانے میں عام طور پر پکا بھی لیا جاتا تھا۔

ثريد من الحيس:-

الثرید من الحیس کا معنی یہ ہے کہ کھجوریں، پنیر اور گھی وغیرہ ملا کر ان کا ملغوبہ سا تیار کر لیا جاتا تھا جس طرح روٹی کی چوری بناتے ہیں اسی طریقہ سے کھجور وغیرہ کی چوری بنالی جائے تو اس کو الثرید من الحیس کہتے ہیں۔

(٥٧) ----وعن أبي أسيد الأنصاري، قال: قال رسول الله ﷺ: كلوا الزيت وادهنوا به فإنه من شجرة مباركة۔ (رواه الترمذي وابن ماجه والدارمي)

ترجمہ ...... حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ انصاری فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زیتون کا تیل کھانے میں استعمال کرو اور اس کو جسم پر بھی لگاؤ اس لئے کہ یہ بابرکت درخت میں سے ہے۔

زیتون کے تیل کے فوائد:-

زیتون کے تیل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس درخت کو قرآن کریم میں شجر مبارک کہا گیا ہے لہٰذا اس درخت پر لگنے والا پھل بھی بابرکت ہوگا اور اس پھل سے نکلنے والا تیل بھی بابرکت ہوگا اس کے علاوہ طبی طور پر زیتون کے تیل کے بہت سے فوائد مسلّمہ ہیں۔

(۵۸)----وعن أم هانی، قالت: دخل علیّ النبی صلی الله علیه وسلم فقال: أعندك شیٌ قلت: لا إلا خبز یابس وخل فقال: هاتی ما أقفر بیتٌ من أدم فیه خل۔ (رواه الترمذی، وقال: هذا حدیث حسن غریب)

ترجمہ...... حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے، آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے یعنی کھانے کے لئے میں نے کہا کوئی چیز نہیں صرف خشک روٹی اور سرکہ ہے تو آپ نے فرمایا یہی لے آؤ، ایسا گھر سالن سے خالی نہیں سمجھا جاتا جس کے اندر سرکہ موجود ہو۔

(۵۹)---- وعن یوسف بن عبد الله بن سلام،قال: رأیت النبی صلی الله علیه وسلم أخذ کسرة من خبز الشعیر، فوضع علیها تمرة، فقال: هذه إدام هذه وأکل۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھی اور فرمایا یہ اس کا سالن ہے اور اسے تناول فرمایا۔

تشریح...... یہاں ہمارے سامنے مشکوٰۃ کے نسخہ میں **وعن یوسف بن عبدالله ابن سلام قال** ہے لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوں ہونا چاہئے: **عن یوسف بن عبد الله ابن سلام عن ابیه** کہ یوسف بن عبداللہ بن سلام اپنے والد سے یعنی عبداللہ بن سلام سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کی روٹی لی اور اس پر کھجور رکھی اور فرمایا کہ یہ اس کا سالن ہے یہ مطلب نہیں کہ کھجور واقعتاً سالن ہے یا لغت میں اس کو ادام کہا جاسکتا ہے بلکہ قناعت کی ترغیب دینا مقصود ہے، اگر سالن مل جائے تو ٹھیک اگر نہ ملے تو کوئی بھی چیز مل جائے چٹنی یا کوئی اور چیز اسی کے ساتھ آدمی کو روٹی کھا لینی چاہئے، کھجور کو بھی بطور سالن استعمال کیا جاسکتا ہے اگر دل میں قناعت موجود ہو۔

(۶۰)----وعن سعد، قال: مرضت مرضاً أتانی النبی ﷺ یعودُنی فوضع

يده بين ثديي حتى وجدت بردها على فؤادي، وقال: إنك رجل مفؤود أئت الحارث من كلدة أخا ثقيف فإنّه رجلٌ يتطبب، فليأخذ سبع تمرات من عجوة المدينة، فليجأهنّ بنو اهنّ، ثم ليلدك بهنّ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس میری بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے تو آپ نے اپنا دست مبارک میرے دو پستانوں کے درمیان رکھا یہاں تک کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کی تو آپ نے فرمایا کہ تم ایسے شخص ہو جسے دل کی بیماری ہے تم حارث بن کلدہ کے پاس جاؤ جو کہ بنو ثقیف میں سے ہیں اس لئے کہ وہ ایسا شخص ہے کہ جو طب کا کام کرتا ہے اسے چاہئے کہ وہ مدینے کی عجوہ کھجوروں میں سے سات کھجوریں لے آئے اور انہیں گٹھلیوں سمیت کوٹ لے پھر تمہیں منہ کے راستہ سے کھلائے۔

تشریح ...... دوائی استعمال کرنے کے دو طریقے عربوں میں چلتے تھے: ایک طریقہ تھا کہ ناک کے ذریعے دوائی اندر داخل کی جاتی تھی اس کو سعوط کہتے تھے اور دوسرا یہ کہ منہ کے راستہ سے دوائی اندر داخل کی جاتی تھی اسے لدود کہتے تھے، اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ کتاب الطب میں آئے گی تو یہاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا اور یہ فرمایا کہ تمہیں دل کی تکلیف ہے۔

سینے پر ہاتھ رکھنے کی وجوہ:۔

سینے پر ہاتھ کس لئے رکھا، اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

پہلی وجہ ...... یا تو آپ نے سینے پر ہاتھ رکھا برکت پہنچانے کے لئے۔

دوسری وجہ ...... یا سینے پر ہاتھ رکھا تشخیص کے لئے کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن کا اندازہ وغیرہ لگایا ہوگا۔

مدینے کی عجوہ کھجور کی فضیلت:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے علاج یہ تجویز کیا کہ مدینے کی سات عجوہ کھجوریں لے آؤ اور انہیں اپنی گٹھلیوں سمیت کوٹ لو اور انہیں کھائیں، اس سے انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مدینے کی عجوہ کھجور میں دل کی بعض امراض کا علاج موجود ہے اب باقی رہی یہ بات کہ کون سے امراض

کا علاج موجود ہے اس کی تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجربہ پر چھوڑ دی ہے، یہاں ایک اور سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے:

سوال...... جب نسخہ خود نبی کریم ﷺ نے متعین کر دیا اور مقدار بھی متعین کر دی اور نسخہ بنانے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ گٹھلیوں سمیت انہیں کوٹنا ہے تو اب طبیب کے پاس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب......

پہلی وجہ...... اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بعض چیزیں بعض امراض میں مفید ہوتی ہیں لیکن کسی عارض کی وجہ سے کسی خاص شخص کے لئے وہ دوائی مفید نہیں ہوتی بلکہ مضر ہو سکتی ہے اور اس کا فیصلہ طبیب ہی کر سکتا ہے وہ مریض کا مزاج اور اس کی مجموعی حالت دیکھ کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس مرض میں اس کو یہ دوائی جو عام طور پر اس طرح کے مریضوں کو دی جاتی ہے دینی چاہئے یا نہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طبیب کے پاس بھیجا۔

دوسری وجہ...... دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مدینہ منورہ کے ایک کھجور فروش نے مجھے بتایا تھا کہ مدینے کی عجوہ کی جو گٹھلی ہے اس کو کوٹنا بہت مشکل ہے، آسان کام نہیں ہے بلکہ اس کا خاص طریقہ بھی کوئی بتایا تھا کہ اس کو پہلے گرم کرنا چاہئے اور پھر گرم گرم کوٹنا چاہئے۔ تو اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو کوٹنا ہر ایک کا کام نہیں بلکہ صحیح طریقے سے کوٹنے کے لئے خاص مہارت کی ضرورت ہے اور ایسی مہارت عام طور پر اطباء کو ہوتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو طبیب کے پاس بھیجا، واللہ اعلم۔

(٦١)-----وعن عائشة، أن النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یأکُلُ البطیخ بالرطب رواه الترمذی وزاد أبو داؤد: ویقولُ: یکسر حر هذا ببردِ هذا، وبَردُ هذا بحرّ هذا وقال الترمذی: هذا حدیثٌ حسنٌ غریب۔

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ تر کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے اور ابوداؤد کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس کی گرمی اس کی ٹھنڈک سے دور ہو جائے گی اور اس کی ٹھنڈک اس کی گرمی سے۔

تشریح...... یہاں پر شارحین حدیث میں ایک بحث چلی ہے وہ یہ کہ بطیخ کا لفظ دو معنی میں بولا جاتا ہے:

(۱)......... ایک معنی تربوز جس کو عربی میں بطیخ اُخضر کہا جا سکتا ہے۔

(۲)......... دوسرا معنی اس کا خربوزہ جس کو عربی میں بطیخ اُصفر کہتے ہیں۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہاں پر بطیخ اخضر یعنی تربوز مراد ہے اور قرینہ یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ کھجور کی گرمی بطیخ کی ٹھنڈک سے زائل ہو جاتی ہے اور بطیخ کی گرمی کھجور کی گرمی سے زائل ہو جائے گی اور تاثیر کے اعتبار سے ٹھنڈا تربوز ہوتا ہے، خربوزہ تاثیر کے اعتبار سے ٹھنڈا نہیں بلکہ گرم ہوتا ہے۔

اکثر شارحین کی رائے یہ ہے اور صحیح بھی یہ ہے کہ یہاں بطیخ اصفر یعنی خربوزہ مراد ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عربوں کے ہاں تربوز زیادہ پایا ہی نہیں جاتا تھا، زیادہ تر خربوزہ ہی پایا جاتا تھا اس لئے جب بطیخ کا لفظ بولا جاتا تھا تو اس سے عموماً خربوزہ ہی مراد لیا جاتا تھا اس لئے یہاں پر خربوزہ ہی مراد لیا جائے گا۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ نسائی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: **كان يجمع بين الرطب والخربز۔** خربز بہرحال خربوزے ہی کو کہتے ہیں تربوز کو خربز نہیں کہا جاتا، اس لئے راجح یہی ہے کہ یہاں خربوزہ ہی مراد ہے۔ باقی رہا یہ اشکال کہ خربوزہ تو تاثیر کے اعتبار سے گرم ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیسے فرمادیا کہ کھجور کی گرمی اس کی ٹھنڈک سے دور ہو جائے گی؟

پہلا جواب ...... اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ خربوزہ اگرچہ گرم ہوتا ہے لیکن اس کی حرارت کھجور کے مقابلے میں بہت کم ہے لہذا کھجور کے مقابلے میں یہ ٹھنڈا ہے۔

دوسرا جواب ...... دوسرا جواب جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ یہاں حرارت اور برودت سے مراد تاثیر کی حرارت اور برودت نہیں بلکہ حسی حرارت اور برودت مراد ہے یعنی کھجور میں چونکہ مٹھاس زیادہ ہوتی ہے اس لئے یہ حسی طور پر گرم محسوس ہوتی ہے اور خربوزے میں چونکہ مٹھاس کم ہوتی ہے اس لئے حسی طور پر تو یہاں کھجور کی حسی حرارت کو خربوزے کے ذریعے کم کرنا مقصود ہے تاثیر کے اعتبار سے حرارت اور برودت مراد نہیں ہے۔ اسی کو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کھجور کے ذائقے میں تیزی ہوتی ہے جب کہ خربوزہ کے ذائقے میں اس طرح کی تیزی نہیں ہوتی کیونکہ اس میں میٹھا کم ہوتا ہے کھجور کے ذائقے کی تیزی کو حرارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کو خربوزے کے ذریعے معتدل کرنا مقصود ہے، جیسا کہ پہلے بھی یہ بات قثاء اور رطب یعنی ککڑی اور تر کھجور کے بارے میں گزر چکی ہے اصل میں ایک چیز کا ذائقہ ذرا تیز ہو تو عام طور پر اس کو ہلکا کرنے کے لئے اس کے ساتھ کوئی چیز ملالی جاتی ہے۔

(٦٢) ----- وعن أنس، قال: أتي النبي صلى الله عليه وسلم بتمر عتيق، فجعل يفتشه ويخرج السوس منه۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس پرانی کھجوریں لائی گئیں تو آپ انہیں کھولنے لگے اور اس میں سے کیڑے نکالنے لگے۔

تشریح ...... کھجور جب پرانی ہو جاتی ہے تو اس میں باریک کیڑا اندر کی جانب لگ جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ایسی کھجور اگر کھانی ہو تو کھول کر اس کے اندر سے کیڑا نکال کر پھر اسے کھانا چاہئے۔

(٦٣)-----وعن ابن عمر، قال: أتي النبي صلى الله عليه وسلم بجبنة في تبوك، فدعا بالسكين، فسمى وقطع۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس غزوہ تبوک کے موقع پر پنیر کا ایک ٹکڑا لایا گیا تو آپ نے چاقو منگوایا اور اللہ کا نام لیا اور اسے کاٹا۔

(٦٤)-----وعن سلمان، قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن السَّمن والجُبنِ والفراءِ، فقال: الحلال ماأحَلَّ الله في كتابه، والحرامُ ماحرَّمَ الله في كتابه، وما سكت عنه فهو مما عفا عنه۔ (رواه ابن ماجه والترمذي وقال: هذا حديث غريبٌ وموقوفٌ على الأصح)

ترجمہ ...... حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا گھی اور پنیر اور حمار وحشی یعنی نیل گائے کے بارے میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا اور حرام وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے اور جن کے بارے میں کتاب اللہ خاموش ہے وہ ان چیزوں میں سے ہے جنہیں معاف کر دیا گیا ہے۔

تشریح ...... لفظ فراء: اس کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ ف کے فتح (زبر) کے ساتھ ہے تو اس صورت میں اس کا معنی حمار وحشی یعنی نیل گائے ہوگا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ف کے کسرہ (زیر) کے ساتھ ہو اس صورت میں یہ فرو کی جمع ہو گی جس کا معنی پوستین ہے۔

(٦٥)-----وعن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وددتُ انَّ عندى خبزة بيضاء من بُرَّةٍ سمراء ملبقة بسمن ولبن فقام رجلٌ من القوم فاتخذه، فجاء به، فقال: في أي شي كان هذا؟ قال: في عكة ضب قال: أرفعه۔ (رواه أبو داؤد وابن ماجه وقال أبو داؤد: هذا حديثٌ منكرٌ)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری یہ خواہش ہے کہ میرے پاس سفید رنگ کی روٹی ہو جو کہ گندم کے آٹے سے بنی ہوئی ہو جسے گھی اور دودھ میں تر کیا گیا ہو تو ان لوگوں میں سے ایک

آدمی اٹھا اور اس نے اس طرح کی روٹی تیار کی اور آپ کے پاس لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ گھی کس چیز میں تھا تو اس نے کہا گوکی کپی میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے اٹھالو۔

تشریح...... عکہ ضب، کسی جانور کی کھال وغیرہ سے عام طور پر ایک کپی سی بنالیا کرتے تھے جس کے اندر گھی ڈالا کرتے تھے اور اس کو عکہ کہتے ہیں تو یہ کپی جس میں گھی تھا یہ گوکی کھال کی بنی ہوئی تھی، گو حلال ہے یا حرام اس میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن اتنی بات طے شدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں تھی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش ظاہر فرمائی کہ اس طرح کی روٹی مل جائے جو گندم کی بنی ہوئی ہو اور سفید ہو برۃ یعنی گندم اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے، سمراء یعنی گندمی رنگ والی ایسا رنگ جس میں کسی قدر سیاہی موجود ہو جو کہ عام طور پر گندم کا رنگ ہوتا ہے، خاکی سا رنگ اور روٹی کی سفیدی بیان کی گئی ہے کہ وہ سفید ہو تو بظاہر گندم کے ایسے آٹے کی روٹی جو چھنا ہوا ہو یا گندم کے میدے کی روٹی اور روٹی بھی ایسی ہو جو گھی اور دودھ کے ساتھ تل دی گئی ہو یعنی پراٹھا قسم کی روٹی اس کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواہش کی اور کوئی آدمی اس طرح کی روٹی تیار کر کے بھی لے آیا لیکن جب آپ کو پتہ چلا کہ جس گھی سے یہ پراٹھا تیار کیا گیا ہے وہ گوکی کپی میں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھانے سے انکار کر دیا اور اسے کھانے کو آپ کا دل نہیں چاہا۔

مذکورہ حدیث کی سند میں اختلاف:۔

بعض حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے چنانچہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ منکر کا یہاں اصطلاحی معنی مراد نہیں ہے کہ ایک ضعیف راوی ثقہ راویوں کے مخالف روایت کرتا ہو بلکہ منکر سے مراد یہ ہے کہ حدیث صحیح اور قابل استدلال نہیں ہے اور بعض محدثین نے اس حدیث کو قابل استدلال سمجھا ہے کم از کم حسن ضرور ہے۔

البتہ بعض حضرات نے معنی کے اعتبار سے اس حدیث کو رد کر دیا ہے وہ اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اچھے اور تنعم والے کھانوں کی خواہش فرمانا آپ کے مزاج کے خلاف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل جاتا تھا وہ تناول فرمالیتے تھے۔ کھانے میں نہ عیب بیان کرتے اور نہ اس کی خوبی بیان کرتے تھے، اس لئے کہ کھانے پینے کی طرف آپ کی توجہ نہیں تھی، تو آپ کا اس طریقے سے خواہش کرنا بظاہر آپ کی اس عادت کے خلاف تھا اور دوسرے اس خواہش کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلس میں دوسرے لوگوں کے

سامنے ظاہر فرمایا جو در حقیقت ایک قسم کا سوال بن جاتا ہے تو یہ آپ کے عادت مبارکہ کے خلاف تھا اس لئے یہ حدیث صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اس بنیاد پر اس حدیث کو رد کرنا درست نہیں اس لئے کہ عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ کی عادت اگر چہ اچھے کھانوں کی خواہش کرنا نہیں تھی لیکن کبھی کبھار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لئے ایسی خواہش کا اظہار کر دیا ہو تو وہ اس عام عادت کے خلاف نہیں۔

باقی رہی سوال کی بات تو واقعتاً سوال کرنا چاہئے دلالۃً ہو چاہئے صراحۃً ہو یہ اچھی بات نہیں ہے لیکن جہاں بے تکلفی ہو اور ماحول بالکل بے تکلف ہو وہاں اپنی کوئی پسندیدہ چیز ظاہر کر دی جائے کہ مجھے یہ چیز پسند ہے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے چنانچہ آگے باب الضیافہ میں واقعہ آئے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے ان سے یہ فرمایا کہ ہمیں بسر کھلاؤ: یعنی ایسی کھجور کھلاؤ جو آدھی کچی اور آدھی پکی ہوئی ہوتی ہے تو چونکہ ان کے ساتھ بے تکلفی تھی اس لئے وہاں جا کر اپنی پسندیدہ چیز ظاہر کر دی کہ ہم یہ کھانا چاہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ یہاں پر بھی جن لوگوں کے سامنے خواہش ظاہر فرمائی تھی ان کے ساتھ بے تکلفی ہو، وہ آپ کے بے تکلف صحابہ میں سے ہوں۔

اس حدیث سے ایک اور بھی بات معلوم ہوئی کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نیک بندوں سے معاملہ ہوتا ہے کہ ان کی خواہش کو پورا نہیں کیا جاتا اور اللہ تعالیٰ کے جو ناپسندیدہ لوگ ہوتے ہیں ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہوگا، اس لئے انہوں نے جو تھوڑا بہت اچھا کام کیا ہوتا ہے اس کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے لیکن جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں ان کے لئے اصل آخرت ہے اس دنیا میں بعض اوقات ان کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں چنانچہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے ذیل میں ایک واقعہ لکھا ہے۔

واقعہ ...... ایک دفعہ آسمان سے کسی کام کے لئے کوئی فرشتہ اتر رہا تھا اور دوسرا فرشتہ کوئی کام کر کے واپس جا رہا تھا، راستہ میں ملاقات ہو گئی اس نے پوچھا: تم کیسے آئے تھے؟ اس نے پوچھا کہ تم کس کام کے لئے آئے تھے؟ ایک نے بتایا کہ مجھے اس مقصد کے لئے بھیجا گیا کہ فلاں مرنے کے قریب ہے اس کے دل میں مچھلی کی خواہش پیدا ہوئی ہے اور مجھے حکم دیا گیا کہ اس کے گھر کے قریب جو تالاب ہے اس میں مچھلی پیدا کر دوں تاکہ اس کی خواہش پوری ہو جائے اور اللہ کی طرف اس کا کوئی حساب باقی نہ رہے، دنیا میں اسے مل جائے جو کچھ ملنا ہے۔ دوسرے نے بتایا: مجھے اس لئے بھیجا گیا کہ فلاں اللہ کا نیک بندہ ہے اس کے دل میں دودھ کا شوق پیدا ہوا ہے اور اس نے دودھ منگوا بھی لیا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جا کر اس کے دودھ کا گلاس گرا

دوں تاکہ اس کی خواہش پوری نہ ہو اور آخرت میں اس کے لئے ذخیرہ بن جائے۔[1]

(٦٦)-----وعن علی رضی الله عنه، قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن أکل الثوم إلّا مطبوخاً۔ (رواه الترمذی وأبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن کھانے سے منع فرمایا مگر یہ کہ وہ پکا ہوا ہو۔

(٦٧)-----وعن أبی زیاد، قال: سُئلت عائشة عن البصل فقالت: إنَّ آخرَ طعام أکله رسولُ الله ﷺ طعامٌ فیهِ بصل۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت ابوزیاد سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پیاز کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آخری کھانا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھایا وہ ایسا کھانا تھا جس میں پیاز تھا۔

(٦٨)-----وعن ابنی بسر السلمیَّین، قالا: دخلَ علینا رسولُ الله ﷺ فقدَّ منا زُبداً وتمراً وکان یحب الزبد والتمر۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عطیہ بن بسر سلمی اور حضرت عبداللہ بن بسر سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو ہم نے آپ کے سامنے مکھن اور کھجور پیش کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکھن اور کھجور کو پسند فرمایا کرتے تھے۔

(٦٩)----- وعن عکراش بن ذؤیب، قال: أتینا بجفنةٍ کثیرَةِ الثریدِ والوَذرِ، فخبطتُ بیدی فی نواحیها وأکلَ رسول الله صلی الله علیه وسلم من بین یدیه، فقبض بیده الیُسری علی یدی الیمنی ثمَّ قال: یاعکراش! کُل من موضعٍ واحدٍ، فإنَّه طعامٌ واحدٌ ثم أتینا بطبق فیه ألوان التمر، فجعلت آکل من بین یدی، وجالت ید رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الطبق، فقال: یاعکراش! کل من حیث شئت، فإنَّه غیر لون واحد ثمَّ أتینا بماءٍ فغسل رسول الله صلی الله علیه وسلم یدیه ومسح ببلل کفَّیهِ وجهه وذراعَیهِ ورأسَه، وقال: یاعکراش! هذا الوضوء ممَّا غیرت النار۔ (رواه الترمذی)

---

(۱) "مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح" فی الاطعمہ الفصل الثانی ج ۸ / ص ۱۹۴

ترجمہ ...... حضرت عکراش بن ذویب سے رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک بڑا برتن لایا گیا جس میں بہت ثرید اور گوشت کی بوٹیاں تھیں میں اس کے اطراف میں سے اپنے ہاتھ کو مارنے لگا اور رسول اللہ ﷺ اپنے سامنے سے تناول فرمانے لگے تو آپ نے اپنے بائیں ہاتھ کے ساتھ میرے دائیں ہاتھ کو پکڑ لیا اور فرمایا: اے عکراش! ایک ہی جگہ سے کھاؤ اس لئے کہ سارا کھانا ایک ہے پھر ہمارے پاس ایک طباق لایا گیا جس میں مختلف قسم کی کھجوریں تھیں میں اپنے سامنے سے کھانے لگا اور رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ اس طباق میں گھومتا رہا آپ ﷺ نے فرمایا: اے عکراش! جہاں سے چاہو کھاؤ اس لئے کہ یہ ایک قسم نہیں ہے، پھر ہمارے پاس پانی لایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھویا اور اپنی ہتھیلیوں کی تری کے ساتھ اپنے چہرے اور اپنی کلائیوں کو اور اپنے سر کو پونچھا اور فرمایا کہ اے عکراش! یہ وضو ہے اس چیز سے جس کو آگ نے تبدیل کر دیا ہو۔

یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھا کر جو اصطلاحی وضو ہے وہ واجب نہیں ہے بلکہ منہ ہاتھ دھو لینا ہی کافی ہے۔

مسئلہ تو پہلے گزر چکا کہ سامنے سے کھانا یا ادھر ادھر سے کھانا اس کا کیا حکم ہے۔

اس حدیث سے حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کی اطاعت بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ جب ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثرید کے بارے میں یہ فرمایا کہ سامنے سے کھاؤ اس کے بعد جب دوسری قسم کا کھانا آیا تو بھی حضرت عکراش اپنے سامنے سے کھاتے رہے اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ادھر سے کھا رہے تھے لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے امر فرما دیا تھا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادھر ادھر سے کھاتے دیکھ کر انہوں نے ادھر ادھر سے کھانا شروع نہیں کیا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں کہا کہ جہاں سے چاہو کھاؤ ایک تو اطاعت شعاری کہ مجھے تو یہی حکم دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، باقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ادھر سے کھا رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی خصوصیت ہو یا کوئی اور وجہ ہو مجھے تو وہی کرنا جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

ایک نوعیت کے کھانے کو اپنے سامنے کھانا:۔

دوسرا اس سے ایک اور مسئلہ سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ ایک ہی جگہ سے کھانا جب کہ کھانا ایک ہی نوعیت کا ہو کھانے کے آداب میں سے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادب بیان فرما دیا ہے اور ادھر ادھر سے کھانا ناپسندیدہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان فرمائی، اس پر قیاس کر کے حضرت

عکراش نے کھجور کا بھی یہی حکم سمجھا کہ ایک ہی طرف سے کھانا چاہئے اگرچہ مختلف قسم کی کھجوریں ہوں۔

ظاہر ہے کہ اپنے سامنے سے کھانا کوئی ناجائز تو نہیں تھا حضرت عکراش رضی اللہ عنہ اپنے سامنے سے کھا رہے ہیں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں تھا تو حضرت عکراش کو بظاہر ٹوکنے کی، مسئلہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن چونکہ حضرت عکراش رضی اللہ عنہ سمجھ رہے تھے کہ سامنے سے ہی کھانا چاہئے یہ ادب ہے ان کے ذہن میں مسئلہ غلط بیٹھا ہوا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ بتانا ضروری سمجھا، تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایسا کام جو شرعاً ناپسندیدہ نہ ہو، مکروہ نہ ہو کوئی آدمی اسے مکروہ سمجھ رہا ہو تو اسے اس کا جواز بتا دینا چاہئے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اگر یہ اس کام سے بچے گا تو بچنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اس کام سے بچنے میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے لیکن یہ سمجھنا کہ شرعاً اس سے بچنا چاہئے یہ حرج کی بات ہے۔

(۷۰)----وعن عائشة، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أخذَ أهلَه الوعك أمر بالحساءِ فصُنِعَ، ثمَّ أمرهم فحسوا منه، وكان يقولُ: إنَّه ليرتو فؤاد الحزين، ويَسرو عن فؤاد السقيم كما تسرو إحدا كنَّ الوَسَخَ بالماءِ عن وجهِها۔ (رواه الترمذي، وقال: هذا حديثٌ حسنٌ صحيح)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ کے گھر والوں کو بخار ہوتا تو آپ حریرہ بنانے کا حکم دیتے تو وہ تیار کیا جاتا پھر آپ انہیں حکم دیتے تو وہ اس میں سے پیتے اور نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ یہ غمگین آدمی کے دل کو مضبوط کرتا اور بیمار کے باطن کو صاف کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی عورت پانی کے ساتھ اپنے چہرے کے میل کچیل کو صاف کرتی ہے۔

تشریح ...... اس حدیث میں حساء کا ذکر ہے، حساء کہتے ہیں اس چیز کو جسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا جائے، **حسا یحسو** کا معنی ہے کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے پینا بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا جاتا ہے جیسا کہ چائے اور سوپ وغیرہ۔ تو ایسی چیزوں کو اس طرح پینے کو عربی میں حسو کہتے ہیں، حساء کا معنی ہے تھوڑی تھوڑی کر کے پی جانے والی چیز یہاں اس سے مراد بظاہر تلبینہ ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے[1] یعنی جو کا دلیہ یا جو کا پانی جس کے اندر شہد اور دودھ وغیرہ ملا لیا جاتا ہے اور بعض دفعہ کھجوریں

---

(۱) عن عائشه قالت سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول التلبينة مجمة لفواد المريض الحديث مشكاة المصابيح كتاب الاطعمة الفصل الاول۔ ج۲: ص۳۶۴

بھی ملائی جاتی ہیں اس لئے کہ یہاں جو حساء کے فوائد بیان کئے جارہے ہیں، یہ تقریباً وہی ہے جو پہلے تلبینہ کے گزر چکے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں حساء سے مراد تلبینہ ہے یہاں دو فائدے بیان کئے گئے ہیں:

حساء کے فوائد:-

پہلا فائدہ......ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے غمگین آدمی کا دل مضبوط ہو جاتا ہے اور یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ **التلبينة مجمة لفوائد المريض تذهب ببعض الحزن**۔[1] کہ تلبینہ سے بیمار کا دل مضبوط ہوتا ہے، جب دل مضبوط ہوگا تو غم کا مقابلہ کرنا بھی آسان ہوگا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب کسی کے ہاں ان کے عزیزوں میں سے کسی کے گھر میں انتقال ہو جاتا اور تعزیت کرنے کے لئے جو مہمان آئے ہوئے ہوتے تھے وہ واپس جاتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حکم دیتیں کہ حریرہ تیار کیا جائے وہ تیار کیا جاتا اور سب کو پینے کا حکم دیا جاتا تاکہ اس کا غم زائل ہو جائے۔

دوسرا فائدہ......دوسرا فائدہ اس کا اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا کہ **يسرو عن فؤاد السقيم** کہ سقیم کے فواد کو یہ صاف کرتا ہے۔ یہاں فؤاد سے کیا مراد ہے؟ تو بعض نے فؤاد سے مراد یہاں دل لیا ہے اور صاف کرنے سے مراد غم کو دور کرنا ہے، تو اس صورت میں اس جملے کا وہی مطلب ہوگا جو پچھلے جملے کا تھا تو گویا یہ جملہ اسی کی تاکید ہے لیکن بعض شارحین نے کہا ہے کہ یہاں فؤاد سے مراد دل نہیں ہے بلکہ معدہ ہے معدہ کو عربی زبان میں بعض اوقات فؤاد کہہ دیتے ہیں تو اس صورت میں ایک نیا فائدہ ہے کہ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کا معدہ صاف ہو جاتا ہے، معدہ کا تنقیہ ہوتا ہے۔

(۷۱)-----وعن أبي هريرة، قال: قال رسول الله ﷺ: العجوة من الجنةِ، وفيها شفاءُ من السَم والكمأةُ من المن وماؤها شفاءٌ للعين - (رواه الترمذى)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عجوہ کھجور جنت میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفاء ہے اور کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے۔

تشریح ...... کھمبی کے بارے میں بات ہو چکی اس طرح عجوہ کھجور کے بارے میں بھی پہلے بات ہو چکی ہے البتہ یہاں ایک نئی بات عجوہ کھجور کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جنت میں سے ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب الاطعمۃ الفصل الاول ج ۲/ ص ۳۶۴

العجوه من الجنة کا مطلب:-

ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جنت میں سے ہے یعنی جنت کے میووں کے مشابہ ہے، اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمتوں میں سے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے کہ واقعتاً جنت میں سے ہے۔ حضرت آدم اور حضرت حوا جب آسمان سے اترے ہیں تو ان کے ساتھ بہر حال جنت کے کچھ پتے بھی ساتھ آئے تھے انہوں نے جنت کے پتے اپنے اوپر لپیٹ لئے تھے، جب وہ ننگے ہو چکے تھے۔ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّـةِ۔[1] تو ممکن ہے کہ اس موقع پر یا کسی اور موقع پر کوئی پھل جنت سے آگیا ہو اور اسی طرح اس کی نسل آگے بڑھ گئی ہو۔

الفصل الثالث

(۷۲)----عن المغيرة بن شعبة، قال: ضفت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات ليلةٍ، فأمر بجنب فشُوِي، ثمَّ أخذ الشَّفرة فجعل يحُزُّ لي بها منه، فجاء بلال يؤذنه بالصلاة، فألقى الشفرة، فقال: ماله تربت يداه قال: وكان شاربه وفاء فقال لي: أقصه على سواكٍ أو قصه على سواكٍ۔ (رواه الترمذي)

ترجمہ ...... حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک رات مہمان ہوا تو آپ نے ایک دستی کے بارے میں حکم دیا تو اسے بھونا گیا پھر آپ نے چھری لی اور اس کے ساتھ مجھے اس دستی میں سے کاٹ کاٹ کر دینے لگے پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کو نماز کی اطلاع کرنے کے لئے آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چھری کو رکھ دیا اور فرمایا کہ اس بلال کو کیا ہو گیا ہے، اس کے ہاتھ خاک میں ملیں۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں: ان کی یعنی مغیرہ بن شعبہ کی مونچھیں بڑی ہوئی تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ میں تمہاری مونچھوں کو مسواک رکھ کر کاٹ دیتا ہوں۔

تشریح ...... اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ فرمایا ہے: ماله تربت يداه ۔ اس میں تربت یداہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے تو بد دعا ہے کہ اس کے ہاتھ خاک میں ملیں یعنی یہ شخص خاک میں ملے لیکن عام طور پر محاورات عرب میں یہ جملہ بد دعا کے لئے استعمال

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۲ رکوع نمبر ۲

نہیں ہوتا بلکہ پیار کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کی اطلاع کے لئے آئے تھے یہ تو کوئی بری بات نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل پر اظہار ناپسندیدگی کیا کہ مالہ تربت یداہ کہ اس کو کیا ہو گیا کہ ہم اچھے خاصے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے درمیان میں اس نے آکر نماز کی بات کر دی، تو بات اصل میں یہ ہے کہ نماز کے وقت میں ابھی گنجائش تھی۔ وقت تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے احتیاط کے طور پر آپ کو اطلاع دی چونکہ مناسب یہ تھا کہ آپ کو جب کھانا کھاتے دیکھ لیا ہے تو انتظار کر لیتے، جب آپ کھانے سے فارغ ہو جاتے پھر آپ کو نماز کا کہتے یہ آخر میں مونچھوں کی بات ہے اس کا مسئلہ ان شاء اللہ آگے کتاب اللباس میں آجائے گا۔

(۷۳)-----وعن حذيفة، قال: كنَّا إذا حضر نامع النبي صلى الله عليه وسلم لم نضع أيدينا حتى يبدأ رسول الله صلى الله عليه وسلم فيضع يده، وإنَّا حضرنا معه مرةً طعامًا، فجاءت جاريةٌ كأنَّها تدفع، فذهبت لتضع يدها في الطعام، فأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بيدها، ثم جاء أعرابي كأنَّما يدفع، فأخذه بيده فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الشيطان يستحل الطعام أن لايُذكر اسم اللهِ عليهِ، وأنَّه جاء بهذه الجارية ليستحل بها، فأخذت بيدها، فجاء بهذا الأعرابي ليستحل به، فأخذت بيده والذي نفسي بيده، إنَّ يده في يدي مع يدها زاد في رواية: ثمَّ ذكر اسم الله وأكل۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کھانے میں شریک ہوتے تھے تو اپنے ہاتھ کھانے میں نہیں ڈالتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء فرمالیں اور ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مرتبہ کھانے میں شریک تھے تو ایک لڑکی آئی (یا ایک باندی آئی) ایسا لگتا تھا جیسا کہ اسے دھکا دیا جا رہا ہے (بڑی تیزی سے بھاگتی ہوئی آئی) اور وہ آگے بڑھی تاکہ وہ اپنا ہاتھ کھانے میں ڈالے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر ایک بدو آیا جیسا کہ اسے دھکا دیا جا رہا ہے تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان کھانے کو حلال سمجھتا ہے اس وجہ سے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا اور وہ اس لڑکی کو لے کر آیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے لئے کھانا حلال کر لے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر وہ اس

بدو کو لے کر آیا تا کہ وہ اس کے ذریعے سے کھانے کو حلال سمجھ لے، تو میں نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ بے شک اس کا ہاتھ یعنی شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے اس باندی کے ہاتھ کے ساتھ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا نام لیا اور کھانا شروع کر دیا۔

تشریح ...... ایک تو اس حدیث سے اجتماعی کھانے کا یہ ادب معلوم ہوا کہ اگر کھانے کے موقع پر کوئی بڑا اور معزز آدمی موجود ہو، قابل احترام شخص موجود ہو تو جب تک وہ کھانا شروع نہ کرے اس وقت تک باقیوں کو بھی کھانا نہیں چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے تھے تو جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے ہم بھی ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے۔ لیکن یہ جو لڑکی آئی ہے، اس کو ایسے آداب کی خبر نہیں تھی، اسی طرح سے جو بدو آیا ہے اس کو اس طرح کے آداب کی خبر نہیں تھی، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی کھانا شروع کرنا چاہا لیکن خطرہ یہ تھا کہ وہ کھانا شروع کریں گے اللہ کا نام لئے بغیر جس سے کھانے میں بے برکتی پیدا ہو جاتی اور شیطان کا اثر کھانے کے اندر آجاتا۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے تعبیر کیا کہ ان کو شیطان لے کر آیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچ مچ لے کر آیا ہو یعنی شیطان نے ان کے دل میں داعیہ پیدا کیا ہو یہاں پر آنے کا اور بغیر بسم اللہ کے کھانا شروع کرنے کا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان کی طرف ان کو لانے کی نسبت مجازاً کر دی گئی ہو کہ ان کے اس طرح آنے پر شیطان خوش ہوا ہے کہ اگر یہ نہ آتے تو سارے کے سارے اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرتے تو اس میں میرا کوئی حصہ نہ ہوتا، اب یہ کھانا اللہ کا نام لئے بغیر شروع کریں گے تو جب تک کوئی اور اللہ کا نام نہیں لے گا اس وقت تک کم از کم مجھے کھانے کا موقع مل جائے گا۔

آخر میں جملہ ہے ...... **والذی نفسی بیدہ ان یدہ فی یدی مع یدھا** ۔ یہاں دو روایتیں ہیں بعض روایتوں میں ہے **مع یدھما** یعنی تثنیہ کی ضمیر ہے اس پر کوئی اشکال نہیں اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بدو کا ہاتھ بھی پکڑا تھا اور اس لڑکی کا ہاتھ بھی پکڑا تھا اس لئے تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہئے، باقی ید مفرد ہے تو اس کا اطلاق جنس پر ہوتا ہے، ایک پر بھی ہو سکتا ہے، دو پر بھی ہو سکتا ہے، دو سے زیادہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے سامنے جو نسخہ ہے اس میں یہ لفظ ہے: **مع یدھا** یعنی واحد مؤنث کی ضمیر ہے یعنی میرے ہاتھ میں شیطان کا ہاتھ ہے اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ، اس پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہاتھ دونوں کا پکڑا تھا یعنی باندی کا بھی اور بدو کا بھی اس لئے **یدھما** ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر یہ کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی کو ایک ہاتھ سے پکڑا ہو بظاہر ایسا ہی ہے اور بدو کا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑا ہو اور جس ہاتھ سے باندی کا ہاتھ پکڑا تھا یا لڑکی کا ہاتھ پکڑا تھا اس ہاتھ سے شیطان کا ہاتھ پکڑا ہو تو اگرچہ بدو کا ہاتھ بھی پکڑا ہو لیکن جس ہاتھ میں شیطان کا ہاتھ ہے اس ہاتھ میں دونوں کے ہاتھ نہیں ہیں بلکہ اس میں صرف لڑکی کا ہاتھ ہے اس لئے مع یدھا کہ دیا گیا۔

(۷۴) -----وعن عاعشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أراد أن يشترى غلاماً، فألقي بين يديه تمراً فأكل الغلام، فأكثر، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ كثرة الأكل شؤمٌ وأمر برده ـ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام خریدنے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے کچھ کھجوریں رکھ دیں تو اس غلام نے وہ کھجوریں کھائیں اور خوب کھائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زیادہ کھانا نحوست ہے اور اس غلام کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔

تشریح ...... یہ مطلب نہیں کہ غلام خرید چکے تھے اور کثرت اکل اس کا عیب تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیار عیب کی وجہ سے واپس کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خریدا نہیں تھا بلکہ خریدنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کو دیکھنے کے لئے، جانچنے کے لئے اپنے پاس بلایا تھا اور جانچنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ اس کے سامنے کھانا رکھ دیا اس زمانہ کا کھانا کھجوریں ہی تھیں تو کھجوریں اس کے سامنے رکھ دیں، اس نے بہت زیادہ کھائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ یہ کثرت اکل کا عادی ہے اور جو زیادہ کھانے کا عادی ہوتا ہے وہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ زیادہ کھانے سے مراد یہ ہے کہ اعتدال سے زیادہ کھانا جتنا جس طرح کی جسامت والے آدمی کو کھانا چاہئے اس نے اس سے زیادہ کھایا۔

(۷۵)-----وعن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سيد إدامكم الملح ـ (رواه ابن ماجـه)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے کھانوں کا سردار نمک ہے۔

تشریح ...... بعض روایتوں میں آتا ہے کہ تمہارے کھانوں کا سردار دنیا اور آخرت میں گوشت ہے اور بعض میں گوشت کے ساتھ چاول کا بھی ذکر ہے، کنز العمال میں بھی کافی احادیث ہیں جن میں گوشت کو کھانے کا سردار کہا گیا ہے۔[1] جب کہ یہاں نمک کو کھانے کا سردار کہا گیا ہے تو اگر یہ حدیث صحیح ہو تو پھر جواب یہ ہوگا کہ گوشت کا سردار ہونا اور نمک کا سردار ہونا الگ الگ اعتبار سے ہے۔

گوشت کا سردار ہونا یہ اس کی غذائیت وغیرہ کے اعتبار سے ہے اور نمک کا سردار ہونا اصلاح طعام کے اعتبار سے ہے یا قناعت کے اعتبار سے ہے کہ اگر نمک روٹی بھی مل جائے تو قناعت شعار شخص کے لئے یہ بھی بڑا کھانا ہے۔

(٧٦)-----وعن، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وضع الطعام فاخلعوا نعالكم فإنّه أروح لا قدامكم۔

ترجمہ ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کھانا رکھا جائے تو جوتے اتار لیا کرو اس لئے کہ تمہارے قدموں کے لئے یہ زیادہ راحت کا باعث ہے۔

تشریح ...... جوتے اتارنے کا جو حکم دیا ہے وہ اس لئے کہ بہتر یہ ہے کہ آدمی کھانا اطمینان سے کھائے اور آرام کے ساتھ بیٹھ کر کھائے اگر جوتے سمیت بیٹھ کر کھائے گا تو ظاہر ہے کہ بیٹھنے میں وہ اطمینان اور سکون نہیں ہوگا۔

(٧٧)-----وعن أسماء بنت أبي بكر: أنّها كانت إذا أتيت بثريد أمرت به فغطي حتى تذهب فورة دخانه، وتقول: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: هو أعظم للبركة رواهما الدرمي۔

ترجمہ ...... حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس جب ثرید لایا جاتا تو آپ رضی اللہ عنہا اس کے بارے میں حکم دیتیں تو اسے ڈھانپ دیا جاتا یہاں تک کہ اس کی بھاپ کی شدت ختم ہو جاتی اور یہ فرماتیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ زیادہ برکت کا باعث ہے۔

تشریح ...... یعنی کھانے کو اتنا ٹھنڈا کر لینا کہ اس کی جو شدید بھاپ ہے وہ ختم ہو جائے یہ زیادہ برکت کا باعث ہے، اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھانا ٹھنڈا کھانا چاہئے بلکہ بہت سے کھانے ایسے ہیں جو کھائے ہی گرم جاتے ہیں اور اچھے ہی گرم لگتے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ کھانے کے اترنے کے وقت اس کا جو

(١) "سيد الإدام في الدنيا والاخرة اللحم" کنز العمال کتاب المعیشۃ فی آداب الاکل عنوان اللحم ج١٥/ ص ٢٨٠ حدیث نمبر ٤١٠٠١

ابال ہو تا ہے یا بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے چنانچہ لفظ ہیں: **حتی تذهب فوره دخانه۔**
یہ بھی نہیں کہا کہ اس کی بھاپ ختم ہو جائے بلکہ کہا کہ اس کی بھاپ کی شدت ختم ہو جائے یعنی اگر بھاپ موجود ہے لیکن بہت زیادہ بھاپ نہیں ہے تو اس کا کھانا بھی برکت میں قلت کا باعث نہیں ہے۔

(۷۸)-----وعن نبيشة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أكل في قصعة ثمّ لحسها، تقول له القصعة: أعتقك الله من النّار كما أعتقتني من الشيطان رواه رزين۔

ترجمہ ...... حضرت نبیشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی کسی برتن کے اندر کھانا کھاتا ہے پھر اسے صاف کر دیتا ہے تو وہ برتن اس کے بارے میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ سے آزاد کرے جیسا کہ تو نے مجھے شیطان سے بچایا ہے۔

باب الضيافة

الفصل الاوّل

(١)-----عن أبی هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً أو ليصمت وفی رواية: بدل الجار: ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليصل رحمه۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے اور جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو ایذاء نہ پہنچائے اور جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے اور ایک روایت میں پڑوس کے بجائے یہ جملہ ہے کہ اور جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے رشتہ داری کو جوڑے (صلہ رحمی کرے)۔

(٢)-----وعن أبی شريح الكعبی، أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، جائزته يومٌ وليلةٌ، والضيافة ثلاثة أيام، فما بعد ذلك فهو صدقةٌ، ولا يحل له أن يثوی عنده حتی يحرجه۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت ابوشریح کعبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس کا خصوصی اکرام ایک دن اور ایک رات ہوتا ہے اور ضیافت تین دن ہوتی ہے، وہ جو اس کے بعد ہوتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے پاس ٹھہرا رہے یہاں تک اس کو تنگی اور حرج میں ڈال دے۔

(٣)-----وعن عقبة بن عامر، قال: قلت للنبی صلى الله عليه وسلم: إنَّك

تبعثنا فننزل بقوم لا یقروننا، فما تری؟ فقال لنا: إن نزلتم بقوم فأمروا لکم بما ینبغی للضیف فاقبلوا، فإن لم یفعلوا فخذوا منهم حقَّ الضیف الذی ینبغی لهم۔ (متفق علیه)

ترجمہ...... حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمیں بھیجتے ہیں اور ہم کسی قوم کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں لیکن وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے، تو آپ کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ اگر تم کسی قوم کے پاس پڑاؤ ڈالو اور وہ تمہیں وہ چیز دیں جو مہمان کو دینے کے مناسب ہے تو تم اس کو قبول کر لو اور اگر وہ تمہاری مہمانی نہ کریں تو تم ان سے مہمان کا وہ حق لے سکتے ہو جو ایک مہمان کے مناسب ہے۔

اس باب میں سب سے پہلا مسئلہ یہ قابل ذکر ہے کہ ضیافت کا حکم کیا ہے؟

ضیافت کا حکم:-

بعض فقہاء کے نزدیک...... تو بعض فقہاء کے نزدیک ضیافت واجب ہے چنانچہ لیث ابن سعد وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ...... امام احمدؒ کے نزدیک اہل بدو پر ضیافت واجب ہے اور اہل قریٰ پر ضیافت واجب نہیں یعنی جو لوگ آبادیوں میں یا قصبات میں یا شہروں میں یا بڑے دیہاتوں میں رہتے ہیں ان پر ضیافت واجب نہیں ہے اور جو لوگ دور دراز جنگلوں میں رہتے ہیں ان پر ضیافت واجب ہے۔

حنفیہ اور اکثر فقہاء...... لیکن حنفیہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے تو ضیافت واجب نہیں ہے بلکہ مکارم اخلاق میں سے ہے اور زیادہ سے زیادہ اسے سنت مؤکدہ کہہ سکتے ہیں البتہ اگر کوئی شخص مضطر ہو تو اس کی ضیافت واجب ہے یعنی کوئی ایسا شخص مہمان بن جائے جس کے پاس کھانے کے لئے کچھ موجود نہیں اور کہیں اور سے بھی اس کو کھانے کے لئے کچھ ملنے کا امکان نہ ہو اور وہ شدید بھوک کا شکار ہے تو ایسے شخص کی ضیافت کرنا واجب ہے البتہ غیر مضطر کی ضیافت واجب نہیں ہے البتہ اگر آنے والا اسی سے ملنے اور اس کے ہاں رہنے کے لئے آیا، اسے بھی کھانا پیش نہ کرنا پرلے درجے کا بخل ہونے کی وجہ سے انتہائی مذموم ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام احمدؒ کے قول کا حاصل بھی یہی ہے کیوں کہ جمہور نے فرق کیا ہے

مضطر اور غیر مضطر کا کہ مضطر کی ضیافت واجب اور غیر مضطِر کی غیر واجب اور امام احمدؒ نے فرق کیا ہے اہل بدو اور اہل قریٰ کا، اس فرق کی وجہ بھی بظاہر یہی ہے کہ شہروں میں عام طور پر آدمی مضطر نہیں ہوتا بلکہ اس کو کہیں نہ کہیں کھانا ملنے کا امکان ہوتا ہے یا تو کہیں سے خرید سکتا ہے جیسے آج کل ہوٹل وغیرہ ہوتے ہیں یا آبادی بڑی ہے تو اگر ایک نہیں دیتا تو دوسرے اسے دے ہی دیں گے جب کہ قریہ میں عام طور پر لوگ مضطر ہوتے ہیں لہٰذا جمہور اور امام احمدؒ کے مذہب میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ تو اب بنیادی قول دو ہی ہو گئے: ایک یہ کہ ضیافت واجب ہے یہ لیث ابن سعد وغیرہ کا قول ہے اور دوسرا کہ ضیافت واجب نہیں ہے مگر مضطر کے لئے اور یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

وجوب والوں کے دلائل...... جو حضرات کہتے ہیں کہ ضیافت واجب ہے ان کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث ہے جو اس باب میں تیسرے نمبر پر آرہی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمیں بھیجتے ہیں اور کسی قوم کے پاس ہم پڑاؤ ڈالتے ہیں لیکن وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو وہ تمہیں خود مہمانی دے دیں جو مہمان کو دینی چاہئے پھر تو ٹھیک ہے اور اگر وہ تمہاری مہمانی نہ کریں تو پھر مہمان کا جو حق بنتا ہے وہ ان سے زبردستی لے لو زبردستی لینا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ان پر مہمانی کرنا واجب ہو۔ اسی طرح الفصل الثانی میں[۱] حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ایما مسلمٍ ضاف قوما فاصبح الضیف محرومًا کان حقاً علی کل مسلمٍ نصرہ حتی یأخذلہ بقراہ من مالہ وزرعہ۔ (رواہ الدارمی و ابوداؤد)

اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایسا مسلمان جو کسی قوم کا مہمان بنے لیکن وہاں پر وہ محروم رہے یعنی وہ اسے کچھ کھانے کے لئے نہ دیں تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس مہمان کی مدد کرے اور اس میزبان سے اس کی مہمانی کروائے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضیافت واجب ہے۔

جمہور کی دلیل ...... جمہور کی دلیل یہ ہے کہ عام احادیث کا سیاق ترغیبی انداز کا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضیافت واجب نہیں بلکہ مکارم اخلاق میں سے ہے۔

جواب ...... عقبہ بن عامر اور مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہما کی حدیثوں کا کئی طرح سے جمہور کی طرف سے جواب دیا گیا ہے مثلاً بعض نے یہ جواب دیا کہ مہمان کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ **حتّٰی یاخذلہ بقراہ** کہ وہ اپنی مہمانی کے بدلے میں لے سکتا ہے تو یہاں لینے سے مراد اس کی عزت

میں سے لینا ہے یعنی مہمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس بخیل اور کنجوس پر جس نے اسے روٹی تک نہیں پوچھی اس پر تنقید کرے اور اس کی برائی کا لوگوں کے سامنے ذکر کرے، اس سے مال لینا مراد نہیں ہے۔ لیکن یہ توجیہ انتہائی بعید ہے اور خود حدیث کے الفاظ اس کی تردید کر رہے ہیں اس لئے کہ دارمی وغیرہ کی روایت کے لفظ جو الفصل الثانی میں آرہے ہیں وہ یہ ہیں: **حتّٰی یاخذلہ بقراہ من مالہ وزرعہ**، یہ الفاظ صراحتاً اس توجیہ کی تردید کر رہے ہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیثیں ابتدائے اسلام پر محمول ہیں، ابتدائے اسلام میں ضیافت واجب تھی بعد میں یہ وجوب منسوخ ہو گیا۔ یہ جواب امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے لیکن بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ قول نسخ والا اختیار کرنا ہی ہو تو نسخ کی تعبیر کی بجائے یوں کہنا چاہئے کہ یہاں حکم کی علت مرتفع ہونے کی وجہ سے حکم مرتفع ہو گیا۔

دو چیزیں ہوتی ہیں ایک نسخ ہے کوئی حکم منسوخ ہو گیا تو منسوخ ہونے کا تقاضا ہوتا ہے کہ اب وہ حکم کسی بھی حالت میں لاگو نہیں ہوتا اور دوسرے **انتہاء الحکم بانتہاء العلۃ** ہے کہ کوئی حکم اس وجہ سے مرتفع ہو گیا کہ اس کی علت مرتفع ہو گئی تو اس صورت میں وہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہوتا بلکہ اسی طرح کی حالت اگر دوبارہ پیدا ہو جائے تو وہ حکم بھی لوٹ آئے گا۔

اس کی مثال جمعہ کے دن کا غسل ہے ابتدائے اسلام میں واجب تھا بعد میں یہ وجوب باقی نہیں رہا لیکن یہ وجوب ختم ہونا نسخ نہیں ہے بلکہ **انتہاء الحکم بانتہاء العلۃ** ہے یعنی ابتداء میں جو جمعہ کے غسل کو واجب قرار دیا گیا تھا وہ ایک خاص علت کی وجہ سے تھا کہ مسلمانوں کو اپنے کام کاج خود کرنے پڑتے تھے اور کپڑے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ہوتے تھے وہ عموماً اون کے ہوتے تھے موٹے ہوتے تھے، پسینہ بہت زیادہ آتا تھا اور مسجد نبوی کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی اور جمعہ کے دن مجمع زیادہ ہو جاتا تھا یہ ساری باتیں مل کر پسینے کی وجہ سے ایک دوسرے کو شدید تکلیف ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تکلیف سے بچانے کے لئے فرمایا کہ جب جمعہ پڑھنے آؤ تو غسل کر کے آیا کرو لیکن جب مسلمانوں کے حالات ذرا اچھے ہوئے کام کاج کے لئے غلام بھی ملنے لگے اور اس طرح کی صورت حال باقی نہ رہی تو وجوب ختم ہو گیا، یہ نسخ نہیں ہے اگر نسخ کہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا اب جمعہ کا غسل کبھی واجب نہیں ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نسخ نہیں بلکہ **انتہاء الحکم بانتہاءِ العلۃ** ہے لہٰذا اب بھی اگر اسی طرح کے حالات کسی جگہ پر پیدا ہو جائیں تو وہاں پر وہی حکم لوٹ آئے گا اور جمعہ کے دن کا غسل واجب ہو گا۔

اسی طریقے سے اگر امام طحاوی رحمۃ اللہ کا یہ قول نسخ والا اختیار کر بھی لیں تو نسخ کی بجائے یوں کہنا

چاہئے کہ پہلے جو مہمانی واجب تھی وہ خاص علت کی وجہ سے تھی اور وہ علت یہ تھی کہ اس زمانے میں اکثر مہمان مضطر ہوا کرتے تھے، اس لئے مہمانی علی الاطلاق واجب کر دی گئی لیکن جب حالات اچھے ہو گئے خوشحالی آگئی تو اب زیادہ تر لوگ مضطر نہیں ہوتے تھے اس لئے مہمانی کا وجوب ختم کر دیا گیا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ حکم بالکل ختم ہو گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ علت باقی نہ رہی لیکن جہاں جہاں اب بھی علت اضطرار موجود ہو گی وہاں پر یہی حکم ہو گا۔

تیسرا جواب...... تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیثیں مضطر پر محمول ہیں اور پچھلی جو بات تھی اس کا حاصل بھی یہی نکلا تھا مضطر کی ضیافت واجب ہے اور اگر کوئی شخص مضطر کی ضیافت نہیں کرتا کھانے کے لئے نہیں دیتا تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ اپنی جان بچانے کے لئے زبردستی اس سے کھانے کے لئے کچھ لے لے یا اس کی اجازت کے بغیر کچھ لے لے۔

بغیر اجازت چیز لینے کی صورت میں ضمان کا حکم:-

ہاں البتہ اس صورت میں اس میں اختلاف ہوا ہے کہ بعد میں اس کا ضمان واجب ہو گا یا نہیں۔

حنفیہ اور جمہور کا مذہب...... اضطرار کے وقت اس کے لئے بغیر اجازت کھانا جائز ہے لیکن بعد میں جب اضطرار ختم ہو جائے گا اور اس کے پاس گنجائش ہو گی تو اس پر اس کی ضمان واجب ہو گی اِلّا یہ کہ باپ اپنے بیٹے کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کھائے۔ باپ اگر بیٹے کے مال میں سے حالت اضطرار میں اس کی اجازت کے بغیر لے لے تو اس کا ضمان والد پر واجب نہیں ہوتا۔

امام احمد رحمہ اللہ...... امام احمد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ مضطر پر کسی بھی صورت میں ضمان واجب نہیں ہوتا بہر حال اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ مضطر کے لئے اس وقت اس مالک کی اجازت کے بغیر لینا جائز ہے۔

چوتھا جواب...... یہ حدیثیں عاملین زکوۃ پر محمول ہیں وہ لوگ زکوۃ وغیرہ لینے جاتے تھے تو ظاہر ہے کہ ان کو کھانے پینے کی بھی ضرورت ہوتی تھی ابتدائے اسلام میں بیت المال میں وسعت نہیں ہوتی تھی اس لئے ان کا سفر خرچ بیت المال سے دینا مشکل تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جن جن قبائل کے پاس عاملین زکوۃ آئیں تو ان کا نفقہ اور خرچہ ان کے ذمہ ہے کھانا وغیرہ ان قبائل کے ذمہ ہے تو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لازم قرار دے دیا تھا اس لئے ان پر واجب ہو گیا اور ان عاملین کے لئے ان سے زبردستی لینا بھی جائز ہو گیا لیکن بعد میں جب بیت المال کے اندر وسعت پیدا ہو گئی اور ان عمال کو زاد راہ بیت المال سے ملنے لگ گیا تو سابقہ حکم ختم ہو گیا۔

پانچواں جواب...... سب سے بہتر اور صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیثیں ذمیوں پر محمول ہیں، جزیے کے باب میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرو غیرہ نے کچھ لوگوں پر جب جزیہ مقرر کیا تو ان کے جزیہ میں کچھ تو درہم و دنانیر سالانہ شامل تھے یا کچھ اور چیزیں شامل تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی شامل تھی کہ ہمارے لوگ ہمارے لشکر یا ہمارے عاملین اس علاقے میں آئیں گے تو ان کی مہمانی بھی تمہارے ذمہ ہوگی یہ مہمانی جزیے کا باقاعدہ حصہ تھی اور اس کے بدلے میں جو سالانہ جزیہ تھا اس میں تخفیف کی جاتی تھی مثلاً اگر سالانہ بارہ درہم لینے ہیں تو جن پر مہمانی واجب کی گئی ہے ان سے بارہ درہم کی بجائے دس درہم لئے جاتے تھے یا ایک دینار لیا جاتا تھا جب کہ وہاں تفصیل سے گزر چکا ہے یہ حدیث اس طرح کے ذمیوں پر محمول ہے، تو چونکہ مہمانی ان کے جزیے کے اندر شامل ہے اس لئے ان پر اس کی ادائیگی لازم ہے اور اگر وہ انہیں دیتے تو زبردستی بھی ان سے لیا جاسکتا ہے۔ بہر حال جمہور کے نزدیک ان احادیث سے ضیافت کا وجوب ثابت نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ وہ ضیف مضطر ہو۔ (۱)

جائزہ کا معنی اور اس میں وسعت:۔

دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضیافت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

جائزتـهٔ یوم ولیلة والضیافـة ثلثة ایـام۔

اس میں جائزہ مشتق ہے جاز یجوز سے، جس کا معنی گزرنا ہے جائزۃ یا جِیزۃ اصل میں کھانے کی اسی مقدار کو کہا جاتا ہے جو ایک منزل سے دوسری منزل تک کافی ہو جائے یا پانی کی اتنی مقدار جو ایک منزل سے دوسری منزل تک کافی ہو جائے یعنی جس کے ذریعے سے سفر کیا جاسکے، سفر میں گزارا کیا جاسکے۔ بعد میں جائزہ کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جو کسی مہمان کو رخصت ہوتے وقت زادِ راہ کے طور پر دے دی جاتی ہے کہ راستے میں کھانے پینے کا انتظام ہو جائے، اس کو جائزہ بھی کہتے ہیں اور جیزہ بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انتقال سے پہلے جو وصیتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ **اجیزوا الوفد بنحو ما کنتُ اجیزھم۔** کہ جس طرح میں وفد کو جائزۃ یا جیزہ دیا کرتا تھا تم بھی ان کو جائزۃ یا جیزہ دیا کرنا۔ اس کے بعد جائزے کا اطلاق مطلقاً اعزاز واکرام پر ہونے لگا کہ اعزاز واکرام کے طور پر کسی کو کوئی چیز دے دی جائے تو وہ جائزہ ہے اس لئے کہ مہمان کو جو جاتے وقت دیا جاتا تھا کبھی تو اس کو ضرورت کے پیش نظر دیا جاتا تھا اور کبھی محض اعزاز واکرام کے طور پر اسے کچھ تحفہ دے دیا جاتا تھا پھر اسی سے اسی معنی کو وسعت

(۱) فیض الباری علی صحیح البخاری کتاب الادب اکرام الضیف ج ۴/ص ۳۹۶

ہوئی اور شعراکو قصیدہ پڑھنے کی وجہ سے بادشاہوں اور حکام کی طرف سے جو عطیہ ملتا تھا اس کو جائزہ کہا جانے لگا، پھر کسی بھی اچھے کام پر جو انعام کسی کو دیا جاتا ہے اس کو جائزہ کہا جانے لگا چنانچہ آج کل عربی زبان میں جائزۃ کا اطلاق زیادہ تر انعام پر ہوتا ہے۔

حدیث میں جائزہ سے مراد...... حدیث میں جہاں جائزۃ سے کیا مراد ہے اس میں دو احتمال ہو سکتے ہیں:

مہمان کو سفر میں کھانے کے لئے دینا:۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ مہمان کو رخصت ہوتے وقت سفر میں کچھ کھانے کے لئے بطور زاد راہ دے دیا جائے۔

مہمان کے کھانے میں تکلف کرنا:۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ مہمان کے اعزاز و اکرام کے طور پر اس کے لئے کھانے میں تکلف کیا جائے عام معمول کا کھانا اس کے سامنے نہ رکھا جائے۔ یہاں دونوں معنی درست ہیں اس لئے کہ دونوں چیزیں ہی مہمانی کے آداب میں شامل ہیں۔ کم از کم ایک دن مہمان کے لئے کھانے میں اپنی حیثیت کے مطابق تکلف کرنا بھی مہمانی کے آداب میں شامل ہے اگر وہ لمبے سفر پر جارہے تو راستے کا کھانا دے دینا بھی اس کے آداب میں شامل ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مہمان دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض ٹھہرنے والے ہوتے ہیں، بعض جلدی چلے جانے والے، جو ٹھہرنے والے ہیں ان کے لئے جائزہ سے مراد کھانے میں تکلف کرنا ہے کہ اگر وہ تین دن ٹھہر رہا ہے تو ایک دن کم از کم اسے نسبتاً پر تکلف کھانا کھلایا جائے باقی دو دنوں میں عام معمول کا کھانا کھلا دیا جائے اور جو مہمان ٹھہرنے والا نہیں ہے آتے ہی بس جا رہا ہے تو اس کے لئے جائزہ یہ ہے کہ اسے راستے میں کھانے کے لئے دے دیا جائے اور اگر کسی مہمان میں دونوں باتیں جمع کر دی جائیں کہ ٹھہرنے والا مہمان اس کے لئے ایک دن کے کھانے میں بھی تکلف کر لیا جائے اور جب وہ جائے تو ساتھ دے دیا جائے تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ ایک سوال شارحین حدیث نے یہاں اٹھایا ہے وہ یہ کہ

حدیث میں تین دن مراد ہیں یا چار دن؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **جائزتہ یوم ولیلۃ والضیافۃ ثلثۃ ایام۔**

کہ ضیافت تین دن ہے اور جائزۃ یعنی پر تکلف کھانا ایک دن ہے، تو یہ ضیافت کے تین دن جائزے والے دن کے علاوہ ہیں یا اس کو شامل کر کے ہیں اگر اس کے علاوہ ہوں تو چار دن بن جائیں گے

اور اگر اس کو ملا کر ہوں تو کل تین دن ہی رہے تو کون سا معنی مراد ہے احتمال دونوں کا ہے حتمی طور پر کسی معنی کی تعیین نہیں ہے۔

تین دن کے بعد کھانا صدقہ ہے:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ ضیافت تو تین دن ہے اور اس کے بعد اگر مہمان ٹھہرا ہوا ہے تو جو کچھ اسے کھلایا جارہا ہے وہ صدقہ ہے وہ صدقہ کیوں ہے؟

صدقہ اس لئے کہا کہ کسی شخص کو کچھ کھلایا جارہا ہے یا دیا جارہا ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک صورت یہ کہ آپ کے اس کو دینے یا کھلانے سے اس کی حاجت روائی مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ محبت کا اظہار اور اس کا اعزاز و اکرام مقصود ہے چنانچہ ہدیہ میں یہی بات ہوتی ہے کہ ہدیہ جس کو دیا جاتا ہے اس کے ساتھ محبت کی وجہ سے دیا جاتا ہے اس کو حاجت مند سمجھ کر نہیں دیا جاتا اگرچہ وہ فی نفسہ حاجت مند ہو بھی سہی لیکن دینے کا منشاء اس کے ساتھ محبت اور اس کا اعزاز و اکرام کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کا حاجت مند ہونا اور جو صدقہ ہوتا ہے وہ کسی کی حاجت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ تو ابتدائی تین دن میزبان جو اسے کھلا رہا ہے وہ بظاہر دل کی خوشی سے اور محبت کے ساتھ کھلا رہا ہے اس لئے ضیافت ہدیے کی قبیل سے ہے لیکن تین دن کے بعد میزبان تنگ ہونا شروع ہو جائے گا اب وہ عزت افزائی کے طور پر یا اس کے ساتھ محبت کے طور پر نہیں کھلائے گا بلکہ اس لئے کھلا رہا ہے کہ یہ یہاں ٹھہرا ہوا ہے اگر اس کو نہیں کھلائے گا تو بھوکا مر جائے گا اس لئے کھلانا ہی پڑے گا۔ اس لئے اس کی مشابہت صدقے کے ساتھ زیادہ ہے یہ بات کہہ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میزبان اور مہمان کو ایک بات سمجھانا چاہتے ہیں۔

میزبان کو تعلیم کہ تین دن کے بعد بھی دل تنگ نہ کرے:۔

میزبان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر کوئی مہمان ڈھیٹ بن جائے، تین دن سے زیادہ بھی پڑا رہے اور اسے کھانا کھلانا ہی پڑ رہا ہے تو دل کو تنگ نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ جو کچھ کھلا رہے ہو محبت کی وجہ سے نہیں کھلا رہے، ضیافت نہیں ہے تو کم از کم صدقہ ضرور ہے، تو تنگ ہونے کی بجائے اس کی چغلیاں اور غیبت کرنے کی بجائے یہ سوچ لو کہ صدقہ کر رہا ہوں اجر و ثواب ملے گا۔

دوسری بات مہمان کو عار دلانا مقصود ہے کہ پہلے تو تم ضیافت کھا رہے تھے اور اب صدقہ کی روٹیاں کھا رہے ہو اس لئے اب ذرا شرم کرو اور یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ اس لئے فرمایا: **فما بعد ذالك فهو صدقة۔**

تو اس میں درحقیقت ایک سبق مہمان کے لئے ہے اور ایک میزبان کے لئے اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ولا یحل له ان یثوی عنده حتّٰی یحرجه** ۔ کہ مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اتنی دیر ٹھہرے کہ اس کو حرج میں ڈال دے۔ تحریج کے دو معنی ہیں:

تحریج کا معنی......

(۱) تنگی میں مبتلا کرنا۔ (۲) گناہ میں مبتلا کرنا۔

گناہ میں مبتلا کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مہمان کی اپنی بیوی وغیرہ کے سامنے غیبت کرے گا، اس کے سامنے تو اسے کچھ نہ کہے لیکن آگے پیچھے اسے برا بھلا کہے تو اس حد تک اسے وہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ یہاں ضیافت کو تین دن تک منحصر کیا ہے، اس کی اصل علت یہ ہے کہ زیادہ دن ٹھہرنے سے میزبان تنگی اور گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اس لئے تین دن سے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں لیکن اگر یہ علت موجود نہ ہو اور یہ یقین ہو کہ میرے زیادہ ٹھہرنے سے میزبان کو تنگی نہیں ہوگی اور وہ گناہ میں مبتلا نہ ہوگا تو زیادہ ٹھہرنے میں بھی حرج نہیں۔

(٤)-----وعن أبی هریرةَ، قال: خرجَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم ذَات یوم أو لیلة، فإذا هو بأبی بکر وعمر فقال: ما أخرجکما من بیوتکما هذه الساعة، قال: الجوعُ قال: وأنا والذی نفسی بیده لأخرَ جَنی الذی أخرَجَکُما، قوموا، فقاموا معه فأتی رجلاً من الأنصار، فإذا هو لیس فی بیتِه، فلما رأته المرأةُ قالت: مرحبًا وأهلاً فقال لها رسول الله صلی الله علیه وسلم: أینَ فلان؟ قالت: ذهبَ یستعذبُ لنا من الماءِ إذ جاءَ الأنصاری فنظرَ إلی رسول الله صلی الله علیه وسلم وصاحبیه، ثمَّ قال: الحمد لله، ماأحدٌ الیومَ أکرمَ أضیافًا منی قال: فانطَلَقَ فجاء هم بعِذقٍ فیه بُسر وتمر ورطب، فقال: کلوا من هذه، وأخذَ المُدیة، فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم: إیَّاكَ والحَلوبَ، فذبح لهم، فأکلوا من الشاةِ ومن ذلك العذق، وشربوا، فلما أن شبعُوا ورووا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لأبی بکرٍ وعمر: والذی نفسی بیده لتُسألُنَّ عن هذا النعیم یومَ القیامةِ، أخرجَکم من بیوتِکم الجوعُ، ثمَّ لم ترجِعُوا حتی أصابَکم هذا النعیمُ رواه مسلم وذکر حدیث أبی مسعود: کان رجل من الأنصار فی باب الولیمة۔

ترجمہ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن

یا ایک رات گھر سے باہر نکلے تو آپ نے اچانک حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تمہیں تمہارے گھروں سے کس چیز نے نکالا؟ ان دونوں نے عرض کیا بھوک نے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے جس چیز نے تمہیں نکالا۔ اٹھو! چنانچہ وہ آپ کے ساتھ اٹھے، تو آنحضرت ﷺ انصار میں سے ایک شخص کے پاس آئے، تو وہ انصاری اپنے گھر میں موجود نہیں تھے، تو جب ان کی بیوی نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو اس نے کہا خوش آمدید ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں شخص کہاں ہے؟ تو اس نے بتایا کہ وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گیا ہے، اتنے میں وہ انصاری آگئے انہوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا تو کہا: **الحمد للہ** آج مجھ سے زیادہ معزز مہمانوں والا کوئی نہیں۔ (اور لوگوں کے پاس بھی مہمان آئے ہوں گے لیکن جتنے اونچے مہمان میرے پاس آئے ہیں کسی کے پاس نہیں آئے) حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ وہ انصاری گئے اور ان کے پاس ایک خوشہ لائے جس میں کچی اور پکی کھجوریں بھی تھیں، خشک اور تر کھجوریں بھی تھیں اور یہ عرض کیا کہ اس میں سے کھاؤ اور خود اس نے چھری پکڑ لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم دودھ دینے والی بکری سے بچنا۔ (یعنی دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا اس میں تمہارا نقصان زیادہ ہوگا) چنانچہ اس انصاری نے ان کے لئے بکری ذبح کی تو انہوں نے بکری کا گوشت کھایا اور اس خوشے میں سے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا، جب سیر ہوگئے اور سیر اب ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے قیامت کے دن تم سے اس نعمت کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا تمہیں تمہارے گھروں سے بھوک نے نکالا تھا پھر تم گھروں کو واپس نہیں لوٹے یہاں تک کہ یہ نعمت تمہیں حاصل ہوگئی۔

حدیث میں بیان کردہ واقعہ سے مستنبط احکام:-

(۱) حضور ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے حالات اور مزاج میں یکسانیت ......

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حالات میں بہت زیادہ

یکسانیت ہوتی تھی، حالات ایک ہی رہتے تھے جس کی وجہ سے جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھوک کا شکار ہوئے اسی وقت حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھوک کا شکار ہوئے اور مزاج بھی ایک جیسا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بھوک کی وجہ سے باہر نکل آئے اور حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی بھوک کی وجہ سے گھر سے باہر نکل آئے تو گویا ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

(۲) مشکل میں ابتلاء کی صورت میں ممکنہ حد تک ضرور کوشش کرنی چاہئے ......

اگر آدمی کسی مشکل میں مبتلا ہو یا کسی ضرورت کا شکار ہو تو اگر چہ اسے اسباب نظر نہ آرہے ہوں یا اسباب کے نتائج نظر نہ آرہے ہوں لیکن جتنی حد تک ممکن ہو اتنی حد تک ہاتھ پاؤں ضرور مار لینے چاہییں۔ حضرت ابو بکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا کہ کیا ملے گا؟ کہاں سے ملے گا؟ لیکن بہر حال گھر سے نکل پڑے، گھر میں آرام سے نہیں بیٹھے رہے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی دیا۔

(۳) حاجت کے وقت بے تکلف احباب کے پاس کھانے پینے کے لئے جانا ......

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت اور حاجت وغیرہ کے موقع پر کھانے پینے کے لئے اگر آدمی اپنے بے تکلف احباب کے پاس چلا جائے اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔

(۴) خوف فتنہ نہ ہونے کی صورت میں عورت سے بات کرنا اور مرد کی عدم موجودگی میں عورت کے لئے مہمان کو ٹھہرانا اور بٹھانا ...... اس حدیث سے شارحین نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اگر فتنے کا خوف نہ ہو تو کسی عورت سے بات کرنا بھی جائز ہے اور کسی عورت کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ کسی مہمان وغیرہ کو مرد کی عدم موجودگی میں اپنے گھر کے اندر ٹھہرائے اور بٹھائے۔[1]

(۵) مہمانی کا ایک لطیف ادب ...... اس حدیث سے میزبانی کا ایک بڑا لطیف ادب سمجھ میں آرہا ہے اور اس انصاری صحابی کی دانائی اور سمجھ داری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اصل میں تو بکری ذبح کر کے کھلانی تھی لیکن اس میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ وقت لگ جانا تھا اس لئے انہوں نے فوری طور پر جو چیز پیش کی جاسکتی تھی پیش کر دی کہ کھجوروں کا خوشہ پیش کر دیا تاکہ تھوڑا بہت یہ کھانا شروع کر دیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مہمان کے آتے ہی اس کے سامنے تھوڑی بہت چیز پیش کر دی جائے اصل کھانا بعد میں آجائے یہ بھی ایک اچھی بات ہے بشرطیکہ وہ ایسی چیز نہ ہو جس کے بعد کھانا کھانا مشکل ہو جائے۔[2]

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح باب الضیافۃ تحت حدیث ابی ہریرۃ ج ۸ / ص ۲۰۴ ...... (۲) المرجع السابق

(۶) مہمان کی آمد پر زبان سے بھی خوشی کا اظہار کرنا...... اس حدیث سے مہمانی کا ایک ادب یہ سمجھ میں آیا کہ میزبان کو چاہئے کہ وہ مہمان کی آمد پر اپنی زبان سے بھی خوشی کا اظہار کرے عمل سے تو خوشی کا اظہار ہوتا ہی ہے لیکن زبان سے خوشی کا اظہار کرے گا تو تعلقات میں بھی استحکام پیدا ہوگا، مہمان کا دل بھی زیادہ خوش ہو جائے گا اور مہمان کو یہ یقین ہو جائے گا کہ ہم اس کے پاس آکر اس پر بوجھ نہیں بنے بلکہ ہمارے آنے کی وجہ سے خوش ہوا ہے۔[1]

(۷) مہمان کا کھانے پینے کے سلسلے میں میزبان کو مشورہ دینا...... اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان میزبان کو مہمانی کے سلسلے میں کوئی مشورہ دے دے کہ یہ چیز تیار کرو اور یہ چیز تیار نہ کرو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ دیا کہ ہمارے لئے بکری بے شک ذبح کرو لیکن دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا اس لئے کہ اس میں تمہاری بکری بھی جائے گی اور دودھ کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا اس لئے بہتر ہے کہ ایسی بکری ذبح کرو جو آج کل دودھ نہ دے رہی ہو۔

(۸) ہر نعمت پر شکر ادا کرنا...... آخری بات یہ کہ اللہ جل شانہ، جو بھی نعمت عطا فرمائیں جیسی بھی نعمت عطا فرمائیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی کہ دیکھو تم کس حالت میں گھر سے نکلے تھے اور اب کس حالت میں واپس جا رہے ہو، صرف یہ نہیں کہ کھا کر جا رہے ہو بلکہ اچھا کھا کر جا رہے ہو تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہئے اس لئے کہ قیامت کے دن سوال ہوگا کہ میری اس نعمت کا کیا شکر ادا کیا۔[2]

(۵)----- عن المقدام بن معدی کرب، سمعَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: أیُّما مسلمٍ ضافَ قوماً، فأصبحَ الضیفُ محروماً، کان حقاً علی کل مسلم نصرهُ حتی یأخذَ له بقراه من ماله وزرعه۔ (رواه الدارمی و أبو داؤد)

وفی روایةٍ لـه: أیُّما رجلٍ ضافَ قومًا فلم یقروه، کان له أن یُعقبهم بمثلِ قراه۔

ترجمہ...... حضرت مقدام بن معدیکربؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر ایسا مسلمان جو کسی قوم کا مہمان بنے پھر وہ مہمان محروم رہے تو ہر مسلمان پر اس کی مدد کرنا واجب ہے یہاں تک کہ اس کو

---

(۱) المرجع السابق...... (۲) ایضاً

اس کی مہمانی نے کر دے دے اس کے مال اور اس کی کھیتی میں سے اور ابو داؤد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر ایسا شخص جو کسی قوم کا مہمان بنے پھر وہ اس کی مہمانی نہ کریں تو اس کے لئے یہ جائز ہو گا کہ انہیں بدلہ دے اپنی مہمانی کی مثل کے ساتھ۔

اس دوسری روایت کا مطلب یہ ہے کہ ضیافت میں اس کا جتنا حق بنتا تھا وہ کسی اور طریقے سے لے لے جیسے ہو سکتا ہے لے لے۔

مسئلۃ الظفر[1]:۔

یہاں علماء میں ایک مسئلے کے متعلق بحث چلی ہے وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کا دوسرے کے ذمہ کوئی حق ہے مثلاً میں نے کسی شخص کو ہزار روپیہ قرض دیا ہوا ہے اور واپس لینا ہے لیکن وہ میرا حق دیتا نہیں مجھے اس کی کوئی چیز مل جاتی ہے جس کے ذریعے سے میں اس کی اجازت یا اس کے علم کے بغیر اپنا حق وصول کرتا ہوں، تو آیا میرے لئے اس طرح سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں، اس کو مسئلہ ظفر یا ظفر بالحق کا مسئلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا حق پالے تو اس کا کیا حکم ہے۔

مالکیہ کا مذہب...... مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی اس کیلئے اپنا حق لینا جائز نہیں۔

شافعیہ کا مذہب...... حضرات شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کے لئے مطلقاً اپنا حق لینا جائز ہے چاہے وہ چیز اس کے حق کی جنس میں سے ہو یا غیر جنس میں سے ہو۔ جنس میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس سے ہزار روپیہ لینا تھا یہ کہیں جا رہا تھا اس کی جیب سے ہزار روپیہ گر گیا تو میں نے چپکے سے اٹھا لیا اور اسے دیا نہیں اپنا حق وصول کر لیا یہ تو جنس میں سے ہو گیا۔ غیر جنس میں سے یہ فرض کیجئے کہ یہ غسل کرنے کے لئے گیا اور وہاں سے جب واپس آیا تو اپنی گھڑی وہاں پر بھول آیا جس کی قیمت تقریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) روپیہ تھی میں نے وہ گھڑی اٹھا لی اور چپکے سے لے گیا تو یہ غیر جنس میں سے ہے۔ تو شافعیہ کے نزدیک حق جنس میں مل رہا ہو یا غیر جنس سے دونوں صورتوں میں اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

حنفیہ کا مذہب...... حنفیہ کے ہاں اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر جنس حق میں سے ہو تو لینا جائز ہے اور اگر غیر جنس میں سے ہو تو پھر لینا جائز نہیں۔

عدم جواز والوں کی دلیل...... وہ استدلال کرتے ہیں ایک حدیث سے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تخن من خانک ۔ یعنی جو تمہارے ساتھ خیانت کرتا ہے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

---

(۱) راجع لمسألۃ الظفر تکملہ فتح الملہم شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہ کتاب الاقضیۃ باب قضیۃ ہند ج ۲/ ص ۵۷۸

وہ تمہیں حق نہیں دے رہا خیانت کر رہا ہے، تم اس کی اجازت کے بغیر لے رہے ہو تو تم اس کے ساتھ خیانت کر رہے ہو، تو خیانت کے بدلے میں خیانت کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب...... جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اپنا حق لینا یہ خیانت نہیں ہے لہٰذا **لا تخن من خانك** کے اندر داخل نہیں ہوگا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ اس نے میرا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چرالیا بعد میں وہ مجھے مل گیا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس نے میرا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چرایا تھا لہٰذا وہ چور ہے اور چور کی چوری کرنا ٹھیک ہے۔ لہٰذا اگر میرے ہاتھ میں اس کا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چڑھتا ہے تو میں لے لیتا ہوں یہ لینا بہر حال خیانت ہے اس وجہ سے کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی تھی اب میں اس کے ساتھ خیانت کروں یہ جائز نہیں۔

جواز والوں کے دلائل...... جو حضرات کہتے ہیں کہ اپنا حق لینا جائز ہے ان کا استدلال ایک تو اس حدیث سے ہے۔

پہلی دلیل...... کہ یہ عاملین زکوٰۃ کی بات ہو یا ذمیوں کی بات ہو۔ (جیسا کہ پہلے تفصیل سے گزرا) بہر حال مہمان کا حق تھا کہ اس کو مہمانی ملے اور اگر وہ حق نہیں دیتے تو جیسے ہو سکتا ہے یہ اپنا حق لے لے، تو معلوم ہوا کہ اپنا حق لینا جائز ہے۔

دوسری دلیل...... دوسرا استدلال حضرت ہندہ زوجۂ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ ابوسفیان بعض اوقات ہمیں خرچہ نہیں دیتے کنجوسی کرتے ہیں، تو کیا ان کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے لے سکتے ہیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف۔**

کہ قاعدے اور عرف کے مطابق جو تمہارے لئے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو سکتا ہے وہ تم ان کی اجازت کے بغیر لے سکتے ہو یعنی نفقہ تمہارا حق ہے اگر وہ خود نہیں دیتے تو تم چوری چھپے نفقہ لے سکتی ہو۔

البتہ حنفیہ ان حدیثوں کو جنس حق کے ساتھ خاص کرتے ہیں کیوں کہ جب خلاف جنس کا مسئلہ ہوتا ہے تو وہاں درحقیقت مال کا مال کے بدلے میں تبادلہ ہو رہا ہوتا ہے کہ اصل میں تو اس کے ذمے میرے ہزار روپے واجب ہیں لیکن اس ہزار روپے کے بدلے میں میں اس کی گھڑی لے رہا ہوں، تو صرف اپنا حق لینا نہیں ہے بلکہ مال کا مال کے بدلے میں تبادلہ ہے تو جب مال کا مال کے بدلہ میں تبادلہ ہو تو اس میں اجازت ضروری ہے اور یہاں اجازت نہیں پائی گئی اس لئے یہاں لینا جائز نہیں۔

حنفیہ کا اصل مذہب تو یہی ہے کہ غیر جنس سے لینا جائز نہیں ہے لیکن متأخرین نے فساد زمان کی وجہ

سے اور جور قضاۃ کی وجہ سے یعنی قاضیوں کے غیر عادل ہونے کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ ان کے ذریعہ سے حق حاصل کرنا مشکل ہے۔ فتویٰ شافعیہ کے مذہب پر دیا ہے کہ جنس حق میں سے لینا بھی جائز ہے اور غیر جنس میں سے بھی لینا جائز ہے البتہ اس میں اتنی احتیاط ضرور ہونی چاہئے کہ جب غیر جنس میں سے لیں گے تو اس میں قیمت بہر حال لگانی پڑے گی، یہ دیکھنا پڑے گا کہ گھڑی تقریباً کتنے کی ہے، تو قیمت لگانے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ دو ہزار (۲۰۰۰) کی گھڑی ہے اور آپ ویسے ہی فرضی طور پر یہ خیال کر لیں کہ یہ ہزار کی ہے اور یہ سمجھیں کہ ہزار (۱۰۰۰) کے بدلے میں مجھے ہزار (۱۰۰۰) کی گھڑی مل گئی بلکہ قیمت لگانے میں دیانت داری کے ساتھ پوری احتیاط کرنی چاہئے اگر واقعتاً اتنی قیمت بنتی ہے تو وہ چیز لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(٦)-----وعن أبی الأحوصِ الجُشَمی، عن أبیهِ، قال: قلت: یا رسولَ اللهِ! أرأیتَ إن مررتُ برجلٍ فلم یَقرِنی ولم یُضِفنی ثمَّ مرَّبی بعد ذلك، أأقرِیه أم أجزیهِ قال: بل اقرهِ۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ ...... حضرت ابو الاحوص جشمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بتلایئے اگر میں کسی آدمی کے پاس سے گزروں اور وہ مجھے کھانے کے لئے بھی نہ دے اور اپنا مہمان بھی نہ بنائے پھر وہ شخص اس کے بعد میرے پاس سے گزرے تو میں اس کی مہمانی کروں یا اس کو بدلہ دوں۔ (یعنی اس کی مہمانی نہ کروں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلکہ اس کی مہمانی کرو۔

(٧)-----وعن أنس أو غیره أنَّ رسولَ اللهِ صلی اللهُ علیه وسلم استأذنَ علی سعدِ بن عبادة فقال: السلام علیکم ورحمة الله فقال سعد: وعلیکم السلام ورحمة الله، ولم یُسمع النبیَّ صلی الله علیه وسلم حتی سلم ثلاثـاً، وردَّ علیهِ سعدٌ ثلاثـاً، ولم یُسمعه، فرجعَ النبی صلی الله علیه وسلم فاتبعه سعد، فقال: یا رسولَ اللهِ! بأبی أنتَ وأمی، ماسلَّمتَ تسلیمةً إلا هیَ بأذنی: ولقد رددتُ علیكَ ولم أسمِعك، أحببتُ أن أستکثرَ من سلامِكَ ومن البرکة، ثمَّ دخلوا البیتَ، فقرب له زبیبـاً، فأکلَ نبی اللهِ صلی اللهعلیه وسلم، فلما فرغَ قال: أکلَ طعامَکم الأ برارُ، وصلَّت علیکم الملائکةُ، وأفطرَ عندکم الصائمون رواه فی شرح السنة۔

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استیذان کیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، تو حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ سلم کو سنوایا نہیں یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سلام کیا اور حضرت سعد نے بھی تینوں مرتبہ سلام کا جواب دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا نہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے گئے، حضرت سعد آپ کے پیچھے پیچھے آئے اور عرض کیا یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ نے جتنی مرتبہ بھی سلام کیا وہ میرے کانوں میں پڑتا رہا ہے اور میں نے آپ کے سلام کا جواب بھی دیا ہے لیکن آپ کو سنوایا نہیں، (یعنی آہستہ آواز سے جواب دیا) میں یہ چاہتا تھا کہ میں آپ کا سلام اور آپ کی برکت زیادہ حاصل کروں۔ پھر یہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو حضرت سعد نے آپ کے لئے کشمش پیش کی، تو اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا جب فارغ ہوئے تو یوں فرمایا:

اکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملائکہ وافطر عندکم الصائمون۔

ترجمہ ...... تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں اور تمہارے لئے فرشتے دعائے رحمت کریں اور تمہارے ہاں روزہ دار افطار کریں۔

تشریح ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سلام کیا، حضرت سعد نے اگرچہ سلام کا جواب دیا لیکن اتنی آہستہ آواز سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سن نہیں سکے اور قاعدہ یہ ہے کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد واپس آجانا چاہئے اس لئے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے تو حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے دوبارہ آپ کو اپنے گھر لے گئے، یہ عرض کیا کہ میں نے آپ کا سلام سن بھی لیا تھا اور جواب بھی دیا تھا لیکن قصداً آہستہ آہستہ آواز سے جواب دیا تھا کہ آپ کو سنے نہیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ آپ کا السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا میرے لئے سلامتی کا بھی باعث ہے اور آپ کی یہ دعا میرے لئے برکت کا ذریعہ ہے، تو میں نے سوچا کہ محض ایک مرتبہ آپ کی یہ دعا حاصل نہیں کرنی چاہئے بلکہ بار بار حاصل کرنی چاہئے اسی لئے میں نے آہستہ جواب دیا تا کہ آپ دوبارہ سلام کریں۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جواب بڑا مبارک تھا لیکن بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ اس کو غلبہ حال پر محمول کرنا چاہئے ورنہ اصل قاعدے کا مقتضیٰ

یہ ہے کہ خود برکت حاصل کرنے کی خاطر کسی بڑے کو مشقت، تنگی یا انتظار میں ڈالنا یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، ادب کی بات نہیں ہے لیکن حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس وقت ایک حالت کا غلبہ تھا۔

غلبہ حال:-

غلبہ حال کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک پہلو ذہن میں اتنا سما جاتا ہے اور اس کی طرف توجہ اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ دوسرے پہلو کی طرف ذہن جاتا ہی نہیں۔ یہاں دو چیزیں تھیں ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور برکت حاصل کرنا یہ بھی پسندیدہ عمل ہے اور دوسری چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت رسانی اور آپ کو انتظار نہ کروانا یہ اس سے بھی زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن بظاہر حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ سنے تو آپ کی توجہ پہلی چیز کی طرف اتنی زیادہ ہو گئی کہ دوسری بات کی طرف آپ کا دھیان نہیں جاسکا۔

اگر کھانا کسی اور نے کھلایا ہو تو اس کی دعاء...... دوسری بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ جب آدمی کسی کے ہاں کھانا کھائے تو اسے یہ الفاظ کہنے چاہئیں: **اکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملائکہ وافطر عندکم الصائمون۔**

کلمات دعاء اخبار یا انشاء...... یہ تین جملے ہیں، ان تین جملوں میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ اخبار ہو۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خبر دینا تو سو فیصد درست تھا اس لئے کہ مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا کھانا نیک لوگوں نے کھایا ہے اور واقعتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نیک کون ہو سکتا ہے لیکن عام لوگوں کے لئے اخبار کیسے ہو یعنی اپنے بارے میں بتایا کہ ہم نیک لوگ ہیں ہم نے آپ کا کھانا کھایا ہے تو اس کو اسی پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ کہنے والے کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت نیک لوگوں نے تمہارا کھانا کھایا ہے بلکہ حسن ظن کا اظہار ہے اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نیک لوگوں کو کھانا کھلاتے رہتے ہو ہمیں تمہارے بارے میں حسن ظن یہی ہے۔

لیکن زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں جملوں کو انشا اور دعا پر محمول کیا جائے کم از کم ہمیں یہ جملے دعا کی نیت سے کہنے چاہئیں کہ تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں اس میں دو باتیں آگئیں:

(۱)...... ایک تو یہ کہ تمہارے گھر کے تمام افراد نیک بن جائیں تو نیک لوگ تمہارا کھانا کھا رہے ہیں۔

(۲)...... دوسرا یہ کہ تمہارے تعلقات زیادہ نیک لوگوں سے ہوں کیونکہ جس طرح کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں اسی طرح کے لوگ مہمان بنتے ہیں اور اسی طرح کے لوگ اس کا کھانا کھاتے ہیں، تو تمہیں

نیک صحبت نصیب ہو، اچھے لوگوں کے ساتھ تعلقات نصیب ہوں اور فرشتے تمہارے لئے دعائے رحمت کریں اور روزہ دار تمہارے ہاں روزہ افطار کریں اس میں بھی دو باتیں آگئیں ایک تو یہ کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بکثرت روزے رکھنے کی توفیق ہو دوسرا یہ کہ دوسرے روزہ داروں کو افطار کرانے کی توفیق ہو۔

(٨)-----وعن أبی سعید، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: مَثَلُ المؤمنِ ومَثَلُ الإیمانِ كمثَلِ الفرسِ فی آخیَّتِه یجولُ ثمَّ یرجع إلی آخیَّتِه، وإنَّ المؤمنَ یسهو ثمَّ یرجِعُ إلی الایمان، فأطعموا طعامكم الأتقیاء، وأولُوا معروفكم المؤمنینَ- (رواه البیهقی فی شعب الایمان وأبو نعیم فی الحلیة)

ترجمہ ...... حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کی مثال اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی طرح ہے جو اپنی کنڈی کے اندر بندھا ہوا ہو، وہ گومتا ہے پھر اپنی کنڈی کی طرف لوٹ آتا ہے اور مؤمن بھی بھول جاتا ہے پھر ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے لہٰذا تم اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ اور اپنا حسن سلوک ایمان والوں کو عطا کرو۔

اس حدیث میں پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کی مثال سمجھائی ہے، مؤمن کی حالت ایک مثال سے سمجھائی ہے کہ جیسے زمین کے اندر کنڈی گاڑی ہوئی ہو اور گھوڑے کو رسی کے ساتھ باندھ کر وہ رسی اس میں باندھ دی جائے تو گھوڑا اس سے دور بھی چلا جائے گا کیونکہ رسی بالکل چھوٹی نہیں بلکہ کچھ لمبی ہے لیکن زیادہ دور نہیں جاسکتا، ایک خاص حد تک دور جائے گا۔ بس یوں ہی سمجھئے کہ مؤمن ایک گھوڑا ہے اور ایمان کنڈی ہے، مؤمن غلطی سے بداعمالیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ایمان کے تقاضوں سے دور نکل جاتا ہے لیکن ایک خاص حد تک جاتا ہے کہیں نہ کہیں جا کر وہ رک جاتا ہے اور ایمانی تقاضوں کی طرف واپس لوٹ آتا ہے اس پر تفریع کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں بیان فرمائیں:

(١)...........ایک تو یہ کہ تم اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ۔

(٢)...........ایمان والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اس بات کا پچھلی بات سے ربط اور تعلق کیا ہے؟ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاء درمیان میں استعمال فرمایا ہے یعنی ان دو باتوں کو پچھلی بات پر مرتب فرمارہے ہیں۔

جواب ...... دراصل پچھلی بات کا تعلق دوسرے حکم کے ساتھ ہے یعنی **أولوا معروفكم المؤمنین** - کہ ایمان والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اس لئے کہ کسی مؤمن کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو سکتا

ہے کہ اس کے اعمال تو اچھے نہیں لہٰذا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرنا چاہئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسن سلوک کیلئے اس کے دل میں ایمان ہونا کافی ہے، وہ مؤمن ہے تو وہ ایمان کے ساتھ بندھا ہوا ہے اگرچہ ایمان سے ذرا دور ہٹا ہوا ہے لیکن ایک خاص حد تک دور جائے گا اس سے زیادہ نہیں جائے گا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **أطعموا طعامكم الأتقياء** ۔ کہ اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ، یہی بات ایک اور حدیث میں ان لفظوں کے ساتھ آتی ہے کہ **لا يأكُلُ طعامَكم إلا تَقِيٌّ** ۔[1] کہ تمہارا کھانا متقی آدمی ہی کھائے۔ تو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کو کھلانا دو طرح سے ہوتا ہے:

(۱)...... کسی کو اس کی حاجت کی وجہ سے کھانا کھلانا۔

(۲)...... کسی کو اس سے تعلق اور محبت کی وجہ سے کھانا کھلانا۔

جیسے آپ کسی دوست کی دعوت کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے گھر میں کھاتا پیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ جو کھانا آپ اسے کھلا رہے ہیں گھر میں وہ اس سے اچھا ہی کھاتا ہو لیکن آپ کو چونکہ اس کے ساتھ تعلق ہے اور محبت ہے اس لئے آپ اس کی دعوت کرتے ہیں۔

حاجت کی وجہ سے جو کسی کو کھانا کھلانا ہے اس میں متقی اور غیر متقی کا کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ ہر حاجت مند کو کھلانا چاہئے بلکہ اگر حاجت مند کافر ہو تو اس کی مدد کرنا بھی کار ثواب ہے۔ یہاں بات اس کھانے کی ہو رہی ہے جو بطور محبت کے کھلایا جاتا ہے کہ بطور محبت کے کھانا صرف نیک اور متقی لوگوں کو کھلانا چاہئے کیونکہ اس سے ان کے ساتھ تعلق مزید بڑھے گا، اگر برے لوگوں کو اس طریقے سے کھانا کھلاؤ گے تو ان کے ساتھ تمہارا تعلق بڑھے گا تو اس کے برے اثرات بھی تم پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

(۹)----عن عبد الله بن بُسر، قال: كانَ للنبي صلى الله عليه وسلم قصعةٌ، يحملها أربعة رجال، يقال لها: الغرَّاءُ، فلمَّا أضحَوا وسجدو الضحى، أتى بتلكَ القصعة وقد ثرد فيها، فالتفوا عليها، فلمَّا كثروا، جثا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فقال أعرابي: ماهذه الجِلسَةُ؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: إنَّ اللهَ جعلني عبداً كريماً، ولم يجعلني جبَّاراً عنيداً ثمَّ قال: كلُوا من جوانبها، ودَعوا ذِروتها يُبارَكْ فيها۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا برتن تھا جسے چار آدمی اٹھاتے تھے، اسے غراء کہا جاتا تھا، جب چاشت

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج ۸/ ص ۲۰۸ ؎ ایضاً جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی صحبۃ المؤمن ج ۲/ ص ۶۵

کا وقت ہوا اور چاشت کی نماز پڑھ لی تو اس برتن کو لایا گیا اس حال میں کہ اس میں ثرید بنایا گیا تھا، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے ارد گرد جمع ہو گئے، جب تعداد میں زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، تو ایک بدو نے کہا یہ بیٹھنا کیسا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تواضع کرنے والا اور دوسروں کی رعایت کرنے والا بندہ بنایا ہے اور مجھے متکبر اور سرکش نہیں بنایا پھر آپ نے فرمایا کہ اس کے اطراف میں سے کھاؤ اور اس کے درمیان میں جو اوپر والا حصہ ہے اسے چھوڑ دو یعنی بعد میں کھانا اس حصے میں برکت نازل کی جائے گی۔

حاصل یہ ہوا کہ اس بڑے برتن کے ارد گرد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما جمع ہو گئے، پہلے تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کھل کر بیٹھے تھے لیکن جب کھانے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو آنحضرت ﷺ سکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے تاکہ دوسروں کے لئے گنجائش پیدا ہو جائے۔

تو اس پر ایک بدو کو اشکال ہوا کہ بڑے لوگ تو اس طریقے سے نہیں بیٹھا کرتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کریم بنایا ہے یعنی متواضع اور دوسروں کی رعایت کرنے والا بنایا ہے، متکبر نہیں بنایا کہ دوسروں کی رعایت ہی نہ کروں۔

یہ حدیث اس باب میں اس لئے لائے ہیں کہ ضیافت میں بھی عام طور پر اجتماعی کھانا ہوتا ہے اور اس حدیث سے بھی اکٹھے بیٹھ کر کھانے کا ایک ادب سمجھ میں آیا کہ اگر تعداد میں آدمی زیادہ ہو جائیں تو پہلے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو چاہئے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے گنجائش پیدا کر دیں اور تھوڑا سکڑ کر بیٹھ جائیں۔

(۱۰)-----وعن وحشي بن حرب، عن أبيهِ، عن جدِّه: أنَّ أصحابَ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قالوا: يا رسولَ اللهِ! إنَّا نأكلُ ولا نشبعُ قالَ: فلعلكم تفترقون قالوا: نعم قال: فاجتمعُوا على طعامِكم، واذكُروا اسمَ اللهِ يُبارك لكم فيه۔ (رواه الترمذي)

ترجمہ...... حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ: ہم کھاتے ہیں تو سیر نہیں ہوتے، تو آپ نے فرمایا: شاید تم الگ الگ کھاتے ہو، تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے کھانے پر جمع ہو جایا کرو اور اللہ کا نام لے لیا کرو تمہیں اس کھانے میں برکت دی جائے گی۔

جمع ہونا دو طرح سے ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھا رہے ہوں لیکن برتن الگ الگ ہوں یہ جمع ہونے کا ادنیٰ درجہ ہے اور دوسرا یہ ہے کہ برتن بھی ایک ہو اگر نزاع یا طبیعت پر گرانی وغیرہ کا خطرہ نہ ہو تو یہ جمع ہونے کا اعلیٰ درجہ ہے۔ جمع ہو کر کھانے میں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے (واللہ اعلم) کہ اکھٹے کھانے میں کھانا ضائع نہیں ہوتا بلکہ کم کھانے والے کا زائد حصہ زیادہ کھانے والے کے کام آجاتا ہے اور یہ مقصد اس صورت میں بھی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ کھانا ایک بڑے برتن میں ہو اور لوگ چھوٹے برتنوں میں بقدر ضرورت نکال کر کھا رہے ہوں۔

(۱۱)-----عن أبي عَسيب، قال: خرجَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ليلاً، فمرَّبي فدعاني، فخرجتُ إليه، ثمَّ مرَّبأبي بكرٍ فدعاه فخرجَ إليه، ثمَّ مرَّ بعمر فدعاه فخرجَ إليه، فانطلقَ حتى دخلَ حائطاً لبعضِ الأنصار، فقال لصاحبِ الحائط: أطعِمنا بُسراً فجاء بعِذق، فوضعه، فأكلَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم وأصحابُه، ثمَّ دعا بماء باردٍ، فشرب فقال: لَتُسألُنَّ عن هذا النعيم يومَ القيامةِ قال: فأخذ عمر العِذقَ فضربَ بهِ الأرضَ حتى تناثرَ البُسر قِبَلَ رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثمَّ قال: يارسول الله! إنَّا لمسؤولونَ عن هذا يومَ القيامةِ؟ قال: نعم، إلّا من ثلاثٍ: خرقةٍ لفَّ بها الرجلُ عورتَه، أو كسرةٍ سدَّ بها جَوعَتَه، أو جُحرٍ يتدخَّلُ فيهِ من الحر والقُرِّ- (رواه أحمد والبيهقي في شعب الايمان مرسلاً)

ترجمہ...... حضرت ابو عسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نکلے اور میرے پاس سے گزرے تو مجھے بلالیا تو میں نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گیا، پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے انہیں بلا لیا تو وہ بھی نکل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو انہیں بھی بلالیا تو وہ بھی نکل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے، یہاں تک کہ کسی انصاری کے باغ میں داخل ہوگئے اور باغ والے سے کہا کہ ہمیں کچی اور پکی کھجوریں کھلاؤ چنانچہ وہ ایک خوشہ لے کر آئے اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے کھایا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھنڈا پانی منگوایا اور اسے پیا پھر فرمایا کہ اس نعمت کے

8

بارے میں قیامت کے دن تم سے ضرور سوال کیا جائے گا۔ تو روایت کرنے والے کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خوشے کو زمین پر مارا یہاں تک کہ کھجوریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بکھر گئیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن ہم سے اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں، سوائے تین چیزوں کے، ایک کپڑے کا ایسا ٹکڑا جس سے آدمی ستر کو چھپالے یا روٹی کا ایسا ٹکڑا جس سے آدمی اپنی بھوک مٹالے یا ایسی چھوٹی سی رہائش جس میں آدمی گرمی اور سردی کی وجہ سے گھس جائے۔

اسی طرح کا واقعہ پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی گزر چکا ہے، اس پر بحث چلی ہے کہ دونوں روایتوں میں ایک ہی واقعہ ہے یا الگ الگ ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جس انصاری کا واقعہ ہے ان کا نام ابوالہیثم ہے، اس روایت میں بھی ابوالہیثم ہی کا واقعہ ہے یا کوئی اور ہے، صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ الگ ہے اور وہ واقعہ الگ ہے کیونکہ دونوں کا سیاق الگ الگ ہے اور دونوں میں کئی فرق ہیں:

(۱)......... مثلاً پہلی روایت میں یہ تھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما خود اپنے گھروں سے نکلے ہوئے تھے اور اس میں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا ہے۔

(۲)......... وہاں وہ انصاری خود نہیں ملا تھا بلکہ ابتداء میں اس کی بیوی ملی، یہاں پر براہ راست ابتداء ہی میں اس باغ والے سے ملاقات ہوگئی ہے۔

(۳)......... اور وہاں کھجوریں کھانے کا بھی ذکر تھا اور بکری کا گوشت کھانے کا بھی لیکن یہاں صرف کھجوروں کا ذکر ہے اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس سے الگ ہے۔[1] اس واقعے سے کئی باتیں سمجھ میں آئیں۔

حدیث سے مستنبط مسائل:-

ہر نعمت کے بارے میں سوال ہوگا...... حضور اقدس صلی ﷺ نے فرمایا کہ تم نے جو کھجوریں کھائی ہیں اور پانی پیا ہے اس نعمت کے بارے میں بھی تم سے سوال ہوگا یعنی ایک تو یہ سوال ہوگا کہ یہ نعمت جائز طریقے سے حاصل کی یا ناجائز طریقے سے اور دوسرے یہ سوال ہوگا کہ اس کا شکر ادا کیا یا نہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ خوشہ اٹھا کر زمین پر مارا اور پوچھا کہ کیا اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔

---

(۱) اوجز المسالک الی موطا الامام مالک جامع ماجاء فی الطعام والشراب ج ۱۴/ ص ۳۲۵

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس خوشہ کو زمین پر اس طرح مارنا یا تو شدت خوف کی وجہ سے تھا کہ اس اللہ تعالیٰ کے سامنے مسؤلیت کا خوف اتنا ہوا کہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکے یا اس طرح کرنا حیرت کی وجہ سے تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیرت ہوئی کہ یہ بظاہر معمولی سی چیز ہے اس کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جس نعمت میں کسی درجے میں بھی تلذّذ کا معنی پایا جاتا ہے اس کے بارے میں سوال ہوگا ہاں البتہ وہ نعمتیں جن میں حاجت پوری کرنے کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں پایا جاتا اس سے صرف حاجت ہی پوری ہوتی ہے مثلاً یہ کہ کپڑا بس اتنا ہے کہ اس سے ستر چھپ جائے، اس میں زینت وغیرہ کا کوئی پہلو نہیں ہے یا کھانے کی اتنی مقدار ہے اور ایسی نوعیت ہے کہ اس سے صرف بھوک مٹتی ہے کوئی لذت وغیرہ اس سے حاصل نہیں ہوتی یا رہائش اتنی معمولی ہے کہ اس سے صرف سردی اور گرمی سے بچنے کا کام لیا جاتا ہے اور کسی قسم کی سہولت نہیں ہے۔ تو یہ چونکہ انسان کی بہت ہی بنیادی ضرورتیں ہیں اس سے زائد جو بھی ملا چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اس کے بارے میں قیامت کے دن سوال ہوگا جس کو زیادہ ملا اس سے زیادہ سوال ہوگا اور جس کو تھوڑا ملا اس سے تھوڑا سوال ہوگا۔

بے تکلف احباب سے اپنی پسند کی چیز مانگنے میں حرج نہیں...... اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اپنے بے تکلف احباب کے پاس جا کر اگر از خود اپنی پسند کی چیز مانگ لی جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ان سے یہ کہا: أطعِمنا بُسراً کہ ہمیں بسر کھلاؤ، یہ اس وقت ہے جب دوسرے پر گرانی کا خطرہ نہ ہو اور یہاں أطعِمنا بُسراً کہنے کا یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ صرف کھجوریں کھلانے پر اکتفا کرو ہمارے لئے بکری وغیرہ ذبح نہ کرنا یا کسی اور کھانے کا بندوبست نہ کرنا۔

اگر کھانا نہ کھانا ہو تو میزبان کو پہلے اطلاع کر دینی چاہئے...... اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اگر آدمی نے کھانا وغیرہ نہ کھانا ہو اور یہ احتمال ہو کہ میزبان تیار کرلے گا تو چاہئے کہ آدمی پہلے ہی بتا دے ایسا نہ ہو کہ وہ تیار کرلے بعد میں آپ کھانے سے انکار کر دیں۔

(۱۲)-----وعن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وضعت المائدة فلا يقوم رجل حتى ترفع المائدة ولا يرفع يده وإن شبع حتى يفرغ القوم وليعذر فإن ذلك يخجل جليسه، فيقبض يده، وعسى أن يكون له في الطعام حاجة۔ (رواه ابن ماجه والبيهقي في شعب الايمان)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(۳) شرح الطیبی کتاب الاطعمہ باب الضیافہ الفصل الثالث ج ۸ / ص ۱۷۹

وسلم نے فرمایا کہ جب دستر خوان رکھا جائے تو کوئی آدمی نہ اٹھے یہاں تک کہ دستر خوان اٹھالیا جائے اور کوئی آدمی کھانے سے اپنا ہاتھ بھی پیچھے نہ ہٹائے اگرچہ وہ سیر ہو چکا ہو یہاں تک کہ سارے لوگ فارغ ہو جائیں اور اسے چاہئے کہ معذرت کرلے اس لئے کہ یہ بات اس کے ہم نشین کو شرمندہ کرے گی اور وہ اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالے گا حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اسے بھی کھانے کی حاجت ہو۔

اس حدیث میں دو آداب بیان فرمائے ہیں:

دسترخوان اٹھانے سے پہلے اٹھنا:-

پہلا ادب یہ بیان کیا ہے: **فلا یقوم رجلٌ حتی یرفع المائدة**۔ کہ کوئی آدمی اس وقت تک نہ اٹھے یہاں تک کہ دستر خوان اٹھالیا جائے۔ (مائدہ) اصل میں کھانے کی میز یا تپائی کو کہتے ہیں لیکن بظاہر یہاں پر مطلقاً دستر خوان مراد ہے اور دستر خوان سے مراد دستر خوان پہ رکھا ہوا کھانا اور برتن ہیں۔

رفع مائدہ کے معانی...... رفع مائدہ کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں:

(۱)......... ایک تو یہی کہ رکھا ہوا کھانا اور برتن وغیرہ مراد ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جب تک برتن نہ اٹھالئے جائیں اس وقت تک دستر خوان سے نہیں اٹھنا چاہئے اس لئے کہ ابھی برتن اور کھانا سامنے رکھا ہوا ہے اور آدمی وہاں سے اٹھ جاتا ہے تو یہ کھانے سے اعراض کی ایک صورت ہے اور یہ مناسب نہیں ہے لیکن یہ اس وقت ہے کہ کوئی حاجت یا عذر نہ ہو اگر کوئی عذر ہو مثلاً کھانا یا برتن اٹھانے والے ذرا دیر سے اٹھائیں گے اور اس کو کسی وجہ سے جلدی ہے تو پہلے اٹھ جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ بیٹھے رہنا یہ آداب میں سے ہے اور آداب میں معمولی عوارض کی وجہ سے بھی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ برتن اٹھانے یا کھانا اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ برتن اٹھنے کا سلسلہ شروع ہو جائے، پورے برتن اٹھائے جانا مراد نہیں جب برتن پہلے جانا شروع ہو گئے تو اس کا اٹھنا اعراض کی صورت نہیں بنتا۔

(۲)......... رفع مائدہ کا دوسرا معنی کھانے سے فارغ ہونا ہے چنانچہ صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے مشکوٰۃ کے صفحہ نمبر ۳۶۵ پر ہے:

أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا رفع مائدتہٗ قال الحمد للہ حمداً کثیراً۔

تو یہاں رفع مائدہ سے مراد ہے کھانے سے فارغ ہونا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر

یہی ترجمہ قائم کیا ہے کہ باب ما یقول اذا فرَغ من طعامه۔[1] اسی طریقے سے اس زیر بحث حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں بھی رفع مائدہ سے مراد کھانے سے فارغ ہونا ہو سکتا ہے۔ تو اب مطلب یہ ہوگا کہ جب تک باقی لوگ کھانے سے فارغ نہیں ہوتے اس وقت تک کوئی آدمی نہ اٹھے نہ اٹھنے کی وجہ وہی ہوگی جو اگلے ادب کی وجہ ہے کہ باقی لوگ ابھی کھانے سے فارغ نہیں ہوئے بلکہ کھا رہے ہیں یہ پہلے ہی اٹھ جاتا ہے تو باقی لوگوں کو احساس ہوگا کہ شاید ہم زیادہ کھا رہے ہیں ہو سکتا ہے وہ شرمندگی کا شکار ہو جائیں۔

اجتماعی کھانے میں جلدی فارغ ہونے والے کے لئے آداب...... دوسرا ادب یہ بیان فرمایا کہ اگر کچھ لوگ اجتماعی کھانا کھا رہے ہوں ایک آدمی پہلے سیر ہو چکا ہو خاص طور پر میزبان تو اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ دوسروں کے فارغ ہونے تک تھوڑا تھوڑا کر کے کھاتا رہے اور اپنا ہاتھ نہ کھینچے اس لئے کہ اگر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فارغ ہو کر بیٹھ گیا تو دوسرے لوگ یہ سمجھیں گے کہ شاید ہم زیادہ کھا رہے ہیں یا انہیں احساس ہوگا کہ اگر ہم کھاتے رہے تو ہمارے بارے میں یہ تاثر ہوگا کہ یہ زیادہ کھا رہے ہیں اور اس وجہ سے وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیں گے حالانکہ وہ سکتا ہے کہ ان کا پیٹ ابھی نہ بھرا ہو۔ اس علت سے معلوم ہوا کہ جہاں پر یہ بات نہ پائی جاتی ہو یعنی دوسرے شرکاء کا کسی شرمندگی یا ندامت میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو مثلاً کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ایک آدمی فارغ ہوا ہے لیکن باقی اکثر ابھی کھا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ باقی سوچیں گے کہ اگر ایک فارغ ہو گیا ہے تو ہماری طرح کے کھانے والے ابھی بہت سارے ہیں اسے شرمندگی نہیں ہوگی، تو اس صورت میں پیچھے ہٹ جانے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور اگر شرمندگی کا امکان ہے لیکن کسی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے مثلاً اتنا سیر ہو گیا ہے کہ تھوڑے لقمے کھانے کی گنجائش بھی نہیں ہے تو پھر اس کو چاہئے کہ وہ صراحتاً معذرت کر دے مثلاً یہ کہہ دے کہ میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے میں کھا نہیں سکتا یا میں پہلے کھا چکا تھا اس لئے اب کھا نہیں سکتا اس لئے میں ہٹ گیا ہوں جب ایسی معذرت کرے گا تو دوسرا ہم نشین شرمندہ نہیں ہوگا۔

(۱۳)------وعن جعفر بن محمّد، عن أبيهِ، قال: كانَ رسولُ اللهِ ﷺ إذا أكلَ معَ قومٍ كانَ آخرَهم أكلاً۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان مرسلاً)

ترجمہ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ لوگوں کے سامنے کھاتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے آخر میں کھانے والے ہوتے تھے۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

---

(۱) صحیح البخاری کتاب الاطعمہ باب مایقول اذا فرغ من طعامہ ج ۲/ ص ۸۲۰

(۱) پہلے دوسروں کو کھلانا پھر خود کھانا......ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دوسروں کو کھلا کر پھر کھاتے تھے چنانچہ کئی موقعوں پر ایسا ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دوسروں کو کھانا تقسیم کیا اور کھلایا پھر خود کھایا۔

(۲) رفقاء کے ساتھ آخر تک کھاتے رہنا...... دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جب دوسروں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے تو آخر تک کھاتے رہتے تھے تاکہ آپ کے ہاتھ کھینچ لینے کی وجہ سے دوسرے بھی شرمندہ ہو کر ہاتھ نہ کھینچ لیں۔

(١٤)----وعن أسماء بنتِ يزيد، قالت: أتي النبي صلى الله عليه وسلم بطعامٍ فعرَض علينا، فقلنا: لا نشتهيه قال: لا تجتمعن جوعًا وكذبًا۔ (رواه ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کھانا لایا گیا تو آپ نے ہمیں بھی کھانا پیش کیا تو ہم نے کہا کہ ہمیں کھانے کی خواہش نہیں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو۔

دو نقصان ہوں گے ایک دنیا کا نقصان اور ایک آخرت کا، دنیا کا نقصان تو یہ ہے کہ حقیقت میں بھوک لگی ہوئی تھی اور بھوک مٹانے کا موقع مل رہا تھا لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھایا، آخرت کا نقصان یہ ہے کہ جھوٹ بولا ہے جو کہ گناہ کا کام ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ واقعتاً انہوں نے جھوٹ بولا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم حتمی طور پر کہنا چاہتے ہوں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو بلکہ فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر واقعتاً بھوک لگی ہوئی ہے پھر ایسا نہیں کہنا چاہئے کہ **لا نشتهيه** کیوں کہ اس میں بھوک بھی برقرار رہے گی اور اس کے ساتھ آخرت کا گناہ بھی ہوگا۔

(١٥)----وعن عمر بن الخطاب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كلُوا جميعًا ولا تفرَّقُوا، فانَّ البركةَ معَ الجماعةِ۔ (رواه ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اکٹھے کھایا کرو اور الگ الگ ہو کر نہ کھایا کرو اس لئے کہ برکت جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔

(١٦)----وعن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من السُنَّةِ أن يخرُجَ الرجلُ مع ضيفهِ إلى بابِ الدَّار۔ (رواه ابن ماجه)

ورواه البيهقي في شعب الايمان عنه وعن ابن عباس وقال: في إسناده ضعفٌ۔

ترجمہ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سنت میں سے ہے کہ آدمی اپنے مہمان کے ساتھ گھر کے دروازے تک جائے۔

(١٧)----وعن ابن عبَّاس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الخيرُ أسرعُ إلى البيتِ الذى يؤكلُ فيه من الشفرةِ إلى سنامِ البعير۔ (رواه ابن ماجه)

ترجمہ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھلائی اس گھر کی طرف جس میں کھایا جاتا ہے اس چھری سے بھی جلدی جاتی ہے جو اونٹ کی کوہان کی طرف بڑھتی ہے۔

مطلب یہ کہ عربوں میں اونٹ کی کوہان بہت پسند کی جاتی تھی اس لئے جب اونٹ ذبح کیا جاتا تھا تو سب سے پہلے اس کی کوہان کا گوشت کاٹ کر کھایا جاتا تھا، تو چھری اونٹ کی کوہان کی طرف بہت جلدی سے جاتی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس تیزی کے ساتھ چھری اونٹ کی کوہان کی طرف جاتی ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ برکت اور خیر اس گھر کی طرف جاتی ہے جس گھر میں کھانا کھایا جاتا ہے یعنی جس میں مہمان کھاتے ہیں، ویسے کھایا تو ہر گھر میں جاتا ہے یہاں مراد ہے جس میں مہمان کھاتے ہیں البتہ الفاظ حدیث کے عموم کی وجہ سے استطاعت وحیثیت کے مطابق اہل خانہ پر فراخی کو بھی اس میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

(١)----عن الفُجَيع العامري، أنَّه أتى النبى صلى الله عليه وسلم، فقال: مايحل لنَا من المِيتةِ؟ قال: ماطعامُكم قُلنا: نَغتَبِقُ ونصطَبِحُ قال أبو نعيم: فسَّره لى عُقبةُ: قدحٌ غُدوَةً، وقدَحٌ عشيَّةً قال: ذاكَ وأبى الجوعُ فأحلَّ لهمُ الميتةَ على هذهِ الحال۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت فجیع عامری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے لئے مردار میں سے کتنا حلال ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا کھانا کیا ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ صبح کے وقت بھی دودھ پیتے

ہیں اور شام کو بھی، ابو نعیم کہتے ہیں کہ حدیث کے راوی عقبہ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ ایک پیالہ صبح کے وقت اور ایک پیالہ شام کے وقت تو آپ نے فرمایا کہ میرے باپ کی قسم یہ تو بھوک ہے، پھر آپ نے اس حالت پر ان کے لئے مردار کو حلال قرار دیا۔

غیر اللہ کی قسم پر اشکال اور جواب:۔

اس حدیث میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ذاك و أبى الجوع** کہ میرے باپ کی قسم یہ تو بھوک ہے، یہ غیر اللہ کی قسم کھائی ہے حالانکہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)........ یہ اس زمانے کی بات ہوگی جب غیر اللہ کی قسم کھانے کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔

(۲)........ قسم کھانا دو طرح سے ہوتا ہے کبھی قسم کھائی جاتی ہے مقسم بہ کے احترام اور اس کی تعظیم کی وجہ سے اور کبھی عربوں کے ہاں محاورۃً قسم کھائی جاتی ہے صرف کلام کی تاکید کے لئے اور اس میں مقسم بہ مقصود نہیں ہوتا چنانچہ بعض عرب شعراء نے اپنے یا اپنی محبوبہ کے دشمن کی قسم کھائی ہے، اس طریقے سے بعض شعراء نے چغل خوروں کے باپ کی قسم کھائی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی تعظیم مقصود نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات صرف کلام کی تاکید کے لئے قسم کھائی جاتی ہے اور مقسم بہ کی تعظیم مقصود نہیں ہوتی غیر اللہ کی قسم کھانا جو ناجائز اور حرام ہے وہ درحقیقت پہلی قسم ہے دوسری قسم کی قسم کھانا حرام نہیں ہے اگرچہ خلاف اولیٰ ہے لیکن آنحضرت ﷺ بعض اوقات بیان جواز کے لئے خلاف اولیٰ کا ارتکاب بھی فرمایا کرتے تھے۔

یہاں پر دو طرح کی روایتیں ہیں، یہاں مشکوٰۃ کی روایت کے لفظ ہیں:

ما یحل لنا من المیتة کہ میتہ کتنا حلال ہے جب کہ طبرانی کی ایک روایت میں ہے: **ما یحل لنا المیتة** کہ کون سی چیز ہمارے لئے میتہ کو حلال کر دیتی ہے یعنی میتہ کھانا کس حالت میں جائز ہے۔ دوسری روایت پر تو کوئی اشکال نہیں کیوں کہ سوال کہ میتہ کس حالت میں جائز ہے اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا کہ تمہاری حالت چونکہ بھوک والی ہے اس لئے تمہارے لئے میتہ حلال ہے یعنی حالت جوع میں میتہ حلال ہے۔ تو جواب سوال پر منطبق ہو رہا ہے لیکن ہمارے پیش نظر روایت پر اشکال وارد ہوتا ہے۔

اشکال...... یہاں سوال اور جواب میں مطابقت نہیں اس لئے کہ سوال یہ نہیں کہ میتہ کب کھانا حلال ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ جب میتہ کھانا حلال ہو جائے تو کتنا کھایا جا سکتا ہے، مقدار کے بارے میں سوال ہے۔ جب کہ جواب میں اس چیز کا کوئی ذکر نہیں، جواب میں آپ نے پوچھا کہ تمہاری حالت کیا ہے تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بھوک کی حالت ہے اس لئے میتہ کھانا حلال ہے تو سوال مقدار کے بارے میں ہے اور جواب اس حالت کے بارے میں ہے کہ جس حالت میں میتہ کھانا حلال ہوتا ہے تو سوال اور جواب ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔

جواب...... اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مطابقت ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جوبات فرمائی اس کا حاصل یہ ہے کہ بھوک کی حالت میں میتہ کھانا جائز ہے تو میتہ کے حلال ہونے کی علت بھوک ہے اس لئے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اتنی مقدار میں کھایا جاسکتا ہے کہ جس سے بھوک مٹ جائے اس سے زیادہ کھانا جائز نہیں کیوں کہ جب بھوک مٹ گئی تو جواز میتہ کی علت ختم ہو گئی، حلت کی علت بھی باقی نہ رہی اور جب علت نہ رہی تو حلت بھی نہ رہی۔

(۲) ----- وعن أبي واقد الليثي، أنَّ رجلاً قال: يا رسولَ اللهِ! إنَّا نكونُ بأرضٍ فتُصيبُنا بها المخمصَةُ، فمتى يحل لنا الميتةُ؟ قال: مالم تصطبِحوا وتغتبِقوا أو تحتفِئوا بها بقلاً، فشانَكم بها معناه: إذا لم تجدوا صَبوحاً أو غَبوقاً ولم تجِدوا بقلَةً تأكلونَها حلَّت لكم الميتةُ۔ (رواه الدارمي)

ترجمہ...... حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم ایسی زمین میں ہوتے ہیں کہ وہاں ہمیں شدید بھوک لاحق ہوتی ہے تو میتہ ہمارے لئے کب حلال ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم صبح کے وقت کی خوراک دودھ نہ پاؤ یا شام کے وقت کا دودھ نہ پاؤ یا تم اس زمین میں سبزہ کھانے کے لئے نہ پاؤ تو پھر تم اس میتہ کو لازم پکڑ سکتے ہو۔ راوی نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ جب تم صبح کا دودھ نہ پاؤ یا شام کا دودھ نہ پاؤ اور تم ایسی چیز سبزی نہ پاؤ کہ تم اس کو کھاسکو تو تمہارے لئے میتہ حلال ہو جائے گا۔

یہاں پر تین چیزوں کا ذکر ہے: کہ تم اصطباح نہ پاؤ یعنی صبح کے وقت پینے کے لئے دودھ نہ پاؤ، کہ اغتباق نہ پاؤ یعنی شام کے وقت کا دودھ نہ پاؤ۔

تیسرے احتفاء کا ذکر کیا ہے احتفاء کے اصل معنی چارہ چرنے کے ہیں یہاں مراد ہے کہ کوئی سبزی یا ترکاری یا کھانے کے قابل پتے وغیرہ نہ پاؤ۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تم نہ پاؤ تو تمہارے لئے میتہ کھانا حلال ہو جائے گا، اب یہاں پر دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: میتہ کب حلال ہوتا ہے...... حنفیہ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے کہ حالت

اضطرار اور حالت مخمصہ میں میتۃ کھانا حلال ہوتا ہے یعنی ایسی حالت میں کہ نہ کھانے کی صورت میں جان کے جانے کا خطرہ ہو محض بھوک سے میتۃ کھانا حلال نہیں ہوتا بلکہ شدید بھوک ہو تو میتۃ کھانا حلال ہوتا ہے جب کہ بعض حضرات کے نزدیک محض بھوک کی وجہ سے میتۃ کھانا حلال ہو جاتا ہے جب کہ کوئی اور چیز کھانے کے لئے نہ ہو۔[1]

دوسرا مسئلہ ...... میتۃ کتنی مقدار میں حلال ہے[2] ......

جب میتۃ کھانا حلال ہو جائے تو کتنا کھایا جا سکتا ہے۔

حنفیہ کا مذہب ...... محض سد رمق کی مقدار کھایا جا سکتا ہے یعنی اتنی مقدار میں کہ جس سے جان بچ جائے چاہے بھوک مٹے یا نہ مٹے سد جوع کی مقدار کھانا درست نہیں۔

مالکیہ کا مذہب ...... سد جوع کی مقدار کھانا بھی درست ہے تو گویا یہاں تین حالتیں ہو گئیں۔

ایک یہ کہ اتنا کھایا جائے کہ جس سے جان بچ جائے لیکن بھوک نہ مٹے یہ سب کے نزدیک جائز ہے۔

دوسرا یہ کہ اتنا کھایا جائے کہ جس سے بھوک بھی مٹ جائے لیکن بھوک سے زائد نہ کھایا جائے، اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے۔

تیسرا یہ کہ جتنی بھوک ہے اس سے زائد کھایا جائے یہ سب کے نزدیک ناجائز ہے۔[3]

حنفیہ اور جمہور کی دلیل ...... قرآن کریم کی آیت ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ۔[4]

اس آیت میں حالت اضطرار اور حالت مخمصہ میں میتۃ کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ میتۃ کے حلال ہونے کی علت بھی اضطرار اور مخمصہ ہے یعنی شدید بھوک ہے جب بھوک کی شدت ختم ہو گئی اور زندگی بچنے کا امکان پیدا ہو گیا تو اب اضطرار نہ رہا مخمصہ کی حالت نہ رہی جب حلت میتۃ کی علت نہ رہی تو میتۃ بھی حلال نہ رہے گا۔

---

(۱) المغنی لابن قدامه کتاب الصید والذبائح، ۱۷۳۹ مسئلة (ومن اضطر الی المیتة، فلا یاکل منها الاما یومن معه الموت) ج۱۳: ص ۳۳۰. (القاهره) ایضاً اوجز المسالك الی موطا امام مالك کتاب الصید ماجاء فیمن یطظر الی المیتة ج۹/ص ۱۹۵

(۲) تکمله فتح الملهم کتاب الصید والذبائح مسأله قدر مایباح للمضطر ج۳/ص ۵۰٤ ایضاً بذل المجهود کتاب الاطعمه باب فی من اضطر الی المیة ج۵/ص ۳۶۲

(۳) المغنی لابن قدامه کتاب الصید والذبائح ۱۷۳۹ مسأله (ومن اضطر الی المیتة فلا یاکل منها الاما یومن معه الموت ج۱۳/ص ۳۳۰ القاهره)

(۴) سورۃ المائدۃ پ۶ آیت نمبر ۳ رکوع نمبر ۱

سد جوع والوں کی دلیل...... یہ حضرت فجیع عامری رضی اللہ عنہ والی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تمہیں کھانا کتنا ملتا ہے انہوں نے کہا کہ دودھ کا ایک پیالہ صبح کو اور ایک پیالہ شام کو تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو بھوک کی حالت ہے تو آپ نے ان کے لئے میتہ کو حلال قرار دے دیا۔ یہاں دیکھیں کہ اگر ایک پیالہ شام کو اور ایک پیالہ صبح کو مل جائے تو اس سے سد رمق تو ہو جاتا ہے یعنی اتنی سخت بھوک لاحق نہیں ہوتی کہ مرنے کا خطرہ ہو البتہ فی الجملہ بھوک ہوتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح سد رمق کے لئے میتہ کھانا جائز ہے اسی طرح سد جوع کے لئے بھی جائز ہے یعنی بھوک مٹانے کے لئے بھی جائز ہے۔

جواب...... حنفیہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ جو کہا گیا ہے کہ ایک پیالہ صبح کو اور ایک پیالہ شام کو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر ہر آدمی کو ایک پیالہ صبح کو اور ایک پیالہ شام کو ملتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ پوری قوم اور پورے قبیلے کو ایک پیالہ صبح اور ایک شام کو ملتا ہے ظاہر ہے کہ ہر ایک آدمی کو چند گھونٹ ہی آتے ہوں گے اور اس سے سد رمق کی مقدار کھانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

دوسرا جواب...... دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض مالکیہ نے لکھا ہے کہ سد جوع کے لئے کھانے اور مقدار شبع کھانے کا جواز اس صورت میں ہے کہ جب یہ اضطرار اور بھوک ممتد ہو یعنی ایک آدھ دن کا نہ ہو بلکہ طویل عرصہ تک یہ صورت حال چلتی رہے اور طویل عرصے تک جب یہ صورت حال چلتی رہے گی اس میں محض سد رمق کی مقدار کھا کر چند لقمے کھا کر جان نہیں بچائی جا سکتی کیوں کہ جب مسلسل اتنا تھوڑا کھائے گا تو جسم غذائی قلت کا شکار ہو جائے گا اور بڑی بڑی بیماریاں اس پر حملہ آور ہوں گی، تو اس صورت میں موت یقینی یا ظنی ہے، تو اس صورت میں کہ جب مخمصہ یا بھوک کی حالت طویل ہو جائے تو حنفیہ نے اگرچہ تصریح نہیں کی یا کہیں نظر سے نہیں گزری لیکن قواعد کا تقاضا یہی ہے کہ حنفیہ کے ہاں بھی اس صورت میں مقدار شبع کھانا جائز ہو جانا چاہئے کیوں کہ اصل مقصود تو جان بچانا ہے تو اگر چند لقمے کھانے پر اکتفاء کیا تو جان نہیں بچ سکے گی لہٰذا کوئی اختلاف نہیں رہا اور یہ حدیث بھی اس اضطرار یا جوع پر محمول ہے کہ جس کا عرصہ طویل ہو۔

باب الأشربة

نوٹ ...... باب کے متعلق زیادہ تر مسائل کی تفصیل باب کے آخر میں ہے ابتداء میں صرف احادیث کا ترجمہ ہے۔

﴿الفصل الاوّل﴾

(۱)-----عن أنس، قال: کانَ رسول الله صلی الله علیه وسلم یتنفَّسُ فی الشَّرابِ ثلاثاً متفق علیه وزادَ مسلم فی روایة ویقولُ: إنَّه أروَی وأبرَ أو أمرَا۔

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پینے کی چیز میں تین مرتبہ سانس لیتے تھے یہ تو بخاری اور مسلم کی روایت ہے اور مسلم کی روایت میں یہ زائد لفظ بھی آتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ یہ فرماتے تھے کہ تین دفعہ سانس لینا سیرابی کی زیادتی کا باعث بیماری سے زیادہ محفوظ رکھنے والا اور زیادہ ہضم ہونے کا باعث ہے۔

(۲)-----وعن ابنِ عبَّاس، قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عنِ الشربِ من فی السقاءِ۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے مشکیزے سے منہ لگا کر پینے سے۔

(۳)-----وعن أبی سعید الخدری، قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن اختناث الأسقیَةِ زادَ فی روایة: واختِناثُها: أن یُقلَبَ رأسُها ثمَّ یشربَ منه۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا مشکیزوں کا منہ موڑ کر پانی پینے سے اور ایک روایت میں ہے کہ اختناث یہ ہے کہ اس کا منہ موڑا جائے پھر اس سے پیا جائے۔

(٤)-----وعن أنس، عن النبی صلی الله علیه وسلم، أنَّه نهی أن یشربَ الرَّجلُ قائماً۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے منع فرمایا اس بات سے کہ کوئی آدمی کھڑے ہو کر پانی پیئے۔

(٥)-----وعن أبی هريرة، قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: لا يشربَنَّ أحدٌ منكم قائماً، فمن نسیَ منكم فليستقی۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کھڑے ہو کر پانی نہ پیئے اور جو بھول جائے (یعنی بھول کر کھڑا ہو کر پی لے) اسے چاہئے کہ قے کر دے۔

(٦)-----وعن ابنِ عبَّاس، قال: أتيتُ النبی صلی الله عليه وسلم بدَلوٍ من ماءِ زمزمَ، فشرِبَ وهوَ قائمٌ۔ (متفق عليه)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زمزم کے پانی کا ایک ڈول لے کر آیا تو آپ نے اسے کھڑے کھڑے ہی نوش فرمالیا۔

(٧)-----وعن علی رضی الله عنه: أنَّه صلی الظهرَ ثمَّ قعدَ فی حوائجِ النَّاس فی رَحبةِ الكوفةِ، حتی حضرت صلاةُ العصرِ، ثمَّ أتی بماءٍ، فشربَ وغَسلَ وجهَه ويديهِ، وذكرَ راسَه ورجلَيهِ، ثمَّ قامَ فشربَ فَضلَه وهوَ قائمٌ، ثمَّ قال: إنَّ أناساً يكرَهونَ الشربَ قائماً، وإنَّ النبی صلی الله عليه وسلم صنعَ مثلَ ما صنعتُ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی پھر کوفے کے رحبہ میں (یعنی مسجد کے قریب میدان میں) لوگوں کی ضرورت کے لئے بیٹھ گئے یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آگیا پھر آپ کے پاس پانی لایا گیا تو آپ نے اس میں سے پیا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کو دھویا اور راوی نے سر اور پاؤں کا بھی ذکر کیا پھر آپ نے وضو کیا پھر کھڑے ہوئے اور کھڑے کھڑے بچا ہوا پانی پی لیا پھر آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو ناپسند کرتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا (یعنی کھڑے ہو کر پیا تھا)۔

(٨)-----وعن جابر، أنَّ النبیَ صلی الله عليه وسلم دخلَ علی رجل من الأنصار، ومعَه صاحبٌ له، فسلَّمَ فردَّ الرَّجلُ وهوَ يحولُ الماءَ فی حائطٍ،

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إن کانَ عندكَ ماءٌ باتَ فی شنَّةٍ وإلّا کرعنا؟ فقال: عندی ماءٌ باتَ فی شن، فانطلقَ إلی العریشِ فسکبَ فی قدَحٍ ماء، ثمَّ حلبَ علیهِ من داجنٍ، فشربَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثمَّ أعادَ فشربَ الرَّجلُ الذی جاءَ معَه۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے ایک شخص کے ہاں گئے اس حال میں کہ آپ کے ساتھ آپ کے ساتھی بھی تھے، آپ نے سلام کیااور اس شخص نے جواب دیااس حال میں کہ وہ باغ میں پانی کو پلٹ رہاتھاتو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ے فرمایااگر تمہارے پاس ایساپانی ہوجو رات بھر پرانے مشکیزے میں رہا ہو وگرنہ ہم منہ لگا کر پانی پئیں گے تو اس شخص نے کہاکہ میرے پاس ایساپانی موجود ہے کہ وہ رات بھر پرانے مشکیزے میں رہاہے تو وہ شخص چھپر کی طرف گیااور اس نے ایک پیالے کے اندر پانی ڈالا پھراس پر ایک گھریلو بکری کا دودھ نکالا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیا پھراس نے دوبارہ ایسا کیا تو اس شخص نے پیا جو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا تھا۔

یہاں پرانے مشکیزے کا ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانے مشکیزے کے مسامات عام طور پر کھلے ہوتے ہیں اس لئے اس میں پانی ٹھنڈا جلدی ہو جاتا ہے خاص طور پر رات بھر پرانے مشکیزے کے اندر رہے تو اس سے پانی زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹھنڈا پانی پینا چاہتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ اگر اس طرح کا پانی موجود ہو جو رات بھر پرانے مشکیزے میں رہا ہو اور اگر ایساپانی نہیں ہے تو ہم کرعاً پانی پی لیں گے۔

کرع کا معنی اور اس کا حکم:-

کرع کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پانی کی نہر یا نالہ وغیرہ بہہ رہا ہو یا بڑا تالاب وغیرہ ہے تو اس سے براہ راست منہ لگا کر پانی پی لیا جائے اس کو کرع کہتے ہیں۔[1]

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح پانی پینے سے منع فرمایا ہے چنانچہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق کچھ حدیثیں ذکر کی تھیں ان میں بھی کچھ حدیثیں ایسی

(۱) شرح تاج العروس فصل الکاف من باب العین ج ۵ / ص ۴۹۲

آئی تھیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا لا تکرعوا۔

اس کے علاوہ کچھ اور بھی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے سے پانی نہیں پینا چاہئے لیکن یہاں پر اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح پانی نہیں پیا اس لئے کہ مشکیزے کا پانی آپ کو مل گیا تھا لیکن آپ نے اس طرح پانی پینے کا ارادہ ضرور ظاہر فرمایا تھا اگر مشکیزے کا پانی نہ ملتا تو بطور کرع کے پانی پیتے۔ اس لئے بظاہر یہ حدیث نہی عن الکرع والی حدیث کے خلاف ہے اس میں کئی طریقے سے تطبیق دی گئی ہے:

(۱)........... مثلاً بعض نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی چھوٹا تالاب وغیرہ ہو تو اس میں کرعاً پانی پینا مکروہ ہے کیوں کہ اس میں لعاب شامل ہو جائے گا تو دوسرے لوگوں کو وہ پانی استعمال کرنے میں گھن آئے گی لیکن اگر بڑا تالاب ہو یا بہتا ہوا پانی ہو تو اس میں چونکہ یہ وجہ نہیں پائی جاتی اس لئے اس میں کرعاً پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲)........... کرعاً پانی پینے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس طریقے سے منہ لگا کر پانی پیا جائے گا خاص طور پر زیادہ تعداد میں لوگ منہ لگا کر پانی پئیں گے تو باقی ماندہ پانی خراب ہو جائے گا خراب ہونے سے مراد ہے کہ کسی قدر لعاب زیادہ ہو جائے گا دوسرے لوگ نہیں پی سکیں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ علت نہیں پائی جاتی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب مبارک میں کسی کو گھن نہیں آتی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب تو دوسروں کے لئے باعث برکت تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے پر دوسروں کے پینے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

(۳)........... تیسری تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کرعاً پانی پینے کا ارادہ ظاہر کرنا بیان جواز پر محمول ہے۔

(۴)........... چوتھی وجہ: ایک وجہ اور ذہن میں آتی ہے اگرچہ کہیں دیکھی نہیں لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر شاید وہی وجہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کرع سے نہی فرمائی ہے لیکن نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ خلاف ادب ہونے کی وجہ سے ہے۔

خلاف ادب ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دوسروں کو گھن آئے گی وہ وجہ تو یہاں پر نہیں پائی جاتی۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دیکھنے میں بھی اچھا نہیں لگتا اس لئے کہ اس طرح سے تو جانور پانی پیتے ہیں، سلیقے کے خلاف ہے اور اس طرح کے آداب جن میں دوسروں کو تنگی کا خطرہ نہیں ہوتا بس یہ ہوتا ہے کہ سلیقے کے خلاف ہے ان میں معمولی اعذار کی وجہ سے گنجائش پیدا ہو جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ بعض اوقات معمولی اعذار کی وجہ سے ایسے آداب کو چھوڑ دیا کرتے تھے یہاں پر بھی ایک عذر موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر ٹھنڈا پانی پینا چاہتے تھے اور ٹھنڈے پانی کی ایک اہمیت ہے اگر پانی پورے طور پر ٹھنڈا نہ ہو تو جتنا زیادہ پی لیا جائے طبیعت کو وہ سیری

نہیں ہوتی جو ٹھنڈا پانی پینے سے ہوتی ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو ایسا پانی منگوایا جو پرانے مشکیزے میں رات بھر رہا ہو لیکن اگر ایسا پانی نہ ملتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی بہتے ہوئے پانی میں سے پینا پڑتا یہ پانی بظاہر اس معیار کا ٹھنڈا نہیں تھا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے لیکن پھر بھی گزارا ہو سکتا تھا لیکن اگر چلو میں بھر کر پیتے تو اس کی ٹھنڈک اور کم ہو جاتی بلکہ گرمی کے موسم میں اگر ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالیں تو اس سے بھی اس کی ٹھنڈک کم ہو جاتی ہے اور یہاں تو ہاتھ کی اپنی گرمی بھی ہوگی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح کا ٹھنڈا پانی پینے کا ارادہ فرما رہے تھے اس میں کافی کمی واقع ہو سکتی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی کی ٹھنڈک کو جو تھوڑی بہت ہے برقرار رکھنے کے لئے براہ راست منہ لگا کر پانی پینے کا ارادہ ظاہر فرمایا، واللہ اعلم۔

(۹)-----وعن أم سلمةَ، أنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قال: الذی يشربُ فی آنِيَةِ الفضَّةِ إنَّما يُجَرجِرُ فی بطنِه نارَ جهنَّمَ متفق عليه وفی رواية لمسلمٍ: إنَّ الذی يأكُلُ ويشربُ فی آنِيَةِ الفضَّةِ والذَّهب۔

ترجمہ...... حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ انڈیلتا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں سونے اور چاندی دونوں کے برتن کا ذکر ہے۔

(۱۰)-----وعن حذيفةَ، قال: سمِعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقولُ: لا تلبَسوا الحريرَ ولا الدِّيباجَ، ولا تشرَبوا فی آنيةِ الذَّهب والفضَّةِ، ولا تأكلوا فی صِحافِها، فإنَّها لهم فی الدنيا وهیَ لكم فی الآخرةِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ریشم اور دیباج کا کپڑا نہ پہنو اور سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور ان کی پیالیوں میں کھاؤ بھی نہیں اس لئے کہ یہ سونا اور چاندی دنیا میں کافروں کے لئے ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں۔

(۱۱)-----وعن أنس، قال: حُلبت لرسول الله صلى الله عليه وسلم شاةٌ داجنٌ، وشِيبَ لبنُها بماءٍ منَ البئرِ التی فی دارِ أنسٍ، فأعطِیَ رسول الله صلى الله عليه وسلم القدَحَ، فشربَ وعلی يسارِه أبوبكرٍ، وعن يمينِه أعرابیٌّ، فقال عمَرُ: أعطِ أبابكرٍ يا رسول الله! فأعطى الأعرابیَّ الذی عن يمينِه، ثمَّ قال:

الأيمنُ فالأ يمنُ وفي رواية: الأيَمنونَ الأيمَنونَ، ألاَ فيَمِّنوا۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک گھریلو بکری کا دودھ نکالا گیا اور اس دودھ کو اس کنویں کے پانی کے ساتھ ملایا گیا جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ پیالہ دیا گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیا اس وقت آپ کی بائیں جانب حضرت ابو بکر اور دائیں جانب ایک بدو تھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ بچا ہوا ابو بکر کو دے دیجئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی کو دے دیا جو آپ کی دائیں جانب تھا پھر آپ نے فرمایا: **الایمن فالایمن** یعنی **یقدم الایمن فالایمن** کہ دائیں جانب والے کو مقدم کیا جائے گا پھر اس سے دائیں جانب والے کو۔

چنانچہ یہی مسئلہ ہے کہ کوئی چیز اگر تقسیم کرنی ہو اور استحقاق کی کوئی اور وجہ کسی کے اندر نہ پائی جاتی ہو تو اس کی تقسیم کا آغاز دائیں طرف سے کرنا چاہئے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ حضرت ابو بکر آپ کی بائیں جانب تھے اور دائیں جانب ایک بدو تھا لیکن آپ نے دائیں جانب کی رعایت رکھنے کے لئے فضیلت کو نظر انداز کر دیا اور بچا ہوا پیالہ اس اعرابی کو دے دیا۔

(١٢) ---- وعن سهل بن سعد، قال: اتىَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بقدحٍ، فشربَ منه وعن يمينِه غلامٌ أصغرُ القومِ، والأشياخ عن يسارِه فقال: يا غلام! أتأذَنُ أن أعطيَه الأشياخ؟ فقال: ماكنتُ لأوثِرَ بفضلٍ منكَ أحداً يا رسول الله! فأعطاهُ إيَّاهُ۔ (متفق عليه)

وحديث أبي قتادةَ سنذكر في باب المعجزات إن شاء اللهُ تعالى۔

ترجمہ ...... حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالہ لایا گیا تو آپ نے اس میں سے پیا اس حال میں کہ آپ کی دائیں جانب ایک لڑکا تھا جو کہ ان لوگوں میں سے سب سے چھوٹا تھا اور بڑی عمر کے لوگ آپ کی بائیں جانب تھے تو آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے کیا تو اجازت دیتا ہے کہ میں یہ بچا ہوا بڑی عمر کے لوگوں کو دے دوں تو اس نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے ہوئے کے بارے میں کسی اور کو ترجیح دوں یا رسول اللہ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بچا ہوا اسے دے دیا۔

89

جس لڑکے کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔[1] اس وقت نوعمر تھے اور آپ ﷺ کی دائیں جانب بیٹھے تھے اور بائیں جانب حضرت ابو بکر اور دوسرے بڑی عمر کے حضرات موجود تھے، ترتیب کے لحاظ سے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا حق مقدم تھا لیکن حضرت ابو بکر وغیرہ یا دوسرے حضرات کے بڑی عمر کے ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے احترام میں یہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابن عباس کو یہی مشورہ دیا کہ حق تمہارا بنتا ہے لیکن بڑوں کے احترام میں اپنا حق چھوڑ دو تو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اگر تو بات محض پینے کی چیز کی ہوتی پانی یا دودھ تو میں سو مرتبہ ان کے احترام میں دستبردار ہو جاتا لیکن معاملہ یہاں محض پینے کی چیز کا نہیں ہے بلکہ آپ کی برکت کا معاملہ ہے، یہ آپ کے منہ سے لگی ہوئی چیز ہے اور آپ کی بچی ہوئی چیز ہے اس طرح کی برکت میں ایثار نہیں کر سکتا۔

(۱۳)-----عن ابن عمر، قال: كنّا نأكُلُ على عهدِ رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحنُ نمشي ونشربُ ونحنُ قِيامٌ۔ (رواه الترمذی وابن ماجه والدارمي وقال الترمذی: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريب)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس حال میں کھایا کرتے تھے کہ ہم چل رہے ہوتے تھے اور ہم اس حال میں پی لیا کرتے تھے کہ ہم کھڑے ہوتے تھے۔

(۱٤)-----وعن عمرو بن شعيب، عن أبيهِ، عن جدّه، قال: رأيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يشربُ قائمًا وقاعداً۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ ...... حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے وہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہو کر پیتے ہوئے بھی دیکھا اور بیٹھ کر بھی۔

(۱٥)-----وعن ابن عباس رضی الله عنهما، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يتنفَّسَ في الإناءِ، أويُنفخَ فيهِ۔ (رواه أبو داؤد وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ برتن کے اندر سانس لیا جائے یا اس میں پھونک ماری جائے۔

(۱٦)-----وعن قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا تشربوا

(۱) اوجز المسالک الی موطا امام مالک، السنۃ فی الشراب وتناولہ عن الیمین ج ۱۴/ ص ۲۷۷

واحِدا كشربِ البعيرِ، ولكنِ اشرَبوا مثنى وثُلاثَ، وسموا إذا أنتم شرِبتم، واحمدوا إذا أنتم رفعتُم۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک سانس میں مت پیو جیسا کہ اونٹ پیتا ہے بلکہ دو یا تین مرتبہ پیو اور جب تم پینے لگو تو اللہ کا نام لے لو اور جب تم پی کر فارغ ہو جاؤ تو اللہ کی حمد کرو۔

(۱۷)-----وعن أبى سعيد الخدرى، أنَّ النبىَّ صلى الله عليه وسلم نهى عنِ النَّفخِ فى الشرابِ فقال رجلٌ: القَذاةَ أراها فى الإناءِ قال: أهرِقها قال: فإنى لا أروى من نفَسٍ واحدٍ قال: فأبِنِ القدَحَ عن فِيكَ، ثُمَّ تنفَّس۔ (رواه الترمذى والدرمى)

ترجمہ ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا تو ایک آدمی نے کہا کہ بعض اوقات میں برتن میں تنکا دیکھتا ہوں (یعنی پانی وغیرہ میں تنکا ہوتا ہے اس کو ہٹانے کے لئے پھونک مارنی پڑتی ہے) تو آپ نے فرمایا اس کو بہادو (یعنی تھوڑا سا پانی انڈیل دو تو جو تنکا اوپر تیر رہا ہے وہ بھی گر جائے گا) اس نے کہا میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا (اس لئے مجھے سانس لینا پڑتا ہے) تو آپ نے فرمایا کہ برتن کو منہ سے الگ کر لیا کرو پھر سانس لیا کرو۔

(۱۸)-----وعن قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الشُّربِ من ثُلمةِ القدَحِ، وأن يُنفخَ فى الشرابِ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پیالے کی ٹوٹی ہوئی جگہ سے پینے سے منع فرمایا اور پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے۔

پھونک مارنے کا مسئلہ بعد میں عرض کرتے ہیں یہاں آپ نے پیالہ کی ٹوٹی ہوئی جگہ سے منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا ہے۔

برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت کی وجوہ:-

اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

(۱)..........ایک تو یہ کہ جہاں سے پیالہ ٹوٹا ہوا ہے وہاں سے اگر پئیں گے تو خطرہ ہے کہ وہاں پر ہونٹ پوری

طرح نہ لگیں اور اس ٹوٹی ہوئی جگہ سے پانی وغیرہ گر کر کپڑوں پر آجائے اور کپڑے وغیرہ خراب ہو جائیں۔[1]

(۲).......... اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں سے پیالہ ٹوٹا ہوا ہے وہاں عام طور میل کچیل یا بیماری کے اجزاء جن کو جراثیم کہتے ہیں وہ جمع ہو سکتے ہیں اور ان کے وہاں جمع ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے لہٰذا وہاں سے پینا نظافت کے بھی خلاف ہے اور اس میں بیماری کا بھی احتمال ہے۔[2]

(۱۹)-----وعن كبشةَ، قالت: دخلَ عليَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم فشربَ من فِي قِربَةٍ معلَّقةٍ قائماً، فقمتُ إلى فِيها فقطعتُه۔ (رواه الترمذى وابن ماجه وقال الترمذى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ صحيح)

ترجمہ...... حضرت کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کے منہ سے کھڑے ہو کر پانی پیا تو میں اس مشکیزے کے منہ کی طرف اٹھی اور اسے کاٹ لیا۔ (جہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا تھا وہاں سے مشکیزے کا منہ کاٹ لیا۔)

مشکیزے کا منہ کاٹنے کی وجوہ:-

اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

(۱).......... ایک تو یہ کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک لگ گئے اب اس جگہ کسی اور کے ہونٹ نہیں لگنے چاہئے اس میں اس چیز کا ابتذال اور بے ادبی ہے اس لئے کاٹ کر رکھ لیا۔

(۲).......... برکت کے لئے کاٹ کر رکھ لیا کہ اس چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک لگے ہوئے ہیں آپ کا لعاب مبارک بھی لگا ہوا ہے اس لئے برکت پیدا ہو گئی ہے، مشکیزہ تو ضائع بھی ہو سکتا ہے، گم بھی ہو سکتا ہے، پھٹنے کے بعد پھینکنا بھی پڑتا ہے لیکن یہ ٹکڑا برکت کے طور پر میرے پاس محفوظ رہے گا۔

(۲۰)----- وعن الزهرى، عن عروةَ، عن عائشةَ، قالت: كانَ أحبَّ الشَّرابِ إلى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم الحلوُ الباردُ۔ (رواه الترمذى، وقال: والصحيحُ ماروىَ عن الزهرى، عن النبى صلى الله عليه وسلم مرسلاً)

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے کی چیزوں میں سے سب سے زیادہ پسند میٹھی اور ٹھنڈی چیزیں تھیں۔

---

(۱) بذل المجہود کتاب الاشربہ باب فی الشرب من ثلمۃ القدح ج۵ / ص۳۴۱...... (۲) ایضاً

(۲۱)----وعن ابنِ عبَّاس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أكلَ أحدُكم طعامًا فليقُل: اللهُمَّ بارِك لنافيهِ وأطعِمنا خيراً منه وإذا سُقِىَ لبنا فليقُل: اللهُمَّ بارِك لنا فيهِ، وزِدنا منه، فإنَّه ليسَ شئٌ يُجزى منَ الطعامِ والشرابِ إلّا اللبنُ۔ (رواه الترمذى وأبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھائے تو یوں کہے:

اللّٰهم بارك لنا فيه أطعمنا خيرا منه۔

کہ اے اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرمایئے اور ہمیں اس سے بہتر کھانے کے لئے عطا فرمایئے اور جب دودھ پیئے تو یوں کہے:

اللّٰهم بارك لنا فيه وزدنا منه۔

اے اللہ! ہمیں اس میں برکت عطا فرمایئے اور اس میں اضافہ عطا فرمایئے اس لئے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جو کھانے اور پینے کے قائم مقام ہو سوائے دودھ کے۔

چونکہ دودھ کی افادیت بہت زیادہ ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا نہیں فرمائی کہ اس سے بہتر عطا فرمایئے کیوں کہ اس سے بہتر کوئی نہیں بلکہ یہ دعا فرمائی: ''زدنا منہ''۔

(۲۲)----وعن عائشةَ، قالت: كانَ النبى صلى الله عليه وسلم يُستعذَبُ له الماءُ منَ السقيا قيلَ: هىَ عينٌ بينَها وبينَ المدينةِ يومان۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سقیا چشمہ سے میٹھا پانی لایا جاتا تھا، کہا گیا ہے کہ یہ ایسا چشمہ تھا کہ اس کے درمیان اور مدینہ کے درمیان دو دن کی مسافت تھی۔

ٹھنڈے اور اچھے پانی کی اہمیت:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طور پر کھانے پینے میں معمول یہ تھا کہ کسی چیز کا تکلف اور اہتمام نہیں فرماتے تھے بلکہ کیف ما اتفق جو ملا اگر پسند آگیا تو اسے کھالیا اگر پسند نہ آیا تو نہیں کھایا۔ باقی اس میں کوئی عیب بیان کرنا یہ آپ کا معمول نہیں تھا اور کسی خاص قسم کے کھانے کے لئے کوئی خاص تکلف اور اہتمام کرنا کہ فلاں چیز ہی ملنی چاہئے یا مہیا ہونی چاہئے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ نہیں تھی البتہ پانی کے

بارے میں آپ کی عادت اور معمول ذرا مختلف تھا کہ پانی کے بارے میں آپ نے خصوصی اہتمام فرمایا مدینہ منورہ کے اندر بھی پانی کے کچھ کنویں موجود تھے لیکن مدینہ منورہ سے تقریباً دو دن کی مسافت پر ایک چشمہ تھا جس کا نام سقیا تھا اس کا پانی ٹھنڈا اور زیادہ بہتر تھا اور نمکیات بھی اس میں کم تھے اس لئے آپ پینے کے لئے پانی وہاں سے منگوا لیتے، اس سے اچھے پانی کی اہمیت سمجھ آتی ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی اشیاء میں تو کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا لیکن پانی کے بارے میں آپ نے اہتمام فرمایا۔

(۲۳)-----عن ابنِ عمرَ، أنَّ النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: مَن شربَ فی إناءِ ذهبٍ أو فضَّةٍ، أوإناءٍ فیهِ شئٌ من ذلكَ فأنما یُجَر جرُفی بطنِه نارَ جنهم۔
(رواه الدار قطنی)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی سونے یا چاندی کے برتن میں پیئے یا ایسے برتن میں پیئے جس میں سونے یا چاندی میں سے کوئی چیز لگی ہوئی ہو وہ اپنے پیٹ کے اندر جہنم کی آگ ڈال رہا ہے۔

اس باب کی حدیث کے ترجمہ کے بعد چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں:

برتن وغیرہ میں سانس لینا:-

سب سے پہلی حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پینے کی چیز میں تین مرتبہ سانس لیتے تھے جب کہ دوسری حدیث میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنفس فی الاناء یا نفخ فی الاناء سے منع فرمایا یعنی برتن کے اندر سانس لینے سے یا پھونک مارنے سے منع فرمایا مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: **نهی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان یتنفس فی الاناء أو ینفخ فیه۔**

تو بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض ہے بعض حضرات نے اس تعارض کو دور کرنے کے لئے لمبی چوڑی تقریریں کی ہیں لیکن آسان سی بات یہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منع فرمایا ہے وہ برتن کے اندر سانس لینے سے فرمایا ہے۔ برتن کے اندر سانس لینے کا مطلب یہ ہے کہ پینا تو بند کر دے لیکن برتن کو منہ سے الگ نہ کرے اور اسی حالت میں سانس لے لے، یہ تو پسندیدہ نہیں ہے لیکن خود آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معمول تھا وہ تنفس فی الاناء کا نہیں ہے بلکہ تنفس فی الشراب کا ہے یعنی پینے کے دوران سانس

لیتے تھے برتن منہ سے ہٹا کر۔ لہٰذا یہ حدیث اس کے خلاف نہیں ہے۔[1] اور اس کی مزید تائید حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے جو الفصل الثانی میں موجود ہے۔[2]

آنحضرت ﷺ نے جب منع فرمایا کہ برتن کے اندر پھونک نہ ماری جائے تو ایک شخص نے کہا کہ میں ایک سانس سے سیراب نہیں ہوتا یعنی مجھے پینے کے دوران سانس لینا پڑتا ہے اور جب سانس لوں گا تو برتن میں منہ کی ہوا جائے گی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سانس لینے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ برتن کو منہ کے ساتھ رکھتے ہوئے سانس لیا جائے بلکہ طریقہ یہ ہے کہ فابن القدح عن فیك ثم تنفس ۔کہ پیالہ کو منہ سے الگ کرو پھر سانس لو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ بھی یہی تھی کہ آپ تین سانس میں پیتے تھے اور آپ نے اپنی قولی حدیث کے ذریعے بھی اسی کا حکم دیا ہے اور اس کے فوائد بیان فرمائے ہیں چنانچہ حضرت انس کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تین فوائد بیان فرمائے ہیں:

(۱)......... پہلا یہ کہ تین سانس میں پینے سے پیاس زیادہ بجھتی ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ اگر ایک گلاس ایک ہی سانس میں پی لیا جائے تو اس سے اتنی پیاس نہیں بجھتی جتنی اس صورت میں بجھتی ہے جب کہ پانی تو اتنا ہی پیا جائے لیکن تھوڑا تھوڑا کر کے درمیان میں سانس لے کر پیا جائے۔

(۲)......... دوسرا فائدہ بیماری سے حفاظت ہے اس لئے کہ یک دم پانی غٹ غٹ کر کے چڑھا جائیں تو اس میں اچھو وغیرہ لگنے کا خطرہ بھی ہے اور بیماری بھی لگ سکتی ہے۔

(۳)......... تیسرا فائدہ یہ ہے کہ زیادہ ہضم کا ذریعہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یک دم اگر معدے کے اندر ڈالا جائے تو بعض اوقات معدے پر بوجھ بن جاتا ہے اور ہضم نہیں ہوتا جب کہ تھوڑا تھوڑا ڈالا جائے تو معدہ بآسانی قبول کر لیتا ہے اور دوسرا یہ کہ اگر درمیان میں سانس نہ لیا جائے تو چونکہ اس سے پیاس جلدی نہیں بجھتی اس لئے پیاس بجھانے کی خاطر آدمی پانی زیادہ پی جاتا ہے اور بعض اوقات معدے کے تحمل سے زیادہ پی جاتا ہے اور اس سے بدہضمی کا خطرہ ہے۔ لیکن اگر سانس لے کر پیئے گا تو چونکہ اس سے پیاس بآسانی بجھ جاتی ہے اس لئے اتنا ہی پیئے گا جتنا معدے کے اندر تحمل ہو گا اس سے زیادہ نہیں پیئے گا بدہضمی کا بھی خطرہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ کتنے سانسوں میں پانی پیتے تھے:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنے سانسوں میں پیتے تھے اس میں روایات کے اندر کچھ تعارض ہے اس

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح باب الاشربہ الفصل الاول ج ۸ / ص ۲۱۵

(۲) مشکاۃ المصابیح کتاب الاطعمہ باب الاشربہ الفصل الثانی ج ۲ / ص ۳۷۱

حدیث میں یہ آیا ہے: **یتنفس فی الشراب ثلاثا** کہ آنحضرت ﷺ پینے کی چیز میں تین مرتبہ سانس لیتے تھے جب کہ بعض احادیث میں آتا ہے **مرتین أو ثلاثا** کہ دو مرتبہ سانس لیتے تھے یا تین مرتبہ۔

حل تعارض......

(۱)............بعض نے ان احادیث میں تطبیق یوں دی ہے کہ جن میں آتا ہے کہ تین مرتبہ سانس لیتے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ پانی کو کل تین حصوں میں پیتے تھے پہلے تھوڑا سا پی لیا پھر الگ کر لیا پھر تھوڑا سا پیا اور برتن الگ کر لیا اور جن حدیثوں میں دو مرتبہ کا ذکر آتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ پینے کے دوران سانس لیتے تھے جب پانی تین حصوں میں پیا جائے گا ظاہر ہے کہ پینے کے درمیان دو سانس آئیں گے، اس کا تیسرا سانس وہ لینا ہی ہے اس لئے کہ وہ تو شرب کے خاتمے کے لئے ہے وگرنہ تو قیامت تک پیتا رہے گا۔ اس لئے بعض راویوں نے اس کو ذکر نہیں کیا لہٰذا دونوں قسموں کے اندر کچھ تعارض نہیں ہے۔[1]

(۲)............لیکن صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ حضور ﷺ کے معمول مختلف تھے عموماً آپ تین حصوں میں پیتے تھے لیکن دو حصوں میں بھی پی لیا کرتے تھے۔ اس کی تائید حضور ﷺ کی قولی حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث الفصل الثانی میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **لا تشربوا واحد اکشرب البعیر ولکن اشربوا مثنی وثلث** ۔کہ ایک دفعہ میں نہ پیو بلکہ دو اور تین مرتبہ میں پیو۔ اس حدیث کا بظاہر مطلب یہی بنتا ہے کہ ایک دفعہ پینا خلاف ادب ہے لیکن دو مرتبہ پینا بھی درست ہے اور تین مرتبہ پینا بھی درست ہے۔ آپ نے دو مرتبہ کا ذکر بھی کیا ہے اور تین مرتبہ کا ذکر بھی کیا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ کے فعل کے بارے میں جو حدیثیں ہیں ان میں بھی یہی کہا جائے گا کہ آپ بھی کبھی دو مرتبہ میں پیتے تھے اور کبھی تین مرتبہ میں۔

تین سانسوں میں پینے کا حکم...... تین سانسوں میں پینا آداب میں سے ہے اور سب سے بہتر طریقہ وہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فوائد بیان فرمائے ہیں۔

دو سانسوں میں پینے کا حکم...... دو سانسوں میں پینے کا حکم یہ ہے کہ یہ جائز ہے اور خلاف اولیٰ اور خلاف ادب بھی نہیں ہے، اس لئے کہ نہی ایک مرتبہ پینے سے ہے چونکہ ایک سانس میں یک دم پانی کے پیٹ میں جانے سے نقصان کا خطرہ بھی ہے اور یہ جانوروں کا طریقہ بھی ہے اس لئے آپ نے فرمایا: **لا تشربوا واحد اکشرب البعیر۔**

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح باب الاشربہ الفصل الاول ج ۸/ص ۲۱۶، ایضا اوجز المسالک الی موطا امام مالک النفخ فی الشراب ج ۱۴/ص ۲۶۹، ایضا فتح الباری کتاب الاشربہ باب النہی عن التنفس فی الاناء وباب الشرب بنفسین او ثلاثہ ج ۱۰/ص ۶۷، ۷۷

کہ اونٹ کی طرح ایک دفعہ پانی غٹ غٹ نہ چڑھاؤ اور یہ بات دو مرتبہ پینے میں نہیں پائی جاتی لہٰذا دو مرتبہ پینا بغیر کراہت کے جائز ہے۔

ایک مرتبہ پینے کا حکم ...... البتہ ایک مرتبہ پینا فی نفسہٖ مباح ہے لیکن خلاف اولیٰ اور خلاف ادب ہے، ایک تو اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین مرتبہ پینے کے فوائد بیان فرمائے ہیں وہ اس میں حاصل نہیں ہوتے دو دو دفعہ پینے میں کسی قدر حاصل ہو جاتے ہیں اور تین دفعہ پینے میں پورے طور پر حاصل ہو جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اونٹ کی طرح پینا قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ تنزیہی ہے اس لئے کہ اس نہی کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں:

ایک تو یہ کہ دنیوی فائدے سے محروم ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ نہی تحریمی نہ ہو بلکہ تنزیہی ہو۔

تین سے زیادہ مرتبہ میں پینے کا حکم ...... تین سے زیادہ مرتبہ مثلاً چار سانسوں، پانچ سانسوں میں پینے کا حکم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جائز ہے واللہ اعلم اور اس میں کسی قسم کی کراہت بھی نہیں ہے بلکہ سنت کا ثواب بظاہر اس میں مل جائے گا کیونکہ جب چار یا پانچ سانسوں میں پیئے گا تو اس میں تین سانس بھی آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کا ذکر تو کیا ہے تین سے زائد کی نفی نہیں کی۔

دوسرے یہ کہ حضور ﷺ نے تین سانسوں کا حکم چند فوائد کی وجہ سے دیا ہے اور یہ فوائد جس طرح تین سانسوں میں حاصل ہوتے ہیں اسی طرح تین سانسوں سے زیادہ میں بھی حاصل ہوتے ہیں بلکہ بطریق اولیٰ حاصل ہوتے ہیں، اس لئے تین سے زیادہ سانسوں میں پی لے تو نہ صرف یہ کہ خلاف سنت نہیں بلکہ بظاہر سنت پر عمل کرنے کا ثواب مل جائے گا۔ بعض مشروب ایسے ہوتے ہیں جو زیادہ سانسوں میں پیئے جاتے ہیں کچھ تو گرم چیزیں ہوتی ہیں ان کی تو خیر بات ہی علیحدہ ہے جیسے چائے وغیرہ لیکن دوسرے ٹھنڈے مشروبات بھی جیسے سوڈے کی بوتل وغیرہ یا اس طرح کے کچھ اور مشروبات یہ بھی بظاہر کئی سانسوں میں پیئے جاتے ہیں تو وہ خلاف سنت نہیں ہے اور مزید تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے جن کی سند کی تحقیق کا موقع نہیں ملا یہ حدیثیں مجمع الزوائد اور کنز العمال میں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پانی کو تھوڑا تھوڑا کر کے چوس چوس کر پیو۔ (۱)

برتن کے اندر پھونک مارنے کا حکم:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن کے اندر اور خاص طور پر پینے کی چیز کے اندر پھونک مارنے

---

(۱) کنز العمال الباب الثانی فی الشراب الفصل الاول فی آداب الشراب ج ۱۵/ ص ۲۹۰

سے منع فرمایا اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

پہلی وجہ ...... کہ برتن کے اندر پھونک مارے گا اور وہ پانی ہو سکتا ہے کسی اور نے بھی پینا ہو اور اس کو پیتے ہوئے گھن آئے کیوں کہ پھونک مارنے سے منہ کا کچھ لعاب بھی چلا جائے گا تو ایسا کام کرنا جس سے دوسرے کو گھن آئے پسندیدہ نہیں ہے، یہ وجہ اس صورت میں پائی جاتی ہے جب کہ اسی برتن میں کسی اور نے بھی پینا ہو۔[1]

دوسری وجہ ...... وہ یہ کہ اگر خود بھی پینا ہے تب بھی نفاست کے خلاف ہے اس لئے کہ اس میں پھونک مارے گا تو ظاہر ہے کہ کچھ لعاب کے بھی اجزاء جائیں گے اگرچہ لعاب اپنا ہی ہے لیکن تب بھی ایک مرتبہ منہ سے نکال کر دوبارہ منہ میں ڈالنا نفاست کے خلاف ہے اگر تو معتد بہ مقدار میں لعاب ہے اور وہ دوبارہ منہ ڈالتا ہے تو وہ نظافت کے خلاف ہے لیکن اس صورت میں نظافت کے خلاف تو نہیں البتہ نفاست خلاف ضرور ہے۔ پہلی وجہ شدید ہے بنسبت دوسری وجہ کے کیوں کہ دوسری وجہ میں دوسروں کو تکلیف کا خطرہ نہیں اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک تو نفاست کا معاملہ ہے اسے کسی بھی ضرورت اور عذر کی وجہ سے ترک کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس قسم کے آداب معمولی عوارض کی وجہ سے چھوڑ دیئے جاتے ہیں جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے اس تقریر سے معلوم ہوا کہ جہاں دوسروں کو گھن آتی ہو یا خطرہ ہو وہاں پر تو کراہت ہو گی لیکن جہاں دوسرے کو گھن آنے کا خطرہ نہ ہو وہاں پر یہ کراہت نہیں ہو گی اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ پینے کی چیز پینی ہی اس نے ہے کسی اور نے نہیں پینی، تو پہلی وجہ کراہت کی اس میں نہیں پائی جاتی لہٰذا کراہت معمولی رہ جائے گی اسی طرح اگر یقین ہے کہ دوسرا شخص اس کے لعاب یا اس کی پھونک سے گھن محسوس نہیں کرے گا اس صورت میں بھی یہ کراہت نہیں رہے گی خاص طور پر جب یہ اندازہ ہو کہ وہ اس کو اپنے لئے باعث فخر سمجھے گا تو یہ کراہت بالکل ختم ہو جائے گی۔

پانی پر دم کرتے وقت پھونک مارنا:-

اس سے ایک مسئلہ سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عام طور پر پینے کے لئے کچھ پڑھ کر پانی وغیرہ پر دم کیا جاتا ہے یہ ناجائز ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پانی یا پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے، دم کرنے والا ظاہر ہے اس میں پھونک مارتا ہے اس کا جواب یہ ہو گیا کہ یہ نہی

(۱) بذل المجہور کتاب الاشربہ باب فی النفخ فی الشراب ج ۵ / ص ۳۴۲، ایضاً اوجز المسالک الی موطا امام مالک النفخ فی الشراب ج ۱۴ / ص ۲۶۳، ایضاً فتح الباری کتاب الاشربہ باب الشرب بنفسین او ثلاثہ ج ۱۰ / ص ۷۷

اس صورت میں ہے جب کہ دوسرا اس کو برا سمجھے یہاں تو وہ برکت کے لئے ایسا کراتا ہے لہٰذا اس میں علت نہیں پائی جاتی اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ کتاب المعجزات میں اس طرح کے واقعات آئیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد واقعات پر پانی میں یا کسی کھانے کی چیز میں اپنا لعاب مبارک ڈالا ظاہر ہے کہ لعاب ڈالنا پھونک مارنے سے بھی اشد ہے لیکن چونکہ آپ کو یقین تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے لعاب کو بابرکت سمجھتے ہیں بلکہ اس موقع پر اس کی برکت بھی ظاہر ہوئی ہے، صحابہ ہی کا اس میں فائدہ تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لعاب ڈالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ایسی صورت حال کہ جب لعاب ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو پھونک مارنے میں بطریق اولیٰ کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پھونک مارنا بذاتِ خود ممنوع نہیں بلکہ لعاب کی گھن کی وجہ سے ممنوع ہے۔

مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پینا:۔

آنحضرت ﷺ نے مشکیزہ کو منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متفق علیہ حدیث ہے: **نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الشراب من فی السقاء۔**

اسی طرح حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث جو کہ متفق علیہ حدیث ہے یعنی بخاری اور مسلم میں ہے: **نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اختناث الاسقیہ۔**

اختناث الاسقیہ کا مطلب یہ ہے کہ مشکیزے کے منہ کو موڑ کر اس سے منہ لگا کر پانی پینا، ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کہ مشکیزہ زمین پر رکھا ہوا ہو اس کا منہ اگر سیدھا ہو تو اس سے منہ لگا کر پانی پینا مشکل ہوتا ہے اس لئے پانی پینے کے لئے اس کا منہ اپنی جانب کر لیا جاتا ہے اور منہ اوپر کی طرف کرنے کے لئے تھوڑا موڑنا پڑتا ہے اس کو اختناث الاسقیہ کہا جاتا ہے، اس سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ حاصل یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا چاہے اس کے منہ کو موڑنا پڑے یا نہ موڑنا پڑے دونوں صورتیں ہیں لیکن بعض احادیث بظاہر اس کے خلاف ہیں ان سے مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے مثلاً حضرت کبشہ کی حدیث الفصل الثانی میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لائے اور ان کے گھر میں مشکیزہ لٹکا ہوا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کھڑے ہو کر منہ لگا کر پیا، یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں:

پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ احادیث میں مشکیزے کو منہ لگا کر پینے سے منع کیا گیا ہے وہاں نہی کی علت یا حکمت کیا ہے اس کے بعد روایات میں تعارض کو حل کر لیں گے۔

مشکیزے کو منہ لگا کر پینے سے ممانعت کی وجوہ:-

(۱)......... مشکیزے کو منہ لگا کر پینے کی ممانعت کی کئی وجوہ ہیں مثلاً ہو سکتا ہے کہ مشکیزے کے اندر کوئی مضرت رساں چیز موجود ہو مثلاً کوئی زہریلی چیز موجود ہو اگر کسی گلاس یا برتن میں نکال کر پیا جائے تو وہ چیز ہو گی تو نظر آ جائے گی لیکن اگر براہ راست مشکیزے کو منہ لگا کر پیئے گا تو وہ چیز سیدھی منہ میں جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پانی کے بہاؤ کی وجہ سے وہ جلدی سے حلق سے نیچے اتر جائے، اس کی وجہ سے کوئی نقصان ہو بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ پیش بھی آیا کہ چھوٹا سانپ یا اس طرح کی کوئی چیز اس طرح کسی کے حلق میں چلی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزے کو منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔[۱]

(۲)......... ہو سکتا ہے اس مشکیزے سے کسی اور نے بھی پینا ہو تو یہ منہ لگا کر پیئے گا اس کے منہ کا لعاب اس کے منہ کو لگ جائے گا جس کی وجہ سے دوسرے کو گھن آئے گی اور نفرت محسوس ہو گی۔ چنانچہ بعض روایات میں اس وجہ کی بھی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا: **فان ذالك ينتنه** کہ منہ لگا کر پینے سے لعاب کی وجہ سے مشکیزے کا منہ بدبودار ہو سکتا ہے۔[۲]

(۳)......... ہو سکتا ہے کہ مشکیزہ بڑا ہو اور وہ اوپر لٹکا ہوا ہو اس کو منہ لگا کر پانی پیئے گا تو پانی کے دباؤ کی وجہ سے پانی حلق میں پھنس جائے گا اور اچھو وغیرہ لگ جائے گا یا سانس میں کوئی تکلیف پیدا ہو جائے گی۔[۳]

(۴)......... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشکیزے کو منہ لگانے کی صورت میں پانی اس کے ہونٹوں سے قابو نہ کیا جا سکے اور اس کے کپڑوں وغیرہ پر پانی گر جائے اور کپڑے وغیرہ بھیگ جائیں۔[۴]

(۵)......... مشکیزے کا منہ اگر موڑ کر پیتا ہے اس میں اضافی قباحت یہ ہے کہ اس طریقے سے مشکیزے کو بار بار موڑے گا اس کا منہ جلد ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے اس سے مشکیزہ ضائع ہو جائے گا۔[۵]

حل تعارض...... اب آیئے حل تعارض کی طرف کہ ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا دوسری طرف مشکیزہ کو منہ لگا کر پانی پیا۔

(۱)......... اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ بعض حضرات نے چھوٹے اور بڑے مشکیزے کا فرق بیان کیا ہے کہ بڑے مشکیزے سے منع کیا گیا ہے کیوں کہ اس میں دباؤ کی وجہ سے پانی حلق میں پھنسنے کا زیادہ خطرہ ہے جب کہ چھوٹے مشکیزہ میں اس طرح کا خطرہ نہیں ہے۔[۶]

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح کتاب الاطعمہ باب الاشربہ الفصل الاول ج ۸ / ص ۲۱۶، ایضاح البخاری کتاب الاشربہ باب الشرب من فم السقاء ج ۱۰ / ص ۷۴

(۲) ایضاً...... (۳) ایضاً...... (۴) مرقاۃ المفاتیح کتاب الاطعمہ باب الاشربہ الفصل الاول ج ۸ / ص ۲۱۶

(۵) فتح الباری کتاب الاشربہ باب الشرب من فم السقاء ج ۱۰ / ص ۷۵...... (۶) ایضاً

(۲)........... بعض نے جواب دیا ہے کہ یہ نہی تنزیہی ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لئے ایسا کیا ہے۔[1]

(۳)........... تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اصل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے گھر گئے ہوئے تھے اور وہاں برتن موجود نہیں تھا اور گھر والوں سے یہ کہنا کہ برتن لاؤ اس سے ان کے حرج میں مبتلا ہونے کا خطرہ تھا کیوں کہ اس زمانے میں برتنوں کی فراوانی نہیں ہوتی تھی کہ لازماً گھر کے اندر کوئی برتن موجود ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ برتن موجود ہی نہ ہو یا موجود تو ہو لیکن مصروف ہو، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میزبان کو تنگ کرنے کی بجائے منہ لگا کر پانی پی لیا۔[2] یہ عرض کر چکا ہوں کہ آداب کے معاملہ میں معمولی اعذار کی وجہ سے بھی کافی وسعت ہو جاتی ہے۔

مشکیزے کو منہ لگا کر پینے کا حکم:۔

بعض حضرات کے نزدیک کراہت تحریمی ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی فرمائی ہے اور نہی کے اندر اصل یہ ہے کہ کراہت تحریمی ہوتی ہے، باقی جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خود منہ لگا کر پینے کا تعلق ہے تو اس میں خصوصیت کا احتمال موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو لیکن صحیح یہ ہے کہ مکروہ تحریمی نہیں بلکہ مکروہ تنزیہی ہے۔

مکروہ تنزیہی کی وجوہ:۔

ایک تو یہ کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ لگا کر پانی پیا اور خصوصیت کا احتمال ذرا بعید ہے اس پر واضح کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور احکام کے اندر اصل عدم خصوصیت ہے۔

دوسرے اس وجہ سے کہ یہ نہی دنیوی حرج اور نقصان سے بچانے کے لئے ہے اور ادب کے قبیل سے ہے اور اس طرح کی نہی عام طور پر تحریمی نہیں ہوتی بلکہ تنزیہی ہوتی ہے لہٰذا یہ بھی تنزیہی ہے۔

فائدہ...... البتہ اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اس نہی تنزیہی کی پانچ وجوہات ذکر کی ہیں تو جہاں پر ان میں سے زیادہ وجوہ پائی جاتی ہیں وہاں نہی تنزیہی ہونے کے باوجود نسبتاً اشد ہو گی اور جتنی وجوہ کم ہوتی چلی جائیں گی اتنی ہی نہی کے اندر مزید تخفیف ہوتی چلی جائے گی مثلاً ہو سکتا ہے مشکیزہ چھوٹا ہو تو اچھو وغیرہ لگنے کا خطرہ نہیں ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے لعاب کی وجہ سے کسی دوسرے

---

(۱) فتح الباری کتاب الاشربہ باب الشرب من فم السقاء ج ۱۰/ص ۷۵..... (۲) ایضاً

کو نفرت محسوس ہونے کا خطرہ کم ہو یا نہ ہو تو ایک وجہ اور کم ہو گئی۔ تو مختلف حالات کی وجہ سے ان پانچ وجوہ میں کمی بھی ہو سکتی ہے اور زیادتی بھی ہو سکتی ہے، اصل کے اعتبار سے تو نہی تنزیہی ہے لیکن جتنی وجوہ زیادہ ہوتی چلی جائیں گی نہی اتنی ہی اشد ہوتی چلی جائے گی۔

ہر چیز کے استعمال میں احتیاط کی تعلیم:۔

اختناث الاسقیہ والی حدیث سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ کسی چیز کو استعمال کرنے میں احتیاط برتنی چاہئے یہ بھی شرعی آداب میں سے ہے، ایسے بے ڈھنگے انداز سے کسی چیز کو استعمال نہیں کرنا چاہئے جس سے وہ چیز جلدی خراب ہو جائے، بے احتیاطی سے چیز کو استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر چیز اگرچہ وہ اپنی ہی ہو ایسے انداز اور احتیاط سے استعمال کرنا چاہئے کہ وہ جلد خراب نہ ہو اور اگر کسی اور کی ہے تو اس میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔

اختناث الاسقیہ والی حدیث سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی پیچھے مسئلہ گزرا ہے کہ برتن کے اندر پھونک مارنے سے ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ جب پھونک مارے گا تو لعاب کے اجزاء اس میں غیر محسوس طریقے سے چلے جائیں گے اگرچہ بہت معمولی ہوں، لیکن بعض لوگوں کی طبیعت پر اس سے بھی گرانی ہوتی ہے اور یہاں پر بھی ایک وجہ یہ ہے کہ مشکیزے کو اگر لعاب لگ گیا تو دوسرے کو نفرت آئے گی۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس سے دوسرے کو دیکھ کر اس کی طبیعت پر گرانی گزرے۔

کسی کے جھوٹے کو پینے کی طبیعت نہ چاہے تو یہ خلاف سنت نہیں:۔

دوسرا یہ کہ بعض کی طبعیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ دوسرے کا جھوٹا اور بچا ہوا آسانی سے کھا پی لیتے ہیں لیکن بعض کی طبائع ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کے لئے کسی کا جھوٹا اور بچا ہوا پینا مشکل ہوتا ہے، تو بعض لوگ اس مزاج کو برا اور ناپسندیدہ سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں: **سور المؤمن شفاء** کہ مؤمن کے جھوٹے میں تو شفاء ہوتی ہے۔[1] لہٰذا ہر ایک کو چاہئے کہ وہ دوسرے کا جھوٹا پیئے اور جو نہ پی سکتا ہو اس کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ یہ خلاف سنت کام کر رہا ہے لیکن اس طرح کے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی طبیعت ایسی ہو کہ اس کو کسی کی زبان یا لعاب لگنے کی وجہ سے یا کسی کا سانس لینا طبیعت پر بوجھ محسوس ہوتا ہے تو شریعت نے خود اس مزاج کی رعایت کی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مزاج برا نہیں بلکہ غیر اختیاری معاملہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے مزاج مختلف بنائے ہوئے ہیں۔

---

(۱) بطورِ حدیث کے یہ بات نہیں ہے۔

کھڑے ہو کر پینے کا حکم:-

کھڑے ہو کر پینے کے بارے میں بھی احادیث مختلف ہیں بعض احادیث میں کھڑے ہو کر پینے سے نہی وارد ہوئی ہے مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی کھڑا ہو کر پیئے۔(۱) اس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مسلم شریف کے حوالہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی کھڑے ہو کر نہ پیئے اگر کوئی ایسا کر لے تو اس کو چاہئے کہ وہ قے کرے۔(۲) یہ دو حدیثیں نہی پر دلالت کرتی ہیں، جب کہ دوسری بہت ساری احادیث سے کھڑے ہو کر پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

(۱)......... مثلاً بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زمزم کا ڈول لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیا۔(۳)

(۲)......... حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ انہوں نے کوفہ کے اندر سب کے سامنے وضوء کیا اور بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا اور یہ فرمایا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ لوگ کھڑے ہو کر پینے کو برا سمجھتے ہیں تو ان کی تردید کے لئے میں نے کھڑے ہو کر پیا ہے اور میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔(۴) یہ تو بخاری کی روایت ہے اور مسند احمد کی روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیٹھ کر پیتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور کھڑے ہو کر پیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔(۵)

(۳)......... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث الفصل الثانی کے شروع میں ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کھڑے ہو کر کھالیا کرتے تھے اور کھڑے ہو کر پی لیا کرتے تھے۔(۵)

(۴)......... حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث الفصل الثانی کی دوسری حدیث ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھڑے ہو کر پیتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور بیٹھ کر پیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔(۶)

(۵)......... حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ آلہ وسلم ان کے گھر تشریف لائے مشکیزہ لٹکا ہوا تھا تو کھڑے ہو کر پیا۔(۷) یہ احادیث کھڑے ہو کر پینے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ احادیث کے اس تعارض کو کس طرح دور کیا جائے اس کے لئے محدثین نے مختلف راستے

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب فی الشرب قائماج ۲/ ص ۱۷۳...... (۲) ایضاً...... (۳) صحیح بخاری کتاب الاشربہ باب الشرب قائماج ۲/ ص ۸۳۹
(۴) ایضاً...... (۵) مشکاۃ المصابیح باب الاشربہ الفصل الثانی ج ۲/ ص ۳۷۱...... (۸،۷،۶) ایضاً......

اختیار کیے ہیں۔[1]

حل تعارض بطریق ترجیح ...... بعض نے ترجیح کا راستہ اختیار کیا ہے کہ ان میں سے بعض روایات کو بعض روایات پر ترجیح دی جائے اگر ترجیح کا راستہ اختیار کیا جائے تو جواز والی احادیث راجح ہیں اور نہی والی احادیث مرجوح ہیں۔

احادیث جواز کی وجوہ ترجیح ...... ایک تو اس وجہ سے کہ جواز والی احادیث تعداد میں زیادہ ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ جواز والی احادیث صحت کے اعتبار سے بھی زیادہ قوی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نہی کی کوئی حدیث بخاری شریف میں نہیں لائے جب کہ جواز کی دو حدیثیں لائے ہیں ایک حضرت ابن عباس کی، دوسری حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث۔

حل تعارض بطریق نسخ ...... بعض حضرات نے نسخ کا راستہ اختیار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ نہی والی احادیث منسوخ ہیں اور جواز والی احادیث ناسخ ہیں، ابتداء میں کھڑے ہو کر پینا ناجائز تھا لیکن بعد میں جائز ہو گیا لیکن ترجیح یا نسخ کا راستہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ مختلف احادیث میں تطبیق ممکن نہ ہو اگر مختلف احادیث میں تطبیق ممکن ہو تو بہتر یہی ہوتا ہے ان میں تطبیق دی جائے اس لئے یہاں پر بجائے نسخ یا ترجیح کے تطبیق دی جائے گی جو زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

حل تعارض بطریق تطبیق ...... تطبیق یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پینا اگرچہ ممنوع ہے لیکن اس سے جو کراہت ہے تحریمی نہیں بلکہ خلاف ادب ہونے کی وجہ سے ہے لہٰذا جن احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے وہ احادیث نہی والی احادیث کے خلاف نہیں کیوں کہ نہی والی احادیث کا حاصل یہ ہے کہ یہ خلاف ادب ہے اور جو چیز خلاف ادب ہوتی ہے وہ فی نفسہٖ جائز ہوتی ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کھڑے ہو کر پینے کی احادیث کافی زیادہ ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ نے کھڑے ہو کر پیا، ایک تو اس وجہ سے کہ فی نفسہٖ جائز ہے بیان جواز کے لئے ایسا کیا دوسرے اس وجہ سے کہ آداب میں معمولی اعذار کی وجہ سے وسعت ہوتی ہے اور آداب کے اختیار کرنے کا اہتمام تو کیا جاتا ہے لیکن ان میں تکلف سے کام نہیں لیا جاتا لہٰذا جہاں بآسانی بیٹھ کر پینا ممکن ہو وہاں بیٹھ کر ہی پینا چاہیئے جہاں بیٹھ کر پینا ممکن نہ ہو وہاں کھڑے ہو کر پینا بھی درست ہے مثلاً حضرت کبشہ کے گھر میں مشکیزہ لٹکا ہوا تھا تو برتن منگوانے میں بھی گھر والوں کو تکلیف تھی اور مشکیزہ اتارتے، پھر بندھا ہوا تھا، گرہ وغیرہ کھولتے، پھر اسے نیچے رکھتے، پھر بیٹھ کر پیتے اس میں ذرا

---

(۱) فتح الباری کتاب الاشربہ باب الشرب قائما ج ۱۰/ ص ۶۹، ایضاً عمدۃ القاری کتاب الاشربہ باب الشرب قائما ج ۲۱/ ص ۱۹۳ (مکتبہ رشیدیہ پاکستان)، ایضاً اوجز المسالک الی موطا امام مالک باب فی شرب الرجل وھو قائم ج ۱۴/ ص ۲۷۰ (ادارہ تالیفات اشرفیہ)

تکلف تھا چونکہ محض یہ ادب تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے زیادہ تکلف کی ضرورت نہ سمجھی سب سے بہترین تطبیق کا راستہ یہ ہے۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا یہ وضو کے بچے ہوئے پانی اور زم زم کے ساتھ خاص ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زم زم کا پانی کھڑے ہو کر پیا لیکن یہ بات علی الاطلاق درست معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ جواز کی احادیث کافی ساری ہیں اور سب کو زم زم اور وضو کے بچے ہوئے پانی کے ساتھ خاص کرنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اگرچہ وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا تھا لیکن نتیجہ اس سے عام نکالا تھا کہ جو لوگ ہر قسم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینا ناپسند سمجھتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام پانی کھڑے ہو کر پینا خلافِ ادب ضرور ہے لیکن زم زم یا وضو کا بچا ہوا کھڑے ہو کر پینا خلافِ ادب بھی نہیں، یہ ان دو پانیوں کی خصوصیت ہے۔

بعض حضرات نے یہاں تک کہا ہے کہ یہ دو پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ مستحب نہیں بلکہ ان کی خصوصیت صرف اتنی ہے کہ خلافِ ادب نہیں، جب کہ باقی پانی کھڑے ہو کر پینا خلافِ ادب ہے۔

قے کے حکم کی وجہ:۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے: **فمن نسی منکم فلیسقی** تو یہ قے کرنے کا امر کیسا ہے بعض حضرات نے یہ کہا کہ یہ امر استحبابی ہے، وجوبی نہیں۔[1]

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قے کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ وہ بھولے گا نہیں بلکہ جب ایک مرتبہ بھول کر کھڑے ہو کر پانی پیا اور اسے قے کرنا پڑ گیا تو آئندہ اسے یاد رہے گا تو گویا یہ قے کرنا معالجہ پر محمول ہے یعنی عادت کے معالجے پر کیونکہ ایک معالجہ جسمانی ہوتا ہے اور ایک عادات کا معالجہ ہوتا ہے کہ بعض کاموں سے بچنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آدمی بھول جاتا ہے اور ارادہ یہ کرتا ہے کہ آئندہ یاد رکھوں گا اور پھر بھول جاتا ہے یا بعض چیزوں کے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب کرنے کا موقع ہوتا ہے تو آدمی بھول جاتا ہے اور کوشش کے باوجود ہر موقع پر اسے بات یاد نہیں آتی تو صوفیاء اس کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ بھولنے پر کوئی ایسی سزا مقرر کرتے ہیں جس کی وجہ سے آئندہ آدمی کو یاد رہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس پر آدمی کو

(۱) فتح الباری کتاب الاشربہ باب الشرب قائماج ۱۰/ص ۶۸

کوئی مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ چیز آدمی کو یاد رہتی ہے، تو یہاں جب آدمی فیصلہ کرے گا کہ جو پانی پیا تو اس کو قے کرنا پڑے گی تو وہ اسے بعد میں یاد رہے گا اور کھڑے ہو کر وہ نہیں پیئے گا۔ تو یہ امر استحبابی ہے استحباب کی وجہ کہیں صراحتاً دیکھی تو نہیں ہے لیکن بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ حدیث اس طریقے سے ثابت ہے تو قے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فی نفسہٖ تو مستحب نہیں لیکن عادت کی تبدیلی کے لئے اس کا حکم دیا گیا۔

البتہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے اور ان کی بات بھی قوی ہے کہ اس روایت میں اصل میں راوی سے اختصار ہو گیا ہے کہ جو بھول کر ایسا کرے تو وہ قے کر دے، اصل میں روایت اس طریقے سے نہیں اور اس میں امر کا صیغہ نہیں تھا بلکہ مسند احمد کی روایت یوں ہے کہ جو آدمی کھڑے ہو کر پیتا ہے اس کو اگر پتہ چل جائے کہ اس میں کیا قباحت ہے تو وہ قے کر دے، یہ مطلب نہیں کہ قے کر دینی چاہئے بلکہ اگر اسے قباحت نظر آجائے تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور قے کرنے پر مجبور ہو جائے اور اس کی وضاحت ایک اور حدیث میں یوں آتی ہے کہ حضور ﷺ نے اس طرح کسی شخص کو فرمایا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہارے ساتھ بلی پانی پیئے، اس نے کہا کہ اسے تو میں پسند نہیں کروں گا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اگر بلی اس کے ساتھ پینے لگ جائے تو شاید اس کے لئے برداشت کرنا مشکل ہو جائے، شاید قے ہو جائے۔ تو اس طریقے سے جب تم پیتے ہو تو تمہارے ساتھ شیطان پیتا ہے جو بلی سے بھی گندا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بلی نظر آجاتی ہے شیطان نظر نہیں آتا لہٰذا اصل روایت میں امر کا صیغہ نہیں تھا بلکہ راوی نے اختصار کیا اور اختصار کرتے یہ نقل کر دیا: فمن نسی فلستقی۔

سونا اور چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کا حکم[1]:۔

چوتھا مسئلہ ہے سونے اور چاندی کے برتن میں پینا تو جو برتن مکمل طور پر سونے یا چاندی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں یا کسی اور چیز کے ہوتے ہیں لیکن ان کی ظاہری سطح پر مکمل طور پر سونا یا چاندی چڑھا ہوا ہوتا ہے تو ایسے برتن میں کھانا اور پینا بالاتفاق ناجائز ہے، مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی البتہ اگر کوئی برتن بنیادی طور پر تو کسی اور چیز کا ہو مثلاً پیتل، تانبے، لوہے یا کسی اور چیز کا ہے لیکن اس میں کسی جگہ پر کچھ سونا یا کچھ چاندی لگی ہوئی ہے تو اس کو اناءِ مذہب یا اِناء مفضض کہیں گے۔

اناء مذہب یا اناء مفضض میں پینے کا حکم:۔

اس میں پینے کا حکم یہ ہے کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ کا مذہب اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ اس

---

(۱) اوجز المسالک الی موطا امام مالک النھی عن الشراب فی آنیۃ الفضۃ ج ۱۴/ص ۲۶۳

میں بھی پینا ناجائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ اگر تو سونے یا چاندی والی جگہ پر ہونٹ لگ رہے ہوں تو پینا ناجائز ہے لیکن اگر وہاں سے منہ لگا کر پانی نہ پیئے بلکہ کسی اور جگہ سے منہ لگا کر پیئے تو اس کی گنجائش ہے۔[۱]

امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کی دلیل:۔

(۱)......... امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **الذی یشرب فی آنیة الفضة إنما یُجَرْجِرُ فی بطنہٖ نار جھنم** - یہ حدیث اگرچہ سنداً صحیح ہے اور بخاری مسلم کی حدیث ہے لیکن مالکیہ اور شافعیہ کا اس سے استدلال بہت کمزور ہے اس لئے کہ اس میں چاندی کے برتن میں پینے سے منع کیا گیا ہے اور چاندی کا برتن تب کہلاتا ہے جب کہ مکمل طور پر چاندی کا ہو یا کم از کم اس کی ظاہری سطح پر مکمل طور پر چاندی ہو۔ برتن کسی اور چیز کا بنا ہوا ہے لیکن ایک آدھ جگہ کہیں چاندی کا جوڑ وغیرہ لگا ہوا ہے تو اس کو عرف اور محاورے میں چاندی کا برتن نہیں کہا جاتا، اس لئے اس سے استدلال درست نہیں ہے۔

(۲)......... دوسری دلیل مالکیہ، شافعیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی جو اس باب کے آخر میں ہے جس میں دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من شرب فی إناء ذھب او فضة او إناء فیہ شئ ذلك فانما یجرجر فی بطنہٖ نار جھنم**۔[۲]

اس میں تین چیزوں کا ذکر ہے، تین چیزوں پر وعید ہے، سونے کے برتن میں پیئے، چاندی کے برتن میں پیئے یا ایسے برتن میں پیئے جس میں سونا یا چاندی شامل ہو یہ الفاظ صراحتاً اِناءِ مفضض اور اِناء مذہب پر دلالت کرتے ہیں یعنی جس پر سونا یا چاندی لگا ہوا ہے۔

لیکن یہ حدیث سنداً صحیح نہیں اس لئے کہ اس حدیث کے ایک راوی زکریا بن ابراہیم اپنے والد ابراہیم سے روایت کرتے ہیں اور زکریا خود بھی مجہول ہیں اور ان کے والد بھی مجہول ہیں تو اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں، اس لئے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے البتہ موقوفاً یہ روایت ثابت ہے یعنی خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل ہے کہ وہ اس طرح کے برتن میں نہیں پیا کرتے تھے۔

---

(۱) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحة باب الاکل والشرب فی اوانی الذھب والفضه ص۱۷: ص۲۹۶، ایضاً المغنی لابن قدامه کتاب الاشربه مسأله الشرب فی آنیه الذھب والفضه ج۱۲/ص۵۱۸

(۲) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحة باب الشرب من الاناء المفضض او المضبب ج۱۷/ص۲۹۷

دلائل حنفیہ ...... حنفیہ کی ایک دلیل تو حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے جسے طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں تفضیض الاناء سے منع فرمادیا یعنی برتن میں چاندی کی تار وغیرہ لگانے سے منع فرمایا تھا لیکن بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔[1]

حدیث کی سند پر اعتراض......

(۱)......اس حدیث کی سند پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے اور آپ نے جس سے استدلال کیا تھا اس میں دو راوی مجہول تھے لہٰذا یہ حدیث اس کی نسبت بہر حال قوی ہے لہٰذا اس کو اس پر ترجیح ہو گی۔

(۲)......دوسری دلیل بخاری وغیرہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک پیالہ تھا جس کے بارے میں انہوں نے بتلایا کہ میں نے اس پیالے کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی چیزیں پلائی ہیں وہ پیالہ ٹوٹ گیا تھا تو اس کو جوڑنے کے لئے اس میں چاندی کی تاریں لگائی گئی تھیں۔

اب یہاں دو احتمال ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ یہ چاندی کی تاریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں لگائی گئی تھیں چنانچہ بعض روایات سے ایسے ہی معلوم ہوتا ہے یہ تو واضح طور پر ہمارے لئے حجت ہے کیوں کہ حدیث مرفوع ہو گئی اور اگر دوسرا احتمال لیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد یہ پیالہ ٹوٹ گیا تھا اور اس میں یہ تاریں لگائی گئیں تھیں تب بھی یہ ایک صحابی کا فعل ضرور ہے اس لئے ہمارے لئے حجت ہے۔

سوال ...... البتہ یہ سوال پیدا ہو گا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس کے جواز کی معلوم ہو رہی ہے لیکن اس کے برعکس حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے عدم جواز کی ہے تو جب صحابہ کی مختلف آراء آگئیں تو حنفیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کو کیوں ترجیح دی؟[2]

جواب: وجوہ ترجیح......

(۱)......ترجیح کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی تائید حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے ہو رہی ہے۔

(۲)......اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اصل میں جو ممنوع ہے وہ سونے اور چاندی کا برتن ہے اور کسی برتن

---

(۱) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحۃ باب الشرب من الاناء المفضض او المضبب ج ۱۷/ ص ۲۹۹......(۲) ایضاً

میں ضمنی طور پر سونا اور چاندی لگا ہوا ہو تو سونے اور چاندی کا برتن نہیں کہلاتا۔[1]

ابو جعفر حضور (عباسی خلیفہ ہوئے ہیں) کی مجلس میں کچھ علماء بیٹھے ہوئے تھے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی موجود تھے تو وہاں پر یہی بحث چلی کہ اناءِ مفضض میں پینے کا کیا حکم ہے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں یہ مسئلہ بعد میں بتاؤں گا پہلے مجھے ایک اور مسئلہ بتاؤ وہ یہ کہ ایک آدمی نے چاندی کی انگوٹھی پہنی ظاہر ہے کہ چاندی کی انگوٹھی مرد کے لئے جائز ہے اور وہ چلو سے پانی پیتا ہے، اس کا چلو سے پانی پینا جائز ہے یا نہیں۔ تو یہ سوال سن کر سارے حضرات خاموش ہو گئے کہ اس سے پہلے مسئلے کا جواب واضح ہو گیا کہ بہر حال اس کا چلو میں سے پانی پینا جائز ہے، یہ پانی اس چاندی کو لگ کر آرہا ہے، ہونٹ اس چاندی کو نہیں لگ رہے اور دوسرا یہ کہ ہاتھ بنیادی طور پر چاندی کا نہیں البتہ اس کے اندر چاندی موجود ہے تو یہی صورت حال اِناء مفضض میں ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔[2]

البتہ یہاں علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ایک بات پر تنبیہ فرمائی وہ یہ ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں عام طور پر مسئلہ یوں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جس برتن میں چاندی لگی ہوئی ہے اس میں بھی پینا جائز ہے اور جس میں سونا لگا ہوا ہے اس میں بھی پینا جائز ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے جو روایت منقول ہے وہ صرف چاندی کے بارے میں ہے کہ جس برتن میں چاندی لگی ہوئی ہے اس کو جائز قرار دیا ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے مشائخ نے سونے کو بھی اس پر قیاس کر لیا ہے لیکن حضرت عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قیاس بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جہاں چاندی جائز ہو وہاں سونا بھی جائز ہو اس لئے کہ چاندی کے اندر سونے کی بنسبت زیادہ گنجائش ہے مثلاً ایک مثقال کی حد تک مرد کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے لیکن سونے کی انگوٹھی کسی بھی حالت میں کسی بھی مقدار میں پہننا جائز نہیں ہے اس لئے اس قیاس میں نظر ضرور ہے۔[3]

کھڑے ہو کر کھانے کا حکم:۔

کھڑے ہو کر پینے کا مسئلہ تو آ گیا لیکن کھڑے ہو کر کھانے کا کیا حکم ہے تو اس میں کوئی صریح اور صحیح حدیث تو نظر سے نہیں گزری البتہ صحیح مسلم میں ایک روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا قتادہ رضی اللہ تعالیٰ

---

(۱) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحۃ باب الشرب من الاناء المفضض او المضبب ج ۱۷/ ص ۲۹۹

(۲) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحۃ باب الاکل والشرب فی اوانی الذھب والفضۃ ج ۱۷/ ص ۲۹۶

(۳) اعلاء السنن کتاب الحظر والاباحۃ باب الشرب من الاناء المفضض او المضبب ج ۱۷/ ص ۳۰۰

عنہ سے ہے یعنی اُن کے شاگرد قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا کہ کھڑے ہو کر کھانے کا کیا حکم ہے؟ کھڑے ہو کر پینے کی حدیث کا ذکر کیا اور انہوں نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر کھانا تو اس سے بھی اشد ہے۔[1] گویا انہوں نے کھڑے ہو کر کھانے کی نہی پر بطور دلالت النص استدلال کیا ہے کہ جب کھڑے ہو کر پینے کی نہی ہے تو کھڑے ہو کر کھانے سے بطریق اولیٰ نہی ہو گی لیکن کھڑے ہو کر پینے سے نہی عبارۃ النص سے ثابت ہے اور کھڑے ہو کر کھانے سے نہی دلالت النص سے ثابت ہے اس کا درجہ دلالت کے اعتبار سے ذرا کمزور ہوتا ہے۔ بہر حال اس سے یہ ثابت ہوا کہ جس طرح کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے اسی طریقے سے کھڑے ہو کر کھانا بھی مکروہ ہے لیکن جس طرح کھڑے ہو کر پینے سے نہی تنزیہی ہے یعنی خلاف ادب ہونے کی وجہ سے ہے اسی طرح کھڑے ہو کر کھانا بھی خلافِ ادب ہے لیکن بذات خود جائز اور مباح ہے اس کو ناجائز یا حرام نہیں کہا جا سکتا۔

تعارض...... البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بظاہر اس کے خلاف ہے اس میں آتا ہے کہ ہم حضور ﷺ کے زمانے میں چلتے پھرتے بھی کھالیا کرتے تھے، تو جب چلتے پھرتے کھاتے تھے تو کھڑے ہو کر بطریق اولیٰ کھالیتے ہوں گے، اس لئے کہ چلتے پھرتے کھانا یہ کھڑے ہو کر کھانے سے بھی اگلا درجہ ہے۔

حل تعارض......

(۱)......... تو اس کا ایک جواب تو بعض نے یہ دیا ہے کہ یہ حدیث آخری لقمے پر محمول ہے کہ ویسے تو بیٹھ کر کھاتے تھے لیکن آخری لقمہ منہ میں ڈال کر چل دیتے تھے اور وہ چلتے ہوئے کھاتے تھے۔

(۲)......... دوسرا جواب یہ ہے اور یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں کھانے کی چیزیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک تو وہ ہیں جنہیں باقاعدہ کھانے کے طور پر کھایا جاتا ہے جیسا کہ روٹی ہے، چاول ہیں جیسے ناشتہ، دوپہر کا کھانا وغیرہ اور دوسری وہ چیز ہوتی ہے جسے کیف ما اتفق کھایا جاتا ہے، جیسے ٹافی، چنے کھالئے، پان چھالیا وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ کراہت اصل میں پہلی قسم کے کھانے سے ہے یعنی جن چیزوں کو باقاعدہ طور پر کھایا جاتا ہے لیکن چنے، ٹافی، بادام، پان، سونف اس طرح کی جو چیزیں ہوتی ہیں ان کا یہ حکم نہیں ہے، ان کو چلتے پھرتے کھانے میں کراہت نہیں ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث دوسری قسم کی چیزوں پر محمول ہے لہٰذا کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

تبلیغ اعتدال کی ضرورت:-

یہاں پر ایک بات اور سمجھ لیجئے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے سمجھ میں آتی ہے کہ

(۲) صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب فی الشراب قائما ج ۲/ ص ۱۷۳

کھڑے ہو کر پینا اگرچہ جائز اور مباح ہے لیکن خلافِ ادب ضرور ہے لیکن یہاں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے اہتمام سے کھڑے ہو کر پیا اور سب کے سامنے پیا، خلافِ ادب چیز کا اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو بات اصل میں یہ ہے کہ لوگ اس مسئلے کو اپنی حد سے بڑھانے لگ گئے تھے، مسئلہ تو یہ ہے کہ فی نفسہٖ جائز خلافِ ادب ہے لیکن لوگ اس کو ناجائز سمجھنے لگ گئے تھے۔ جتنی اس میں ناپسندیدگی ہے اس سے زیادہ سمجھنے لگ گئے تھے تو اس کی تردید کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عملاً کھڑے ہو کر پی کر دکھایا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کام خلافِ ادب ہو تو اس سے بچنا چاہئے لیکن اگر کسی ماحول یا معاشرے میں اس کو اس سے زیادہ ناپسندیدہ سمجھا جانے لگے جتنا وہ ہے تو اس حالت میں اس پر انکار کرنا چاہئے، مقتداء اور علماء کو چاہئے کہ اس پر انکار کریں، زبان سے انکار کرنا کافی ہو تو زبان سے انکار کریں اور اگر زبان سے انکار ناکافی ہو تو عمل سے بھی انکار کرے تاکہ معتدل مسئلہ لوگوں کے ذہن میں آجائے، جس طریقے سے خلافِ ادب کا ارتکاب ناپسندیدہ ہے اسی طرح خلافِ ادب کام کو محض ناجائز سمجھ لینا اور حد سے بڑھا دینا اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہے اس لئے اگر کچھ لوگ خلافِ ادب کام کر رہے ہوں تو جس طرح یہ کام قابلِ اصلاح ہے اس طرح اگر کچھ لوگ کسی مسئلہ کو اپنی حد سے بڑھا رہے ہوں تو یہ اس سے بھی زیادہ قابلِ اصلاح کام ہے۔

باب النقيع والأنبذة

یہ باب دوچیزوں کے بارے میں ہے، نقیع اور انبذہ کے بارے میں۔

الفصل الاوّل

نبیذ اور نقیع کا معنی (۱):-

انبذہ نبیذ کی جمع ہے، نبیذ اور نقیع کا معنی قریب قریب ہے کہ کھجور، کشمش، گندم یا جو وغیرہ کو پانی میں ڈال دیا جائے اور ان کا اثر پانی کے اندر نکل آئے اس کو نبیذ بھی کہہ دیتے ہیں اور نقیع بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے ان دونوں کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ نبیذ اس وقت کہلاتا ہے جب اس کو پکا لیا جائے اور نقیع وہ ہوتا ہے جس کو پکایا نہ جائے لیکن دونوں کا اطلاق ایک دوسرے پر کثرت سے ہوتا رہتا ہے۔

(۱)-----عن أنس، قال: لقد سَقيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم بقدَحي هذا الشرابَ كلَّه: العسلَ، والنَّبيذَ، والماء، واللبنَ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے اس پیالے سے ہر قسم کی پینے کی چیزیں پلائی ہیں، شہد بھی، نبیذ بھی، پانی بھی اور دودھ بھی۔

(۲)-----وعن عائشةَ، قالت: كنَّا ننبِذُ لرسول الله صلى الله عليه وسلم في سقاء يوكأ اعلاهُ، وله عزلاءُ، ننبِذُه غُدوةً، فيشربُه عشاءً، وننبذُه عشاءً فيشربُه غُدوةً۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک مشکیزے میں نبیذ بنایا کرتے تھے جس کے اوپر ڈھکن لگا دیا جاتا تھا اور اس کا منہ تھا ہم اس میں نبیذ بناتے تھے صبح کے وقت۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے شام تک پی لیا کرتے تھے اور ہم اس میں شام کے وقت نبیذ بناتے تو آپ اسے صبح تک پی لیا کرتے تھے۔

---

(۱) تاج العروس للزبیدی فصل النون من باب الذال ج ۲/ص ۵۸۰، ایضا فیہ فصل النون من باب العین ج ۵/ص ۵۳۸

(۳)-----وعن ابنِ عبَّاس، قال: كانَ رسولُ اللهِ ﷺ يُنبذُ له أولَ الليلِ، فيشربُه إذا أصبحَ يومَه ذلكَ، والليلةَ التي تجيُ، والغدَ، والليلةَ الأخرى، والغدَ إلى العصرِ، فإن بقيَ شيٌ سقاهُ الخادمَ، أو أمرَبهِ فصُبَّ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رات کے شروع میں نبیذ بنایا جاتا تو آپ اس دن جب صبح ہوتی تو اسے پی لیتے اور اس کے بعد جو رات آتی اس میں بھی پی لیتے اور اگلے دن بھی پیتے اور اس کے بعد والی رات میں بھی پیتے اور اس کے اگلے دن عصر تک بھی پیتے رہتے اگر کوئی چیز پھر بھی بچ جاتی تو خادم کو پلا دیتے یا اس کے بارے میں حکم دیتے تو اسے گرا دیا جاتا۔

مثلاً اگر جمعہ کے دن شام کو نبیذ بنانے کے لئے مشکیزے میں کھجوریں وغیرہ ڈالی گئیں تو آپ ہفتے کے دن صبح کو بھی پیتے تھے اور ہفتے کی شام کو بھی پیتے تھے اور اتوار کو پیتے رہتے تھے اور پیر کے دن عصر تک اس میں سے پیتے رہتے تھے اگر تو ختم ہو جاتا تو ٹھیک ہے اگر تیسرے دن عصر کے بعد بھی کچھ بچ جاتا تو یا تو اپنے کسی خادم کو پلا دیتے یا اسے گرانے کا حکم دے دیتے جب کہ اس میں نشہ آچکا ہوتا یا نشہ آنے کا ظن غالب ہوتا اور خادم کو پلاتے جب کہ اس میں نشے کا قوی احتمال نہ ہوتا۔

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حدیث بظاہر پچھلی حدیث کے خلاف ہے کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ اگر صبح کو نبیذ بنانے کے لئے پانی میں کھجوریں وغیرہ ڈالی جاتی تو شام تک آپ اسے نوش فرما لیتے اور اگر رات کو ڈالی جاتی تھیں تو اگلے دن صبح تک اسے نوش فرما لیتے یعنی زیادہ سے زیادہ ایک دن استعمال فرماتے جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ تین دن تک اسے استعمال فرما لیتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں مختلف موسموں کے بارے میں ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث گرمی کے موسم کے بارے میں ہے، گرمی کے موسم میں کھجوریں وغیرہ ڈالنے کے بعد جھاگ وغیرہ جلدی پیدا ہو جاتی تھی اور نشے کا امکان بھی جلدی ہوتا ہے اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختصر وقت میں اسے ختم فرما لیتے تھے، اس کے بعد اسے نہیں پیتے تھے اور سردیوں کے موسم میں کھجور کا اثر پانی میں ذرا دیر سے آتا ہے اس میں جھاگ وغیرہ بھی دیر سے پیدا ہوتی ہے اور نشے کا احتمال بھی دیر سے پیدا ہوتا ہے اس لئے سردی کے موسم میں تیسرے دن عصر تک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پی لیتے تھے لیکن اس کے بعد اگر بچ جاتا تھا تو اپنے خادم کو پلا دیتے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو چیز خود کو پسند نہیں ہے اسے اپنے خادم کو کیوں پلاتے تھے یہ اس اصول

کے خلاف ہے کہ مسلمان کو چاہئے کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ خادم کو اس صورت میں پلاتے تھے جب کہ اس میں نشے کا احتمال ہوتا تھا لیکن بہت کم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ نشے کے معمولی احتمال سے بھی بچتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس معاملے میں امتی آپ کی طرح نہیں ہو سکتے۔اس لئے نشے کے احتمال سے جس چیز سے آپ بچنا چاہتے تھے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایک امتی کے لئے بھی اس سے بچنا ضروری ہو اس لئے ایسی صورت میں آپ کسی اور کو پلا دیتے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو چیز خود استعمال نہ کرنی ہو وہ دوسروں دینا مطلقاً ناپسندیدہ نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ اگر دوسرے کو دے رہا ہے دوسرے کی تحقیر کی وجہ سے تو یہ برا ہے لیکن اگر دوسرے کو وہ چیز دے رہا ہے اضاعتِ مال سے بچنے کے لئے کہ طے شدہ ہے کہ خود اسے استعمال نہیں کروں گا، اب اگر دوسرے کو نہیں دیتا تو وہ چیز ضائع ہو جائے گی اس صورت میں دوسرے کو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ مقصود دوسرے کی تحقیر نہیں بلکہ مال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ عصر تک تو پیتے رہتے تھے لیکن عصر کے بعد خود نہیں پینا چاہتے تھے، ضروری نہیں کہ ہر وقت آدمی کی طبیعت میں کسی چیز کے پینے کا تحمل ہو اب اگر کسی کو دے دیں گے تو وہ چیز استعمال میں آجائے گی، ضائع ہونے سے بچ جائے گی لیکن اگر کسی اور کو بھی پینے کے لئے بھی نہیں دیں گے، خود بھی نہیں پئیں گے ظاہر ہے کہ پڑے پڑے خراب ہو جائے گی، تو خراب ہونے سے بہتر ہے کہ کسی اور کو پلا دی جائے۔

(٤)-----وعن جابر، قال: كانَ يُنبذُ لرسول الله صلى الله عليه وسلم في سِقائِه، فإذا لم يجدوا سقاء يُـنـبذُ له في تَورٍ من حجارةٍ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک مشکیزے میں نبیذ بنایا جاتا تھا اور جب مشکیزہ نہیں پاتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پتھروں کے ایک برتن میں نبیذ بنایا جاتا تھا۔

(٥)-----وعن ابن عمر: انَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الدُّبـاءِ، والحَـنَـتمِ، والمزفتِ، والنَّقيرِ، وأمرَ أن يُنبذَ في أسقيةِ الأدَم۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کدو کے بنے ہوئے برتن سے اور روغنی مٹکے سے اور تار کول لگے ہوئے برتن سے اور لکڑی کرید کر بنائے ہوئے برتن سے اور آپ نے حکم دیا کہ چمڑے کے مشکیزوں میں نبیذ بنایا جائے۔

(٦)-----وعن بُريدةَ، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: نهيتُكم عنِ الظروفِ، فإنَّ ظرفاً لا يُحِلُّ سشيئاً ولا يُحرِّمُه، وكل مُسكرٍ حرامٌ، وفي رواية: قال: نهيتُكم عنِ الأشربةِ إلّا في ظروفِ الأَدَمِ، فاشربوا في كلِّ وعاء غيرَ أن لا تشربوا مُسكراً۔ (رواه مسلم)

ترجمہ...... حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں خاص برتنوں سے منع کیا تھا لیکن کوئی برتن کسی چیز کو حلال نہیں کرتا اور نہ اسے حرام کرتا ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں پینے کی چیزوں سے منع کیا تھا سوائے ان کے جو کہ چمڑے کے برتنوں میں ہو لیکن اب ہر برتن میں پی لیا کرو لیکن نشہ آور چیز نہ پیا کرو۔

چار برتنوں سے نبی کریم ﷺ نے نہی فرمائی، یہ نہی آپ نے ان سے اس لئے فرمائی تھی کہ ان کے اندر نبیذ بنائے جانے کی صورت میں جلدی نشہ پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور وہ وقت ایسا تھا کہ شراب کی حرمت نئی نئی نازل ہوئی تھی اس لئے شراب کی قباحت اور نشے کی برائی ذہنوں میں پورے طور پر بیٹھی نہیں تھی اس لئے سب لوگ اس معاملے میں احتیاط کے عادی نہیں تھے اس لئے آپ نے سد اللذریعہ یہ فرمادیا کہ ان برتنوں کے اندر نبیذ بنایا ہی نہ جائے، اصل قباحت برتنوں کے اندر نہیں تھی بلکہ اصل مقصود نشے سے روکنا تھا یہ برتن چونکہ اس کا ذریعہ بن سکتے تھے اس لئے آپ نے ان برتنوں سے بھی منع فرمادیا لیکن جب شراب اور نشے کی قباحت ذہنوں میں اچھے طریقے سے بیٹھ گئی اور لوگوں سے یہ توقع پیدا ہوگئی کہ نشے کے معاملے میں وہ احتیاط سے کام لیں گے تو آپ نے فرمایا: برتنوں کے اندر بذات خود قباحت نہیں ہے جو منع کیا تھا وہ میں نے نشے کی وجہ سے منع کیا تھا لہٰذا تم ان برتنوں کو بے شک استعمال کرلو لیکن نشے سے بچنے کی کوشش کرو، احتیاط کرو کہ نشہ آنے سے پہلے پہلے اسے استعمال کرلو۔[1]

سد ذریعہ کا اصول:-

اس سے دو باتیں سمجھ میں آئیں ایک تو یہ کہ بعض کام فی نفسہٖ جائز ہوتے ہیں لیکن اگر وہ کسی ناجائز کا ذریعہ بن رہے ہوں تو ان سے منع کردیا جاتا ہے جس کو سد ذریعہ کہا جاتا ہے اور یہ شریعت کا ایک مستقل باب ہے کہ ایسا کام جو کسی ناجائز کا ذریعہ بن رہا ہے اس سے منع کردیا جاتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس جائز

(۱) فتح الباری کتاب الاشربہ باب ترخیص النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الاوعیہ والظروف بعد النہی ج ۱۰/ ص ۷۴

کام کی وجہ سے ناجائز کام کے ترتب کا واضح امکان ہو کہ اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہو کہ جو آدمی یہ جائز کام کرے گا وہ اس ناجائز کام میں بھی مبتلا ہو ہی جائے گا تو ایسی صورت میں صرف اس ناجائز کام سے ہی منع نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا ذریعہ بننے والے جائز کام سے بھی منع کر دیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھ میں آئی کہ سد أللذریعہ کسی چیز سے صرف اس صورت میں منع کرنا چاہئے جب کہ واقعتاً اس کی ضرورت ہو لیکن جہاں اس کی ضرورت نہ ہو وہاں سد أللذریعہ منع نہیں کرنا چاہئے، جہاں اس پر مفاسد کے ترتب کا امکان تو ہو لیکن یہ امکان بہت زیادہ نہ ہو تو وہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس مفسدے سے بچو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کے ذریعے سے بچو یعنی یہ جائز کام تو کرلو لیکن اس جائز کام پر اس ناجائز کا ترتب ہو سکتا ہے اس سے بچنے کی کوشش کرو جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں فرمایا کہ بعد میں آپ نے یہ فرمایا کہ اگرچہ ان برتنوں کی وجہ سے نشہ پیدا ہونے کا امکان ہے یہ برتن نشے کا ذریعہ بن سکتے ہیں پھر بھی تم ان برتنوں کو استعمال کر سکتے ہو لیکن نشے سے بچنے کی کوشش کرو۔

(۷)-----عن أبی مالك الأشعری، أنّه سمِعَ رسول الله ﷺ یقول: لَیشربَنَّ ناسٌ من امَّتی الخمرَ، یسمونها بغیرِ اسمِها۔ (رواه أبو داؤد و ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے کچھ لوگ شراب پئیں گے لیکن اس کا نام کچھ اور رکھیں گے۔

(۸)-----عن عبد الله بن أبی أوفی، قال: نهی رسول الله ﷺ عن نَبیذِ الجَرِّ الأخضرِ قلتُ: أنشربُ فی الأبیضِ؟ قال: لا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سبز مٹکے کے نبیذ سے منع فرمایا تو میں نے کہا کیا ہم سفید کے اندر پی لیا کریں تو آپ نے فرمایا کہ نہیں۔

حضور ﷺ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ سبز مٹکے کے اندر جو نبیذ بنتا ہے وہ نہ پیو، اصل مقصود آپ ﷺ کا روغنی مٹکے سے منع کرنا تھا جس پر روغن کیا گیا ہو کیوں کہ اس کے مسامات بند ہو جاتے ہیں لیکن عام طور اس زمانے میں روغن سبز رنگ کا کیا جاتا تھا اس لئے آپ نے سبز مٹکے کا ذکر فرمادیا۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شبہ ہوا کہ شاید سبز رنگ کی قید احترازی ہے اس لئے مٹکے پر اگر کسی اور رنگ کا روغن کیا ہوا ہو تو اس میں نبیذ بنانا جائز ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اور رنگوں کا بھی یہی حکم ہے کہ یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ یہ حکم ابتداء میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اب حکم یہ ہے کہ کسی بھی برتن کے اندر نبیذ بنا سکتے ہیں البتہ یہ احتیاط ضروری ہے کہ نشہ نہ آئے۔

باب تغطية الأواني وغيرها

برتن وغیرہ کوڈھانپنے کا باب

الفصل الاوّل

(۱)-----عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا كانَ جنحُ الليلِ أو أمسيتُم فكفُّوا صِبيانَكم، فإنَّ الشيطانَ ينتشرُ حينئذٍ، فإذا ذهبَ ساعةٌ منَ الليلِ فخلوهُم وأغلِقوا الأبوابَ وأذكروا اسمَ اللهِ، فإنَّ الشيطانَ لا يفتَحُ باباً مُغلَقاً، وأو كواقِربَكم واذكروا اسمَ اللهِ، وَخمِروا آنيتكم واذكروا اسمَ اللهِ، ولوأن تعرِضوا عايهِ شيئاً، وأطفِئوا مصابيحَكم۔ (متفق عليه)

وفي رواية للبخارى، قال: خمِروا الآنيةَ، وأوكوا الأسقيَةَ، وأجيفوا الأبوابَ، واكفِتوا صِبيانَكم عندَا المساءِ، فإنَّ للجنِّ انتشارا وخَطفةً، وأطفِئوا المصابيحَ عندَالرقادِ، فإنَّ الفُوَيسقةَ ربما اجترَّتِ الفتيلَةَ فأحرقت أهلَ البيتِ۔

وفي رواية لمسلمٍ، قال: غَطوا الاناءَ، وأوكوا السِقاءَ، وأغلقوا الأبوابَ، وأطفِئوا السِراجَ، فإنَّ الشيطانَ لا يَحُلُّ سقاءً، ولا يفتَحُ باباً، ولا يكشِفُ إناءً فان لم يجد أحدُكم إلّا أن يعرِضَ على إنائِه عوداً ويذكرَ اسمَ اللهِ فليفعَل، فانَّ الفُوَيسقةَ تضرُم على أهلِ البيتِ بيتهم۔

وفي رواية له، قال: لا ترسِلوا فَواشِيَكم وصِبيانَكم إذا غابتِ الشَّمسُ حتى تذهبَ فحمةُ العشاءِ، فانَّ الشيطانَ يُبعثُ إذا غابتِ الشمسُ حتى تذهبَ فحمةُ العشاءِ۔

وفي رواية له، قال: غَطوا الإناءَ، وأوكوا السقاءَ، فانَّ في السَّنةِ ليلةً بنزلُ فيها وَباءٌ لايَمر باناء ليسَ عليهِ غطاءٌ أوسقاء ليسَ عليهِ وِكاءٌ إلّا نزلَ فيهِ من ذلكَ الوَباءِ۔

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب رات کا ابتدائی حصہ ہو یا یوں فرمایا کہ جب شام کا وقت ہو تو اپنے بچوں کو باہر جانے

سے روک لیا کرو اس لئے کہ اس وقت شیطان پھیل جاتے ہیں اور جب رات کی ایک گھڑی چلی جائے تو بچوں کو چھوڑ دو یعنی انہیں باہر جانے کی اجازت دے دو اور دروازے بند کر لیا کرو اور اللہ کا نام لے لیا کرو اس لئے کہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھولتا اور اپنے مشکیزوں کو ڈھکن لگا دیا کرو اور اللہ کا نام لے لیا کرو اور اپنے برتنوں کو ڈھانپ لیا کرو اور اللہ کا نام لے لیا کرو اگرچہ تم ان پر چوڑائی کے بل ہی کوئی چیز رکھو اور اپنے چراغ بجھا دیا کرو، یہ تو بخاری اور مسلم کی روایت ہے اور بخاری کی ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ برتنوں کو ڈھانپ دیا کرو اور مشکیزوں کو ڈھکن لگا دیا کرو اور دروازے بند کر دیا کرو اور اپنے بچوں کو شام کے وقت روک لیا کرو اس لئے کہ جنات کے لئے پھیلنا اور اچکنا ہوتا ہے اور سوتے وقت چراغوں کو بجھا دیا کرو اس لئے کہ چھوٹا سا شرارتی جانور (چوہا) بعض اوقات بتی کو کھینچتا ہے اور گھر والوں کو جلا دیتا ہے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ برتن ڈھانپ دیا کرو اور مشکیزوں پر ڈھکن لگا دیا کرو اور دروزاے بند کر دیا کرو اور چراغ بجھا دیا کرو اس لئے کہ شیطان کسی مشکیزے کو کھولتا نہیں ہے اور نہ ہی بند دروازے کو کھولتا ہے اور نہ ہی ڈھکے ہوئے برتن سے پردہ ہٹاتا ہے، اگر تم میں کوئی آدمی کوئی چیز نہ پائے سوائے یہ کہ اپنے برتن پر چوڑائی کے بل ایک لکڑی رکھ دے اور اس پر اللہ کا نام لے لے تو وہ ایسا ہی کرے اس لئے کہ چوہا بعض اوقات گھر والوں سمیت گھر کو جلا دیتا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب سورج غروب ہو جائے تو اپنے بچوں کو اور اپنے چوپاؤں کو باہر نہ نکلنے دیا کرو یہاں تک کہ عشاء کے وقت کی تاریکی چلی جائے اس لئے کہ شیطانوں کو بھیجا جاتا ہے جب کہ سورج غروب ہوتا ہے یہاں تک کہ اول شب کی تاریکی چلی جائے اور ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ برتنوں کو ڈھانپ دیا کرو اور مشکیزوں کو ڈھکن لگا دیا کرو اس لئے کہ سال کے اندر ایک رات ایسی ہوتی ہے کہ جس میں ایسی وباء اترتی ہے کہ وہ جس برتن سے بھی گزرتی ہے جس پر ڈھکن نہ ہو یا کسی ایسے مشکیزے پر سے گزرتی ہے جس پر ڈھکن نہ ہو تو اس وباء کا کچھ حصہ اس میں ضرور نازل ہوتا ہے۔

غروب شمس کے بعد بچوں اور جانوروں کو باہر نکالنے کی حیثیت:-

اس حدیث میں رات کے وقت کے کئی آداب بیان کئے گئے ہیں، سب سے پہلا ادب تو یہ بیان فرمایا

کہ جب سورج غروب ہو جائے تو اپنے بچوں اور چوپاؤں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دو اس کی وجہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی کہ اس وقت عام طور پر شیطان پھیلے ہوئے ہوتے ہیں یعنی وہ وقت ایسا ہے جس میں شیطانی اثرات غالب ہوتے ہیں لہٰذا بچے یا چوپائے گھر سے باہر نکلیں گے تو وہ بھی شیطانی اثرات کو قبول کریں گے، باہر نکلنے کا حکم کب تک ہے اس میں حدیث میں اتنی بات آئی کہ **اذا ذهبت ساعة من الليل** کہ اول شب میں تو انہیں نکلنے سے روکا جائے لیکن جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو پھر انہیں باہر نکلنے کی اجازت دی جاسکتی ہے ساعۃ اللیل کا مصداق کیا ہے، کتنا وقت مراد ہے، اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حتی تذہب فحمۃ العشاء یہاں تک کہ فحمۃ العشاء ختم ہو جائے۔ فحمہ اصل میں کہتے ہیں عشاء کے وقت تک جو رات کی تاریکی ہوتی ہے یعنی رات کی ابتدائی تاریکی جو غروب شفق تک رہتی ہے، غروب شفق سے لے کر نصف شب تک جو رات کی تاریکی ہوتی ہے اس کو عسعسہ کہا جاتا ہے۔ تو فحمہ کا اطلاق اس تاریکی پر ہوتا ہے جو غروب شفق تک ہوتی ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ بچوں اور مویشیوں کو گھر سے نہ نکلنے کا حکم غروب شفق تک ہے، غروب شفق کے بعد اگر ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دے دی جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

رات کو سوتے وقت دروازے بند کرنا:۔

دوسرا ادب یہ بیان فرمایا کہ رات کو سوتے وقت دروازے بند کر لیا کرو اور دروازے بند کرتے وقت اللہ کا نام بھی لے لیا کرو اس میں دو فائدے ہیں، ایک فائدہ تو یہ ہے کہ بہت سارے حسی نقصانات سے انسان بچ جاتا ہے، رات کے وقت چور وغیرہ آسانی سے داخل نہیں ہو سکتے، اسی طرح جو دروازہ کھلا ہو گا تو کتے یا اس قسم کے جانور گھر میں آسکتے ہیں جب دروازہ بند ہو گا تو وہ گھر میں نہیں آئیں گے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ باطنی اور معنوی نقصانات سے بھی بچاؤ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایسا گھر رات کے وقت شیطانی اثرات سے محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن مجموعہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا فائدہ تو مطلقاً حاصل ہو سکتا ہے لیکن دوسرا فائدہ تب حاصل ہو گا جب کہ دروازہ بند کرتے وقت اللہ کا نام بھی لے لیا جائے۔

برتنوں کو ڈھانپنے کا حکم:۔

تیسرا ادب بیان فرمایا کہ رات کو سوتے وقت برتنوں کو ڈھانپ دیا کرو اور مشکیزے وغیرہ پر بھی ڈھکن لگا دیا کرو، اس میں بھی کئی فوائد ہیں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اگر برتن کھلے ہوئے ہوں گے یا مشکیزہ کھلا ہوا

ہو گا تورات کے وقت کوئی نقصان دہ اور زہریلی چیز اپنے مضر اور زہریلے اثرات اس میں ڈال سکتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر برتن کھلے ہوئے ہوں گے تو ان میں رات کے وقت شیطانی اثرات بھی منتقل ہو سکتے ہیں لیکن جب انہیں ڈھانپ لیا جائے گا تو وہ برتن شیطانی اثرات سے محفوظ ہو جائے گا لیکن بظاہر یہ فائدہ تب حاصل ہو گا جب کہ اللہ کا نام بھی لے لیا جائے گا، اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو پھر یہ فائدہ حاصل نہیں ہو گا اس فائدے کے حصول کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر برتن ڈھانپنے کے لئے ایسی کوئی چیز نہ ملے جس سے پورا برتن ڈھانپا جاسکے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ برتن کو اللہ کا نام لے کر اوندھا کر دو اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو کوئی لکڑی وغیرہ معمولی چیز اس پر رکھ دو اور اس پر اللہ کا نام لے دو۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لکڑی وغیرہ سے وہ برتن پوری طرح پر چھپے گا تو نہیں اس لئے جو حسی نقصانات ہیں ان سے بچاؤ نہیں ہو گا، حسی طور پر اگر ان میں کوئی چیز پڑنی ہو گی تو وہ اس میں پڑ ہی جائے گی جو بچاؤ ہو گا وہ شیطانی اثرات سے ہو گا اور شیطانی اثرات سے بچاؤ اصل میں برتن کے ڈھانپنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سے بچاؤ تو اللہ کا نام لینے کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اس پر لکڑی وغیرہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے محض اللہ کا نام لینا ہی کافی ہونا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اصل میں تو جو شیطان سے حفاظت ہو گی وہ تو اللہ کے نام کی وجہ سے ہو گی لیکن اس پر لکڑی اگر رکھی ہوئی ہو گی تو اس کو دیکھ کر شیطان دور سے دیکھ کر ہی پہچان لے گا کہ اس برتن پر اللہ کا نام لیا ہوا ہے اس لئے وہ اس کے قریب بھی نہیں آئے گا تو لکڑی رکھنا گویا شیطان کے لئے ایک علامت ہے۔ (۱)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اصل میں جو شیطانی اثرات سے حفاظت ہو گی وہ تو اللہ کا نام لینے کی وجہ سے ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے اس لئے جو کام بظاہر اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں اور محض کسی برکت کی وجہ سے ہوتے ہیں ان میں بھی اسباب کا کسی نہ کسی درجے میں تلوث ضرور ہوتا ہے۔ کام ہوتا تو محض برکت کے نتیجے میں ہے لیکن خالص برکت نہیں ہوتی بلکہ اسباب کی اس میں تھوڑی سی حرکت بھی ہوتی ہے اس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک مرتبہ مہمان کے طور پر ٹھہرا ہوا تھا تو آپ نے ہمیں یہ کہہ رکھا تھا کہ بکری کا دودھ نکال لیا کرو اور اپنے حصے کا دودھ پی لیا کرو اور میرے حصے کا دودھ رکھ لیا کرو جب میں رات کو آیا کروں گا تو پی لیا کروں گا، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی تو حضرت مقداد نے سوچا کہ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آج کسی کے ہاں مہمان ہوں گے اس لئے کھانا بھی کہیں کھالیا ہو گا یہ سوچ کر

(۱) فتح الباری کتاب الاشربہ باب شرب اللبن ج۱۰/ص ۵۹، ایضاً فتح الباری کتاب الاستیذان باب غلق الابواب بالليل ج۱۱/ص ۷۳

آپ کے حصے کا جو دودھ رکھا ہوا تھا وہ بھی اٹھا کر پی لیا، تھوڑی دیر بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ مانگا، حضرت مقداد کہتے ہیں کہ میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اب پتہ چلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا جب حضرت مقداد نے پوری بات بتائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا بلکہ مصلے کی طرف تشریف لے گئے اور نماز پڑھی اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری کی طرف گئے تو خلاف معمول اور خلاف عادت بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا دودھ نکالا اور اسے تناول فرمایا۔ تو یہاں دیکھئے اصل میں دودھ ملا ہے دعا کی برکت سے، اصل میں تو یہ خالص برکت ہے لیکن برکت یوں بھی تو ہو سکتی تھی یا منجانب اللہ مدد یوں بھی ہو سکتی تھی کہ سیدھا آپ کے پاس کوئی دودھ کا پیالہ پہنچ جاتا، آپ کے سامنے رکھا ہوا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا، کام محض اللہ کی نصرت سے ہوا ہے لیکن تھوڑا سا اسباب کا بھی اس میں تلوث ہے کہ آپ کو اٹھ کر بکری کے پاس جانا پڑا، بکری کا دودھ نکالنا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ سفر میں تھے پانی ختم ہو گیا سارے قافلے والے پریشان ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دو صحابیوں کو حکم دیا کہ کہیں سے پانی ڈھونڈ کر لاؤ، ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ایک عورت مشکیزے میں پانی بھر کر اپنی اونٹنی پر لاد کر لے جا رہی تھی اس سے کہا کہ ہمیں تھوڑا سا پانی دے دو اس عورت نے انکار کر دیا، تو یہ عورت کو گرفتار کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکیزے میں سے تھوڑا سا پانی نکالا اور اس میں برکت کی دعا فرمائی اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس سے اپنے برتن وغیرہ بھر لو تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس میں سے اپنے برتن بھی بھرنے شروع کر دیئے اور اپنے مشکیزے بھی بھرنے شروع کر دیئے، وضو وغیرہ بھی کیا لیکن مشکیزہ ویسا کا ویسا ہی رہا بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ اس میں پانی پہلے سے زائد ہے تو یہ جو پانی کے اندر برکت ظاہر ہوئی یہ خلاف عادت ہے لیکن اس میں اسباب کا تھوڑا سا واسطہ ضرور آ گیا یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ویسے ہی کہیں سے پانی نکل آتا برکت تو ویسے بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں ہے بلکہ ابتداء میں تھوڑا سا پانی ڈھونڈنا پڑا ہے پھر اس میں مزید برکت ہو گئی۔ (۱)

حدیبیہ کے موقع پر پانی کی قلت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تھوڑا بہت پانی اگر کسی کے پاس ہو تو لے آئے تو بہت تھوڑا سا پانی مشکیزوں کے اندر سے ملا اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں ڈالیں تو صحابہ نے دیکھا کہ آپ کی انگلیوں سے پانی نکل رہا تھا تو صحابہؓ نے وضو وغیرہ بھی کیا

(۱) مشکاۃ المصابیح باب فی المعجزات الفصل الاول ج ۲/ ص ۵۳۳

تمام برتن بھی بھرے اور اپنے مشکیزے وغیرہ بھی بھرے۔[۱]

یہاں ہے تو اللہ کی طرف سے نصرت اور مدد اور معاملہ اسباب سے بالاتر ہے لیکن کچھ نہ کچھ اسباب کا دخل اس میں بھی آ گیا یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ابتداءً آپ کی انگلیوں سے پانی نکل آتا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ کچھ پانی ڈھونڈا گیا اس میں آپ نے اپنی انگلیاں ڈالیں، گیلی کیں پھر اس سے پانی نکل آیا تو یہ دار الاسباب ہے اس میں اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ جو کام اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں اور اللہ کی نصرت اور مدد کے طور پر ہوتے ہیں ان میں بھی کسی نہ کسی درجے میں اسباب کا دخل ہوتا ہے اگرچہ بہت معمولی سا ہو۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے کہ لکڑی رکھنے کی وجہ سے جو شیطانی اثرات تھے ان سے طہارت ہو گئی وہ تو محض اللہ کے نام کی برکت سے ہو گی لیکن اس میں اسباب کا بھی تھوڑا سا دخل ہے۔ کامل درجے کا سبب تو یہ تھا کہ کامل طور پر برتن کو ڈھانپ لیا جاتا لیکن اگر اتنا نہیں ہو سکتا تو آپ نے فرمایا کہ جتنا تم سے ممکن ہے اتنا کر لو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے لو، تمہارے بس میں جو کچھ تھا وہ تم نے کر لیا ہے باقی اللہ کے نام کی برکت ہو جائے گی اس سے ایک اور سوال کا جواب بھی ہو گیا۔

سوال...... سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دروازہ رات کو بند کر دیا کرو اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ شیطان کسی بند دروازے کو نہیں کھولتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دروازے سے ہی آئے وہ تو اوپر سے بھی آ سکتا ہے؟

جواب...... تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ نتیجہ محض دروازے کے بند ہونے کا نہیں ہے بلکہ بند کرتے وقت اللہ کا نام لینے کا نتیجہ ہے، اللہ کا نام لے کر دروازہ بند کیا جاتا ہے تو شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا نہ دروازے سے اور نہ ہی کسی اور راستے سے چنانچہ مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ ایسی صورت میں دیوار پھلانگنے سے بھی روک دیا جاتا ہے، اب اس جگہ شیطانوں کا رکنا یہ تو اللہ کے نام کی برکت سے ہوا تو پھر دروازہ بند کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑا۔ اس کا جواب وہی ہے کہ دروازہ بند کرنا ہمارے بس میں ہے اور اپنے بس کی حد تک انسان نے سبب اختیار کر لیا اور اللہ کا نام لے لیا تو اب آگے اللہ کے نام کی برکت ظاہر ہو گی۔[۲]

تیسری وجہ رات کو برتنوں کو ڈھانکنے اور مشکیزوں پر ڈھکن لگانے کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سال بھر میں ایک غیر متعین رات ہے اس میں کوئی وباء نازل ہوتی ہے اور جو بھی برتن رات کو کھلا ہوا ہوتا ہے اس میں اس وباء کا کچھ نہ کچھ اثر آ جاتا ہے، اب یہ رات کون سی ہے آنحضرت صلی اللہ

---

(۱) مشکاۃ المصابیح باب فی المعجزات ج ۲/ ص ۵۳۲، ایضاً صحیح بخاری مع فتح الباری کتاب الاشربۃ باب شرب البرکۃ والماء المبارک ج ۱۰/ ص ۸۳

(۲) اوجز المسالک الی موطا امام مالک جامع ما جاء فی الطعام والشراب ج ۱۴/ ص ۲۹۲

علیہ وسلم نے اس کی تعیین نہیں فرمائی اگر تو رات متعین ہوتی تو پھر اس متعین رات میں برتن ڈھانپ لیتے، باقی راتوں کے اندر وباء سے بچنے کے لئے برتن ڈھانپنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن چونکہ رات غیر متعین ہے اس لئے ہر رات میں یہ احتمال ہے کہ یہ وبائی رات ہو اس لئے آپ نے فرمایا کہ یہ روزانہ کا معمول بنالو کہ رات کو برتن وغیرہ ڈھانپ دیا کرو۔(۱)

اب اطباء یا سائنسدان کہیں گے کہ ہمارے تجربے میں کوئی ایسی رات نہیں آئی جس میں اس طرح کی کوئی وباء نازل ہوتی ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ عدم علم، علم عدم کو مستلزم نہیں۔ جو چیز ہمارے تجربے اور مشاہدے میں نہیں آئی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم یقینی طور پر فیصلہ کرلیں کہ یہ ہے ہی نہیں، آخر اس وقت کے بہت سارے انکشافات ایسے ہیں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے انسان کو معلوم نہیں تھے لیکن جس وقت یہ چیزیں انسان کو معلوم نہیں تھیں اس وقت وہ موجود تھی لیکن ہمیں پتہ نہیں چلا تھا کچھ عرصہ پہلے امریکہ کا کسی کو پتہ نہیں تھا لیکن آج سب کو پتہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس وقت امریکہ نہیں تھا تو معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہ آئی ہو لیکن اس کے باوجود موجود ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ فرمادیا ہے اور فی نفسہ ممکن ہے اس لئے اس کو ماننا ضروری ہے۔

چوتھا ادب یہ بیان فرمایا کہ سوتے وقت چراغ بجھادیا کرو، چراغ بجھانے سے مراد یہ ہے کہ آگ بجھادیا کرو اس لئے کہ آگ کے جہاں فوائد ہیں وہیں نقصانات بھی ہیں مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مثال کے بیان فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ چوہا آئے ویسے بھی سوتی چیز کو جلدی کاٹتا ہے، سوتی کپڑوں کو اور سوتی دھاگوں کو اور چراغ کی بتی عام طور پر سوت کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور اس میں چکنائی بھی لگی ہوئی ہوتی ہے تو اس کے لئے اس میں اور زیادہ کشش پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وہ آگے پھینک دے گا، جاگتے ہوئے ایسا ممکن ہے بلکہ جاگتے ہوئے ایسا واقعہ پیش بھی آیا لیکن جاگتے ہوئے اتنا ضرور ہے کہ فوری طور پر انسان کو پتہ چل جاتا ہے اور آگ پر قابو پالیتا ہے لیکن سوتے ہوئے ممکن ہے کہ وہ آگ اتنی پھیل چکی ہو اور پتہ ایسے وقت چلے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے اور بہت سارا نقصان ہو چکا ہو اس لئے آپ نے فرمایا چراغ یا آگ کی کوئی بھی چیز ہو اسے بجھا دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم چراغ وغیرہ کا بھی ہے اور آگ کی باقی چیزوں کا بھی ہے۔ گیس کا ہیٹر یا ایسی کوئی بھی چیز اس کو بجھا کر سوئیں اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روشنی کے وہ ذرائع جو آگ سے نہیں جلتے بلکہ بجلی وغیرہ سے جلتے ہیں تو اس میں چونکہ اس طرح کے نقصانات کا احتمال نہیں ہے اس لئے اس کے تحت یہ نہیں آئے گا اور اس ادب کی بنیاد پر یہ بجھانا ضروری نہیں ہے ہاں البتہ بہت ساری صورتوں میں رات کے

---

(۱) اوجز المسالک الی موطا امام مالک جامع ماجاء فی الطعام والشراب ج ۱۴/ ص ۲۹۰

وقت اس طرح کی بتیوں کا جلتا رہنا فضول خرچی میں داخل ہوتا ہے اس کی وجہ سے ممنوع ہونا اور بات ہے۔

(۲)-----وعنه قال: جاءَ أبو حُمَيد رجلٌ منَ الأنصارِ منَ النَّقيعِ باناء من لبن إلى النبى صلى الله عليه وسلم ، فقال النبى صلى الله عليه وسلم: ألَّا خَمَّرتَه ولو أن تعرِضَ عليهِ عودا۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... ابوحمید انصاریؓ ایک برتن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اسے ڈھانپ کیوں نہ لیا اگرچہ اس پر چوڑائی کے بل کوئی لکڑی ہی رکھ لیتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کھانے پینے کی کوئی چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لے کے جانی ہو تو وہ ننگی نہیں لے جانی چاہئے بلکہ اسے ڈھانک کر لے جانا چاہئے۔

(۳)-----وعن ابن عمر، عن النبى صلى الله عليه وسلم، قال لا تتركوا النَّارَ فى بيوتكم حينَ تنامونَ۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے گھروں کے اندر سوتے وقت آگ کو نہ چھوڑا کرو۔

(٤)-----وعن أبى موسى، قال: احترقَ بيتٌ بالمدينةِ على أهلِه منَ الليلِ، فحُدِّثَ بشأنِه النبى صلى الله عليه وسلم، قال: إنَّ هذهِ النَّارَ إنما هىَ عدُوٌّ لكم، فاذا نمتُم فأطفئوها عنكم۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینے میں رات کے وقت ایک گھر گھر والوں کا نقصان کرتے ہو جل گیا تو اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ آگ تو تمہاری دشمن ہے لہٰذا جب تم سونے لگو تو اس کو بجھا دیا کرو۔

(٥)-----عن جابر، قال: سمعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يقول: إذا سمعتم نُباحَ الكلاب ونهيقَ الحميرِ من الليلِ فتعوَّذوا باللهِ من الشيطانِ الرجيم، فإنهنَّ يرينَ ما لا ترونَ وأقِلوا الخروجَ إذا هداتِ الأرجُلُ، فانَّ الله عزَّوجلَّ يبُثُ من خلقِه فى ليلتِه مايشاء وأجيفوا الأبوابَ، واذكروا اسم الله عليه، فإنَّ الشيطانَ لا يَفتح باباً إذا اجيف وذُكر اسم الله عليه وغطوا

الجِرَارَ، وأكفئوا الآنيةَ، وأوكوا القِربَ رواه في شرح السنة۔

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رات کو جب تم کتوں کے بھونکنے کی اور گدھوں کے ہنہنانے کی آواز سنو تو اللہ کی شیطان مردود سے پناہ مانگو اس لئے کہ یہ جانور ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو تم نہیں دیکھتے اور جب پاؤں رک جائیں (یعنی چلنا پھرنا رک جائے) تو نکلنا کم کردو اس لئے کہ اللہ جل جلالہ رات میں اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتے ہیں پھیلا دیتے ہیں اور دروازے بند کرلیا کرو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اس لئے کہ شیطان کسی دروازے کو نہیں کھولتا جب کہ اس کو بند کردیا گیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو اور مٹکوں کو ڈھانپ دیا کرو اور برتنوں کو اوندھا کردیا کرو اور مشکیزوں کے ڈھکن لگادیا کرو۔

برتنوں کو اوندھا کرنے کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ اس کے ڈھانپنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ ہو اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کتوں کے بھونکنے کی یا گدھے کے ہنہنانے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو یعنی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ لو اس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ان جانوروں کو ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آتیں بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہنہناتا ہے اسی طرح کتا شیطان کو دیکھ کر بھونکتا ہے تو کتے کے بھونکنے اور گدھے کے ہنہنانے کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت یہاں پر شیطان موجود ہے اور ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اس کے برے اثرات سے محفوظ رہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ لیا کرو۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہنہناتا ہے اسی طرح کتا شیطان کو دیکھ کر بھونکتا ہے تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تو واقعتاً ایسا ہی ہے البتہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ گدھا جب بھی ہنہناتا ہے تو وہ شیطان کو دیکھ کر ہنہناتا ہے بلکہ یہ اس کے بھونکنے یا ہنہنانے کا ایک سبب ہے، اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہوسکتے ہیں مثلاً کتا اس لئے بھونک رہا ہے کہ کوئی اجنبی شخص اس کے دروازے کے پاس آگیا ہے یا اس لئے بھونک رہا ہے کہ اس کے محلے میں کوئی نیا کتا آگیا ہے اسی طریقے سے گدھے کے ہنہنانے کے اور اسباب بھی ہوسکتے ہیں لیکن ایک سبب بہرحال شیطان کو دیکھنا ہے۔ تو اب جب کتا بھونک رہا ہے یا گدھا ہنہنا رہا ہے تو کم از کم یہ احتمال ضرور ہے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ایسا کررہا ہے اس لئے آپ نے فرمایا کہ اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو، اگر شیطان ہو تو اس کے برے اثرات سے محفوظ ہو جاؤ گے اور اگر شیطان نہ بھی ہو تو اعوذ باللہ پڑھنے کا نقصان کوئی نہیں ہے۔

رات کی تخصیص کی وجوہات:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کا ذکر کیا ہے کہ رات کے وقت جب گدھے کے ہنہنانے کی یا کتے کے بھونکنے کی آواز سنو تو اعوذ باللہ پڑھو تو یہ حکم رات کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ بات یا تو آپ نے اس لئے فرمائی کہ کتے زیادہ تر رات ہی کو بھونکتے ہیں اور گدھے بھی رات کو زیادہ ہنہناتے ہیں دن کو اول تو بھونکتے کم ہیں اور اگر بھونکیں بھی یا گدھے ہنہنائیں بھی تو دوسرے کاموں اور دوسری آوازوں کی وجہ سے بعض اوقات اس کی طرف توجہ نہیں جاتی لیکن رات کے سناٹے میں اگر کتا بھونکے تو پتہ چل جاتا ہے، اسی طریقے سے گدھا ہنہنائے تو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

اس کے علاوہ رات کی قید ذکر کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ دن کے وقت اور اسباب بھی گدھے کے ہنہنانے کے ہو سکتے ہیں جبکہ رات کے وقت ہنہنانے میں شیطانی اثرات کا امکان زیادہ ہو گا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کا وقت خصوصیت سے ذکر فرمایا۔

(٦)-----وعن ابنِ عبَّاس، قال: جاءت فأرةٌ تجر الفتيلةَ، فألقتها بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم على الخُمرةِ التى كان قاعداً عليها، فأحرقت منها مثلَ موضِع الدِّرهم فقال: إذا نِمتُم فأطفئوا سُرُجَكم، فإنَّ الشيطانَ يَدُل مثلَ هذه على هذا، فيحرقكم (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک چوہیا یا ایک چوہا (فارۃ کے دونوں معنی ہوتے ہیں) بتی کو کھینچتا ہوا لایا اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس چٹائی پر پھینک دیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے اور اس میں سے ایک درہم کی مقدار حصہ جلا دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم سونے لگو تو اپنے چراغوں کو بجھا دیا کرو اس لئے کہ شیطان اس طرح کے جانور کو اس طرح کے کام کی رہنمائی کرتا ہے اور تمہیں جلا دیتا ہے۔

کتاب اللباس

اس کتاب میں لباس کے متعلق احادیث ذکر کی جائیں گی، اسی طریقے سے زینت وغیرہ کے بارے میں بھی احادیث ذکر کی جائیں گی، گویا عنوان صرف لباس کا ہے لیکن مقصد لباس اور زینت ہے۔ لہٰذا زینت کی صورتوں کے احکام بھی بیان کریں گے مثلاً زیورات کے بارے میں کہ مرد کے لئے کون سا زیور درست ہے اور کون سا درست نہیں مثلاً انگوٹھی اور عورت کے لئے کون سا زیور درست ہے اور کون سا نہیں، اسی طریقے سے بالوں کے احکام بھی بیان کریں گے کیوں کہ ان کا تعلق بھی زینت کے ساتھ ہے، اسی طرح تصاویر کے احکام بھی بیان کئے جائیں گے کیوں کہ وہ بھی بعض اوقات زینت کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہاں لباس اور زینت دونوں کے بارے میں احادیث لائیں گے۔

احادیث کا ترجمہ کرنے سے پہلے کچھ اصولی باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

لباس قومی مسئلہ ہے یا دینی؟

سب سے بنیادی مسئلہ اور سوال یہ ہے کہ لباس انسان کا خالص تہذیبی، تمدنی، قومی مسئلہ ہے یا دینی مسئلہ ہے۔ اس میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ لباس دینی مسئلہ نہیں ہے، لباس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا لباس ہو یا بالوں کی کوئی شکل ہو یا زینت کی اور صورتیں ہوں ان میں جائز ناجائز کی بحث میں نہیں پڑا جاتا، یہ انسان کا ایک تہذیبی یا قومی مسئلہ ہے کہ جس طرح کا رسم و رواج اس علاقے میں چلتا ہے اس طرح کا لباس پہن لیں۔ جب کہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ لباس خالصتاً ایک دینی مسئلہ ہے۔ لہٰذا کس طرح کا لباس پہننا ہے اور کس طرح کا لباس نہیں پہننا یہ دین سے فیصلہ کروائیں گے۔ لیکن اصل حقیقت دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ لباس خالص تہذیبی و ثقافتی مسئلہ بھی نہیں ہے اور خالص دینی معاملہ بھی نہیں ہے بلکہ حقیقت بین بین ہے۔ یہ کہنا کہ لباس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ خالص تہذیبی و ثقافتی مسئلہ ہے یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ جب ہم قرآن و حدیث کو دیکھتے ہیں تو ہمیں لباس کے متعلق واضح ہدایات اور تعلیمات ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی لباس کا ذکر کیا اور لباس کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں:

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗا۔ (الآیۃ) [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی لباس کے متعلق بے شمار ہیں، بہت سے لباس ایسے تھے جو

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۵ رکوع نمبر ۲

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت موجود اور عرب میں مروج تھے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمادیا مثال کے طور پر مرد ریشم بھی پہن لیا کرتے تھے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو ریشم پہننے سے منع فرمادیا، مرد سونا بھی پہن لیا کرتے تھے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو سونا چاندی پہننے سے منع فرمادیا صرف خاص مقدار میں چاندی کی انگوٹھی کی اجازت دی۔ عربوں کا عام لباس ازار اور رداء تھا یعنی ایک چادر اوپر ایک چادر نیچے، نیچے والی چادر یعنی لنگی عام طور پر ٹخنوں سے نیچے رکھی جاتی تھی اور اس کو فخر کا باعث سمجھتے تھے، اپنی بڑائی اور عظمت کے اظہار کے لئے عام طور پر لنگی ٹخنوں سے نیچے رکھی جاتی تھی۔ یہ ایک رواج تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا اور بھی کئی لباس ہیں یا لباس کی کئی صورتیں ہیں جو مروج تھیں یا زینت کی صورتیں مروج تھیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمادیا۔ اگر یہ محض تہذیبی یا ثقافتی مسئلہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ یہ تو عربوں کا رسم و رواج ہے اس لئے اپنے رسم و رواج کے مطابق لباس پہنیں جو فارسیوں کا رسم و رواج ہے وہ اپنے رسم و رواج کے مطابق لباس پہنیں، شام کے لوگ اپنے رسم و رواج کے مطابق لباس پہنیں۔ اگر یہ شریعت کا مسئلہ نہ ہوتا اور لباس دینی مسئلہ نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لباسوں سے منع نہ فرماتے جو اس زمانے میں عرب کے اندر مروج تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لباس محض ایک تہذیبی اور ثقافتی مسئلہ ہے دین کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ بات غلط ہے بلکہ دین کی تعلیمات لباس کے متعلق بھی موجود ہیں۔

دوسری طرف یہ سمجھنا کہ یہ اسی طرح خالص دینی مسئلہ ہے جس طرح نماز اور عبادات خالص دینی معاملہ ہیں کہ ان میں جزئیات تک اور مکمل طریقہ مکمل شرائط و شکل کی تعیین کر دی ہے لباس کی بھی ایسی صورت حال ہے یہ کہنا بھی درست نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شریعت کا مزاج عبادت کے بارے میں اور ہے اور امور عادت کے بارے میں اور ہے۔ عادت کا معنی جو کام محض عبادت سمجھ کر نہیں کئے جاتے بلکہ جو عبادت نہیں بھی سمجھتا وہ بھی کرتا ہے، نماز وہی پڑھتا ہے جس نے عبادت کرنی ہوتی ہے چاہے رب کو راضی کرنے کے لئے پڑھنی ہو یا لوگوں کو دکھانے کے لئے لیکن کرنی عبادت ہوتی ہے۔ لیکن لباس ہر آدمی پہنتا ہے چاہے اس نے عبادت کرنی ہو یا نہ کرنی ہو، کھانا ہر آدمی کھاتا ہے مسلمان ہو یا کافر اس کے ہاں عبادت کا تصور ہو یا نہ ہو رہنا سہنا ہر آدمی اختیار کرتا ہے چاہے وہ عبادت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، یہ امور عادت ہیں جن کو فقہاء افعال حسیّہ کہتے ہیں۔ فقہاء نے افعال کی دو قسمیں بیان کی ہیں: افعال حسیّہ، افعال شرعیہ، امور عادت کے بارے میں شریعت کا انداز اور ہے اور امور عبادت میں انداز اور ہے، عبادت میں شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جزوی امور کی بھی تعیین کرتی ہے ایک لگا بندھا طریقہ سکھاتی ہے، نماز کا ایک طے شدہ طریقہ ہے، روزے کا

ایک طے شدہ طریقہ ہے، زکوٰۃ کا ایک طے شدہ طریقہ ہے اس سے اگر ہٹیں گے تو یہ عبادت صحیح طریقے سے ادا نہیں ہو گی۔ لیکن عادت میں یہ بھی نہیں کہ شریعت بالکل آزاد چھوڑ دے کہ جو مرضی کرو یہ بھی نہیں کہ ہر بات میں جزوی تعینات کر دی جائیں جزوی امور تک کو متعین کر دیا گیا ہو مثلاً کھانا امور عادت میں سے ہے اب یہ بھی نہیں کہ شریعت نے کہہ دیا ہو کہ جو مرضی کھاؤ کوئی پابندی نہیں جس طرح چاہو کھاؤ اور یہ بھی نہیں کہ کھانے کی چھوٹی چھوٹی باتیں طے کر دی ہوں کہ صرف فلاں فلاں جانور کا گوشت کھا سکتے ہو مثلاً مرغی کا گوشت کھا سکتے ہو، پھر مرغی کا گوشت کیسے کھانا ہے بھون کر، شوربہ بنا کر، روشٹ کر کے یا کسی اور طریقے سے اور اس میں مرچ ڈالنی ہے یا نہیں ڈالنی اگر ڈالنی ہے تو ہلکی رکھنی ہے یا تیز۔ نماز میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں طے شدہ ہیں لیکن یہاں تعیین نہیں بلکہ یہاں انداز یہ ہے کہ کچھ عمومی ہدایات اور کچھ جزوی مسائل ذکر کر دیئے اور اس کے بعد آزاد چھوڑ دیا۔ کھانے کے بارے میں کہا کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، گندم حلال ہے لیکن اس کے کھانے کا طریقہ متعین نہیں کیا اس کو آپ کی پسند پر یا رسم ورواج پر چھوڑ دیا۔

یہی معاملہ لباس کے بارے میں ہے کہ یہ بھی نہیں کہ لباس کے بارے میں کوئی تعلیم ہی نہ ہو کہ دین کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں اور یہ بھی نہیں کہ لباس کی ایک خاص شکل اور وردی متعین کر کے یہ کہہ دیا ہو کہ یہی اسلامی لباس ہے اور ہر ایک کو یہی پہننا پڑے گا اس سے ہٹ کر کوئی اور لباس نہیں پہنا جا سکتا۔ بلکہ یہاں پر بھی کچھ اصول ہیں مثلاً یہ کہ وہ لباس ساتر ہو، وہ لباس تکبر کا باعث نہ بنے وغیرہ وغیرہ اور کچھ جزوی مسائل بھی ہیں مثلاً مرد ریشم نہ پہنیں اور لنگی یا شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ کچھ اصول اور چند جزوی مسائل بیان کر کے شریعت نے آزاد چھوڑ دیا کہ ان اصولوں اور ان چند جزوی مسائل کی پابندی کرنی ہے۔ ان کی پابندی کرتے ہوئے اپنے علاقے کے رسم ورواج کے مطابق یا اپنی پسند کے مطابق جو لباس تم پہن لو گے وہ شریعت کی نظر میں درست ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے ہر خطے میں پہنچے اور ان علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا لیکن جہاں جہاں اسلام پہنچا ان سب علاقوں کا لباس یکساں نہیں۔ آپ برصغیر میں دیکھ لیں یہاں کا لباس اور طرح کا ہے اور برصغیر میں پاکستان میں اور طرح کا ملے گا، ہندوستان میں اور طرح کا ملے گا، پنجاب اور سرحد کے لباس میں آپ کو فرق نظر آئے گا کہ یہاں شلوار درمیانی ہو گی زیادہ کھلی نہیں ہو گی اور وہاں شلوار کافی کھلی ہو گی وغیرہ وغیرہ اور بنگلہ دیش میں چلے جائیں تو وہاں کا لباس اور ہے دھوتی اور بنیان نظر آئے گی اور برصغیر سے نکل کر آپ کہیں اور چلے جائیں افریقہ میں چلے جائیں افریقی ممالک میں مسلمانوں کا لباس اور ہے، عرب ممالک میں اور ہے، انڈونیشیا اور ملائشیا کی طرف چلے جائیں تو وہاں اور لباس ہے۔ مسلمان اور اسلام دنیا کے مختلف خطوں میں پہنچے اور ہر جگہ پر مسلمانوں کا لباس الگ الگ

نوعیت کا ہے اور یہ صورت حال آج کی نہیں ابتداء ہی سے چلی آرہی ہے، صدیوں سے چلی آرہی ہے اور کبھی اس صورت حال پر علماء کی طرف انکار نہیں کیا گیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ لباس کی کوئی خاص شکل شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ اصول اور چند مسئلے ہیں۔ ان اصولوں اور مسائل کی پابندی کرنے کے بعد آزاد چھوڑ دیا گیا، ہر علاقے میں اس کے رسم و رواج کے مطابق لوگوں نے لباس پہنا اور جو پہلے سے لباس چلا آرہا تھا عموماً اسی کو اختیار کر لیا۔ البتہ اس میں جو چیزیں خلاف شریعت تھیں ان کو نکال دیا اور تھوڑا بہت ردوبدل کر دیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لباس خالصتاً ایک تہذیبی اور رسم و رواج کا مسئلہ ہے دین کو اس میں کوئی دخل نہیں دینا چاہئے یہ بھی غلط ہے اور یہ کہنا کہ یہ خالص دینی مسئلہ ہے جس طرح نماز ایک دینی مسئلہ ہے یہ بھی درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک حد تک یہ ایک دینی مسئلہ ہے جہاں شریعت نے کوئی اصول بیان کر دیئے کوئی مسئلہ بیان کر دیا اور جہاں شریعت خاموش ہو جائے تو پھر اس کا تعلق تمہاری پسند کے ساتھ ہے یا کسی علاقے کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہے۔

لیکن پہلے نمبر پر دین کی ہدایت کو دیکھیں گے کہ وہ کیا کہتا ہے جہاں دین ہدایت دیتا ہے وہاں رسم و رواج کو نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور جہاں دین خاموش ہو جائے گا اس سے آگے اپنی مرضی۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ اصول یا لباس کے متعلق مسائل کیا ہیں؟ جہاں تک مسائل کا تعلق ہے تو جہاں جہاں حدیثیں آئیں گی وہاں وہاں مسائل ساتھ ہی بیان کرتے چلے جائیں گے البتہ عمومی اصول جو ایک روح کی حیثیت رکھتے ہیں جو تقریباً تمام احادیث میں پائی جاتی ہے احادیث کو سمجھنے سے پہلے ان بنیادی اصولوں کا ذہن میں رکھ لینا ضروری ہے۔

پہلا اصول:۔

لباس ساتر ہو ...... لباس کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ساتر ہو یعنی جسم کو چھپانے والا ہو چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے: **یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا۔**[1]

کہ اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری چھپانے کی جگہوں کو چھپاتا ہے۔ سوءٰت کا ترجمہ چھپانے کی جگہیں اور تمہارے لئے زینت کا باعث ہے، اس آیت میں لباس کے دو مقصد بیان کئے ہیں:

لباس کا پہلا اور سب سے اہم مقصد بدن کو چھپانا ہے لہٰذا جو لباس اس مقصد پر پورا اترے گا وہ اسلامی لباس ہے اور جو لباس اس مقصد پر پورا نہ اترے وہ اسلامی لباس نہیں کہلا سکتا۔

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۵ ۲ رکوع ۲

بدن کو چھپانے میں پھر کئی درجے ہیں، بدن کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو چھپانا ضروری ہے اور اگر نہیں چھپائے گا ظاہر کرے گا تو گنہگار ہو گا مثلاً حنفیہ کے نزدیک ناف سے لے کر گھٹنوں تک مرد کا ستر ہے، اس کو چھپانا ضروری ہے اور اگر نہیں چھپائے گا لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا تو گنہگار ہو گا۔ اس طرح عورت کا بھی ستر ہے جس کی تفصیل فقہاء نے فرمائی ہے کہ آزاد عورت کا ستر اور ہے اور باندی کا ستر اور ہے، اسی طرح عورت کا ستر غیر محرم کے سامنے اور ہے اور محرم کے سامنے اور ہے، اس کی تعیین فقہاء نے کر دی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ حصے ایسے جن کو چھپانا شرعاً ضروری ہے اور اگر ان کو نہیں چھپائے گا تو گنہگار ہو گا یہ حصے مرد کے لئے کم ہیں اور عورت کے لئے زیادہ حتی کہ ستر جس کا چھپانا واجب ہے خاص طور پر عورت غلیظہ اس کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ تنہائی میں بھی بغیر ضرورت کسی کے سامنے کھولنا نا جائز ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہاں کوئی انسان موجود نہیں تو کم از کم فرشتے تو موجود ہیں ان سے حیاء کرنی چاہئے۔ [1] اور نہیں تو اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔ [2] اللہ تعالیٰ سے حیاء کا تقاضا ہے کہ بغیر ضرورت کے آدمی تنہائی میں بھی بے لباس نہ ہو یعنی عورت غلیظہ کو ظاہر نہ کرے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ لباس کی حالت میں بھی دیکھ رہے ہیں لیکن وہ دیکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہ بے حیائی نہیں ہے اور اگر اس نے اپنے ستر کو ظاہر کیا تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیکھنا نہیں ہو گا بلکہ سمجھنے کے لئے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی طرف سے دکھانا بھی ہے، صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ دیکھ رہے ہیں بلکہ یہ دکھا بھی رہا ہے یہ بے حیائی کی بات ہے۔ اس لئے فرمایا کہ بلا ضرورت اپنا ستر تنہائی میں بھی نہ کھولو کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کا تقاضا ہے۔

کچھ حصے ایسے ہیں جن کو چھپانا کہ اگرچہ شرعاً ضروری نہیں لیکن مروت کا تقاضا ہے کہ عام حالات میں ان کو بھی چھپانا چاہئے اِلّا یہ کہ کوئی بے تکلفی کا موقع ہو مثلاً پیٹ ہے اب آدمی کرتہ اتار کر صرف بنیان پہن کر باہر جائے باہر پھرتا رہے ظاہر ہے کہ اچھا نہیں لگتا، ایک لنگوٹی پہن کر یا صرف ایک لنگی سی باندھ کر جو ناف سے لے کر گھٹنے تک آتی ہو باہر پھرتا رہے، مجالس میں بھی جائے، دوسری جگہوں پر بھی جائے تو ظاہر ہے اچھا نہیں لگتا مروت کے خلاف ہے۔ اس لئے ایک حد تک ان کو چھپانا ضروری ہے اِلّا یہ کہ کوئی بے تکلفی کا موقع ہو تو وہاں اور بات ہے۔ ایک جگہ طلبہ رہتے ہیں وہاں کپڑے بھی دھونے پڑتے ہیں تو کرتہ اتار کر کپڑے دھو رہے ہیں یا صفائی کے عمل میں ہیں تو جب تک یہ سارا عمل پورا نہیں ہوتا اس وقت تک کرتہ اتار کر پھر بھی رہے ہیں تو اس کی گنجائش ہے جہاں عرفاً اس طرح کھلا پھرنا عیب کی بات سمجھی جاتی ہے وہاں اس سے بھی بچنا چاہئے اس لئے کہ وہاں اس کے اندر قلت حیاء پائی جاتی ہے۔ جہاں مروتاً اور عرفاً ان اعضاء کو

---

(۱) حدیث ابن عمر مشکوۃ النکاح باب النظر الی المخطوبہ و بیان العورات...... (۲) حوالہ سابقہ حدیث بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ

چھپانا ضروری ہے وہاں کسی درجے میں شریعت بھی چھپانے کا تقاضا کرتی ہے۔

کچھ حصے ایسے ہوتے ہیں جن کو چھپانا ادب کا تقاضا ہوتا ہے مثلاً سر کو چھپانا خاص طور پر نماز کے وقت سر کو چھپانا کیوں کہ نماز کے وقت انسان کو مکمل لباس کے اندر ہونا چاہئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **خذوا زینتکم عند کل مسجد**[1] اور زینت تب بنتی ہے جب کہ آدمی مکمل لباس کے اندر ہو۔ اس لئے نماز کے وقت انسان کا لباس مکمل ہونا چاہئے اس کے اندر کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ بہر حال یہ تفصیلات فقہاء نے اپنی جگہ پر بیان کر دی ہیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لباس کا اولین مقصد اور پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ساتر ہو، کسی جگہ ساتر ہونا وجوب کے درجہ میں ہے اور کسی جگہ ساتر ہونا استحباب کے درجہ میں ہے۔

تین قسم کے لباس ایسے ہیں جو اس اصول پر پورے نہیں اترتے اس وجہ سے وہ خلاف شریعت کہلائیں گے۔

لباس چھوٹا ہونے کی وجہ سے ساتر نہ ہو ......

(۱)........... وہ لباس جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے ساتر نہیں مثلاً نیکر پہنی ہوئی ہے جس میں آدھی ران ننگی ہے اور حنفیہ کے نزدیک مرد کی ران بھی ستر میں داخل ہے۔ تو یہ لباس ساتر نہیں اس وجہ سے کہ یہ چھوٹا ہے، یہ لباس اس اصول کے نہ ہونے کی وجہ سے غیر اسلامی ہے۔

(۲)........... دوسرا وہ لباس جو پتلا ہونے کی وجہ سے غیر ساتر ہو، جسم چھپانے کا کام نہ دے، اتنا باریک لباس پہنا ہوا ہے کہ اس میں سے جسم صاف طور پر نظر آرہا ہے تو یہ لباس نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے یہ بھی غیر اسلامی لباس ہے اس میں پھر دو درجے ہیں ایک درجہ ان حصوں کا ہے جن کو چھپانا ضروری ہے جیسا کہ مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک اس کے حکم میں سختی ہے باقی حصے کے حکم میں اتنی سختی نہیں ہے جس حصے کو چھپانا ضروری ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ جسم نظر نہ آئے۔

جسم کی رنگت نظر نہ آئے لیکن جھلک محسوس ہو ...... ہاں البتہ اگر لباس پتلا ہے لیکن جسم کی کھال اور رنگت نظر نہیں آتی بلکہ جھلک سی پڑتی ہے تو بالکل ناجائز نہیں یہ اس حصے کی بات ہے جس کو چھپانا ضروری ہے اور یہ حصے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مرد کے لئے تھوڑے ہیں اور عورت کے لئے زیادہ ہیں خاص طور پر اجنبی کے سامنے تو بہت زیادہ ہیں۔

جس حصے کو چھپانا شرعاً ضروری نہیں اگر وہ نظر آئے ...... وہ حصہ جس کو چھپانا شرعاً ضروری نہیں صرف مروتاً اور عرفاً ضروری تھا اس میں اصول یہ ہے کہ اگرچہ لباس پتلا ہے جسم نظر بھی آرہا ہے لیکن عرفاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے لباس پہنا ہوا ہے تو بظاہر اس کی گنجائش ہے اس میں کوئی حرج کی بات

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۳۱ رکوع ۲

نہیں جیسا کہ ہمارے ہاں گرمیوں میں بعض لباس ایسے ہوتے ہیں کہ اس میں بازو وغیرہ نظر آتے ہیں۔ جتنے حصے پر بنیان ہوتی ہے اتنا جسم تو نظر نہیں آتا اور باقی نظر آتا ہے لیکن بہر حال آدمی کسی کے سامنے بالکل کرتہ اتار کر چلا جائے تو جس طرح وہ سمجھا جاتا ہے اس طرح یہ نہیں سمجھا جاتا اس لئے بظاہر اس کی گنجائش ہے۔

تو پہلی قسم کا لباس چھوٹا ہونے کی وجہ سے ساتر نہ ہوا اور دوسری قسم کا لباس پتلا ہونے کی وجہ سے ساتر نہ ہوا۔

وہ لباس جو چست ہونے کی وجہ سے ساتر نہ ہو......

(۳)......... تیسرا لباس جو چست ہونے کی وجہ سے غیر ساتر ہو، اس میں مرد کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر مستور اعضاء اور مخصوص اعضاء پر لباس اتنا تنگ ہو کہ جسم کے اس حصے کی حکایت ہو رہی ہو، حکایت کا معنی یہ کہ اس کی جسامت محسوس ہو رہی ہو تو یہ اس اصول کے خلاف ہو گا اور عورت کے لئے تقریباً پورا جسم یہی حکم رکھتا ہے۔ خاص طور پر اجنبی کے سامنے، نامحرم کے سامنے، نامحرم آئی ہے بظاہر پورا جسم اس نے چھپایا ہوا ہے اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا ہے لیکن لباس اتنا چست پہنا ہوا ہے کہ جسم کے اعضاء خاص طور پر جن کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا ہے ان کی جسامت واضح ہو رہی ہو تو یہ عورت کا اسلامی لباس نہیں ہو گا۔ شریعت اس کو اس طرح کے لباس کی اجازت نہیں دیتی خاص طور پر اجنبی کے سامنے، کہنے کو کہتی ہے میں نے پردہ کیا ہوا ہے، ہاتھ بھی چھپے ہوئے ہیں، پاؤں بھی چھپے ہوئے ہیں، چہرہ بھی چھپا ہوا ہے لیکن جو چیز پہنی ہوئی ہے وہ اتنی چست ہے کہ سینہ بھی واضح طور پر نظر آ رہا ہے اور پیٹ بھی واضح طور پر محسوس ہو رہا ہے، بازو بھی واضح طور پر محسوس ہو رہے ہیں تو یہ بھی غیر اسلامی لباس ہو گا۔

لباس کا پہلا اصول یہ ہوا کہ ساتر ہو: **لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْءٰتِكُمْ وَرِیْشًا** ۔ اور غیر ساتر تین طریقوں سے بنتا ہے: (۱) چھوٹا ہونے کی وجہ سے، (۲) اور کبھی پتلا ہونے کی وجہ سے، (۳) اور کبھی چست اور تنگ ہونے کی وجہ سے، ان میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے تو وہ لباس شریعت کے مطابق نہیں رہے گا۔

دوسرا اصول:-

لباس باعث زینت ہو...... لباس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ باعث زینت ہو، قرآن کریم میں اس اصول کو پہلے اصول کے ساتھ بیان کیا ہے اس لئے اس کو یہاں اس کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے فرمایا: **لباسًا یواری سوئتکم وریشا** ۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ لباس کا ایک مقصد زینت بھی ہے کہ لباس پہن

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۲۵ رکوع نمبر ۲

کر اچھا لگتا ہے اگر بغیر لباس کے ہو آدمی اچھا نہیں لگتا۔ اس میں پھر کئی درجے ہیں ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی نے بدن چھپایا ہوا ہو لیکن لباس ایسا ہے کہ آدمی بالکل عجوبہ سے بن جائے مثلاً فرض کریں گھر میں دو قمیصیں رکھی ہوئی تھیں ایک اوپر پہن لی اور دوسری نیچے پہن لی اور باہر پھر رہا ہے، یوں تو چھپ گیا لیکن عجوبہ سا بن گیا بر الگ رہا ہے۔ تو ایسا لباس قابل ترک ہے اس لئے کہ اس میں ریش یعنی زینت کا جو ادنیٰ درجہ ہو سکتا تھا وہ بھی نہیں پایا گیا۔

زینت یا ترک زینت مطلوب ہونے میں تعارض ...... اس سے بڑھ کر لباس میں زینت کا کیا درجہ ہے۔ زینت مطلوب ہے یا ترک زینت مطلوب ہے تو اس میں بظاہر نصوص میں کچھ تعارض نظر آرہا ہے اس لئے کہ بعض نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ لباس میں زینت مطلوب ہے جیسا کہ یہ آیت کہ لباس کا ایک مقصد یعنی تمہارے سوءٰت یعنی چھپانے کی جگہوں کو چھپاتا ہے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ زینت کا باعث ہے۔ اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ **انّ اللہ تعالیٰ جمیل یحبّ الجمال الحدیث**۔[1]

حضور اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ تکبر کی مذمت بیان فرمائی تو اس پر ایک آدمی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا اچھا ہو تو آپ نے فرمایا کہ یہ تکبر میں داخل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں۔ اس طرح ایک آدمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بہت گھٹیا لباس پہنا ہوا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا ہر قسم کا مال ہے دراہم ودنانیر بھی ہیں، بکریاں بھی ہیں، اونٹ بھی ہیں جو کچھ اس زمانے کی مالداری کے لوازمات تھے ان کے بارے میں کہا کہ میرے پاس موجود ہیں۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر اپنی نعمت نازل فرماتے ہیں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اثر اس پر ظاہر بھی ہو۔[2] دیکھنے میں بھی پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کچھ دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے لیکن دیکھنے میں یوں لگتا ہے کہ کنگال ہے اور ابھی کہیں سے مزدوری کر کے آرہا ہے، یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لباس زینت کے لئے اختیار فرمائے ہیں، بعض آپ کو زیادہ پسند تھے آپ کو "حمرۃ" دھاری دار لباس پسند تھے۔[3]

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب الاداب باب الغضب والکبر ج ۲/ص ۴۳۳

(۲) سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی الخلقان وفی غسل الثوب ج ۲/ص ۲۰۷

(۳) صحیح مسلم کتاب اللباس باب فضل لباس الثیاب الحمرۃ ج ۲/ص ۱۹۳

اسی طرح بعض میں آتا ہے کہ آپ کو سفید لباس پسند تھا۔[1] تو بعض لباس آپ کو بعض سے زیادہ پسند تھے جو پسند تھے اس وجہ سے کہ ظاہر ہے وہ اچھے لگتے تھے خاص کر وفود کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زینت اختیار فرماتے تھے چنانچہ امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے: **باب من تجمل للوفود**[2] کہ وفد ملنے کے لئے آرہے ہوں تو آدمی جمال اور زینت اختیار کرے اور اس باب میں یہ حدیث پیش کی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ فلاں آدمی بہت اچھا جبہ بیچ رہا ہے آپ اس کو خرید لیجئے تاکہ وفود جب ملنے کے لئے آیا کریں تو آپ اس کو پہن لیا کریں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خریدا تو نہیں اس لئے کہ وہ ریشم کا تھا اور ریشم مرد کے لئے حلال نہیں۔ بہر حال اس سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مزاج تھا کہ وفود کے لئے مستقل اچھا لباس رکھا کرتے تھے۔ اس طرح کی بہت سی احادیث اس باب میں بھی آجائیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس کے اندر زینت مطلوب ہے۔

دوسری احادیث وہ ہیں جن سے ترک زینت کی فضیلت سمجھ میں آتی ہے چنانچہ اس باب میں صفحہ نمبر ۳۷۵ پر احادیث آئیں گی مثلاً حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا تسمعون الا تسمعون ان البذاذة من الایمان ان البذاذة من الایمان ۔ (رواہ ابو داؤد)[3] کہ تم سنتے نہیں کہ بذاذہ یعنی سادگی ایمان میں سے ہے یعنی سادگی ایمان کا تقاضا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی جمال والا لباس چھوڑ دے حالانکہ وہ اس پر قادر تھا لیکن محض تواضع کی وجہ سے اس نے جمال والا لباس چھوڑ دیا، عزت والا لباس چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت کا جوڑا پہنائیں گے: **کساہ اللہ حلة الکرامة**۔[4] اس میں زینت والے لباس کو ترک کرنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ لہٰذا بعض احادیث جمال اور زینت کی ترغیب دے رہی ہیں اور سادگی کا معنی بظاہر ترک زینت ہے اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان نصوص کو کیسے جمع کیا جائے۔

یعنی اگر زینت مطلوب ہے تو کس حد تک، اگر سادگی مطلوب ہے تو کس حد تک، اگر زینت مطلوب ہے تو کن صورتوں میں اگر سادگی مطلوب ہے تو کن صورتوں میں یہ بات یہاں قابل غور ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری کتاب اللباس باب الثیاب البیض ج ۲/ص ۸۶۶، ایضاً سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی البیاض ج ۲/ص ۲۰۷

(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب من تجمل للوفود ج ۲/ص ۸۹۸

(۳) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثانی ج ۲/ص ۳۷۴.....(۴) ایضاً

بذاذۃ (سادگی) کا معنی:-

اس سے پہلے بنیادی بات یہ ذہن میں رکھ لیں کہ بذاذۃ یعنی سادگی کا معنی ترک زینت ہے نہ کہ ترک نظافت یعنی ایک آدمی میلا کچیلا رہتا ہے نظافت کا اہتمام نہیں رکھتا بدن اور کپڑوں کو صاف ستھرا نہیں رکھتا یہ سادگی نہیں بلکہ گنداپن ہے۔ بذاذۃ سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ بذاذۃ سے مراد یہ ہے کہ صاف ستھرا رہتا ہے لیکن زینت اور آرائش کا اہتمام نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ تو مطلقاً زینت مطلوب ہے اور نہ ہی مطلقاً بذاذۃ بلکہ زینت بھی بعض حالات میں مذموم ہے اور بعض حالات میں محمود ہے اور اسی طریقے سے بذاذۃ بھی بعض حالات میں مذموم ہے اور بعض حالات میں محمود۔

زینت مذموم ہونے کی صورتیں:-

(۱)......... کوئی آدمی محض شہرت نمائش اور دکھاوے کے لئے زینت اختیار کرتا ہے تو اس مقصد کے لئے زینت اختیار کرنا بہت برا ہے۔

(۲)......... کوئی آدمی تکلف کر کے اس انداز سے زینت اختیار کرتا ہے کہ اس میں بہت زیادہ انہماک ہو جاتا ہے اور مقاصد سے بھی دوری اور غفلت ہو جاتی ہے تو یہ بھی مطلوب نہیں زینت تو مطلوب ہے لیکن اہتمام زینت اور زینت میں انہماک مطلوب نہیں۔ چنانچہ جہاں احادیث میں یہ آتا ہے کہ ڈاڑھی کو درست رکھنا چاہئے، سر کے بالوں میں کنگھی کر کے رکھنی چاہئے، بال وغیرہ بکھرے ہوئے نہیں ہونے چاہئے وہاں احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ کنگھی کرنے میں کبھی کبھی ناغہ بھی کر لینا چاہئے۔[1]

اس لئے کہ جو ہر روز کنگھی کرتا ہے یا دن میں کئی مرتبہ کنگھی کرتا ہے، کنگھی یا شیشہ ہر وقت جیب کے اندر ہے ہر دس پندرہ منٹ کے بعد نکال کر اپنے آپ کو درست کرتا ہے تو یہ زینت نہیں بلکہ زینت میں انہماک اور تعمق ہے یہ مطلوب نہیں بلکہ مذموم ہے خاص طور پر مرد کے لئے تو یہ کسی بھی طرح درست نہیں۔

(۳)......... کوئی اپنی گنجائش سے بڑھ کر زینت کرتا ہے یعنی جتنی مالی حیثیت ہے اس سے بڑھ کر زینت اختیار کرتا ہے تو یہ بھی پسندیدہ نہیں اس لئے کہ یہ بعض دفعہ اسراف کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے اپنی حیثیت سے زیادہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

اس کے برعکس بعض حالات میں زینت محمود ہوتی ہے۔

---

(۱) آگے باب الترجیل میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آرہی ہے: نھی رسول اللہ ﷺ عن الترجل إلا غبا۔

زینت محمود ہونے کی صورتیں:۔

حق تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کے لئے زینت اختیار کرنا......

(۱)............کوئی آدمی حق تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کے لئے زینت اختیار کرتا ہے اور یہ بات حدیثوں کے اندر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ کسی بندے پر انعام کریں تو اس پر اللہ کی نعمت کا اثر نظر آئے۔[۱] یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکر میں داخل ہے: **اما بنعمت ربک فحدث۔**[۲] کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بیان کرو، بیان کرنا جس طرح زبان سے ہوتا ہے اس طرح عمل سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے عمل سے یہ پتہ چلے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ فرض کیجئے آپ نے کسی کو ایک بہت بڑی چیز دے دی اس پر بہت بڑا احسان کر دیا اور وہ ہر ایک آدمی کے سامنے ظاہر کرتا پھر رہا ہے کہ فلاں آدمی نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ تو زبان سے یہ نہیں کہتا کہ میں ان کا بہت بڑا شکر گزار ہوں لیکن اس کے احسان کو ظاہر کرنا قدر دانی اور شکر ہی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا کی ہے اس کو ظاہر کرنا اس کی نعمت کا شکر ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ذکر کرنا کبھی زبان سے ہوتا ہے اور کبھی عمل سے، تو اللہ تعالیٰ نے اچھی مالی حیثیت عطا فرمائی ہے تو اس کے مناسب لباس پہننا یہ اس کی نعمت کا اظہار ہے، اس میں شکر کی بھی نیت ہو سکتی ہے تو اگر اس نیت سے زینت اختیار کرتا ہے تو یہ زینت مطلوب اور مقصود ہے۔

(۲)............بسا اوقات زینت مطلوب ہوتی ہے جب کہ اس سے اپنے فقر اور حاجت کا اخفاء مقصود ہو کسی قدر زینت اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ مجھے فقیر سمجھ کر، حاجت مند سمجھ کر کچھ دینے کا اہتمام نہ کریں اور گھٹیا لباس سے اس لئے بچتا ہے کہ میرا گھٹیا لباس عملی طور پر کہیں سوال نہ بن جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کہیں سفر پر جانے لگے اور کپڑے پیوند والے پہنے ہوئے تھے اور ایسی جگہ جا رہے تھے جہاں بڑے بڑے رؤسا سے سامنا کرنا تھا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ کوئی جو مرضی سمجھ لے کیا فرق پڑے گا، گھر والوں نے کہا کہ اگر آپ اچھا لباس پہن کر جائیں گے تو جن کے ہاں آپ جا رہے ان کو یہ فکر نہیں ہوگی کہ حضرت کو کچھ دینا چاہئے، اگر دیں گے تو محض اظہار محبت کے طور پر دیں گے اور اگر اس طرح کا لباس پہن کر جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ مالی حالات درست نہیں ہے اس وجہ سے وہ دینے کی زیادہ فکر کریں گے۔ تو حضرت نے اس بات کو پسند فرمایا چنانچہ وہاں اچھا لباس پہن کر گئے بہر حال مقصد مقصد سے فرق پڑ جاتا ہے۔

(۱) سنن ابی داؤد کتاب للباس باب فی الخلقان وفی غسل الثوب ج۲/ص۲۰۷......(۲) سورۃ الضحیٰ آیت نمبر ۱۱

تطییب قلب مسلم کے لئے زینت اختیار کرنا......

(۳)........... ایک آدمی اچھا لباس پہنتا ہے تطییب قلب مسلم کے لئے اس لئے پہنتا ہے تاکہ دوسرے مسلمان کا دل خوش ہو مثلاً کسی نے اچھا لباس ہدیئے میں دے دیا، گھر والوں نے اچھے کپڑے سلا دیئے یا سی دیئے۔ اب اگر یہ نہیں پہنتا تو ان کی دل شکنی ہوگی اور اگر پہنتا ہے تو ان کا دل خوش ہوگا، تو اپنے متعلقین کا دل خوش کرنے کے لئے کہ مجھ پر اچھا لباس دیکھ کر وہ خوش ہوں گے ان کو اچھا لگے گا تو اس مقصد کے لئے اگر کوئی زینت اختیار کرتا ہے تو یہ بھی محمود ہے۔

اس کے برعکس بذاذۃ اور سادگی نہ مطلقاً مذموم ہے اور نہ مطلقاً محمود ہے بلکہ بعض حالات میں مذموم ہوتی ہے اور بعض حالات میں محمود ہے۔

بذاذۃ (سادگی) مذموم ہونے کی صورتیں:۔

(۱) ترک زینت بخل کی وجہ سے...... کوئی آدمی ترک زینت محض بخل کی وجہ سے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہے لیکن کنجوس اتنا ہے کہ اپنے اوپر بھی خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں نے سادگی اختیار کر کے بڑا کمال کیا ہے لیکن یہ سادگی مطلوب نہیں ہے۔

(۲) ترک زینت سستی کی وجہ سے...... کوئی آدمی زینت کو چھوڑتا ہے اور بظاہر سادگی اختیار کرتا ہے لیکن اس کا منشاء محض سستی ہے، پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ تو ہے لیکن سستی کا مارا ہوا ایسا ہے کہ کئی دن تک کپڑے ہی تبدیل نہیں کرتا، کئی دن تک بالوں میں تیل لگانے اور کنگھی کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اس کا منشاء محض سستی اور کاہلی ہے۔ یہ سادگی شرعاً مطلوب نہیں ہے اس لئے کہ سستی شرعاً مذموم ہے: **ان اللہ تعالیٰ یلوم علی العجز**۔[1] کہ اللہ تعالیٰ سستی، کاہلی اور عاجزی کو ناپسند فرماتے ہیں اور وہ خوش ہوتے ہیں ہوشیاری اور تیقظ پر۔

(۳) بعض دفعہ آدمی سادگی اختیار کرتا ہے محض خست طبع کی وجہ سے مزاج ہی گھٹیا ہے ظاہر ہے یہ ترک زینت بھی مطلوب اور محمود نہیں ہے۔

سادگی محمود ہونے کی صورتیں:۔

(۱)........... بعض حالات میں سادگی اختیار کرتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اعلیٰ مقصد پر اس طرح جمی ہوئی

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب القضاء باب الرجل یحلف علی حقہ ج ۲/ص ۱۵۵

ہے کہ اسباب زینت کی طرف اس کو توجہ ہی نہیں ہوتی، اللہ کی یاد میں ایسا منہمک ہے، علم میں ایسا منہمک ہے کہ اس کو زینت کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی یہ سادگی مطلوب ہے۔

(۲)......... کوئی آدمی تواضعاً سادگی اختیار کرتا ہے کہ میری حیثیت ہی آخر کیا ہے کہ میں اچھا لباس پہنوں اور لوگوں کو کچھ بن کر دکھاؤں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: **من ترك لبس ثوب جمال تواضعا**۔[1] تواضع کی وجہ سے جمال اور زینت کا لباس چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن عزت کا لباس پہنائیں گے۔

حاصل یہ کہ زینت اختیار کرنے یا سادگی اختیار کرنے میں کوئی عمومی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اشخاص اور حالت کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے۔ بعض حالات میں بعض آدمیوں کے لئے ایک چیز مطلوب ہوتی ہے لیکن وہی چیز دوسروں کے لئے دوسرے حالات میں مطلوب نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات مذموم ہوتی ہے۔

خلاصہ ...... اب تک لباس کے متعلق دو اصول معلوم ہو چکے ہیں: پہلا اصول جسم یعنی ستر چھپانا، دوسرا اصول زینت اس سے تیسرا اصول خود بخود سمجھ میں آگیا اور وہ سادگی ہے۔

تیسرا اصول:۔

سادگی ...... لباس کے اندر سادگی بھی شرعاً مطلوب ہے، یہ ساری بحث اس لئے کی کہ بظاہر دوسرا اور تیسرا اصول متعارض نظر آرہے تھے۔

چوتھا اصول:۔

نظافت ...... اور یہ اصول بھی انہی سے ملتا جلتا ہے، نظافت بھی شریعت میں مطلوب ہے اور اتنی مطلوب ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اپنے گھروں کے باہر کے حصوں کو بھی صاف کیا کرو۔[2] جب گھروں کے سامنے والا حصہ باہر والا حصہ صاف کرنا مطلوب ہے اس میں نظافت مطلوب ہے تو گھر کے اندر نظافت بطریق اولیٰ مطلوب ہوگی اور جب گھر میں نظافت مطلوب ہے تو لباس میں بطریق اولیٰ ہوگی اور جب لباس کے اندر نظافت مطلوب ہے تو جسم میں بطریق اولیٰ مطلوب ہوگی۔

طہارت اور نظافت:۔

یہاں یاد رکھیے طہارت اور نظافت دو الگ الگ چیزیں ہیں، طہارت کا معنی ہے کہ جسم یا کپڑوں پر

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثانی ج ۲/ ص ۳۷۵ ...... (۲) جامع ترمذی ابواب الاداب باب ماجاء فی النظافہ ج ۲/ ص ۱۰۷

کوئی ناپاک چیز نہ ہو اور نظافت کا معنی ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ستھرائی کے خلاف سمجھی جاتی ہو اگر چہ وہ پاک ہو مثلاً گرد و غبار جمی ہوئی ہے۔ گرد و غبار ناپاک چیز نہیں ہے لیکن صفائی اور ستھرائی کے خلاف ہے، کپڑوں پر سالن گرا ہوا ہے لیکن پھر بھی کپڑے تبدیل نہیں کئے یوں ہی ملنگوں کی طرح پھر رہا ہے یہ سالن ناپاک نہیں ہے لیکن ستھرائی کے خلاف ہے۔ ایسی چیزوں کو زائل کرنا جو ستھرائی کے خلاف ہو یہ نظافت ہے اور نظافت بھی مطلوب ہے۔ اب شریعت نے حکم دیا ہے کہ چالیس دن میں کم از کم ایک مرتبہ ناخن کاٹنا واجب ہے اور بہتر یہ ہے کہ ہفتے میں یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ کاٹ لیں، اسی طرح جسم کے بعض حصوں کے بال کاٹنے کا حکم دیا تو یہ حکم نظافت کے لئے ہے اس لئے کہ اگر ناخنوں کو نہیں کاٹے گا تو ناخنوں کے اندر میل جم جائے گی اگر بغلوں وغیرہ کے بال صاف نہیں کرے گا تو ان میں گندگی بھر جائے گی۔ اسی طرح قرآن پاک میں آتا ہے: وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۔[1] اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چند کلمات کے ذریعے امتحان لیا۔ کن باتوں کے ذریعے امتحان لیا؟ ان میں سے بعض احکامات کا بعض روایات میں تفصیلاً ذکر آیا ہے اور ان میں سے بعض احکامات ایسے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنن الفطرۃ کہا ہے یعنی فطرت کے طریقے۔ فطرۃ کے طریقوں کا مطلب ان شاء اللہ باب الترجل میں حدیث آئے گی اس کے تحت بیان کیا جائے گا۔ سنن الفطرۃ میں یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیئے جانے والے احکام میں غسل البراجم بھی شامل ہے یعنی ایسی جگہوں کو دھونا جہاں میل عام طور پر زیادہ جم جاتی ہے اور جب تک اہتمام سے وہاں سے میل کو نہ نکالا جائے نہیں نکلتی۔ جیسا کہ انگلیوں کے درمیان کی جگہ یا بغلوں کے نیچے یا کہنیوں کی جگہ گھٹنے کے نیچے کی جگہ اس کی پچھلی جانب کی جگہ ان سب کو دھونے اور اہتمام سے وہاں سے میل کو نہ نکالا جائے تو نہیں نکلتی، ان سب کو دھونے اور اہتمام سے صاف کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنن الفطرۃ میں سے قرار دیا اور یہ ان خصوصی احکام میں سے ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خصوصی طور پر حکم دیا گیا اور جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورا پورا عمل کر کے دکھایا اور اس کی وجہ سے وہ امتحان میں کامیاب ہوئے۔

بلکہ ایک اہم اسلامی سنت ختنہ کرنا ہے اور ختنے میں جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں باب الترجل میں آئیں گی، ان میں سے اہم حکمت نظافت ہے یعنی اگر ختنہ نہیں کیا جائے گا تو کھال کے اندر گندگی اور میل کچیل جمع ہو جائے گا، صفائی اہتمام سے نہیں ہو گی، اس کھال کو اتارنے کے بعد صفائی آسانی سے ہو جائے گی۔ یہ چند مثالیں عرض کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت میں نظافت مطلوب ہے اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں

---

(۱) سورۃ البقرۃ پ نمبر ۱ آیت نمبر ۱۲۴

کہ نظافت بذاتہ یعنی سادگی کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ سادگی کا معنی ترک زینت ہے ترک نظافت نہیں نظافت مطلوب ہے۔ ہاں البتہ بعض مخصوص حالات میں نظافت کے اس حکم سے استثناء ہو سکتا ہے کہ ان میں آدمی غیر نظیف بھی رہے تب بھی اس کو کمال سمجھا جائے مثلاً ایک آدمی کسی اعلیٰ مقصد میں اتنا شدید انہماک رکھتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ میرے کپڑے میلے ہو گئے ہیں یا میرے جسم پر کوئی اس طرح کی چیز لگی ہوئی ہے اس کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا اپنے مقصد میں ایسا مگن ہے تو یہ برا نہیں ہے جیسا کہ امام محمدؒ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ پڑھنے لکھنے میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان کو کہہ کر کپڑے تبدیل کروانے پڑتے تھے کہہ کر کپڑے تبدیل کروا لیتے تو کر لیتے ورنہ کئی کئی دن گزر جاتے ان کو خیال نہ ہوتا کہ میں نے کپڑے تبدیل کرنے ہیں۔ لیکن یہ سستی اور کاہلی کی وجہ سے نہیں تھا واقعتاً علم میں ایسا انہماک ہوتا تھا کہ انہیں یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ کپڑے بھی تبدیل کرنے ہیں، تو یہ برا نہیں اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ آدمی کی بہترین زندگی دو طرح کی ہوگی یا تو یہ کہ آدمی تھوڑی سی بکریاں لے کر کسی غار وغیرہ میں رہ پڑے آبادی سے الگ تھلگ ہو جائے وہاں پر عبادت کرتا رہے اور بکریوں کے دودھ پر گزارا کرتا رہے۔ **حتی یاتیہ الیقین۔**[1] یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کو موت آجائے اور دوسرا وہ شخص ہوگا جو سارے تعلقات کو منقطع کر کے (جن تعلقات کو شرعاً منقطع کرنا جائز ہے) اور آبادی کے بکھیڑوں سے نکل کر اپنے آپ کو جہاد کے لئے وقف کرے اور ہر وقت وہ اس کام میں لگا رہے۔ اس آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اشعث راسہ مغبرۃ قدماہ۔**[2] سر کے بال پراگندہ ہیں اور پاؤں غبار آلود ہیں یہ غبار آلود اس وجہ سے نہیں کہ صفائی کا اہتمام نہیں یا سستی اس پر غالب ہے وہ تو مجاہد ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنے کام میں اس طرح لگا ہوا ہے کہ اس طرف اسے زیادہ توجہ نہیں ہوتی یا اسے سفر زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ سے صفائی کا اہتمام کرتا بھی ہے تب بھی پاؤں غبار آلود ہو جاتے ہیں اور سر کے بال بکھر جاتے ہیں۔ اس طرح بعض صوفیاء کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بھی بعض اوقات اس طریقے سے رہتے تھے، زیادہ صفائی کا بھی اہتمام نہیں کرتے تھے تو وہ بھی درحقیقت اسی نوعیت کی بات ہوگی، خاص حالت کا ان پر غلبہ ہوگا لیکن اصل مسنون طریقہ بہرحال یہی ہے اور شرعاً مطلوب یہی ہے عام لوگوں کے لئے عام حالات میں کہ وہ نظافت اور ستھرائی کا بھی اہتمام کریں۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فضل الجہاد والرباط ج ۲/ص ۱۳۶ ایضاً سنن ابن ماجہ ابواب الفتن باب العزلۃ: ص ۲۸۶

(۲) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللہ ج ۱/ص ۴۰۴

پانچواں اصول:-

اسراف سے بچنا...... ایک اصول یہ ہے کہ آدمی اسراف سے بچے، اسراف کا معنی ہے کہ ایسی جگہ پر خرچ کرنا جہاں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہو نہ آخرت کا، بے مقصد خرچ کرنا اس سے معلوم ہوا کہ اسراف کا معنی زیادہ خرچ کرنا نہیں بلکہ فضول خرچ کرنا۔ بعض لوگ زیادہ خرچ کرنے کو اسراف کہتے ہیں حالاں کہ یہ بات نہیں بلکہ فضول خرچ کرنا اسراف ہے۔ لہٰذا اگر وہ ایک روپیہ خرچ کرتا ہے اور وہ بے مقصد ہے تو وہ اسراف میں داخل ہے اگر وہ لاکھوں روپیہ خرچ کرتا ہے لیکن بامقصد ہے تو وہ اسراف میں داخل نہیں ہے۔ اب لباس میں ظاہر ہے ایک حد تک زینت بھی اختیار کرنا مقصود ہے اور اسراف ممنوع ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے کہ کون سی صورت زینت کے اندر داخل ہے اور کون سی اسراف میں تو اس میں ایک موٹی سی بات ذہن میں رکھیں وہ یہ کہ آدمی اپنی حیثیت کے اندر رہتے ہوئے اور عرف کے اندر رہتے ہوئے جو خرچ کرتا ہے وہ اسراف نہیں ہوتا یعنی لباس پر اتنی حیثیت کا آدمی عموماً جتنا خرچ کیا کرتا ہے اگر اتنا خرچ کرتا ہے تو وہ اسراف میں داخل نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسراف کا معاملہ مالی حیثیت کے مختلف ہونے سے بھی بدل جاتا ہے کسی کے معاشرتی مقام ورتبے کے بدلنے سے بھی بدل جاتا ہے۔ ایک آدمی روزانہ کپڑے بدلتا ہے اور کپڑا بھی اس کا اچھا ہوتا ہے اور کلف لگی ہوئی ہے، استری ہوتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کے حق میں وہ اسراف نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت کے لوگ اس سے بھی اعلیٰ لباس پہنتے ہوں، اس کے اعتبار سے وہی سادگی ہو اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے آدمی کی حیثیت کم ہے یا اس کا مقام ومرتبہ کم ہے اور وہ یہ کام بہت تکلف کرکے کرتا ہے اپنی حیثیت سے زائد خرچ کرکے کرتا ہے تو اس کے لئے وہی کام اسراف ہوگا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک اصول بیان فرمایا ہے وہ اصول بنیادی طور پر حضرت نے مکان وغیرہ تعمیر کرنے کے بارے میں فرمایا ہے لیکن بہر حال اس کا اطلاق لباس پر بھی ہو سکتا ہے۔

پہلا درجہ رہائش...... حضرت نے فرمایا کہ مکان میں پہلا درجہ یہ ہے کہ رہائش مقصود ہو یعنی ضرورت پوری ہو جائے، سر چھپانے کو جگہ مل جائے، گرمی اور سردی سے آدمی بچ جائے یہ درجہ بنیادی ضرورت ہے اس کے بغیر چارہ کار نہیں لہٰذا یہ مذموم نہیں۔

دوسرا درجہ آسائش...... دوسرا درجہ آسائش کا ہے کہ صرف ضرورت ہی پوری نہیں بلکہ آسائش اور سہولت بھی مل رہی ہے مثلاً مکان میں اے سی لگوالیا یا راحت کے اور اسباب مہیا کرلئے تو یہ آسائش ہے اور آسائش بھی بری نہیں اللہ تعالیٰ اگر کسی کو دیں تو اس کو راحت کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔

تیسرا درجہ زیبائش وآرائش...... تیسری چیز زیبائش وآرائش ہے کہ مکان دیکھنے میں اچھا لگے، خوبصورت لگے مثلاً مکان بنایا تو رہائش ہوگئی اس میں اے سی وغیرہ بھی لگوالیا تو آسائش بھی ہوگئی رنگ و

روغن بھی کرلیا تو ظاہر ہے کہ آرائش بھی ہوگئی، یہ تینوں چیزیں درست ہیں۔

چوتھا درجہ نمائش...... اصل خرابی چوتھی چیز میں ہے اور وہ نمائش ہے کہ خرچ کرنے کا مقصد محض دکھاوا ہے۔

تقریباً یہی بات لباس کے اندر کہی جاسکتی ہے کہ ایک یہ ہے کہ ضرورت پوری ہو جائے، جسم چھپ جائے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ لباس باسہولت ہو سردیوں میں گرم کپڑا پہنتا ہے اور گرمیوں میں پتلا کپڑا پہنتا ہے اور تیسرا یہ ہے کہ وہ لباس اچھا بھی لگتا ہو لیکن یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگ مجھے کچھ سمجھیں۔ اگر چوتھی بات آگئی کہ نمائش مقصود ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اگر پہلی تین چیزوں میں سے کسی پر خرچ کرتا ہے تو یہ اسراف نہیں ہے بشرطیکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔ اگر چوتھے مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے تو یہ اسراف ہے لیکن پھر بھی کہاں اسراف ہوا اور کہاں اسراف نہیں ہوا جزوی معاملات میں فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے اس کے لئے یا تو ضروری ہے کہ آدمی کا خود اپنا دینی فہم اتنا اونچا ہو جس سے بصیرت حاصل ہو اور اگر دینی بصیرت نہیں تو اپنے آپ کو کسی بصیرت والے کے حوالے کردے اور اپنے حالات اس کے سامنے رکھ کر فیصلہ کروائے۔

چھٹا اصول:۔

تکبر والا لباس...... یہ بھی لباس میں اہم اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ تکبر والا لباس نہ ہو تکبر بذات خود انتہائی مذموم اور اللہ کو انتہائی ناپسند ہے، تو تکبر والے کام بھی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، اسی طرح تکبر والا لباس بھی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ چنانچہ کئی لباس ایسے ہیں جن سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تکبر کی وجہ سے منع فرمایا ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لنگی یا شلوار وغیرہ کو ٹخنوں سے نیچے کرنے سے منع فرمایا ہے، اسبال ازار اسی کو کہتے ہیں اور اس کی ایک بڑی وجہ تکبر ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں ایسا تکبر کی وجہ سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حدیثوں میں الفاظ آتے ہیں: **من جرّ ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة۔**(۱) کہ جو آدمی تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا لمبا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ قیامت کے دن اتنا حقیر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے یعنی نظر رحمت نہیں فرمائیں گے یعنی اس کو اپنی نظروں سے گرادیں گے اور بھی کئی حدیثیں آپ پڑھیں گے جن سے پتہ چلے گا کہ تکبر کا لباس پسندیدہ نہیں۔

تکبر کا لباس دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ لباس جس کے پہننے کا منشاء ہی تکبر ہے یعنی تکبر پہلے دل میں پیدا ہو چکا ہے اور دل میں موجود تکبر نے یہ تقاضا کیا کہ ایسا لباس پہنو تاکہ دوسروں کے اوپر بھی اپنی برتری

---

(۱) صحیح مسلم کتاب اللباس باب تحریم جر الثوب خیلاء ج ۲/ ص ۱۹۴

جماؤ۔ تکبر کا معنی ہوتا ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا لباس پہنتے وقت یہ کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور اپنی بڑائی دوسروں پر ظاہر بھی کرنی چاہئے۔

دوسرا لباس تکبر وہ ہے کہ تکبر پیدا تو نہیں ہوا اور پہلے سے دل میں موجود تکبر نے اس لباس کے پہننے کا تقاضا نہیں کیا لیکن لباس پہننے کے بعد خطرہ ہے کہ میرے اندر تکبر پیدا ہو جائے گا اگر یہ لباس میں پہنوں گا تو اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگ جاؤں گا، دوسروں کو حقیر سمجھنے لگ جاؤں گا تو یہ بھی لباس تکبر میں داخل ہے اس سے بھی بچنا چاہئے۔ اب کچھ لباس تو ایسے ہیں کہ جن کو بالتعیین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کا لباس قرار دیا ہے مثلاً اسبال ازار وغیرہ اس سے تو ہر حال میں بچنا چاہئے اور اس کے علاوہ کون سا لباس تکبر کا ہے اور کون سا نہیں یہ ہر آدمی کے حالات کے بدلنے سے مختلف ہو سکتا ہے ایک آدمی وہی لباس تکبر کی وجہ سے پہنتا ہے اور دوسرا وہی لباس تکبر کی وجہ سے نہیں پہنتا، ایک آدمی میں خاص لباس پہننے کی وجہ سے تکبر پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور دوسرے میں اس کے پیدا ہونے کا خطرہ نہیں تو ہر آدمی کا حکم مختلف ہو گا ایسے معاملات میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے اور دوسروں کے بارے میں حسن ظن کے پہلو کو۔

ساتواں اصول:-

ترک لباس شہرت ...... ایک اور اصول جو اسی سے ملتا جلتا ہے وہ یہ ہے کہ لباس شہرت سے بچنا چاہئے ایسا لباس جس کی وجہ سے یا تو شہرت ہوتی ہو یا جس کا مقصد شہرت حاصل کرنا ہو اس سے بچنا چاہئے، فرق یہ ہے کہ پہلے اصول کا تعلق کبر کے ساتھ تھا اور اس اصول کا تعلق حب جاہ کے ساتھ ہے۔ آگے حدیث میں آئے گا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی شہرت کا لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائیں گے: **مَن لبس ثوب شهرة في الدنيا البسهٗ الله ثوب مذلة يوم القيامة** ۔ (الحدیث)[1] شہرت کا لباس دو طرح سے بنتا ہے کبھی تو لباس بہت اعلیٰ اور اونچا ہونے کی وجہ سے ثوب شہرت ہوتا ہے آدمی اونچا لباس پہنتا ہے تاکہ میری شہرت ہو اور کبھی زیادہ سادگی کا لباس بھی شہرت میں داخل ہو جاتا ہے کہ آدمی بتکلف سادگی اختیار کرتا ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ لوگ مجھے بزرگ سمجھیں اور سادگی کی وجہ سے لوگ میری عزت کریں یا لوگ میری سادگی دیکھ کر میرے معتقد ہوں اور کچھ نذر و نیاز اور ہدایا تحائف ملنے لگ جائیں، یہ بھی ثوب شہرت میں داخل ہے۔

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثانی ج ۲/ ص ۳۷۵

ترک اہتمام زینت مطلوب ہے نہ کہ اہتمام ترک زینت:۔

یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھیں وہ یہ کہ پہلے مسئلہ زینت کا آیا تھا زینت ہو یا بذاذۃ اس کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے ایک عجیب بات بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سارے اہل اللہ نے سادگی کو اختیار فرمایا ہے، اس کا مطلب ترک اہتمام زینت ہے نہ کہ اہتمام ترک زینت، مقصد یہ ہے کہ زینت کا اہتمام نہیں کرتے لیکن اگر بغیر اہتمام کے ہو گئی تو اس سے بچنے کی بھی کوشش نہیں کرتے ترک زینت کا اہتمام مطلوب نہیں ہے کیوں کہ اصل یہ ہے کہ ایک مؤمن کو اپنے اعلیٰ مقاصد پر نظر رکھنی چاہئے نہ اس کو زینتِ اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور نہ ہی ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہئے بعض اوقات اہتمام ترک زینت بھی شہرت کی طرف مفضی ہو جاتا ہے اس لئے یہ مطلوب نہیں۔

آٹھواں اصول:۔

سہولت والا لباس...... ایک اصول لباس کا یہ ہے کہ لباس میں سہولت ہو، سہولت والا لباس بھی ایک درجے میں مطلوب ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص کو پسند فرمایا ہے جیسا کہ الفصل الثانی کی پہلی حدیث میں آ رہا ہے۔ اس زمانے میں قمیص کافی نیچی ہوتی تھی اس سے تقریباً سارا جسم چھپ جاتا تھا جیسے عربوں کا ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کو قمیص پسند ہونے کی وجوہ:۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قمیص پسند ہونے کی کئی وجوہ ہیں:

(۱)........... ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں ستر اور جسم زیادہ چھپتا ہے بنسبت ازار اور رداء کے۔

(۲)........... دوسری یہ کہ اس میں ستر چھپانے کی سہولت زیادہ ہے۔ آدمی ازار اور رداء کے ساتھ بھی ستر چھپا سکتا ہے لیکن اس میں آدمی کو ذرا مشقت اٹھانی پڑتی ہے ہر وقت خیال رکھنا پڑتا ہے جب کہ قمیص میں بسہولت ستر چھپا رہتا ہے چونکہ قمیص پسند ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سہولت ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ لباس میں سہولت بھی کسی درجے میں مطلوب ہے اگرچہ اتنی مطلوب نہیں جتنے پہلے اصول مطلوب ہیں۔

اہم اصول:۔

یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھیں کہ بعض کام ایسے ہیں جو حضور اقدس ﷺ نے کبھی کبھار کئے

ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی مطلوبیت زیادہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کم اس لئے کئے کہ زیادہ کرنے کا موقع نہیں ملا، وسائل مہیا نہیں ہوئے اور مطلوبیت اس لئے زیادہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قول سے اس کا مطلوب ہونا سمجھ میں آتا ہے مثلاً آنحضرت ﷺ کی زندگی کو اگر دیکھیں تو زیادہ ملے گا کہ آپ نے زیادہ تر ڈھیلوں کے ساتھ استنجاء کیا پانی کے ساتھ استنجاء کرنا شاید کم ملے اور اتنی بات طے شدہ ہے کہ صحابہ میں سے اکثر ڈھیلوں کے ساتھ استنجاء کرتے تھے پانی کے ساتھ استنجاء کم کیا جاتا تھا، عمل زیادہ ڈھیلوں کے ساتھ استنجاء کرنے کا تھا، لیکن اس کے باوجود پانی کے ساتھ استنجاء کرنا افضل ہے۔ افضل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے قولاً اس کی فضیلت ثابت ہے اور قولاً فضیلت نہ بھی ہوتی تب بھی اس کی مطلوبیت اس لئے زیادہ ہے کہ مقصود شریعت اس سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ شریعت کا مطلوب نظافت ہے، ڈھیلوں کا پھیرنا مقصود نہیں ہے اور صفائی اور نظافت زیادہ استنجاء بالماء میں ہوتی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ایک کام حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں کم کیا گیا ہو بعد میں زیادہ رواج پا گیا ہو یا ایجاد ہی بعد میں ہوا ہو لیکن چونکہ مقصود شریعت اس سے زیادہ حاصل ہو رہا ہے اس لئے اس کی مطلوبیت زیادہ ہو گئی چونکہ اس زمانے میں مہیا نہیں تھا اس لئے آپ نے نہیں کیا یا کم کیا۔ یہی معاملہ قمیص کا ہے آنحضرت ﷺ نے قمیص پہنی ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی یہ کہے کہ آپ نے قمیص کم پہنی ہے، ازار اور رداء زیادہ پہنی ہے لیکن اس کے باوجود قمیص کی مطلوبیت زیادہ ہے کم اس لئے پہنی کہ ملی کم ہو گی، مطلوبیت اس لئے زیادہ ہے کہ لباس کے مقاصد اس سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں، ستر بھی اس میں زیادہ ہے، زینت بھی اس میں زیادہ ہے اور سہولت بھی اس میں زیادہ ہے۔

شلوار میں لنگی کی بنسبت ادائیگی سنّیت زیادہ ہے:-

یہی معاملہ شلوار کا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے زیادہ تر لنگی باندھی ہے، شلوار پہننا اکثر حضرات کے نزدیک آپ سے ثابت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یوں نہیں کہیں گے کہ لنگی میں سنت زیادہ اداء ہوتی ہے بنسبت شلوار کے جیسے یوں نہیں کہہ سکتے کہ ڈھیلوں کے ساتھ استنجاء کرنے میں زیادہ فضیلت ہے بنسبت پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کے اس لئے کہ ایک تو حضور اقدس ﷺ کو شلوار کا پسند فرمانا ثابت ہے اور شاید خریدنا بھی ثابت ہے اور بظاہر جب خریدی ہو گی تو پہنی بھی ہو گی لیکن بہر حال پہننے کی تصریح نہیں ہے۔ پہنی بھی ہو گی تو کبھی کبھار اور دوسرے یہ کہ شلوار سے لباس کے مقاصد زیادہ پورے ہوتے ہیں بنسبت لنگی کے کہ اس میں ستر بھی زیادہ ہے کہ ہوا سے ادھر ادھر ہونے کا خطرہ نہیں ہے اور سہولت بھی زیادہ ہے کہ ایک مرتبہ پہن کر بے فکر ہو جاؤ۔ جب کہ لنگی میں ہر وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے، اٹھتے بیٹھتے پہلے اس کو درست کرنا پڑتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لنگی زیادہ باندھی ہے لیکن اس کے باوجود شاید یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ سنیت میں شلوار بڑھ کر ہے۔

نواں اصول:-

تشبّہ والا لباس...... لباس کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اس میں تشبہ نہ ہو یعنی ایسا لباس نہ ہو جس کے ذریعے آدمی کسی کافر قوم جیسا بن جائے اور دیکھنے میں یہ لگے کہ یہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ تشبہ بھی لباس کا ایک اہم اصول ہے، اس میں دونوں پہلو ہیں کہ اچھے لوگوں کے ساتھ تشبہ مطلوب ہے۔ انبیاء، صلحاء کے ساتھ لباس اور زینت میں تشبہ اختیار کرنا مقصود ہے، انبیاء کے ساتھ خصوصاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جتنی مشابہت زیادہ کرے گا اتنا ہی پسندیدہ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ برے لوگوں کے ساتھ تشبہ مذموم ہے، کفار کے ساتھ تشبہ زیادہ برا ہے، فساق اور فجار کے ساتھ اس سے کم برا ہے وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح تشبہ میں بعض اور چیزیں ہیں مثلاً مردوں کے لئے عورتوں کے ساتھ تشبہ اور عورتوں کے لئے مردوں کے ساتھ تشبہ مذموم ہے۔ بہر حال تشبہ بھی شریعت کا ایک اہم اصول ہے اور اس کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث مشہور ہے جو آگے آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من تشبه بقوم فهو منهم۔**[1] کہ جو آدمی کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا اور اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **ليس منا من تشبه بغيرنا۔**[2] کہ جو ہمارے غیر کے ساتھ تشبہ اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

آج کل بعض لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تشبہ اسلام کا مسئلہ نہیں ہے اگر کسی سے تشبہ ہو بھی جائے تو اس سے کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا۔ ایسے لوگ اس طرح کی احادیث پر کچھ کلام کرتے ہیں مثلاً حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کی سند پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کے ایک راوی ہیں حسان بن عطیہ وہ اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں ابو منیب سے اور حسان بن عطیہ کا ابو منیب سے سماع ثابت نہیں ہے اس لئے یہ حدیث سنداً صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں انقطاع پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حسان بن عطیہ کا ابو منیب سے سماع ثابت نہیں ہے بلکہ محدثین نے کہا ہے کہ ان کا سماع ثابت ہے۔

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثانی ج ۲/ ص ۳۷۵

(۲) جامع ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی کراهیۃ اشارۃ الید فی السلام ج ۲/ ص ۹۹

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی مروی نہیں ہے بلکہ اور بھی متعدد صحابہ سے مروی ہے مثلاً حضرت حذیفہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی حدیث روایت کی گئی ہے ان کی حدیثیں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے لئے مؤید ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر اس حدیث سے بالکل قطع نظر بھی کر لیں جس میں ہیں: **من تشبه بقوم فهو منهم**۔ کے لفظ ہیں تب بھی تشبہ کا مسئلہ دوسری واضح اور ناقابل انکار نصوص سے ثابت ہے مثلاً قرآن کریم میں آتا ہے: **لا تركنوا الى الذين ظلموا فتمسكم النار**۔[1] کہ تم ظالموں کی طرف میلان اختیار نہ کرو کہ اس کے نتیجے میں تمہیں جہنم کی آگ بھگتنی پڑے گی۔ یہاں ظالموں سے مراد کافر، فاسق، فاجر سارے کے سارے ہیں تو ظالموں کی طرف میلان سے بھی منع کیا گیا ہے کہ ان کی طرف قلبی میلان بھی نہ رکھو اور تشبہ کا حاصل یہ ہے کہ آدمی بہ تکلف کسی جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے یہ چاہتا ہے میں فلاں جیسا لگوں اب ظاہر ہے جب یہ چاہے گا کہ میں فلاں لوگوں کی طرح نظر آؤں تو یہ تب ہی ہو گا جب کہ دل کے اندر ان کی طرف طبعی میلان ہو بغیر ان کی طرف میلان کے آدمی یہ کوشش نہیں کرے گا کہ میں ان جیسا نظر آؤں جن کے ساتھ آدمی تشبہ اختیار کرتا ہے، ان کی طرف طبعی میلان بھی ہوتا ہے برے لوگوں کی طرف میلان سے منع کر دیا۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ تشبہ بھی ممنوع ہے اور اچھے لوگوں کی طرف چونکہ میلان مطلوب ہے اس لئے ان کے ساتھ تشبہ بھی مطلوب ہو گا۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی کاموں سے محض تشبہ کی وجہ سے منع فرمایا مثلاً ریشم پہننا مرد کے لئے ناجائز ہے ایک تو بذات خود ناجائز ہے اس کے علاوہ ایک وجہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بیان فرمائی کہ: **انما يلبس الحرير في الدنيا من لا خلاق له في الاخرة**۔[2] کہ ریشم وہ آدمی پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں یعنی یہ کافروں کا لباس ہے اس لئے ہمیں نہیں پہننا چاہئے۔

اسی طرح آگے مشکوۃ ہی میں حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں سے منع فرمایا ان میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ: **ان يجعل الرجل في اسفل ثيابه حريرا مثل الاعاجم او يجعل على منكبيه حريرا مثل الاعاجم**۔[3] کہ آدمی اپنے کپڑے کے نچلے حصے میں ریشم لگالے جیسا کہ عجمی یعنی مجوسی لگاتے ہیں یا آدمی اپنے کندھوں پر ریشم لگالے جیسا عجمی یعنی مجوسی لگاتے ہیں تو خاص طریقے سے ریشم لگانے سے اس لئے منع فرمایا کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔

---

(۱) سورۃ ہود آیت نمبر ۱۱۳ پارہ نمبر ۱۲ رکوع نمبر ۹......(۲) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الاول ج ۲/ص ۳۷۳

(۳) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثانی ج ۲/ص ۳۷۶

اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں چھوٹی کرنے کا حکم بیان فرمایا ہے۔[۱] اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ بذات خود مطلوب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض احادیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ: خالفوا المشرکین[۲] کہ مشرکین کی مخالفت کرو مشرکین سے مخالفت کرنے کے لئے ان کے ساتھ تشبہ سے بچنے کے لئے ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں چھوٹی کرنے کا حکم فرمایا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ تشبہ سے بچنا مطلوب ہے۔

اسی طرح کسی آدمی کے بال سفید ہو گئے تو کالے رنگوں کے علاوہ باقی رنگوں سے رنگنا جائز ہے لیکن بعض موقعوں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کے ساتھ بالوں کو رنگنے کا حکم فرمایا ہے اور اس کی وجہ بیان فرمائی کر یہود کے ساتھ مشابہت سے بچو۔[۳] چونکہ نہ رنگنے کی حالت میں یہودیوں کے ساتھ تشبہ ہو رہا تھا اس لئے آپ نے بالوں کو رنگنے کا حکم دیا حالانکہ بذات خود بالوں کا رنگنا واجب نہیں تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہود کے ساتھ تشبہ سے بچنا مطلوب ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھنا شروع کیا لیکن آپ کو پتہ چلا کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں اگر آئندہ سال زندہ رہا تو صرف دس محرم کا روزہ نہیں رکھوں گا بلکہ اس کے ساتھ ایک روزہ اور ملاؤں گا تاکہ یہود کے ساتھ تشبہ نہ ہو۔[۴] یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ذخیرہ حدیث میں اگر غور کیا جائے تو بے شمار مثالیں اور مل جائیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سارے کاموں کا حکم دیا گیا ہے اور بہت سارے کاموں سے منع کیا گیا ہے۔

محض اس وجہ سے کہ اس سے تشبہ لازم آرہا ہے لہٰذا اگر من تشبہ بقوم والی حدیث کو بالکل نظر انداز بھی کر دیں تب بھی برے لوگوں کے ساتھ تشبہ کا مضر اور مذموم ہونا اور اچھے لوگوں کے ساتھ تشبہ کا محمود مطلوب ہونا اور بھی بہت ساری احادیث سے ثابت ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ حدیث بھی آگے آرہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المخنثین من الرجال والمترجلات من النساء۔**[۵] کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو مردوں جیسا بننے کی کوشش کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان مردوں پر جو مخنث بنتے ہیں یعنی عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ تشبہ کا اسلام میں ایک درجہ ہے۔

پھر جو حضرات تشبہ کی بالکل نفی کرنا چاہتے ہیں وہ عام طور پر اس بات سے بھی سہارا لیتے ہیں جس

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب للباس باب الترجل الفصل الاول ج ۲/ ص ۲۸۰ ...... (۲) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس باب الترجل الفصل الاول ج ۲/ ص ۳۸۰

(۳) صحیح البخاری کتاب اللباس باب الخضاب ج ۲/ ص ۸۷۵ ...... (۴) صحیح مسلم کتاب الصوم باب صوم یوم عاشوراء ج ۱/ ص ۳۵۹

(۵) مشکاۃ المصابیح کتاب للباس باب الترجل الفصل الاول ج ۲/ ص ۳۸۰ ایضاً صحیح بخاری کتاب للباس باب المتشبہین بالنساء الخ ج ۲/ ص ۸۷۴

پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے کہ اصل میں لباس اور شکل وصورت یہ کوئی دینی مسئلہ نہیں یہ تو محض ایک تہذیب اور ثقافت کا مسئلہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص لباس اس وجہ سے پہنا کہ آپ عربوں کے اندر مبعوث ہوئے اور عربوں کا لباس یہی تھا اور اگر بالفرض آپ یورپ کے اندر مبعوث ہوتے تو آپ کا لباس یورپ کی طرح ہوتا اور اگر آپ ہندوستان میں مبعوث ہوتے تو آپ کا لباس ہندوستانیوں جیسا ہوتا یہ لباس تو آپ نے اس وجہ سے اختیار فرمایا کہ یہ لباس آپ کے زمانہ میں مروج تھا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے لیکن سو فی صد درست نہیں بلکہ لباس کے متعلق شریعت کے کچھ احکام موجود ہیں پہلے لباس کے متعلق دیکھا جائے گا کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں اگر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی تو اس سے بچنا ضروری ہے۔ اب یہ دینی مسئلہ بھی ہے محض تہذیبی اور ثقافتی مسئلہ نہیں ہے، جس لباس کی شریعت نے اجازت دے دی یا شریعت اس کے بارے میں خاموش ہے اس سے آگے تہذیب و ثقافت کا مسئلہ ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے جو چاہو لباس اختیار کرو۔

شریعت میں ظاہر کی اہمیت:-

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ظاہر سے کیا فرق پڑتا ہے آدمی کا باطن ٹھیک ہونا چاہئے جیسے کہتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں کسی شیعہ نے کالے کپڑے نہیں پہنے تھے تو کسی نے کہا کہ آپ نے کالے کپڑے کیوں نہیں پہنے تو اس نے کہا کہ ظاہر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا دل کا اعتبار ہوتا ہے۔ کالے کپڑے پہننے سے کیا ہوتا ہے دل کالا ہونا چاہئے۔ تو اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ ظاہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل باطن ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے شریعت میں جس طرح باطن مطلوب ہے اس طرح ظاہر بھی مطلوب ہے اور باطن بھی اس وقت تک محفوظ ہوتا ہے جب تک کہ ظاہر ٹھیک ہو اب آدمی کا یہ جسم ظاہر ہے اور روح باطن ہے۔

آدمی کہے کہ میرے جسم کی ضرورت نہیں اسے ختم کر دو تو ظاہر ہے اس طرح کہنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہو گا حالانکہ جسم کو ختم بھی کر دیا جائے روح تو پھر بھی باقی رہے گی وہ تو ختم نہیں ہوئی باطن تو ختم نہیں ہوا ظاہر ہی ختم ہوا ہے۔ آپ کے جسم کو کوئی زخمی نہ کرے لیکن آپ کے کپڑے پھاڑ دے تو آپ کو غصہ آئے گا حالانکہ ظاہر کو نقصان پہنچا ہے باطن کو تو کچھ نہیں ہوا۔ تو جس طرح باطن مطلوب ہوتا ہے اسی طرح ظاہر بھی مطلوب ہوتا ہے اور جس طرح شریعت کے بعض احکام باطن کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اسی طرح بہت سارے احکام ظاہر کے ساتھ بھی متعلق ہوتے ہیں اصل مقصود حکم شرعی کو پورا کرنا ہے، نہ ظاہر مطلوب ہے نہ باطن مطلوب ہے اصل مطلوب اللہ اور رسول کا حکم پورا کرنا ہے۔ لہٰذا اگر وہ حکم باطن سے

متعلق ہے تو وہاں باطن مطلوب ہے اگر حکم ظاہر سے متعلق ہے تو ظاہر مطلوب ہے اب یہ کہنا کہ ظاہر کی کوئی حیثیت نہیں یہ بات درست نہیں اس لئے کہ یہ بات پہلے سے ثابت کی جاچکی ہے کہ شریعت کے کچھ احکام لباس اور زینت سے بھی متعلق ہیں اور یہ احکام ظاہر سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک مقولہ ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان لوگوں کا بھی عجیب حال ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ شلوار ٹخنوں سے نیچے نہ ہو ٹخنے ننگے ہونے چاہئے اس وقت تو اس حکم کا مذاق آڑانے لگے کہ کیا فرق پڑتا ہے ٹخنے چھپا لیئے تو کیا فرق پڑا ٹخنے ننگے کر لئے تو کیا فرق پڑا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر ٹخنے ننگے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن جب انگریزوں نے کہا تو گھٹنے بھی ننگے کر دیئے اور نیکر پہن لی۔ اگر کوئی مولوی بے چارہ شلوار ٹخنوں سے اوپر کرلے تو وہ قابل مذاق ہے لیکن اگر انگریز کے کہنے پر گھٹنے بھی ننگے کرلیں، آدھی ران بھی ننگی کرلیں تو اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے۔ جہاں شریعت کا کوئی مسئلہ آئے تو وہاں ظاہر کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن جہاں فیشن کا مسئلہ آئے تو وہاں یہ کبھی نہیں کہا کہ فیشن دل میں ہونا چاہئے ظاہر میں نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

کون سا تشبہ ممنوع ہے:۔

یہاں اصل بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اسلام نے جس تشبہ سے منع کیا ہے وہ کون سا تشبہ ہے اس لئے کہ فی الجملہ غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت ہر ایک کو ہوتی ہے اور یہ بات بعض کہتے بھی ہیں کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ تشبہ ناجائز ہے حالانکہ کافر بھی ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں، آپ بھی ہوائی جہاز میں سفر کرلیتے ہیں، وہ بھی بریانی، قورمہ وغیرہ چیزیں کھاتے ہیں آپ بھی یہ چیزیں کھاتے ہیں، وہ بھی کمرے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اے۔ سی استعمال کرتے ہیں آپ بھی استعمال کرتے ہیں۔ تو کافروں والے کام تو ہو گئے اور یہ سارے کے سارے کام ایجاد بھی کافروں کے کئے ہوئے ہیں، جہاز ان کا ایجاد کیا ہوا ہے یہ ساری چیزیں ان کی ایجاد کی ہوئی ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار نہیں کریں گے حالانکہ آپ مشابہت اختیار کر رہے ہیں لہٰذا یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کون سا تشبہ ممنوع ہے۔

اس پر سب سے منقح گفتگو ماضی قریب کے علماء میں سے دو حضرات نے کی ہے: ایک حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے حیات المسلمین میں مختصر گفتگو فرمائی ہے لیکن کافی جامع ہے اور دوسرے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی ایک مستقل کتاب ہے التشبہ فی الاسلام کے نام سے جو آج کل

اسلامی تہذیب و تمدن کے نام سے چھپتی ہے۔اس میں حضرت نے تشبہ کے مسئلہ پر کافی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس میں یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ کون سا تشبہ ممنوع ہے اور کون سا غیر ممنوع ہے۔

ان دونوں حضرات کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مشابہت ابتداءً تین طرح کے کاموں میں ہوتی ہے۔

غیر اختیاری امور میں مشابہت ...... ایک غیر اختیاری امور میں مشابہت جیسے کافروں کی بھی دو آنکھیں ہیں اور ہماری بھی دو، جیسے ان کے چہرے کے درمیان میں ناک ہے ہمارے چہرے کے درمیان میں بھی ناک ہے، ان کے بھی دانت ہیں ہمارے بھی دانت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ چونکہ بالکل غیر اختیاری امور ہیں فطری امور ہیں ان میں انسان مکلف نہیں ہے اس لئے اس کے ساتھ حکم شرعی کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اختیاری امور جو غیر اختیاری کی طرح ہیں ان میں تشبہ ...... دوسرے وہ امور ہیں جو اختیاری ہیں یعنی اپنے اختیار سے کرتے ہیں لیکن غیر اختیاری کی طرح ہیں اس لئے کہ ہم ان سے بچ نہیں سکتے جیسے بھوک لگے تو کھانا پیاس لگے تو پینا اور تھک جائے تو سونا، اب جب یہ کھاتے ہیں تو اپنے اختیار سے کھاتے ہیں، ارادہ کر کے کھاتے ہیں یہ تو نہیں کہ غیر اختیاری طور پر منہ میں لقمے چلے جاتے ہیں، پیتے ہیں تو اپنے اختیار سے پیتے ہیں، سوتے ہیں تو اپنی مرضی سے لیٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک معنی میں یہ غیر اختیاری بھی ہیں کہ اگر ہم کھانے سے بچنا چاہیں تو نہیں بچ سکتے بہر حال زندگی بچانے کے لئے کھانا پڑتا ہے، اگر ہم پینے سے بچنا چاہیں تو نہیں بچ سکتے۔ ہر انسان کو بحیثیت انسان یہ کام کرنا پڑتے ہیں لہٰذا ان میں بھی تشبہ کا کوئی مسئلہ نہیں۔

اختیاری امور میں تشبہ ...... تیسرے وہ کام جو مکمل طور پر اختیاری ہیں مثلاً خاص انداز کا لباس، لباس پہننا ہماری مجبوری ہے لیکن خاص قسم کا لباس یہ مجبوری نہیں یہ اختیاری ہے یا خاص انداز سے کھانا یا خاص انداز سے جسم کی بناوٹ بنانا خاص انداز کے بال وغیرہ وغیرہ یہ امور اختیاریہ ہیں۔ اصل تشبہ کا مسئلہ امور اختیاریہ میں سے ہے اور امور اختیاریہ دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کا تعلق عبادات سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق عادات کے ساتھ ہے۔ کسی قوم کے اندر وہ کام عبادت سمجھ کر نہیں کئے جاتے بلکہ عام عادت سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔

عبادات سے متعلق امور اختیاریہ میں تشبہ ...... جن کاموں کا تعلق عبادات کے ساتھ ہے ان میں تشبہ حرام ہے تشبہ کا معنی از خود کسی کافر قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے یہ نہیں کہ غیر اختیاری طور پر ان کے مشابہ ہو گئے ہیں بلکہ از خود ان جیسا کام کرنا یہ اگر عبادت کے اندر ہے تو حرام ہے یعنی جو

کام وہ بطور عبادت کے کرتے ہیں وہی کام اسی طریقہ سے اگر ہم کریں گے تو یہ حرام ہو گا جیسے زنار باندھنا یا گلے میں صلیب لٹکانا وہ صلیب ایک دنیاوی کام سمجھ کر نہیں لٹکاتے بلکہ اپنے دین کا ایک حصہ سمجھ کر لٹکاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تشبہ کفر تک بھی پہنچ جاتا ہے مثلاً بت کو سجدہ کرنا دل میں اس بت کو خدا نہیں سمجھتا دل میں خدا صرف اللہ کو جانتا ہے، دل میں توحید موجود ہے عقیدہ ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے علماء نے بت کو سجدہ کرنے کو کفر قرار دیا ہے۔ ظاہری احکام میں اس پر کفر کا حکم لگادیں گے۔ بہر حال امور عبادت میں تشبہ حرام ہے بلکہ بعض اوقات کفر تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

عادت سے متعلق امور اختیاریہ میں تشبہ ...... جہاں تک امور عادت کا تعلق ہے جو کام بطور عادت کئے جاتے ہیں ان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ کام کسی قوم کا شعار بن چکے ہوں یعنی کسی کافر قوم کے ساتھ اس طور پر خاص ہو چکے ہوں کہ اگر کوئی دوسرا یہ کام کرے تو دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے مثلاً ہندو مخصوص انداز سے دھوتی باندھتے ہیں جہاں ہندو رہتے ہیں وہاں یہ دھوتی دیکھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ہندو ہیں چاہے وہ عیسائی ہوں، مسلمان ہوں یا کوئی اور ہوں لیکن دیکھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ ہندو ہے۔ تو مخصوص انداز کی دھوتی اس انداز سے ہندوؤں کے ساتھ خاص ہو گئی ہے کہ دیکھنے والے اس کو ہندو تصور کرتے ہیں یہ ان کا شعار بن گیا ہے یا خاص انداز سے ان کے سلام کرنے کا طریقہ ہوتا ہے، ہاتھ جوڑ کر نمستے جیسا کوئی لفظ کہتے ہیں عام طور پر اس طرح کوئی کرے گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ یہ ہندو ہے یہ ہندوؤں والا کام کر رہا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جو کسی قوم کا شعار بن چکے ہوں دوسرے وہ امور ہیں جو کسی کافر قوم کا شعار نہیں بنے ان کے ساتھ خاص نہیں۔

کافر قوم کے شعار میں تشبہ ...... جو چیزیں کسی کافر قوم کا شعار بن چکی ہوں اگرچہ وہ بطور مذہبی امر کے نہیں کرتے بلکہ عادت کے طور پر کرتے ہیں تب بھی ان میں تشبہ مکروہ تحریمی ہے۔

کافر قوم کے غیر شعار میں تشبہ ...... جو کام کافر قوم کا شعار نہیں ہیں ان میں تشبہ اگرچہ ناجائز نہیں ہے فی نفسہ مباح ہے لیکن پھر بھی اگر وہ کام تشبہ کی نیت سے کئے جائیں تو ناجائز ہوں گے اور اگر بغیر تشبہ کی نیت سے کئے جائیں گے تو جائز ہوں گے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا متبادل مسلمانوں کے پاس موجود ہے تو پھر ان کے طریقہ کو اختیار کرنا خلاف اولیٰ ضرور ہے مسلمانوں کو اپنا متبادل اختیار کرنا چاہئے۔

خلاصہ ...... ابتداءً تین قسمیں تھیں:

(۱) غیر اختیاری امور۔ (۲) غیر اختیاری کی طرح۔ (۳) اختیاری امور۔

پہلے دو امور کے ساتھ حکم شرعی کا تعلق نہیں ہے: **لا یکلّف اللہ نفسا الا وسعھا۔**[1] البتہ امور اختیاریہ کے ساتھ حکم شرعی متعلق ہے تو امور اختیاریہ میں تشبہ دو طرح کا ہو گیا ایک عبادات میں دوسرا عادات میں عبادات میں تشبہ حرام بلکہ بعض دفعہ موجب کفر ہوتا ہے اور عادات میں یہ دیکھیں کے کہ کسی خاص قوم کا شعار بنا ہے یا نہیں اگر کسی خاص قوم کا شعار ہے تو مکروہ تحریمی ہے اور اگر کسی خاص قوم کا شعار نہیں ہے تو اگر تشبہ کی نیت سے کرتا ہے تو چونکہ اس کی نیت یہ ہے کہ فلاں قوم کی طرح لگوں اس لئے یہ ممنوع ہے، اگر تشبہ کی نیت نہیں ہے تو پھر جائز تو ہے لیکن اگر مسلمانوں کے پاس اس کا متبادل موجود ہے تو ان کے طریقے کو اختیار کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

ان تمام احکام کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ جو تشبہ ناجائز ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک امور دینیہ یعنی امور عبادت میں تشبہ دوسرے میں کسی قوم کے شعار میں تشبہ ایک میں حرام ہے اور ایک میں مکروہ تحریمی ہے اور دونوں قریب قریب ہیں۔

تشبہ کا حکم حالات کے بدلنے سے بدل بھی سکتا ہے:۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تشبہ کی وجہ سے کسی کام کا حکم زمانہ یا علاقہ کے بدلنے کی وجہ سے بدل بھی سکتا ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک کام ایک زمانہ میں بطور عبادت کے کیا جاتا ہو لیکن دوسرے زمانے میں اس قوم کے اندر اس کی عبادت والی حقیقت ختم ہو جائے اور وہ ایک عام دنیوی کام کے طور پر کرنے لگ جائیں یا ہو سکتا ہے کہ ایک کام ایک زمانے میں کسی قوم کا شعار ہو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو لیکن دوسرے زمانے میں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہ رہے بلکہ اور بھی قومیں کرنے لگ جائیں وہ کام ہندو بھی، عیسائی بھی کرتے ہیں، یہودی بھی کرتے ہیں، مجوسی بھی کرتے ہیں، بدھ مت والے بھی کرتے ہیں مختلف قوموں والے کرتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کام آج کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں اس کا شعار نہیں لہٰذا وہ تشبہ ممنوع میں داخل نہیں لیکن کل کو وہ کسی کے ساتھ خاص ہو جائے تو یہ تشبہ ممنوع میں داخل ہو جائے گا۔

تشبہ کا حکم وقت اور حالات کے بدلنے سے بھی بدل جاتا ہے، علاقے کے بدلنے سے بھی بدل سکتا ہے، ایک علاقہ میں خاص ہیئت کو دیکھ کر یہ شبہ پڑتا ہے کہ فلاں لوگوں میں سے ہے لیکن دوسرے علاقے میں ایسا نہیں لگتا تو پہلی جگہ تشبہ ممنوع ہو گا اور دوسری جگہ تشبہ ممنوع نہیں ہو گا بلکہ دوسری جگہ تشبہ پایا ہی نہیں گیا اس لئے فقہا بہت سارے مسائل میں یہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے یہ کام

(۱) سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۸۶ رکوع نمبر ۴۰ پارہ نمبر ۳

ناجائز ہے لیکن ہمارے ہاں چونکہ یہودیوں کے ساتھ تشبہ نہیں پایا جاتا اس لئے ہمارے ہاں جائز ہے۔

بہت سارے کام ایسے ہو سکتے ہیں کہ ایک علاقہ میں یہودی بکثرت پائے جاتے ہیں اور یہودی وہ کام کرتے بھی ہیں وہاں اگر یہ کام کریں گے تو دیکھ کر یہ تاثر ابھرے گا کہ شاید یہ بھی انہیں میں سے ہے لیکن دوسرا علاقہ ایسا ہے کہ جہاں کبھی کسی نے کوئی یہودی دیکھا ہی نہیں پتہ ہی نہیں کہ وہ کیسے ہیں اور ان کی عادات اور اطوار زندگی کیسے ہوتے ہیں، وہاں پر یہ تشبہ نہیں ہوگا جب یہودی یہ کام کرتے تھے تو فقہاء نے ان کے تشبہ کی وجہ سے منع کر دیا لیکن دوسرے زمانے میں انہوں نے وہ کام چھوڑ دیئے تو اب تشبہ نہ رہا یا وہی کام دوسرے لوگوں نے اختیار کر لیا یہودیوں کے ساتھ خاص نہ رہا تو اب بھی تشبہ نہیں رہے گا اگر فقہ کی کتابوں میں دیکھیں تو آپ کو اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بعض مواعظ میں تشبہ کا معنی بیان فرمایا ہے کہ تشبہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کو دیکھ کر یہ لگے کہ یہ فلاں قوم میں سے ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ وقت کے بدلنے سے حکم بھی بدل جاتا ہے اور حضرت نے اس کی مثال میز کرسی کی بیان فرمائی ہے، کسی وقت ہمارے ہاں میز کرسی عام نہیں ہوتی تھی بلکہ انگریزوں کے ساتھ خاص سمجھی جاتی تھی لیکن حضرت نے فرمایا کہ یہ ہمارے زمانے میں اب عام ہو گئی ہے اور انگریزوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی بکثرت استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس لئے بظاہر اب اس میں تشبہ نہیں رہا البتہ حضرت فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ابھی چونکہ بہت عام نہیں ہے اس لئے کچھ کھٹک سی ضرور رہتی ہے کہ شاید یہ تشبہ ممنوع میں داخل ہو۔[1] حضرت کی گفتگو سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اگر بہت عام ہو جائے تو پھر یہ کھٹک بھی باقی نہیں رہے گی اصل بات جو سمجھانا چاہتا ہوں وہ اصول ہے کہ تشبہ کا حکم وقت کے بدلنے سے بدل جاتا ہے اس کا دارومدار کسی قوم کے ساتھ خاص ہونے یا عبادت ہونے پر ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے تحت یہ بحث چھیڑی ہے کہ ایک حدیث سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے اور بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طیلسان پہنی ہے یہ طیلسان خاص قسم کی ایک چادر ہوتی ہے جو عام طور پر سر کے اوپر بھی ہوتی تھی اور باقی جسم کے اوپر بھی ہوتی تھی اس پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہودیوں کا لباس قرار دیا ہے مثلاً آپ نے فرمایا کہ دجال کی پیروی ستر ہزار یہودی کریں گے اور ان پر طیالسہ ہوں گی یعنی طیلسان ہوں گی، اس کو یہودیوں کا لباس قرار دیا ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیسے پہن لیا اس

---

(۱) حضرت تھانوی کی عبارت کتاب الاطعمہ کی حدیث نمبر ۱۱ کی تشریح میں گزر چکی ہے۔

کا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، ایک خاص وقت میں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ یہودیوں کے ساتھ خاص ہو جائے اس زمانے میں اس کا پہننا ممنوع ہو گا اور تشبہ ہو گا لیکن اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودیوں کے ساتھ خاص نہیں ہو گی اس لئے اس زمانے میں اس کا پہننا ممنوع نہیں ہو گا اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک اور بات پیش کی ہے کہ طبقات ابن سعد رحمہ اللہ میں ایک روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے طیلسان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: **هذا ثوب لا يؤدى شكره**۔[1] کہ یہ ایسا کپڑا ہے کہ اس کا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طیلسان ممنوع نہیں حالانکہ دوسری جگہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کو یہودیوں کی علامت قرار دے رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک زمانے میں ان کی علامت ہو گی اور ایک زمانے میں ان کی علامت نہیں ہو گی جس زمانے میں ان کی علامت ہو گی اس زمانے میں تشبہ کی وجہ سے ممنوع ہو گا اور جس زمانے میں ان کی علامت نہیں ہو گی تو اس زمانے میں یہ ممنوع نہیں ہے بہر حال یہ اصول طے شدہ ہے کہ تشبہ کا حکم وقت کے بدلنے سے بدل بھی سکتا ہے۔

اصل وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے تھا کہ دو کاموں کی وجہ سے تشبہ ناجائز یا مکرو تحریمی بنتا ہے عبادت کے قبیل سے ہو یا کسی قوم کا شعار ہو اب ہمارے ہاں کچھ لباس مروج ہیں ان کا جائزہ لے لیں کہ یہ تشبہ میں داخل ہے یا نہیں۔

میز کرسی پر کھانے کا حکم:۔

ایک مسئلہ میز کرسی پر کھانے کا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ فی نفسہٖ جائز ہے اس کو عربی میں مائدۃ کہتے ہیں اور امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کے مباح ہونے کی تصریح کی ہے۔[2] کتاب الاطعمہ میں تفصیل کے ساتھ اس پر بحث ہو چکی ہے۔[3]

لیکن ہمارے بعض اکابر نے تشبہ کی وجہ سے اسے ممنوع قرار دیا ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے زمانے میں ہو سکتا ہے اس میں تشبہ ہو ہمارے زمانے میں اس میں تشبہ نہیں رہا، اس لئے کہ یہ کسی کافر قوم کے ساتھ خاص نہیں رہا بلکہ ایک بین الاقوامی عادت بن گئی ہے۔ تقریباً ہر مذہب ہر قوم کے لوگ اس کو بکثرت استعمال کرنے لگے ہیں اس لئے اب تشبہ برقرار نہیں رہا لہٰذا اباحۃ اصلیہ والا حکم لوٹ آئے گا البتہ یہ الگ بات ہے کہ نیچے بیٹھ کر دستر خوان بچھا کر کھانا اقرب الی السنۃ ہے۔

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب التقنع ج ۱۰ / ص ۲۲۵ ...... (۲) احیاء علوم الدین مع الاتحاف ج ۵ / ص ۲۱۴ ...... (۳) حدیث نمبر ۱۱ کی تشریح میں

پتلون کا حکم:-

اسی طرح پتلون ہے اس کو بھی بعض حضرات نے تشبہ کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے لیکن ہمارے زمانے میں یہ بات محل نظر ہے اس لئے کہ یہ بھی کسی کافر قوم کا شعار اور ان کے ساتھ مخصوص نہیں رہی لیکن پتلون میں کچھ مفاسد ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ پسندیدہ لباس نہیں ہے۔

پتلون میں مفاسد:-

ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ بہت تنگ ہوتی ہے اور اتنی تنگ ہوتی ہے کہ اعضاء جسم کی حکایت ہوتی ہے یعنی ان کا حجم محسوس ہوتا ہے اور بعض حالات میں ایسا بھی ہو سکتا ہے خاص طور پر اگر زیر جامہ پہنا ہوا نہ ہو تو اعضاء مستورہ کی بھی حکایت ہو لیکن اگر پتلون کھلی کھلی ہو تو اس میں یہ مفسدہ نہیں ہوگا اور دوسرا مفسدہ اس میں یہ ہے کہ جسم کو چھپانا مثلاً رانوں کو چھپانا یہ تو ضروری ہے رانوں کے درمیان خلاء کو چھپانا اگرچہ ضروری نہیں ہے شرعاً کیوں کہ یہ ستر نہیں اس لئے کہ ستر انسان کا جسم ہوتا ہے خلاء نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی اگر اسلامی تعلیمات کو دیکھیں تو اسلامی تعلیمات کے مزاج سے معلوم ہوتا ہے کہ کمال حیاء کا تقاضا یہ ہے کہ جب لوگوں کے سامنے جائیں بے تکلفی کا ماحول نہ ہو تو یہ خلاء بھی پر ہونا چاہئے مثلاً اگر لنگی پہنی ہوئی ہو تو اس میں سارا ستر کور ہو جاتا ہے، اگر شلوار وغیرہ پہنی ہوئی ہو تو ہمارے ہاں اکثر مشرقی لباسوں میں اور اسلامی ملکوں کے لباسوں کے اندر ان حصوں پر کرتہ یا قمیص یا جبہ یا اور کوئی اس طرح کی چیز ہوتی ہے اور پتلون میں عام طور پر چونکہ اوپر شرٹ وغیرہ ہوتی ہے اس لئے اس خلاء پر کوئی چیز نہیں ہوتی اس خلاء کا کھلا ہونا اگرچہ گناہ نہیں ہے، خلاف شریعت نہیں ہے لیکن بحیثیت مجموعی اسلامی مزاج سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لباس کمال حیاء کے منافی ہے چونکہ اس میں بعض خرابیاں ضرور ہیں اس لئے یہ پسندیدہ لباس نہیں ہے۔ لیکن ہمارے دور میں اس میں تشبہ نہیں پایا جاتا اس لئے کہ یہ لباس ہمارے زمانے میں کسی کافر قوم کے ساتھ خاص نہیں رہا بلکہ دنیا کے ہر ملک اور علاقے میں پہنا جاتا ہے اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پہنتے ہیں اور وہ لوگ بھی پہنتے ہیں جن کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہوتا لہٰذا اس میں تشبہ نہیں ہے اس لئے اس کو بالکل حرام اور مکروہ تحریمی قرار نہیں دے سکتے لیکن پیچھے ذکر کردہ مفاسد کی وجہ سے ایک ناپسندیدہ لباس ضرور ہے خاص کر اگر وہ چست اور بہت تنگ ہو تو وہ زیادہ قابل احتراز ہے۔

پاجامہ اور پتلون میں فرق:-

اس سے ایک فرق سمجھ میں آیا اور بعض لوگوں کو یہ اشکال ہو جاتا ہے کہ پاجامہ اور پتلون میں اپنی

ذات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے بس اتنا فرق ہے کہ پتلون عام طور پر موٹے کپڑے کی بنتی ہے اور پاجامہ پتلے کپڑے کا بنتا ہے ورنہ اور کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

لیکن فرق ضرور ہے وہ یہ کہ جب پاجامہ پہنا جائے تو اس کے اوپر کرتہ وغیرہ پہنا جاتا ہے عام طور پر رانوں پر بھی آجاتا ہے جب کہ پتلون کے اندر یہ بات نہیں ہوتی یہ ایک فرق ہے، ایک عرب دوست ایک دفعہ بتانے لگے کہ میں ہندوستان میں گیا تو وہاں میں نے بہت سارے علماء کو پتلون پہنے ہوئے دیکھا میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے انہوں نے پاجامہ پہنا ہو آپ نے اس کو پتلون سمجھ لیا، یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

پتلون کے اندر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ ہر اسلامی ملک کا اپنا اپنا لباس ہے جیسے پاکستانی لباس شلوار قمیص ہے عربوں کا اپنا ایک لباس ہے، دوسرے بھی اسلامی ملکوں کے اپنے اپنے لباس ہیں اپنے اس لباس کو چھوڑ کر ایک اجنبی لباس کو پہننا پسندیدہ نہیں۔

چونکہ وہ کسی خاص قوم کا شعار نہیں ہے اس لئے تشبہ میں داخل نہیں لیکن یہ لباس اجنبی ضرور ہے، اس لباس کو پہن کر گویا اس نے اپنے لباس کو اتنا بہتر نہیں سمجھا جتنا دوسرے کو بہتر سمجھا ہے اس لئے گناہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن ناپسندیدہ ضرور ہے لہٰذا اس لباس سے بچنا اولیٰ ہے۔

پھر اس میں نیت سے بھی فرق پڑ جاتا ہے کہ جو شعار نہ ہو اگر وہ تشبہ کی نیت سے پہنا ہے تو ناجائز ہے اور اگر تشبہ کی نیت سے نہیں پہنا تو جائز ہے۔ اگر کوئی اس لئے پہنتا ہے کہ اس میں انگریزوں جیسا بن جائیں تو اس کے لئے وہ زیادہ برا ہو جائے گا اور اگر ویسے ہی پہنتا ہے کہ ہمارے ہاں لوگ پہنتے ہیں یا اس طبقے کے لوگ پہنتے ہیں یا اس پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ بکثرت پہنتے ہیں۔ خاص طور پر ڈیوٹی کے اوقات میں بکثرت پہنی جاتی ہے اس لئے یہ بھی پہن لیتا ہے تو اس سے حکم مختلف ہو جائے گا۔

صلحاء کا لباس ہونے نہ ہونے سے بھی فرق پڑتا ہے:۔

تشبہ میں ایک اور چیز سے بھی فرق پڑ جاتا ہے اور وہ یہاں پر بھی پڑے گا اور وہ یہ کہ بعض علاقوں میں ایسا ہوتا ہے کہ صلحاء اور نیک لوگ اس لباس سے بچتے ہیں مثلاً پتلون وغیرہ سے بچتے ہیں جیسا کہ ہمارے بیشتر علاقوں میں ایسا ہوتا ہے تو وہاں اس سے بچنا اس لئے بھی زیادہ اصلح ہو گا کہ یہ صلحاء کا لباس نہیں ہے اور آدمی کو چاہئے کہ اپنے آپ کو صلحاء کے زیادہ قریب کرے اور دنیا کے بعض خطے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جہاں صلحاء بھی یہ لباس بکثرت پہنتے ہوں تو وہاں اس کی حیثیت اور ہو جائے گی علاقے کے بدلنے سے حکم میں فرق پڑ جائے گا۔

ٹائی کا حکم:-

اسی طریقے سے ٹائی کا مسئلہ ہے، ٹائی میں ایک بات تو وہی ہے جو پتلون وغیرہ میں ہے اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ پورے سوٹ کا حصہ ہے کہ پتلون اس سے اوپر کوٹ یا شرٹ وغیرہ اور اس کے اوپر ٹائی باندھی ہوتی ہے جو حکم اس کا ہے وہی ٹائی کا بھی ہونا چاہئے کیوں کہ اسی سوٹ کا یہ حصہ ہے، آج کل اس میں تشبہ نہیں رہا البتہ بعض دیگر وجوہ کی بنا پر اس سے بچنا ضروری ہے یہی حکم ٹائی کا بھی ہوگا اس سے بھی بچنا چاہئے لیکن تشبہ کی وجہ سے حرام نہیں۔

ایک عارض کی وجہ سے دوسرے پہلو کے اعتبار سے یہ مسئلہ قابل غور ہے وہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ ٹائی در حقیقت صلیب کی علامت ہے اور اسی حیثیت سے پہنی جاتی ہے، اس صورت میں یہ عادت کے امور سے نکل کر بظاہر عبادت کے امور داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو پھر واقعتاً قابل غور ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ٹائی کے بارے میں بات ثابت بھی ہے یا نہیں بعض حضرات سے ہم نے پوچھا بھی ہے اور بعض کتابوں کی طرف مراجعت بھی کی ہے لیکن کہیں اس بات کا ثبوت نہیں مل سکا کہ ٹائی کی ایجاد بطور علامت صلیب کے ہے۔ دو تین سال پہلے ایک صاحب نے کسی انسائیکلو پیڈیا کے کچھ صفحے فوٹو سٹیٹ کروا کر دیئے تھے ان کے اندر ٹائی کے بارے میں پوری تفصیل ہے، میں نے بڑے اہتمام سے ان سے لئے اور گھر جا کر پڑھے اس میں ٹائی کی تاریخ تھی کہ فلاں زمانے میں یہ بڑی ہوتی تھی اور فلاں زمانے میں چھوٹی ہوتی تھی، اتنا سائز ہوتا تھا لیکن یہ بات اس میں کہیں نہیں ملی کہ یہ بطور علامت صلیب پہنی جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے اپنے بھائی کے حوالے سے بتایا یہ تقریباً ۹۰ کے لگ بھگ کی بات ہے کہ ایک انگریزی رسالہ **Reader's Digest** چھپتا ہے یہ بہت مشہور رسالہ ہے اس میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ٹائی اصل میں انگریزوں کی ایجاد ہی نہیں بلکہ ترکوں کی ایجاد ہے اور میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ رسالہ مجھے لا کر دینا لیکن اس نے لا کر نہیں دیا اور میں خود بھی تلاش نہ کر سکا اس لئے حتمی طور پر اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے اور بعید از قیاس نہیں کہ اس کی ایجاد اس حیثیت سے ہوئی ہو کہ جس طرح بچوں کو کھلاتے وقت بب لگا لیا جاتا ہے اس طرح کی کوئی چیز ہو اور بعد میں فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہو اور فیشن بنتے بنتے چھوٹی ہوتی چلی گئی یہ بعید از قیاس نہیں۔ لیکن بہر حال اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملا اگر کسی کو ملے تو ہمیں بھی مطلع کر دے تا کہ مسئلہ پر از سر نو غور کر سکیں۔ بہر حال ثبوت کی ضرورت ہے اور اگر اس کا ثبوت مل بھی جائے کہ اس کی ایجاد بطور علامت صلیب کے ہے تو بھی ایک پہلو اور بھی قابل غور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اگر چہ اس کی ایجاد اس حیثیت سے ہوئی ہے لیکن بہر حال آج کل ٹائی اس حیثیت سے نہیں پہنی جاتی اور عموماً ٹائی پہننے والے کے

تصور میں بھی نہیں ہوتا کہ میں صلیب کی علامت باندھ رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جو صلیب کو مانتے ہیں وہ بھی ٹائی باندھتے ہیں اور جو صلیب کو نہیں مانتے یہودی، ہندو، مجوسی یا وہ لوگ جو صلیب کو تو کیا ماننا سرے سے کسی مذہب کو نہیں مانتے وہ بھی ٹائی باندھتے ہیں اگر اس کی ایجاد اس حیثیت سے ہوئی ہو تب بھی یہ حیثیت باقی نہیں رہی۔

اگر کسی چیز کی ایجاد اور حیثیت سے ہو لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے اس کی حیثیت بدل جائے تو حکم بھی بدل جائے گا ورنہ میرا اندازہ ہے تحقیق نہیں ہے کہ بہت سارے کھانے ایسے ہیں کہ اگر ان کے پیچھے تحقیق کریں گے تو اس کے پیچھے کوئی کفریہ یا شرکیہ بات ہو مثلاً حلوہ پوری ہے اس کی تاریخ اگر تلاش کریں تو ہو سکتا ہے کہ اس کی سند ہندوؤں کے ساتھ جا کر ملے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب اس کی حیثیت کیا ہے تو اب بظاہر اس کی یہ حیثیت نہیں یہی وجہ ہے کہ عام لوگ ٹائی باندھتے ہیں لیکن ان کے پادری جب مذہبی لباس میں ہوتے ہیں اور مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے آتے ہیں تو اس وقت ان کی ٹائی نہیں ہوتی بلکہ عام طور پر یا تو ایک بڑا جبہ ہوتا ہے یا کوٹ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ گلے میں زنجیر کے ساتھ صلیب لٹکائی ہوتی ہے۔ ایک صاحب مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں وہ ایک دفعہ ملے تو ٹائی کے بارے میں بات کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ علماء ہمارا ساتھ نہیں دیتے ہم فلاں جگہ سے اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو وہ کسی آدمی کے حوالے سے کہنے لگے: اس نے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اس کی تحقیق کے لئے ان کا جو پوپ Vatican City میں رہتا ہے اس کو خط لکھ دیں۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے خط لکھا تھا۔ میں نے کہا: اس کا جواب آیا ہے۔ کہنے لگے: جواب کو آپ چھوڑیں پتہ نہیں کیا جواب آیا ہوگا۔ بہر حال بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جواب ان کی رائے کے خلاف ہوگا۔ خیر اس میں تعمق میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی شریعت اتنے تعمق کا مکلف بناتی ہے۔ ظاہری طور پر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ آج کل اس میں کوئی اس طرح کی بات نہیں پائی جاتی بظاہر یہ تشبہ میں داخل نہیں ہے اور اس کی وجہ سے اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا، ہاں جس طرح باقی سوٹ سے بچنا بہتر ہے اس سے بچنا بھی بہتر ہے خاص طور پر ہمارے علاقے کے لحاظ سے کہ یہ صلحاء کا لباس نہیں سمجھا جاتا، یہی حکم ٹائی کا بھی ہوگا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اکیلی ٹائی صلیب کی علامت نہیں البتہ اس کے ساتھ بو (Bow) ہوتی ہے جو ٹائی کے اوپر باندھی جاتی ہے لیکن یہ بات بھی محتاج دلیل ہے جب تک واضح طور پر ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک حکم لگانا مشکل ہے۔ اب تک جو فہم ناقص میں آیا ہے وہ یہی ہے: **ورحم اللہ امرأ نبهني على الخطأ**۔

مسائل بتانا بڑی نازک ذمہ داری ہے:-

دین در حقیقت امانت ہے مسئلہ وہی بیان کرنا چاہئے جو ہے، جب آدمی مسئلہ بتانے کے لئے بیٹھتا ہے

تو وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے وہ اپنی بات نہیں کر رہا ہوتا اس لئے مسئلہ بتانے والے پر بہت بڑی ذمہ داری وارد ہوتی ہے کسی حرام کو حلال کہنا جس طریقے سے غلط ہے اتنا ہی غلط ہے بلکہ اس سے زیادہ غلط ہے کسی حلال کو حرام کہنا کسی حرام کو حلال کہنا اس لئے برا ہے کہ جب اس کو حلال کہا تو اس کو اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اس طرح سے اگر حلال کو حرام کہا تب بھی اللہ کی طرف ایک غلط بات کی نسبت ہو گئی اس لئے کسی بات پر حکم شرعی لگانا، فتویٰ دینا، مسئلہ بتانا یہ پل صراط پر چلنے کی طرح ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک طرف کو ہو جائیں گے جس چیز میں تھوڑا سا تردد نظر آیا اس کو ناجائز کہہ دیا احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو ناجائز کہہ دیا جائے وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم ناجائز کہہ رہے ہیں لوگوں کو اس سے منع کر رہے ہیں اس لئے ہم بری الذمہ ہیں اگر جائز کہیں گے تو ہو سکتا ہے کہ فی نفسہ وہ ناجائز ہو لوگ وہ کام کریں گے تو ہم سے مؤاخذہ ہو گا لیکن اگر بے دھڑک ہو کر کام کو ناجائز کہتے چلے جائیں گے پھر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ یاد رکھیئے یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے: **لاتحرموا طیبّت ما احلّ اللہ لکم** ۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمہ اللہ ایک بڑے بزرگ ہیں ان کو خاتم مثنوی کہا جاتا ہے اس لئے کہ مولانا روم رحمہ اللہ نے مثنوی لکھتے ہوئے آخر میں چھوڑ دی تھی اور یہ کہا کہ بعد میں کوئی اور اس کو پورا کرے گا۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمہ اللہ نے پورا کیا، بڑے درجے کے علماء، صلحاء میں سے ہیں ان کے آباؤ اجداد میں سے مولانا اشرف جھنجانوی رحمہ اللہ ہیں یہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے دور کے ہیں ایک دفعہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے پاس آئے اور یہ کہا کہ میں نے ایک رسالہ حقے کی حرمت پر لکھا ہے آپ بھی اس پر دستخط کر دیں تاکہ اس پر اجماع ہو جائے، تو حضرت نے فرمایا کہ میں تو اس کو حرام نہیں سمجھتا بلکہ مباح سمجھتا ہوں اور اس کی کئی دلیلیں بھی ذکر کیں، تو ملا عبدالحکیم رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر آپ اس کو مباح سمجھتے ہیں تو پھر آپ میرے سامنے حقہ پی کر بھی دکھائیں تو انہوں نے کہا اگرچہ مباح ہے لیکن مجھے طبعی طور پر اس سے نفرت ہے۔ بعض چیزیں فی نفسہ جائز ہوتی ہیں لیکن طبعی طور پر اچھی نہیں لگتیں اس لئے میں نہیں پینا چاہتا، علماء کا قول کافی ہوتا ہے عمل ضروری نہیں ہوتا بلکہ جب عالم نے کہہ دیا کہ جائز ہے بس کافی ہے۔ لیکن وہ بھی بہر حال ملا تھے اور ملا کی تعریف ہے: "ملاں آں باشد کہ چپ نہ شود" اس نے کہا کہ قول کے ساتھ اگر عمل بھی مقرون ہو جائے تو بہتر ہے حالانکہ یہ اصول مستحبات کے بارے میں ہے مباحات کے بارے میں نہیں یعنی ایک عالم ایک عمل کو مباح کہتا ہے لیکن وہ عمل نہیں کرتا اس کو عالم بے عمل نہیں کہیں گے تو حضرت نے ایک طالب علم کو بلایا جو حقہ پی سکتا تھا اس کو کہا کہ میرے سامنے حقہ پی کر دکھاؤ، حقہ پی کر دکھایا تو آپ نے ملا عبدالحکیم سے کہا کہ تسلی ہو گئی، عمل نہیں ہوا تقریر تو ہو گئی بلکہ اپنے حکم سے پلوایا ہے۔ یہ مولانا بڑے درجے کے اولیاء میں سے

ہیں ان کے بڑے عجیب وغریب واقعات آتے ہیں۔ ایک کیمیا گران کے پاس آیا اور انہوں نے کچھ کیمیا سکھایا تو انہوں نے اس کو نظرانداز کر دیا کہ ہمیں ضرورت نہیں پھر وہ خود کیمیا کے ذریعے سے سونے کی ایک اینٹ بنا کر لایا ان کو لا کر دی فقر کافی رہتا تھا، انہوں نے کہا کہ میری مسجد کے قریب دفن کر دو جب ضرورت ہو گی نکال لوں گا کافی عرصے کے بعد آیا تو دیکھا کہ وہی فقیرانہ شان ہے اور سوچا کہ شاید وہ ختم ہو گئی ہو تو کہا کہ اور لادوں تو انہوں نے کہا کہ وہاں جا کر دیکھو جہاں رکھی تھی وہاں جا کر دیکھا تو اینٹ ویسے ہی رکھی ہوئی تھی۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے قدر نہیں کی اس وقت ان کے ہاتھ میں ڈھیلا تھا استنجاء سکھا رہے تھے تو آپ نے وہ ڈھیلہ زمین پر مارا تو وہ سونا بن گیا اور کہا کہ ہم سونا جمع کرنا چاہیں تو یوں جمع کر سکتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کی گئی تھی کہ پہاڑ سونا بنا دیں تو آپ کی ایک شان آپ کے بعض غلاموں میں بھی آگئی ہے تو یہ اس شان کے اولیاء میں سے تھے اور بڑے درجے کے علماء میں سے تھے۔ ایک بات انہوں نے اس وقت ملا عبدالحکیم سے یہ بھی کہی تھی جو مجھے عرض کرنی ہے فرمایا کہ چونکہ حقہ پینے میں ابتلاء عام ہے اس لئے یوں اس کو حرام قرار دینا جرم عظیم ہے اور یہ عام آدمی کی بات نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ یہ کس درجے کے متقی اور پرہیزگار ہیں اور جب میں نے غور کیا تو اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کی نظر میں سب سے بڑا مجرم وہ آدمی ہے کہ کوئی چیز حرام نہ ہو لیکن اس کے بار بار پوچھنے کی وجہ سے حرام ہو جائے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ سے زیادہ سوالات کرنے سے منع کیا گیا تھا اس کی حکمت یہ بھی تھی کہ حرمت نازل نہ ہو جائے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا: **اعظم المسلمین جرمًا من سال عن شیء لم یحرم فحرم من أجل مسألته۔**[1] حالانکہ یہاں اگر تحریم ہو گی تو واقعتاً تحریم ہو گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب حرام قرار دیں گے تو وہ واقعتاً حرام ہو گی لیکن اس کا سبب بننے کو بھی جرم عظیم قرار دیا گیا اور جب نبوت ختم ہو چکی ہے، حلت و حرمت طے ہو چکے ہیں، ایک چیز میں ابتلاء عام ہے لوگ بکثرت اس میں مبتلاء ہیں اور محض احتیاط کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ لوگ مجھے پکا مولوی کہیں اس کو حرام قرار دے رہے ہیں، تو یہ کیسے جرم عظیم نہیں ہو گا؟ ابتداء میں ان بزرگ کی کلام میں جرم عظیم کا لفظ مجھے بڑا عجیب لگا لیکن جب غور کیا تو واقعتاً بات سمجھ میں آئی اور اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اگر دین کو اتنا سخت بنا دیں گے تو کوئی بھی دین کے قریب نہیں آئے گا، دین میں جو حقیقتاً پابندیاں ہیں، سختیاں ہیں وہ تو یقیناً رہیں گی، دین نام

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری کتاب الاعتصام باب مایکرہ من کثرۃ السوال ج ۱۳/ ص ۲۲۶

ہے اللہ اور رسول کی خاطر مشقتیں اٹھانے کا لیکن محض اپنے افتاد طبع کی وجہ سے ہر چیز کو حرام کرتے چلے جائیں یہ اچھا طرز عمل نہیں۔ دونوں طرز عمل غلط ہیں کہ ایک یہ طے کر لیا کہ جائز قرار دینا ہے اور ایک یہ کہ ناجائز قرار دینا ہے۔ جو شخص سہولت اور اباحت کی طرف مائل ہوتا ہے کم از کم اس کو کبھی کبھی یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ شاید میرا دین کمزور ہے اور کچھ نہ کچھ اس کا ضمیر اس کی غلطی پر ملامت کر دیتا ہے لیکن جو دوسری غلطی میں مبتلا ہوتا ہے اس کو عموماً اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا جب کہ دین خاص اپنے رجحان طبع کا نام نہیں بلکہ اصولوں پر چلنے کا نام ہے اور ان اصولوں پر چلنا پل صراط پر چلنا ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسئلہ بتانا بڑی نازک ذمہ داری ہے جس طرح کسی چیز کا حرام ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے تو اس کی حرمت بتانا ضروری ہے اسی طرح اگر کسی کو کسی چیز کا جواز دلیل شرعی سے معلوم ہو رہا ہے اور اس کو جواز پر پورا شرح صدر ہے وہ شرعاً پابند ہے کہ اگر مسئلہ بتائے تو جائز ہی بتائے۔

اگر سد اًللذریعہ ناجائز قرار دیتا ہے تو الگ بات ہے لیکن سدِ ذریعہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے محض اپنے افتاد طبع کی وجہ سے یا محض اس لئے کہ کہیں لوگ مجھے ڈھیلا ڈھالا مولوی نہ کہیں اگر اس لئے وہ کرتا ہے تو یہ اچھی بات نہیں اور میں نے پہلے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مثال ذکر کی تھی کہ بعض نبیذوں کے بارے میں اپنے عمل میں اتنی احتیاط کہ ایک گھونٹ پینے کو تیار نہیں لیکن فتویٰ دینے میں اتنی احتیاط کہ فرمار ہے ہیں کہ پوری دنیا کا لالچ بھی دے کر مجھ کو کہا جائے کہ اس کو حرام کہہ دیں تب بھی اس کو حرام نہیں کہوں گا تب بھی حلال ہی کہوں گا کیوں کہ مسئلہ اپنے گھر کا نہیں اللہ اور اس کے رسول کا ہے، دلیل کا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو دلیل کے اعتبار سے شرح صدر اور طرح ہو بہر حال جس بات پر شرح صدر ہو وہی بات کہنی چاہیے۔

كتاب اللباس

الفصل الاوّل

(۱)----عن أنس، قال: كانَ أحبُّ الثياب إلى النبی صلی الله علیه وسلم أن يلبسها الحِبَرَه ۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب لباس جس کا پہننا آپ کو پسند تھا وہ حبرہ تھا۔

حبرہ عنبۃ کے وزن پر ہے یعنی حاء کا کسرہ اور باء کا فتح یہ یمن کی خاص قسم کی چادر ہوتی تھی خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا اس کو ازار اور رداء کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا اور سی کر بھی استعمال کیا جاتا تھا یہ نقش و نگار والا کپڑا ہوتا تھا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر دھاریاں ہوتی تھیں یہ یمن کا بہترین کپڑا سمجھا جاتا تھا۔ یمن ویسے ہی اس زمانے میں ٹیکسٹائل کی صنعت میں مشہور تھا وہاں کپڑا بہت اچھا بنتا تھا اور وہاں جن کپڑوں کو سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا ان میں سے ایک حبرہ بھی تھا۔ حبرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصل میں تحبیر سے مشتق ہے تحبیر کا معنی ہے مزین کرنا چنانچہ قرآن کریم میں اہل جنۃ کے بارے میں کہا جاتا ہے: **فهم فی روضة يحبرون** ۔ یہ بھی چونکہ زینت والا لباس ہوتا ہے اس لئے اس کو حبرہ کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھا، علماء نے اس کے پسند ہونے کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔

حبرہ پسند ہونے کی وجوہ......

(۱)......... سب سے بڑی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ خوبصورت اور زینت والا لباس تھا۔

(۲)......... بعض حضرات نے یہ وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اس میں زینت کم تھی لیکن یہ بات حبرۃ کے اصل معنی کے مطابق معلوم نہیں ہوتی۔ بعض حضرات کے اس طرح کی تشریح کرنے کا منشاء بظاہر یہ ہے کہ ذہن میں بٹھالیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ زہد اور ترک دنیا میں کامل تھے اس لئے آپ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا کہ کون سا کپڑا پہننے میں اچھا لگتا ہے اور کون سا اچھا نہیں لگتا اس طرح کھانے پینے میں بھی آپ کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا کہ کون سا کھانا لذیذ ہے اور کون سا غیر لذیذ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کو اس طرح سمجھنا خلاف حقیقت ہے یہ ٹھیک ہے کہ کھانے پینے میں آپ کو انہاک

نہیں تھا اور آپ لذت کے زیادہ طالب نہیں تھے کہ نہ ملے تو آدمی پریشان ہو جائے لیکن بہر حال لذت کے اعتبار سے آپ کے ہاں پسند ناپسند کی حد بندی تھی اور یہ بات کئی احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے آپ نے بعض کھانوں کو لذیذ بنانے کی کوشش بھی کی مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے ککڑی کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھایا اس کی ایک وجہ ذائقہ میں اعتدال پیدا کرنا ہے کہ ککڑی پھیکی پھیکی ہوتی ہے وہ اچھی نہیں لگتی اور کھجور میٹھی ہوتی ہے لیکن اس کی مٹھاس کافی تیز ہوتی ہے جو آدمی کو بعض اوقات اچھی نہیں لگتی ذوق لطیف پر گراں گزرتی ہے، تو آپ نے دونوں کو ملا لیا اس سے ذائقہ میں اعتدال پیدا ہو گیا، آپ نے ذائقہ اچھا بنانے کے لئے چیز کو مرکب بنا کر کھایا ہے۔ جیسے بعض لوگ بعض مٹھائیوں کے ساتھ نمک پارہ ملا کر کھاتے ہیں اس سے ذائقہ مناسب ہو جاتا ہے یہ مقصود نہیں جیسا کہ بعض جاہل صوفیوں نے یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ قرب مع اللہ میں کمال کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کو لذیذ اور غیر لذیذ کا امتیاز باقی نہ رہے۔

جمالیاتی ذوق ختم کرنا شرعاً مطلوب نہیں:۔

یہی معاملہ لباس کا ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ لباس میں زینت کے اندر اہتمام نہیں ہونا چاہئے اور خود بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ زینت کا اہتمام نہیں فرماتے تھے اس میں زیادہ انہماک نہیں تھا لیکن یہ بات کہ آپ کے نزدیک بالکل فرق نہیں تھا کہ یہ چیز خوبصورت ہے اور یہ خوبصورت نہیں ہے اور آپ کے ہاں جمالیاتی ذوق نہیں تھا یہ بات نہیں ہے۔ آدمی کے اندر سے خوبصورتی اور غیر خوبصورتی کا امتیاز ہی ختم ہو جائے، جمالیاتی ذوق اس میں نہ رہے یہ چیز اچھی لگ رہی ہے یہ بدھی لگ رہی ہے اس کی حس نہ ہو یہ کمال قرب مع اللہ کا تقاضا نہیں ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض لباس خوبصورتی کے اعتبار سے بھی پسند تھے اور یہاں آپ نے حبرۃ کو پسند فرمایا۔ بظاہر اس کے پسندیدہ ہونے کی وجہ اس کا اچھا لگنا ہے آپ کی زندگی میں دونوں مثالیں ملتی ہیں ایک طرف تو انتہائی سادہ لباس بھی آپ کی زندگی میں ملتا ہے۔ چنانچہ چند حدیثیں چھوڑ کر آگے حدیث آجائے گی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک چادر نکالی جس میں پیوند لگے ہوئے اور ایک موٹا تہہ بند نکالا اور فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال انہی دو کپڑوں میں ہوا تھا آخری وقت میں آپ نے یہی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے بردہ پہن رکھا تھا۔ بردہ یہ سادہ قسم کی چادر ہوا کرتی تھی اور عموماً کالی ہوتی تھی اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہمارے شعراء میں یہ لفظ مشہور ہے کالی کملی والے یہ بھی آپ نے بکثرت پہنی، سادہ لباس تھا اس لئے اختیار فرمایا اور وہ عموماً اون کا ہوتا تھا اور اسی سے صوفیاء نے اونی لباس کو اختیار فرمایا لیکن بہر حال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دائمی معمول نہیں تھا بلکہ دونوں ہی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بذات خود نہ گھٹیا لباس پہننا مقصود ہے نہ بذات خود اعلیٰ لباس مطلوب ہے کسی کو بھی مطلوب بنالینا یہ ٹھیک نہیں۔

آپ کو کون سا لباس زیادہ پسند تھا:-

یہاں پر شارحین حدیث نے یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ آپ کو کون سا لباس پسند تھا کہیں آرہا ہے کہ آپ کو حمرۃ پسند تھا اور کہیں یہ آرہا ہے کہ آپ کو قمیص زیادہ پسند تھی اور کہیں یہ آرہا ہے کہ آپ کو سفید لباس زیادہ پسند تھا، تو بظاہر یہ حدیثیں ایک دوسرے کے معارض ہیں۔

حل تعارض ...... اس کا جواب یہ ہے کہ پسندیدگی یہ ایک امر اضافی ہے ایک اعتبار سے ایک چیز زیادہ پسند ہوتی ہے دوسرے اعتبار سے دوسری چیز زیادہ پسند ہوتی ہے بناوٹ کے اعتبار سے آپ کو قمیص سب سے زیادہ پسند تھی اور رنگ دار لباس میں حمرۃ آپ کو سب سے زیادہ پسند ہوگا اور ایک اعتبار سے آپ کو سفید لباس زیادہ پسند تھا کہ یہ بھی اچھا لگتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب مسجدوں میں ملاقات کرو تو بھی سفید لباس میں ملاقات کرو اور جب قبروں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو تو بھی سفید لباس میں کرو یعنی کفن بھی سفید ہونا چاہئے، مختلف اعتبارات سے آپ کو یہ ساری چیزیں پسند تھیں۔

(۲)----وعن المغيرة بن شعبةَ: أن النبيَّ صلى الله عليه وسلم لبِسَ جُبَّةً رومِيَّةً ضيِّقَةَ الكُمَّين۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رومی جبہ پہنا جو کہ تنگ آستینوں والا تھا۔

یہ درحقیقت ایک لمبی حدیث کا اقتباس ہے یہ غزوہ تبوک کا واقعہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فجر کے وقت قضائے حاجت کے لئے نکلے تو میں آپ کے ساتھ تھا آپ نے ایک رومی جبہ پہن رکھا تھا آپ قضائے حاجت سے فارغ ہوگئے لیکن کافی دیر ہوگئی اس لئے کہ قضائے حاجت کافی دور جا کر کرتے تھے، قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد میں وضوء کا پانی لے کر حاضر ہوا، آپ نے وضو فرمایا لیکن وضو فرماتے وقت اس جبے کی آستینوں کو اوپر چڑھانا مشکل تھا اس لئے کہ وہ آستینیں بہت تنگ تھیں تو آپ نے اپنی آستینوں کو بازو کے نیچے سے نکال لیا اور اس طریقے سے بازو کو دھویا اور اس کے بعد جبہ دوبارہ پہن لیا اور آپ نے موزے پہنے ہوئے تھے، تو آپ نے ان موزوں

پر مسح فرمایااور آپ واپس وہاں تشریف لائے جہاں پڑاؤڈالا تھا۔ صحابہ کرام نے کچھ دیرانتظار کیالیکن جب دیکھا کہ وقت تنگ ہو رہا ہے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امامت کے لئے آگے کر دیا وہ نماز پڑھارہے تھے وہ ایک رکعت پڑھا چکے تھے دوسری رکعت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہالیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ نہیں اپنی جگہ پر ہی رہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد جو رکعت رہ گئی تھی اس کو پورا فرمایااور صحابہ کرام کے اس فعل کی تحسین فرمائی کہ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا میرا انتظار نہیں کیا بلکہ خود نماز کھڑی کر دی اس میں جو حصہ کتاب اللباس کے متعلق ہے وہ صرف اتنا ہے جتنا یہاں صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا کہ :ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیس جبّۃ رومیّۃ ضیقۃ الکمین۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جبہ پہنا جو کہ رومی تھا، رومی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ روم کا بنا ہوا سلا ہوا ہو گا۔

اس زمانے میں روم کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا جس کو بیز نطیہ کہا جاتا تھا،اب اس شہر کا نام استنبول ہے۔اس کی تفصیل کتاب الفتن میں ان شاءاللہ آئے گی۔ شام کا علاقہ بھی رومی سلطنت کے ماتحت تھااور آج کل سوریا جس کو شام کہتے ہیں اردن اور فلسطین کے سارے علاقے شام کے اندر ہی سمجھے جاتے تھے یہ سارے علاقے سلطنت رومیہ یعنی بیز نطیہ کے ماتحت تھے، روم کے علاقے کی بنی ہوئی چیز کو بھی رومی کہہ دیا جاتا تھا اور شام کے علاقے وغیرہ کی بنی ہوئی چیز کو بھی رومی کہہ دیا جاتا تھا یہاں دونوں احتمال ہیں۔اصل مرکز کا بنا ہوا ہو یہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام کا بنا ہوا ہو لیکن حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ شام بھی اس وقت کافروں کا ملک تھااور بیز نطینہ بھی کافروں کا علاقہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومی جبہ پہنا ہوا تھااور یہ جبہ تنگ آستینوں والا تھا۔

حدیث سے مستنبط مسائل:۔

اس حدیث سے لباس کے متعلق کئی مسئلے معلوم ہوئے۔

(۱) کفار کی مصنوعات استعمال کرنے کا حکم:۔

پہلا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کفار کی بنی ہوئی چیز کا استعمال جائز ہے یہ جبہ کافروں کا بنا ہوا تھالہٰذا کافروں کا بنا ہوا کپڑا پہننا بھی جائز ہے بشرطیکہ کوئی اور شرعی مانع نہ ہو مثلاً یہ یقین ہو کہ وہ کپڑا ناپاک ہے وغیرہ وغیرہ تو

یہ الگ بات ہے لیکن فی نفسہ کافروں کے ملک کا یا کافروں کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو اس کا استعمال جائز ہے۔

(۲) کفار کے طرز پر بناوٹ والی مصنوعات کا حکم:-

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لباس پہنا ہوا تھا صرف یہ نہیں کہ اس کا مواد اور کپڑا کافر ملک کا بنا ہوا تھا بلکہ سلا ہوا بھی وہاں کا تھا اور اغلب یہی ہے کہ بناوٹ بھی انہی کے طرز پر ہو گی اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہن لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی لباس کی بناوٹ کافروں کے طرز پر ہو لیکن کسی کافر قوم کے ساتھ خاص نہ ہو بلکہ اور بھی کئی لوگ پہنتے ہوں جیسے یہ جبہ عرب میں لیا جاتا تھا عرب بھی پہنتے ہوں گے، مشرک بھی پہنتے ہوں گے، مسلمان بھی پہنتے ہوں گے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پہن لیا معلوم ہوا کہ اگر کسی کپڑے کی بناوٹ کافروں کے انداز پر ہو لیکن اس میں تشبہ نہ ہو یعنی ان کی عبادت کے قبیل سے نہ ہو اور نہ ہی وہ کسی کافر قوم کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہو تو مسلمانوں کے لئے بھی اس کا پہننا جائز ہے اس طرح کی بات آگے بھی آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کسروانی جبہ پہنا یعنی کہ کسریٰ کے طرز پر بنا ہوا تھا یا کسریٰ کے علاقے کا بنا ہوا تھا۔

(۳) تنگ آستینوں والا لباس:-

تیسری بات یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ آستینوں والا جبہ پہنا ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ تنگ آستینوں والا لباس مرد کے لئے فی نفسہ جائز ہے مرد کے لئے کی قید اس لئے لگائی کہ عورت کے لئے غیر محرم کے سامنے جائز نہیں اس لئے کہ اس کے جسم کی حکایت ہوتی ہے۔

عام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہ کرام کی آستینیں کھلی ہوتی تھیں زیادہ تنگ نہیں ہوتی تھیں اگرچہ بہت زیادہ کھلی بھی نہیں ہوتی تھیں بہت کھلی آستینیں اس زمانے میں اسبال کے اندر داخل تھیں جو کہ ممنوع ہے بہت زیادہ تنگ بھی نہیں ہوتی تھیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ آستینوں والا جبہ اس لئے پہنا کہ آپ کو ہدیہ ملا ہو گا اس طرح ہوتا ہے کہ اگر آدمی خود اپنی مرضی سے لباس سلوائے اس میں تو اپنی پسند اور ناپسند اور اپنے ذوق کا خیال رکھتا ہے اور رکھنا چاہئے اور اگر ہدیہ مل گیا تو جیسے سلا ہوا ہے بسا اوقات ویسا ہی پہننا پڑتا ہے اس لئے کہ کبھی اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی یا بہت مشکل ہوتی ہے۔ یہاں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیے میں ملا ہو گا اس لئے آپ نے

پہن لیا ہو گا اور یہ پہن کر آپ نے یہ بھی بتادیا کہ اس طرح کا لباس پہننا جائز ہے۔ اگرچہ بہتر یہ ہے کہ لباس زیادہ کھلا نہ ہو کہ اسراف میں داخل ہو اور نہ بہت زیادہ چست اور تنگ ہو کہ جسم کے ساتھ ملا ہوا ہو لیکن اگر کسی عارض کی وجہ سے آستینیں تنگ ہو جائیں تو مرد کے لئے یا عورت کے لئے جب کہ وہ اجانب کے سامنے نہ ہو گنجائش ہے یہ جواز بتانے کے لئے آپ نے اس طرح کا لباس پہن لیا تھا۔

حضور ﷺ کا کسی لباس کو محض پہننا اس کے مسنون ہونے کی علامت نہیں:۔

اس سے یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی لباس پہن لیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ سنت بھی بن گیا ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ کافروں کا بنا ہوا کپڑا اور کافروں کے ملک میں سلا ہوا کپڑا اور چست لباس بھی سنت ہے حالانکہ ایسا کوئی بھی نہیں کہتا، اس کو سنت نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کے سنت ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ نے اس کا اہتمام اور قصد بھی فرمایا ہو، اس کو پسند فرمایا ہو اور اس کو بکثرت پہنا ہو تو وہ لباس کم از کم سنن عادیہ میں داخل ہو جائے گا لیکن جب تک یہ بات نہیں تو اس کو سنن عادیہ میں سے بھی شمار نہیں کر سکتے۔

یہ غلط فہمی بہت کثرت سے لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامے کا رنگ کہیں آ گیا کہ فلاں موقع پر آپ نے اس طرح کا عمامہ پہنا ہوا تھا تو کہہ دیا کہ یہ رنگ سنت ہے۔ دوسروں نے کوئی دوسری روایت دیکھی کہ فلاں رنگ کا عمامہ پہنا ہوا تھا تو کہہ دیا کہ یہ رنگ سنت ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رنگ کا اہتمام نہیں فرمایا جو بھی پہنا ہے وہ اس لئے پہنا کہ کیف ما اتفق آپ کو مل گیا۔ اس طرح اکثر و بیشتر آپ کے لباس بھی اس طرح کی نوعیت کے ہیں کہ کیف ما اتفق جیسے آپ کو ملے ویسے ہی پہن لئے ان کا کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا اس لئے ان کو سنت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(۳)----- وعن أبی بُردَةَ، قال: أخرَجَت إلینا عائشةُ کساءً ملبَّداً وإزَارًا غلیظاً، فقالت: قُبِضَ روحُ رسول الله ﷺ فی هذین۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہمارے سامنے ایک پیوند لگی ہوئی چادر اور ایک موٹا تہہ بند نکالا اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح ان دو کپڑوں میں قبض ہوئی۔

(٤)----- وعن عائشة، قالت: کان فِراشُ رسول الله صلی الله علیه وسلم الذی ینام علیه أدَماً، حَشوُهُ لیفٌ۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر جس پر آپ آرام فرماتے تھے چمڑے کا تھا جس کی بھرائی کھجور کی چھال کی تھی۔

(۵)-----وعنها، قالت: كان وِسادُ رسول الله صلى الله عليه وسلم الذى يتكى عليه من أدَمٍ، حشوُهُ ليفٌ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیہ جس پر آپ تکیہ لگاتے تھے وہ چمڑے کا تھا جس کی بھرائی کھجور کی چھال کی تھی۔

وسادہ کا معنی ...... وسادہ عربی زبان میں دو معنی میں استعمال ہوتا ہے وسادہ کا ایک معنی وہ تکیہ جس پر ٹیک لگائی جاتی ہے یا سوتے وقت سر کے نیچے رکھا جاتا ہے۔

''وسادۃ'' کا دوسرا معنی گدا ہے جس کو بچھا کر اس پر لیٹا جاتا ہے یہاں دونوں معنے استعمال ہوئے ہیں، ایک یہ کہ آپ کا تکیہ چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی روئی یا کوئی اور چیز نہیں تھی اور دوسرا یہ تھا کہ آپ کا نیچے بچھانے والا گدا وہ بھی چمڑے کا تھا اور اس میں روئی وغیرہ کے بجائے کھجور کی چھال کی بھرائی تھی ان دونوں حدیثوں سے دو باتیں سمجھ میں آئیں۔

بستر بنانا اور اس کا استعمال:-

پہلی بات یہ کہ بستر بنانا اور اس کا استعمال کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ کا بستر تھا آپ نے اس کو استعمال کیا ورنہ سونے کو تو آدمی زمین پر بھی سو سکتا ہے لیکن بستر پر سوئے گا تو نسبۃً آرام کی نیند آجائے گی، نیند میں سہولت ہو آرام کی نیند آجائے یہ بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے۔

بستر میں تکلف کی بجائے سادگی اختیار کرنا:-

اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بستر میں زیادہ تکلف نہیں فرمایا بلکہ سادگی اختیار فرمائی کہ گدے کے اندر بجائے روئی وغیرہ بھرنے کے (روئی سے گدا زیادہ نرم ہو جاتا ہے) آپ نے کھجور کی چھال بھر لی۔ مطلب یہ ہے کہ جیسا ملا آپ نے استعمال کر لیا، زیادہ اچھا بستر مل جائے تو یہ بھی اللہ کی نعمت ہے شرعاً ناجائز نہیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت اچھے بستر کا اہتمام نہیں فرمایا جیسا ملا ویسا اختیار فرمالیا یہ نہیں کہ بستر مل رہا ہے اور کسی درجہ میں آرام کی نیند مل رہی ہے لیکن تقویٰ اور تصوف کی،۔ میں اس کو بھی چھوڑ دے کہ نہیں میں تو مجاہدہ کروں گا، مشقت اٹھاؤں گا اور یہ بھی نہیں کہ

آرام ہی کو اپنا مقصود اصلی بنالیا کہ اس کے لئے ہر وقت پاپڑ بیل رہے ہیں کہ کسی طریقے سے نرم سے نرم بستر مل جائے۔ یہ انداز بھی اختیار نہیں فرمایا بلکہ اعتدال کی راہ اختیار فرمائی سہولت مل گئی تو اچھا ہے ورنہ زیادہ سہولت کے طالب نہ بنے۔

لباس اور کھانے پینے وغیرہ میں زیادہ سہولت کی بجائے سادگی اور جفاکشی کی تعلیم:۔

بلکہ بعض احادیث میں تصریح آتی ہے کہ لباس بستر اور کھانے پینے وغیرہ میں سادگی اور جفاکشی اختیار کرو یعنی زیادہ نازک مزاج نہ بنو زیادہ نازک مزاجی بھی شرعاً پسندیدہ نہیں ہے۔ کسی نہ کسی درجہ میں بدن کو آرام تو پہنچانا چاہئے، سہولت پہنچانی چاہئے لیکن آگے حدیثوں میں آئے گا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چل لیا کرو اور یہ بھی فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں زیادہ ارفاہ یعنی زیادہ تنعم اور سہولت سے منع فرمایا کرتے تھے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ مرض الوفات میں تھے اور کئی ہفتوں سے مسلسل اسہال چل رہے تھے آپ جانتے ہیں کہ اسہال ایک دن میں بھی آدمی کو ختم کر دیتے ہیں اور یہ کئی ہفتوں سے چل رہے تھے اور عمر بھی اسی (۸۰) سال کے لگ بھگ تھی تو جو ضعف اور نقاہت ہو گی اس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، آپ ایک تخت پر گدا بچھا کر لیٹے ہوئے تھے کسی نے عرض کیا کہ حضرت گدا دہرا کر دیں تاکہ نرم ہو جائے اس پر آپ کو تکلیف ہو رہی ہو گی تو حضرتؒ نے فرمایا نہیں اس کی ضرورت نہیں اور پھر یہ فرمایا کہ میں نازک مزاج تو ضرور ہوں لیکن الحمد للہ نازک بدن نہیں ہوں۔ نازک مزاج ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بے ڈھنگی اور بے ترتیبی بات یا کام سے طبیعت میں تکدر ہو جاتا ہے وہ گوارہ نہیں ہوتی لیکن نازک بدن نہیں ہوں کہ جب تک سات آٹھ انچ فوم نہ ہو اس وقت تک نیند نہ آئے۔

(٦) ----- وعنها، قالت: بينا نحنُ جلوسٌ في بيتنا في حَر الظهيرةِ، قال قائل لأبي بكرٍ: هذا رسول الله ﷺ مُقبلاً مُتَقَنعاً۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اسی اثنا میں کہ ہم اپنے گھر میں دوپہر کی گرمی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کہنے والے نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں تشریف لا رہے ہیں کہ آپ نے سر کو اوڑھا ہوا ہے۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ابتدائی حصہ ہے اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے ہجرت کا واقعہ تفصیل سے

بیان فرمایا ہے اور یہ بات کہ ہم دوپہر کے وقت اپنے گھر میں تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے یہ ہجرت سے پہلے کی بات ہے اس موقع پر حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہجرت کی اجازت دے دی ہے اس لئے میں نے ہجرت کا ارادہ کرلیا ہے تو حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: "**صحبة یا رسول اللہ**" کہ میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں اور یہ عرض کیا کہ میں نے اس مقصد کے لئے اونٹنیاں بھی تیار کر رکھی ہیں ان میں سے ایک اونٹنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کی اور ایک خود حضرت ابو بکرؓ نے لے لی اور اپنی بیٹی حضرت اسماء بنت ابی بکر اور دوسرے بعض اہل وعیال کے ذمے کھانا پہنچانا لگادیا، آگے تفصیل سے ہجرت کا واقعہ ہے۔ یہاں چونکہ مقصود ابتدائی حصہ تھا اس لئے صرف اس کو ذکر کیا اور وہ **مُتَقَنِّعًا** کا لفظ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو آپ نے سر اوڑھا ہوا تھا اس لئے کہ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت تھا اور اس علاقے (مکہ مکرمہ) کی گرمی بہت شدید ہوتی ہے آج کل سائنسدانوں نے مانا ہے کہ گرمی میں سر اور گردن کو ڈھانپ کر رکھنا چاہئے اور یہی تقنع کا حاصل ہے۔

(۷)-----وعن جابر، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لهُ: فِراشٌ للرَّجُلِ وفراشٌ لأمرأته، والثالثُ للضَيفِ، والرابع للشيطان۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ایک بستر آدمی کے لئے ہو گیا اور ایک بستر اس کی بیوی کے لئے ہو گیا اور تیسرا بستر مہمان کے لئے ہو گیا اور چوتھا شیطان کے لئے ہوتا ہے۔

اس حدیث کا بظاہر حاصل یہ نکلتا ہے کہ آدمی گھر میں تین بستر رکھ سکتا ہے اور تین سے زائد شیطانی بستر ہوگا۔ شیطانی بستر اس لئے قرار دیا کہ وہ اسراف میں داخل ہے اور اسراف درحقیقت شیطان کا کام ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْآ اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْن۔ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔

حدیث میں تین کا عدد مقصود نہیں بلکہ ضرورت کی تین انواع بیان کرنا مقصود ہے:-

تین بستروں کے ذکر سے تین کا عدد مقصود نہیں کہ صرف تین بستر رکھ سکتے ہیں اس سے زیادہ بستر نہیں رکھ سکتے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ گھر کے اندر بستر اور سازوسامان ضرورت کے مطابق رکھنا چاہئے ضرورت سے زائد نہیں رکھنا چاہئے اس لئے کہ ضرورت سے زائد تو اسراف ہوگا اور اسراف کے ساتھ کبھی اس کا مقصد نمائش اور دکھاوا بھی ہوتا ہے تکبر بھی مقصود ہوتا ہے اس لئے وہ درست نہیں۔ تین کے عدد سے درحقیقت تین قسم کی ضرورتیں بیان کرنا مقصود ہے، تین افراد بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ضرورت کی تین

انواع بیان کرنا مقصود ہے اور ہر نوع کے اندر کئی افراد ہو سکتے ہیں۔

پہلی قسم کی ضرورت ...... پہلی قسم کی ضرورت آدمی کی اپنی ذات کے لئے ہے اپنے لئے سردی اور گرمی کے اعتبار سے الگ الگ بستر ہو جائیں تو یہ بھی درست ہے ضرورت کی وجہ سے اس میں کوئی قباحت نہیں یا متعدد بستر اس لئے رکھنے پڑتے ہیں کہ بعض اوقات ایک کے دھونے میں وقت لگ جاتا ہے جتنی دیر میں وہ دھلے گا اتنی دیر میں دوسرا استعمال ہو جائے گا اس لئے دو ہو گئے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ بہر حال ضرورت کی ایک نوعیت یہ ہے کہ آدمی کی اپنی ضرورت اس سے پوری ہو۔

دوسری قسم کی ضرورت ...... دوسری ضرورت یہ ہے کہ اپنے اہل و عیال کی ضرورت پوری ہو اس کو "فراش لامرته" فرمایا کہ اپنی بیوی کے لئے یہ نہیں کہ اپنی بیوی کے لئے تو بستر ہو سکتا ہے اپنے بچوں کے لئے بستر نہیں ہو سکتا ان کو بغیر بستر کے سلاؤ، بلکہ یہ دوسری نوع ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے بستر ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اہل و عیال زیادہ ہیں تو بستروں کی مقدار بھی زیادہ ہو گی اور اگر اہل و عیال تھوڑے ہیں تو بستروں کی مقدار بھی تھوڑی ہو گی، یہ مطلب نہیں کہ اہل و عیال کے لئے صرف ایک عدد بستر ہو مقصد ضرورت کی نوعیت بیان کرنا ہے تعداد بیان کرنا نہیں۔

تیسری قسم کی ضرورت ...... تیسری قسم کی ضرورت مہمان کے لئے ہے کہ مہمان آجائے اس کو بستر دینا پڑتا ہے اب کسی کے ہاں کم مہمانوں کا امکان ہوتا ہے اور کسی کے ہاں زیادہ مہمانوں کا امکان ہوتا ہے، بیک وقت زیادہ مہمان آسکتے ہیں اس کے اعتبار سے ضرورت کی وجہ سے تعداد کا فرق پڑ جائے گا۔ ضرورت کی ایک نوعیت یہ ہے کہ مہمان آسکتے ہیں لیکن بیک وقت کتنے مہمان آسکتے ہیں اس میں تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی کا مہمان صدی میں بھی بمشکل آتا ہے اس کے لئے ایک بستر بھی کافی ہے اور دوسرے کے پاس بکثرت مہمان آتے ہیں اور ایک وقت میں کئی کئی مہمان آتے ہیں تو اس کے لئے زیادہ بستروں کی ضرورت ہو گی مثلاً بکثرت دس دس مہمان بھی آسکتے ہیں اگر اس نے مہمانوں کے لئے دس (۱۰) پندرہ (۱۵) بستر بنا رکھے ہیں تو وہ بھی **الثالث للضیف** کے اندر داخل ہے۔

گھریلو سامان کے لئے ضرورت کے درجات:-

اس کو مزید مختصر کر کے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ضرورت کے دو درجے ہیں:

(۱)............ ایک موجودہ ضرورت یعنی وہ بستر جو اس وقت زیر استعمال ہیں۔

(۲)............ دوسری متوقع ضرورت یعنی جو کبھی کبھار استعمال میں آجاتا ہے اگرچہ اس وقت استعمال میں نہیں

روز مرہ استعمال میں نہیں آتا۔ دونوں قسموں کی ضرورت کے لئے بستر ٹھیک ہیں موجودہ ضرورت کے لئے بھی اور متوقع ضرورت کے لئے بھی اور جو بستر نہ اب استعمال ہو رہا ہے اور نہ کبھی آئندہ استعمال ہونے کی امید ہے یہ شیطانی بستر ہے اس لئے کہ یہ یا تو اسراف میں داخل ہے یا نمود و نمائش مقصود ہے کہ ہمارے گھر میں اتنے بستر ہیں۔

یہ مسئلہ صرف بستر کا نہیں گھر کے سارے سامان کے بارے میں ہے کہ ایسی چیزیں جو روز مرہ استعمال میں آتی ہیں وہ بھی آگئی اور وہ چیزیں جو کبھی کبھار استعمال میں آتی ہیں ان کا وجود بھی سمجھ میں آگیا لیکن گھر میں ویسے ہی سامان جمع کر رکھا ہے جو کبھی بھی استعمال میں نہیں آتا اتنے زیادہ برتن ہیں کہ ان کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی یہ مناسب نہیں اس سے بچنا چاہئے اور گھر کے اندر فضول سامان اکھٹا نہیں کرنا چاہئے۔

شوہر کو بیوی کے ساتھ سونا چاہئے یا الگ:۔

بعض حضرات نے اس حدیث کے تحت یہ مسئلہ چھیڑا ہے کہ مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ سونا چاہئے یا الگ بستر پر سونا چاہئے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ سونا چاہئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی تھا لیکن اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ مرد کے لئے الگ بستر ہو اور عورت کے لئے الگ بستر ہو۔ بعض حضرات نے اس سے استدلال کیا ہے کہ الگ سونا بہتر ہے الگ الگ سونا فی نفسہٖ جائز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مسئلہ اپنی جگہ پر یہاں اس حدیث کا اس مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے یعنی یہ حدیث نہ یہ کہتی ہے کہ اکٹھے سوؤ اور نہ یہ کہتی ہے کہ الگ الگ سوؤ بلکہ صرف یہ کہتی ہے کہ گھر میں مرد کے لئے الگ بستر ہو اور بیوی کے لئے الگ بستر ہو، اگر کسی وجہ سے الگ سونا پڑ جائے مثلاً بیماری کی وجہ سے یا مخصوص ایام میں خطرہ ہو کہ میں شرعی پابندی کا لحاظ نہیں رکھ سکوں گا اس لئے الگ سو جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ باقی فی نفسہٖ اولیٰ اور غیر اولیٰ کیا ہے یہ بالکل الگ مسئلہ ہے حالات اور اشخاص کے بدلنے سے بدل سکتا ہے اس لئے کوئی حتمی بات عمومی طور پر سب پر لاگو نہیں کی جاسکتی۔

(۸)-----وعن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لاينظرُ اللهُ يومَ القيامةِ إلى من جرَّ إزارَهُ بطراً۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے جو اپنی لنگی کو تکبر کی وجہ سے گھسیٹے۔

گھسیٹنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی چلے تو اس کی لنگی شلوار وغیرہ اتنی لمبی ہو کہ زمین پر گھسٹتی ہوئی

چلی جائے جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنی لنگی وغیرہ کو گھسیٹے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں یعنی اس کی طرف نظر رحمت، نظر عنایت نہیں فرمائیں گے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ بصیر ہیں دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، جانتے ہیں یہاں نظر نہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف دھیان بھی نہیں فرمائیں گے۔ اس کو قابل التفات نہیں سمجھیں گے اللہ تعالیٰ اس سے اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار فرمائیں گے۔

(۹)-----وعن ابن عمر ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: من جر ثوبه خیلاء لم ینظر الله إلیه یوم القیامة۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو اپنے کپڑے کو تکبر کی وجہ سے لمبا کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے۔

(۱۰)-----وعن، قال: رسول الله ﷺ بینما رجُلٌ یجُرُّ إزارَہُ مِنَ الخُیَلاءِ خُسِفَ به، فهو یتجلجل فی الأرضِ إلی یومِ القیامة۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس حالت میں کہ ایک آدمی اپنی چادر کو تکبر کی وجہ سے گھسیٹتا ہوا جارہا تھا کہ اسے زمین میں دھنسا دیا گیا اب وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا رہے گا۔

(۱۱)-----وعن أبی هریرة، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ماأسفلَ من الکعبین من الازارِ فی النار۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لنگی کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہوگا۔

اس حصہ کے دوزخ میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لنگی والا یہ حصہ دوزخ میں ہوگا، اس طریقے سے نیچے کرنے والا بھی دوزخ میں ہوگا۔ ان چند احادیث میں اسبال اِزار اور جر ازار کے بارے میں سخت وعیدیں بیان فرمائیں ہیں اس مضمون کی کچھ حدیثیں آگے الفصل الثانی اور الفصل الثالث میں بھی آئیں گی۔

اسبال اور جر کا معنی:-

اسبال کا معنی لمبا کرنا اور "جر" کا معنی گھسیٹنا۔

اسبال ازار کا مطلب ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا اتنا لمبا ہو کہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلا

جائے۔اسبال ہر لباس کے اندر ہو سکتا ہے لنگی وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں ہے چنانچہ آگے تصریح آجائے گی کہ اسبال عمامہ میں بھی ہوتا ہے یعنی عمامہ جتنا عموماً کسی عرف میں ہوتا ہے اس سے بڑا عمامہ باندھنا اس لئے کہ بعض علاقوں میں بڑا عمامہ باندھنا فخر کی بات سمجھا جاتا ہے یا آستین جتنی ہوتی ہے اس سے لمبی کرنا جب کہ اس کو فخر کی بات سمجھا جائے۔ قمیص یا جبہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ بھی اسبال میں داخل ہے اسی طرح اگر لنگی تہہ بند، پائجامہ، پینٹ، شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوں یہ بھی اسبال میں داخل ہے۔اسبال کا مفہوم بڑا عام ہے لیکن زیادہ تر حدیثوں میں لنگی وغیرہ کے اسبال کا ذکر آتا ہے یعنی اسبال ازار کا ازار اگرچہ نیچے باندھنے والی چادر کو کہتے ہیں لیکن یہاں اسبال سے مراد ہر وہ چیز ہے جو نچلے دھڑ کو چھپانے کے لئے پہنی جائے چاہے وہ لنگی اور تہہ بند ہو یا شلوار اور پائجامہ وغیرہ ہو سب اس میں داخل ہیں۔

اسبال ازار کا حکم ...... چونکہ اسبال ازار پر شدید وعیدیں بیان کی گئی ہیں اس لئے اتنی بات طے شدہ ہے کہ فی الجملہ اسبال اور خاص طور پر اسبال ازار ناجائز ہے۔

اسبال ازار کی صورتیں:۔

لیکن مطلقاً ناجائز ہے یا بعض صورتوں میں اس میں تفصیل یہ ہے کہ اس کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت ...... پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی بالقصد تکبر کی وجہ سے اسبال کرے یعنی شلوار یا لنگی ٹخنوں سے نیچے کرتا ہے۔

دوسری صورت ...... دوسری صورت یہ ہے کہ بالقصد اسبال ازار کرتا ہے لیکن اس کا منشاء تکبر نہیں کسی اور وجہ سے کرتا ہے۔

تیسری صورت ...... تیسری صورت یہ ہے کہ بغیر قصد کے نیچے ہو جائے اور یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کہ کپڑے کا سائز اس انداز سے اختیار کیا جائے کہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو لیکن ازار بند ڈھیلا ہونے کی وجہ سے نیچے ہو گیا یا لنگی ڈھیلی ہو گئی اور وہ ٹخنوں سے نیچے چلی گئی وغیر وغیرہ۔

پہلی صورت کا حکم ...... پہلی صورت بالاتفاق ناجائز ہے یعنی جب کہ تکبر کی وجہ سے ایسا کرے۔

تیسری صورت کا حکم ...... تیسری صورت بالاتفاق جائز ہے اس لئے کہ جو کام بغیر قصد کے ہو وہ شرعاً ممنوع نہیں۔

دوسری صورت میں اختلاف ...... دوسری صورت کے بارے میں اختلاف ہے یعنی بالقصد کیا لیکن اس کا منشا تکبر نہیں ہے یہ جائز ہے یا ناجائز اس میں دو قول ہیں:

(۱)..........ایک قول یہ ہے کہ یہ بھی مکروہ تحریمی ہے یعنی ناجائز ہے چنانچہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتح الباری میں اسی طرف رجحان ہے۔[1]

(۲)..........دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے یعنی اگر تکبر کی وجہ سے نہیں تو مکروہ تنزیہی ہے چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح کی ہے اور خود نوویؒ کی اپنی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔[2] حنفیہ میں سے ابن ملک اور ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کی رائے بھی یہی ہے۔[3] اور فتاویٰ عالمگیریہ میں بھی یہی لکھا گیا ہے کہ اگر بغیر تکبر کے ہو تو یہ مکروہ تنزیہی ہے مکروہ تحریمی نہیں ہے،[4] یہ دو قول ہیں۔

پہلے قول والوں کی دلیل...... پہلے قول والوں کا کہنا یہ ہے کہ اگرچہ بہت ساری احادیث میں **من الخیلاء** کی قید ہے کہ تکبر کی وجہ سے کرے لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے یعنی ایسا ہوتا ہی تکبر کی وجہ سے ہے، یہ قید فعل کی مزید شناعت بیان کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے قرآن پاک میں ہے: **وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا** ۔ کہ اگر تمہاری باندیاں پاک دامنی کا ارادہ رکھتی ہوں تو انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو یعنی اگر وہ پاک دامنی پر رہنا چاہتی ہوں تو پھر ان کو مجبور کرنا گناہ ہے اور اگر وہ پاک دامنی نہ چاہتی ہوں تو پھر ان کو بدکاری پر مجبور کرنا جائز ہے یہ مراد نہیں بلکہ دونوں صورتوں میں ناجائز ہے یہاں **اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا** کی قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے کیوں کہ عام اکراہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں یہ قید لگا کر فعل کی مزید شناعت مقصود ہے کہ اپنی باندیوں سے زبردستی بدکاری کروا رہے ہیں۔ بدکاری بذات خود بری بات ہے اور زبردستی بھی کروا رہے ہیں تو اس کی برائی دوگنی ہوگئی اس طرح **من الخیلاء** کی قید اگرچہ احادیث میں ہے لیکن یہ قید احترازی نہیں بلکہ واقعی ہے۔

پہلے قول والوں کی دوسری دلیل...... جو حضرات اسبال ازار کو مطلقاً مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں چاہے وہ تکبر کی وجہ سے ہو یا بغیر تکبر کے ان حضرات کا استدلال یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں درحقیقت دو طرح کی وعیدیں ہیں ایک وعید **ما أسفل من الکعبین من الازار ففی النار** ہے کہ ازار کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ جہنم میں ہوگا، یہ وعید ایسی ہے کہ عام پور اس کے ساتھ تکبر یعنی "خیلاء" کی قید ذکر نہیں کی گئی ہے اور دوسری وعید "**لاینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ**" کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن دیکھیں گے بھی نہیں، اس وعید کے ساتھ اکثر احادیث میں "خیلاء" کی قید ہے یعنی تکبر کی وجہ سے ہو تو یہ وعید ہے البتہ ایک حدیث میں یہ وعید بیان کی گئی ہے لیکن اس میں تکبر کی قید نہیں ہے وہ حدیث یہ ہے کہ

---

(۱) فتح الباری ج۱۰/ص۲۶۳ باب من جر ثوبہ من الخیلاء...... (۲) ایضاً...... (۳) مرقات ج۸/ص۱۳۸...... (۴) عالمگیریہ ج۵/ص۳۳۳

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں: **لا ینظر اللہ إلیھم یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذابٌ ألیم** ۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے اور ان کو پاکیزہ قرار نہیں دیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ پہلا وہ شخص جو احسان جتلانے کا عادی ہو اور دوسرا وہ شخص کہ جو اپنے سودے کو چھوٹی قسموں کے ذریعے چلائے اور تیسرا وہ شخص "**المسبل إزراہ**" ہے جو اپنی لنگی وغیرہ کو ٹخنوں سے نیچے کرے گا، اس میں وعید تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر نظر نہیں فرمائیں گے لیکن اس میں تکبر کی قید نہیں تاہم اکثر و بیشتر احادیث میں جہاں یہ دوسری وعید ہے وہاں خیلاء کی قید یعنی تکبر کی قید ضرور موجود ہے۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسری وعید اس صورت میں ہے جب کہ آدمی اسبال تکبر کی وجہ سے کرے لیکن پہلی وعید دونوں صورتوں میں ہے۔ تکبر کے ساتھ ہو یا بغیر تکبر کے جس کا مطلب یہ ہوا کہ بغیر تکبر کے ہو تو بھی گناہ ہے اس لئے کہ **ففی النار** کی وعید ہے اور اگر تکبر کی وجہ سے ہو تو اس سے بھی بڑا گناہ ہے اس لئے کہ اس میں **ففی النار** کی وعید کے ساتھ **لاینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ** کی وعید بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ دونوں صورتوں میں ہے چاہے تکبر کے ساتھ ہو یا بغیر تکبر کے ہو ہاں بغیر قصد و ارادے کے ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

دوسرے قول والوں کی دلیل ...... جو حضرات کہتے ہیں کہ اگر اسبال ازار کا منشا تکبر نہ ہو تو یہ مکروہ تحریمی نہیں ہے بلکہ مکروہ تنزیہی ہے، وہ حضرات ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں جو احادیث میں آتا ہے مشکوٰۃ میں بھی آئے گا، بخاری کی حدیث آرہی ہے(۱) کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری لنگی ٹخنوں سے نیچے ہو جاتی ہے اِلا یہ کہ میں ہر وقت اس کا خیال رکھوں اور اس کو اوپر رکھوں اور ظاہر ہے کہ ہر وقت اوپر کرتے رہنا مشکل ہے اس لئے بے خیالی میں بے توجہی میں نیچے ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیٹ بڑا تھا اس کی وجہ سے اوپر کرتے بھی تھے تو وہ ڈھلک کر نیچے ہو جاتی تھی۔ یہ وجہ ہو یا کوئی اور وجہ ہو بہر حال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی یہ حالت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: **إنك لستَ مِمَّن یصنعہ خیلاء** ۔ کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کی وجہ سے اسبال ازار کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ممنوع اس وقت ہے جب کہ تکبر کی وجہ سے ہو اگر بغیر تکبر کے ہو تو ناجائز اور ممنوع نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس میں کراہت تنزیہی ہوگی۔

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب اللباس الفصل الثالث ج ۲/ ص ۳۷۶

دلیل کا جواب...... پہلے قول والے یعنی کراہت تحریمہ کے قائلین اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث اس صورت کے بارے میں ہے جب کہ غیر ارادی طور نیچے ہو جائے کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ کی لنگی غیر ارادی طور پر نیچے ہو جاتی تھی قصد وارادے کے ساتھ ہو اور تکبر کی وجہ سے ہو اس کے بارے میں یہ حدیث نہیں ہے۔

دوسرے قول والوں کی دوسری دلیل...... کراہت تنزیہیہ کے قائلین کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حکم ایک ہے کہ اسبال ازار ناجائز ہے اور اس حکم میں دو طرح کی حدیثیں ہیں ایک وہ جن میں خیلاء کی قید ہے یعنی حدیثیں مقید ہیں اور دوسری وہ ہیں جن میں "خیلاء" یعنی تکبر کی قید نہیں ہے یعنی حدیثیں مطلق ہیں اور جب ایک ہی حکم میں دو یا دو سے زیادہ نصوص آجائیں ان میں سے بعض مطلق ہوں اور بعض مقید ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے یعنی جو مطلق ہے اس میں بھی وہ قید ملحوظ ہوتی ہے لہٰذا جن نصوص میں اسبال ازار پر وعید ہے لیکن تکبر کی قید نہیں لگائی گئی ان میں بھی یہ قید ملحوظ ہوگی۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ ساری وعیدیں چاہے فی النار کی وعید ہو یا لم ینظر اللہ الیہ فی یوم القیامة کی وعید ہو یہ اس وقت ہیں جب کہ تکبر ہو اگر تکبر نہ ہو تو یہ وعید نہیں ہے۔

اسبال ازار کی حرمت معلول بالعلۃ ہے...... اگر بحیثیت مجموعی تمام روایات پر اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کی جائے تو بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ (واللہ اعلم) کہ اسبال ازار اگرچہ ناجائز ہے لیکن اس کی حرمت معلول ہے علت کی وجہ سے ناجائز ہے محض امر تعبدی نہیں ہے۔

امر تعبدی...... وہ کام جو شریعت کا حکم ہوتے ہیں لیکن ان کی علت معلوم نہیں ہوتی کسی علت پر ان کا دار و مدار نہیں ہوتا ایسے کاموں کو امر تعبدی کہتے ہیں، اسبال ازار کا ممنوع ہونا امر تعبدی نہیں ہے بلکہ علت کی وجہ سے ممنوع ہے یہ حکم معلول بالعلۃ ہے اس لئے کہ یہ لباس کا حکم ہے جو بنیادی طور پر عادات کے قبیل سے ہے عبادات کے قبیل سے نہیں ہے اور عادات کے قبیل سے جو احکام ہوتے ہیں وہ عام طور پر معلول بالعلۃ ہوتے ہیں اور امر تعبدی نہیں ہوتے۔

اسبال ازار ممنوع ہونے کی علت تکبر ہے:-

وہ علت تکبر ہے اور احادیث میں تکبر کی قید اس کثرت سے آرہی ہے کہ یہ کہے بغیر چارۂ کار نہیں ہے کہ ممانعت تکبر کی علت کی وجہ سے ہے اور ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے احمد بن منیع کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إياك وجرُّ الإزار

فإن جر الإزار من المخيلة۔ [1] کہ اسبال ازار سے بچو اس لئے کہ اسبال ازار تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے یہاں **فَإنّ** کا لفظ ہے یہ اسلوب بتارہا ہے کہ اسبال ازار کی علت تکبر ہے۔

اسی طریقے سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں پہلے قول والوں نے اگرچہ یہ کہہ دیا ہے کہ یہ اس صورت کے بارے میں ہے جب کہ غیر ارادی طور پر نیچے ہو جائے اور اور واقعتاً یہ بات درست ہے کہ سوال اسی حالت کے بارے میں ہے اس لئے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قصد اور ارادے سے نیچے نہیں کرتے تھے بلکہ بغیر قصد اور ارادے کے نیچے ہو جاتا تھا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ: **إنك لست ممن يصنعه خيلاء۔** اس سے محض اس صورت کا حکم سمجھ میں نہیں آرہا، سوال اگرچہ اس خاص صورت کے بارے میں ہے لیکن فقہاء کا اصول ہے: **العِبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد۔** کہ نص کے لفظوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ان سے کیا سمجھ میں آیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں چونکہ تم تکبر کے وجہ نہیں کرتے اس لئے تمہارے لئے یہ جائز ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ یہ بیان نہیں فرمائی کہ بغیر ارادے کے ہو جاتا ہے بلکہ یہ وجہ بیان فرمائی کہ تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس حکم کی علت تکبر ہے اور صدیق اکبرؓ کے لئے جائز ہونے کی وجہ تکبر نہ ہونا ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ جب کسی حکم کی علت معلوم ہو جائے تو اس حکم کا مدار طرداً اور عکساً علت پر ہوتا ہے یعنی جہاں علت پائی جائے حکم بھی ہوگا اور جہاں علت نہ پائی جائے وہاں حکم بھی نہیں ہوگا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کراہت تحریمیہ تب ہو گی جب کہ تکبر کی وجہ سے ہو اور جہاں تکبر کی وجہ سے نہ ہو وہاں کراہت تحریمیہ نہیں ہو گی جہاں علت ہے وہاں حکم بھی ہے اور جہاں علت نہیں ہے وہاں حکم بھی نہیں ہے اور یہ بات تمام حدیثوں کے بارے میں ہو گی چاہے ان میں تکبر کی قید ہو یا نہ ہو اس لئے کہ علت کا مسئلے کی ہر ہر نص میں مصرح ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن یہ علت ایسی ہے کہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ پائی جاتی ہے یا نہیں پائی جاتی مشکل ہے لہٰذا جہاں یقین ہو کہ یہاں اسبال ازار تکبر کی وجہ سے نہیں ہو رہا اس کو مکروہ تحریمی قرار نہیں دیں گے مثلاً غیر ارادی طور پر ہو رہا ہے آدمی نے کپڑا اس انداز سے سلوایا تھا کہ ٹخنوں سے اوپر رہے لیکن غیر ارادی طور پر ازار بند یا لنگی وغیرہ ڈھلک کر نیچے ہو جاتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں ہے اگر تکبر ہوتا تو شروع ہی سے اس حساب سے سلواتا یا کسی جگہ خاص عرف سے یہ یقین ہو جائے کہ اس کا منشا تکبر نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے مسکین طبیعت کے اور بڑے متواضع قسم کے لوگ بھی نیچے کر لیتے ہیں تو وہاں پر یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ یہ کراہت تحریمی نہیں ہے لیکن

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب من جر ثوبہ من الخیلاء ج۱۰/ص ۲۱۷

عام حالات میں خاص طور پر اپنے بارے میں یہ کہنا کہ میں تکبر کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا یہ مشکل ہوتا ہے، اپنے بارے میں یہ کہنا کہ میرے اندر تکبر نہیں ہے یہ بذات خود تکبر ہے اور بڑا خطرناک دعویٰ ہے اور اگر یہ تو نہیں کہتا کہ میں تکبر سے بری اور خالی ہوں لیکن یہ کہتا ہے کہ فلاں کام میں نے تکبر کی وجہ سے نہیں کیا، یہ دعویٰ اگرچہ پہلے دعوے جیسا خطرناک نہیں ہے لیکن بعض حالات میں یہ دعویٰ مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اپنے عمل میں اس کے ساتھ مکروہ تحریمی والا معاملہ کرے۔

البتہ جہاں اس میں بکثرت ابتلاء ہو وہاں دوسروں پر سخت حکم لگانے میں احتیاط کرنی چاہئے۔

بہر حال فقہاء کا دوسرا قول کراہت تنزیہیہ کا ہے اور بہت سے حنفیہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے بعض علاقوں میں خصوصاً صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بڑے بڑے علماء کو آپ دیکھیں گے کہ ان کی شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوتی ہے اور ان میں بڑے متدین اور صالح قسم کے افراد بھی ہوتے ہیں اور بظاہر ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اب ان حضرات پر ہم عمومی فتویٰ لگا دیں کہ وہ بھی کراہت تحریمیہ کے مرتکب ہیں یہ بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

کسی جگہ کا عرف ایسا ہو جائے کہ متکبر اور غیر متکبر سب کرتے ہیں اور نیچے کرنا کوئی فخر کی بات نہیں سمجھی جاتی کس نے نیچے کی ہوئی ہے یا کس نے نیچے نہیں کی کسی کو فرق معلوم نہیں ہوتا اس کی خاص نشانی نہیں سمجھی جاتی کہ اس کی شلوار یا اس کی لنگی ٹخنوں سے نیچے ہے تو وہاں ہو سکتا ہے کہ ویسے ان میں تکبر ہو لیکن یہ فعل اس نے تکبر کی وجہ سے نہ کیا ہو ایسی صورت میں آدمی دوسروں کے بارے میں سخت فتویٰ نہ لگائے البتہ اپنے عمل میں احتیاط کرے، اپنا عمل ایسا رکھے جیسا کہ مکروہ تحریمی ہوتا ہے لیکن دوسروں کے بارے میں کراہت تنزیہیہ والا قول بھی مد نظر رکھے۔ گویا حاصل یہ کہ حرمت کی علت تکبر ہونا احادیث سے واضح ہے اور جب حکم کی علت معلوم ہو جائے تو مدارِ حکم علت ہی ہوتی ہے لیکن آدمی اپنے بارے میں یہی سوچے کہ ہو سکتا ہے کہ میرے اس کام کا منشا تکبر ہو اور مجھے اپنے تکبر کا احساس نہ ہو اور دوسرے کے بارے میں یہ سمجھے کہ اس کا منشا تکبر نہیں ہوگا بلکہ ویسے ہی اس نے کر لیا ہوگا۔

(۱۲)----- وعن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يأكلَ الرجلُ بشماله، أو يمشي في نعل واحدةٍ، وأن يشتمل الصَّماءَ أو يحتبيَ في ثوبٍ واحدٍ كاشفاً عن فرجه۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی اپنے بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک ہی جوتے میں

چلے اور اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی کپڑے کو اپنے اوپر مکمل طور پر لپیٹ لے یا ایک ہی کپڑے میں "احتباء" کرے اس حال میں کہ اس کی شرم گاہ ظاہر ہو رہی ہو۔

اس حدیث میں تین کاموں سے منع فرمایا ہے:

(۱)......... پہلا کام کہ بائیں ہاتھ سے نہ کھایا جائے بلکہ دائیں ہاتھ سے کھایا جائے، اس حکم کی تفصیل کتاب الاطعمہ میں گزر چکی ہے۔

(۲)......... اور دوسرا یہ کہ آدمی ایک ہی جوتے میں چلے ایک پاؤں میں جوتا ہے اور ایک میں نہیں اس سے اس لئے منع فرمایا کہ یہ وقار کے خلاف ہے دیکھنے میں برا لگتا ہے اور چلنے میں دقت بھی ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کراہت تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔

(۳)......... اور تیسرے نمبر پر آپ نے اشتمال الصّما سے منع فرمایا۔

اشتمال الصماء کی پہلی تفسیر ...... اشتمال الصماء کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں سب سے معروف تفسیر یہ ہے کہ آدمی کوئی چادر وغیرہ اپنے اوپر مکمل طور پر اس انداز سے لپیٹ لے کہ ہاتھ نکالنا بھی مشکل ہو جائے اس سے اس لئے منع فرمایا کہ اس صورت میں ایک تو نماز وغیرہ پڑھنا مشکل ہو جائے گا اگر پڑھے گا تو نماز کے پورے آداب کی رعایت نہیں کر سکے گا مثلاً ہاتھوں کو کانوں کے برابر لانا چاہئے وہ ایسا نہ کر سکے گا دوسرا یہ کہ آدمی کو بعض اوقات جلدی میں ہاتھ نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اگر اس طریقے سے اپنے آپ کو لپیٹا ہوا ہے تو اگر جلدی نکالنے کی کوشش بھی کرے گا تو بھی نہیں نکلے گا۔

اشتمال الصماء کی دوسری تفسیر ...... بعض حضرات نے اشتمال الصماء کی تفسیر یہ کی ہے کہ بڑی چادر لپیٹ کر اس کا ایک کنارہ کندھے پر رکھ لے یہ اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے کشف عورت کا خطرہ ہوتا ہے ستر کے کھلنے کا خطرہ ہوتا ہے جیسا کہ دیہاتوں میں کرتے ہیں اگرچہ وہ اشتمال الصماء میں داخل نہیں لیکن اس کے قریب قریب ہے کہ لنگی کا ایک کنارہ باتیں کرتے کرتے اوپر کو اٹھا لیتے ہیں اگر اس طرح اوپر اٹھا لیا کہ ستر کا کچھ حصہ ظاہر ہو گیا تو وہ ناجائز ہے اگر اتنا نہیں اٹھایا تو وہ ناجائز نہیں ہے۔

(۴)......... اور چوتھے آپ نے احتباء فی ثوب واحد سے منع فرمایا۔

احتباء فی ثوب واحد کا معنی:-

احتباء کا معنی "گھوٹ مار کر بیٹھنا" یعنی اس طریقے سے بیٹھنا کہ آدمی گھٹنے کھڑے کر لے اور اپنے بازو

سے اپنے گھٹنوں کے گرد حلقہ بنالے۔

احتباء جائز ہے بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے کہ آپ بھی اس انداز سے بکثرت بیٹھا کرتے تھے، لیکن جہاں احتباء سے کشف عورت کا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے۔ مثلاً اس زمانے میں ایسا ہوتا تھا کہ ایک بڑی ساری قمیص پہنی جاتی تھی اسی سے اوپر کا دھڑ چھپتا تھا اور اسی سے ٹانگیں چھپتی تھیں اس لئے نیچے کچھ پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی یہ تو ٹھیک ہے کہ ستر چھپ گیا لیکن ایسی حالت میں کہ محض ایک قمیص پہنی ہوئی ہے ایک لمباسا جبہ پہنا ہوا ہے اگر احتباءً بیٹھے گا تو خطرہ ہے کہ ستر ظاہر ہو جائے اس لئے اس سے منع فرمایا۔

(۱۳) ----- وعن عُمرِ وأنس وابن الزبير، وأبى أمامة رضى الله عنهم أجمعين عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: من لبسَ الحريرَ فى الدنيا، لم يلبَسهُ فى الآخرة۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عمر، انس، ابن زبیر اور ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دنیا میں ریشم پہنے گا وہ اسے آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔

مردوں کیلئے دنیا میں ریشم پہننا آخرت میں ریشم سے محرومی کا ذریعہ ہے:-

آخرت میں نہیں پہن سکے گا کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائے گا اور یہ اس صورت میں ہوگا جب کہ صرف ریشم پہننا ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی شامل ہو جائے کہ اس کی وجہ سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے مثلاً ریشم کو حلال سمجھ لیا جائے وغیرہ وغیرہ اس انداز سے حلال سمجھے کہ نوبت کفر تک پہنچ جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں ریشم نہیں پہن سکے گا یعنی ابتداءً جنت میں داخل نہیں ہوگا اور بظاہر یہ مطلب راجح ہے کہ ابتداءً اسے ریشم پہننا نصیب نہیں ہوگا بلکہ دنیا میں جو ریشم پہنا، گناہ کا ارتکاب کیا اس کی سزا بھگتنی پڑے گی ہاں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یا کسی اور وجہ سے معاف فرمادیں تو اور بات ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر جنت میں چلا بھی گیا تو جنت کی باقی نعمتیں تو نصیب ہو جائیں گی لیکن ریشم والی نعمت اسے نہیں ملے گی۔

(۱٤)----وعن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما

يَلبَسُ الحريرَ في الدنيا مَن لاخلاقَ له في الآخرة۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں ریشم وہ لوگ پہنتے ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ (یعنی کافر پہنتے ہیں)

(۱۵)----- وعن حُذيفةَ، قال: نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نشربَ في آنيةِ الفضَّةِ والذهبِ وأن نأكلَ فيها: وعن لُبسِ الحرير والديباج، وأن نجلِسَ عليه۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا کہ ہم چاندی اور سونے کے برتنوں میں پئیں اور یہ کہ ہم ان برتنوں کے اندر کھائیں اور آپ نے منع فرمایا ریشم اور دیباج کے پہننے سے اور اس بات سے کہ ریشم پر بیٹھیں۔

(۱۶)-----وعن علي رضي الله عنه قال: أهديت لرسول الله صلى الله عليه وسلم حُلّةٌ سِيَرَاءُ فبعثَ بها إليَّ فلبستُها، فعرَفتُ الغضَبَ في وجهه، فقال: إني لم أبعث بها إليكَ لِتَلبَسَها، إنما بعَثتُ بها إليكَ لِتُشَقِّقَهاُ خُمراً بين النساءِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی جوڑا ہدیے میں دیا گیا تو آپ نے وہ جوڑا میری طرف بھیج دیا تو میں نے اسے پہن لیا۔ میں نے حضور اقدس ﷺ کے چہرے میں ناراضگی کے آثار محسوس کئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ جوڑا میں نے آپ کی طرف اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم خود پہن لو بلکہ میں نے یہ اس لئے بھیجا تھا کہ تم اسے کاٹ کر اپنی عورتوں کے درمیان اوڑھنیاں بنا کر تقسیم کردو۔

(۱۷)-----وعن عمرؓ رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن لُبسِ الحرير إلا هكذا، ورفعَ رسول الله صلى الله عليه وسلم إصبَعَيهِ: الوُسطى والسَّبابَةَ وضمّهُما۔ (متفق عليه)

وفي رواية لُمسلم: أنه خطَبَ بالجابيةِ، فقال: نهى رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عن لبس الحرير إلا مَوضعَ اصبَعَين أوثلاثٍ أو أربعٍ۔

ترجمہ ...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ریشم پہننے سے منع فرمایا مگر اتنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرماتے ہوئے اپنی دو انگلیوں کو اوپر اٹھایا یعنی درمیان والی انگلی کو اور شہادت والی انگلی کو اور ان دونوں کو ملایا اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جابیہ یعنی شام کے ایک شہر میں خطبہ دیا اور اس میں یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا مگر وہ کہ جو دو انگلیوں کے برابر ہو یا تین کے برابر ہو یا چار انگلیوں کے برابر ہو۔

ریشم کا حکم:۔

یہ چند حدیثیں ہیں جن میں ریشم پہننے کا حکم بیان کیا گیا ہے اور اس موضوع پر آگے بھی حدیثیں آرہی ہیں لیکن ریشم کا حکم یہیں سمجھ لیا جائے۔

ریشم کے حکم میں سلف سے تین قول منقول ہیں:

(۱)........ پہلا قول یہ ہے کہ ریشم پہننا مطلقاً حرام ہے یعنی مردوں پر بھی اور عورتوں پر بھی چنانچہ حضرت ابن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور بعض صحابہؓ سے بھی یہی منقول ہے اور تابعین میں سے حسن بصریؒ سے یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

(۲)........ دوسرا قول یہ ہے کہ ریشم پہننا عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے جائز ہے البتہ مردوں کو منع کیا گیا ہے، یہ یا تو تنزیہی ہے یا اس صورت میں ہے کہ جب کہ تکبر یا فخر کے طور پر پہنے بذات خود مرد پر یہ ممنوع نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی بظاہر یہی رائے معلوم ہوتی ہے اور بھی بعض سلف سے یہ بات منقول ہے مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ریشم پہن رکھا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں منع کیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہنستے ہوئے کہا کہ اگر آپ میری مان لیں تو آپ بھی میری طرح پہن لیں، اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لئے مکروہ تحریمی نہیں سمجھتے تھے یہ دونوں قول تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔

(۳)........ بعد کے فقہاء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ ریشم عورتوں کے لئے جائز ہے مردوں کے لئے حرام ہے اب اس کے خلاف اگر کوئی قول ہو گا تو وہ شاذ ہو گا۔

ریشم کی حقیقت:۔

یہاں سمجھنے کی ایک بات یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مرد کے لئے ریشم ناجائز ہے یا یوں کہئے کہ

حریر ناجائز ہے تو حریر سے مراد کیا ہے۔ ہمارے ہاں بعض اوقات ہر نرم کپڑے یا ہر قسم کی سلک کو ریشمی کپڑا کہہ دیا جاتا ہے لیکن شرعاً حریر یا ریشم سے مراد وہ ریشم ہے جو خاص قسم کے کیڑے کے منہ سے نکلتا ہے ایک خاص کیڑا ہوتا ہے جو زیادہ تر شہتوت کھاتا ہے اس کی بنیادی خوراک یہی ہوتی ہے اور جب وہ خاص عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کا لعاب نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اس لعاب کو اپنے اوپر لپیٹنا شروع کر دیتا ہے اور اسی لعاب سے ریشے سے بن جاتے ہیں اور وہ خود اس کے اندر گھٹ کر مر جاتا ہے۔ انسان کو ریشم دینے کے لئے وہ اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے ایک جدید سائنس دان نے بتایا کہ جب اس کا لعاب نکالنے کا وقت آتا ہے تو پہلے اپنے پیٹ کو غلاظت سے مکمل طور پر صاف کر لیتا ہے اس کے بعد یہ کام شروع کرتا ہے اور اس کے اوپر ایک خول بن جاتا ہے خود اس میں مر جاتا ہے تاکہ انسان کو بالکل صاف ستھری چیز ملے، اس کے اوپر والے ریشے سے دھاگہ وغیرہ بنا کر کپڑا بنایا جاتا ہے اور بڑا نرم اور قیمتی کپڑا سمجھا جاتا ہے اور خول الگ ہوتا ہے اس کو اطباء عموماً ادویات میں استعمال کرتے ہیں اسے ابریشم کہا جاتا ہے اگر آپ نے ابریشم دیکھنا ہو تو آپ کسی بھی دواخانے پر جائیں کہ اتنا ابریشم دے دو وہ دیدے گا، وہ خول سے ہوں گے ان کے اوپر سے ریشم کے ریشے کو اتار لیا جاتا ہے لیکن کچھ کچھ اوپر رہ جاتا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ریشم کیا ہوتا ہے۔

ریشم کی اقسام:۔

فقہاء نے ریشمی کپڑے کی تین اقسام لکھی ہیں:

(۱)......... پہلی قسم حریر محض یعنی خالص ریشم، کپڑے کا تانہ اور بانہ ریشم کا ہو اس کو حریر مصمت بھی کہتے ہیں۔

(۲)......... دوسری قسم یہ ہے کہ کپڑے کا تانہ تو کسی اور چیز کا ہے لیکن بانا ریشم کا ہے تانے کو عربی میں سدی کہتے ہیں اور بانے کو لحمہ کہتے ہیں تو سدی کسی اور چیز کا ہے اور لیکن لحمہ ریشم کا ہے۔

(۳)......... تیسری قسم اس کے برعکس ہے کہ تانا ریشم کا ہے اور بانا کسی اور چیز کا ہے۔

ان میں سے پہلی دو قسمیں ناجائز ہیں، خالص ریشم ہو تو وہ بھی مردوں کے لئے ناجائز ہے اور اگر بانا ریشم کا ہے اور تانہ کسی اور چیز کا ہے تو بھی ناجائز ہے لیکن اگر تانا ریشم کا ہے اور بانہ کسی اور چیز کا ہے تو اس کا پہننا مردوں کے لئے جائز ہے یعنی وہ ریشمی کپڑا سمجھا ہی نہیں جائے گا۔ فقہاء کے ہاں کپڑے کا دارومدار بانے پر ہے جس چیز کا بانا ہو اس چیز کا کپڑا سمجھا جائے گا لہٰذا اگر بانا ریشم کا ہے تو کپڑا ریشم کا ہے اس لئے اس کا پہننا ناجائز ہے اور اگر بانا کسی اور چیز کا ہے مثلاً سوت کا ہے تو اس کا پہننا جائز ہے وہ سوتی کپڑا سمجھا جائے گا چاہے اس کا تانا ریشم کا ہو۔

آج کل ریشم ہونے کا مدار اکثریت پر ہے:۔

لیکن آج کل دو مسئلے ہیں ایک یہ کہ کپڑا بننے کے بعض انداز ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تانا اور بانا نہیں ہوتا اس انداز سے بنے جاتے ہیں جیسے سویٹر بنے جاتے ہیں اکثر بنیانیں اور ہوزری کی چیزیں اس انداز سے بنی جاتی ہیں کہ اگر ایک طرف سے آپ دھاگہ نکالنا شروع کریں تو وہ ادھڑتا چلا جائے گا اس میں تانے بانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا تو اس میں کیسے فیصلہ کریں گے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بعض اوقات تانے اور بانے کا فرق نہیں ہوتا تانا بھی اسی دھاگے کا ہوتا ہے اور بانا بھی اسی دھاگے کا ہوتا ہے البتہ دھاگہ بناتے وقت کئی چیزیں مکس کر لی جاتی ہیں اس میں سوت بھی شامل کر لیا جاتا ہے اور اس میں بعض اوقات نائلون بھی شامل کر لیا جاتا ہے یہاں یہ نہیں کہ تانا کسی اور چیز کا اور بانا کسی اور چیز کا لگایا بلکہ دھاگہ مخلوط ہے، اسی کا تانا اور اسی کا بانا۔ تو اس صورت میں یہ فیصلہ کیسے کریں کہ یہ کپڑا ریشم کا ہے یا نہیں ہے، ان دونوں صورتوں میں تانے اور بانے پر مدار نہیں رکھا جا سکتا ان میں اکثریت واغلب پر مدار ہوگا جو چیز پچاس فی صد سے زائد ہو شرعاً کپڑا اسی کا سمجھا جائے گا لہٰذا فرض کیجئے کہ نائلون بھی ہے اور ریشم بھی ہے اگر نائلون زیادہ ہے اور ریشم کم تو کپڑا نائلون کا سمجھا جائے گا اس کو پہننا جائز ہے اور اگر ریشم زیادہ اور نائلون کم ہے تو وہ ریشمی کپڑا سمجھا جائے گا اس کا پہننا ناجائز ہوگا۔

عذر کی وجہ سے مردوں کے لئے ریشم پہننا:۔

مردوں کے لئے اگرچہ ریشم ناجائز ہے لیکن عذر کی وجہ سے پہننے کی اجازت ہے، اس پر تقریباً اتفاق ہے عذر کئی ہو سکتے ہیں مثلاً جسم پر کوئی خارش وغیرہ ایسی ہے کہ اس کا علاج ریشم پہنے بغیر نہیں ہو سکتا یا اس زمانے میں لڑائی کے اندر ریشم پہنا جاتا تھا۔ اس لئے کہ لڑائی دراصل تلواروں سے ہوتی تھی اور ریشم چونکہ بہت نرم ہوتا ہے اس لئے جب اس پر تلوار کی دھار لگتی ہے تو سیدھی جسم کے اندر جانے کی بجائے پھسل جاتی ہے اور آدمی تلوار کی وجہ سے زخمی نہیں ہوتا تو ریشم تلوار سے بچاؤ کا کام دیتا ہے۔ لہٰذا عذر مثلاً خارش وغیرہ یا لڑائی کے اندر ریشم پہننا جائز ہے اور خود حدیث میں بھی اس کا ذکر آ رہا ہے، آگے اسی فصل میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آ رہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ریشم پہننے کی اجازت دی اس لئے کہ ان کے جسم پر کھجلی اور خارش تھی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ ان کے جسم پر جوئیں تھیں ان سے بچاؤ کے لئے حضور اقدس ﷺ نے انہیں ریشم کی قمیص پہننے کی اجازت دی تو معلوم ہوا کہ عذر کی وجہ سے مرد کے لئے ریشم پہننا جائز ہے۔

عذر کی وجہ سے کیسا ریشم پہننا جائز ہے:-

(ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کا مذہب) ...... ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کا مذہب یہ ہے کہ عذر کی وجہ سے ہر قسم کا ریشم جائز ہے چاہے وہ حریر محض یعنی خالص ریشم ہو یا ایسا ریشم ہو جس کا بانا ریشم کا ہو اگرچہ تانا کسی اور چیز کا ہو۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ...... امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حریر محض یعنی خالص ریشم پہننا جائز نہیں، عذر کی وجہ سے اجازت صرف اس ریشمی کپڑے کی ہے جس کا بانا ریشم کا تھا تانا کسی اور چیز کا تھا کہ ایسا کپڑا عام حالت میں پہننا جائز نہیں تھا لیکن عذر کی وجہ سے جائز ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کی دلیل ...... ائمہ ثلاثہ اور صاحبین یہ کہتے ہیں کہ جن حدیثوں میں عذر کی وجہ سے رخصت آئی ہے ان میں کوئی تقیید نہیں کہ فلاں قسم کا ریشم پہن سکتے ہو اور فلاں قسم کا نہیں پہن سکتے لہٰذا جب عذر ثابت ہو گیا تو ہر قسم کا ریشم جائز ہو گا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل ...... امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل کے اعتبار سے مرد کے لئے ریشم حرام تھا یہاں ضرورت کی وجہ سے اجازت دی گئی ہے اور قاعدہ ہے: "الضَّرُوْرِيُّ يتقدر بقدر الضروة" کہ جو کام ضرورت کی وجہ سے کیا جاتا ہے وہ بقدر ضرورت کیا جاتا ہے اور ضرورت تھوڑے سے پوری ہو سکتی ہے لہٰذا زیادہ کی اجازت نہیں ہو گی، تھوڑے سے مراد یہ ہے کہ جس کا صرف بانا ریشم کا ہے تانا نہیں جب اس سے ضرورت پوری ہو گی تو خالص ریشم پہننا جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس دلیل سے معلوم ہوا کہ اگر ضرورت اس کپڑے سے پوری نہ ہو جس کپڑے کا بانا محض ریشم کا ہے تانا کسی اور چیز کا ہے تو اس کے لئے خالص ریشم پہننا بھی جائز ہو گا اسی طرح عذر والے کو خالص ریشم تو ملتا ہے لیکن وہ ریشمی کپڑا نہیں ملتا جس کا صرف بانا ریشم کا ہے تو اس کے لئے بھی خالص ریشم پہننا جائز ہو گا اس لئے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے معذور کو خالص ریشم سے اس لئے منع کیا تھا کہ اس کے بغیر ضرورت پوری ہو جاتی تھی لیکن جب اس کے بغیر ضرورت پوری نہ ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک بھی مرد کو خالص ریشم کی اجازت ہو گی۔

غیر ریشمی کپڑے کے حاشیہ وغیرہ پر ریشم لگانا:-

اگر کپڑا ریشم کا نہ ہو لیکن اس پر حاشیہ یا پٹیاں ریشم کی لگی ہوئی ہیں تو مرد کے لئے بغیر عذر کے جائز ہے مثلاً آستین کے کنارے پر ریشم لگا لیا، دامن کے کنارے پر ریشم لگا لیا یا گریبان پر ریشم لگا لیا، ریشم کی پٹی

لگالی، شلوار کے پائنچہ پر ریشم کی پٹی لگالی۔

بلا عذر جائز ہونے کے لئے شرط...... اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کی چوڑائی چار انگل سے زیادہ نہ ہو لمبائی میں کوئی حرج نہیں، لمبائی کتنی ہی ہو جائے کوئی حرج نہیں لیکن چوڑائی زیادہ سے زیادہ چار انگلی ہو اس سے زیادہ نہ ہو اگر چوڑائی اس سے زیادہ ہو گئی تو وہ ناجائز ہے۔

بلا عذر چار انگلی کی مقدار ریشم جائز ہونے کا ثبوت...... چنانچہ اس کی بھی احادیث میں تصریح مذکور ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کے ایک شہر جابیہ میں خطبہ دیا اور اس میں یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا سوائے اس کے کہ وہ دو یا تین یا چار انگلیوں کے برابر ہو اگرچہ ایک روایت میں دو انگلیوں کا بھی ذکر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درمیان والی انگلی اور شہادت والی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اتنا ہو جس میں دو انگلیوں کا ذکر ہے۔ اس میں چونکہ زیادہ کی نفی نہیں ہے اور دوسری روایتوں میں چار کا ذکر ہے اور زیادہ سے زیادہ چار کا ذکر آرہا ہے اس لئے چار تک اجازت ہے چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ آگے اسماء بنت ابی بکرؓ کی حدیث بھی آرہی ہے اس میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک جبے کی کیفیت بیان فرمائی ہے اس میں یہ بھی آتا ہے کہ ''لها لبنة ديباج'' کہ اس پر دیباج کا گریبان لگا ہوا تھا اور دیباج بھی ریشم کی ایک قسم ہے اور اسی طرح فرمایا: ''فرجيها مكفوفين بالديباج'' اس کی کشادگیوں پر ریشم کی کناریاں لگی ہوئی تھیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ ریشم کی پٹی کپڑے کو لگانا جائز ہے اور بھی بہت ساری احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے۔

تعارض...... البتہ بعض روایات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ریشم پہننا ٹھیک نہیں اسی طرح ریشم کا حاشیہ یا پٹی بھی ٹھیک نہیں مثلاً مشکوٰۃ کے صفحہ نمبر ۳۷۵ کے آخر میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث ہے اس میں یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا ألبس القميص المكفف بالحرير** ۔ کہ میں ایسی قمیص نہیں پہنتا جس پر ریشم کا حاشیہ لگا ہوا ہو اس سے اگلی حدیث حضرت ابوریحانہؓ کی ہے اس میں یہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس چیزوں سے منع فرمایا ان دس (۱۰) چیزوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ **أن يجعل الرجل في أسفل ثيابه حريرا مثل الأعاجم** ۔ کہ آدمی اپنے کپڑے کے نچلے حصے میں عجمیوں کی طرح ریشم لگالے اور یہ بھی اس کے اندر ہے: **أن يجعل على منكبيه حريرا مثل الأعاجم** ۔ کہ آدمی اپنے کندھوں پر عجمیوں کی طرح ریشم یعنی ریشم کی پٹیاں لگالے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ریشم کی پٹی اور حاشیہ جائز نہیں۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں سند کے اعتبار سے جواز والی احادیث کے ہم پلہ نہیں ہیں اس لئے وہ راجح ہوں گی اور یہ مرجوح ہوں گی۔

اس کے علاوہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں آپ نے پہننے سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں ایسی قمیص نہیں پہنتا، باقی رہا یہ کہ آپ نے ایسا جبہ پہنا ہے اس کا جواب اگلی حدیث کی شرح میں دیں گے۔

حضرت ابو ریحانہؓ والی حدیث میں ریشم کی پٹی یا حاشیہ سے منع کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی مثل الاعاجم کی قید بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً پٹی سے منع کرنا مقصود نہیں بلکہ کوئی خاص قسم کا حاشیہ ہوتا ہوگا جس میں عجمیوں کے ساتھ تشبہ ہوتا ہوگا اس لئے آپ نے اس سے منع فرمایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی چوڑائی چار انگلی سے زائد ہوتی ہوگی اس لئے آپ نے اس سے منع فرمایا۔

چار انگلی کی مقدار ریشم کی اجازت کی وجوہ...... چار انگلی تک اجازت کیوں دی گئی ہے اصل بات یہ ہے کہ شریعت کا حکم ہے البتہ حکمت کے درجے میں اس کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱)......... ایک وجہ یہ ہے کہ اتنا ریشم اصل میں تابع ہوتا ہے اور لباس میں بعض چیزیں اصالۃً تو جائز نہیں ہوتیں لیکن اگر وہ تابع ہوں تو وہ جائز ہوتی ہیں۔

مردوں کے لئے سونے کے بٹن استعمال کرنا...... مثلاً مرد کے لئے سونا پہننا جائز نہیں ہے لیکن اگر سونے کے بٹن ہوں اور وہ جسم کے ساتھ نہ لگتے ہوں تو بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے اس وجہ سے کہ اس کی حیثیت تابع کی ہے اتنا ریشم بھی چونکہ تابع ہے اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

(۲) .... فقہاء نے دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ ریشم کا لباس اصل میں جنت کا لباس ہے: **وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ** یہ لباس پورا کا پورا جنت میں جا کر ملے گا، جنت کی نعمت کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ یہاں دنیا میں بھی تھوڑا سا ریشم ہو تو ذہن میں آئے کہ پورا ہونا چاہئے اور پھر سوچے گا کہ پورا کیسے ہوگا دنیا میں تو ہو نہیں سکتا تو پتہ چلے گا کہ جنت میں ہوگا، جنت کا شوق پیدا ہوگا تو جنت کی نعمت کی چاٹ لگانے کے لئے اجازت دے دی۔

ریشم کے بستر پر بیٹھنے کا حکم:۔

ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کا مذہب...... ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے ہاں ریشم کے بستر پر بیٹھنا ناجائز ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کی دلیل...... ان کی دلیل حضرت حذیفہؓ کی حدیث ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: أن نجلس علیه اس پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب...... امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ریشم پر بیٹھنا جائز ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل...... ان کی دلیل یہ ہے کہ ابن سعد نے طبقات میں راشد مولیٰ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کی مسند پر ریشم کا ایک تکیہ گدی دیکھی جس پر وہ ٹیک لگاتے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عامرؓ کے بارے میں طحاوی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ ریشم کی تھی البتہ ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عبداللہ بن عامر کو اس سے منع فرمایا تھا کہ یہ اٹھادو۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو اس وجہ سے منع فرمایا تھا کہ یہ محض تنعم کی قبیل سے تھا اس وجہ سے نہیں کہ بیٹھنا ناجائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ پہلے بیٹھتے تھے اور ظاہر ہے کہ اور صحابہ بھی ان کو ملنے کے لئے آتے ہوں گے لیکن کسی نے منع نہیں کیا یہ دلیل ہے کہ وہ جائز سمجھتے تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے منع کرنے کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ تنعم کی وجہ سے منع کیا ہے چنانچہ بعض روایتوں میں یہ تصریح آتی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ جن کے بارے میں قرآن کریم یہ کہتا ہے: أذهبتم في حيٰوتكم الدنيا واستمتعتم بها۔ بہر حال ان چند روایتوں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ریشم پر بیٹھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، باقی حضرت حذیفہؓ کی حدیث جس میں جلوس سے بھی نہی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں ریشم سے کی حدیثیں بہت سارے صحابہؓ روایت کر رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی روایت میں بیٹھنے سے نہی کا ذکر نہیں، پہننے سے نہی کا ذکر ہے صرف حضرت حذیفہؓ کی روایت میں بیٹھنے سے بھی نہی کا ذکر ہے اور پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی بہت سی سندیں ہیں سب سندیں سب طرق بیٹھنے کے تذکرے سے خالی ہیں، صرف جریر بن حازم کی روایت میں ریشم پر بیٹھنے کا بھی ذکر ہے لیکن وہ روایت نقل کرنے میں متفرد ہیں۔

ویسے جریر ثقہ ہے اور ثقہ کا تفرد بھی مقبول ہوتا ہے ثقہ کی زیادت بھی مقبول ہوتی ہے لیکن یہاں ایک بات تو یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں ثقات کی بہت بڑی تعداد ہے دوسرا یہ کہ جریر بن حازم کے بارے میں آتا ہے کہ یہ اگرچہ ثقہ ہیں لیکن اوہام میں بکثرت مبتلا ہو جاتے تھے، غلطیاں بکثرت ہو جاتی تھیں اس لئے یہ کہنے کی گنجائش موجود ہے کہ یہاں بھی جریر بن حازم سے غلطی ہو گئی ہے اس لئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے

اس روایت کو نہیں اپنایا اور اس پر عمل نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جریر بن حازم کا انتقال امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پچیس (۲۵) سال بعد ہوا ہے تو ہو سکتا ہے کہ امام صاحبؒ کے انتقال کے بعد بیان کی ہو، ظاہر ہے کہ امام صاحبؒ ان احادیث کے مکلف ہیں جو آپ کے زمانے تک روایت ہو رہی تھیں اگر بعد میں کسی سے کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کے مکلف نہیں ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے انتقال تک أن نجلس عليه والی روایت کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا۔ بہر حال دونوں قول ہیں جواز کا بھی ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جواز کے قائل ہیں اور عدم جواز کا بھی ہے اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اختلاف سے نکل جائے اور ایسی چیز کو اختیار ہی نہ کرے جس کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف ہو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے الفاظ: أهديتُ لرسول الله ﷺ حُلَّةً سِيراء۔ اس کو دو طریقے سے روایت کیا گیا ہے ایک تو یہ کہ موصوف صفت ہیں حُلَّةً سیراء اور دوسری روایت اضافت کے ساتھ ہے یعنی "حُلَّة سِيَرَاء" تو اس صورت میں موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہو گی۔

سیراء کی تفاسیر:۔

(۱)......... سیراء کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ ایسا کپڑا جو خالص ریشم کا ہو۔

(۲)......... ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ جس کا تانہ ریشم کا ہو اور بظاہر ان دونوں میں سے کوئی معنی یہاں مراد ہے اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن وہ بظاہر یہاں مراد نہیں ہیں۔

دیباج کا لفظ روایات میں آرہا ہے تو دیباج بھی عموماً ریشم کی ایک خاص قسم کو کہا جاتا ہے جو دلہا کے لئے خریدا جاتا ہے اور اگر آپ کپڑے کی کسی اچھی دکان پر جائیں گے بلکہ شادی بیاہ کے کپڑوں کے لئے دکانیں بھی الگ ہوتی ہیں ان کو بتائیں گے کہ دلہا کے لئے خریدنا ہے تو وہ آپ کو الگ کپڑے دکھائیں گے اور زیادہ تر یہ ہلکے پیلے ہوتے ہیں ان میں بعض اوقات خالص ریشم بھی ہوتا ہے۔

(۱۸) ----- وعن أسماءَ بنت ابی بکر: أنها أخرجَت جُبَّةَ طيالِسَة كِسرَوَانِيَّةَ لها لبنَةُ ديباج، وفُرجيها مكفوفَين بالديباج، وقالت: هذه جُبَّةُ رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت عند عائشةَ فلما قُبضت قبضتُها، وكان النبی صلى الله عليه وسلم يلبَسُها، فنحنُ نغسِلُها للمَرضى نستشفی بها۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک طیلسانی کپڑے کا جبہ نکالا جو کسریٰ کے انداز کا تھا، اس پر دیباج کا گریبان تھا اور میں نے اس کے

دو شگافوں کو دیکھا جن پر دیباج کا حاشیہ لگا ہوا تھا اور حضرت اسماء نے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھا اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو میں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا اور نبی کریم ﷺ تو اس جبے کو پہنا کرتے تھے اور ہم اس کو بیماروں کے لئے دھوتے ہیں اور اس کے ذریعے شفا حاصل کرتے ہیں۔

یعنی اس کو دھو کر اس کا پانی مریض کو پلایا جاتا ہے یا مریض کے جسم پر ڈالا جاتا ہے جس سے مریض تندرست ہو جاتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس کے متعلق دو (۲۰) لفظ ملتے جلتے آتے ہیں ایک لفظ قمیص اور دوسرا جبہ ان دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں سلے ہوئے لباس ہوتے ہیں۔ اِزار اور رداء کی طرح ان سلے نہیں ہوتے اور دوسرا یہ کہ یہ عموماً کافی لمبے ہوتے تھے اور ٹانگوں کا بھی بیشتر حصہ ان میں چھپ جاتا تھا لیکن فرق کیا ہے؟

قمیص اور جبہ میں فرق......

(۱)........... بعض نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ قمیص کہرے کپڑے کی ہوتی تھی اور جبہ دہرے کپڑے کا اور دہری سلائی کا ہوتا تھا اور درمیان میں بعض اوقات کوئی چیز بھی بھر دی جاتی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ جبہ سردیوں میں پہنا جاتا ہوگا۔

(۲)........... بعض نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ قمیص کے شگاف دائیں بائیں ہوتے ہیں اور جبے میں شگاف آگے پیچھے ہوتے ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔

دونوں فرق قریب قریب ہیں کوئی بنیادی فرق ان میں نہیں ہے۔

یہاں حدیث کے الفاظ "جبة طيالسة كسروانية" ہیں طیالسۃ یہ طیلسان کی جمع ہے اور طیلسان خاص قسم کی چادر ہوتی تھی جو اس زمانے میں اہل فارس وغیرہ استعمال کیا کرتے تھے یہاں اس کا کپڑا مراد ہے اس لئے ترجمہ طیلسانی کپڑا کیا۔

"كسروانية" کسریٰ کی طرف نسبت ہے، کسریٰ کے علاقے کا بنا ہوا (یعنی فارس کا بنا ہوا) یا کسریٰ کے انداز پر بنا ہوا۔

یہاں ان لفظوں کی ترکیب میں کئی احتمال ہیں سب سے پہلا احتمال یہ ہے کہ جبۃ طیالسۃ کی طرف مضاف ہے اس صورت میں کسروانیۃ میں دو احتمال ہوئے۔ ایک یہ کہ یہ طیالسۃ کی صفت ہو اس صورت میں کسروانیۃ مجرور ہوگا "جُبَّةَ طَيالِسةِ كِسروانيةِ" اور دوسرا یہ کہ كسروانية جبة کی صفت ہو، اس صورت میں یہ مضوب ہوگا "جُبةَ طيالِسةِ كسروانيةً" یہ دونوں احتمال اس صورت میں ہوں گے کہ جب جبۃ کو

طیالسۃ کی طرف مضاف سمجھا جائے تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا "جبۃَ طیالسۃِ کسروانیۃٍ" پہلے احتمال کے مطابق ترجمہ کہ کسریٰ کے علاقے کے بنے ہوئے طیلسانی کپڑے کا جبہ اور دوسرے احتمال کے مطابق ترجمہ ہو گا "جُبۃَ طیالسۃِ کسروانیۃً" کہ طیلسانی کپڑے کا کسریٰ کے علاقے کا بنا ہوا جبہ اس لئے کہ کسروانیۃ طیالسۃ کی صفت نہیں بلکہ جبہ کی ہے یہ تو ساری گفتگو اس وقت ہے جب کہ جبہ طیالسۃ کی طرف مضاف ہو۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ موصوف صفت ہوں تو اس صورت میں طیالسۃ بھی منصوب ہو گا اور کسروانیۃ بھی منصوب ہو گا۔ جبۃً طیالسۃً کسروانیۃً کہ کسریٰ کے علاقے کا بنا ہوا طیلسانی جبہ یا کسریٰ کے طرز پر بنا ہوا طیلسانی جبہ۔ یہ سارے ترکیبی احتمالات ہیں مطلب اور خلاصہ ایک ہی نکلے گا کہ اس جبے کا کپڑا وہ تھا جس سے طیلسان بنائی جاتی تھی اور یہ کپڑا کسریٰ کے علاقے کا بنا ہوا تھا یا جس طرح کا کپڑا کسریٰ پہنا کرتا تھا اس انداز کا بنا ہوا تھا۔

کفار کی اشیاء استعمال کرنا:۔

پہلے حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث گزری اس میں آپ نے رومی جبہ پہنا تھا اور یہاں آپ نے فارسی جبہ پہنا۔

وہ بھی اس وقت کی بہت بڑی کافر طاقت تھی اور یہ بھی اس وقت بہت بڑی کافر طاقت تھی معلوم ہوا کہ کافروں کی بنی ہوئی چیز کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ وہ ان کی عبادت کی قبیل سے نہ ہو اور نہ ہی کسی کافر قوم کے ساتھ ایسا مخصوص ہو کہ ان کا شعار بن چکا ہو۔

حضور اقدس ﷺ کا اعلیٰ اور عمدہ لباس پہننا:۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ اور عمدہ لباس بھی پہنا ہے اس لئے کہ جو جبہ کسریٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو وہ بظاہر معمولی نہیں ہو گا اور پھر اس پر ریشم کے حاشیے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ نے عمدہ لباس پہنا ہے۔

آگے یہ آرہا ہے کہ اس جبے میں "لبنۃ دیباج" دیباج کا گریبان تھا یعنی ریشم کا گریبان تھا اور اس کے جو دو شگاف ہوتے ہیں ان میں بھی ریشم کا حاشیہ لگا ہوا تھا تو اس سے وہی مسئلہ ثابت ہوا کہ اگرچہ مردوں کے لئے ریشم ناجائز ہے لیکن اس کا حاشیہ جائز ہے اور بظاہر یہ حاشیہ چار انگل سے زائد نہیں ہو گا۔

تعارض...... آگے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آرہی ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا ألبس القميص المكفف بالحرير** - کہ میں ریشم کے حاشیے والی قمیص نہیں پہنتا اور یہاں حاشیہ والا جبہ آپ نے پہنا ہے تو بظاہر دونوں باتیں ایک دوسرے کے معارض ہیں۔

حل تعارض......

(۱)..........اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث سند کے اعتبار سے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی حدیث کے ہم پلہ نہیں ہے (اس کے برابر نہیں ہے) اس لئے اس کے معاملے میں اس کو ترجیح ہوگی۔

(۲)..........اور بعض نے کہا کہ نفی قمیص کی ہے اور حاشیے والے جبے کے پہننے کا ثبوت ہے اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۳)..........اور یہ بھی تطبیق ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرمارہے ہیں کہ میں نہیں پہنتا تو اس سے مراد یہ ہے کہ میرا عام معمول اور عادت نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت عمدہ اور اعلیٰ لباس نہیں پہنا۔

یہ جبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آگیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لے لیا۔

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو میراث نہیں چلتی تو آپ کا جبہ حضرت عائشہ نے کیسے لے لیا؟ اس میں دو احتمال ہیں:

ایک یہ کہ جبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے ہوں لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ملکیت ہو مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہبہ کر دیا ہو یا یہ کہ خریدا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے مال سے ہو اور اپنے مال سے خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہننے کے لئے دے دیا ہو لیکن تملیک نہ کی ہو۔ اب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ملکیت ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے انتقال کے بعد ان کی بہن اسماء بنت ابی بکرؓ نے حضرت عائشہؓ کے باقی ورثاء کی اجازت سے لے لیا ہو گا اس لئے کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نہ چلنے کے منافی یہ بات تب ہو جب کہ حضرت عائشہؓ نے بطور ملکیت کے لیا ہو ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو یہ ملکیت تو سب کی ہے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ سب کے لئے صدقہ ہوتا ہے۔ ”ماترکناہ فھو

صدقة'' تو سارے مسلمانوں کا حق ہے اگرچہ حق سب مسلمانوں کا ہے لیکن انتظامی طور پر کسی کی تحویل اور قبضے میں رہے گا اور وہ کسی کا بھی وہ سکتا ہے۔ تو حضرت عائشہؓ نے اپنے پاس رکھا اس لئے نہیں کہ یہ میرا ہو گیا بلکہ ہے تو سب مسلمانوں کا لیکن اس کی محافظ اور منتظم میں ہوں یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی بیمار ہوتا تو اس کو دے دیا جاتا تھا اور حضرت عائشہؓ کے انتقال کے بعد اس کی متولیہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بن گئیں، تو یہ کہنا بطور ملکیت کے نہیں بلکہ بطور انتظام اور تولیت کے تھا۔ یہ جبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو پہنا کرتے تھے لیکن حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ ہم پہننے کی بجائے اور کام کے لئے استعمال کیا کرتے تھے وہ یہ کہ ہم اس کو رکھ چھوڑتے تھے اور کوئی بیمار ہوتا تھا تو اس کو دھو کر پانی دے دیتے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پورا جبہ دھوتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک کنارہ پانی کے اندر گیلا کر دیتے ہوں اس پانی کو مریض استعمال کرتا تھا جس سے وہ شفایاب ہو جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے مقبولین کے ساتھ تعلق رکھنے والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنا:-

اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کے مقبولین کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزوں میں برکت ہوتی ہے اور یہ برکت حاصل کرنا جائز ہے اور اس میں شرک کے منافی کوئی بات نہیں ہے یہ تبرک بے شمار احادیث سے ثابت ہے ایک تو یہی حدیث ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقعے پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال مبارک خود حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیئے کہ لوگوں میں تقسیم کردو۔

اسی طریقے سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث آگے کتاب اللباس ہی میں آرہی ہے کہ ان کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو ایک گھنٹی کی شکل میں ڈبیہ کے اندر بند کیا ہوا تھا اور مصرف یہ تھا کہ جب کوئی بیمار ہوتا تو وہ پانی لے کر ان کے پاس جاتا تو یہ ان بالوں کو پانی کے اندر ڈبو دیتی اور اس سے مریض شفایاب ہو جاتا تھا۔ اسی طریقے سے حضرت کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ترمذی شریف میں آتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ایک چھوٹا مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منہ لگا کر پانی پیا تو انہوں نے مشکیزے کے اس حصے کو جہاں آپ کے لب مبارک لگے تھے وہاں سے برکت کے لئے کاٹ کر رکھ لیا۔

بخاری میں ایک حدیث آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کہیں سے ایک کپڑاملا وہ بڑی چادر تھی جس کی آپ کو ضرورت بھی تھی اور آپ کو پسند بھی تھا بڑا اچھا کپڑا تھا آپ اس کو اوڑھ کر باہر تشریف لائے تو ایک

شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ یہ مجھے دے دیجئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں تجھے دے دوں گا چنانچہ جب مجلس برخاست ہوئی تو آپ گھر تشریف لے گئے اور پرانا لباس پہن کر یہ اتار کر اس شخص کو دے دیا، باقی صحابہؓ نے اسے ملامت کی کہ بندۂ خدا یہ آپ ﷺ کو پسند بھی تھا اور آپ کو اس کی ضرورت بھی تھی اور تم نے مانگ کر اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے پہننے کے لئے تھوڑا مانگا ہے بلکہ اس لئے مانگا ہے کہ یہ میرا کفن بنے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس نبی کریم ﷺ کا ایک بال تھا، حضرت انس نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے انتقال کے بعد یہ بال میری زبان کے نیچے رکھ کر مجھے دفن کیا جائے۔

اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کے لئے ایک حمرہ چادر لائی گئی اور شاید کچھ دیر وہ چادر آپ پر رکھی بھی گئی لیکن آپ کو اس میں کفن نہیں دیا گیا بلکہ آپ کو سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا، یہ چادر محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سنبھال کر رکھ لی۔ غالباً محمد بن ابی بکرؓ ہیں یا اسی خاندان کے کوئی اور شخص ہیں کہ یہ میرا کفن بنے گا۔ البتہ بعد میں یہ کہا کہ مجھے اس میں کفن نہ دیا جائے اس لئے کہ جس کپڑے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کفن نہیں دیا گیا تو مجھے اس میں دینا مناسب نہیں ہے، لیکن بہر حال ایک دفعہ اس کو سنبھال کر رکھا اس وجہ سے کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تلبس اور تعلق تھا۔

صلح حدیبیہ کے بارے میں روایات کے اندر آتا ہے کہ بعض مشرکین جب حالات کا جائزہ لینے کے لئے آئے انہوں نے واپس جا کر جو رپورٹ دی اس میں یہ بات بھی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تو ان کے ایسے جاں نثار ہیں کہ وہ تھوکتے ہیں تو وہ تھوک کو زمین پر نہیں گرنے دیتے۔ آگے مشکوٰۃ میں حدیث آرہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ وضو فرما رہے تھے تو صحابہ پانی زمین پر نہیں گرنے دے رہے تھے بلکہ اس کو اپنے جسم پر مل رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو انہوں نے کہا کہ اللہ اور رسول کی محبت کی وجہ سے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم واقعتاً اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتے ہو تو جب بات کرو تو سچی کیا کرو، جب وعدہ کرو تو اسے پورا کیا کرو اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو۔ یہ بات تو آپ نے فرمائی لیکن جو وضوء کے پانی کو اپنے جسم پر لگا رہے تھے اس سے منع نہیں فرمایا۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ اس طرح کی احادیث بے شمار ملتی ہیں جن سے اس طرح کے تبرکات کا جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ بات میں شاید پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تبرک کا جواز ثابت ہو رہا ہے اسی طرح دوسرے صالحین سے بھی جواز تبرک ثابت ہو رہا ہے اس لئے کہ علت میں فی الجملہ اشتراک ہے وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق والی چیز بابرکت ہو گئی اس لئے کہ

آپ مقبول عند اللہ ہیں تو دوسرے صالحین بھی فی الجملہ مقبول عند اللہ ہیں اگرچہ قبولیت کے درجے میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ زمین و آسمان سے پتہ نہیں کتنا گنا زیادہ فرق ہو گا۔ لیکن بہر حال فی الجملہ قبولیت ضرور ہے اور یہ فرق بھی ہے کہ وہاں مقبول عند اللہ ہونا یقینی ہے یہاں یقینی نہیں ہے اس لئے وہاں برکت یقینی ہے اور یہاں برکت کا ظن غالب ہو گا لیکن علت بہر حال فی الجملہ پائی گئی ہے اس لئے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کا جواز ثابت ہوتا ہے اسی طرح دوسرے صالحین کے تبرکات کا بھی جواز ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیر نبی سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو برکت والا سمجھنا اور بطور تبرک کے استعمال کرنا درست نہیں ہے لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ذریعہ شرک بن سکتا ہے لیکن شرک یا ذرائع شرک میں نبی اور غیر نبی کا فرق نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو نہیں کہ غیر نبی کو تو خدا کے مقام پر نہیں پہنچایا جا سکتا لیکن نبی کو پہنچایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے یہ بات نہیں ہے شرک کے معاملے میں نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ جتنا مقبول عند اللہ ہو گا اور جس کی عقیدت زیادہ ہو گی اتنا ہی اس میں ذریعہ شرک ہونے کا امکان زیادہ ہو گا۔ تو جب اس میں تبرک جائز ہے تو دوسروں میں بطریق اولیٰ جائز ہو گا

تبرکات میں افراط اور تفریط:-

اب تک یہ عرض کیا کہ تبرک کا ثبوت ہے، بے ثبوت چیز نہیں ہے البتہ یہ بات بھی ہے کہ اس میں غلطی سے افراط و تفریط ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ تبرکات کا ویسے ہی انکار کر دیتے ہیں یہ بھی ٹھیک نہیں ہے اور بعض لوگ سب کچھ سمجھتے ہی تبرکات کو ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے نہ عقائد کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی اعمال و اخلاق کی اصلاح کی تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے اصل چیز اعمال اور اخلاق کی اصلاح ہے اور خاص طور پر عقائد کی اصلاح ہے اس کے ساتھ ساتھ اگر برکت بھی مل جائے تو اچھی بات ہے لیکن سب سے اہم چیز عقائد و اعمال اخلاق ہیں ان کی قربانی نہیں دی جا سکتی۔ یہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی کہ آپ کے وضو کے پانی کو اپنے جسم پر لگا رہے ہیں تو آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ تبرک کی اصل ہے لیکن ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرما دیا کہ اپنے اعمال اور اخلاق بھی ٹھیک کرو کہ میرے ساتھ محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ صرف میرے ساتھ نسبت رکھنے والی چیزوں کو چوم چاٹ لو بلکہ میرے ساتھ محبت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ جو کام میں نے کئے ہیں وہ کرو، بات کرو تو سچی کرو اور وعدہ کرو تو پورا کرو اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

اس لئے کہ اس چیز میں برکت اس لئے آئی کہ اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی وجہ سے یہ چیز متبرک ہو گئی حالانکہ وہ بے جان ہے۔ تو اگر کوئی اشرف المخلوقات کا فرد اپنی نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قائم کرلے گا تو کیا وہ بابرکت نہیں ہو جائے گا، وہ بطریق اولیٰ بابرکت ہو جائے گا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت اس طرح حاصل ہو گی کہ آپ کے طریقے پر چلا جائے اس لئے تبرکات کی بالکل نفی کرنا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے اور سب کچھ انہیں کو سمجھنا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا رئیس المنافقین کے کفن کے لئے قمیص دینا:۔

یہ سبق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے ملتا ہے کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کا جب انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کفن کے لئے اپنی قمیص مبارک دی اور اس کے منہ میں اپنا لعاب بھی ڈالا۔

اب یہاں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اصل میں عبداللہ بن ابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس کو ایک دفعہ قمیص پہنائی تھی تو آپ نہیں چاہتے تھے کہ ایک منافق کا احسان ہمارے سر رہے اس کا بدلہ چکانے کے لئے آپ نے کفن کے لئے اس کو قمیص دے دی قمیص دینے کی یہ وجہ ہے۔

بعض علماء نے لعاب مبارک ڈالنے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں درحقیقت یہی سبق سکھانا مقصود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص برکت کا باعث ہے اور آپ کے جسم پر لگا ہوا کپڑا کفن کے لئے باقاعدہ بعض صحابہؓ نے لیا ہے۔ لیکن یہ تب ہے جب کہ ایمان موجود ہو اگر ایمان موجود نہیں تو دنیا کا بڑے سے بڑا تبرک مل جائے (آپ کے لعاب دھن سے بڑا تبرک کیا ہوگا) تو وہ تبرک کسی کام کا نہیں ہے، تبرک فائدہ تو پہنچاتے ہیں لیکن شرط کے ساتھ غیر مشروط طور پر یہ مفید نہیں ہیں۔

(۱۹)----- وعن أنس، قال: رخَّصَ رسول الله صلى الله عليه وسلم للزُبَير وعبد الرحمٰن بن عوف في لبس الحرير لحكة بهما ۔ (متفق عليه) وفي رواية لمسلم قال: إنَّما شكوا القمل، فرَخَّص لهما في قُمُص الحرير ۔

ترجمہ …… حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ریشم پہننے کی اجازت دی ایک خارش کی وجہ

سے جو ان کے جسم پر تھی اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ان دونوں حضرات نے جوؤں کی شکایت کی تو آنحضرت ﷺ نے انہیں ریشم کی قمیص پہننے کی اجازت دی۔

(۲۰)-----وعن عبد الله بن عمرو بن العاص، قال: رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم عليَّ ثوبَين مُعَصفَرين فقال: إنَّ هذه من ثيابِ الكفارِ، فلا تَلبَسهما۔

وفي رواية: قلتُ: أغسِلهُما؟ قال: بل احرِقهما۔ (رواه مسلم)

وسنذكر حديث عائشة: خرج النبي صلى الله عليه وسلم ذاتَ غداة في باب مناقب أهل بيت النبي صلى الله عليه وسلم۔

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ پر عصفر میں رنگے ہوئے دو کپڑے دیکھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کافروں کے کپڑوں میں سے ہیں لہٰذا تم انہیں نہ پہنو اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ میں ان دونوں کو دھو ڈالوں (تاکہ رنگ اتر جائے) تو آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ انہیں جلا دو۔

معصفر کا معنی:-

معصفر کا معنی عصفر میں رنگا ہوا کپڑا، یہ عصفر ایک خاص قسم کی بوٹی ہوتی تھی جسے کسم بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اس کے بیج قرطم کہلاتے تھے شاید یہ آپ نے کئی جگہ شعروں میں پڑھا ہو اور اس بوٹی سے کپڑے رنگے جاتے تھے اور پیلا رنگ کپڑوں کو چڑھتا تھا جس بوٹی میں کپڑا رنگا جائے اس کو عصفر کہتے ہیں۔

معصفر کا حکم:-

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں معصفر پہننے سے منع فرمایا ہے۔

عورتوں کے لئے معصفر کا حکم...... فقہاء کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ عورتوں کے لئے جائز ہے۔

مردوں کے لئے معصفر کا حکم...... مردوں کے لئے معصفر کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

حضرات شافعیہ و مالکیہ کا مذہب...... امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ وغیرہ کے نزدیک مردوں کے لئے بھی جائز ہے صرف کراہت تنزیہی ہے اور امام مالکؒ کی ایک روایت کے مطابق یہ کراہت تنزیہی بھی محافل وغیرہ میں ہے یعنی آدمی گھر سے باہر پہن کر آئے اگر گھر کے اندر عصفر میں رنگا ہوا کپڑا

پہن لے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔

حضرات حنفیہ کا مذہب...... حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مردوں کے لئے اس کی کراہت تحریمی ہے لہٰذا مرد کے لئے عصفر میں رنگا ہوا کپڑا پہننا مکروہ تحریمی ہے۔

حضرات حنفیہ کی دلیل...... حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ متعدد حدیثوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی فرمائی ہے اور نہی کا اصل متقضاء کراہت تحریمیہ ہے۔

البتہ احسن الفتاویٰ میں نظر سے گزرا ہے کہ یہ کراہت تحریمیہ اس وقت ہے جب کہ خاص عصفر کی بوٹی سے کپڑے کو رنگا جائے اگر کسی اور چیز سے کپڑے کو رنگا جائے لیکن وہ رنگ معصفر جیسا ہو جائے تو اس میں مرد کے لئے کوئی کراہت نہیں ہے۔[1]

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر معصفر کپڑے دیکھے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کافروں جیسا لباس ہے ایسا لباس نہ پہنا کرو تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں انہیں دھو ڈالوں، دھونے سے ایک تو بوٹی کی خاص مہک ختم ہو جائے گی ہو سکتا ہے کہ کراہت اس مہک کی وجہ سے ہو اس لئے دھونے سے وہ کراہت ختم ہو جائے اور دوسرا یہ کہ دھونے سے اس زمانے کے رنگ عموماً اتر جاتے تھے یا ماند پڑ جاتے تھے، دھو ڈالوں گا تو اس طرح رنگ باقی نہیں رہے گا تو کیا میں انہیں دھو ڈالوں تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ انہیں جلادو۔

اب جلانے کا مطلب کیا ہے؟

ایک مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہو سچ مچ جلانا مقصود ہو باقی رہا یہ اشکال کہ یہ تو اضاعت مال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضاعت نہیں ہے اضاعت تب ہوتی ہے جب کہ کسی چیز کو جلایا جائے اور اس میں کوئی فائدہ نہ ہو، اگر کسی چیز کو جلانے ہی میں فائدہ ہو تو وہ اضاعت نہیں ہے جیسے ایندھن کو لکڑیوں کو جلایا جاتا ہے لیکن اسے اضاعت مال قرار نہیں دیتے اور یہاں فائدہ تغلیظ تھا اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی تربیت و تادیب مقصود تھی ادب سکھانا مقصود تھا کہ اچھے طریقے سے یہ بات ذہن میں بیٹھ جائے۔ ایک دفعہ سزا ہو گی تو دوبارہ اس طرح کی حرکت نہیں کریں گے اور اس طرح کی تادیب چلا کرتی تھی مثلاً ایک دفعہ ایک عورت ایک اونٹنی پر سوار تھی اس نے اپنی اونٹنی کو ملعونہ کہہ دیا، لعنت کر دی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اونٹنی سے اتارو پیدل چلے، یہ بھی بظاہر ایک قسم کی ناشکری اور اضاعت مال ہے کہ سواری موجود ہے پھر بھی آدمی پیدل چل رہا ہے لیکن یہاں اشکال اس لئے نہیں کہ یہاں اس کی تربیت مقصود تھی،

---

(۱) احسن الفتاویٰ کتاب الحظر والاباحہ ج ۸ / ص ۶۲

تادیب مقصود تھی۔ یہاں پر بھی چونکہ جلانے کا حکم تادیب کے لئے ہے اس لئے اس میں اضاعت مال نہیں ہے لیکن یہ ساری تقریر اس وقت ہوگی جب کہ جلانے کے حکم کو اپنے ظاہر پر رکھیں ظاہر پر رکھنے میں یہاں ایک اشکال اور ہے اور وہ قوی اشکال ہے۔

وہ یہ ہے کہ اگلی فصل میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ ہی کی ایک حدیث آرہی ہے، یہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اسی طریقے کا کپڑا پہن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گیا تو میں نے محسوس کیا کہ آپ کو یہ اچھا نہیں لگا تو میں گھر واپس آیا تو وہاں آکر میں نے اسے جلادیا اور ایک روایت میں ہے کہ جب گھر میں آیا تو وہاں ایک تنور جل رہا تھا تو میں نے ان کپڑوں کو تنور میں پھینک دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے اپنے اس کپڑے کا کیا کیا؟ تو میں نے کہا کہ میں نے تو اسے جلادیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ کپڑا جلانا نہیں تھا بلکہ اپنے گھر والوں کو پہنادیتے اس لئے کہ عورتوں کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جلانے کا امر اپنے ظاہر پر نہیں ہے، سچ مچ جلانے کا حکم دینا مقصود نہیں تھا اور یہاں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ واقعہ متعدد بار ہوا ہوگا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ ابن عمرو اس طرح کا کپڑا پہن گئے تو آپ نے جلانے کا حکم دیا اور سچ مچ جلادیا اور دوسری مرتبہ پھر اسی طرح کا واقعہ پیش آیا تو اس پر آپ نے فرمایا کہ جلانا نہیں تھا اس طریقے سے تعدد واقعہ پر محمول نہیں کرسکتے کیوں کہ تعدد واقعہ پر محمول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس لباس پر اظہار ناراضگی فرماچکے تھے پھر بھی دوسری مرتبہ انہوں نے پہنا اور پہن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گئے یہ بات انتہائی بعید ہے اس لئے دونوں حدیثوں کو الگ الگ واقعہ پر محمول نہیں کرسکتے۔ یہاں عبداللہ بن عمروؓ کے جلانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ جلانے کی ضرورت نہیں تھی یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اس کا ظاہری معنیٰ ہی سمجھا یا ادب کی وجہ سے جذبۂ تعمیل حکم کی بنا پر اس کے ظاہر پر عمل کرلیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود سچ مچ جلانا نہیں تھا لہٰذا یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے بلکہ جلانے کا اور معنیٰ ہے مثلاً بعض نے جلانے کا ایک معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جلدی سے اس کو اپنے سے الگ کرو مثلاً بیچ دو یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کو ہبہ کردو تاکہ تم سے الگ ہوجائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ میں دھوڈالوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھونے سے منع فرمایا تو دھونے سے منع کرنے کی وجہ بظاہر یہ ہوسکتی ہے کہ دھونے میں اضاعت ہے کیونکہ بہرحال محنت سے رنگا گیا ہے اور دھونے سے رنگ خراب ہوجاتا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ انہیں دھوکر ضائع کیوں کرنا ہے بلکہ اپنے سے الگ کردو تمہاری عورتوں میں سے کوئی پہن لے گی۔

----------الفصل الثانی----------

(۲۱)-----عن أم سلمة، قالت: كان أحب الثيابِ إلى رسول الله عليه وسلم القميص۔ (رواه الترمذی و أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کپڑوں میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند قمیص تھی۔

(۲۲)-----وعن أسماء بنت يزيد، قالت: كان كم قميص رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى الرُصغِ۔ (رواه الترمذی وقال: هذا حديث حسنٌ غريبٌ)

ترجمہ ...... حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کی آستین پہنچوں تک تھی۔

یہاں مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں ''إلی الرصغ'' لفظ ہے اور دوسری بہت ساری روایات میں (سین) کے ساتھ (رسغ) ہے اور زیادہ معروف سین ہی کے ساتھ ہے اس کا معنی کلائی ہے اور ہاتھ کے درمیان جوڑ جس کو گٹہ اور پہنچہ کہہ دیتے ہیں۔

حضور ﷺ کی قمیص کی آستین پہنچوں تک ہوتی تھی لیکن دوسری بعض روایات اس کے خلاف بھی ہیں مثلاً بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی آستین انگلیوں تک ہوتی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی آستین انگلیوں کے کناروں تک ہوتی تھی (إلی رؤس الأصابع) کے الفاظ آتے ہیں۔

تو یہ روایتیں بظاہر مختلف ہیں بعض نے یہ حل نکالا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں جب پہنتے ہوں گے اس وقت انگلیوں کے قریب ہوتی ہوں گی لیکن پہننے کے بعد جب آدمی بار بار وضو وغیرہ کرنے کے لئے اوپر چڑھاتا ہے یا بازو کو آگے پیچھے کرتا ہے تو اس سے بل پڑنے کی وجہ سے کپڑا سکڑ جاتا ہے، پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ تو ابتداء میں انگلیوں تک ہوتی ہوں گی لیکن بعد میں سکڑتے سکڑتے (رسغ) کے قریب تک پہنچ جاتی ہوں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی متعدد قمیص ہوں بعض یہاں تک ہوں اور بعض یہاں تک اس لئے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

آستین کہاں تک ہونی چاہئے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ آستین کہاں تک ہونی چاہئے تو بعض نے یہ کہا ہے کہ (رسغ) تک یعنی پہنچے تک

ہونی چاہئے اس سے آگے نہیں ہونی چاہئے اور بعض نے کہا نہیں۔ مستحب یہ ہے کہ ہاتھ بھی آستین کے اندر چھپا ہوا ہو البتہ اگر آستین اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو تو وہ اسبال کے اندر داخل ہے اور وہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آستین کم از کم اتنی ہونی چاہئے کہ اس میں کلائی چھپ جائے اور اس سے زائد عرف پر ہے کہ جس طرح کا عرف ہو اس کے مطابق پہن لی جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت کسی کا اہتمام نہیں کیا لیکن بہر حال اگر قمیص کلائی سے پیچھے ہو اور کلائی ننگی بھی ہو، بازو ننگا ہو بھی ہو تو یہ مرد کے لئے ناجائز اور حرام نہیں ہے۔

البتہ جب مجالس وغیرہ میں آئے جہاں بے تکلفی کی جگہ نہ ہو وہاں پر بہتر یہ ہے کہ کلائی بھی چھپی ہوئی ہو۔

(۲۳)-----وعن أبي هريرة، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا لبِسَ قميصاً بدأ بميامنه۔ (رواه الترمذي)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی قمیص پہنتے تو اس کی دائیں جانب سے ابتداء فرماتے یعنی پہلے دائیں طرف پہنتے پھر بائیں طرف پہنتے۔

نیز ہر اچھے کام میں حضور ﷺ کا یہی معمول تھا کہ آپ دائیں جانب سے ابتداء فرمایا کرتے تھے۔

(۲٤)----- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إزرَةُ المؤمن إلى أنصافِ ساقيه، لاُجناحَ عليه فيما بينه وبين الكعبين، ماأسفل من ذلك ففي النار قال ذلك ثلاث مرّات ولا ينظرُ اللهُ يوم القيامةِ إلى من جرَّ إزارَهُ بَطراً۔ (رواه أبو داؤد وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مؤمن کا لنگی باندھنا اس کی پنڈلی کے نصف تک ہونا چاہئے اور پنڈلی کے نصف سے لے کر گھٹنوں تک کے درمیان میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو اس سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمائی اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس آدمی کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے جو لنگی میں سے کسی چیز کو تکبر کی وجہ سے لمبا کرے۔

یہاں إزرة المؤمن لفظ ہے إزرَة فعلة کے وزن پر مصدر ہے فِعلة کے وزن پر مصدر بیان ہیئت کے لئے ہوتا ہے تو معنی ہوا لنگی باندھنے کا طریقہ، وہ طریقہ یہ ہے کہ پنڈلیوں کے نصف تک ہو۔

فرمایا: إلى أنصاف ساقيه، ساقین یہ تو تثنیہ ہے اور انصاف یہ نصف کی جمع ہے۔

آدمی کی دو پنڈلیاں ہوتی ہیں جب پنڈلیاں دو ہیں تو ان کے نصف بھی دو ہی ہوں گے تو جمع کیسے آگیا اصل بات یہ ہے کہ جب تثنیہ کی تثنیہ کی طرف اضافت ہو رہی ہو تو اس کو کلام عرب میں ثقیل سمجھا جاتا ہے اس لئے پہلے تثنیہ کو یا تو مفرد لے آتے ہیں یا جمع لے آتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں آتا ہے: إِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۔اصل میں قلبا کما ہونا چاہئے تھا قلب بھی تثنیہ ہوتا اور کما ضمیر بھی تثنیہ لیکن اس کو اہل عرب بعض اوقات ثقیل سمجھتے ہیں اس لئے قلب کو تثنیہ کے بجائے جمع لائے (قلوبکما) کہہ دیا اسی طرح (إلی نصفی ساقیہ) کہنے کے بجائے (إلی نصاف ساقیہ) کہہ دیا۔

مطلب حدیث کا یہ ہے کہ لنگی باندھنے میں مؤمن کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ پنڈلی کے نصف تک ہو اولیٰ اور افضل یہ ہے لیکن اگر پنڈلی کے نصف تک نہیں بلکہ اس سے نیچے ہے لیکن ٹخنوں سے اوپر ہے تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں یہ بھی جائز ہے البتہ اگر لنگی ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تو یہ اسبال میں داخل ہے اور یہ ناجائز ہے۔

لنگی کا نصف ساق تک ہونا مستحب ہے:۔

اس حدیث سے سمجھ میں آیا کہ نصف ساق تک ہونا یعنی آدھی پنڈلی تک ہونا مستحب ہے۔

یہ استحباب صرف لنگی کے ساتھ خاص ہے کہ لنگی باندھنی ہو وہ تو یہاں تک باندھی جائے اور اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو تو اس میں آدھی پنڈلی تک ہونا مستحب نہیں ہے یا یہ کہ شلوار وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔یہ بات صراحتاً کہیں نظر سے نہیں گزری البتہ آدھی پنڈلی تک کے بارے میں ساری کی ساری احادیث لنگی کے بارے میں ہے۔اگرچہ اس زمانے میں شلوار پہنی جاتی تھی لیکن کم پہنی جاتی تھی جبہ یا قمیص کا پہننا نسبتاً عام تھا اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نصف ساق تک مستحب ہونا لنگی کے ساتھ خاص ہے یا ہر لباس میں ہے؟اس سلسلے میں کوئی صریح بات نظر سے نہیں گزری البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کے بارے میں بکثرت روایات میں آتا ہے کہ وہ کعبین تک تھی یعنی ٹخنوں تک تھی۔ ٹخنوں تک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں ٹخنے چھپتے نہیں تھے بلکہ ٹخنوں سے اوپر تھی اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لئے ایسا کیا ہو کیوں کہ ٹخنوں تک اجازت ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہی اس طرح ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نصف ساق تک استحباب لنگی کے ساتھ خاص ہو اور باقی لباسوں کے اندر یہ استحباب نہ ہو۔ بہر حال سارے ہی احتمال ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ لنگی کے بارے

میں تو تصریح ہے کہ نصف ساق تک مستحب ہے اور باقی لباسوں کے بارے میں اس طرح کی تصریح نہیں ہے لیکن ٹخنوں سے اوپر ہونا پھر بھی ضروری ہے۔

(۲۵) ----- وعن سالم، عن أبيه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الإسبال في الإزار والقميص والعِمامةِ، من جرَّ منها شيئاً خُيَلاءَ لم ينظر الله إليه يوم القيامة۔ (رواه أبو داؤد والنسائي وابن ماجه)

ترجمہ...... حضرت سالم اپنے والد یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسبال لنگی میں بھی ہوتا ہے اور قمیص اور عمامے میں بھی جو آدمی ان میں سے کسی چیز کو تکبر کی وجہ سے لمبا کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے۔

یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ اسبال صرف لنگی میں نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک میں ہوتا ہے، لنگی وغیرہ میں اسبال یہ ہے کہ وہ ٹخنوں سے نیچے ہو اور باقی لباسوں مثلاً عمامہ وغیر میں اسبال یہ ہے کہ وہ معتاد سے زیادہ ہو عرف میں جتنا ہوتا ہے اس سے زائد ہو۔

(۲۶) ----- وعن أبي كبشةَ، قال: كان كِمامُ أصحابُ رسول الله صلى الله عليه وسلم بُطحاً۔ (رواه الترمذي وقال: هذا حديثٌ منكر)

ترجمہ...... حضرت ابو کبشہؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی ٹوپیاں نیچی ہوتی تھیں۔

ٹوپی پہننا:۔

کمام میں دو احتمال ہیں ایک احتمال اور اسی کو اکثر شارحین نے اختیار کیا ہے کہ یہ کُمَّۃٌ کی جمع ہے اس کا معنی ٹوپی ہے اس صورت میں بُطحاً بَطحاءٌ کی جمع ہو گی اس کا معنی سر کے ساتھ چپٹی ہوئی، سر پر پھیلی ہوئی یعنی اوپر اٹھی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ صحابہ کرامؓ کی ٹوپیاں عموماً زیادہ اونچی نہیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ عمومی بات کر رہے ہیں اکا دکا اس کے خلاف روایت مل سکتی ہے کہ کسی صحابی کی ٹوپی اونچی بھی ہو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ زیادہ اونچی ٹوپی پہننا فساق کا شعار ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات نقل کر کے فرمایا کہ ہمارے زمانے میں یہ مشائخ کی عادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تشبہ کا معاملہ عرف اور حالات کے بدلنے سے مختلف ہو سکتا ہے ایک زمانے میں ایک لباس برے لوگوں کا شعار ہو اور دوسرے زمانے میں وہی لباس نیک لوگوں کا شعار ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں کسی کا

بھی شعار نہ ہو ہر طرح کے لوگ اس کو پہنتے ہوں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ کِمام کُمّ کی جمع ہے اگرچہ کُم کی جمع عموماً اکمام آتی ہے لیکن کِمام بھی اس کی جمع ہو سکتی ہے اس کا معنی آستین ہو گا اس صورت میں بطحا کا معنی کشادہ ہو گا کہ صحابہ کی آستین عموماً کشادہ ہوتی تھیں، بالکل تنگ اور جسم کے ساتھ چپکی ہوئی نہیں ہوتی تھی کشادہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اعتدال کے ساتھ کشادہ ہوتی تھیں کیونکہ بہت زیادہ کھلی آستین بھی اس زمانے میں اسبال کے اندر داخل تھی۔

(۲۷)-----وعن أم سلمةَ، قالت لرسول الله صلى الله عليه وسلم حينَ ذكرَ الإزارَ: فالمرأةُ يا رسولَ الله؟ قال: تُرخي شبراً فقالت: إذاً تنكشِفُ عنها قال: فذراعاً لا تزيدُ عليهِ۔ (رواه مالك وأبو داؤد والنسائي وابن ماجه)

وفي رواية الترمذي والنسائي، عن ابنِ عمَرَ فقالت: إذاً تنكشف أقدامُهنَّ قال: فيُرخين ذراعاً لا يزدنَ عليه۔

ترجمہ...... جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لنگی کا ذکر فرمایا کہ یہ نیچے نہیں ہونی چاہئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ عورت۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورت ایک بالشت نیچے کر سکتی ہے یعنی آدھی پنڈلی سے ایک بالشت نیچے کر سکتی ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ پھر اس کا جسم ظاہر ہو گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ایک ذراع وہ نیچے کر سکتی ہے لیکن ایک ذراع سے زیادہ نہ کرے۔

اس لئے کہ عورت کو ضرورت ہے کہ ٹخنوں تک اس کا جسم چھپا ہوا ہو، عام طور پر لنگی وغیرہ اگر ایک بالشت تک پنڈلی سے بڑھی ہوئی ہو اس سے اس کے ٹخنے وغیرہ چھپ جائیں گے اور ٹانگ کا کوئی حصہ نظر نہیں آئے گا اس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی ہاں البتہ اگر کوئی عورت زیادہ لمبی تڑنگی ہو تو ایک ذراع سے زیادہ نیچے کرنے کی اسے ضرورت نہیں ہو گی۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس کی ٹانگ کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو جتنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ ٹھیک ہے اور مقصد سے زائد محض تکبر کی وجہ سے فخریہ طور پر زمین پر گھسیٹنا ٹھیک نہیں ہے۔

(۲۸)---- وعن معاويةَ بن قرَّةَ، عن أبيه، أتيتُ النبي صلى الله عليه وسلم في رَهطٍ من مزَينةَ فبايَعوهُ وإنَّه لمطلَقُ الازرارِ، فأدخلتُ يَدي في جَيبِ قميصِه، فمسِستُ الخاتمَ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... معاویۃ بن قرۃ رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے والد حضرت قرۃ بن ایاس رضی اللہ عنہ

سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوا تو انہوں نے حضور اقدس ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بٹن کھلے ہوئے تھے تو میں نے اپنے ہاتھ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کے گریبان میں داخل کیا اور مہر نبوت کو چھوا۔

حضرت قرۃ بن ایاس رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ میں مزینہ کے ایک وفد میں شامل ہو کر حضور اقدس ﷺ کے پاس گیا لیکن یہ نہیں کہہ رہے کہ میں نے آپ سے بیعت کی بلکہ یہ کہہ رہے ہیں "فبایعوا" انہوں نے یعنی مزینہ کے لوگوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ حضرت قرۃ بن ایاس اس وقت چھوٹے ہوں، بچے ہوں گے اور بچے کو عموماً بیعت نہیں کیا کرتے اس لئے انہوں نے بیعت نہیں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیعت کی بجائے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتے تھے۔

قمیص کو بٹن لگانا:۔

یہ فرمایا کہ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بٹن کھلے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی قمیص کے بٹن تھے لہٰذا بٹن لگانا بھی درست ہے۔

بٹن کھلے رکھنا:۔

بٹن اس وقت کھلے ہوئے تھے اس سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ قمیص وغیرہ کے بٹن کھلے ہوئے ہونا مستحب ہے لیکن یہ بات اس سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ آپ ﷺ سے اس کا اہتمام یا التزام ثابت ہی نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اتفاقاً آپ ﷺ کے بٹن کھلے ہوئے ہوں، گرمی کی وجہ سے آپ ﷺ نے گریبان کے بٹن کھولے ہوئے ہوں یا کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس وغیرہ کے بارے میں محض اتفاقاً کوئی کام کرنا اس کا مستحب ہونا ضروری نہیں ہے۔

گریبان کس طرف ہونا چاہئے؟

اس میں یہ آیا کہ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بٹن کھلے ہوئے تھے اس لئے میں نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت کو چھوا اور آپ کی مہر نبوت کمر پر تھی اس سے بعض حضرات نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان پیچھے کی جانب تھا

اور بٹن بھی پیچھے کی جانب تھے، اس سے بعض نے یہ بات ثابت کیا ہے کہ پیچھے کی طرف ہونا بہتر ہے لیکن یہ بات نہیں ہے اس لئے کہ اول تو یہی ضروری نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان پیچھے کی جانب ہو بلکہ اگر گریبان آگے کی جانب بھی ہو لیکن بٹن کھلے ہوئے ہوں تو کمر کی جانب بھی آسانی سے ہاتھ داخل کیا جا سکتا ہے اور اگر بٹن بند ہوں تو پھر ہاتھ کمر کی جانب سے بھی داخل نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس قمیص کا گریبان یا بٹن پیچھے تھے بلکہ آگے بھی ہو سکتے ہیں اور اگر بالفرض پیچھے بھی ہوں تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گریبان کا پیچھے ہونا یا بٹنوں کا پیچھے ہونا بہتر ہے۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص جبے یا لباس وغیرہ میں کسی خاص ہیئت کا اہتمام نہیں فرمایا یہ کہنا کہ آپ کی قمیص ایسی ہوتی تھی لہٰذا یہ مستحب ہے۔ یہ درست نہیں ہے بلکہ آپ کو (کیف ما اتفق) جیسی چیز ملی ویسی آپ نے پہن لی کسی خاص ہیئت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد نہیں فرمایا لہٰذا کسی بھی ہیئت کو مسنون قرار دینا درست نہیں ہے لہٰذا اگر بٹن پیچھے بھی ہوں تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مسنون لباس ہے ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی قمیص ایسی ہو جس میں پیچھے ہوں، کوئی قمیص ایسی ہو جس میں آگے ہوں البتہ فی نفسہ دونوں طرح جائز ہے کہ بٹن آگے ہو سکتے ہیں اور پیچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

(۲۹) ----- وعن سمرةَ، انَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم، قال: البَسوا الثِیَابَ البیضَ، فِاِنَّها أطهرُ وأطیبُ وكفنوا فیها موتا كم۔ (رواه أحمد والترمذی والنسائی وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سفید کپڑے پہنا کرو اس لئے کہ یہ زیادہ پاکیزہ اور زیادہ اچھے ہوتے ہیں اور انہیں کے اندر اپنے مردوں کو کفن دیا کرو۔

سفید لباس:-

سفید لباس کے بارے میں دو باتیں بیان فرمائی:

ایک یہ کہ اطہر ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اطیب ہوتے ہیں۔

سفید لباس کا اطہر ہونا ...... اطہر ہونے کا معنی یہ ہے کہ زیادہ صاف ستھرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رنگ دار کپڑا ہو اور جتنا رنگ گہرا ہو اتنا ہی اس پر میل کچیل کا پتہ نہیں چلتا اور اس کی وجہ سے جلدی دھونے کی ضرورت بھی محسوس نہیں جاتی دیر سے دھویا جاتا ہے۔ جب کہ سفید کپڑے پہ

معمولی سی میل لگ جائے، معمولی سا دھبہ لگ جائے تو وہ بہت نمایاں ہوتا ہے اس لئے اس کو جلدی دھونے کا اہتمام کیا جاتا ہے، تو سفید کپڑا بکثرت دھلتا ہے اس لئے یہ عموماً زیادہ صاف ہوتا ہے جب کہ رنگ دار کپڑا خاص طور پر گہرے رنگ کا کپڑا دیر سے دھلتا ہے اس لئے وہ دیکھنے میں اگرچہ میلا نظر نہ آئے لیکن حقیقت میں اس میں میل کچیل زیادہ ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے یہ وجہ بیان کی ہے (اس زمانے میں شاید اتنی زیادہ نہ ہو کیونکہ آج کل رنگ پکے ہوتے ہیں) کہ سفید کپڑا زیادہ زور کے ساتھ دھویا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ رنگ اتر جائے گا، صابن یا سرف یا کوئی بھی اور چیز لگانی ہو وہ بھی خوب لگائی جاتی ہے اور تیز لگائی جاتی ہے جب کہ رنگ دار کپڑے میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اس کا رنگ نہ اتر جائے اس لئے بعض اوقات دھونے میں زیادہ زور نہیں لگایا جاتا یا میل اتارنے کے لئے تیز قسم کا مواد استعمال نہیں کیا جاتا کہ کہیں میل کے ساتھ ساتھ رنگ بھی نہ اتر جائے اور سفید کپڑے میں اس طرح کا کوئی ڈر نہیں ہوتا وہ بے دھڑک ہو کر دھویا جاتا ہے اس لئے زیادہ صاف ہوتا ہے۔

سفید کپڑے کا اطیب ہونا...... سفید کپڑے کا دوسرا وصف اطیب ہونا ہے، اطیب کا معنی یہ ہے کہ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے، نظروں کو بھلا لگتا ہے اس لئے کہ سفید رنگ اجلا اجلا محسوس ہوتا ہے۔

سفید لباس اور حبرہ...... حضور اقدس ﷺ کو سفید کپڑا پسند تھا لیکن یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو حبرہ پسند تھا اس لئے کہ سفید کی پسندیدگی اپنی جگہ اور رنگ دار کپڑوں میں سے آپ ﷺ کو حبرہ پسند تھا اس کی پسندیدگی اپنی جگہ بیک وقت کئی قسم کے لباس بھی آدمی کو پسند ہو سکتے ہیں۔

(۳۰)---- وعن ابنِ عمَرَ، قال: كانَ رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اعتم سدَلَ عمامته بين كتفيه۔ (رواه الترمذي: هذا حديث حسنٌ غريبٌ)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب عمامہ باندھتے تو عمامہ کے کنارے کو اپنے دو کندھوں کے درمیان چھوڑتے۔

عمامے کے بارے میں بحث آگے الفصل الثالث میں انشاء اللہ جا کر کریں گے۔

(۳۱)----وعن عبد الرحمٰن بن عوف، قال: عممني رسول الله صلى الله عليه وسلم فسدَلها بين يديَّ ومِن خلفي۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ پر عمامہ باندھا اور اس کا کنارہ میرے آگے بھی چھوڑا اور میرے پیچھے بھی۔

دستار بندی:-

یعنی ایک کناری آگے کی طرف چھوڑی اور ایک پیچھے کی طرف چھوڑی، اس حدیث سے دستار بندی کی بھی اصل نکلتی ہے اس لئے کہ عمامہ تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے پہلے سے باندھا تھا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے دوبارہ باندھا، اس کا مقصد بظاہر برکت ہوگا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر روانہ کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسی کو کسی مہم پر روانہ کیا جائے یا کسی پر کسی معاملے میں اظہار اعتماد کرنا ہو تو اس موقعے پر اس کے سر پر عمامہ رمزی طور پر باندھ دیا جائے یہ بھی درست ہے۔

(۳۲)----- وعن رُكانةَ، عن النبی صلی الله علیه وسلم، قال: فَرقُ مابیننا وبین المشركینَ العمائمُ علی القلانِس۔ (رواه الترمذی وقال: هذا حدیث حسن غریب، وإسنادُه لیسَ بالقائم)

ترجمہ...... حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ایسے عمامے ہیں جو ٹوپیوں پر ہوتے ہیں۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے اتنی صحیح نہیں ہے جیسا کہ خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ **واسنادهٔ لیس بالقائم** لیکن پھر بھی اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔ بظاہر اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ایسے عمامے ہیں جو ٹوپیوں پر ہوتے ہیں، یعنی مشرکین کے ہاں صرف ٹوپی ہوتی ہے اس پر عمامہ نہیں ہوتا جب کہ ہمارے ہاں صرف ٹوپی نہیں ہوتی بلکہ ٹوپی کے اوپر عمامہ بھی ہوتا ہے۔ تو محض ٹوپی نہ پہننا بلکہ اس پر عمامہ بھی باندھنا یہ ہماری امتیازی علامت ہے۔

دوسرا مطلب یہ کہ مشرکین صرف عمامہ باندھتے ہیں اور اس کے نیچے ٹوپی نہیں رکھتے اور ہمیں چاہئے کہ عمامہ باندھتے وقت اکیلا عمامہ نہ باندھیں بلکہ اس کے نیچے ٹوپی بھی رکھ لیں۔ دوسرا مطلب زیادہ راجح ہے اس لئے کہ پہلی صورت میں مطلب یہ بنے گا کہ مشرکین عموماً ٹوپی پہنا کرتے تھے اور عمامہ نہیں باندھا کرتے تھے اور یہ بات خلاف واقعہ ہے اس لئے کہ عربوں میں عمومی اور اکثری رواج سر پر عمامہ باندھنے کا تھا مشرکین بھی بکثرت عمامہ باندھا کرتے تھے اس لئے پہلا مطلب بظاہر خلاف واقعہ ہوگا اس لئے اگر اس حدیث کو صحیح مان بھی لیں تو دوسرا مطلب راجح ہے۔

(۳۳)----- وعن أبی موسی الأشعری، أن النبی صلی الله علیه وسلم قال:

أحِلَّ الذهبُ والحريرُ للإناثِ من أمتي، وحرَّمَ على ذكورِها۔ (رواه الترمذي والنسائي وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح)

ترجمہ...... حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال ہیں اور میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔

(۳۴)----وعن أبي سعيد الخدري، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اَستجدَّ ثوبًا سمَّاه باسمه، عمامةً اوقميصاً، أو رداءً، ثم يقول اللهُمَّ لك الحمدُ، كما كسوتَنيه أسألك خيرَه وخيرَ ماصُنع له، وأعوذبك من شرِّه وشرِّ ما صُنع له۔ (رواه الترمذي وأبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا حاصل کرتے تو اس کا نام لیتے مثلاً عمامہ یا قمیص یا رداء وغیرہ پھر فرماتے: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا كَسَوْتَنِيْهِ اَسْئَلُكَ خَيْرَهُ وَخَيْرَ مَا صُنِعَ لَهُ: وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَاصُنِعَ لَهُ۔

کہ اے اللہ آپ ہی کے لئے تعریف اور شکر ہے اس بات پر کہ آپ نے یہ کپڑا مجھے پہنایا میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس لباس کی خیر کا اور اس چیز کی خیر کا جس کے لئے اسے بنایا گیا ہے اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس لباس کے شر سے اور اس چیز کے شر سے جس کے لئے اس کو بنایا گیا ہے۔

یہ فرمایا کہ جب آپ نیا کپڑا حاصل کرتے تو اس کا نام لیتے یعنی جس نوع کا وہ لباس ہوتا وہ نام لیتے نام لینے کا کیا مطلب ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں: ایک مطلب یہ ہے کہ یہ دعا پڑھنے سے پہلے اس کا نام لیتے مثلاً هٰذهٖ عمامةٌ یارزقنی الله العمامة یا یہ فرماتے: هذا قميص یہ قمیص ہے یارزقنی الله القميص کہ اللہ نے مجھے قمیص عطا فرمائی ہے یہ دعا پڑھنے سے پہلے یا پہننے سے پہلے اس کا نام لیتے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نام لینے سے مراد یہ ہے کہ كسوتنيه کی ضمیر کی جگہ اس لباس کو ذکر کرتے مثلاً اگر عمامہ ہوتا تو یوں دعا پڑھتے: اللّٰهُمَّ لك الحمد كما كسوتني هذه العمامة اور اگر قمیص ہوتی تو یوں دعا پڑھتے: اللّٰهم لك الحمد كما كسوتني هٰذا القميص۔

اللّٰهم لك الحمد كما كسوتنيه۔ کما میں کاف کیسا ہے تو زیادہ راجح یہ ہے کہ یہ کاف تشبیہ کیلئے نہیں بلکہ تعلیل کیلئے ہے کہ اللہ کا شکر ہے اس وجہ سے اور اس بات پر کہ انہوں نے مجھے یہ لباس پہننے کیلئے دیا ہے۔

یہ فرمایا کہ اسئلك خیرہ وخیر ما صنع له ۔اس لباس کی بھی خیر مانگتا ہوں اور جس کے لئے اس کو بنایا گیا ہے اس کی بھی خیر مانگتا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے انجام کی بھی خیر مانگتا ہوں کہ اس وقت بھی میرے لئے یہ لباس خیر ثابت ہو اور اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے بھی میرے لئے خیر ثابت ہو اور اس وقت بھی اگر اس کے اندر کوئی شر ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھیں اور اس کے نتائج اور اثرات میں اس کے انجام میں اگر کوئی برائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی مجھے محفوظ رکھیں۔

(۳۵)-----وعن معاذ بن أنس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مَن أكَلَ طعاماً، ثمَّ قال: الحمدُ لله الذی أطعمنی هذا الطعامَ، ورزقنيهِ من غيرِ حولٍ منى ولا قوَّةٍ، غُفِرَله ما تقدَّمَ من ذنبهِ ۔ رواه الترمذی وزاد أبو داؤد: ومن لَبِسَ ثوبًا فقال: الحمدُ لله الذی كسانی هذا، ورزَقنيهِ من غيرِ حولٍ منى ولا قوَّةٍ غُفِرَله ماتقدَّمَ من ذنبه وما تأخَّرَ ۔

ترجمہ ...... حضرت معاذ بن انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی کوئی کھانا کھائے پھر کہے: **الحمد لله الذی اطعمنی هذا الطعام وَرَزَقنيهِ من غير حولٍ منی ولا قوّةٌ** ۔یعنی تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور یہ کھانا مجھے میری تدبیر اور قوت کے بغیر عطا کیا تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

ابوداؤد کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جو آدمی کپڑا پہنے اور یہ کہے: **الحمد لله الذی کسانی هذا وَرَزَقنيهِ من غِير حولٍ منی ولا قوة** کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے یہ لباس مجھے پہنایا اور یہ لباس مجھے میری تدبیر اور میری قوت کے بغیر عطا کیا تو اس کے اگلے گناہ بھی معاف کر دیئے جاتے ہیں اور پچھلے بھی۔

(۳۶)----- وعن عائشةَ، قالت قال لی رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ياعائشةُ! إذا أردتِ اللحوقَ بی فليكفكِ من الدنيا كزاد الراكب، وإياك ومجالسةَ الأغنياءِ، ولا تستخلقی ثوبًا حتى تُرقِّعيه ۔ (رواه الترمذی، وقال: هذا حديث غريب لا نعرِفُه إلاَّ من حديث صالح بن حسَّان قال محَّمد بن إسماعيل: صالح بن حسان منكر الحديث)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عائشہ! اگر تو میرے ساتھ ملنا چاہتی ہے مجھ تک پہنچنا چاہتی ہے تو دنیا میں سے

تمہارے لئے اتنی مقدار کافی ہونی چاہئے جتنی کہ سوار کے توشے کی ہوتی ہے اور تم مالداروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھنے سے بچو اور کسی کپڑے کو پرانا قرار نہ دو یہاں تک کہ اس پر پیوند لگالو۔

اغنیاء کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے بچو اس لئے کہ جب ان کے ساتھ بیٹھو گی تو لازماً دنیا کی محبت دل میں پیدا ہو گی اور ناشکری بھی ہو گی یہ دیکھو گی کہ ان کے پاس یہ بھی ہے، یہ بھی ہے اور اپنے پاس نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہو جائے گی یہ سوچو گی کہ اللہ نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔

کپڑے کو پیوند لگانے سے پہلے پرانا قرار نہ دو یعنی جب تک پیوند لگا کر اسے پہن نہ لو اس وقت تک اس کو چھوڑو نہیں اور اس کو اتار کر پھینکو نہیں۔

(۳۷)-----وعن ابن عمرَ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من لَبِسَ ثوبَ شهرةٍ منَ الدنیا ألبسَه اللہُ ثوبَ مذّلةٍ یومَ القیامةِ۔ (رواہ أحمد و أبو داؤد و ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی دنیا میں شہرت کا لباس پہنے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شہرت کا لباس دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو یہ کہ بہت اعلیٰ لباس ہے جس کی وجہ سے شہرت ہوتی ہے اور کبھی شہرت کا لباس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ بہت سادہ ہوتا ہے۔

(۳۸)-----عن أبی أمامة إیاس بن ثعلبةَ، قال: قال رسولُ اللہِ صلی اللہ علیه وسلم: ألاَ تسمعون؟ الاتسمعون أنَّ البذاذةَ منَ الإیمان، أنَّ البذاذةَ من الإیمان؟۔ (رواہ أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سنتے نہیں تم سنتے نہیں کہ بذاذۃ یعنی سادگی ایمان میں سے ہے، سادگی ایمان کا تقاضا ہے۔

سادگی اور ترک زینت پر کتاب اللباس کے ابتدائی مباحث میں بات ہو چکی ہے۔

(۳۹)----- وعنه، قال: قال رسولُ اللہِ صلی اللہ علیه وسلم: مَن تشبَّهَ بقومٍ فهوَ منهم۔ (رواہ أحمد و أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے۔
تشبہ کا مسئلہ لباس کے اصولوں کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

(٤٠)------ وعن سوید بن وهب، عن رجل من أبناءِ أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَن ترَكَ لُبسَ ثوبِ جمالٍ وهو يقدرُ عليه وفي رواية: تواضعاً كساه اللهُ حلَّةَ الكرامةِ، ومن تزوَّجَ للهِ توَّجه الله تاجَ الملك۔ (رواه أبو داؤد)

وروى الترمذي منه عن معاذ بن أنس حديث اللباس۔

ترجمہ ...... سوید بن وہب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی کے بیٹے سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی جمال والا لباس پہننا چھوڑ دے تواضع کی وجہ سے حالانکہ وہ اس پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت کا جوڑا پہنائیں گے اور جو آدمی اللہ کے لئے شادی کرے اللہ تعالیٰ اسے بادشاہوں والا تاج پہنائیں گے۔

تاج پہنانا آخرت میں ہوگا لیکن عزت کا لباس پہنانا اس میں دونوں احتمال ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قیامت میں کوئی خاص جوڑا پہنایا جائے جو اس کے لئے اولین اور آخرین کے سامنے عزت کا باعث ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں عزت عطا فرمائیں گے۔

فرمایا کہ جو اللہ کے لئے نکاح کرے، اللہ کے لئے شادی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱)......... ایک صورت یہ ہے کہ شادی اس لئے کی تاکہ مجھے عفت اور پاکدامنی حاصل ہو اور میں گناہ سے بچ جاؤں اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے یہ اللہ کے لئے شادی کرنا ہے۔

(۲)......... دوسرا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص جگہ پر نکاح کرنے میں رغبت نہیں تھی لیکن محض اس لئے اس عورت سے نکاح کر لیا کہ وہ بے چاری بے سہارا ہے اس کو ایک سہارا اور ٹھکانا مل جائے گا یہ بھی خالصتاً اللہ کے لئے شادی کرنا ہے جس میں اپنی کوئی غرض اور خواہش شامل نہیں ہے۔

(٤١)-----وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ اللهَ يُحب أن يرى أثرَ نعمتِه على عبده۔ (رواه الترمذي)

ترجمہ ...... حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے یعنی عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بات

کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی نعمت کا اثر ان کے بندے پر نظر آئے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا کی اور وہ اس نے چھپا کر رکھ لی اس نعمت کو ظاہر نہیں کیا تو یہ ناشکری ہے۔ شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو ظاہر کیا جائے نعمت کو ظاہر کرنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ کبھی تو زبان سے اس کا اظہار ہوتا ہے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا ہے یہ تحدیث نعمت ہے: أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

نعمت کے بیان کرنے میں اور ڈھینگ مارنے میں فرق ہے، ڈھینگ مارنے کے لئے بتاتا ہے وہ برائی ہے اور اگر اللہ کی نعمت کا شکر اور اظہار مقصود ہے تو یہ عبادت ہے لیکن کون سی تحدیث نعمت ہے کون سی ڈھینگ ہے اس میں فرق کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے کوئی کامل اور صاحب بصیرت ایمانیہ فرق کر سکتا ہے اور کبھی نعمت کا اظہار عمل سے ہوتا ہے کہ مثلاً اللہ نے مالی وسعت عطا کی ہے تو اچھا لباس پہنے تاکہ دیکھنے سے بھی پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کچھ دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لاکھوں کروڑوں دیئے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی لباس فقیروں والا پہن رکھا ہے محض کنجوسی اور خست طبع کی وجہ سے تو اس کا منشا تواضع نہیں ہے یہ ناشکری ہے۔

یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ نعمت کا اثر بندے پر نظر آئے یہ لباس کے ساتھ خاص نہیں ہے اگرچہ محدثین اس کو عموماً کتاب اللباس میں ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے الفاظ لباس کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ ہر چیز کو شامل ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی نعمت عطا فرمائی ہے تو وہ مختلف طریقوں سے ظاہر ہونی چاہئے، اس کے لباس سے بھی ظاہر ہو، لباس سے پتہ چلے کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے اس کو کچھ دے رکھا ہے، اس کے سفر کرنے کے انداز سے پتہ چلے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے، بڑی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں لیکن تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہے تواضع کی وجہ سے نہیں کسی اور اچھے مقصد کے لئے نہیں بلکہ ویسے ہی پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے، رہائش ایسی ہے کہ دیکھنے میں لگتا ہے کہ بڑا فقیر آدمی ہے ہر بات میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی کو علم کی نعمت عطا فرمائی ہے تو وہ نعمت بھی اس پر نظر آنی چاہئے اس کو چاہئے کہ وہ علم کی اشاعت کرے یہ نہیں کہ علم تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے لیکن اس کو ایسا چھپا کر رکھا کہ دیکھنے میں نظر آرہا ہے کہ یہ بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے یہ بات نہیں بلکہ اس کا اظہار ہونا چاہئے۔

لیکن اشاعت علم کے لئے یا شکر کے طور پر اظہار کرنے اور فخر کے طور پر اظہار کرنے میں فرق ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں اثر نعمت کا لفظ لباس کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر چیز میں ہے۔

(۴۲)----- وعن جابر، قال: أتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم زائراً، فرأى رجلاً شعِثاً قد تفرق شعرُه، فقال: ما كانَ يجدُ هذا ما يُسكِنُ به رأسه؟

ورأى رجلاً عليه ثياب وسخةٌ فقال: ما كانَ يجدُ هذا ما يغسِلُ به ثوبَه۔ (رواه أحمد والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ایک مرتبہ ملاقات کے لئے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پراگندہ آدمی کو دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا یہ ایسی چیز بھی نہیں پاتا تھا جس سے یہ اپنے سر کے بالوں کو درست کرلے اور ایک آدمی کو دیکھا کہ اس پر میلے کپڑے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا یہ ایسی چیز کو بھی نہیں پاتا تھا جس سے اپنے کپڑوں کو دھوڈالے۔

فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پراگندگی اور میلے کچیلے کپڑے عموماً فقر اور غربت کی وجہ سے نہیں ہوتے اگر فقر اور غربت کی وجہ سے ہو تو وہ ایک غیر اختیاری بات ہے اس پر صبر کرنا چاہئے لیکن عموماً یہ فقر اور غربت کی وجہ سے نہیں ہوتے اتنا غریب کوئی نہیں ہوتا کہ کپڑے بھی نہ دھو سکے اتنا گیا گزرا کوئی بھی نہیں ہوتا کہ اس کو کہیں سے کنگھی اور تیل بھی نہ مل سکے۔ عموماً یہ پراگندگی اور میلا کچیلا پن سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔

(٤٣)-----وعن أبی الأحوصِ، عن أبیهِ، قال: أتیتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلیَّ ثوبٌ دونٌ، فقال لی: ألكَ مالٌ؟ قلت: نعم قال: مِن أیِّ المالِ؟ قلتُ: من كل المال، قد أعطانی اللهُ منَ الإبلِ والبقر والغنم والخیلِ والرَّقیق قال: فاذا آتاكَ اللهُ مالاً فلیُرَ أثرُ نعمةِ الله علیكَ وكرامته۔ (رواه أحمد والنسائی وفی شرح السنَّة بلفظ المصابیح)

ترجمہ ...... ابو الاحوص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ مجھ پر گھٹیا کپڑے تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے کہا: کہ جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کس قسم کے مال میں سے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال میں سے عطا فرمایا ہے اونٹوں میں سے بھی، گائیوں میں سے بھی، بکریوں میں سے بھی، گھوڑوں میں سے بھی اور غلاموں میں سے بھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں مال عطا فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور ان کے

91

اکرام کا اثر تم پر نظر آنا چاہئے۔

(٤٤)----- وعن عبد الله بن عمرو، قال: مرَّ رجلٌ وعليه ثوبانِ أحمرانِ فسلم على النبي صلى الله عليه وسلم فلم يردَّ عليه۔ (رواه الترمذي وأبو داود)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی گزرا اس حال میں کہ اس پر دو سرخ رنگ کے کپڑے تھے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

سرخ رنگ کا کپڑا:-

عورتوں کے لئے سرخ رنگ کا کپڑا پہننا جائز ہے، مردوں کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے حتی کہ فقہائے حنفیہ کا بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حسن بن عمار شرنبلانی رحمہ اللہ تعالیٰ جو نور الایضاح کے مصنف ہیں ان کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے[1] جس میں انہوں نے آٹھ (۸) اقوال نقل کئے ہیں، استحباب سے لے کر کراہت تحریمیہ تک۔[2]

یعنی بعض نے اس کو مستحب قرار دیا ہے اور بعض نے اس کے بالکل برعکس سرخ رنگ کو مردوں کے لئے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔

سرخ کپڑے کی اقسام ...... سرخ رنگ کے کپڑے کی دو قسمیں ہیں ایک احمر قانی ہو یعنی خالص سرخ رنگ اور دوسرا یہ کہ خالص سرخ رنگ نہ ہو بلکہ کوئی اور رنگ بھی اس میں ہو مثلاً سفید یا سیاہ کپڑے میں سرخ دھاریاں ہیں۔

دوسری قسم کا کپڑا تقریباً سب کے نزدیک جائز ہے بلکہ بعض نے اس کو مستحب قرار دیا ہے لیکن استحباب کا قول محل نظر ہے جنہوں نے مستحب قرار دیا ہے اس بنیاد پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ دھاریوں والا کپڑا پہنا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محض کسی لباس کو پہن لینا یہ اس کے شرعی استحباب پر دلالت نہیں کرتا زیادہ سے زیادہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہوگا۔

سرخ کپڑے کا مکروہ ہونا اور اس کی دلیل ...... اصل بحث خالص سرخ میں ہے کہ یہ مرد کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات اس کی کراہت تحریمیہ کے قائل ہیں اور انہوں نے کئی احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے اکثر تو بہت ضعیف ہیں البتہ دو حدیثیں نسبتاً قابل استدلال ہیں:

---

(۱) رسالے کا نام تحفۃ الاکمل ہے۔ ...... (۲) ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ فصل فی اللبس ج ۶/ ص ۳۵۸

(۱)......... ایک حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اس نے سرخ رنگ کے کپڑے بھی پہنے ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ اس نے سرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا لہٰذا سرخ رنگ کے کپڑے پہننا مکروہ تحریمی ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سلام کا جواب ضرور دیتے لیکن یہ استدلال محل نظر ضرور ہے اس لئے کہ آپ کے سلام کا جواب نہ دینے کی اور بھی وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ بعض اوقات کوئی سلام کرتا ہے لیکن دوسرے کو کسی خیال میں منہمک ہونے کی وجہ سے پتہ نہیں چلتا کہ مجھے سلام کیا گیا ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سلام کیا لیکن حضرت عمرؓ نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح یہاں پر ہو سکتا ہے اس لئے یہ کراہت تحریمیہ کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے جو حضرات کراہت تحریمیہ کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اصل میں اس زمانے میں بہت سے سرخ رنگ کے کپڑے ایسے ہوتے تھے جن کو رنگنے کے لئے نجاست استعمال ہوتی تھی تو اصل میں اس نجاست کی وجہ سے منع کیا گیا ہے بذات خود سرخ رنگ سے منع کرنا مقصود نہیں ہے۔

دوسری دلیل...... کراہت تحریمیہ کے قائلین کی دوسری دلیل ابوداؤد کی ایک حدیث کہ بنو اسد کی ایک عورت کہتی ہے کہ ہم ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس مغرہ کے ساتھ کپڑے رنگ رہی تھیں مغرہ یہ خاص قسم کی سرخ رنگ کی مٹی ہوتی تھی مطلب یہ ہوا کہ کپڑوں کو سرخ رنگ دے رہی تھیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے لیکن گھر کے قریب پہنچ کر واپس تشریف لے گئے تو ہم نے جلدی سے رنگنے کے سامان کو سمیٹ دیا کہ شاید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کپڑوں کو اس طرح رنگنے پر ناراض ہو گئے ہیں کچھ دیر کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو وہ سامان موجود نہیں تھا اور ہم بھی چلی گئیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے آئے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سرخ رنگ کے ساتھ کپڑوں کو رنگنے پر ناراض ہو گئے ہیں اور یہ ناراضگی تبھی ہو سکتی ہے جب کہ مکروہ تحریمی ہو۔

جواب نمبر (۱)...... یہ استدلال بھی کافی کمزور ہے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اول تو اگر اس سے استدلال کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ عورتوں کے لئے بھی سرخ

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی رخصۃ الحمرۃ ج ۲/ ص ۲۰۸

رنگ مکروہ تحریمی ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

(۲)......... دوسرا یہ کہ ان عورتوں کا فہم تھا کہ وہ یہ سمجھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سرخ رنگ کی وجہ سے ناراض ہو کر چلے گئے ہیں جب کہ ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس جانے کی وجہ کوئی اور ہو ناراض ہو کر واپس نہ گئے ہوں، ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے واپس چلے گئے ہوں کہ گھر میں عورتیں کام کر رہی ہیں اجنبی عورتیں ہیں اگر میں گھر جاؤں گا تو وہ بچاری ادھر ادھر ہو جائیں گی یا ان کو پردہ کرنا پڑے گا یا حجاب اور شرم کی وجہ سے وہ چلی جائیں گی تو ان کے کام میں کیوں رکاوٹ بنوں، ان پر بوجھ کیوں بنوں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس چلے گئے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھر کے قریب پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کام یاد آ گیا ہو اس کی وجہ سے واپس چلے گئے ہوں، ناراضگی کی وجہ سے واپس جانا یہاں متعین نہیں ہے۔

کراہت تحریمیہ پر جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ دلائل محل نظر ہیں لہٰذا صحیح یہ ہے کہ جو تو احمر قانی نہ ہو یعنی خالص سرخ نہ ہو اس کا پہننا بلا تردد جائز ہے اور خالص سرخ کا پہننا بھی جائز ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالص سرخ رنگ مردوں کے لئے مکروہ تنزیہی ہے ہاں البتہ جہاں اس سے تشبہ بالنساء ہو وہاں اس کی کراہت اور بڑھ جائے گی کیوں کہ تشبہ بالنساء بذات خود ممنوع ہے کہاں اس میں تشبہ بالنساء ہوتا ہے اور کہاں نہیں ہوتا اس کا دارومدار عرف اور ماحول پر ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سرخ لباس پہننا بکثرت ثابت ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ سرخ جوڑے کے اندر دیکھا اور فرمایا: **لم أر شيئًا قط أحسن منه**۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب صورت چیز میں نے نہیں دیکھی۔(۱)

اسی طرح اسی باب میں ایک حدیث آگے آ رہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب منیٰ میں خطبہ دیا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ چادریں اوڑھ رکھی تھیں اس طرح کی اور بھی بہت ساری حدیثیں ہیں تو کئی علماء نے ان کے بارے میں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سرخ لباس پہنا ہے وہ خالص سرخ نہیں تھا بلکہ سرخ دھاریوں والا لباس تھا۔

(۴۵)----- وعن عمرانَ بن حُصَين، أنَّ نبيَّ الله ﷺ قال: لا أركبُ الأرجوان، ولا ألبَسُ المعصفرَ، ولا ألبسُ القميص المكفَّفَ بالحريرِ وقال: ألاَ وطِيبُ الرِّجالِ ريحٌ لالونَ له، وطيبُ النساءِ لونٌ لاريحَ لـه۔ (رواه أبو داؤد)

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب اللباس باب فی الحمرۃ ج ۲ / ص ۲۰۸

ترجمہ ...... حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سرخ گدی پر سوار نہیں ہوتا اور نہ ہی عصفر میں رنگا ہوا کپڑا پہنتا ہوں اور نہ ہی میں ایسی قمیص پہنتا ہوں جس پر ریشم کا حاشیہ لگا ہوا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات سن لو کہ مردوں کی خوشبو وہ ہے کہ جس میں خوشبو ہو رنگ نہ ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس میں رنگ ہو زیادہ خوشبو نہ ہو۔

ارجوان:-

پہلی بات اس حدیث میں لا أركب الأرجوان ہے، ارجوان در حقیقت ایک بوٹی کا نام ہے اور اس بوٹی سے عام طور پر کپڑوں کو سرخ رنگ دیا جاتا تھا تو ارجوان کا ایک معنی سرخ کپڑا لیکن یہاں مطلقاً سرخ کپڑا مراد نہیں ہے بلکہ یہاں خاص قسم کی گدی مراد ہے جو عام طور پر گھوڑے پر سوار ہوتے وقت نیچے رکھی جاتی تھی اور یہ عموماً ریشم کی ہوتی تھی، اسی گدی کو میثرہ بھی کہا جاتا ہے جس کو "المیثرہ الحمراء" بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اسی کو "میثرہ الارجوان" بھی کہہ دیا جاتا ہے یہ سارے الفاظ مختلف حدیثوں میں آرہے ہیں۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ سرخ رنگ کی ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی گدی جو گھوڑے پر سوار ہوتے وقت نیچے رکھ لی جاتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس پر نہیں بیٹھتا اور دوسری حدیثوں میں صراحۃً آرہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع بھی فرمایا ہے۔

ارجوان سے منع کرنے کی وجوہ: ...... اس سے منع کرنے کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں:

(۱) .... ایک یہ کہ یہ ریشم کی ہوتی ہے ائمہ ثلاثہ اور صاحبین رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک ریشم پر بیٹھنا بھی ناجائز ہے لہٰذا ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک کراہت تحریمی ہو گی۔

(۲) .... بعض نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا رنگ سرخ ہوتا تھا لیکن یہ وجہ ضعیف ہے اس لئے کہ سرخ رنگ کا پہننا حرام نہیں ہے تو اس پر بیٹھنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا، سرخ رنگ پر بیٹھنے کی کراہت کسی دلیل مستقل سے ثابت نہیں ہے۔

(۳) .... تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں تنعم کی چیز تھی ناز و نعمت کی چیز تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس صورت میں کراہت تحریمی نہیں ہو گی بلکہ تنزیہی ہو گی کہ زیادہ ناز و نخرے والی چیزیں استعمال کرنا یہ مؤمن کی شان کے مناسب نہیں ہے۔

معصفر کا حکم پہلے بیان ہو چکا ہے اسی طرح ریشم کے حاشیہ کا حکم بھی بیان ہو چکا ہے، خوشبو کے

بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مردوں کے لئے بہتر خوشبو وہ ہے جس میں مہک زیادہ ہو لیکن رنگت نہ ہو یہ مطلب نہیں کہ مہک کا ہونا ضروری ہے مطلب یہ ہے کہ اس میں رنگت زیادہ نہیں ہونی چاہئے اس لئے کہ رنگت عورتوں کے زیادہ مناسب ہے مردوں کے زیادہ مناسب نہیں ہے۔ ایسی خوشبو نہ ہو کہ لگانے کے بعد اس کی خاص رنگت نہ رہے بلکہ مہک آتی رہے جب کہ اس کے برعکس عورت اگر خوشبو لگائے تو اس کو زیادہ پیش نظر رنگت رکھنی چاہئے اور مہک ہونی تو چاہئے کیوں کہ اگر مہک نہیں ہوگی تو وہ خوشبو ہی نہیں ہوگی لیکن تیز نہیں ہونی چاہئے یہ حکم اس وقت ہے جب کہ عورت نے گھر سے باہر نکلنا ہو اس لئے کہ جب گھر سے باہر نکلے گی تو رنگت تو کپڑے سے چھپائی جاسکتی ہے، برقعے میں چھپ جائے گی حجاب میں آجائے گی لیکن تیز مہک کسی برقعے وغیرہ سے نہیں چھپے گی جہاں سے گزرے گی لوگوں کو خوشبو آئے گی اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔

(٤٦)-----وعن أبی ریحانةَ، قال: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عشرٍ: عنِ الوشر، والوشم، والنتف، وعن مکامعةِ الرجلِ الرجلَ بغیرِ شعارٍ، ومکامعةِ المرأةِ المرأةَ بغیرِ شعارٍ، وأن یجعلَ الرجلُ فی أسفلِ ثیابہ حریراً مثل الأعاجم، أویجعلَ علی منکبَیہ حریراً مثل الأعاجم، وعن النھبی، وعن رکوبِ النمور، ولبوسِ الخاتِم إلّا لذی سُلطان۔ (رواہ أبوداود والنسائی)

ترجمہ ...... ابوریحانہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں سے منع فرمایا: دانتوں کو باریک کرنے سے، بدن کو گودنے سے، بال اکھیڑنے سے، مرد کے مرد کے ساتھ بغیر کپڑے کے لیٹنے سے، عورت کے عورت کے ساتھ بغیر کپڑے کے لیٹنے سے اور اس بات سے کہ آدمی اپنے کپڑوں کے نچلے حصے میں عجمیوں کی طرح ریشم لگالے یا اپنے کندھوں پر عجمیوں کی طرح ریشم لگالے اور کوئی چیز چھیننے سے منع فرمایا اور چیتوں کی کھال پر بیٹھنے سے اور غیر صاحب اقتدار کے لئے انگوٹھی پہننے سے۔

ممنوع چیزیں:۔

دس چیزوں سے منع فرمایا ان میں سے اکثر چیزیں تو وہ ہیں جو پہلے بیان ہو چکی ہیں:

(۱)......... پہلی چیز وشر ہے وشر کا معنی دانتوں کو باریک کرنا یہ عام طور پر زینت کے لئے بھی کیا جاتا تھا اور اپنی عمر چھپانے کے لئے بھی کیا جاتا تھا اس لئے کہ جوں جوں عمر بڑی ہوتی ہے دانت گھس گھس کر موٹے ہو

جاتے ہیں ان کی نوک یا تیز کنارا برقرار نہیں رہتا تو بعض عورتیں اپنے آپ کو جوان ظاہر کرنے کے لئے دانتوں کو باریک کرلیا کرتی تھیں۔

اگر یہ عمر چھپانے کے لئے دھوکہ دینے کے لئے ہو تو ناجائز ہے تفصیل سے مسئلہ باب الترجل میں آجائے گا۔

(۲)........دوسری چیز وشم ہے وشم کا معنی بدن گودنا یہ خاص طریقہ ہوتا تھا کہ کھال میں سوراخ کرکے اس میں رنگ بھر کر جسم میں خاص قسم کے نقشے بنائے جاتے تھے یہ بھی ممنوع ہے اس کا حکم بھی آگے آجائے گا۔

(۳)........آپ ﷺ نے نتف سے منع فرمایا نتف کے کئی معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ عورتوں کے چہرے سے بال اور لوئیں اکھیڑنا، دوسرا معنی سفید بالوں کو اکھیڑنا ان دونوں کا حکم بھی آگے آجائے گا۔

(۴)........مرد کا مرد کے ساتھ لیٹنا اگر درمیان میں کپڑا حائل ہو تو اس صورت میں اگر شہوت کا خطرہ ہو تو ناجائز ہے وگرنہ جائز ہے اور اگر درمیان میں کپڑا بھی حائل نہ ہو تو پھر ناجائز ہے اور اسی سے یہاں پر منع کیا گیا اور یہی حکم عورت کے عورت کے ساتھ لیٹنے کا ہے۔

(۵)........آپ ﷺ نے منع فرمایا نھبی سے۔ نہبہ کا معنی کسی سے زبردستی کوئی چیز چھین لینا یا لوٹنا یہ ممنوع ہے۔

(۶)........**وعن رکوب النمور۔** نمور، نَمِرْ کی جمع ہے۔ نَمِرْ اصل میں چیتے کو کہتے ہیں لفظی معنی چیتوں پر سوار ہونا اور یہاں نَمِرْ سے مراد چیتے کی کھال ہے تو رکوب النمور کا معنی چیتے کی کھال پر بیٹھنا۔

چیتے کی کھال پر بیٹھنے سے نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے اس لئے کہ ایک تو یہ اس زمانہ میں بہت زیادہ تنعم کی چیز سمجھی جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ کہا جاتا ہے کہ ہر جانور کا اثر ہوتا ہے اور اس پر بیٹھنے سے وہ انسان کے اندر منتقل ہوتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی کوئی اس طرح کی بات ہو اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا بہر حال یہ نہی تحریمی نہیں تنزیہی ہے۔

(۷)........انگوٹھی کا حکم آگے باب الخاتم میں آجائے گا یہاں فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ صاحب اقتدار کو انگوٹھی کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس زمانے میں انگوٹھی مہر کا کام دیتی تھی لیکن جو صاحب اقتدار نہیں ہے جس کو مہر لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔

بعض کے نزدیک یہ نہی منسوخ ہے اور بعض کے نزدیک اور بیشتر حنفیہ کے نزدیک یہ نہی منسوخ نہیں البتہ تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے باقی انگوٹھی کا تفصیلی حکم باب الخاتم میں آجائے گا۔

(٤٧)----- وعنْ علي، قال: نهاني رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عن خاتمِ الذهبِ، وعن لبسِ القَسِي والمياثِرِ - (رواه الترمذی وأبوداود والنسائی وابن ماجه وفی روایة لأبی داود قال: نهى عن مياثِرِ الارجوان)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے منع فرمایا سونے کی انگوٹھی سے اور قَسِیّ کپڑے کے پہننے سے اور سرخ رنگ کی ریشمی گدیوں سے۔

میاثرۃ میثرہ کی جمع ہے میثرہ کا معنی اُرجوان کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

قسی کپڑے سے منع فرمایا یہ خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا بعض نے یہ کہا ہے کہ قس مصر میں ایک جگہ کا نام ہے وہاں کا بنا ہوا کپڑا ہوتا تھا بظاہر یہ نہی اس صورت میں ہے جب کہ یہ کپڑا ریشم کا ہو اور عموماً وہ ریشم کا ہوتا ہو گا اور بعض نے کہا کہ قسی اصل میں قزی تھا اور قزی یہ نسبت ہے قز کی طرف اور قز ریشم کی خاص قسم ہے تو اس صورت میں بھی خاص قسم کے ریشمی کپڑے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا۔

(۴۸)-----وعن معاويةَ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تركبوا الخزَّ ولا النِّمارَ۔ (رواه أبو داود والنسائى)

ترجمہ ...... حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نہ تو خز پر بیٹھا کرو اور نہ ہی نمار پر۔

خز یہ خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا اور اکثر شارحین نے یہ کہا ہے کہ یہ ریشم کا کپڑا ہوتا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نہی تنزیہی ہو گی جب کہ دوسرے حضرات کے نزدیک یہ نہی تحریمی ہو گی۔ اس پر بیٹھنے سے اس لئے منع فرمایا کہ یہ تنعّم کی بات تھی اور بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنعماً منع فرمایا۔

نِمار نَمِرہ کی جمع ہے نَمِرہ کا معنی دھاریوں والی چادر، دھاریوں والی چادر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہننا ثابت ہے اور بکثرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنی ہے اس پر بیٹھنے سے کیسے منع کر دیا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ خاص قسم کی کوئی چادریں مراد ہوں جن میں نہی کی کوئی وجہ ہو مثلاً ریشم کی ہوتی ہوں یا وہ بہت زیادہ تنعّم کی چیز سمجھی جاتی ہو اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنزیہی طور پر اس سے منع فرمایا لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ نمار اگر چہ نَمِرہ کی جمع ہوتی ہے لیکن یہاں نَمِرَہ کی جمع نہیں ہے بلکہ نَمِر کی جمع ہے گویا نمار نمور کے معنی میں ہے اور اس سے مراد چیتے کی کھال ہے اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیتے کی کھال پر بیٹھنے سے منع فرمایا لیکن یہ نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔

(۴۹)-----وعن البراءِ بن عازبٍ: أنّ النبيَّ صلى اللهُ عليه وسلم نهى عن الميثرةِ الحمراء۔ (رواه فى شرح السنة)

ترجمہ ...... حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے سرخ رنگ کی گدی سے منع فرمایا۔

(۸۰)----- وعن أبی رِمثةَ التیمی، قال: أتیتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہِ ثوبانِ أخضرانِ، ولہ شعرٌ قد علاہ الشَّیبُ وشیبُہ أحمرُ - (رواہ الترمذی وفی روایةٍ لأبی داود: وھو ذو وفرة وبھا رَدعٌ من حِنَّاءٍ)

ترجمہ...... حضرت ابو رمثہ تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سبز کپڑے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بھی تھے جن پر سفیدی چھائی ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی سفیدی سرخی میں بدلی ہوئی تھی یعنی ان پر سرخ خضاب لگا ہوا تھا اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ذو وفرہ ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پٹوں والے تھے اور ان پٹوں پر مہندی کے داغ تھے۔

سبز رنگ کے کپڑے:-

اس حدیث سے ایک یہ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے کپڑے بھی پہنے ہیں اور یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف رنگوں کے کپڑے پہنے ہیں تاکہ یہ پتہ چلے کہ بذات خود کوئی رنگ شرعاً مطلوب نہیں ہے جو مل جائے یا جو پسند ہو پہنا جا سکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کے بارے میں تفصیلی گفتگو انشاء اللہ "باب الترجل" میں آئے گی۔

یہاں یہ آیا کہ "قد علاہ الشیب" شیب کا معنی بالوں کا سفید ہو جانا فرمایا کہ ان بالوں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی تو اس سے مراد سارے بال نہیں ہیں اکثر بال بھی نہیں ہیں بلکہ چند بال ہیں اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت تھوڑے بال سفید ہوئے تھے زیادہ بال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید نہیں ہوئے تھے خضاب کا مسئلہ بھی باب الترجل میں آجائے گا۔

(۸۱)-----وعن أنس: أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کانَ شاکیاً، فخرج یتوکّا علی اسامةَ وعلیہِ ثوب قِطرٍ قد توشَّحَ بہ فصلّٰی بھم- (رواہ فی شرح السنة)

ترجمہ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار تھے تو آپ ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے سہارے پر باہر تشریف لائے اور اس وقت آپ ﷺ پر قطری کپڑا تھا جسے آپ ﷺ نے اپنے اوپر لپیٹ رکھا تھا تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں (صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو) نماز پڑھائی۔

قطری کپڑا یہ خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا اور اچھے کپڑوں میں شمار ہوتا تھا لیکن موٹا ہوتا تھا بعض نے یہ کہا کہ یہ کپڑا یمن سے بن کر آتا تھا اور بعض نے کہا کہ نہیں یہ قطر کا بنا ہوا کپڑا ہوتا تھا جگہ کا نام قَطر ہے لیکن جب اس کی طرف کپڑے کی نسبت کی جائے تو ''قاف'' کا زیر پڑھا جاتا ہے یعنی قِطرِی پڑھا جاتا ہے بہر حال یہ خاص قسم کا کپڑا تھا۔

(۵۲)----- وعن عائشةَ، قالت: كانَ على النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثوبانِ قِطرِيَّانِ غليظانِ، وكانَ إذا قعدَ فعَرِقَ ثَقُلا عليهِ، فقدِمَ بَزٌّ منَ الشامِ لفلانٍ اليهودی فقلتُ: لو بعثتَ إليهِ فاشتربتَ منه ثوبَينِ إلی الميسرة فأرسلَ إليه، فقال: قد علمتُ ماتريدُ، إنما تريدُ أن تذهبَ بمالی فقال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: كذبَ، قد علمَ أنی من أتقاهُم وآداهُم للأمانةِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دو موٹے قطری کپڑے تھے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسینہ آتا تو یہ دونوں کپڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بوجھل ہو جاتے فلاں یہودی کا شام کے علاقے سے ''بزّ'' کپڑا آیا تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر آپ اس یہودی کے پاس آدمی بھیجیں اور اس سے دو کپڑے خرید لیں ہاتھ کی کشادگی تک ادھار پر تو اچھا ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کے پاس آدمی بھیجا (کہ ہم کپڑے لینا چاہتے ہیں لیکن پیسے بعد میں دے دیں گے) تو اس نے کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ تم کیا چاہتے ہو؟ تم یہ چاہتے ہو کہ میرا مال لے اڑو (یعنی پیسے بعد میں نہیں دو گے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے، بے شک اسے معلوم ہے کہ میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور لوگوں میں سے سب سے زیادہ ادائیگی کرنے والا ہوں۔

ایک تو یہ ہے کہ آدمی کو کسی کے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے پتہ نہیں ہوتا تو تاجر آدمی اس کو ادھار سودا دینے میں احتیاط کرتا ہے کہ کہیں پیسے نہ مار جائے لیکن اس کو کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ تو ان میں سے ہے جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا کہ ''يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ'' اس یہودی کو پتہ ہے

کہ اور کوئی امانت میں خیانت کرے تو کرے میں کبھی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا میں کسی کے پیسے نہیں مار سکتا۔ لیکن جان بوجھ کر محض لوگوں کو ورغلانے کے لئے گمراہی میں ڈالنے کے لئے اس نے یہ بات کہی ہے۔

بیع مؤجل میں جہالت:-

یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تجویز پیش کی کہ اس یہودی سے ادھار کپڑا خرید لیا جائے کپڑا خریدنے کے لئے اس وقت پیسے نہیں تھے اس لئے یہ بھی کہا کہ ادھار خرید لیا جائے لیکن ادھار کب تک ہوگا **إلی المیسرة** یعنی ہاتھ کی کشادگی تک بظاہر یہ اَجل مجہول ہے اور بیع مؤجل میں اجل مجہول ہے کہ کب ادائیگی کرنی ہے اس کا وقت مجہول ہے تو یہ بیع صحیح نہیں ہوتی، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ تجویز کیسے پیش کر دی۔

(۱)......... اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تجویز میں جہالت ہے کہ ہاتھ کی کشادگی تک کا ادھار کر لیں لیکن جب اس یہودی سے بات کرنی تھی اس میں جہالت نہیں تھی بلکہ اندازہ لگا کر کہ فلاں وقت تک کشادگی ہو جائے گی وہ وقت اس کو بتانا تھا اور وہی اس کو بتایا ہوگا کہ فلاں وقت تک ہمیں دو کپڑے ادھار دے دو اس لئے بیع کے اندر جہالت نہیں ہے۔

(۲)......... دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بیع مؤجل نہ کی ہو بلکہ بیع حال کی ہو اس لئے کہ اگر مشتری عقد مکمل ہونے کے بعد بائع سے یہ کہہ دے کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں بعد میں ادا کر دوں گا تو یہ بیع مؤجل نہیں ہوتی بلکہ بیع حال ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خود عقد میں اَجل کا ذکر نہیں ہے اس لئے ایسی بیع میں بائع کو ہر وقت یہ اختیار حاصل رہتا ہے کہ وہ جب چاہے مشتری سے قیمت کا مطالبہ کرے اور مشتری پر قیمت کی ادائیگی فی الحال واجب ہو جاتی ہے لیکن مشتری بائع سے مہلت مانگ لیتا ہے مثلاً آپ نے دکان سے کوئی چیز خریدی لیکن جیب میں پیسے نہیں تھے دُکاندار نے آپ سے کہا کہ کوئی بات نہیں بعد میں دے دینا۔ اب بظاہر تو یہ بیع فاسد ہونی چاہئے اس لئے کہ قیمت ادا کرنے کا وقت مجہول ہے لیکن حقیقت میں یہ بیع مؤجل نہیں ہے بلکہ بیع حال ہے البتہ مشتری نے قیمت کی ادائیگی کیلئے مہلت مانگی لی ہے یا بائع نے مہلت دے دی ہے۔ اب اس مہلت کا متعین ہونا شرعاً ضروری نہیں وہ غیر متعین بھی ہو سکتی ہے اور اس صورت میں دکاندار کو ہر وقت قیمت کے مطالبے کا حق حاصل ہے۔ بہر حال اس حدیث میں ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بیع حال کی ہو۔

راحت و آسانی والا لباس:-

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی لباس آدمی پر بوجھل ہوتا ہو تو اس کو چھوڑ کر ایسا لباس

خریدنا جو آدمی کے لئے سہولت، راحت اور آسانی کا باعث ہو یہ بھی کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ نے بھی اس کا لحاظ فرمایا کہ موٹے کپڑے کی جگہ بز کپڑا جو ہلکا ہوتا ہے خرید لیا جائے تاکہ راحت کا باعث ہو۔

(۵۳)-----وعن عبد الله بن عمرو بن العاص، قال: رآني رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وعليَّ ثوبٌ مصبوغٌ بعصفر مورَّداً، فقال: ماهذا؟ فعرفتُ ماكرِهَ، فانطلقتُ فأحرقته فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ماصنعتَ بثوبك؟ قلتُ: أحرقتُه قال: أفلا كسوتَه بعضَ اهلِك؟ فانَّه لاباسَ به للنساءِ۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ مجھ پر ایک ایسا کپڑا تھا جو عصفر میں رنگا ہوا تھا اور اس میں گلاب کا رنگ بھی تھا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ تو میں سمجھ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کون سی چیز ناپسند ہوئی ہے تو میں گیا اور میں نے اس کپڑے کو جلادیا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اپنے کپڑے کا کیا کیا؟ میں نے کہا کہ میں نے اسے جلادیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اپنے بعض گھر والوں کو یہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا اس لئے کہ اس میں عورتوں کے لئے کوئی حرج نہیں ہے۔

(۵۴)----- وعن هلال بن عامر، عن أبيه، قال: رأيتُ النبيَّ ﷺ بمنى يخطبُ على بغلة وعليه بردٌ أحمرُ، وعليٌّ أمامَه يُعبِر عنه۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت ہلال بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منیٰ میں خچر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سرخ رنگ کی چادریں تھیں (یعنی دھاریوں والی چادریں تھیں) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بات کو آگے پہنچا رہے تھے۔

اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر نہیں تھے تو زیادہ مجمع میں خطاب کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اصل خطاب کرنے والا بولتا تھا اور کچھ فاصلہ پر کوئی آدمی کھڑا ہو جاتا تھا وہ اس جملے کو دہراتا تھا اور بعض اوقات کئی کئی آدمی اس طریقے سے دور تک آواز پہنچانے کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔

سوال ...... جو خطبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دیا اس کے بارے میں ابو داؤد کی روایت

میں آتا ہے کہ بطور معجزہ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اتنی بلند ہوگئی تھی کہ جو اپنے اپنے خیموں کے اندر بھی بیٹھے تھے انہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنائی دے رہا تھا اور پورے منیٰ کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز گونج رہی تھی۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اتنی بلند تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بات پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔

جواب ...... اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں متعدد خطبے دیئے ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کے خطبہ میں ظاہر ہوا ہے کیونکہ یہ مصروفیت کا بھی دن تھا اور خطبہ بھی اہم تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام بھی بیان کرنے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو بلند کر دیا کہ جو اپنے کام لگا ہوا ہے، جو رمی جمرات کر رہا ہے، جو جانور ذبح کر رہا ہے، کوئی اور کام کر رہا ہے سب تک آواز پہنچ جائے لیکن اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے دیئے ہیں تو ان خطبوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ظاہر نہیں ہوا ہوگا اس لئے وہاں اس کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

(۵۵)----- وعن عائشةَ، قالت: صُنِعَت للنبی صلی اللہ علیه وسلم بُردة سوداءُ، فلبسها، فلما عرق فیها وجد ریح الصوف، فقذفها۔ (رواہ أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک کالی چادر تیار کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں پسینہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کی بو محسوس کی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتار دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لباس میں جہاں طہارت پسند فرماتے تھے، نظافت پسند فرماتے تھے وہیں نفاست بھی پسند فرماتے تھے۔

(۵٦)----- وعن جابر، قال: أتیتُ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم وهو محتبٍ بشملةٍ قد وقعَ هُدبها علی قدمَیه۔ (رواہ أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر کے ساتھ احتباء کیا ہوا تھا جس کے پھندنے آپ ﷺ کے قدموں پر لگ رہے تھے۔

(۵۷)----- وعن دِحیةَ بن خلیفةَ، قال: أُتی النبی صلی اللہ علیه وسلم

بقَباطي، فأعطاني منها قُبطِيَّةً، فقال: اصدَعها صَدعين، فاقطع أحدَهما قميصاً، وأعطِ الآخرَ امرأتكَ تختمرُبه فلما أدبر، قال: وأمر امرأتكَ أن تجعلَ تحتَه ثوبـًا لايصِفها۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ...... حضرت دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قبطی کپڑے لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک قبطی کپڑا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے دو حصے کر لینا ان میں سے ایک حصے کو کاٹ کر قمیص بنالینا اور دوسرا اپنی بیوی کو دے دینا اس کو اوڑھنی بنالے گی۔ جب حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ واپس جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی بیوی کو کہنا کہ وہ اس کے نیچے اور کپڑا لگالے تاکہ وہ اس کے جسم کو یا اس کے بالوں کو ظاہر نہ کرے۔

قباطی کا معنی:-

یہ لفظ قباطی فعالیل کے وزن پر ہے اس لئے یا مشدد ہے یہ قبطیہ کی جمع ہے، قبطی قبط کے بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں، قبط مصر کی ایک قوم تھی اس قوم کے لئے لفظ قبط بولا جاتا ہے یعنی قاف کے کسرے کے ساتھ اور اس قوم کی طرف جو آدمی منسوب ہو اس کو بھی قبطی کہا جاتا ہے قاف کے کسرے کے ساتھ لیکن جب کپڑے کی نسبت اس قوم کی طرف کی جائے تو قاف کا ضمہ پڑھا جاتا ہے اس کپڑے کو قُبطِیَّہ کہا جائے گا یعنی قبطی چادر۔

اس طرح کی کئی چادریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائیں، ان میں سے ایک دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو بھی دی چونکہ یہ چادر بہت بڑی تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مصرف اور استعمال خود ہی بتلادیا کہ ایسا کرنا کہ کچھ حصے کی قمیص بنوا لینا اور جو بچے گا وہ اپنی بیوی کو دینا کہ وہ اس کی اوڑھنی بنالے لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ چونکہ یہ باریک ہے اس لئے اپنی بیوی سے کہنا کہ اس کے نیچے کپڑا لگالے تاکہ نماز وغیرہ میں جب سر پر لے یا کسی اجنبی کے سامنے سر پر لے کر جانا پڑے تو اس کا جسم یا اس کے بال اس کے اندر سے ظاہر نہ ہوں۔

سوال...... سوال یہ ہے کہ کیا حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کو ستر کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کو نہیں کہا کہ قمیص سلواتے وقت نیچے کپڑا لگالینا اور بیوی کے بارے میں کہا کہ وہ نیچے کپڑا لگالے۔

جواب...... تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگا کہ حضرت دحیہ کلبی

رضی اللہ عنہ اکیلی قمیص نہیں پہنیں گے بلکہ قمیص کے نیچے کوئی شلوار یا لنگی وغیرہ بھی ہو گی اس لئے جتنے حصے کو چھپانا ضروری ہے وہ تو شلوار یا لنگی وغیرہ سے چھپ جائے گا اور باقی جسم کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں اور جو مسئلہ میں نے بتایا تھا یہ اس کی دلیل ہے کہ مرد کا باقی جسم اگر کچھ نظر بھی آرہا ہو لیکن عرفاً اس کو لباس کے اندر سمجھا جاتا ہو تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے بشرطیکہ وہ شرعی ستر کا حصہ نہ ہو۔

(۵۸)----- وعن أم سلمةَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم دخلَ عليها وهيَ تختمر فقال: ليَّةً لاليَّتينِ۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے اور یہ اس وقت اوڑھنی سر پر لے رہیں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بل دو دو بل نہ دو۔

اوڑھنی کو دو مرتبہ بل دینے سے ممانعت کی وجہ ...... بعض نے اس کی وجہ اسراف بیان کی ہے کہ سر پر ایک مرتبہ بل دے لیا کپڑے کو اس کی ضرورت ہے تاکہ یہ اوڑھنی سر پر ٹکی رہے لیکن دو مرتبہ بل دینا یہ بلاضرورت ہے۔ اس لئے یہ اسراف کے اندر داخل ہے اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں تشبہ بالرجال ہے کیونکہ مرد بھی بعض اوقات اپنی چادر سر پر رکھ کر بل دے کر ٹوپی سی بنا لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں مرد عام طور پر دو بل دیتے ہوں اور عورتیں دو بل نہ دیتی ہوں تو اس میں چونکہ تشبہ بالرجال تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

الفصل الثالث

(۵۹)----- عن ابنِ عمرَ، قال: مررتُ برسول الله ﷺ وفي إزاري استرخاءٌ فقال: يا عبد الله! ارفع إزاركَ فرفعتُه، ثم قال: زِد فزدتُ فما زلتُ أتحرَّاها بعدُ فقال بعضُ القومِ: إلى أين؟ قال: إلىٰ أنصاف السَّاقين۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اس حال میں کہ میری لنگی میں ڈھیلا پن تھا یعنی لٹکی ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبد اللہ! اپنی لنگی کو اوپر کرو، میں نے اسے اوپر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور اوپر کرو میں نے اور اوپر کیا پھر میں ہمیشہ اس کو اوپر کرنے کی کوشش کرتا رہا بعض لوگوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں تک اوپر کی تو انہوں نے کہا کہ پنڈلیوں کے نصف تک۔

(٦٠)-----وعنه، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: مَن جرَّ ثوبَه خُيلاءَ لم ينظرِ الله إليه يومَ القيامة فقال أبو بكر: يا رسول الله! إزاري يسترخي، إلّا أن أتعاهدَ فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم إِنَّكَ لستَ ممَّن يفعلُه خُيلاءَ۔ (رواه البخاري)

ترجمہ...... حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی اپنے کپڑے کو تکبر کی وجہ سے لمبا کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائیں گے۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تہہ بند ڈھیلا ہو جاتا ہے، ڈھلک جاتا ہے مگر یہ کہ میں اس کا خیال رکھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو اس طرح تکبر کی وجہ سے کرتے ہیں۔

(٦١)----وعن عكرمة، قال: رأيتُ ابن عباس يأتزرُ فيضعُ حاشيةَ إزاره من مُقَدَّمِه على ظهرِ قدمِه، ويرفعُ من مُؤَخَّرِه قلتُ: لم تأتـزر هذه الإزرة؟ قال: رأيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتـزرها۔ (رواه أبوداود)

ترجمہ...... حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ لنگی کے حاشیہ کو اگلی جانب سے اپنے قدموں کی پشت پر کر لیتے تھے اور اپنی لنگی کو پیچھے کی جانب سے اونچا رکھتے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اس طرح سے لنگی کیوں باندھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طریقے سے لنگی باندھتے ہوئے دیکھا ہے۔ (یعنی آپ ﷺ لنگی اس انداز سے باندھتے تھے کہ اس کی اگلی جانب نیچے کی طرف ہوتی تھی اور پچھلی جانب اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی تھی۔)

(٦٢)-----وعن عُبادةَ رضي الله عنه، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عليكم بالعمائمِ، فإنها سيماء الملائكةِ، وارخوهاخلف ظهوركم۔ (رواه البيهقي)

ترجمہ...... حضرت عبادة بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم عمامے اختیار کرو اس لئے کہ یہ فرشتوں کی علامت ہے اور اس کے کناروں کو اپنی کمروں کے پیچھے لٹکایا کرو۔

عمامہ کا معنی:-

عمامے کے بارے میں پہلے بھی کچھ حدیثیں گزر چکی ہیں، عمامہ عربی زبان کا لفظ ہے، عین کے کسرے کے ساتھ اور یہ مشتق ہے عَمَّ یَعَمُّ سے جس کا معنی شامل ہونا اور محیط ہونا ہے اور عمامہ سے مراد کپڑا ہے جس کو سر پر لپیٹا جائے اور سر کو اس میں چھپالیا جائے۔ چنانچہ بعض اہل لغت نے عمامہ کی تعریف میں کہا ہے کہ سر کا ایسا لباس جو معروف ہے اور بعض نے اس کی تعریف میں کہا کہ وہ کپڑا جس کے ذریعہ آدمی اپنے سر کو چھپاتا ہے اور جس کو سر پر لپیٹا جاتا ہے، کیونکہ عمامہ ایک معروف چیز ہے اس لئے اس کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں عمامہ بکثرت مروج تھا اس لئے عرب شعراء کی کلام میں بھی اس کا بکثرت تذکرہ ملتا ہے:

فجاءت بہ سبط العظام کأنما　　　عمامتہ بین الرجال لواءُ

کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تو وہ بڑی بڑی ہڈیوں والا تھا اور اب یہ صورت حال ہے کہ جب کچھ لوگوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو لمبے قد کی وجہ سے اس کا عمامہ جھنڈے کا کام بھی دیتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عربوں میں عمامہ بکثرت مروج تھا اور ان کا ایک عام لباس تھا اور عرب شعراء کی کلام میں بھی اس کا بکثرت تذکرہ ملتا ہے اور یہ ان کے لئے ضرورت کا لباس بھی تھا، اس لئے کہ عربوں کا موسم کچھ ایسا تھا کہ بعض اوقات سردی زیادہ پڑتی ہے اس کے بچاؤ میں بھی مفید ہوتا ہے اور گرمی بھی شدید پڑتی ہے اور شدید گرمی میں بھی سر پر بھاری کپڑا رکھنا مفید ہوتا ہے۔ تو ایک ضرورت بھی تھی، اس کے علاوہ اس کو ایک عزت کا لباس بھی سمجھا جاتا ہے چنانچہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: عُمِّمَ الرَّجُلُ فلاں آدمی کو عمامہ پہنایا گیا اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو سردار بنایا گیا کیونکہ جس کو سرداری سونپی جاتی تھی عموماً بطور رمز اور علامت کے اس کے سر پر پگڑی باندھی جاتی تھی اس کی دستار بندی کی جاتی تھی۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ اس وقت عجم اور فارس میں سردار بناتے وقت تاج پہنانے کا رواج تھا چنانچہ وہاں ان کے بارے میں جب کہا جائے کہ کسی کو سردار بنایا گیا تو کہا جاتا تھا کہ تُوِّجَ فُلانٌ[1] فلاں کو تاج پہنایا گیا۔ تو جو حیثیت ان کے ہاں تاج کی تھی وہی حیثیت عربوں کے ہاں عمامہ کی تھی کہ تاج تو ان کے ہاں ہوتے ہی نہیں تھے ویسے ہی غربت تھی، سادگی تھی اس لئے جو کام وہ تاج سے لیتے تھے وہ کام عرب لوگ پگڑی سے لے لیا کرتے تھے اور کسی کو سردار بناتے وقت تاج پوشی کی بجائے دستار بندی کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ اس کی سند پر آگے چل کر ہم گفتگو کریں گے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **العمائم تیجان العرب**۔[2] کہ پگڑیاں عربوں کے تاج ہیں اس رسم سے اس حدیث کا مطلب سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا۔

---

(۱) تاج العروس فصل العین من باب المیم ج ۸ / ص ۴۱۰ ..... (۲) کنز العمال کتاب المعیشۃ والعادات الخ الثالث فرع فی العمائم ج ۱۵ / ص ۴۱۱۳۲

عمامہ کا مسنون ہونا:-

عمامہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے اس لئے کہ متفرق احادیث کو ملانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے بکثرت عمامہ باندھا ہے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی عمامہ مروج تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے کتاب اللباس میں باب العمائم قائم کیا ہے۔(۱) اس میں ایسی حدیث ذکر نہیں کی جس میں صراحتاً حضور اقدس ﷺ کے عمامہ باندھنے کا ذکر ہو اس لئے کہ یہ حدیثیں بظاہر امام بخاری رحمہ اللہ علیہ کی شرط کے مطابق نہیں ہوں گی، یہ حدیثیں صحیح اور ثابت ہیں اور سب کو مجموعی طور پر ملانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بکثرت عمامہ باندھا اور آپ ﷺ کے زمانے میں مروج تھا اور ثابت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ جب عربوں میں ویسے ہی ایک عام لباس تھا تو بظاہر نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس کو استعمال کیا ہو گا۔ اثبات کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں نفی کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اگر نہ باندھا ہوتا اس کے لئے ضرورت تھی کیوں کہ عربوں میں عام استعمال کیا جاتا تھا، تو اگر نہ باندھا ہوتا تو اس کے لئے دلیل کی ضرورت تھی لیکن باندھنے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔ تو بہر حال حدیثیں بھی ہیں لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہیں اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں ایک اور حدیث لائے ہیں اور وہی یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ محرم (احرام باندھنے والے) شلوار بھی نہ پہنے، قمیص بھی نہ پہنے اور عمامہ بھی نہ باندھے۔ یہ بات امام بخاری رحمہ اللہ علیہ یوں ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جو کہا کہ محرم عمامہ نہ باندھے تو معلوم ہوا کہ اس وقت لوگ عمامہ باندھا کرتے تھے اور اس ماحول میں بکثرت مروج تھا، تبھی تو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو اس انداز سے امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے اس بات کو ثابت کیا ہے لیکن اس انداز سے نہ بھی ہو تو بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ عربوں کے ہاں بھی ایک عام لباس تھا۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ میں بھی عمامہ باندھنے کا رواج تھا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے یعنی ان چیزوں میں سے ہے جن کو آپ ﷺ نے بطور عادت کے اپنایا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی سنن دو طرح کی ہیں ایک سنن عادیہ اور ایک سنن شرعیہ۔

سنن شرعیہ:-

سنن شرعیہ سے مراد وہ کام جو حضور اقدس ﷺ نے کیا یا اس کی ترغیب دی اس وجہ سے کہ وہ شرعاً

---

(۱) صحیح البخاری کتاب اللباس باب العمائم ج ۲/ ص ۸۶۳

مطلوب ہے اور اس پر کوئی اخروی ثواب ہے، ایسا کام سنت شرعیہ اور مستحب کہلائے گا، جیسے کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا یہ حضور ﷺ کی سنت سے ہے، کھانے کے بعد الحمد للہ یا مخصوص دعائیں پڑھنا یہ حضور ﷺ کی سنت ہے اور سنن شرعیہ میں سے ہے، اشراق آپ ﷺ کی سنت ہے اور سنن شرعیہ میں سے ہے۔

سنن عادیہ:-

سنن عادیہ سے مراد وہ کام ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مسئلہ شرعیہ کے نہیں کئے بلکہ بطور عادت کے کئے ہیں جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گندم کی روٹی بہت کم کھائی ہے زیادہ تر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں پر یا جو پر اکتفا فرمایا ہے لیکن کھجوروں اور جو پر اکتفا کرنا یہ شرعاً سنت نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت عادی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ پر سواری کی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اونٹ پر سواری شریعت میں بذات خود مطلوب ہے بلکہ بطور عادت کے کی ہے، بہت ساری چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق سے تناول فرمایا ہے لیکن بطور مسئلہ شرعیہ کے نہیں بلکہ بطور عادت کے ایسے کاموں کو سنن عادیہ کہا جاتا ہے۔

سنن عادیہ کا حکم:-

ان کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ شریعت میں یہ بذات خود مطلوب اور مقصود نہیں ہیں لیکن بہر حال آپ ﷺ کے ساتھ محبت کی وجہ سے ان چیزوں میں آپ ﷺ کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا اچھا کام ہے اور اس طرح کرنا خیر و برکت سے خالی نہیں ہے کیونکہ یہ آپ ﷺ کی محبت کی علامت ہے جتنی آپ ﷺ کے ساتھ مشابہت ہو جائے اچھا ہے لیکن ان کا درجہ بہر حال عام مستحبات اور آداب سے بھی کم ہوتا ہے۔

امر ارشادی:-

یہیں پہ ایک بات اور بھی سمجھ لیں کہ بعض کام ایسے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عادت کے کئے اسی طرح بعض کام ایسے ہیں جن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بھی دیا لیکن اس کے باوجود وہ شرعاً مستحب نہیں ہیں اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حکم بطور مسئلہ شرعیہ کے نہیں دیا بلکہ ان کا حکم اس وجہ سے دیا کہ وہ ایک مفید کام ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھانا کھاتے وقت جوتے اتار لیا کرو اس لئے کہ اس میں تمہارے قدموں کو زیادہ راحت ملے گی یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ گوشت کو چھری وغیرہ سے کاٹ کر کھانے کی بجائے دانتوں سے نوچ کر کھاؤ اس لئے کہ یہ ہضم زیادہ ہوتا ہے اور اس میں مزا بھی زیادہ آتا ہے علماء کی اصطلاح میں اس طرح کے امر کو امر ارشادی کہا جاتا ہے۔

امر ارشادی کا حکم:-

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کو اس طرح امر فرمایا ان کا درجہ بھی استحباب شرعی سے کم ہے لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا اس لئے ان کو اپنالینا چاہئے ان کو اپنانا اچھی بات ہے لیکن اگر کسی نے ان کو اختیار نہیں کیا تو صرف یہی نہیں کہ گناہ نہیں، ملامت نہیں بلکہ خلاف اولیٰ بھی نہیں ہے۔

عمامہ کی بات چل رہی تھی کہ عمامہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے، سنن شرعیہ میں سے نہیں ہے۔

سنن شرعیہ اور سنن عادیہ میں فرق ضروری ہے:-

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیا کہ سنت ہے اور عادت ہے بس جو آپ ﷺ نے کیا وہ سنت ہے لیکن یہ بہت بڑی علمی غلطی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے افعال میں فرق کرنا پڑے گا کہ بعض کام آپ ﷺ نے اس لئے کئے ہیں کہ شرعاً مطلوب تھے وہ سنن شرعیہ ہوں گے اور آپ ﷺ نے بہت سارے کام اس لئے کئے کہ آپ ﷺ کی عادت تھی شرعاً مطلوب نہیں تھے وگرنہ یہ کہنا پڑے گا کہ آپ ﷺ نے زیادہ تر سواری اونٹ پر کی ہے لہٰذا اونٹ پر سفر کرنا سنت ہے حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ اونٹ یا گھوڑے پر سفر کرنا سنت ہے اور کوئی بھی نہیں کہتا کہ یہ سنت متروک ہو چکی ہے اس کو زندہ کرنا چاہئے۔ اس طرح کی بکثرت مثالیں ہیں آپ ﷺ نے بکثرت ازار اور رداء پہنا یا آپ نے جبہ یا قمیص پہنی لیکن اگر کوئی اس طرح کا لباس پہنے جس طرح کا ہم لباس پہنے ہوئے ہیں اور ہمارے اکثر صلحاء اور علماء پہنتے ہیں یہ بمشکل کسی حدیث سے ثابت ہوگا۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہیں گے کہ جنہوں نے یہ لباس پہنا وہ سنت سے ہٹ گئے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی لباس پہنے ہیں وہ بطور عادت کے پہنے ہیں بطور مسئلہ شرعیہ کے نہیں پہنے۔

سنن عادیہ اور سنن شرعیہ کے فرق کا انکار کرنا بہت بڑی علمی غلطی ہے ورنہ بہت سارے ایسے کاموں کو سنت کہنا پڑے گا جو آج تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔

پلیٹ میں سالن نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کھایا لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاتا کہ سنت کو اپناؤ اور پلیٹ میں نکال کر نہ کھاؤ اس لئے کہ یہ عادات میں سے ہے، سنن شرعیہ میں سے نہیں

ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسجد میں نمازیں پڑھائیں وہ ایک چھپر تھا گویا چھپر کی مسجد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواظبت فرمائی ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ گنجائش نہیں تھی کیونکہ آخر وقت میں وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ مسجد اچھی بنوا لیتے، یہ نہ بھی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا پہاڑ کو سونا بنا دینے کا تو اللہ تعالیٰ سے فرماتے کہ ویسے سونا نہیں چاہئے لیکن اتنا ہو کہ مسجد پکی بنالوں لیکن ایسے نہیں ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپر کی مسجد پر بلا ترک مواظبت فرمائی ہے لیکن کوئی نہیں کہتا کہ چھپر کی مسجد سنت ہے اور اس سنت کو زندہ کرنا چاہئے اور ساری مسجدیں تبدیل ہونی چاہئیں کیوں؟ اس لئے کہ یہ امور عادت میں سے ہے، مسجد امور شرعیہ میں سے ہے لیکن عمارت کیسی ہو کس چیز کی بنی ہوئی ہو اس کی چھت کیسی ہو، لمبائی کتنی ہو یہ ساری کی ساری چیزیں عادت کی قبیل سے ہیں۔

اگر سنن عادیہ میں اور شرعیہ میں فرق نہیں کریں گے تو بہت سارے ایسے کام سنت بن جائیں گے جن کو کوئی بھی سنت نہیں کہتا۔

عمامہ حضور اقدس ﷺ کی سنن عادیہ میں سے ہے اس کا پہننا خیر و برکت سے خالی نہیں ہے بعض احادیث میں حضور اقدس ﷺ نے عمامے کی فضیلت بھی بیان کی ہے لیکن وہ حدیثیں سنداً ضعیف ہیں۔

عمامے کے بارے میں احادیث کا خلاصہ :-

عمامے کے بارے میں اگر حدیثوں کا جائزہ لیں تو بنیادی طور پر تین طرح کی احادیث سامنے آتی ہیں:

(۱)........... وہ احادیث جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامہ باندھنے یا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمامے باندھنے کا ذکر ہے اس طرح کی حدیثیں معتدبہ تعداد میں ہیں اور ان میں سے کئی حدیثیں سنداً صحیح بھی ہیں اور یہ بے غبار طریقے سے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ کرام نے عمامہ باندھا ہے عملی حدیثیں ثابت ہیں ان کے ثبوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)........... دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جن میں عمامے کا ذکر بھی ہے اور عمامے کا فائدہ بھی ذکر کیا ہے لیکن کوئی اجر و ثواب ذکر نہیں کیا گیا۔ اس طرح کی تین حدیثیں معروف ہیں اور تینوں ضعیف ہیں:

(۱) ان میں سے پہلی حدیث یہی ہے، حضرت عبادۃ بن صابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **علیکم بالعمائم فإنها سِیماء الملائکة۔**

یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے بیہقی کی شعب الایمان[1] کے حوالے سے نقل کی ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے

---

(۱) ج:۵: ص۱۷۶ احدیث نمبر ۶۲۶۲

اس لئے کہ اس حدیث کے راوی احوص بن حکیم ضعیف ہیں۔ یہ ان راویوں میں سے ہیں جن کو غلطیاں بکثرت لگتی تھیں اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کی حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ علیہ نے الجامع الصغیر میں یہ حدیث نقل کر کے (ض) کی علامت لگائی ہے یعنی یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس حدیث کی سند میں اور بھی کئی راوی ضعیف ہیں علامہ ذہبی رحمہ اللہ علیہ نے محمد بن الفرج مصری کے تذکرے میں اس حدیث کے بارے میں **أتی بخبر منکر** کہا ہے[1] کہ اس نے یہ منکر حدیث ذکر کی ہے، بہر حال یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔

(۲) دوسری حدیث جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **العمائم تیجان العرب والحبوۃ حیطان العرب والاضطجاع فی المساجد رباط المؤمنین۔**[2] کہ پگڑیاں عربوں کے تاج ہیں اور احتباء یعنی گوٹ مار کر بیٹھنا عربوں کی دیواریں ہیں یعنی اگر ٹیک لگانے کی جگہ نہ ملے تو گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں تو اس سے آدمی کو سہارا مل جاتا ہے۔ مسجدوں میں رہنا ایمان والوں کا رباط ہے، رباط کا اصل معنی سرحد پر پہرا دینا یعنی اس کا بھی وہی درجہ ہے۔ یہ حدیث بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس لئے کہ اس کے راوی یوسف بن ابراہیم المروزی کو اکثر محدثین نے متروک قرار دیا ہے اور یحیٰی بن معین نے ان کو کذاب بھی قرار دیا ہے یعنی ایسے راوی جن پر کذب کی تہمت ہے۔

(۳) تیسری حدیث جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اعتمُّوا تزدادوا حِلمًا۔** اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان[3] اور طبرانی نے معجم کبیر[4] میں روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک[5] میں روایت کیا ہے۔

یہ حدیث بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس لئے کہ اس حدیث کا مدار عبداللہ بن ابی حمید راوی پر ہے جو ضعیف ہیں۔[6] ان کو اکثر محدثین نے متروک یا منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے: **یروی عن ابی الملیح العجائب** ۔ کہ یہ ابوالملیح سے عجیب وغریب روایتیں کرتا ہے اور اس نے **اعتموا تزدادوا حلمًا** والی روایت بھی ابوالملیح سے روایت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر محدثین نے اس حدیث کو صراحۃً ضعیف قرار دیا ہے بلکہ بعض نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے لیکن اگر موضوع نہ بھی ہو پھر بھی اس میں ضعف شدید موجود ہے۔

حاکم نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ صحیح علیٰ شرط الشیخین ہے لیکن حاکم کے بارے میں یہ

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۴/ ص ۴ ...... (۲) شعب الایمان ج ۵/ ص ۱۷۶ عن علی قولہ سند الشہاب (مرفوعا) ج ۱/ ص ۷۵ ...... (۳) ج ۵/ ص ۱۷۶
(۴) ج ۱/ ص ۱۹۴ ...... (۵) ج ۴/ ص ۱۹۳ ...... (۶) دیکھئے میزان الاعتدال ج ۳/ ص ۵، معجم کبیر طبرانی کا حاشیہ ج ۱/ ص ۱۹۴

بات مشہور و معروف ہے کہ یہ حدیث کو صحیح قرار دینے میں بہت متساہل ہیں اور بعض اوقات انتہائی ضعیف حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔ چنانچہ حاکم کے اس فیصلے پر علامہ ذہبی رحمہ اللہ علیہ نے بھی اعتراض کیا ہے (ذہبی نے مستدرک حاکم کی تلخیص لکھی ہے۔) اور کہا ہے کہ اس میں عبید اللہ بن ابی حمید متروک راوی ہیں، امام احمد نے اسے متروک قرار دیا ہے۔

اس طریقے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حاکم کی یہ بات نقل کی ہے اور یہ کہا ہے: **وقد صححه الحاكم فلم يصب۔**[1] کہ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے لیکن یہ کہہ کر درست کام نہیں کیا اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک شاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے موجود ہے جسے بزاز وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ بزاز کی سند میں بھی عبید اللہ بن ابی حمید ہیں۔[2] گویا عبید اللہ کبھی ابو الملیح عن ابیہ سے روایت کرتا ہے اور کبھی حضرت ابن عباس کی روایت سے روایت کر دیتا تھا لہٰذا یہ حدیث بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دوسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عمامے کا فائدہ ذکر فرمایا اگرچہ اجر و ثواب کا تذکرہ نہیں فرمایا لیکن یہ حدیثیں ضعیف ہیں۔

تعدد طرق سے حدیث کا ضعف زائل ہونا:۔

یہ بات معروف ہے کہ تعدد طرق سے حدیث کا ضعف زائل ہو جاتا ہے یہ اصول علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جب کہ ضعف شدید نہ ہو اور خاص طور پر جب ضعف کسی راوی کے متہم بالکذب ہونے کی وجہ سے ہو تو وہ تعدد طرق سے زائل نہیں ہوتا اور یہاں بھی یہی صورت حال معلوم ہوتی ہے کہ ہر ہر حدیث کا ضعف انفرادی طور پر ایسا شدید ہے کہ دو تین طرق اور مل جائیں تو اس سے یہ ضعف زائل نہیں ہوتا۔

اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو ثابت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ یہ حسن لغیرہ ہوگی یعنی ضعف شدید نہیں رہے گا اور پھر ان حدیثوں سے عمومی طور پر عمامے کا سنت شرعیہ ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامے کے عموماً فوائد بیان کئے ہیں کہ اس سے حلم اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے یا یہ عربوں کے لئے تاج ہے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان احادیث سے عمامہ کا سنت شرعیہ ہونا ثابت کرنا

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب العمائم ج۱۰/ ص ۲۷۴ ..... (۲) مجمع الزوائد ج ۵/ ص ۱۲۲

درست نہیں خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ حدیثوں میں ضعف شدید موجود ہے اور تعدد طرق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضعف شدید نہیں رہا کم ہو گیا ہے۔

تیسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں عمامے پر اجر و ثواب کا ذکر ہے مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ عمامے کے ساتھ ایک رکعت پڑھی جائے وہ ان ستر رکعتوں کے برابر ہے جو بغیر عمامے کے پڑھی جائیں اور بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ عمامے کے ساتھ نماز پڑھنا دس ہزار نیکیوں کے برابر ہے وغیرہ۔

یہ حدیثیں پچھلی قسم کی حدیثوں سے بھی زیادہ ضعیف ہیں بلکہ موضوع ہیں، اکثر محدثین نے ان پر وضع کا حکم لگایا ہے ان کی سندوں پر الگ الگ گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ (1) البتہ ایک عمومی بات یہ ہے کہ محدثین نے وضع کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ذکر کی ہے کہ معمولی کام پر بہت زیادہ اجر و ثواب کا وعدہ ہو اور یہاں بھی یہی بات ہے عمامے کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن نماز میں جتنی اہمیت جماعت کی ہے اتنی اہمیت عمامے کی نہیں ہے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ستائیس (۲۷) درجے کا ثواب ہے ایک روایت میں پچیس (۲۵) ہے۔ جماعت جو مطلوب شرعی اور شعائر اسلام میں سے ہے اس سے ستائیس (۲۷) درجے ثواب ملے اور عمامے سے ستر (۷۰) درجے ملے۔

یہ محض قیاس نہیں ہے محدثین نے یہ باتیں لکھی ہیں اس طرح کی علامات کو محدثین نے وضع کی علامت قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے عمامے کو نماز کے آداب میں سے شمار نہیں کیا ویسے عمامہ سنت نبویہ ہے لیکن نماز کے وقت خصوصیت ہو کہ نماز کے وقت اہتمام سے باندھا جائے اس کو عموماً علماء نے تسلیم نہیں کیا اس لئے کہ اس طرح کی حدیثیں موضوع ہیں۔

عمامے کی احادیث کا یہ اجمالی خلاصہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامہ باندھنا ثابت ہے اس لئے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے لیکن اس کا سنت شرعیہ ہونا محل نظر ہے اس لئے کہ قولی حدیثیں یا تو موضوع ہیں یا ان میں ضعف شدید ہے کم از کم یہ کہ ضعیف ہیں اور ان سے عمامہ کا مطلوب شرعی اور موجب ثواب اخروی ہونا واضح نہیں ہوتا۔

فضائل میں ضعیف حدیث کا قبول ہونا:۔

ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ فضائل میں ضعیف حدیثیں قابل قبول ہوتی ہیں لیکن یہ قاعدہ بھی علی الاطلاق نہیں ہے، بہت سارے مسائل میں اس سے بھی غلط فہمی ہو جاتی ہے بلکہ اس کے لئے شرطیں ہیں:

---

(۱) ملاحظہ ہو سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ للألبانی ج۱ / ص ۱۵۸ وما بعد

(۱)..........ایک شرط یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو۔

(۲)..........دوسری شرط یہ ہے کہ اس کام کا موجب فضیلت اور باعث اجر و ثواب ہونا فی الجملہ دلائل صحیحہ سے ثابت ہو اس کے ساتھ اس کی فضیلت کسی ضعیف حدیث میں ہو تو اس کو مان لیں گے مثلاً فی الجملہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نماز فضیلت کا کام ہے لہٰذا اگر نماز کی کوئی فضیلت ضعیف حدیث میں آئے تو اس ضعیف حدیث کو بھی مانا جاتا ہے یا جماعت اور تکبیر اولیٰ کی پابندی کا باعث اجر و فضیلت ہونا فی نفسہٖ ثابت ہے۔ اب حدیث میں ہے کہ جو چالیس دن تکبیر اولیٰ کی پابندی کرے گا تو اس کے لئے نفاق سے براءت لکھ دی جائے گی۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن بعض حضرات نے کہا کہ فضائل میں ہے اس لئے قابل قبول ہے اس لئے کہ اس کام کا بذات خود باعث اجر و ثواب ہونا دوسرے دلائل صحیحہ سے ثابت ہے اگر باعث اجر ہونا کسی اور دلیل سے ثابت نہ ہو تو اس میں حدیث ضعیف حجت نہیں ہوا کرتی۔

یہ بات میں نے ذرا تفصیل سے اس لئے عرض کر دی کہ آج کل عمامے کے بارے میں افراط و تفریط ہو رہا ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک سنت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے اور اس کو اختیار کرنا سعادت کی بات ہے۔ لیکن اس پر بہت زیادہ زور دینا اور اس پر زیادہ اصرار کرنا اور عمامہ نہ باندھنے والے کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اس میں کوئی دینی اور شرعی کمی ہے یہ تجاوز عن الحدود ہے اس لئے کہ عمامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تو ہے لیکن سنن عادیہ میں سے ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سنن عادیہ پر سب کا عمل نہیں ہے، کوئی کسی سنت کا تارک ہے، کوئی کسی سنت کا بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن شرعیہ پر بھی پورا عمل نہیں ہوتا، اشراق سارے لوگ پابندی سے نہیں پڑھتے، ایام بیض کا روزہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے یہ سنن شرعیہ میں سے ہے اور بالکل صحیح احادیث سے ثابت ہے لیکن سارے لوگ نہیں رکھتے، خوش اخلاقی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے لیکن سارے لوگوں کے اندر موجود نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی سنت ہے کہ حضرت انسؓ نے آپ کی دس (۱۰) سال تک خدمت کی لیکن دس (۱۰) سال میں ایک دفعہ بھی نہ جھڑکا، نہ ڈانٹا، یہ بھی سنت ہے اور یہ ساری کی ساری سنن شرعیہ ہیں بلکہ ان چیزوں کی ترغیبات احادیث میں آتی ہیں لیکن یہ سنتیں اگر چھوٹتی ہیں تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے لیکن پگڑی چھوٹ جائے تو بڑی اہم ایک سنت چھوٹ گئی، یہ چند مثالیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ان سنتوں کو واجب کا درجہ دے دیں لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بہر حال اس طرح کی بے شمار سنتیں ہیں جو عمامے سے اہم ہیں اور عمامے سے زیادہ متروک ہیں، ہمارے معاشرے میں اب عمامے باندھنے والے تو آپ کو مل جائیں گے لیکن اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہ سلوک جو نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کیا ہے وہ شاید ہی ڈھونڈنے سے کہیں کوئی ملے، تو کیا یہ سنت عمامے سے زیادہ متروک نہیں ہے۔ تو پھر اس سنت کے احیاء کی اتنی فکر اور اس کا کبھی نام بھی نہ لیا جائے اور فرض کر لیں کہ ایک آدمی اس سنت پر تو عمل کر رہا ہے اس کے اخلاق بھی بہت اچھے، وہ اشراق بھی پڑھتا ہے، سب کچھ کرتا ہے اور دوسرا آدمی ان چیزوں کا اتنا پابند نہیں ہے اور اس کا اخلاق بھی بمشکل گزارہ ہے لیکن بڑی ساری پگڑی سر پر ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ متبع سنت ہے تو یہ حدود شرعیہ سے تجاوز ہے ہر چیز کو اپنی شرعی حد پر رکھنا چاہئے اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور میں نے سنن شرعیہ کی مثالیں دی ہیں، بہت ساری سنن عادیہ بھی ایسی ہیں جو عمامے کی نسبت زیادہ صحیح احادیث سے ثابت ہیں مثلاً تلبینہ یہ جو ایک خاص قسم کا دلیہ ہوتا ہے اور عام طور پر بیماروں کو پلایا جاتا تھا اور بخاری بخاری وغیرہ کی حدیثوں میں آتا ہے کہ یہ بیمار کے دل کو مضبوط کرتا ہے[1] اور اس کے باطن کو پیٹ وغیرہ کو صاف کرتا ہے اور جب کوئی بیمار ہوتا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے اس کو تلبینہ پلاؤ اور یہ بخاری وغیرہ کی حدیثیں ہیں یہ محض سنن عادیہ میں سے ہے لیکن آج کوئی بھی بیمار ہو کر اس طرح کا تلبینہ استعمال نہیں کرتا جس طرح کا حدیثوں میں آتا ہے، جو کا خاص قسم کا دلیہ لیکن کبھی کہا یہ سنت متروک ہو چکی ہے اس کو زندہ کریں کیوں؟ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ یہ سنن عادیہ میں سے ہے اور تو اور شہد کا شفاء ہونا تو قرآن میں آتا ہے لیکن ہمارے ہاں شہد بہت کم استعمال ہوتا ہے اور اگر شہد کسی جگہ بالکل استعمال نہ ہوتا ہو تو یہ نہیں ہوگا کہ اس سنت کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائے اس لئے کہ سنتوں کو زندہ کرنے پر سو شہیدوں کا اجر، یہ اصل میں سنن شرعیہ کے بارے میں ہے جو شریعت میں مطلوب ہیں بذات خود سنن عادیہ کے بارے میں نہیں ہے۔ کل کو کوئی کہے کہ اونٹوں پر سواری کی سنت بھی زندہ کرو اور ازار اور ردا کی سنت بھی زندہ کرو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دھاری دار جبہ بکثرت پہنا بھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند بھی تھا تو اس کو زندہ کرو، سفید لباس کا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ حکم دیا اور صحیح حدیثوں سے ثابت ہے لیکن اگر کسی کے سر پر عمامہ نہ ہو تو یہ خیال ہوتا ہے کہ سنت کا تارک ہے لیکن اگر اس نے سفید کپڑے نہیں پہنے ہوئے تو یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ تارک سنت ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ جس رنگ کے اس نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ رنگ کسی بھی حدیث سے ثابت نہ ہو لیکن پھر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ تارک سنت ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ ساری کی ساری باتیں عادات کے قبیل سے ہیں ان سنتوں میں سے نہیں ہیں جن کے احیاء پر زور دینے کی ضرورت ہو، اگر کوئی اپنے عمل میں سنت سمجھ کر عمامے کا اہتمام کرتا ہے تو یہ اچھی بات

---

۱) مشکوٰۃ المصابیح کتاب الاطعمہ الفصل الاول ج ۲/ ص ۳۶۴

ہے لیکن دوسروں پر اتنا زور دینا بہر حال مناسب نہیں ہے، ہر چیز کو اپنی شرعی حدود پر رکھنا چاہئے۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لیجئے اس سے آپ کو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ سنن عادیہ میں یہ اہتمام نہیں ہوتا کہ ان کو زندہ کیا جائے زندہ کرنے کے لئے کوشش کی جائے مہم چلائی جائے یہ بات احادیث میں آتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بھی حدیث ہے، دوسروں کی بھی حدیثیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عمامہ باندھتے تھے تو زیادہ تر عمامے کا شملہ اور کنارہ پیچھے کندھوں کے درمیان میں چھوڑا کرتے تھے اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اسی کے ساتھ امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ان کے بیٹے سالم اور اسی طریقے سے قاسم بن محمد بھی ایسے ہی کرتے تھے یہ بات نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری(۱) میں اسی باب العمائم میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے عامر بن عبداللہ بن زبیر کے علاوہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا جب امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں اس پر عمل ہے اس پر عمل نہیں، تو اہل مدینہ کی بات کر رہے ہوتے ہیں اور اہل مدینہ میں بھی شیوخ کی اور اس وقت امام مالک رحمہ اللہ کے اوپر کے درجے کے شیوخ سارے تابعین تھے اور بڑے بڑے لوگ تھے، امام مالک کے کہنے کا مطلب یہ ہو گا کہ مدینے کے اندر ان میں سے کسی کو بھی ایسے کرتے ہوئے نہیں دیکھا، تو دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے عمامہ کا شملہ پیچھے چھوڑا جائے لیکن امام مالک رحمہ اللہ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ یہ سنت متروک ہو چکی ہے اور بڑے بڑے مشائخ چھوڑے ہوئے ہیں لیکن امام مالک رحمہ اللہ بے تکلفی سے ایسے کہہ رہے ہیں کہ کوئی بھی ایسے نہیں کرتا باقی اس کو زندہ کرنے کی مہم چلائی جائے اس کی فکر نہیں۔

اکیلی ٹوپی سر پر رکھنے کا ثبوت:۔

جس طرح عمامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے ثابت ہے اسی طریقہ سے ٹوپی بھی ثابت ہے اول تو یہ ہے کہ ثابت نہ بھی ہو تو عادات میں اصل اباحت ہوتی ہے کسی چیز کا جواز ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ورنہ کل کو کوئی کہے گا کہ بریانی کی کوئی حدیث لاؤ، قورمے کی کوئی حدیث لاؤ یا واسکٹ کی کوئی حدیث لاؤ اور بے شمار لباس ہیں جن کی کوئی حدیث نہیں ہے۔ لیکن بہر حال فی الجملہ ٹوپی بھی سلف سے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے ثابت ہے اس لئے اکیلی ٹوپی سر پر رکھنا یہ بغیر کسی

---

(۱) فتح الباری کتاب للباس باب العمائم ج۱۰/ص ۲۲۴

کراہت کے جائز ہے اور خلاف اولیٰ بھی نہیں ہے۔ چند روایات میں آپ کے سامنے ذکر کرتا ہوں مشکوۃ سے ابتداء کرتے ہیں:

(۱)......... صفحہ نمبر ۳۳۵ پر فضالہ بن عبید کی حدیث ہے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے پہلی قسم کا درجہ بیان کرتے ہوئے حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ جنت میں اس کا درجہ اتنا اونچا ہوگا کہ لوگ نظریں اٹھا کر اوپر دیکھیں گے اور یہ بات کرتے ہوئے خود نظر اوپر اٹھا کر دکھائی اور جب نظر اوپر اٹھا کر دکھائی تو آپ کی ٹوپی پیچھے گر گئی: **ورفع راسه حتّٰی سقطت قلنسوته** ۔ البتہ راوی کہتے ہیں کہ: **لا ادری اقلنسوة عمر اراد اقلنسوة النبی صلی الله علیه وسلم** کہ یہ مجھے یقین نہیں ہے، یاد نہیں اچھی طرح کہ فضالہ بن عبید نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ٹوپی کی بات کی یا نبی کریم ﷺ کی لیکن یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کی تھی۔ حضور اقدس ﷺ کی تھی پھر تو حجت ہے ہی اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ٹوپی تھی تو پھر بھی ہمارے لئے حجت ہے۔

(۲)......... صحیح مسلم "کتاب الجنائز باب فی عیادۃ المرضی" اس میں ایک لمبی حدیث ہے کہ ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی عیادت کے لئے ہمارے ساتھ کون کون چلے گا چنانچہ کچھ حضرات تیار ہوگئے دس سے اوپر آدمی تھے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **ونحن بضعة عشر ماعلینا نعال ولا خفاف ولا قلانس ولاقمص نمشی فی تلك السباخ حتّٰی حئناه فاستاخر قومه من حوله حتّٰی دنا رسول الله صلی الله علیه وسلم اصحابه الذین معه** ۔ اپنی حالت کا کمزور ہونا بیان کر رہے ہیں کہ اس وقت ہماری حالت یہ تھی کہ نہ تو ہمارے پاؤں میں جوتے تھے نہ ہی موزے تھے، سر پہ ٹوپیاں تک نہیں تھیں اور قمیصیں بھی نہیں تھیں اور اسی حالت میں ہم اس پتھریلی زمین کے اندر جا رہے تھے۔ یہاں دیکھئے جیسے موزوں اور جوتوں کی نفی کی اسی طرح ٹوپیوں کی بھی نفی کی ہے تو پتہ چلا کہ ٹوپیاں پہنی جاتی تھیں اس زمانے میں تب ہی نفی کی ہے جیسے موزے وغیرہ، جوتے وغیرہ پہنے جاتے تھے اسی طرح ٹوپیاں بھی پہنی جاتی تھیں تبھی تو نفی کی ہے۔ یہ اسی طرح کا استدلال ہے جیسے امام بخاری رحمہ اللہ نے عمامے پر کیا تھا کہ آپ نے فرمایا کہ محرم عمامہ نہ باندھے۔[1] تو پتہ چلا کہ عمامہ باندھا جاتا تھا۔

(۳)......... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ **اِنَّ رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یَلبسُ قَلنسوۃً بَیْضاءَ** ۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی پہنا کرتے تھے یہ حدیث بیہقی رحمہ اللہ

(۱) صحیح البخاری کتاب المناسك باب ما لا یلبس المحرم من الثیاب ج۱/ص۲۰۸

نے شعب الایمان (ج ۵ / ص ۱۷۵) میں روایت کی ہے البتہ اس کی سند میں ضعف ہے۔

البتہ اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث طبرانی رحمہ اللہ نے معجم اوسط میں بھی روایت کی ہے اس کے لفظ ہیں: **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلبسُ کمۃ بیضاء**۔ کمہ بھی ٹوپی کو کہتے ہیں اس حدیث کی بھی سند ضعیف ہے۔

(۴)......... ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ میں حضرت وابصۃ بن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے ہلال بن یساف کہتے ہیں کہ جب ہم وابصہ بن معبد کے پاس گئے تو دیکھا کہ **فإذا علیہ قلنسوۃ لاطیۃ ذات اذنین**[۱] کہ ان کے سر پر ایک ٹوپی تھی جو سر کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور وہ دو کانوں والی تھی یعنی دو کناریاں نکلی ہوئی تھیں۔

(۵)......... آپ پہلے ترمذی کے حوالے سے حدیث پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابو کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ **کان کمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطحا**[۲] نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی ٹوپیاں زیادہ اونچی نہیں ہوتی تھیں۔

(۶)......... امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الجمعۃ باب استعانۃ الید فی الصلاۃ میں ابو اسحاق سبیعی کا اثر نقل کیا ہے تابعین میں سے ہیں کہ ان کی ٹوپی نماز کے اندر گر گئی تو انہوں نے نماز ہی کے اندر اسے اٹھالیا امام بخاری نے یہ حدیث بغیر سند کے ذکر کی ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ جو حدیث بغیر سند کے بھی ذکر کریں وہ بھی صحیح ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ابن سعد نے اپنی طبقات (ج ۶ / ص ۳۱۳) میں ابو اسحاق سبیعی کے حالات میں یہی بات سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔

(۷)......... امام ابو داؤدؒ نے سترے کے احکام میں سفیان بن عیینہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے شریک کو دیکھا کہ ایک دفعہ انہوں نے نماز کے اندر اپنی ٹوپی اتار کر اپنے سامنے رکھ لی تاکہ سترے کا کسی درجہ میں کام دے۔

(۸)......... امام بخاری رحمہ اللہ نے باب السجود علی الثوب فی شدۃ الحر میں حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ **کان القوم یسجدون علی العمامۃ والقلنسوۃ**۔[۳]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تشریح میں یہ فرمایا کہ قوم سے مراد یہاں صحابہ ہیں اس لئے کہ یہی اثر عبد الرزاق رحمہ اللہ نے اپنے مصنف کے اندر روایت کیا ہے اور اس میں لفظ ہیں: **اِن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یسجدون وایدیھم فی ثیابھم ویسجد الرجل منھم علی قلسوتہ**

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الصلاۃ باب الرجل یعتمد فی الصلاۃ علی عصا ج ۱ / ص ۱۴۳

(۲) جامع ترمذی کتاب للباس باب (بلا ترجمہ) ج ۱ / ص ۳۰۸ ...... (۳) صحیح البخاری کتاب الصلاۃ باب السجود علی الثوب ج ۱ / ص ۵۶

وعمامته۔[1] تواس میں دیکھئے کہ عمامے پر بھی سجدہ کرنے کا ذکر ہے اور ٹوپی پر بھی سجدہ کرنے کا ذکر ہے یعنی بعض عمامے پر سجدہ کر لیتے ہوں گے اور بعض ٹوپی پر یعنی ٹوپی کا جو حصہ ماتھے پر آگیا اس پر سجدہ کر لیتے تھے۔

(۹).......... مصنف عبدالرزاق ہی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک دفعہ بیت الخلاء میں گئے اور باہر تشریف لائے: **وعلیه قلنسوة بیضا**۔[2] اس حال میں کہ ان کے سر پر سفید ٹوپی تھی البتہ اس میں یہ بھی آتا ہے: **ومسح علی القلنسوة وجور بیه** ٹوپی پر مسح کرنا یہ الگ مسئلہ ہے لیکن اتنی بات تو ضرور آگئی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سر پر ٹوپی تھی۔

(۱۰).......... مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے عبداللہ بن سعید کہتے ہیں: **رأیت علی علی بن حسین قلنسوة بیضاء مصریة** کہ میں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت علی بن حسین کے سر پر سفید مصری ٹوپی دیکھی ہے۔[3]

(۱۱).......... ہشام کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سر پر ایک ٹوپی دیکھی ہے۔[4]

(۱۲).......... مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے یزید کہتے ہیں کہ **رأیت علی ابراھیم قلنسوة** کہ میں نے نخعی پر بھی ٹوپی دیکھی ہے اس ٹوپی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ **مکفوفة شعالب اوسمور**۔[5]

(۱۳).......... مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے کہ **خرج من الخلاء وعلیه قلنسوة فمسح علیها** کہ قضاء حاجت کر کے تشریف لائے اور ان کے سر پر ٹوپی تھی اور انہوں نے ٹوپی پر مسح کیا۔[6]

حنیفہ کے ہاں اس طرح کی روایات جن میں عمامہ پر مسح کرنا آتا ہے کی توجیہ یہ ہے کہ اپنے سر کے مقدار ناصیہ پر یعنی ایک چوتھائی سر پر تو مسح کیا اور باقی سر پر مسح کرنے کی بجائے سر پر ہی ہاتھ پھیر لیا۔

یہ چند روایات بطور مثال کے ذکر کی ہیں وگرنہ اگر تلاش کریں تو اور بے شمار مل جائیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ٹوپی سلف میں عام مروج تھی۔

ٹوپی کیسی ہونی چاہئے؟

اب رہی یہ بات کہ ٹوپی کیسی ہونی چاہئے، تو یہ میں پہلے بارہا کہہ چکا ہوں کہ کھانے پینے کے مسائل ہوں یا لباس کے ان میں خاص ہیئت یا شکل کی شرعاً کوئی تعیین نہیں ہے اس لئے اس بحث میں پڑنا کہ ٹوپی ایسی

---

(۱) فتح الباری کتاب الصلاۃ باب السجود علی الثوب ج۱/ص ۳۹۲..... (۲) مصنف عبدالرزاق ج۱/ص ۱۹۰

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ کتاب اللباس والزینۃ فی لبس القلانس ج۶/ص ۳۳ (دار الفکر)..... (۶،۵،۴) ایضا.....

ہونی چاہئے ایسی نہیں ہونی چاہئے یہ درست نہیں ہے البتہ یہ ہے کہ کسی شرعی اصول کے منافی نہ ہو مثلاً اس میں تشبہ نہ ہو اگر تشبہ وغیرہ پایا جائے گا تو وہ ناجائز ہوگی۔

گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ بغیر عمامے کے اکیلی ٹوپی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف سے ثابت ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ امت کا متوارث عمل یہی چلا آرہا ہے کہ علماء اور صلحاء عمامہ باندھتے بھی ہیں اور نہیں بھی باندھتے اور کسی پر بھی کبھی انکار نہیں کیا گیا اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بغیر عمامے کے ٹوپی سر پر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عمامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن عادیہ میں سے ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ یہ محض سنت عادیہ نہیں ہے بلکہ مستحب شرعی ہے تو بھی بہر حال اس کا درجہ مستحب ہی کا ہے، مستحب سے زیادہ نہیں ہے اور جب کسی مستحب کے ترک کو برا جانا جانے لگے تو ظاہر ہے کہ وہ تجاوز عن الحدود ہوتا ہے اور اس سے رکنا ضروری ہوتا ہے اس لئے کہ فرض یا واجب کے ترک پر ضروری عذاب ہوتا ہے اور سنت کا ترک موجب ملامت ہوتا ہے اور مستحب کا ترک موجب ملامت بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر یہ شرعاً مستحب بھی ہے تو بھی اس کے تارک کو کسی بھی درجے میں حقارت کی نظر سے دیکھنا یہ مناسب نہیں ہے اس لئے کہ مستحبات تو بہت زیادہ ہوتے ہیں ہر آدمی سارے مستحبات پر بیک وقت عامل ہو ایسا نہیں ہوتا، کوئی کسی مستحب کا تارک ہوتا ہے کوئی کسی مستحب کا بلکہ ہر آدمی بیک وقت چند مستحبات پر عمل رہا ہوتا ہے اور بہت سارے مستحبات کا تارک ہوتا ہے یہی وجہ ہے بعض صحابہ نے حضور اقدس ﷺ سے جب نصیحت کرنے کے لئے عرض کیا تو یہ فرمایا کہ یارسول اللہ! خیر کے ابواب تو بہت زیادہ ہیں اس لئے مجھے چند ایک بتا دیجئے بس۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ سارے ابواب خیر پر ہر آدمی کرلے ایسا نہیں ہو سکتا، اب صلوٰۃ الیل کو لے لیجئے اس کا درجہ عمامے سے کہیں زیادہ ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تہجد کے تارکین عمامے کے تارکین سے بھی زیادہ ہوں گے لیکن اس کے باوجود اس کو کسی بھی درجے میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ ان کو کسی طریقے سے تہجد پڑھوائیں۔

سرکو ڈھانپنے کی صورتیں:۔

عمامہ اور ٹوپی کے اعتبار سے سر کو ڈھانپنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱)............ایک صورت تو یہی ہے کہ سر پر ٹوپی بھی ہو اور عمامہ بھی ہو سب سے بہتر صورت تو یہی ہے۔

(۲)............دوسری صورت یہ ہے کہ سر پر ٹوپی تو ہو لیکن عمامہ نہ ہو یہ بھی بلا کراہت جائز ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

(۳)........ تیسری صورت یہ ہے کہ عمامہ تو ہو لیکن اس کے نیچے ٹوپی نہ ہو اس سے حضرت رکانہؓ کی حدیث میں نہی آتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ **فرق مابیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس** ۔ کہ ہمارے درمیان اور مشرکین کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہم عمامے ٹوپیوں پر رکھتے ہیں اور وہ عمامے ٹوپیوں پر نہیں رکھتے۔

اس حدیث کے دو مطلب میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ مشرکین صرف ٹوپی رکھتے ہیں عمامہ نہیں باندھتے اور ہم اس کے ساتھ عمامہ بھی باندھتے ہیں، میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ مطلب ضعیف ہے ایک تو اس لئے کہ خود مسلمانوں اور صحابہ کا اکیلی ٹوپی رکھنا ثابت ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ یہ بات کہ بغیر عمامے کے ٹوپی رکھنا مشرکین کا شعار ہو یہ بھی ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس مشرکین بھی بکثرت عمامہ باندھا کرتے تھے اس لئے کہ یہ عربوں کا ایک عام رواج تھا اور خاص طور پر جو سردار قسم کے لوگ ہوتے تھے وہ تو عمامہ ضرور باندھا کرتے تھے۔ اس لئے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم تو عمامے کے نیچے ٹوپی رکھتے ہیں اور مشرکین عمامہ تو باندھتے ہیں لیکن اس کے نیچے ٹوپی نہیں رکھتے، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ عمامے کا ایک ادب یہ ہے کہ اس کے نیچے ٹوپی رکھی جائے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سر کی چکناہٹ وغیرہ اس ٹوپی کو لگتی رہے گی اور عمامہ صاف ستھرا رہے گا لیکن ٹوپی رکھنا بھی ضروری نہیں ہے اس لئے کہ بہت سارے حضرات نے یہ تصریح کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر ٹوپی کے عمامہ بھی ثابت ہے اور اگر نہ بھی ہو تب بھی یہ حدیث سند کے اعتبار سے اتنی صحیح نہیں اس لئے اس کی بنیاد پر بغیر ٹوپی کے عمامے کو ناجائز یا مکروہ تحریمی قرار نہیں دیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ قرار دیں گے کہ بہتر یہ ہے کہ نیچے ٹوپی رکھ لے لیکن اگر نہیں بھی رکھتا تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

عمامہ باندھنے کا طریقہ:-

عمامہ باندھنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں اور ان میں سے اکثر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یا بعض سلف سے ثابت ہیں:

(۱)........ مثلاً ایک تو یہ کہ عمامہ باندھا جائے اور اس کا کوئی شملہ چھوڑا ہی نہ جائے۔

(۲)........ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا ایک شملہ چھوڑا جائے اور وہ کمر پر یعنی پیچھے کی جانب چھوڑا جائے یعنی دو کندھوں کے درمیان یہ طریقہ بہت ساری روایات سے ثابت ہے اور زیادہ تر حدیثوں میں یہی آتا ہے۔

(۳)........ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عمامہ کا ایک شملہ پیچھے کی جانب ہو اور ایک آگے دائیں جانب ہو یہ بھی ایک طریقہ مروی ہے۔

(۴)............ایک طریقہ بعض حضرات نے بائیں جانب کا بھی لکھا ہے کہ بائیں جانب شملہ چھوڑ دے۔
(۵)............ایک یہ ہے کہ ایک شملہ ہو اور دائیں جانب ہو۔
(۶)............ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عمامے کے کنارے اور شملہ کو ٹھوڑی کے نیچے سے گزار دیا جائے اس میں ایک تو گرمی وغیرہ سے تحفظ زیادہ ہوتا ہے گردن وغیرہ بھی لو سے بچ جاتی ہے اور دوسرا بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ فائدہ ہوتا تھا کہ جب گھوڑوں وغیرہ پر سوار ہوتے تھے تو عمامہ گرتا نہیں تھا قابو آجاتا تھا تو خیر کوئی بھی مقصد ہو یہ بھی طریقہ آتا ہے، مختلف طریقے آتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ طریقہ یہ تھا کہ شملہ پیچھے کی جانب چھوڑا جائے یا ایک پیچھے کی جانب اور ایک دائیں جانب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اگر کوئی اس طریقے کو اختیار کرتا ہے تو یہ برکت اور سعادت کی بات ہے لیکن یہ طریقہ بھی مقاصد شریعت میں سے نہیں ہے کہ ایسا اہم مقصود ہو کہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول میں پہلے نقل کر چکا ہوں کہ انہوں نے فرمایا کہ اس انداز کا عمامہ میں نے عامر بن عبداللہ بن زبیر کے علاوہ کسی پر نہیں دیکھا حالانکہ احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ آتا ہے لیکن بہر حال اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی اتباع میں ایسا کرتا ہے تو یہ برکت اور سعادت سے خالی نہیں ہے اچھی بات ہے۔

عمامے کا رنگ:۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عمامے کے مختلف رنگ منقول ہیں خاص طور پر کالا رنگ متعدد روایات میں آتا ہے لیکن اگر تلاش کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اور رنگ بھی مل جائیں اور یہ بات میں عرض کر چکا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کے معاملے میں کسی خاص رنگ یا ڈیزائن وغیرہ کو مقصود بنا کر استعمال نہیں کیا زیادہ تر استعمال اس لئے کیا کہ وہ مل گیا یا اس لئے استعمال کیا کہ مروج وہ زیادہ تھا اس لئے خاص رنگ کو سنت قرار دینا مشکل ہے ہاں جو رنگ آتے ہیں ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر لے جیسے جو کھانے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھے کوئی آدمی شوق سے کھا لے تو اچھی بات ہے لیکن کسی رنگ کو سنت مقصودہ قرار دینا درست نہیں ہے۔

عمامے کا سائز:۔

عمامے کا سائز کیا ہو یعنی اس کی لمبائی کتنی ہو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامے کی لمبائی کتنی

تھی اس کے بارے میں کوئی صریح اور صحیح روایت موجود نہیں ہے بلکہ علامہ جوزی رحمہ اللہ کا یہ قول اکثر شارحین حدیث نے نقل کیا ہے کہ میں نے کتابوں کو بہت تلاش کیا ڈھونڈا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامے کی مقدار مل جائے لیکن مجھے نہیں ملی البتہ ایک قابل اعتماد شخص نے مجھے یہ بتایا کہ نووی رحمہ اللہ نے کہیں پر یہ لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دو عمامے تھے ایک چھوٹا اور ایک بڑا، بڑا عمامہ بارہ ذراع کا یعنی چھ گز کا تھا اس لئے کہ ایک ذراع آدھے گز کا ہوتا ہے اور چھوٹا عمامہ سات ذراع یعنی ساڑھے تین گز کا تھا لیکن نووی نے یہ بات کہاں پے لکھی ہے اور کس سیاق وسباق میں لکھی ہے یہ بات بھی واضح نہیں ہے اور اس کی سند کیا ہے یہ بھی واضح نہیں ہے۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامے کی مقدار میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے اور ویسے بھی آپ کی عادت مبارکہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو عمامہ آپ کو مل گیا ہوگا آپ نے استعمال فرمالیا ہوگا، اس لئے بظاہر اس کی مختلف مقداریں لکھی گئیں کسی خاص مقدار کو مقصود سمجھ کر آپ نے اہتمام نہیں فرمایا اس لئے کہ اگر کسی خاص مقدار کا آپ نے اہتمام فرمایا ہوتا تو اس کو نقل بھی ضرور کیا جاتا لیکن عام روایات کے اندر نقل نہ ہونا یہ اس بات کی علامت ہے کہ کوئی خاص مقدار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصود سمجھ کر نہیں اپنائی، اس لئے عمامے کی کوئی بھی مقدار ہو سکتی ہے کسی خاص مقدار کو سنت کہنا مناسب نہیں ہے اس لئے کوئی بھی مقدار ہو لیکن اگر اس سے سر چھپ جاتا ہے سر پر اس کو لپیٹا جا سکتا ہے تو اس سے عمامے کی سنت ادا ہو جائے گی بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاں عمامہ ثابت ہے وہیں عصابہ بھی ثابت ہے، عصابہ کا معنی چھوٹا کپڑا جو سر پر لپیٹا جاسکے اس کو پنجابی میں صافہ کہہ سکتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامے کی جگہ صافہ بھی استعمال فرمایا ہے۔

رومال سے عمامے کی سنت:-

ایک بحث اور ہے کہ رومال سے عمامے کی سنت ادا ہو جاتی ہے یا نہیں تو اس میں دونوں ہی رائیں ہیں، متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ رومال سے عمامے کی سنت ادا نہیں ہوتی اس لئے کہ عمامہ الگ چیز ہے رومال الگ چیز ہے اس کا نام الگ، اس کا نام الگ اس کو عمامہ کہا جاتا ہے اور اس کو عربی زبان میں "مندیل" کہا جاتا ہے لیکن یہ ذہن میں رکھیں کہ عربی میں مندیل اصل میں اس کپڑے کو نہیں کہتے جو سر پے باندھا جائے بلکہ مندیل کا بنیادی اطلاق عربی میں یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں اس رومال پر ہوتا تھا جو ہاتھ وغیرہ صاف کرنے کے لئے ہوتا تھا تولیہ کی جگہ استعمال ہوتا تھا۔ بہر حال ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ اس سے عمامہ کی سنت ادا نہیں ہوتی اور ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ عمامہ اصل میں اس لباس کو کہتے

ہیں جو سر پر لپیٹا جائے اس لئے اگر رومال کی مقدار ذرا معتدبہ ہے اور اس میں سر لپٹ جاتا ہے تو عمامہ کا مقصود حاصل ہے، محض اس وجہ سے کہ ہماری زبان میں اس کو رومال کہتے ہیں اس لئے یہ کہہ دیا جائے کہ اس سے عمامے کی سنت ادا نہیں ہوتی مشکل ہے۔ بہر حال دونوں ہی نقطہ نظر موجود ہیں لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر رومال کا سائز معتدبہ ہے اور اس کو پورے طور پر سر پر لپیٹ لیا گیا تو وہ بھی فی الجملہ عمامے کے قائم مقام ہو جائے گا البتہ عرف میں جس کو عمامہ کہا جاتا ہے وہ اقرب الی السنۃ ہے لیکن اس میں میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کوئی خاص مقدار شرعاً مطلوب نہیں ہے آج کل بعض حضرات خاص مقداروں پر بھی اصرار کرتے ہیں، بعض علاقوں میں بڑے بڑے عماموں کا رواج ہے تو یہ ان کا ایک علاقائی رواج ضرور ہے لیکن یہ سمجھنا کہ جب تک اتنی مقدار نہ ہو اس وقت تک عمامہ ہی نہیں کہلا سکتا درست نہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ عمامہ جب ہو گا جب کہ اتنی مقدار ہو کہ اس کے دو شملے چھوڑے جا سکیں اور اس کو ٹھوڑی کے نیچے سے بھی گزارا جا سکے لیکن یہ بات عمامے کے لوازم میں سے نہیں ہے، یہ طریقہ ثابت تو ہے لیکن یہ کہ اس کے بغیر عمامہ، عمامہ ہی نہیں کہلاتا یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں ہے چنانچہ ایک صاحب نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہوا ہے اور اس میں شروع شروع میں اہل لغت سے عمامہ کی تعریفیں نقل کی ہیں اور وہ وہی ہیں جو شروع میں میں عرض کر چکا ہوں وہ چیز جس کو سر پر باندھا جائے یا وہ چیز جس کو سر پر لپیٹا جائے اس طرح کے الفاظ ہیں نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ عمامے کی تعریف یوں ہونی چاہئے کہ **ثوب طویل الی اخرہ** کہ ایسا لمبا کپڑا جو کہ سر پر باندھا جائے اپنا اجتہاد کر لیا کہ طویل کی قید اپنے پاس سے لگا دی کسی نہ کسی درجے میں طول تو ہوتا ہی ہے وہ تو رومال میں بھی ہوتا ہے لیکن خاص مقدار پانچ گز ہو یا اتنی ہو تو ہی عمامہ بنے گا اس کے بغیر عمامہ ہی نہیں بنے گا یہ بات بھی غیر مناسب اور بے جا جمود ہے۔

(٦٣)-----وعن عائشةَ، أنَّ أسماءَ بنت ابی بکر دخلت علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلیها ثیابٌ رقاق، فأعرضَ عنها وقال: یا أسماء! إِنَّ المرأةَ إذا بلغتِ المحیضَ لن یصلُحَ أن یُری منها إلّا هذا وهذا وأشار إلی وجهِه و کفَّیه۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں داخل ہوئیں اس حال میں کہ ان پر پتلے کپڑے تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ اے اسماء! عورت جب ماہواری کی عمر کو پہنچ جائے (یعنی بالغ ہو جائے) تو یہ

درست نہیں ہے کہ اس کے جسم کے کوئی حصے نظر آئیں سوائے اس کے اور اس کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف۔

عورت جب بالغ ہو جائے تو پھر ہاتھ اور چہرے کے علاوہ جسم کا کوئی اور حصہ اجنبی کو نظر نہیں آنا چاہئے، اجنبی کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ محرم کے لئے عورت کا ستر اور ہوتا ہے وہ ہے ایک تو مرد والا ستر اور اس کے علاوہ سینہ، پیٹ اور کمر اس کے علاوہ باقی جسم عورت کا بازو، سر وغیرہ یہ محرم سے ستر میں داخل نہیں ہیں، محرم سے ان کا چھپانا ضروری نہیں ہے اس لئے میں نے اجنبی کی قید لگائی۔

فقہی مسئلہ ...... اسی حدیث سے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے اور مسئلے کی تفصیل انشاء اللہ کتاب النکاح میں آئے گی کہ چہرہ اور ہاتھ اور بعض دوسری روایات کی وجہ سے قدمین کو بھی اس میں شامل کیا ہے یہ لذاتہ ستر میں داخل نہیں ہیں ہاں البتہ غیر محرم سے چہرے کا چھپانا پھر بھی ضروری ہے خوف فتنہ کی وجہ سے بلکہ چہرے کے اندر فتنے کا خوف باقی جسم کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

(٦٤)----- وعن أبی مَطَرٍ، قال: إنَّ علیاً اشتری ثوباً بثلاثةِ دراهم، فلما لبسَه قال: الحمدُ للهِ الذی رَزَقَنی منَ الرَّیاشِ ماأتجمَّلُ به فی الناسِ و اواری به عورتی ثم قال: هکذا سمعت رسول الله ﷺ یقول۔ (رواه أحمد)

ترجمہ ...... ابو مطر کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین درہم کا ایک کپڑا خریدا جب اسے پہنا تو یوں کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ مِنَ الرِّیَاشِ مَا اَتَجَمَّلُ بِہٖ فِی النَّاسِ وَاُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِی۔ کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے زینت کے لباس میں سے مجھے ایسا لباس عطا کیا جس کے ذریعے میں لوگوں میں زینت حاصل کرتا ہوں اور جس کے ذریعے سے میں اپنے ستر کو چھپاتا ہوں پھر حضرت علی نے کہا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی طریقے سے کہتے ہوئے سنا۔

حضرت علیؓ کی سادگی اور تواضع:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کپڑا پہنتے وقت یہ دعا پڑھی ہے اس حدیث سے ایک تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سادگی اور تواضع سمجھ میں آرہی ہے اس لئے کہ یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت کا ہے لیکن خلیفہ ہونے کے باوجود جو لباس پہنا وہ صرف تین درہم کا اور اس کے ساتھ ایک اور واقعہ آتا ہے یہاں تو اختصار کے ساتھ ہے لیکن ابن کثیر نے ”البدایۃ والنہایۃ“ میں یہی واقعہ تفصیل

سے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ بازار میں گئے اور مختلف لوگوں کو مختلف چیزیں بیچتے ہوئے دیکھا اور ان کو ان کے مناسب کوئی نصیحت کی اور آخر میں ایک دکان دار کے پاس گئے اور اس سے کپڑا خریدنا چاہا لیکن اس نے پہچان لیا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کپڑا نہیں خریدا کہ امیر المؤمنین ہونے کی وجہ سے یہ نرخ میں میرے ساتھ رعایت کرے گا تو یہ بھی اپنے منصب سے ایک قسم کا استفادہ ہوگا، دوسرے کے پاس گئے اس نے بھی پہچان لیا پھر تیسری دکان پہ گئے وہاں اصل دکاندار کہیں گیا ہوا تھا اور اس کا بچہ بیٹھا ہوا تھا اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پہنچانا تو اس سے تین درہم کا کپڑا خریدا اور لا کر پہنا اور یہ دعا پڑھی، بعد میں دکان کا مالک آیا اس کو کسی نے بتایا کہ دکان سے امیر المؤمنین کپڑا لے کر گئے ہیں تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم نے تین درہم کا کیوں دیا، امیر المؤمنین کو تو دو درہم کا دینا تھا۔ چنانچہ ایک درہم واپس کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قبول نہیں فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس نے یہ کپڑا مجھے رضامندی سے دیا میں نے تین درہم رضامندی سے دیئے ہیں اس لئے یہ سودا بالکل صحیح ہے اس میں کسی ردوبدل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شکر اور قناعت کا جذبہ ......اس دعا سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو لباس پہنا وہ بہت اعلیٰ قسم کا نہیں تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو لباس پہن کر دعا پڑھی ہوگی وہ بھی بظاہر بہت اعلیٰ قسم کا نہیں ہوگا اس لئے کہ اعلیٰ لباس اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنا ہے لیکن زیادہ تر سادہ لباس ہی پہنا ہے لیکن اس کے باوجود اس لباس کو صرف لباس نہیں کہہ رہے بلکہ یہ کہہ رہے ہیں: **الحمد لله الذي رزقني من الرياش** ۔ زینت کا سامان ہلکے لباس کو بھی زینت کا لباس کہہ رہے ہیں تو اس سے پتہ چلا کہ انسان کے اندر شکر اور قناعت کا جذبہ ہونا چاہئے یہ نہیں کہ بڑی سے بڑی چیز بھی مل جائے تو نخرے کرے کہ یہ کیا ہے بلکہ اس کے برعکس اگر ہلکی چیز بھی مل گئی تو اس کو بھی سمجھنا چاہئے کہ بہت اچھی چیز مل گئی کیونکہ کسی نہ کسی درجے میں زینت تو ہر لباس میں ہوتی ہے تو زینت وغیرہ میں بھی ہلکے درجے پر قناعت کرنی چاہئے اور ہلکا درجہ مل جائے تو اس پر بھی اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے زینت عطا فرمادی یہ نہیں کہ یہ سوچے کہ بہت اعلیٰ لباس ہوگا تو ہی زینت بنے گی۔

لباس کا مقصد ستر اور زینت ہے:۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ لباس کے مقصد دو ہیں ایک ستر چھپانا اور دوسرا زینت حاصل کرنا۔

(٦٥)----- وعن أبي أمامة، قال: لبس عمر بن الخطاب رضي الله عنه

ثوبـًا جديداً، فقال: الحمدُ الذى كسانى ما أوارى به عورتى وأتجمَّلُ به فى حياتى، ثمَّ قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: مَن لبسَ ثوبـًا جديداً فقال: الحمدُ لله الذى كسانى ماأوارى به عورتى وأتجمَّل به فى حياتى، ثمَّ عمَدَ إلى الثوب الذى أخلَقَ فتصدَّقَ به، كان فى كنفِ اللهِ وفى حفظِ الله وفى سترِ الله حيًّاً وميتـًا۔ (رواه أحمد والترمذى وابن ماجه وقال الترمذى: هذا حديث غريب)

ترجمہ ...... حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نیا کپڑا پہنا اور یہ کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِی مَا اُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِی وَاَتَجَمَّلُ بِہٖ فِی حَیَاتِی۔ کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے ایسی چیز پہننے کے لئے دی جس سے میں اپنے چھپانے کے قابل اعضاء چھپاتا ہوں اور اس کے ذریعے اپنی دنیاوی زندگی میں زینت حاصل کرتا ہوں پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی نیا کپڑا پہنے اور یہ کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِی مَا اُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِی وَاَتَجَمَّلُ بِہٖ فِی حَیَاتِی۔ پھر وہ اس کپڑے کی طرف متوجہ ہو جو پرانا ہو گیا ہے اور اس صدقہ کر دے تو یہ شخص اللہ کے سائے میں رہے گا زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اور اللہ کی حفاظت میں رہے گا اور اللہ کی امان میں رہے گا۔

پرانے کپڑے کو صدقہ کرنے کی فضیلت:۔

تین لفظ ہیں: فى كنف الله وفى حفظ الله وفى ستر الله ۔ تینوں کا معنی تقریباً ایک ہی ہے یہ تین لفظ مبالغہ اور تاکید کے لئے بولے گئے ہیں کہ مکمل طور پر وہ اللہ کی حفاظت میں رہے گا جو آدمی نیا کپڑا پہنے اور یہ دعا پڑھے اور پہلے کپڑے کو صدقہ کر دے لیکن صدقہ کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

(٦٦) -----وعن علقمةَ بن أبى علقمة، عن أمِّه، قالت: دخلت حفصة بنت عبد الرحمٰن على عائشةَ وعليها خمارٌ رقيقٌ، فشقَّته عائشةُ وكستها خماراً كثيفاً۔ (رواه مالك)

ترجمہ ...... علقمہ بن ابی علقمہ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ حفصہ بنت

عبد الرحمٰن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئیں اور اس وقت ان پر پتلی اوڑھنی تھی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو پھاڑ دیا اور ان کو ایک موٹی اوڑھنی پہنا دی۔

ان کے سر پر پتلی اوڑھنی تھی یعنی پتلا دوپٹہ تھا جس میں سے سر نظر آ رہا تھا اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو تو اتار کر پھاڑ دیا اور اس کی جگہ اپنے پاس سے موٹی اوڑھنی دے دی۔ یہاں حضرت عائشہؓ نے زبانی مسئلہ بتانے پر اکتفاء نہیں کیا زبانی نہی عن المنکر نہیں فرمایا بلکہ عملاً فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حفصہ بنت عبد الرحمٰن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھتیجی بھی ہیں اور ایک قسم کی ان کی زیر پرورش بھی اور زیر تربیت بھی تھیں گویا ان کی مریدنی بھی تھیں اور شاگرد بھی تھیں اس لئے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا باقی اس کو پھاڑنا یہ مال کا ضیاع نہیں ہے اس لئے کہ بظاہر پھاڑنے کے بعد بھی وہ کپڑا کسی کام کا رہا ہو گا مثلاً اس کا رومال وغیرہ بن گیا ہو گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے کے مال کو خواہ مخواہ نقصان پہنچایا اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جہاں ان کے دوپٹے کو پھاڑا ہے وہیں اس کی جگہ اپنے پاس سے موٹا دوپٹہ بھی دے دیا۔

(٦٧)----وعن عبدالواحد بن أيمن، عن أبيه، قال: دخلتُ على عائشةَ وعليها دِرعٌ قِطريٌّ ثمنُ خمسةِ دراهم فقالت: ارفع بصرك إلى جاريتي، انظر إليها، فإنها تُزهي أن تلبسه في البيتِ، وقد كان لي منها دِرعٌ على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فما كانت امرأةٌ تُقيَّنُ بالمدينة إلا أرسلت إليَّ تستعيره۔ (رواه البخاري)

ترجمہ ...... عبد الواحد بن ایمن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عاعشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ایک قطری قمیص تھی جس کی قیمت پانچ درہم ہو گی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اپنی نظر ذرا میری اس باندی کی طرف اٹھاؤ اور اس کو ذرا دیکھو کہ یہ اس بات سے نخرے کرتی ہے کہ اس قمیص کو گھر کے اندر پہنے حالانکہ اسی کپڑے کی میری ایک قمیص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی اور مدینے کے اندر جس عورت کو بھی دولہن بنایا جاتا تھا وہ یہ قمیص عاریۃً حاصل کرنے کے لئے میری طرف آدمی بھیجتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بتا رہی ہیں کہ وقت کس طرح بدل گیا ہے زمانے میں کیا تبدیلی آ گئی ہے ایک وقت وہ تھا کہ یہی کپڑا کسی کسی کے پاس ہوتا تھا اور میرے پاس اس کپڑے کی ایک قمیص ہوتی تھی اور مدینے میں جب کسی عورت کی شادی ہوتی تو اس کو پہنانے کے لئے یہ مانگ کر مجھ سے لے جاتے تھے اس کو

دلہن پہنا کرتی تھی اور آج ایک عورت اور وہ بھی باندی آزاد عورت بھی نہیں وہ بھی پہننے کے لئے تیار نہیں ہے اس کو پہننے کے لئے کہو وہ بھی نخرے کرتی ہے اور یہ بھی نہیں کہ پہن کر باہر جانا ہو گھر کے اندر بھی پہننے کے لئے تیار نہیں ہے دیکھو وقت کتنا بدل گیا ہے اس سے اندازہ لگالیجئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو تین درہم کا لباس وہ گاوہ کیسا ہو گا جو پچھلی حدیث میں گزرا کیونکہ یہ لباس جو اس روایت میں ہے پانچ درہم کا تھا۔

(٦٨)-----عن جابر، قال: لبس رسول الله صلى الله عليه وسلم يومـًا قَباءَ ديباجٍ أهدِيَ له، ثمَّ أوشكَ أن نزَعَه، فأرسلَ به إلى عمر، فقيل: قد أوشكَ ما انتزعتَه يا رسول الله! فقال: نهاني عنه جبريلُ فجاءَ يبكي فقال: يا رسولَ الله! كرهتَ أمراً وأعطيتنيه فما لي فقال: إني لم أعطِكهُ تلبَسهُ، إنما أعطيتُكه تبيعُه فباعَه بألفي درهم۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دیباج کی قباء پہنی جو آپ کو ہدیے میں دی گئی تھی پھر جلدی ہی آپ نے اس کو اتار دیا اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دیا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس کو بہت جلد اتار دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے جبریل علیہ السلام نے مجھے منع کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روتے ہوئے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ایک چیز کو ناپسند کیا اور وہ مجھے عطا فرما دی تو میرے اندر ایسی کون سی بات ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں یہ قبا اس لئے نہیں دی کہ تم اسے پہن لو بلکہ تمہیں اس لئے دی ہے تاکہ تم اسے بیچ دو چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دو ہزار درہم کے بدلے میں بیچا۔

ریشم کی قباء:-

دیباج ریشم کی ایک قسم ہوتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیباج کی یہ قبا پہن لی کیوں پہن لی؟ یا تو اس لئے کہ ابھی تک ریشم کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اسی وقت نازل ہوئی اور یا یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دھیان نہیں رہا ہو گا کہ یہ ریشم کی ہے اس طرف توجہ نہیں گئی ہو گی، بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے لیکن جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ کو فوراً مطلع کیا کہ یہ ریشم کی ہے اس لئے آپ اس کو اتار دیجئے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتار دیا۔

اعلیٰ اور قیمتی لباس پہننا:-

اگرچہ اس کو اتار دیا گیا لیکن ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنا ضرور ہے اور ایسی قبا پہنی ہے جس کی قیمت دو ہزار درہم تھی یہ بہت بڑی قیمت ہے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ اعلیٰ اور قیمتی لباس پہننا یہ ممنوع نہیں ہے، جب اتارا تو ایک عارض کی وجہ سے کہ ریشم کا تھا اگر ریشم کا نہ ہوتا تو شاید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسے اتارتے بھی نہ تو پتہ چلا کہ اعلیٰ لباس پہننا بھی کوئی بری بات نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روتے ہوئے آئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل میں یہ حضرات اپنے بارے میں ہمیشہ بدگمان رہتے تھے یہ نہیں کہ اپنے آپ کو ہر وقت یہ سمجھتے رہیں کہ ہم نے دین کی اتنی خدمت کی ہے اور یہ کام کیا ہے اس لئے ہم پکے مؤمن ہیں اور پکے جنتی ہیں بلکہ یہاں تک ان کو خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم منافق تو نہیں ہو گئے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روتے ہوئے اس لئے آئے کہ ایک چیز جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں اور جو شاید ناجائز ہے وہ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہننے کے لئے عطا فرما دی تو شاید میرا ایمان ہی صحیح نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچا کہ اس کو جائز ناجائز سے کیا، پتہ نہیں میں منافق ہو گیا، پتہ نہیں اندر کوئی اور ایسی خامی پیدا ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو ناپسند سمجھا وہ مجھے دے دی تو پتہ نہیں میرے اندر کیا قباحت ہو گی، کیا برائی ہو گی اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اشکال تمہیں تب ہو تا جب کہ میں نے یہ کپڑا تمہیں پہننے کے لئے دیا ہوتا میں نے پہننے کے لئے نہیں دیا بلکہ میں نے اس لئے دیا ہے تاکہ تم بیچ کر اس کے پیسے استعمال کر لو۔

(٦٩)----- وعن ابنِ عبَّاس رضيَ اللهُ عنهما، قال: إنما نهى رسول الله صلىِ الله عليه وسلم عن ثوب المُصمَتِ منَ الحريرِ، فأمَّا العَلَمُ وسَدَى الثوبِ فلا بأسَ به۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف خالص ریشم کے کپڑے سے منع فرمایا ہے، باقی ریشم کا حاشیہ اور کپڑے کا تانا ریشم کا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(٧٠)----- وعن أبي رجاء، قال: خرجَ علينا عمرانُ بن حصين وعليه مِطرَف من خزٍ، وقال: إنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال. مَن أنعم اللهُ عليه نعمةً فإنَّ اللهَ يُحب انَّ يرى أثر نعمتِه على عبدِه۔ (رواه أحمد)

ترجمہ ...... ابو رجاء کہتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین ہمارے پاس باہر تشریف

لائے اور اس وقت آپ پر خز کپڑے کی ایک منقش چادر تھی تو حضرت عمران بن حصین نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے کوئی نعمت عطا کریں تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اپنی نعمت کا اثر اپنے بندے پر دیکھیں۔

عمدہ قسم کا لباس:-

خز خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا اور عموماً اس میں ریشم بھی شامل ہوتا تھا دو صورتیں خز کی ہوتی تھیں ایک یہ کہ خالص ریشم ہوتا تھا اور اعلیٰ قسم کا ریشم ہوتا تھا اور دوسرا یہ کہ خالص ریشم کا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں اون کی بھی ملاوٹ ہوتی تھی تو یہاں بظاہر دوسرا ہی مراد ہے چونکہ یہ خالص ریشم نہیں تھا اور بانا بھی ریشم کا نہیں تھا اس لئے اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بہر حال اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اعلیٰ لباس پہننا بھی درست ہے، حضرت عمران بن حصین نے وہ لباس پہنا جو اس وقت اعلیٰ قسم کا لباس سمجھا جاتا تھا۔

(۷۱)-----وعن ابنِ عبَّاسٍ رضی اللہ عنهما، قال: كُل ماشئتَ، والبَس ماشئتَ ماأخطاتكَ اثنتان: سَرَف وَمخِيلَةٌ۔ (رواه البخاری فی ترجمة باب)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو جب تک کہ دو چیزیں تم سے دور رہیں اسراف اور تکبر۔

اسراف اور تکبر سے احتراز:-

یعنی اسراف اور تکبر سے بچتے ہوئے جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو اور جو چاہو پہنو، اس میں شرعاً کوئی قید اور پابندی نہیں ہے تو گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں اصل اباحت ہے البتہ کچھ اصول ہیں ان اصولوں کی اتباع ضروری ہے اور ان میں دو اصول سب سے بنیادی ہیں ایک یہ کہ اسراف نہ ہو دوسرے یہ کہ تکبر نہ ہو۔ بہر حال اصول شریعت کی پابندی کرتے ہوئے جو لباس بھی پہن لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے جزوی طور پر ہر ہر لباس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۷۲)-----وعن عمرِو بن شعيبٍ، عن أبيه، عن جدّه، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: كُلوا واشربوا وتصدَّقوا والبَسوا، مالم يُخالط إسرافٌ ولا مَخِيلةٌ۔ (رواه أحمد والنسائی وابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھاؤ اور پیو اور صدقہ کرو اور پہنو جب تک کہ اس میں تکبر اور اسراف کی آمیزش نہ ہو۔

(۷۳)----- وعن أبی الدرداءِ، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إنَّ أحسَنَ مازرتمُ الله فی قبورِ کم ومساجدِکُم البیاضُ۔ (رواه ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اچھا لباس جس میں تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو اپنی قبروں اور اپنی مساجد میں وہ سفید لباس ہے

سفید لباس سفید کفن:-

یعنی مساجد میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہو تو بھی سفید لباس سب سے اچھا ہے یعنی مسجد میں سفید لباس پہن کر جانا اچھا ہے اور قبر میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہو تو وہاں پر بھی سفید لباس اچھا ہے یعنی میت کو کفن بھی سفید دینا بہتر ہے۔

باب الخاتم

خاتم کے دو معنی آتے ہیں: ایک مہر اور دوسرے انگوٹھی یہاں پر دوسرا معنی مراد ہے اصل میں اس زمانے میں ایک چیز سے دونوں کام لئے جاتے تھے یعنی انگوٹھی ہی سے مہر کا کام لیا جاتا تھا، انگوٹھی کے نگینے پر اپنا نام وغیرہ نقش کر لیا جاتا تھا اور بوقت ضرورت اس سے مہر لگا لی جاتی تھی، یہاں عنوان انگوٹھی کا ہے لیکن اس باب میں صرف انگوٹھی کے احکام بیان نہیں کریں گے بلکہ مطلقاً زیورات کے احکام بیان کئے جائیں گے البتہ زیادہ تر حدیثیں انگوٹھی کے بارے میں ہیں۔

انگوٹھی بارے میں کچھ بنیادی باتیں ذہن میں رکھ لیں:

انگوٹھی کیوں اور کب بنوائی؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے لیئے انگوٹھی بنوائی تھی اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور یہ انگوٹھی آپ نے کب بنوائی ہے تو آنحضرت ﷺ نے (۶ ہجری) کے آخر میں یا (۷ ہجری) کے شروع میں انگوٹھی بنوائی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ (۶ ہجری) میں جب صلح حدیبیہ ہوئی اور اس کے نتیجے میں عارضی طور پر مسلمانوں میں اور اہل مکہ میں جنگ بندی ہو گئی اور راستے وغیرہ پر امن ہو گئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب یہ سمجھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے بادشاہوں، حکام اور سرداروں کو دعوت الی الاسلام کے لئے خطوط لکھے جائیں۔ جب آپ نے اس طرح خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ کو یہ بتایا گیا کہ اکثر بادشاہ اور سربراہان مملکت خط کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک کہ اس کو بند کر کے اس پر مہر نہ لگائی گئی ہو اس لئے حضور اقدس ﷺ کو مہر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ مہر انگوٹھی کی شکل میں تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے انگوٹھی بنوائی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے پہلے ایک انگوٹھی بنوائی اور وہ پھینک دی پھر دوسری مرتبہ ایک اور بنوائی آپ ﷺ نے پہلے جو انگوٹھی بنا کر پھینکی وہ کس چیز کی تھی اور آپ نے وہ کیوں پھینکی یہ دو مسئلے ہیں۔

انگوٹھی کیسی تھی؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے پہلے جو انگوٹھی بنائی تھی اور جس کو پھینک دیا تھا وہ کس چیز کی تھی اس کے بارے میں دو طرح کی روایات آتی ہیں، عام روایات میں تو یہ آتا ہے کہ آپ نے جو پہلے انگوٹھی

بنائی تھی وہ سونے کی تھی اور آپ کو دیکھ کر بہت سارے صحابہ نے بھی اس طرح کی انگوٹھی بنالی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ انگوٹھی پھینک دی تو صحابہ نے بھی اپنی اپنی انگوٹھی پھینک دی اور اسے ضائع کر دیا۔ چنانچہ اس باب کی پہلی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے اس میں بھی یہی لفظ آرہے ہیں کہ **اِتَّخَذَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من ذھب** ۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ایک انگوٹھی بنائی تھی اور اسے آپ نے دائیں ہاتھ میں پہنا تھا **ثُمَّ القاہ** پھر آپ نے وہ انگوٹھی پھینک دی اس کے بعد آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنائی اور اس میں **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ** کا لفظ نقش کیا گیا اور آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ میرے جیسا نقش کوئی بھی اپنی انگوٹھی پر نہ بنوائے لیکن اس کے برعکس ابن شہاب زہری کی ایک روایت ہے کہ **اَن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتخذ خاتما من ورق ثم القاہ** ۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور اسے پھینک دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو انگوٹھی پھینکی تھی وہ چاندی کی تھی تو اس طرح روایتوں میں تعارض ہے۔

حل تعارض ...... اکثر حضرات نے تو یہاں ترجیح کا راستہ اختیار فرمایا ہے کہ ایک روایت راجح ہے اور ایک مرجوح ہے اور راجح روایت وہ ہے جس میں یہ آتا ہے کہ آپ نے سونے کی انگوٹھی پھینکی ہے اور جس میں آتا ہے، آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنائی اور پھینک دی یہ ابن شہاب زہری کا یا ان کے کسی شاگرد کا وہم ہے اصل میں آپ نے چاندی کی انگوٹھی نہیں پھینکی تھی بلکہ سونے کی پھینکی تھی اور اس وہم کی ایک وجہ بھی بعض حضرات نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک چاندی کی انگوٹھی تھی اور جب آپ بیت الخلاء میں جاتے تو اسے اتار دیتے نزعہ کے لفظ آتے ہیں اور نزع کا معنی ہے انگوٹھی کو اتارنا لیکن ابن شہاب زہری یا کسی اور نے نزع کا معنی پھینکنا سمجھ لیا اور یہ روایت کر دیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنائی تھی اور اسے پھینک دیا حالانکہ اصل بات یہ نہیں کہ آپ نے پھینک دی تھی بلکہ بات یہ کہ اتار دیا کرتے تھے اور اس لئے اتارا کرتے تھے کہ اس میں مقدس نام ہے اس کو یوں ننگی حالت میں بیت الخلاء میں لے کے جانا خلاف ادب ہے ایک راستہ تو یہ ترجیح کا ہے۔

بعض حضرات نے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی بھی کوشش کی ہے دونوں روایتوں کو جمع کیسے کیا جائے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں تقریباً چار قول نقل کیئے ہیں ان میں سے سب سے بہتر اور دل کو لگنے والی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بھی پھینکی ہے اور چاندی کی انگوٹھی بھی پھینکی ہے لیکن دونوں کو پھینکنے کی وجہ الگ الگ تھی پہلے آپ نے سونے کی انگوٹھی بنائی اور آپ کو دیکھ کر صحابہ نے بھی بنوالی کیوں کہ صحابہ کے اندر آپ کی اتباع کا شوق تھا اس وقت تک سونے کی حرمت

مردوں کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی بعد میں سونے کی انگوٹھی مردوں پر حرام کر دی گئی۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وہ انگوٹھی مستقل طور پر اتار دی اور اسے پھینک دیا تو صحابہ نے بھی اپنی اپنی انگوٹھیاں اتار دیں اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنائی اور اس میں اپنا مخصوص نقش بنوایا تو صحابہ نے آپ کی اتباع کے شوق میں چاندی کی انگوٹھی بنوالی اور اس پر نقش بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جیسا بنوالیا اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نقش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے شوق میں تھا لیکن یہ انگوٹھی کے مقصد کے خلاف کیونکہ انگوٹھی کا مقصد محض زینت نہیں تھا بلکہ مہر لگانا بھی مقصود تھا۔ اب جیسی مہر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے ویسی ہی اوروں کے پاس بھی ہو تو اس میں ظاہر ہے کہ التباس کا خطرہ ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس انگوٹھی کو بھی اتار دیا اتار کر پھینک دیا تاکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اپنی اپنی انگوٹھیوں کو ضائع کر دیں چنانچہ صحابہ نے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اپنی چاندی کی ان انگوٹھیوں کو ضائع کر دیا اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ چاندی کی انگوٹھی بنوائی یا ہو سکتا ہے کہ وہی انگوٹھی پہلے کہیں رکھی ہوئی ہو اس کو دوبارہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی فرمادیا کہ **لا ینقشن احد علی نقش خاتمی ھذا**۔ کہ میری اس انگوٹھی جیسا نقش کوئی آدمی اپنی انگوٹھی کا نہ بنائے تو آپ نے چاندی کی انگوٹھی بھی پھینکی سونے کی بھی پھینکی لیکن دونوں کو پھینکنے کی وجہ الگ الگ تھی، سونے کی پھینکی اس لئے کہ اس کی حرمت نازل ہو گئی تھی اور چاندی کی پھینکی اس لئے کہ صحابہ نے اس کا نقش بنالیا تھا اور اس لئے پھینکی تاکہ صحابہ بھی پھینک دیں اور التباس کا خطرہ زائل ہو جائے اور میں از سر نو بعد میں دوبارہ بنوالوں۔ اس کے بعد صحابہ نے چاندی کی انگوٹھیاں بنوائی تو ہیں لیکن حضور اقدس ﷺ والا نقش اختیار نہیں کیا۔

حضور ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ:-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے بارے میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس کا نگینہ کیسا تھا تو اس کے بارے میں دو طرح کی روایتیں آتی ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ **کان فصه منه** کہ چنانچہ اسی باب میں آگے روایت آرہی ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی اسی کا تھا یعنی وہ چاندی ہی کا بنا ہوا تھا لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی ایک دوسری روایت ہے اور وہ بھی بخاری و مسلم کی ہے کہ **فیه فص حبشی** اور یہ بھی اسی باب کے فصل اول میں آرہی ہے کہ اس میں حبشی نگینہ تھا یعنی کسی حبشی پتھر کا مثلاً عقیق وغیرہ کا نگینہ تھا اور اس زمانے میں عقیق پتھر اور اس

طرح کے بعض دوسرے قیمتی پتھر حبشے سے لائے جاتے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ انگوٹھی تو چاندی کی تھی لیکن اس کا نگینہ کسی اور قیمتی پتھر کا تھا جو حبشے سے لایا گیا تھا تو دونوں روایتوں میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کو رفع کرنے سے پہلے ایک اور بات سمجھ لیں۔

انگوٹھیوں کی تعداد:۔

علماء کی اس میں بحث چلی ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ السلام کی انگوٹھیاں کتنی تھیں ایک ہی انگوٹھی تھی یا متعدد تھیں، تو بعض کی رائے یہ ہے کہ آپ کی ایک ہی انگوٹھی تھی، لیکن دوسری رائے یہ ہے کہ آپ کی انگوٹھیاں متعدد تھیں اور دوسری رائے راجح ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے بارے میں اور بھی کئی اختلافات آئے ہیں کسی میں آتا ہے کہ ایسی تھی اور کسی میں آتا ہے کہ ایسی تھی تو ان تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انگوٹھی نہیں تھی بلکہ ایک سے زیادہ تھیں اس قول کو اختیار کر لیں تو یہ تعارض بھی باآسانی رفع ہو جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو انگوٹھیاں تھیں، ایک انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی کا تھا اور دوسری انگوٹھی کا نگینہ کسی حبشی پتھر کا تھا۔

اگر یہ کہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی ایک ہی تھی تو پھر روایتوں میں تطبیق کیسے ہوگی، تو پھر تطبیق کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ جو کہا کہ کانَ فَصُّهُ حبشیٌ کہ اس کا نگینہ حبشی تھا تو حبشی سے مراد یہ نہیں کہ حبشی پتھر تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ نگینہ اگرچہ چاندی کا بنا ہوا تھا لیکن اس کی بناوٹ حبشی طرز پر تھی اس انداز سے بنا ہوا تھا جس انداز سے اہل حبشہ بناتے تھے لہٰذا کوئی تعارض نہیں اور بعض نے کہا کہ یہاں حبشی کا معنی کالا ہے کہ اس کا نگینہ کالا تھا، چاندی ہی کا تھا لیکن اس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا، ایک تو اس وجہ سے کہ چاندی امتداد وقت یعنی وقت گزرنے جانے سے کالی پڑ جاتی ہے اور دوسرا اس لئے کہ اس کے ساتھ مہر بھی لگاتے تھے اور ظاہر ہے کہ جب مہر لگاتے ہوں گے تو اس پر سیاہی بھی لگاتے ہوں گے اس لئے اور کالی ہو گئی، تو اس کا نگینہ حبشی تھا مطلب یہ کہ حبشیوں کی طرح کالا تھا لیکن راجح بات پہلی ہی معلوم ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھیاں متعدد تھیں کسی انگوٹھی کا نگینہ حبشی پتھر کا تھا کسی کا چاندی کا بنا ہوا تھا۔

چاندی یا پیتل کی انگوٹھی:۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے بارے میں ایک بحث یہ ہے کہ آپ کی انگوٹھی خالص چاندی کی تھی یا کسی اور چیز کی بنی ہوئی تھی اور اس پر چاندی چڑھی ہوئی تھی تو اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی بنی ہوئی تھی لیکن بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ کی انگوٹھی پیتل وغیرہ کی بنی ہوئی تھی لیکن اس پر چاندی چڑھائی گئی تھی، چاندی کا پانی چڑھایا گیا تھا یا چاندی کا ایک خول سا اس پر چڑھایا گیا تھا جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھیاں متعدد تھیں اس لئے یہ باآسانی کہہ سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انگوٹھی خالص چاندی کی ہوگی، ایک ایسی ہوگی کہ جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا ہوگا اندر سے کوئی اور چیز ہوگی۔

انگوٹھی کا نقش:۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کا نقش کیا تھا تو اس میں کئی روایتیں آتی ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ اس پر "**لا إله إلا الله محمّدٌ رسول الله**" لکھا ہوا تھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ اس پر "**بسم اللهِ محمّدٌ رسول الله**" لکھا ہوا تھا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ اس پر **محمّد رسول الله** لکھا ہوا تھا، یہ آخری روایت سند کے اعتبار سے بھی زیادہ قوی ہے کہ صرف "**محمّد رسول الله**" لکھا ہوا تھا اور یہ روایت زیادہ قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ عموماً انگوٹھی میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس پر بہت لمبی عبارت لکھی جائے، مختصر سی عبارت ہی لکھی جاسکتی ہے اور اگر لمبی عبارت لکھیں گے تو بہت باریک لکھنا پڑے گا اور ایک تو اس زمانے میں شاید باریک لکھائی کا رواج ہی نہ ہو اور دوسرا یہ کہ اگر لکھائی باریک ہوگی تو مہر لگانے کی فائدہ نہیں ہوگا اور مہر صاف نہیں لگے گی اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ اس پر صرف "**محمّدٌ رسولُ الله**" لکھا ہوا ہوگا اور زیادہ تر صحیح روایات میں یہی آتا ہے۔

انگوٹھی میں محمّدٌ رَسول الله لکھنے کا انداز:۔

محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہوا تھا اتنی بات تو بخاری وغیرہ کی روایات میں واضح طور پر آتی ہے کہ محمد رسول اللہ تین سطروں میں لکھا ہوا تھا ایک سطر میں "محمد" ایک سطر میں "رسول" اور ایک سطر میں "اللہ" لیکن ان سطروں کی پھر ترتیب کیا تھی اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر کی طرف تو احتمال دونوں ہی ہیں ایک یہ کہ اوپر سے نیچے کی طرف تھی اور یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ عام طور پر جب لکھا جاتا ہے تو اوپر سے نیچے کی طرف ہی لکھا جاتا ہے کہ جو لفظ سب سے پہلے پڑھا جاتا ہو وہ سب سے اوپر لکھا جاتا ہے جو اس کے بعد پڑھا جاتا ہو وہ اس سے نچلی سطر میں اور جو اس کے بعد پڑھا جاتا ہو وہ اس سے نچلی سطر میں، لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ سب سے نیچے "محمد" ہو اور اس سے اوپر "رسول" ہو اور اس سے اوپر "اللہ" ہو ان میں سے کون

سا احتمال حقیقت ہے اس کے بارے میں کوئی صریح روایت نظر سے نہیں گزری۔

اگر اوپر سے نیچے کی طرف تھیں تو اس کی وجہ واضح ہے کہ لکھا ہی یوں جاتا ہے کہ جو لفظ پہلے پڑھا جاتا ہو وہ پہلے لکھا جاتا ہے اور اگر نیچے سے اوپر کی طرف ہو تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لفظ اللہ کے ادب کی وجہ سے یہ ترتیب اختیار کی گئی تا کہ لفظ اللہ سب سے اوپر رہے لیکن بہر حال کسی روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے اس لئے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے اگرچہ بعض محدثین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے اس لئے کہ لکھنے کی عام ترتیب یہی ہے۔

آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر مبارک کی تصویریں بکثرت شائع ہیں اور آپ کے بعض والا ناموں کی تصویریں بھی ملتی ہیں اور ان میں بھی یہ مہر لگی دکھائی دی گئی ہے اور ان میں ترتیب دوسری ہے کہ سب سے نیچے "محمد" ہے اس سے اوپر "رسول" ہے اور سب سے اوپر "اللہ" ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والا ناموں اور آپ کی مہروں کے عکس شائع ہیں لیکن ان کی صحت ان کا ثبوت کس حد تک ہے اس کی مجھے کوئی تحقیق نہیں ہے۔ اگر تو یہ عکس صحیح طریقے سے ثابت ہے پھر تو دوسرا احتمال تقریباً متعین ہے اور اگر یہ عکس صحیح طریقے سے ثابت نہیں ہیں تو پھر پہلا احتمال زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ لکھنے کی عام ترتیب وہی ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت کیا ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے یہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے بارے میں چند بحثیں ہیں اب آیئے انگوٹھی کے حکم کی طرف۔

انگوٹھی کا حکم:۔

عورتوں کے لئے سونے کی انگوٹھی بھی جائز ہے اور چاندی کی بھی، مرد کے لئے کیا حکم ہے۔ سونے کی انگوٹھی کے بارے میں آئمہ اربعہ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرد کے لئے ناجائز ہے، صحابہ کا تقریباً اس پر اتفاق ہے البتہ بعض سلف مرد کے لئے بھی سونے کا انگوٹھی کے جواز کے قائل ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ متعدد صحابہ سے سونے کی انگوٹھی پہننا ثابت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ایسی کافی روایات جمع کر دی ہیں اس سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لئے بھی پہننا جائز ہے لیکن ان صحابہ کے عمل کی توجیہ ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء نے یہ کی ہے کہ ان تک نہی کی حدیثیں نہیں پہنچی۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو سونے کی انگوٹھی سے منع فرمایا اور یہ بات کئی حدیثوں میں آتی ہے اور اس باب میں بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث آرہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

1

وسلم نے منع فرمایا قسی کے پہننے سے، عصفر میں رنگے کپڑے سے، سونے کی انگوٹھی پہننے سے اور رکوع کے اندر قرآن پڑھنے سے، لیکن ان صحابہ تک ممانعت کی یہ حدیثیں نہیں پہنچی ہوں گی اس لئے یہ سونے کی انگوٹھی پہنتے رہے۔ یہ توجیہ باقی حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں بآسانی چل جاتی ہے لیکن حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی سونے کی انگوٹھی پہننا ثابت ہے چنانچہ یہ روایت ابن ابی شیبہ وغیرہ نے نقل کی ہے اور حافظ ابن حجر العسقلانی نے فتح الباری کے اندر اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان صحابہ میں شامل ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کی انگوٹھی کی ممانعت بھی نقل کر رہے ہیں، نہی والی حدیثوں کے راوی ہیں تو ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے پاس نہی کی حدیث نہیں پہنچی، تو ان کے بارے میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے سونے کی انگوٹھی کیسے پہن لی؟ تو اس کی ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ ہوگی کہ یہ نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں لیکن دوسرے صحابہ نے بلکہ اکثر صحابہ نے چونکہ اس نہی کو تحریم پر محمول کیا ہے اس لئے صحیح یہی ہے کہ یہ نہی تحریمی ہے لیکن بہر حال ان کا اپنا خیال یہ تھا کہ یہ نہی تنزیہی ہے اس لئے یہ پہنتے رہے اور دوسری توجیہ اور صحیح وجہ یہی ہے کہ یہ سونے کی انگوٹھی پہننے کو اپنی خصوصیت پر محمول کرتے تھے یہ ان کی خصوصیت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے غنیمت وغیرہ کا مال آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں تقسیم فرمایا آخر میں ایک انگوٹھی سونے کی ملی وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے مجھے پہنائی اور یہ فرمایا: إلبس ما کساك اللّٰہ ورسولہٗ کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو چیز تجھے پہنائی ہے وہ بے تردد پہن لو اس لئے یہ سمجھتے تھے کہ میرے لئے پہننا جائز ہے کیوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجھے پہنائی ہے۔

چنانچہ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض حضرات براء بن عازب سے یہ کہتے بھی تھے کہ تم سونے کی انگوٹھی کیوں پہنتے ہو؟ اس کو اتار دو تو یہ فرماتے کہ جو چیز خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پہنائی اور پہناتے ہوئے یہ بھی فرمایا: إلبس ماکساك اللہ ورسولہ۔[1] اس کو میں کیسے اتار کر پھینک دوں اس کو میں نہیں اتار سکتا۔

بہر حال ائمہ اربعہ کا مذہب یہی ہے کہ سونے کی انگوٹھی مرد کے لئے جائز نہیں ہے اور اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ چاندی کی انگوٹھی مرد کے لئے جائز ہے، چاندی کا زیور تو مرد کے لئے جائز نہیں لیکن انگوٹھی جائز ہے۔

---

(۱) اعلاء السنن ج ۱۷/ص ۳۱۱

غیر ذی سلطان کے لئے چاندی کی انگوٹھی کا حکم:۔

البتہ اس میں بحث چلی ہے کہ غیر ذی سلطان کے لئے چاندی کی انگوٹھی کا کیا حکم ہے؟ یعنی جو صاحب اختیار نہیں ہے جس کو مہر وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی اس کے لئے کیا حکم ہے۔ تو حضرت ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے گزری کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دس (۱۰) چیزوں سے منع فرمایا اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے: **ولبس الخاتم إلا الذی سلطان** اور دوسری طرف خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ ﷺ کے بعد بھی بہت سارے صحابہ سے چاندی کی انگوٹھی پہننا مروی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سارے کے سارے صاحب اختیار نہیں تھے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کی انگوٹھی غیر ذی صاحب سلطان اور غیر صاحب اختیار کے لئے بھی جائز ہے تو اب مسئلہ کیا ہے۔

بعض حضرات نے تو حضرت ابو ریحانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات منقول ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ غیر صاحب اختیار کے لئے بھی چاندی کی انگوٹھی بلا تردد جائز ہے اس لئے صحابہ نے پہنی ہے اور نہی کی جو حدیث تھی وہ ضعیف ہوگئی اور اگر اس حدیث کو صحیح مان لیں، قابل استدلال مان لیں تو اس کو خلاف اولیٰ پر محمول کرنا پڑے گا چنانچہ اکثر حنفیہ نے یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ صاحب اختیار کے لئے تو جائز ہی ہے اور غیر صاحب اختیار کے لئے بھی جائز ہے لیکن خلاف اولیٰ ہے یہ چاندی کی انگوٹھی پہننے کا حکم تھا۔

چاندی کی انگوٹھی کی مقدار:۔

چاندی کی انگوٹھی اگر پہننی ہو تو چاندی کی مقدار کتنی ہونی چاہئے اس میں ائمہ حنفیہ سے یعنی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور صاحبین سے کوئی روایت منقول نہیں ہے، البتہ بعد کے مشائخ نے کہا ہے کہ چاندی کی مقدار ایک مثقال تک ہونی چاہئے جو تقریباً چار ماشے بنتی ہے اور اس کی دلیل حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جو اسی باب کی الفصل الثانی میں آرہی ہے، الفصل الثانی کی پانچویں حدیث ہے اس میں یہ آتا ہے کہ پہلے انہوں نے پیتل کی انگوٹھی پہنی اس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، پھر لوہے کی انگوٹھی پہنی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا انہوں نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کس چیز کی انگوٹھی بنواؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ چاندی کی انگوٹھی بنواؤ، لیکن **(لا تتمه مثقالًا)** وہ چاندی کی انگوٹھی ایک مثقال تک نہ پہنچنے پائے ایک مثقال سے کم کم ہو، اس سے معلوم ہوا کہ مرد چاندی کی انگوٹھی پہن تو سکتا ہے لیکن چاندی کا وزن ایک مثقال سے کم کم ہونا چاہئے۔

کون سے ہاتھ میں انگوٹھی پہننی چاہئے؟

اگر انگوٹھی پہننی ہو تو کون سے ہاتھ میں پہننی چاہئے دائیں ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں، اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سے ہاتھ میں پہنی ہے تو اس میں دونوں طرح کی روایتیں ہیں اور یہ دونوں طرح کی روایتیں اس باب میں آرہی ہیں، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ میں پہنی ہے اور بعض میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ میں پہنی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دائیں ہاتھ میں پہنی ہو کبھی بائیں ہاتھ میں پہنی ہو تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ دونوں ہاتھوں میں پہننا جائز ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنی تھی جو بعد میں پھینک دی اور جو چاندی کی انگوٹھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوائی وہ بائیں ہاتھ میں پہنی اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرح الشمائل میں یعنی شمائل ترمذی کی شرح میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی معمول دائیں ہاتھ میں پہننے کا تھا اور آخری معمول بائیں ہاتھ میں پہننے کا تھا، لیکن بہر حال دونوں طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ضرور ہے اس لئے اتنی بات پر تو اتفاق ہے کہ دائیں میں پہنی جائے یا بائیں میں دونوں طریقے جائز ہیں جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ افضلیت میں اختلاف ہے، افضل کیا ہے؟ تو شافعیہ وغیرہ کا زیادہ رجحان اس طرف ہے کہ دائیں ہاتھ میں پہننا زیادہ افضل ہے جب کہ حنفیہ کی معروف روایتیں دو ہیں ایک یہ کہ بائیں ہاتھ میں پہننا افضل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری معمول تھا اور دوسرا یہ کہ دونوں میں پہننا برابر ہے کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ یہ دو معروف روایتیں ہیں اگرچہ ایک روایت حنفیہ کی بعض نے یہ بھی نقل کی ہے کہ دائیں میں پہننا افضل ہے لیکن یہ روایت شاذ ہے۔ تو بہر حال یہ اختلاف جواز اور عدم جواز کا نہیں بلکہ اولویت کا ہے اس لئے کوئی اتنا بڑا اختلاف نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دونوں قولوں میں تطبیق بھی دی ہے وہ یہ کہ انگوٹھی پہننے کے دو مقصد ہوتے ہیں کبھی زینت کے لئے پہنی جاتی ہے کبھی مہر کے طور پر اگر زینت کے لئے پہننی ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ دائیں ہاتھ میں پہنے اس لئے کہ شریعت کا ایک عام اصول یہ ہے کہ اکرام یمین یعنی دائیں ہاتھ کا اکرام کیا جائے اور ہر اچھا کام دائیں ہاتھ سے کیا جائے اور اگر مہر لگانے کے لئے پہننی ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ بائیں میں پہنے اس لئے کہ جب مہر لگائے گا تو ظاہر ہے کہ دائیں ہاتھ سے لگائے گا، اب اگر انگوٹھی دائیں ہاتھ میں ہی پہنی ہوئی ہو تو زیادہ عمل کرنا پڑے گا کہ دائیں ہاتھ کی انگوٹھی اتارے گا بائیں ہاتھ سے پھر بائیں ہاتھ سے دوبارہ دائیں ہاتھ میں لے گا اور پھر مہر لگائے گا اور اگر بائیں ہاتھ میں پہنی ہوئی ہو گی تو دائیں ہاتھ کے ذریعے

نکالے گا اور دائیں ہاتھ ہی سے مہر لگائے گا، درمیان میں ہاتھ کے تبادلہ کا کام ہے کہ بائیں ہاتھ سے اس کو منتقل کیا جائے نکالنے کے بعد دائیں ہاتھ میں یہ نہیں کرنا پڑے گا تو اس میں سہولت ہے۔ اس لئے اگر مہر لگانے کے لئے انگوٹھی ہے تو وہ بائیں ہاتھ میں افضل ہے اب اس سے حنفیہ کی تائید بھی خود بخود ہو جاتی ہے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی زیادہ تر مہر لگانے کے لئے ہی پہنی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خود فرمارہے ہیں کہ مہر لگانے کے لئے ہو تو بائیں ہاتھ میں ہونی چاہئے تو اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ تر معمول بائیں ہاتھ میں پہننے کا رہا ہے۔

انگوٹھی کون سی انگلی میں پہننی چاہئے:۔

اب جس ہاتھ میں بھی پہنی ہو اگلا سوال یہ ہے کہ کون سی انگلی میں پہنی جائے، تو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت اس باب میں آرہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں میں انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا ایک درمیان والی یعنی بڑی انگلی اور دوسرے شہادت کی انگلی لہٰذا ان دو انگلیوں میں تو انگوٹھی نہیں پہننی چاہئے ان کے علاوہ جس انگلی میں چاہے پہن لے گنجائش ہے البتہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ چھوٹی انگلی یعنی ''خنصر'' میں پہنے لیکن بہر حال باقی انگلیوں میں بھی گنجائش ہے چاہے خنصر میں پہن لے چاہے اس کے ساتھ والی بنصر میں پہن لے اور انگوٹھے میں ظاہر ہے کہ کوئی پہنتا نہیں ہے۔

انگوٹھی پہنتے وقت نگینہ کس طرف ہو:۔

جب انگوٹھی پہنے تو نگینہ کس طرف ہونا چاہئے؟ ہتھیلی کی طرف یا باہر کی طرف، تو دونوں کی گنجائش ہے لیکن بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اگر زینت کے لئے نہ ہو بلکہ مہر کے لئے ہو تو بہتر یہ ہے کہ اندر کی جانب ہو اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کا نگینہ اندر کی جانب تھا لیکن اگر زینت کے لئے ہی ہو تو ظاہر ہے کہ باہر کی جانب ہی ہو گی۔

الفصل الاوّل

(۱)-----عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، قال: اتخذَ النبی خاتمًا من ذهبٍ وفی روایةٍ: وجعلَه فی یدهِ الیمنی، ثمَّ ألقاهُ، ثمَّ اتخذَ خاتمًا من ورقٍ نُقِشَ

فيهِ: محمَّدٌ رسولُ اللهِ وقال: لا ينقشنَّ احدٌ على نقشِ خاتمی هذا وكانَ إذا لبِسَه جعلَ فَصَّه ممَّا يلی بطنَ كفِه۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی اور ایک روایت میں ہے کہ اس انگوٹھی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں پہنا پھر اسے پھینک دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں "**محمَّدٌ رسول الله**" کالفظ نقش کیا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص میری اس انگوٹھی کے نقش پر نقش نہ بنوائے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی اس انگوٹھی کو پہنتے تھے تو اس کا نگینہ اپنی ہتھیلی کی اندر والی جانب کرتے تھے۔

(۲)-----وعن علی، قال: نهی رسول الله صلى الله عليه وسلم عن لُبسِ القسِیَّ، والمعصفرِ، وعن تختمِ الذَّهبِ، وعن قراءةِ القرآنِ فی الركوعِ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا قسی کپڑے کے پہننے سے اور عصفر میں رنگے ہوئے کپڑے سے اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے اور رکوع کے اندر قرأت قرآن سے۔

قسی اور معصفر سے نہی مردوں کو ہے عورتوں کو نہیں، اسی طرح سونے کی انگوٹھی سے نہی مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں ہے البتہ رکوع کے اندر قرآن پڑھنا یہ سب کے لئے ممنوع ہے۔

(۳)-----وعن عبد الله بن عبَّاسٍ، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم رأى خاتمًا من ذهبٍ فی يدِ رجلٍ، فنزعَه، فطرحَه، فقال: يَعمِدُ احدُكم إلی جمرةٍ من نارٍ فيجعلُها فی يدهِ؟ فقيلَ للرَّجلِ بعدما ذهبَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: خُذ خاتمَكَ انتفِع به قال: لا والله، لاآخذُه أبداً وقد طرحَه رسولُ الله صلى الله عليه وسلم۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتار اور پھینک دیا اور فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی دوزخ کے

ایک انگارے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے ہاتھ میں ڈال لیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد اس آدمی سے کہا گیا کہ تم اپنی انگوٹھی اٹھالو اور اس سے نفع حاصل کر لو (یعنی بیچ کر یا کسی اور طریقے سے فائدہ اٹھالو) اس نے کہا کہ نہیں اللہ کی قسم میں اسے کبھی بھی نہیں لوں گا حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اسے ایک دفعہ پھینک دیا ہے۔

مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے:۔

اس نے سونے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی تو حضور اقدس ﷺ نے اظہار ناراضگی کے طور پر اس انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا تاکہ اس کی حرمت اچھے طریقے سے لوگوں کے ذہنوں میں واضح ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی قابل نفرت ہے صرف مکروہ تنزیہی ہی نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا جذبہ اطاعت:۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انگوٹھی پھینکی تھی اس کا مقصد تو حاصل ہو گیا کہ اظہار نفرت ہو گیا اس کے بعد اس انگوٹھی کو اٹھا کر بیچ دیتے یا اپنی بیوی کو یا کسی اور عورت کو پہنا دیتے یا کسی اور طریقے سے اس سے استفادہ کر لیتے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن صحابہ کرام کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اگر ہمارے جیسا مولوی ہوتا تو اس طرح کی سینکڑوں تاویلیں کر کے اسے اٹھا لیتا لیکن یہاں کہا کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینک دیا ہے تو اٹھانا لاکھ مرتبہ جائز سہی لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو ہمارا تعلق ہے اس کی وجہ سے دل اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ ایک چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھینکیں اور ہم اسے اٹھالیں یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے خلاف ہے۔

(٤)-----وعن أنسٍ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم أرادَ أن يكتُبَ إلى كسرى وقيصرَ والنجاشي، فقيلَ: إنهم لا يقبلونَ كتاباً إلا بخاتمٍ فصاغَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم خاتماً حَلقَةَ فضةٍ نُقِشَ فيه: محمدٌ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم۔ (رواه مسلم وفي رواية للبخاري: كانَ نقشُ الخاتمِ ثلاثة أسطُرٍ: محمَّدٌ سَطرٌ، ورسولُ سطرٌ، واللهُ سطرٌ)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم نے قیصر وکسریٰ اور نجاشی کی طرف خط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وہ لوگ کوئی خط قبول نہیں کرتے مگر مہر کے ساتھ، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہر بنوائی جس کا حلقہ چاندی کا تھا اور اس میں "**محمدٌ رسول اللہ**" کا لفظ نقش کیا گیا تھا اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ انگوٹھی کا نقش تین سطروں میں تھا "محمد" ایک سطر میں اور "رسول" ایک سطر میں اور "اللہ" ایک سطر میں۔

(۵)----وعنه أنَّ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانَ خاتمه من فضَّةٍ، و کانَ فَصُّه منه۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی اسی میں سے تھا۔

پورے لفظ اس کے **کان خاتمهٗ من فضة و کان فصُّهٗ منه**۔ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی اسی میں سے تھا۔ "**کان فصهٗ منهٗ**" مِنهٗ کی ضمیر فضة کی طرف نہیں لوٹ رہی بلکہ خاتم کی طرف لوٹ رہی ہے کہ جس چیز کی انگوٹھی بنی ہوئی تھی اسی کا نگینہ تھا۔

(۶)----وعنه أنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبسَ خاتمَ فضَّة فی یمینه، فیه فَصٌّ حَبَشِیٌّ، کانَ یجعلُ فَصَّه ممَّا بلی کفه۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنی اس میں حبشی نگینہ تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نگینے کو ہاتھ کی اس جانب کرتے تھے جو کہ آپ کی ہتھیلی کی طرف ہوتا تھا۔

(۷)----وعنه قال: کانَ خاتمُ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فی هذه، وأشارَ إلی الخنصرِ من یده الیسری۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی اس میں ہوتی تھی اور یہ کہتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔

(۸)----وعن علی رضی اللہ عنه، قال: نهانی رسولُ اللہ صلی اللہ علیه وسلم أن أتختَّمَ فی إصبَعی هذه أو هذِه، قال: فأومأ إلی الوُسطی والتی تلیها۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے منع فرمایا اس بات سے کہ میں اس انگلی میں اور اس انگلی میں انگوٹھی پہنوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درمیان والی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا اور اس سے متصل یعنی شہادت کی انگلی کی طرف۔

الفصل الثانی

(۹) ------ عن عبد الله بن جعفر، قال: كانَ النبی صلی الله علیه وسلم یتختَّمُ فی یمینِه رواه ابن ماجه ورواه ابوداؤد والنسائی عن علی۔

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

(۱۰) ----- وعن ابن عُمَرَ، قال: كانَ النبی صلی الله علیه وسلم یتختَّمُ فی یساره رواه أبو داود۔

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

(۱۱) ----- وعن علی رضی الله عنه، أنَّ النبی صلی الله علیه وسلم أخذَ حریراً فجعلَه فی یمینِه، وأخذ ذهبًا فجعله فی شمالِه، ثمَّ قال: إنَّ هذَینِ حرامٌ علی ذکورِ أمتی۔

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم کو پکڑا اور اپنے دائیں ہاتھ میں کیا اور سونا پکڑا اسے اپنے بائیں ہاتھ میں کیا اور فرمایا کہ یہ دو چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ میری امت کی عورتوں کے لئے حلال ہیں۔

(۱۲) ----- وعن معاویةَ، أنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم نهی عن رکوبِ النّمورِ، وعن لبسِ الذهبِ إلا مقطعاً رواه أبو داود والنسائی۔

ترجمہ ...... حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چیتوں کی کھال پر بیٹھنے سے منع فرمایا اور سونا پہننے سے منع فرمایا مگر یہ کہ وہ ریزہ ریزہ کیا ہوا ہو۔

اس حدیث کے بارے میں شارحین حدیث نے دو احتمال بیان فرمائے ہیں اس میں دوسرا جملہ **عن لبس الذهب إلا مقطعًا** ہے یہ مردوں کے بارے میں نہیں بلکہ عورتوں کے بارے میں ہے، مردوں کے لئے تو سونا ویسے ہی حرام ہے البتہ عورتوں کے لئے سونا جائز ہے "**إلا مقطعًا**" کا معنی یہ ہے کہ عورتوں کو بھی زیادہ مقدار میں سونا نہیں پہننا چاہئے یعنی اتنا پہننا چاہئے جتنا عام طور پر عورتیں زینت کے لئے پہنا کرتی ہیں اس لئے کہ اگر اس سے زیادہ پہنے گی تو اس میں دکھاوے اور فخر کی نیت ہوگی اور یہ نیت درست نہیں ہے۔

یہ تشریح اس وقت ہے جب کہ یہ حدیث مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہو، لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صرف مردوں کے لئے ہے اس لئے کہ سونا اور ریشم کے بارے میں جتنی بھی ممانعت کی حدیثیں ہیں وہ ساری کی ساری صرف مردوں ہی کے بارے میں ہیں۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو سونا پہننے سے منع فرمایا لیکن ایک صورت کو مستثنیٰ فرمایا اور اس کی اجازت دی وہ یہ کہ سونا ریزہ ریزہ کیا ہوا ہو، ریزہ ریزہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس کو کپڑے کے اوپر لگا دیا گیا ہو یا کپڑے کے حاشیے پر لگا دیا گیا ہو اس کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ سونے کے ریزے جسم کے ساتھ نہ لگیں، اسی طریقے سے سونے کے بٹن بھی جائز ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ جسم کے ساتھ نہ لگیں۔

(۱۳)-----وعن بُريدةَ، أنَّ النبی صلی الله علیه وسلم قال لرجلٍ علیهِ خاتمٌ من شَبَهٍ: ما لی اجدُ منكَ ریحَ الأصنامِ؟ فطرحَه ثمَّ جاء وعلیهِ خاتمٌ من حدیدٍ، فقال: ما لی أری علیكَ حِلیةَ أهلِ النارِ؟ فطرحه فقال: یا رسولَ اللهِ! من أی شی أتخذُه؟ قال: من ورِقٍ ولا تُتِمَّه مثقالاً۔ (رواه الترمذی وأبو داود والنسائی)

وقال محیی السنة، رحمه الله: وقد صحَّ عن سهلِ بن سعدٍ فی الصداق أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم قال لرجلٍ: التمس ولو خاتمًا من حدید۔

ترجمہ...... حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے آدمی سے جس پر پیتل کی انگوٹھی تھی یہ فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تم سے بتوں کی بدبو محسوس کرتا ہوں تو اس نے وہ پیتل کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی پھر وہ آدمی دوبارہ آیا اور اس وقت اس پر لوہے کی انگوٹھی تھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے میں تم پر دوزخ والوں کا زیور دیکھ رہا ہوں تو اس نے اسے بھی پھینک دیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں کس چیز کی انگوٹھی بنواؤں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ چاندی کی اور ایک مثقال مکمل نہ کرنا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعے میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے یہ کہا تھا کہ مہر میں دینے کے لئے کوئی چیز تلاش کر کے لاؤ اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔

پیتل اور لوہے کی انگوٹھی:۔

یہ شخص پہلی دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت اس نے پیتل کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور یہ فرمایا کہ تم سے بتوں کی بو آرہی ہے یہ اس لئے فرمایا کہ اس زمانے میں بت بکثرت پیتل کے بنتے تھے تو ایک ایسے مادے کی انگوٹھی تم نے پہن رکھی ہے جس سے بت بنتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک قسم کا بت پرستوں کے ساتھ تشبہ ہے تو اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر انگوٹھی پھینک دی تعمیل حکم تو کر لی لیکن دوسری مرتبہ آیا تو لوہے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، تو اس مرتبہ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ناپسندیدگی فرمایا اور فرمایا: **مالی اری علیك حلیة اهل النار** ۔ کہ تم پر دوزخ والوں کا زیور کیوں نظر آرہا ہے، دوزخ والوں سے مراد کافر ہیں، یعنی اس طرح کی انگوٹھی تو کافر لوگ پہنا کرتے ہیں تم نے اس طرح کی انگوٹھی کیوں پہنی، تمہیں نہیں پہننی چاہئے اس نے وہ بھی اتار کر پھینک دی۔ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ آپ نے پیتل کی انگوٹھی بھی ناپسند فرمادی، لوہے کی انگوٹھی بھی ناپسند فرمادی اب آپ بتائیں کہ میں کس چیز کی انگوٹھی بنواؤں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاندی کی انگوٹھی بنواؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی ہی مرتبہ نہیں بتایا کہ انگوٹھی کس چیز کی بنانی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کا مقتضٰی یہ تھا کہ وہ خود سوال کرتے عقلمندی کا مقتضٰی یہ تھا کہ یہ انگوٹھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند ہے پھر میں کس چیز کی انگوٹھی بنواؤں لیکن بہرحال ان کا اس طرف دھیان نہیں گیا تو اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار فرمایا کہ وہ خود پوچھیں تو بتاؤں گا کہ کس چیز کی جائز ہے۔

سونے چاندی کی انگوٹھی:۔

سونے، چاندی کی انگوٹھی یا کسی اور چیز کی انگوٹھی اور زیور وغیرہ کا کیا حکم ہے؟ سونے کے بارے میں تو اتفاق ہے کہ عورتوں کے لئے جائز ہے اور مردوں کے لئے ناجائز ہے اس لئے انگوٹھی بھی ناجائز ہے اور چاندی کے بارے میں بھی اتفاق ہے کہ عورتوں کے لئے مطلقاً جائز ہے اور مردوں کے لئے صرف اس کی انگوٹھی جائز ہے۔

سونے، چاندی کے علاوہ دھاتوں کی انگوٹھی:-

لیکن باقی دھاتوں کی انگوٹھی اگر کوئی پہن لیتا ہے مثلاً لوہے کی، پیتل کی، تانبے کی یا آج کل مزید کئی اور دھاتیں چلی ہوئی ہیں ان کی انگوٹھی پہن لیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

تو اس میں حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے اور شافعیہ کے دو قول ہیں، ایک قول کراہت کا ہے اور دوسرا قول جواز کا ہے ان کے ہاں راجح جواز ہے شافعیہ کی دلیل کی طرف یہاں محی السنہ نے یعنی صاحب مصابیح نے اشارہ کیا ہے کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں یہ آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے یہ کہا تھا کہ مہر میں دینے کے لئے کوئی چیز تلاش کر کے لاؤ اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا: "**أهب لك نفسي يا رسول الله**" یارسول اللہ میں اپنی ذات آپ کے لئے ہبہ کرتی ہوں میرے لئے سعادت ہوگی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجاؤں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموش رہے اس لئے کہ آپ اس سے نکاح نہیں کرنا چاہتے تھے اور اللہ کے نبی ایک عورت کو نا کر دیں اس کو مسترد کر دیں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی کہ وہ خود بخود سمجھ جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہیں کرنا چاہتے، کچھ دیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اس کے بعد مجلس کے اندر غریب قسم کے درویش قسم کے صحابی موجود تھے انہوں نے کہا یارسول اللہ اگر آپ کو حاجت نہیں ہے تو میرے ساتھ اس کا نکاح کروا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ساتھ وہ بغیر مہر کے بھی نکاح کرنے پر آمادہ تھی لیکن ظاہر ہے تمہارے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوگا بلکہ تمہیں تو مہر بھی دینا پڑے گا، تو بتاؤ کہ مہر میں دینے کے لئے کوئی چیز تمہارے پاس ہے، انہوں نے کہا کہ میرے پاس میرے اس تہہ بند کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کو مہر بنا دیا تو تم اس حالت میں ہو گے کہ تمہارا تہہ بند بھی اپنا نہیں ہوگا بلکہ اس میں بھی تمہاری بیوی کا حق متعلق ہوگا تو یہ مناسب بات نہیں ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ تلاش کرو شاید کوئی چیز مل جائے چھوٹی موٹی چیز ہی سہی حتیٰ کہ اگر لوہے کی انگوٹھی ملتی ہے تو وہ بھی لے آؤ تو وہ گیا اور آکر کہا کہ یارسول اللہ کچھ بھی نہیں ملا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہیں قرآن کی کچھ سورتیں یاد ہیں، اس نے کہا کہ فلاں فلاں سورتیں مجھے یاد ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **زوجتکها بما معك من القرآن** میں نے تمہارا نکاح کروادیا اس قرآن کے عوض جو تمہیں یاد ہے یعنی مہر کی جگہ قرآن کی یہ سورتیں اسے یاد کرا دینا اور دوسرا مطلب اس کا اور حنفیہ کے نزدیک اس کا یہ

مطلب راجح ہے کہ میں نے تمہارا اس کے ساتھ نکاح کروایا بغیر مہر معجّل کے یعنی فوراً مہر نہیں دینا پڑے گا اس وجہ سے کہ تمہیں قرآن یاد ہے، بعد میں جب گنجائش ہو تو دیتے رہنا فوری تمہیں مہر نہیں دینا پڑے گا فوری مہر کے بغیر ہی نکاح کراتا ہوں۔ تو بہر حال شافعیہ نے اس سے یوں استدلال کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے کہا: **إلتمس ولو خاتمًا من حديد** کہ کوئی چیز تلاش کر کے لاؤ اگر چہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی جائز ہے۔

حنفیہ نے حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی پر پیتل کی انگوٹھی دیکھ کر بھی اظہار ناراضگی فرمایا اور لوہے کی انگوٹھی دیکھ کر بھی اظہار ناراضگی فرمایا اور یہ فرمایا کہ اگر بنانی ہے تو چاندی کی بناؤ۔ تو معلوم ہوا کہ پیتل اور لوہے کی انگوٹھی پہننا ناجائز ہے اور یہی حکم دوسری دھاتوں کا بھی ہوگا۔

اس حدیث کی سند پر اگر چہ کچھ کلام کیا گیا ہے بہر حال یہ حدیث مجموعی حیثیت سے حسن سے کم نہیں ہے اس لئے یہ قابل استدلال ہے۔

باقی شافعیہ کی دلیل کا حنفیہ کی طرف سے ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میں لوہے کی انگوٹھی کے تملک کا ذکر ہے لبس کا ذکر نہیں، یعنی لوہے کی انگوٹھی اپنی ملک میں رکھنے کا ذکر ہے اس کے پہننے کا ذکر نہیں ہے اور ملکیت میں رکھنا تو ہمارے نزدیک بھی جائز ہے حتیٰ کہ سونے کا زیور مرد کے لئے ناجائز ہے لیکن مرد سونے کا زیور اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے اسی طریقے سے لوہے کی انگوٹھی پہننا تو جائز نہیں ہے لیکن اس کو اپنی ملکیت میں رکھنا جائز ہے۔

اس جواب پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بظاہر مہر میں انگوٹھی دینے کا مقصد یہی ہے کہ یہ انگوٹھی پہنے گی اور خاص طور پر شادی کی انگوٹھی تو اہتمام سے پہنی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں اصل میں لوہے کی انگوٹھی کا ذکر بطور مثال کے ہے، اصل مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی چیز مل جائے معمولی سے معمولی چیز ہو کم سے کم قیمت کی چیز ہو لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے، مکمل مہر اگر چہ حنفیہ کے نزدیک کم سے کم دس درہم ہوتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ نکاح کے وقت یا رخصتی کے وقت پورا مہر نہ بھی دے سکے تو کوئی نہ کوئی تھوڑی بہت چیز ضرور دینی چاہئے تو اس کے لئے کم سے کم قیمت کی چیز ہو تو وہ بھی کافی ہے تو یہ مطلب نہیں کہ لوہے کی انگوٹھی ہی لاؤ اس کا ذکر تو بطور مثال کے ہے اصل میں مقصود قلت کو بیان کرنا ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں دلائل دونوں طرف ہیں شافعیہ کی دلیل صحت کے اعتبار سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ یہ حدیث صحیحین کی ہے اور حنفیہ نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ صحت کے اعتبار سے اس معیار کی

نہیں ہے وہ حسن ہے جب کہ حنفیہ کی دلیل صراحت کے اعتبار سے بڑھ کر ہے کہ اس کی دلالت زیادہ واضح ہے بہ نسبت شافعیہ کی دلیل کے، تو شافعیہ کی دلیل اصح ہے اور حنفیہ کی دلیل اصرح ہے اور احتیاط کا مقتضی یہ ہے کہ حرمت کی دلیل کو اختیار کیا جائے۔

البتہ شافعیہ اس میں یہ تاویل کر سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو لوہے اور پیتل کی انگوٹھی سے تشبہ کی وجہ سے منع فرمایا ہے لہٰذا جہاں تشبہ ہو بکثرت پیتل کے بت بنتے ہوں یا لوہے کی انگوٹھی پہننا کفار کا شعار ہو وہاں تو یہ ممنوع ہو گی ورنہ ممنوع نہیں ہو گی۔

ائمہ کے درمیان مختلف فیہ مسائل میں دونوں طرف دلائل میں کلام کی گنجائش ہوتی ہے اور حتمی اور قطعی فیصلہ کسی جانب نہیں کیا جا سکتا اور عامی آدمی کے لئے یعنی وہ آدمی جس میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہے اس کے لئے تقلید کا حکم اسی لئے ہے کہ کوئی فیصلہ کرنا عام طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ چاندی کے علاوہ کوئی اور انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے حتی کہ سونے اور چاندی کے علاوہ عورتوں کے لئے بھی جائز نہیں ہے آج کل سونے اور چاندی کے علاوہ اور چیزوں کے زیورات بکثرت مروج ہیں مثلاً کانچ کی چوڑیاں پہنی جاتی ہیں اسی طرح دوسری دھاتوں کے عورتوں کے زیورات ہوتے ہیں ان کو بہشتی زیور اور امداد الفتاویٰ میں جائز قرار دیا گیا ہے، عورتوں کے حق میں یہ ممانعت انگوٹھی کے ساتھ خاص ہے۔

(١٤)-----وعن ابنِ مسعود، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يكره عَشرَ خلالٍ: الصُفرةَ- يعني الخلوق- وتغييرَ الشيّبِ، وجرَّ الإزارِ، والتختمَ بالذّهبِ، والتبرُّجَ بالزينةِ لغيرِ محلِّها، والضربَ بالكعابِ، والرُّقى إلّا بالمعوَّذاتِ، وعقدَ التمائمِ، وعزلَ الماءِ لغيرِ محلِّه، وفسادَ الصبيِ غيرَ مُحَرَّمِه- (رواه أبو داود والنسائي)

ترجمہ...... حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس (١٠) کاموں کو ناپسند کیا کرتے تھے: (١) زرد خوشبو یعنی خلوق، (٢) سفید بالوں کے تبدیل کرنے کو، (٣) لنگی وغیرہ کے لمبا کرنے کو، (۴) سونے کی انگوٹھی پہننے کو، (۵) بغیر جائز موقع کے زینت کو ظاہر کرنے کو، (٦) مہروں کے ساتھ کھیلنے کو، (٧) دم کرنے کو مگر یہ کہ وہ معوذات کے ساتھ ہو، (٨) تعویذ لٹکانے کو، (٩) بغیر موقع کے عزل کرنے کو، (١٠) بچے کے بگاڑ کو لیکن اس کو آپ ﷺ نے حرام قرار نہیں دیا۔

دس (١٠) چیزیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرماتے تھے، ناپسند فرمانا عام ہے چاہے

کراہت تحریمی کے درجے میں ہو یا تنزیہی کے درجہ میں۔

جو چیزیں مذکور ہیں ان میں بعض مکروہ تحریمی ہیں بعض مکروہ تنزیہی ہیں۔

(۱)......... پہلی چیز صفرہ ہے اس کو عربی میں خلوق بھی کہتے ہیں یہ زعفران سے بنی ہوئی خاص خوشبو ہوتی ہے اور زرد رنگ کی ہوتی ہے، اس سے منع کیا گیا ہے، مردوں کو اس لئے کہ اس زمانے میں یہ خوشبو عورتوں کے ساتھ خاص تھی اور جو چیز عورتوں کے لئے خاص کر دی جاتی ہو اس کا استعمال مردوں کے لئے ممنوع قرار دیا گیا، لیکن یہ ممنوع ایک تو اس وقت ہے جب کہ بغیر عذر کے ہو اگر عذر کی وجہ سے ہو یعنی کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے لگانی پڑ جائے اور کوئی اور علاج اس کا نہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں، دوسرے یہ ممانعت اس وقت ہے جب کہ بالقصد لگائے اگر غیر ارادی طور پر لگ جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اس کی دلیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے کپڑوں پہ زردی لگی ہوئی تھی یعنی اسی خلوق کے دھبے لگے ہوئے تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ یارسول اللہ! میری شادی ہو گئی ہے، مطلب یہ کہ کپڑوں پر خلوق وغیرہ میں نے خود نہیں لگائی بلکہ بیوی کے کپڑوں پر لگی ہوئی تھی اس کے جسم یا کپڑوں سے مجھے لگ گئی ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا شادی ہو گئی ہے تو پھر ولیمہ کرو اگرچہ بکری ذبح کر کے ہی ہو، تو یہاں ان پر جو خلوق لگی ہوئی تھی اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند نہیں فرمایا اور دھونے کا حکم نہیں دیا اس لئے کہ وہ بغیر قصد کے لگی ہوئی تھی۔

(۲)......... دوسری چیز **تغیر الشیب** ہے سفید بالوں کو بدلنا، بدلنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک ہے سفید بالوں کو اکھیڑنا یہ ممنوع ہے اور دوسرا ہے سفید بالوں پر کوئی رنگ وغیرہ لگا لینا خضاب وغیرہ کر لینا، اگر تو یہ کالے رنگ کا ہو تو مکروہ ہے اور اگر کسی اور رنگ کا ہو تو جائز بلکہ بعض حالت میں مستحسن ہے اور اس کی تفصیل باب الترجل میں انشاء اللہ آجائے گی۔

(۳)......... تیسری چیز جر الآزار ہے جس کا مسئلہ پہلے گزر چکا ہے۔

(۴)......... چوتھی چیز سونے کی انگوٹھی پہننا ہے اور یہ مردوں کیلئے ناجائز ہے، یہ مسئلہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

(۵)......... پانچویں چیز **التَّبَرُّجُ بالزینة لغیرِ محلها** ہے کہ عورت بے موقع اپنی زینت کو ظاہر کرے، بے موقع کا مطلب یہ ہے کہ گھر کے اندر اور محارم کے سامنے تو زینت جائز ہے اس کے علاوہ یعنی گھر سے باہر یا گھر کے اندر غیر محارم کے سامنے اگر زینت کو ظاہر کرتی ہے تو یہ ناجائز ہے: **وَلاَ تُبْدِين زينتهُنَّ إلا لبعولتِهِنَ أو آبائهن أو آباءِ بُعُولَتِهِنَّ الخ۔**

(۶)........... چھٹی چیز ہے الضرب بالکعاب ہے کعاب کعب کی جمع ہے یہ اصل میں خاص قسم کے مہرے ہوتے ہیں جو سیپ کی شکل میں ہوتے ہیں لیکن اس سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں پنجابی میں اس کو کوڈی کہتے ہیں تو اس سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، یہ کھیلنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ شرط لگا کر کھیلا جائے اس میں تو عموماً قمار جوا بن جاتا ہے اس لئے وہ تو ناجائز ہے بغیر شرط لگائے کھیلا جائے تو اس میں اختلاف ہے بعض نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے کھیلوں کی تفصیل انشاءاللہ آگے باب التصاویر میں آجائے گی۔

(۷)........... ساتویں چیز دم درود کرنا ہے اس کو بھی ممنوع قرار دیا ہے لیکن ایک صورت اس سے مستثنیٰ قرار دی وہ یہ کہ معوذات کے ساتھ ہو یعنی ایسے کلمات کے ساتھ ہو جس میں اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہو اصل میں اس زمانے کے عام جو دم اور منتر وغیرہ ہوتے تھے وہ شرکیہ کلمات پر مشتمل ہوتے تھے اس میں زیادہ تر جنات اور شیاطین سے پناہ مانگنے کی درخواست کی جاتی تھی کہ ہمیں اپنی پناہ میں لے لو۔ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا۔ کہ بہت سے انسان انسانوں میں سے بھی عورت نہیں مرد ہو کر جو عموماً بہادر ہوتا ہے وہ بھی جنات کے سامنے اپنے آپ کو ایسا جھکا دیتا تھا کہ ان سے پناہ حاصل کرنے کی درخواست کرتا تھا اور اس کی وجہ سے ان جنات کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں جنات اور شیاطین کی پناہ حاصل کرنے کا عام رواج تھا۔ اس لئے فرمایا: إلا بالمعوّذات کہ جس میں اللہ کی پناہ حاصل کی گئی ہو وہ دم وغیرہ جائز ہے اور جن میں شرکیہ مضمون ہوں وہ جائز نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اگر مضمون وغیرہ ٹھیک ہو تو دم جائز ہے اور اگر مضمون غلط ہو تو وہ ناجائز ہے اور باقی اس مسئلہ کی تفصیل کتاب الطب والرقی میں آجائے گی۔

(۸)........... آٹھویں چیز عقد التمائم ہے یعنی گلوں وغیرہ میں تعویذ لٹکانا اس میں بھی وہی بات ہے کہ اس زمانے میں تعویذ وغیرہ شرکیہ مضامین پر مشتمل ہوتے تھے اس لئے اس سے منع فرمایا لیکن اگر مضمون صحیح ہو تو اس کی گنجائش ہے اور یہ بات بھی آگے کتاب الطب والرقی وغیرہ میں آجائے گی۔

موانع حمل تدابیر:-

(۹)........... نویں چیز "عزل الماء بغیر محله" ہے عزل الماء سے مراد وہی ہے جس کو فقہاء عزل قرار دیتے ہیں یعنی جماع کرتے وقت جب انزال ہونے لگے تو عضو کو باہر نکال لیا جائے تاکہ حمل نہ ٹھہرنے پائے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مانع حمل تدبیر اختیار کرنا، مانع حمل تدابیر دو طرح کی ہیں ایک وہ ہیں جن میں

حمل کی صلاحیت مستقل طور پر ختم ہو جاتی ہے جیسے نس بندی وغیرہ کی جاتی ہے خاص رگیں وغیرہ کٹوادی جاتی ہیں بغیر ضرورت شدیدہ کے وہ تو جائز نہیں ہیں اس لئے کہ وہ تو تغییر خلق اللہ میں داخل ہیں۔

دوسری مانع حمل تدابیر وہ ہیں جو عارضی ہوتی ہیں جیسا کہ آج کل کنڈوم وغیرہ استعمال کیا جاتا ہے اس کا حکم بھی عزل والا ہے تو عزل کا معنی یہاں مانع حمل تدابیر اختیار کرنا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل سے منع فرمایا جب کہ وہ بے موقع ہو۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر موقع پر ہو تو جائز ہے اور اگر بے موقع ہو تو ناجائز ہے اب کون سا عزل موقع پر ہے اور کون سا بے موقع ہے اس کی تفصیل فقہاء نے بیان کی ہے، حنفیہ کے ہاں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تو اپنی باندی ہے تو اس کے ساتھ عزل اس کی اجازت کے ساتھ اور اس کی اجازت کے بغیر دونوں طرح سے جائز ہے اور اگر اپنی بیوی ہے تو اس کی اجازت کے ساتھ عزل جائز ہے اور اس کی اجازت کے بغیر عزل جائز نہیں ہے۔

بغیر اجازت کے عزل کرنا یہ بے موقع ہے اور اگر اجازت کے ساتھ عزل کرتا ہے تو یہ موقع پر ہے اس کے علاوہ اور بھی معانی شارحین نے بیان کئے ہیں مثلاً شہوت زنی کرنا یعنی بے موقع شہوت زنی کرنا۔

اولاد میں وقفہ کا حکم:۔

(۱۰)..........دسویں چیز فساد الصبی ہے فساد الصبی کا معنی یہ ہے کہ پہلے بچے کی مدت رضاعت ابھی پوری نہیں ہوئی وہ ابھی دودھ پی رہا ہے اسی حالت میں دوسرا حمل ٹھہر جائے اس کے بارے میں عربوں کے ہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔

عربوں کا جس انداز کا تصور تھا وہ صحیح ہے یا غلط یہ تو الگ بات ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے ایک تو یہ کہ جب دوسرا حمل ٹھہر جائے گا تو پہلے بچے کی غذا مکمل نہیں ہوگی حالانکہ یہ اس کا حق ہے اور دوسرا یہ کہ جب جلدی سے دوسرا بچہ بھی آجائے گا تو دونوں کی پرورش کی طرف پوری توجہ نہیں ہو سکے گی، جسمانی پرورش بھی صحیح طریقے سے نہیں ہو سکے گی اور اخلاقی تربیت بھی صحیح طریقے سے نہیں ہو سکے گی۔ یہ خرابی اس میں ضرور ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، اس کو غیلہ بھی کہتے ہیں۔

دوسری احادیث میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیلہ سے منع فرمایا کہ پہلے بچے کی مدت رضاعت پوری نہیں ہوئی تو دوسرے بچے کا حمل ٹھہر جانا یہ نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے بلکہ یوں کہئے کہ ارشادی ہے اور اسی کی طرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں اشارہ فرمایا: غیر محرمہ کا لفظ بول کر آپ نے اس سے منع تو فرمایا لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیا۔

10

آج کل اولاد کے درمیان جو وقفے کی بات کی جاتی ہے جس تصور کی بنیاد پر کہی جاتی ہے وہ تو صحیح نہیں ہے لیکن کسی نہ کسی درجے میں اولاد کے درمیان وقفے کا تصور موجود ضرور ہے اس کو اگر کوئی اپنا لے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ دوسرے کا حمل تب ٹھہرے جب پہلے کا رضاع مکمل ہو چکے تو اس مقصد کے لئے اگر عارضی مانع حمل تدابیر اختیار کرلی جائیں تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۱۵)-----وعن ابنِ الزبيرِ: أنَّ مولاةً لهم ذهبت بابنةِ الزبيرِ إلى عمرَ بن الخطابِ وفي رِجلها أجراسٌ، فقطعَها عمرُ وقال: سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول: معَ كلِّ جرسٍ شيطانٌ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی ایک باندی حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئی اور اس وقت اس بچی کے پاؤں میں گھنگرو تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں کاٹ دیا اور یہ فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر گھنگرو کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔

(۱٦)-----وعن بنانة مولاة عبد الرحمٰن بن حيان الأنصارى كانت عند عائشة إذ دخلت عليها بجاربة، وعليها جلاجل يصوتن فقالت: لا تدخلنها على إلا أن تقطعن جلاجلها، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا تدخل الملائكة ببتا فيه جرس۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ...... حضرت بنانہ جو کہ حضرت ابن حیان کی آزاد کردہ باندی ہیں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھیں کہ اتنے میں ان کے پاس ایک لڑکی کو لایا گیا اور اس وقت اس پر گھنگرو تھے یا پازیب تھے جو بج رہے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس نہ لانا مگر یہ کہ اس کے گھنگروؤں کو کاٹ دیا جائے میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں گھنگرو ہو۔

جرس سے ممانعت:-

یہ کئی احادیث ہیں جن میں جرس سے منع کیا گیا ہے مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے: الجرس مزامیر الشیطان کہ جرس شیطان کے مزامیر ہیں جرس کا معنی گھنٹی یا گھنگرو ہے، یہ دو طرح کا ہو سکتا ہے ایک وہ جو جانور

وغیرہ کے گلے میں باندھا جاتا ہے تاکہ جانور چلتا رہے، لمبا سفر کیا جاتا تھا اور بسا اوقات رات کا سفر کیا جاتا تھا تو یہ خطرہ ہوتا تھا کہ آدمی کی کہیں آنکھ لگ جائے اگر اس کے گلے میں گھنگرو ہوگا تو پتہ چل جائے گا کہ جانور چل رہا ہے اور اگر رکے گا اور آواز بند ہو جائے گی تو فوراً احساس ہو جائے گا کہ جانور رک گیا ہے اور ویسے بھی جانور گھنگرو کی آواز سے چلتا رہتا ہے۔

دوسرا گھنگرو وہ ہے جو زیور وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے یعنی پازیب وغیرہ ایسے باندھے جاتے تھے جو بجا کرتے تھے، دونوں سے منع کیا گیا ہے پہلی قسم کے گھنگرو سے نہی کتاب الجہاد میں محدثین ذکر کرتے ہیں اور دوسری قسم کے گھنگرو سے نہی یہاں کتاب اللباس میں ہے۔

پہلے قسم کے گھنگرو سے نہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص حکمت کی وجہ سے کی، وہ وجہ پائی جائے تو ممنوع ہے ورنہ ممنوع نہیں ہے وہ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں سفر عموماً جہاد کے لئے ہوتا تھا اور سفر جہاد میں یہ مطلوب ہوتا ہے کہ لوگوں کو قافلے وغیرہ کا پتہ نہ چلے کہ قافلہ کہاں ہے، اِخفاء مقصود ہوتا ہے اور لوگ سارے کے سارے اپنے جانور وغیرہ کے گلوں میں گھنگرو ڈال لیں اور گھنٹیاں ڈال لیں تو ظاہر ہے کہ دور دور تک آواز جائے گی اور اس وقت دشمن کو بھی پتہ چل سکتا ہے کہ لشکر کہاں ہے اور قافلہ کہاں سے گزر رہا ہے اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی جگہ اِخفاء مطلوب نہ ہو تو اس وقت جانور وغیرہ کے گلے میں گھنٹی باندھنا کسی مقصد کے لئے مثلاً یہی مقصد ہو کہ پتہ چلتا رہے کہ جانور چل رہا ہے جائز ہے۔

دوسری قسم کا گھنگرو لباس میں ہے کہ ایسا پازیب وغیرہ پہننا جو بجتا ہو تو عورت کے لئے ایسا زیور پہننا ٹھیک نہیں ہے جو بجتا ہو کیوں کہ یہ زیور پہن کر باہر بھی جا سکتی ہے اور جب باہر نکلے گی تو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی ویسے کسی کو پتہ چلے یا نہ چلے کہ یہاں سے کوئی گزر رہا ہے لیکن جب اس کی آواز آئے گی تو آدمی خلقی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس چیز کی آواز ہے، اس وجہ سے منع کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گھر کے اندر اگر ایسا زیور وغیرہ پہنتی ہے تو اس کی گنجائش ہے لیکن ایسا زیور بنوانا ہی نہیں چاہئے کیوں کہ جب بنوالیا تو ظاہر ہے اس کو گھر میں بھی پہنے گی اور پہن کر گھر سے باہر بھی جائے گی۔

(۱۷)-----وعن عبدِالرحمنِ بن طرَفَةَ، أنَّ جدَّه عَرفجةَ بن أسعد قُطِعَ أنفُه يومَ الكُلابِ، فاتخذَ أنفاً من ورِقٍ، فأنتنَ عليه، فأمره النبی صلی الله علیه وسلم أن يتخذَ أنفاً من ذهبٍ۔ (رواه الترمذی وأبو داود والنسائی)

ترجمہ ...... عبدالرحمٰن بن طرفہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا عرفجہ بن اسعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ناک کلاب کی جنگ میں کٹ گئی تھی تو انہوں نے ایک چاندی کی ناک

لگوائی لیکن وہ ان کے جسم پر بدبودار ہو گئی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ سونے کی ناک لگوالیں۔

یوم الکلاب زمانۂ جاہلیت کی ایک مشہور جنگ ہے اس میں عرفجہ بن اسعد بھی شریک ہوئے ہوں گے اور اس جنگ کے اندر ان کی ناک کٹ گئی تو اس کی جگہ پر چاندی کی مصنوعی ناک لگوائی لیکن چاندی کے اندر بدبو پیدا ہو جاتی ہے اگر جسم کے ساتھ لگی رہے، ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ سونے کی ناک لگوانے کا حکم دیا اس لئے کہ سونا جسم پر لگا بھی رہے تو وہاں پر بدبو پیدا نہیں ہوتی، تعفن پیدا نہیں ہوتا تو اس سے معلوم ہوا کہ مصنوعی اعضاء آج کل کی کوئی نئی ایجاد نہیں ہیں بلکہ قدیم زمانے سے مروج ہیں۔

سونے، چاندی کے مصنوعی اعضاء کی پیوندکاری:۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مصنوعی اعضاء اگر سونے کے لگوالئے جائیں تو یہ بھی جائز ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ناک لگوانے کا حکم کیا، سونے کی ناک کے بارے میں تو اتفاق ہے کہ یہ جائز ہے لیکن اگر کسی کو سونے کا دانت لگوانا پڑ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ چاندی کے دانت کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ جائز ہے اور آج کل جو مخصوص قسم کے مسالوں کے بنے ہوئے دانت ہوتے ہیں وہ بھی بالاتفاق جائز ہیں البتہ سونے کے دانت کے بارے میں امام محمد رحمہ اللہ علیہ کا مذہب تو یہی ہے کہ وہ جائز ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مختلف روایتیں ہیں ایک روایت کراہت کی ہے اور ایک روایت جواز کی ہے، اصح جواز کی روایت ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی ناک لگوانے کی اجازت دی اس سے معلوم ہوا کہ سونے کے مصنوعی اعضاء لگوانا جائز ہے جب ناک جائز ہے تو دانت بھی بظاہر جائز ہونا چاہئے، دوسرا یہ کہ مسند بزار کی روایت ہے جس کو علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا دانت لگوانے کی اجازت دی پہلے انہوں نے چاندی کا دانت لگوایا تھا لیکن وہ خراب ہو گیا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا دانت لگوانے کی اجازت دی کیوں کہ سونے کا دانت خراب نہیں ہوتا۔[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سونے کا دانت بھی لگوانا جائز ہے، جب سونے کا دانت لگوانا جائز ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دانتوں کو سونے کی تار کے ساتھ باندھنا تاکہ وہ سیدھے رہیں یا سیدھے ہو جائیں تو یہ بھی جائز ہے۔

---

(۱) روایت پر تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن ج ۱۷ / ص ۲۹۴

(۱۸)-----وعن أبی هریرةَ، أنَّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: مَن أحبَّ أن یُحلِقَ حبیبه حلقةً من نارٍ فلیُحلِّقه حَلقةً من ذهبٍ، ومَن أحبَّ أن یُطوقَ حبیبَه طوقاً من نارٍ فلیُطوّقه طوقاً من ذهبٍ، ومَن أحبَّ أن یُسوَّرَ حبیبَه سِواراً من نارٍ فلیُسوِّره سواراً من ذهبٍ، ولکن علیکم بالفضَّةِ فالعَبوا بها۔ (رواه أبوداود)

ترجمہ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی چاہے کہ اس کے دوست کو آگ کا حلقہ (یعنی بالی وغیرہ) پہنائی جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو سونے کا حلقہ (یعنی بالی وغیرہ) پہنا دے اور جو آدمی چاہے کہ اس کے دوست کو آگ کا ہار وغیرہ پہنایا جائے (یعنی قیامت کے دن) تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دنیا میں سونے کا ہار پہنا دے اور جو آدمی یہ چاہے کہ اس کے دوست کو قیامت کے دن آگ کا کنگن پہنایا جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے سونے کا کنگن پہنا دے لیکن تم چاندی کو اختیار کرو اور اس کو اپنے لعب کا ذریعہ بناؤ۔

یہاں یہ حبیب کا لفظ ہے کہ جو آدمی چاہے کہ اس کے حبیب کو آگ کا حلقہ پہنایا جائے تو وہ اسے سونے کا حلقہ پہنا دے بظاہر یہاں حبیب سے مراد بیوی ہے کہ جو آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کو آگ کے زیورات قیامت کے دن پہنائے جائیں تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دنیا میں سونے کے زیور پہنائے اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی کو آگ کے زیور پہنائے جائیں تو مطلب یہ ہوا کہ اسے سونے کے زیور بھی نہ پہناؤ بلکہ چاندی کا زیور پہناؤ اور چاندی کے بارے میں بھی لفظ استعمال کیا ''فالعبوا بہا'' کہ اس کو استعمال کرو، اس کے لئے لعب کا لفظ استعمال کیا اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ چاندی کا زیور بھی ایک قسم کا لعب ہی ہے یہ مقاصد زندگی میں سے نہیں ہے بلکہ زوائد زندگی میں سے ہے، باقی یہ مسئلہ کہ سونا پہننا عورت کے لئے جائز ہے یا نہیں اگلی ایک دو حدیثوں کا ترجمہ دیکھ لیں اس کے بعد بیان کیا جائے گا۔

(۱۹)----- وعن أسماءَ بنتِ یزید، أنَّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: أیّما امرأةٍ تقلّدت قِلادةً من ذهبٍ قُلِّدت فی عُنقِها مثلَها من النارِ یومَ القیامةِ، وأیّما امرأةٍ جعلَت فی أذنِها خُرصًا من ذهبٍ جعلَ اللهُ فی أذنها مثلَه من النارِ یوم القیامة۔ (رواه أبوداود والنسائی)

ترجمہ...... حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایسی عورت جو سونے کا ہار پہنے تو اس کی گردن میں اسی جیسا ہار قیامت کے دن آگ کا پہنایا جائے گا اور ہر ایسی عورت جو اپنے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسی جیسی بالیاں آگ کی اس کے کانوں میں ڈالیں گے۔

(۲۰)-----وعن أختٍ لحذيفةَ، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يا معشر النساءِ! أما لكُنَّ في الفضّةِ ما تحلّينَ بهِ؟ أما إنَّه ليسَ منكنَّ امرأةٌ تحلّى ذهبًا تظهره إلّا عُذّبت به۔ (رواه أبو داود والنسائي)

ترجمہ ...... حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بہن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ کہ کیا تمہیں چاندی کے اندر رغبت نہیں ہے جس سے تم زینت حاصل کرو، بات یہ ہے کہ تم میں سے جو عورت بھی سونے کا زیور پہنے گی جسے وہ ظاہر کرے گی تو اس کی وجہ سے ضرور اسے عذاب دیا جائے گا (یا اس کے ذریعہ سے اسے ضرور عذاب دیا جائے گا)۔

سونے کے زیورات مردوں پر حرام عورتوں کے لئے جائز:-

یہ تین حدیثیں بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سونے کے زیورات جیسے مردوں پر حرام ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی حرام ہیں جب کہ اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ سونے کے زیورات مردوں کے لئے جائز نہیں ہیں، عورتوں کے لئے سونے کا جواز احادیث مشہورہ سے ثابت ہے۔

بعض لوگ اس بات پر بہت زور دینے لگ جاتے ہیں کہ عورتوں کو سونے کے زیور نہیں پہننے چاہئے بلکہ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ عورتوں کے لئے سونے کے زیورات پہننا حرام اور مکروہ ہیں، لیکن ان کا یہ مؤقف اجماع کے خلاف تو ہے ہی احادیث کثیرہ کے بھی خلاف ہے۔

عورتوں کے لئے سونا پہننے کا ثبوت احادیث سے:-

چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱)............الفصل الثانی کے تیسرے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے جس کو احمد، ابوداؤد، نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا اور سونے کو بائیں ہاتھ میں پکڑا اور یہ فرمایا کہ **ان هذين حرام على ذكور امتي**۔ کہ یہ دو چیزیں میری امت کے مردوں

پر حرام ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ مردوں پر حرام ہیں عورتوں پر حرام نہیں اور یہ روایت یہاں مختصراً روایت کی گئی ہے دوسری جگہ پر یہ بھی آتا ہے کہ یہ میری امت کے مردوں پر حرام ہے اور عورتوں پر حلال ہے۔

(۲)........... حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جسے امام ترمذی اور نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **حرم لباس الحرير والذهب على ذكور امتي واحل لاناثهم** ۔اور یہ حدیث روایت کرنے کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **هذا حديث حسن صحيح** ۔اور امام نسائی نے بھی اس حدیث پر سکوت فرمایا ہے اور امام نسائی جو حدیث اپنی سنن صغریٰ میں روایت کریں اور اس پر وہ کوئی کلام نہ کریں وہ ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے۔

(۳)........... اسی قسم کی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **احل الذهب والحرير لاناث من امتي وحرم على ذكورها** ۔

(۴)........... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی اسی مضمون کی ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں ریشم تھا اور دوسرے ہاتھ میں سونا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان هذين محرم على ذكور امتي احل لاناثهم** ۔اس حدیث کو اسحاق بن راہویہ بزاز اور ابو یعلی نے اپنی اپنی مسند میں ذکر کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے بھی اپنے مصنف میں روایت کیا ہے اور طبرانی نے اپنے معجم میں روایت کیا ہے۔

(۵)........... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے اس کا مضمون بھی یہی ہے جس کو بزاز نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

(۶)........... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس کا مضمون بھی وہی ہے اور اس کو بزاز اور طبرانی نے روایت کیا ہے۔

(۷)........... حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

(۸)........... حضرت واثلۃ بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس کا مضمون بھی وہی ہے اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔

(۹)........... حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ کی حدیث جسے ابو سعید نے تاریخ مصر میں روایت کیا ہے۔

یہ جتنی بھی حدیثیں ہیں ان کی سندیں نصب الرایہ جلد نمبر ۴ صفحہ نمبر ۲۲۳ سے ۲۲۵ تک پر دیکھ سکتے ہیں ان میں سے کئی حدیثوں کی سندیں ضعیف بھی ہیں لیکن بعض کی سندیں صحیح بھی ہیں جیسے حضرت ابو موسیٰ

اشعری کی حدیث اور یہ ضعیف حدیثیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی تو اور زیادہ تقویت ہو جائے گی۔

(۱۰)......... مشکاۃ کے صفحہ نمبر ۱۶۰ پر عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے جس کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو عورتیں حاضر ہوئیں ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو ان دونوں نے کہا کہ نہیں، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم چاہتی ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان دونوں کی جگہ آگ کے کنگن پہنائیں، تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم نہیں چاہتیں، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔

اس سے دو مسئلے سمجھ میں آئے ایک یہ کہ سونے کے زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے اور دوسرا یہ کہ سونے کے زیورات سے زکوٰۃ ادا ہوتی رہے تو پہننے میں کوئی حرج نہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ نہ دینے پر تو انکار فرمایا لیکن ان کے پہننے پر انکار نہیں فرمایا، معلوم ہوا ان کا پہننا جائز ہے۔

(۱۱)......... اسی صفحہ پر اگلی حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے، پچھلی حدیث تو سند کے اعتبار سے ضعیف تھی لیکن یہ سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اسے امام مالک نے مؤطا میں اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سونے کے زیور پہنا کرتی تھی تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا یہ بھی کنز میں داخل ہیں کیونکہ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ کیا یہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زیورات جو نصاب کو پہنچ جائیں اور ان کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں تو یہاں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سونے کے زیورات پہنا کرتی تھی صرف یہ نہیں کہ میرے پاس تھے بلکہ پہنا کرتی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہننے سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ جب یہ نصاب کو پہنچ جائیں تو ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے اس کے علاوہ سونے کے زیورات میں زکوٰۃ کی اور بھی کئی حدیثیں ہیں وہ سب کی سب جیسے سونے کے زیورات کے وجوب زکوٰۃ پر دلالت کر رہی ہیں ایسے ہی سونے کے زیورات کے پہننے کے جواز پر بھی دلالت کر رہی ہیں۔

(۱۲)......... امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تعلیقاً روایت کیا ہے یعنی بغیر سند کے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سونے کی انگوٹھیاں پہنا کرتی تھیں۔[1] اور آپ جانتے

---

(۱) صحیح البخاری کتاب اللباس باب الخاتم للنساء

ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ جو روایت تعلیقاروایت کریں وہ بھی صحیح ہوتی ہے۔ یہ بھی دلیل ہے کہ عورتوں کے لئے سونا پہننا جائز ہے۔

(۱۳)......... ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں ایک حدیث روایت کی ہے کہ نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ ہدایا بھیجے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمادیئے ان میں سے ایک چھوٹی سی سونے کی انگوٹھی بچ گئی جو بظاہر کسی کے سائز کی بھی نہیں تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھوٹی نواسی امامہ بنت ابی العاص کو بلوایا اور وہ انگوٹھی اسے پہنادی۔[1] یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خود بھجوادیتے لیکن اگر بچے کو خود دیں تو اسے خوشی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ شفقت کا بھی اظہار ہوتا ہے اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اسے بلوایا کر خود اسے پہنائی اس سے بھی معلوم ہوا کہ سونا پہننا عورتوں کے لئے جائز ہے۔

(۱۴)......... امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے انہوں نے اپنی بہنوں کو سونے کے زیور پہنائے اور حضرت ابن عمر کے بارے میں بھی کتاب الآثار میں یہی روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو سونا پہنایا۔[2]

(۱۵)......... زینب بنت عبیط کہتی ہیں کہ میری والدہ اور میری خالہ نے مجھے بتایا کہ حضور اقدس ﷺ نے ان کو سونے کے زیور پہنائے یعنی پہننے کے لئے دیئے، اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند کے بارے میں علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں یہ کہا ہے کہ اس کے سارے راوی ثقہ ہیں لیکن ایک راوی پر کلام ہے لیکن اس کی حدیث بھی حسن سے کم نہیں۔[3] لہٰذا یہ روایت بھی کم از کم حسن ضرور ہے یہ چند حدیثیں اور روایتیں آپ کے سامنے ذکر کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے سونے کے زیورات پہننا جائز ہیں اگر آپ تلاش کریں تو ہو سکتا ہے اور بھی مل جائیں۔

صحابہ و تابعین کے زمانے میں عورتوں کے لئے بلا انکار سونا پہننے کا رواج:۔

اس کے علاوہ مزید براں یہ کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے سے لے کر آج تک عورتوں میں سونا پہننے کا رواج چلا آرہا ہے اور کبھی اس پر انکار نہیں کیا گیا گویا امت میں اس کو تلقی بالقبول حاصل ہے اور اگر کوئی حدیث ضعیف بھی ہو اور اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو جائے تو وہ عام خبر واحد سے بڑھ جاتی ہے اور یہاں اور روایات بھی پندرہ سے زائد ہیں اور تلقی بالقبول بھی حاصل ہے اس لئے عورتوں کے لئے سونے کا جواز بغیر کسی تردد کے ثابت ہے۔

---

(۱) اعلاء السنن ج ۱۷/ ص ۳۱۲ و مصنف ابن ابی شیبہ نمبر ۲۵۱۴۱...... (۲) اعلاء السنن ج ۱۷/ ص ۲۸۸...... (۳) اعلاء السنن ج ۱۷/ ص ۲۹۰

سونا پہننے کے عدم جواز والی احادیث کی توجیہات:-

اب آیئے ان تین احادیث کی طرف جو مشکوٰۃ میں مذکور ہیں ان سے بظاہر سونا پہننے کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ احادیث چونکہ احادیث کثیرہ کے بظاہر خلاف ہیں اور امت کے مسلسل عمل کے بھی خلاف ہے اس لئے ان میں توجیہ کی ضرورت ہے۔

توجیہ کی ضرورت:-

توجیہ ہم اس وجہ سے نہیں کر رہے کہ یہ ہماری رائے کے خلاف ہے اور کھینچ تان کر حدیث کو اپنی رائے پر منطبق کرنا ہے بلکہ توجیہ کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ یہ دو تین حدیثیں احادیث کثیرہ کے خلاف ہیں اگر توجیہ نہیں کریں گے تو ان حدیثوں کو رد کرنا پڑے گا کیوں کہ اتنی زیادہ حدیثوں کے مقابلہ میں جو ایک دو حدیثیں آئیں گی وہ رد کرنا پڑیں گی لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان حدیثوں کو رد نہ کرنا پڑے اس لئے ان کے اندر توجیہ کر رہے ہیں۔

توجیہات:-

(۱)............ایک توجیہ تو یہ کی گئی ہے کہ ابتدائے اسلام میں سونا اور ریشم عورتوں پر بھی حرام تھے بعد میں ان کو جائز قرار دے دیا گیا، تو یہ حدیثیں اس دور پر محمول ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ حدیثیں منسوخ ہیں۔

(۲)............دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ حدیثیں اس صورت پر محمول ہیں جب کہ زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو۔

اس کی تائید ان حدیثوں سے ہوتی ہے جو زکوٰۃ کے باب میں ذکر کی گئی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو یہ کنز ہیں اور اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ والی وعید اس پر لاگو ہوگی اور اگر زکوٰۃ ادا کی جائے تو یہ وعید نہیں اسی طرح حضور اقدس ﷺ نے ان دو عورتوں کو فرمایا کہ کیا تم چاہتی ہو اس کی جگہ آگ کے کنگن تم دونوں کو پہنائے جائیں اور یہاں پر بھی یہی بات ہے کہ جو سونے کے کنگن پہنے گی اسے آگ کے کنگن پہنائے جائیں گے تو اس حدیث نے بتایا کہ آگ کے کنگن پہنائے جانا اس وقت ہے جب کہ زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو یہ وعیدیں ساری کی ساری س صورت میں ہیں جب کہ زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔

سوال ......اس پر سوال اٹھایا گیا ہے کہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید تو چاندی کے بارے میں بھی ہے اگر کوئی عورت چاندی کے زیورات پہنتی ہے اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو یہ وعید اس پر بھی ہے پھر یہاں صرف سونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟

جواب ...... اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں سونے کا نصاب تھوڑا ہے ساڑھے سات تولے اور چاندی کا نصاب اس سے بہت زیادہ ہے یعنی باون تولے، اس لئے سونے کا زیور زکوٰۃ کے نصاب تک جلدی پہنچ جاتا ہے اور چاندی کا زیور عموماً نصاب تک نہیں پہنچتا اس لئے چاندی کا ذکر حدیثوں میں نہیں کیا گیا اور چاندی نصاب تک اس وقت پہنچتی ہے جب کہ دراہم وغیرہ کی شکل میں ہو۔

(۳)........... اور تیسری توجیہ اور وہ کافی قوی توجیہ ہے وہ یہ کہ یہ ساری وعیدیں اس صورت میں ہیں جب کہ فخر ریا اور دکھاوے کے لئے سونے کا زیور پہنا جائے اور اس کی تائید حضرت حذیفہ کی بہن کی حدیث سے ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں لفظ آئے ہیں: **لیس منکن امراۃ تحلی ذھبا تظھرہ الاعذبت بہ۔** محض سونا پہننے پر وعید نہیں بلکہ سونا پہن کر اسے ظاہر کرنے پر وعید ہے تو معلوم ہوا کہ وعیدیں اس صورت پر ہیں جب کہ دکھاوے اور فخر کے طور پر اسے پہنا جائے۔

سوال ...... یہاں پر بھی وہی سوال ہے کہ دکھاوا تو چاندی میں بلکہ ہر چیز میں ناجائز ہے؟

جواب ...... اس کا جواب یہ ہے کہ چاندی میں دکھاوا عموماً ہوتا نہیں ہے اس لئے کہ وہ معمولی اور ہلکے درجے کا زیور سمجھا جاتا ہے دکھاوے اور فخر کا امکان ہی سونے کے اندر ہوتا ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صرف سونے کے بارے میں بیان فرمائی ہے۔

لہٰذا جو بھی توجیہیں کی جائیں یہ بات ضرور ہے کہ ایک طرف چند حدیثیں ہیں اور دوسری طرف یہ کثیر حدیثیں ہیں اور امت کا توارث ہے تو معلوم ہوا کہ اگر ان حدیثوں کی توجیہ ہو جائے ان حدیثوں کے مقابلہ میں تو یہ قابل قبول ہیں اگر ان کی توجیہ نہ ہو تو یہ قابل قبول نہیں۔

الفصل الثالث

(۲۱) ----عن عقبةَ بنِ عامرٍ، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم كانَ يمنعُ أهلَ الحليةِ والحريرِ، ويقول: إن كنتم تحبونَ حليةَ الجنَّةِ وحريرَها فلا تلبَسوها في الدنيا۔ (رواه النسائي)

ترجمہ ...... حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ریشم والوں کو منع فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے اگر تم ریشم اور جنت کا زیور چاہتے ہو تو ان کو دنیا میں نہ پہنو۔

مردوں کے لئے مطلقاً ممنوع ہے اور عورتوں کے لئے اس میں زیادہ کثرت مناسب نہیں۔

قلیل ہونے کا معیار:-

اب تھوڑا زیور کون سا ہوگا اور زیادہ زیور کون سا ہوگا تو اس کا مدار عرف پر ہے جتنا عام طور پر کسی عرف میں پہنا جاتا ہے اتنا پہننے میں کوئی حرج نہیں اور عام طور پر اس میں دکھاوے وغیرہ کی نیت نہیں ہوتی اور جب اس سے زیادہ پہنے گی تو اس میں فخر اور دکھاوا شامل ہونے کا خطرہ ہے۔

(۲۲) ----- وعن ابنِ عبَّاس، أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم اتخذَ خاتماً، فلبِسَه، قال: شغلَني هذا عنكم منذُ اليوم، إليهِ نظرة، وإليكم نظرة ثمَّ ألقاه۔ (رواه النسائي)

ترجمہ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک انگوٹھی بنوائی اور اسے پہنا اور فرمایا کہ آج سے اس انگوٹھی نے مجھے تمہاری طرف توجہ کرنے سے قاصر کر دیا ہے کہ ایک نظر اس انگوٹھی کی طرف ہوتی ہے اور ایک نظر تمہاری طرف ہوتی ہے۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انگوٹھی کو اتار دیا۔

یہ انگوٹھی کس چیز کی تھی دونوں احتمال ہو سکتے ہیں سونے کی بھی ہو سکتی ہے اور چاندی کی بھی ہو سکتی ہے۔

خوبصورت انگوٹھی زینت کے لئے پہننا:-

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ انگوٹھی زینت کے لئے پہنی تھی اور ذرا خوبصورت انگوٹھی ہو گی لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس لئے اتار دیا کہ اس انگوٹھی کی وجہ سے میں تمہاری طرف پوری طرح توجہ نہیں کر پاتا بلکہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے یہ انگوٹھی مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میں جب تمہاری طرف آؤں تو میں مکمل طور پر متوجہ ہوں اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انگوٹھی کو اتار دیا۔

انگوٹھی کے مشغول کرنے کا مطلب:-

اب یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس انگوٹھی نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کرنے سے قاصر کر دیا ہے کیوں کہ یہ انگوٹھی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، تو اس کا کیا مطلب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی دنیا کی محبت اور دنیا کی طرف کشش تھی، یہ بات نہیں بلکہ اصل میں یہ ہے کہ وہ انگوٹھی بہر حال خوبصورت تھی اور ہر ذوق لطیف والا آدمی خوبصورت چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لطیف ذوق اور کس کا ہو سکتا ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کبھی انگوٹھی کی طرف جاتی اور کبھی صحابہ کی طرف جاتی۔

احباب و متعلقین کی طرف توجہ کرنا:-

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انگوٹھی کو اس لئے نہیں اتارا کہ اللہ کی طرف توجہ سے مانع ہے، نماز میں خشوع سے مانع ہے بلکہ اس لئے اتارا کہ اپنے احباب و متعلقین کی طرف توجہ سے مانع ہے، تو معلوم ہوا کہ اپنے احباب اور متعلقین کی طرف توجہ بھی مقاصد میں سے ہے خاص طور پر جس کے ذمہ اصلاح اور ارشاد کا کام ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف توجہ الی اللہ ہی کو اہمیت نہیں دی بلکہ اپنے احباب کی طرف توجہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دی، ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوبصورت چادر اوڑھی اور اس میں نماز پڑھی نماز پڑھنے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتار دیا اور فرمایا کہ وہ جو میری أنبجانیہ ہے یعنی سادہ سی چادر ہے وہ لے آؤ اس لئے کہ اس کی وجہ سے میری نماز میں توجہ بٹ رہی ہے، جو چیز توجہ الی اللہ سے مانع تھی اس کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے دور کر دیا اور یہاں جو چیز اپنے احباب کی طرف توجہ سے مانع تھی اسے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے دور کر دیا۔

مقام ولایت اور مقام نبوت میں فرق:-

یہی فرق ہوتا ہے مقام ولایت اور مقام نبوت میں کہ ولایت کے اندر ساری کی ساری توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے وہ بھی ایک درجہ ہے اور قرب نبوت کے اندر توجہ الی الخالق بھی ہوتی ہے اور توجہ الی المخلوق بھی ہوتی ہے۔ لیکن ہماری توجہ الیٰ المخلوق میں اور نبی کی توجہ الیٰ المخلوق میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ہماری توجہ الیٰ المخلوق محبت مخلوق کی وجہ سے ہے اور نبیؑ کی توجہ الیٰ المخلوق مخلوق کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ خالق کے تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے۔

وہ دراصل مخلوق کے آئینے میں بھی اللہ کا مشاہدہ کرتا ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ آدمی اپنے محبوب کو براہ راست دیکھ رہا ہے یہ بھی ایک محبوب کے ساتھ تعلق ہے، دوسرا یہ کہ محبوب نے خود کہا کہ مجھے براہ راست نہ دیکھو بلکہ آئینے میں سے دیکھو تو سامنے ایک آئینے کی دکان تھی جس میں آئینے لٹکے ہوئے تھے وہاں جا کر آئینے میں دیکھنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اسی دکان

پر ایک گاہک آیا آئینہ خریدنے کے لئے وہ بھی آئینہ دیکھنے لگا اس کی توجہ بھی آئینے کی طرف ہے اور اس گاہک کی توجہ بھی آئینے کی طرف ہے لیکن توجہ توجہ میں فرق ہے، گاہک کی توجہ صرف آئینے کی طرف ہے اور اس شخص کی توجہ اگرچہ آئینے کی طرف ہے لیکن آئینہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالتبع ہے۔ یہی معاملہ انبیاء کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ مخلوق کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں لیکن ان کی توجہ الی المخلوق توجہ الی الخالق سے مانع نہیں ہوتی بلکہ ایک معنی میں یہ بھی خالق کی طرف توجہ ہے، بس ایک براہ راست توجہ ہے ایک بالواسطہ توجہ ہے یہ ہے مقام نبوت اور اولیاء میں بھی دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، پہلی قسم کے بھی ہوتے ہیں دوسری قسم کے بھی ہوتے ہیں اور دوسری قسم والے جو لوگ ہوتے ہیں ان کو بسا اوقات یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کو نبوت والی نسبت حاصل ہے یا مقام نبوت پر فائز ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کو نعوذ باللہ نبوت مل گئی ہے بلکہ قرب کی اصل میں یہ دو نوعیں ہیں، صوفیاء کے نزدیک اصل میں یہ ولایت کی دو نوعیتوں کا نام ہے ان کو بسا اوقات قرب فرائض اور قرب نوافل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

یہ اصل میں صوفیاء کی اصطلاحات ہیں اور ان کی وجہ سے بعض لوگوں کو شبہ پڑ جاتا ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید اوروں کو بھی نبی کہہ رہے ہیں۔

خیر یہ بات کر رہا تھا کہ مقام نبوت کی ایک شان یہ ہے کہ اس میں اللہ کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے اور اپنے احباب کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے لیکن یہ توجہ بھی اللہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور انبیاء کے وہ وارث جن کے ذمہ اصلاح اور ارشاد کا کام ہوتا ہے ان کی بھی عموماً یہی شان ہوتی ہے وہ اپنے احباب کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک مقولہ ہے کہ جنت کا شوق مجھے پہلے بھی تھا لیکن اس وقت سے مجھے جنت کا شوق بڑھ گیا ہے جب سے مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ جنت میں احباب سے ملاقات ہوتی ہے۔

مقام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم:۔

اس حدیث سے صحابہ کرام کا مقام بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو محض دین نہیں پہنچایا محض دین کی دعوت نہیں دی بلکہ پوری توجہ ان کی طرف مبذول فرمائی۔

جس مرید کے بارے میں یہ پتہ چل جائے کہ اس کے شیخ نے اس مرید کی طرف بڑی توجہ فرمائی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرید کو فیض بھی کامل درجے کا ملا ہے کیوں کہ فیض کے حصول میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ مرید میں طلب صادق ہو اور ایک یہ کہ شیخ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو اور یہاں نبی کریم ﷺ کو صحابہ کی طرف توجہ کا اتنا اہتمام تھا کہ چھوٹی سی انگوٹھی اس میں رکاوٹ بنی تو اس کو بھی اتار دیا۔

(۲۳)----وعن مالك، قال: أنا أكره أن يُلبَس الغلمانُ شيئاً منَ الذهبِ، لأنه بلغني أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم نهى عن التختمِ بالذهبِ، فأنا أكره للرِّجالِ الكبيرِ منهم والصَّغيرِ۔ (رواه في الموطأ)

ترجمہ...... امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لڑکوں کو سونے میں سے کوئی چیز پہنائی جائے اس لئے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا ہے تو میں مردوں کے لئے ناپسند سمجھتا ہوں چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے۔

نابالغ بچوں کو ریشم وغیرہ پہننا:-

مسئلہ یہاں پر ہے کہ ریشم اور سونا مردوں پر حرام ہے تو کیا نابالغ لڑکوں کو یہ چیزیں پہنائی جاسکتی ہیں۔

حضرات شافعیہ کا مذہب ...... تو شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ بالغ مردوں پر تو ریشم حرام ہے لیکن نابالغ لڑکے کو ریشم پہنایا جاسکتا ہے اور خاص طور پر عید کے دن ان کے نزدیک بچوں کو ریشمی لباس پہنانا مستحسن ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب ...... حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ جو چیز بالغ مردوں کے لئے حرام ہے وہ نابالغ بچوں کو بھی نہیں پہنائی جاسکتی۔

فرق اتنا ہے کہ بالغ خود پہنے گا تو پہننے والے کو گناہ ہوگا اور اگر نابالغ لڑکے کو پہنایا گیا ہے تو خود پہننے والے کو تو گناہ نہیں ہوگا کیوں کہ خود مکلف ہی نہیں ہے البتہ پہنانے والے یا پہنانے والی کو گناہ ہوگا۔

حنفیہ کے دلائل......

(۱)......... ہماری دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں سونا پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں ریشم اور فرمایا کہ یہ دو چیزیں حرام ہیں میری امت کے ذکور پر، حدیث میں مذکروں کا ذکر ہے اور مذکر بالغ بھی ہیں اور نابالغ بھی ہیں، تو ذکور کا لفظ یہ بتلا رہا ہے کہ یہ حکم صرف بالغ کے لئے نہیں ہے بلکہ نابالغ کے لئے بھی ہے۔اول تو رجال کا لفظ ہوتا تب بھی یہی تھا کہ وہ بھی رجل ہے اور وہ بھی رجل ہے لیکن اس میں یہ بھی تاویل ہو سکتی ہے کہ رجل بسا اوقات صرف بالغ کو ہی کہتے ہیں اور ذکر ہر مذکر کو کہتے ہیں چاہے بالغ ہو یا نابالغ ہو۔

(۲)......... دوسری دلیل بنانہ کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک بچی لائی گئی جس

نے ایسے پازیب پہن رکھے تھے جو آواز دے رہے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر اس بچی کو میرے پاس لانا ہے تو ان جلاجل کو ان پازیب کو ان گھنگروں کو اتار کر یا کاٹ کر میرے پاس لاؤ حالانکہ وہ چھوٹی بچی تھی تو پتہ چلا کہ جو چیز بڑوں کے لئے ناجائز ہے اس کا چھوٹوں کو پہنانا بھی ناجائز ہے۔

(۳)............ تیسری دلیل کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک لمبے سفر پر تشریف لے گئے بعد میں آئے تو دیکھا کہ ان کے بچوں کو ریشم پہنایا ہوا ہے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے لڑکیوں پر تو ریشم رہنے دیا لیکن لڑکوں سے اتروالیا تو اس سے معلوم ہوا کہ چھوٹے بچوں کے لئے بھی سونا اور ریشم جائز نہیں ہے۔[1]

(۴)............ چوتھی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بچہ آیا جس نے ریشم پہن رکھا تھا اس نے کہا کہ میری امی نے پہنایا ہے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنی امی سے کہنا کہ آئندہ مجھے یہ نہ پہنایا کریں تو معلوم ہوا کہ بچے کو بھی ریشم پہنانا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) اخرجہ محمد فی الآثار اعلاء السنن ج ۱۷ / ص ۳۴۸

باب النعال

الفصل الاوّل

(۱)-----عن ابنِ عمرَ، قال: رأيتُ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم یَلبسُ النعالَ التی لیسَ فیها شعرٌ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا کہ آپ ایسے جوتے پہنتے تھے جن میں بال نہیں ہوتے تھے۔

اصل میں عربوں کے ہاں بہت زیادہ سادگی تھی، کھانے پینے اور لباس میں تکلفات نہیں ہوتے تھے، جوتا چمڑے کا بنتا تھا جانور کی کھال کا بنتا تھا، ویسے ہی سیدھی سیدھی کھال کو کاٹ کر اس کا جوتا بنا لیتے تھے، اس کو صاف بھی نہیں کرتے تھے اس لئے عام طور پر جو جوتے مروج تھے ان کے بال نہیں کاٹے جاتے تھے، کھال کے بال نہیں اتارے جاتے تھے۔ تو عربوں میں مروج جو زیادہ جوتے تھے ان پر بال ہوتے تھے اور دوسرے ملکوں سے اور دوسرے علاقوں سے بن کر کچھ جوتے ایسے بھی آتے تھے جن کو دباغت بھی دی جاتی تھی ان کے بال بھی اچھے طریقے سے اتار کر جوتے بنائے جاتے تھے اور یہ جوتے عمدہ اور ذرا بڑھیا قسم کے سمجھے جاتے تھے لیکن یہ ذرا کم مروج تھے پہلی قسم کے جوتے زیادہ مروج تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جو بات ارشاد فرمائی کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے جوتے پہنے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نعال سبتیہ پہنے ہوئے دیکھا، یہ بات انہوں نے اصل میں ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی، ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا، کچھ اعتراضات کئے ان میں سے ایک سوال اور ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ سبتی جوتے پہنتے ہیں حالانکہ اور بہت سارے آپ کے ساتھیوں کو دیکھا وہ نہیں پہنتے سوال کا منشاء بظاہر دو باتیں ہو سکتی ہیں:

(۱)............ ایک یہ کہ اس زمانے میں سبتی جوتے بظاہر تنعم کی علامت تھی اعلیٰ لباس سمجھا جاتا تھا تو اس نے ان کے پہننے کو سادگی کے خلاف سمجھا۔

(۲)............ اور دوسرا یہ کہ یہ جوتے اس وقت عجم سے بن کر آتے تھے اور ایسے علاقوں سے بن کر آتے تھے جو کافروں کے علاقے تھے تو گویا یہ کافروں کے جوتے تھے اس لئے سوال پیدا ہوا۔

اعلیٰ لباس پہننا:-

اس کے جواب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس لئے پہنتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنے ہیں اس لئے کہ اعلیٰ لباس پہننا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔

کافروں کے ملک کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کرنا:-

اسی طریقے سے کافروں کے ملک کی بنی ہوئی چیز استعمال کرنا اور اس کو پہننا بھی جائز ہے اس لئے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جوتے پہنے ہوئے دیکھا ہے اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ میں یہ جوتے پہنوں، یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی علامت ہے۔

امور عادیہ میں اتباع باعث برکت وسعادت ہے:-

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کام بطور عادت کے کئے جسے کہ یہ جوتے آپ نے مسئلہ شرعی کے طور پر نہیں پہنے تو ایسے کاموں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر لینا اچھی بات ہے اگرچہ ان کا وہ درجہ نہیں ہے جو احکام شرعیہ کا ہے البتہ ان کا اتباع کر لینا بھی برکت اور سعادت سے خالی نہیں ہے۔

(۲)-----وعن أنس، قال: إنَّ نعلَ النبيِّ ﷺ كانَ لها قِبالان۔

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتوں کے دو تسمے تھے۔

تسمے سے مراد:-

یہاں تسمے وغیرہ سے مراد چمڑے وغیرہ کی یا کسی اور چیز کی باریک چیز جو پاؤں کے تلوے میں لگائی جاتی ہے تاکہ اس میں پاؤں اور پاؤں کی انگلیاں پھنسائی جائیں جیسا کہ ہمارے ہاں بعض چپلوں وغیرہ میں ہوتا ہے خاص طور پر ہوائی چپل میں اور بھی مختلف قسم کی چپلوں وغیرہ میں ایسا ہوتا ہے یہاں تسمے سے مراد وہ تسمہ نہیں جو ہمارے ہاں بوٹ کے اوپر ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے نعل مبارک کی کیفیت:۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے میں قبال تھیں یعنی اس طرح کی دو چیزیں تھیں جن میں پاؤں پھنسایا جائے ان میں سے ہر ایک دوہری تھی جیسا کہ اگلی روایت میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوہری تھی۔ بعض روایتوں میں ان کی ترتیب یوں آتی ہے کہ ان میں سے ایک قبال ایسی تھی جو آپ کے انگوٹھے اور انگوٹھے کے برابر والی انگلی کے درمیان میں آجاتی تھی جیسے ہمارے ہاں ہوائی چپل میں ہوتا ہے اور دوسری وہ ہوتی تھی جو چھوٹی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی میں آجاتی تھی یا درمیان والی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی میں آجاتی تھی۔

نعل مبارک کا نقشہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور بڑا خوبصورت چھپا ہوا ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا اس طرح کا خوبصورت نہیں تھا وہ ویسے ہی بنانے والوں نے نقش و نگار بنا دیئے، نیچے اس طرح کا تلوہ دو اس طرح کے قبال تھے یعنی اس طرح کے دو لمبے چمڑے تھے ایک بائیں طرف سے لے کر دائیں طرف تک دائیں طرف سے لے کر بائیں طرف کو جا رہا ہے اس کے درمیان پاؤں ہوتا ہے یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کی کیفیت ہے۔

(۳)-----وعن جابرٍ، قال: سمعتُ رسولَ اللہ ﷺ فی غزوۃٍ غزاھا یقول: استکثِروا من النِّعال، فإنَّ الرَّجُلَ لا یزالُ راکبًا ما انتعَلَ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جوتے کثرت سے پہنا کرو کیوں کہ جب تک آدمی جوتا پہنے رہے ایک قسم کا سوار رہتا ہے۔

اصل میں ہمارے ہاں جوتا آنے جانے کے لوازم میں سے ہے اور بغیر جوتے کے چند قدم تک چلنے کا بھی تصور نہیں ہے لیکن عربوں کے ہاں یہ صورت حال نہیں تھی ان کے ہاں چونکہ بداوت غالب تھی اور غربت بھی تھی اس لئے ہر ایک کے پاس جوتا نہیں ہوتا تھا بعض جوتے کے ساتھ چلتے تھے اور بعض بغیر جوتے کے بھی چلتے رہتے تھے اور بسا اوقات لمبے لمبے سفر بغیر جوتے کے بھی کر لیتے تھے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ کا نام ذات الرقاع ہے۔

غزوہ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ:۔

اس کی وجہ تسمیہ کئی بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس غزوہ میں ننگے پاؤں چلنے کی وجہ

سے پاؤں پھٹ گئے تھے اس لئے پاؤں پر پٹیاں باندھنی پڑی اس لئے اس کا نام ذات الرقاع پڑ گیا، ''رقاع'' رقعہ کی جمع ہے معنی کپڑے کا ٹکڑا۔

بہر حال عربوں کے ہاں جوتا اتنا عام نہیں تھا کچھ پہنا کرتے تھے کچھ نہیں پہنا کرتے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتا میسر آئے تو پہن لینا چاہئے اس لئے کہ ایک آدمی بغیر جوتے کے جارہا ہے اور دوسرا جوتا پہن کر جارہا ہے تو جوتا پہنے ہوئے آدمی کو ایسے سمجھو جیسے سوار ہے اس لئے کہ اس کے چلنے میں کافی راحت ہو جاتی ہے، چلنے کی وجہ سے تھکاوٹ تو ہوتی ہے لیکن زمین پر پاؤں لگنے کی وجہ سے آدمی کو جو تکلیف ہوتی ہے اس سے آدمی بچ جاتا ہے، یہ بھی ایک قسم کی سواری ہی ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ترغیب دی کہ جوتا میسر ہو تو پہن لینا چاہئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کے کاموں میں مشقت بذات خود مطلوب نہیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مشقت بذات خود مطلوب ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔

مقاصد اور ذرائع میں مشقت کی تفصیل:۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس میں تفصیل فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہے مقاصد میں مشقت اٹھانا اور ایک ہے ذرائع میں مشقت اٹھانا تو مقاصد میں مشقت مطلوب ہے مثلاً ایک آدمی مختصر سے دو نفل پڑھتا ہے اور دوسرا آدمی لمبی قرأت کے ساتھ دو نفل پڑھتا ہے اب ظاہر ہے جب لمبی قرأت کرے گا، لمبا قیام کرے گا، لمبا رکوع کرے گا، لمبا سجدہ کرے گا، تو اس میں جسمانی مشقت ہو گی لیکن چونکہ ایک مقصد کے اندر کھپ رہا ہے اس لئے مطلوب ہے۔

ایک ہے ذرائع کے اندر مشقت اگر ذرائع میں غیر اختیاری طور پر مشقت اٹھانا پڑ جائے تو اس میں اجر و ثواب ہے مثلاً وضوء کرنے کے لئے قریب پانی نہیں ملا بلکہ کافی دور جانا پڑا یا سردی کے موسم میں گرم پانی میسر نہیں ٹھنڈے پانی سے وضوء کرنا پڑ گیا اس میں مشقت پر ثواب ملے گا لیکن اگر مشقت کے بغیر ہی کام ہو سکتا ہے مثلاً اپنے کمرے کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ روم تھا اس میں وضوء ہو سکتا تھا لیکن یہ سوچ کر مشقت اٹھانا اچھی بات ہے اس لئے دو میل دور وضوء کرنے کے لئے جاتا ہے یا سخت سردی میں گرم پانی میسر ہے پھر بھی ٹھنڈے پانی سے وضوء کرتا ہے تو یہ شریعت میں مطلوب اور مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح سے کسی دینی مقصد کے لئے سفر ہے اگر کسی مجبوری کی وجہ سے مشقت والا سفر کرنا پڑ گیا مثلاً آرام دہ سواری میسر نہیں یا اچھی سواری کے پیسے میسر نہیں تو یہ مشقت موجب اجر ہو گی اگر مشقت کے

بغیر یہ سفر کر سکتا تھا آرام دہ سفر کر سکتا تھا لیکن بخل کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے آرام دہ سفر کی بجائے مشقت والا سفر کرتا ہے تو یہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے۔

یہاں دیکھئے جہاد کے لئے جارہے ہیں اور جہاد میں تھوڑی تھوڑی مشقت کا بڑا اجر و ثواب ہے لیکن حضور اقدس ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے سفر کو جتنا پر مشقت بنا سکتے ہو بناؤ بلکہ یہ فرمایا کہ جتنا آرام دہ بنا سکتے ہو بناؤ اور اس وقت آرام کی یہی صورت تھی کہ جوتا پہن لے تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سواریاں تو ہے نہیں مجبوراً پیدل چلنا پڑ رہا ہے لیکن جوتا پہن کر پیدل چلنے کی مشقت کو جتنا کم کیا جا سکتا ہے کرلو۔

(٤)-----وعن أبی هريرةَ، قال: قالُ رسول الله صلی الله عليه وسلم: إذا انتعلَ أحدُكم فليبدَأ باليمنی، وإذا نزعَ فليبدَأ بالشمال، لتكنِ اليمنی أوَّلهما تُنعَلُ وآخرَهما تُنزعُ۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی جوتے پہنے تو اسے چاہئے کہ دائیں پاؤں سے ابتداء کرے اور جب جوتا اتارے تو بائیں پاؤں سے ابتداء کرے تاکہ دایاں پاؤں پہلا ہو جس میں جوتا پہنا جارہا ہے اور ان میں سے آخری جس سے جوتا نکالا جارہا ہے۔

جوتے کا ادب دائیں طرف سے پہننا:۔

اس حدیث میں جوتا پہننے کا ایک ادب بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ جب جوتا پہنا جائے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنا جائے پھر بائیں پاؤں میں پہنا جائے اور جب جوتا نکالا جائے تو اس کے برعکس ترتیب اختیار کرے یعنی پہلے بائیں پاؤں سے نکالا جائے پھر دائیں پاؤں سے نکالا جائے۔

اکرام یمین یعنی دائیں جانب کو ترجیح دینا:۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حکمت بھی بیان فرمادی اس کی حکمت اکرام یمین ہے یعنی دائیں جانب کو اہمیت دینا اس لئے کہ جب پہنتے وقت دائیں پاؤں میں پہلے پہنیں گے اور نکالتے وقت دائیں پاؤں سے بعد میں نکالیں گے تو دائیں پاؤں کا زیادہ دیر جوتے میں رہنا پایا جائے گا تو یہ دائیں پاؤں کا اکرام ہے اور یہ ادب صرف جوتا پہننے کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام اصول ہے کہ جب بھی ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہوں تو دائیں کو مقدم کیا جائے جب اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہوں تو بائیں کو مقدم

کیا جائے، بیت الخلاء میں پاؤں ہوں یہ ادنیٰ حالت ہے اور بیت الخلاء سے باہر پاؤں ہوں تو یہ اعلیٰ حالت ہے اور جب بیت الخلاء جارہے ہیں تو اعلیٰ حالت سے ادنیٰ حالت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اس لئے پہلے بیت الخلاء میں بایاں پاؤں رکھنا چاہئے بعد میں دایاں رکھا جائے جب بیت الخلاء سے نکلیں تو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف انتقال ہو رہا ہے اس لئے باہر پہلے دایاں پاؤں رکھنا چاہئے پھر بایاں پاؤں رکھنا چاہئے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بیت الخلاء سے باہر زیادہ دیر دایاں پاؤں رہے گا کیوں کہ اندر بعد میں گیا ہے اور نکلا پہلے ہے۔

مسجد میں داخل ہو رہے ہیں تو مسجد میں ہونا اعلیٰ حالت ہے اور مسجد سے باہر ہونا ادنیٰ حالت ہے لہٰذا جب مسجد میں جائیں تو ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اس لئے پہلے دایاں پاؤں مسجد میں رکھیں گے بعد میں بایاں پاؤں اور جب مسجد سے نکلیں گے تو اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف انتقال ہو رہا ہے اس لئے بایاں پاؤں پہلے نکالیں گے دایاں بعد میں نکالیں گے اس کا نتیجہ بھی یہ ہوگا کہ دایاں پاؤں زیادہ دیر مسجد میں رہے گا اس لئے کہ مسجد میں داخل پہلے ہوا تھا نکلا بعد میں ہے۔

یہی معاملہ جوتا پہننے کا ہے کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے اس طریقہ سے باقی لباس کا بھی یہی ادب ہے کہ جب پہنا جائے تو دائیں طرف سے آغاز کیا جائے اور جب اتارا جائے تو بائیں جانب سے مثلاً کرتا یا قمیص پہننے لگے ہیں تو پہلے دائیں ہاتھ میں پہنیں یعنی دایاں بازو پہنا جائے بعد میں بایاں اس لئے کہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اور قمیص یا کرتا اترا ہوا ہو یہ ادنیٰ حالت ہے اس لئے جب اتار رہے ہیں تو اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اس لئے بائیں طرف سے پہلے نکالا جائے دائیں سے بعد میں نکالا جائے ہر جگہ یہی ادب ہے۔

جب مسجد میں داخل ہو رہے ہوں یا نکل رہے ہوں چونکہ جوتا اتار کر مسجد میں جایا جاتا ہے اس لئے یہ اصول ذرا آپس میں ٹکرا جاتا ہے، جوتے کے بارے میں اس اصول کا تقاضا کچھ اور ہے اور مسجد کے بارے میں اس اصول کا تقاضا کچھ اور ہے کیوں کہ جب مسجد میں داخل ہونے لگیں گے تو وہ موقع جوتا اتارنے کا ہے اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ دایاں پاؤں پہلے اندر رکھا جائے لیکن جوتے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پاؤں نکالا جائے تو دونوں کا ادب ایک دوسرے سے ٹکرا رہا ہے اور مسجد سے نکلتے وقت برعکس معاملہ ہے کہ مسجد سے نکلنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پاؤں نکالا جائے لیکن اگر بایاں پاؤں پہلے نکال کر جوتے میں ڈال لیتے ہیں تو جوتے کے ادب کے خلاف ہوگا۔

بہت سارے بزرگ نے ان کے اندر تطبیق کا یہ راستہ اختیار فرمایا ہے تاکہ دونوں پر عمل ہو جائے کہ مسجد میں جاتے وقت پہلے بائیں پاؤں سے جوتا نکالیں اور پاؤں مسجد میں داخل نہ کریں بلکہ جوتے پر ہی رکھ لیں یا

کہیں اور رکھ لیں اور اس کے بعد دایاں پاؤں نکالیں اور اسے مسجد میں داخل کر لیں پھر بایاں پاؤں مسجد میں داخل کر لیں اسی طریقے سے جب مسجد سے نکلنے لگیں پہلے بایاں پاؤں نکالیں لیکن اس کو نکال کر جاتا نہ پہنیں بلکہ ویسے ہی رکھ لیں پھر دایاں پاؤں مسجد سے باہر نکالیں اس میں جوتا پہن کر بائیں پاؤں میں جوتا پہن لیں اس طریقے سے دونوں تقاضوں پر عمل ہو جائے گا۔

یہ طریقہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ادب پر عمل کر لیں ایک کو چھوڑ دیں کیوں کہ تعارض ہو رہا ہے لیکن دونوں پر عمل کر لیا جائے تو اچھی بات ہے۔

(۵) ----- وعنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايمشي أحدُكم في نعلٍ واحدةٍ، ليُحفِهُما جميعاً أو لينعِلهما جمعاً۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی ایک جوتے میں نہ چلے بلکہ اس کو چاہئے کہ یا تو دونوں پاؤں ننگے کر لے یا دونوں پاؤں میں جوتا پہن لے۔

جوتا پہننے کا ادب:-

اس میں بھی ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور ایک پاؤں میں جوتا نہ ہو بلکہ اگر پہننا ہو تو دونوں میں پہنے اور اگر نہ پہننا ہو تو دونوں پاؤں ننگے ہوں ایک پاؤں میں جوتا ہو ایک پاؤں میں جوتا نہ ہو اس سے ایک تو چلنے میں مشکل ہوتی ہے کہ ایک پاؤں اونچا ہو جاتا ہے ایک نیچا ہو جاتا ہے۔

پہننے میں عام عادت کے خلاف ہیئت اپنانا:-

دوسرا یہ کہ یہ ہیئت کچھ اچھی نہیں لگتی بدوی سی ہیئت بن جاتی ہے اور خلاف مروت ہے اور ہیئت مروجہ اور ہیئت معتادہ کے خلاف ہے، لباس کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایسی ہیئت نہیں اپنانی چاہئے جو عام عادت کے ایسے خلاف ہو کہ دیکھنے والے کو عجیب سا لگے اور ہر ایک کی نظریں اس کی طرف اٹھیں اس لئے حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے لیکن یہ محض ایک ادب ہے، ادب سے بھی بڑھ کر محض ایک ارشادی حکم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ایک پاؤں میں جوتا پہن لیتا ہے اور دوسرا پاؤں ننگا ہے مثلاً کہیں جا رہا تھا راستے میں ایک پاؤں کا جوتا ٹوٹ گیا تو اس کو اٹھا کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دوسرا جوتا پاؤں میں ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث آرہی ہے کہ **ربما مشى النبي صلى الله عليه**

وسلم فی نعل واحدۃ۔ کہ بسا اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی جوتے میں چل لیا کرتے تھے تو وہ حدیث بظاہر اس کے خلاف ہے۔

لیکن اول تو اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے اس کے بارے میں دو طرح کی روایتیں ہیں ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک جوتے میں چل لیا کرتے تھے اور دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بسا اوقات ایک جوتے میں چل لیا کرتی تھیں، تو یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فعل ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے دوسری روایت کے بارے میں فرمایا کہ یہ زیادہ صحیح ہے لہٰذا وہ اس حدیث کے منافی نہیں۔

اگر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فعل ہو تب بھی اس کے خلاف نہیں اس لئے کہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو دوسرے پاؤں میں جوتا نہ ہو یہ جائز ہے اور ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فعل بیان جواز کے لئے اپنایا ہو۔

(٦)----وعن جابرٍ قال: قال رسول الله ﷺ: إذا انقطعَ شِسعُ نعله فلا يمشِ في نعلٍ واحدةٍ حتى يُصلحِ شسعَه، ولا يمشِ في خُفٍّ واحدٍ، ولا يأكل بشماله، ولا يحتبى بالثوبِ الواحدِ، ولا يلتحف الصَّماءَ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی آدمی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ ایک ہی جوتے میں نہ چلے یہاں تک کہ وہ اپنے جوتے کے تسمے کو درست کر لے اور ایک ہی موزے کے اندر بھی نہ چلے اور اپنے بائیں ہاتھ سے بھی نہ کھائے اور ایک ہی کپڑے میں احتباء نہ کرے اور اشتمال صماء بھی نہ کرے، یعنی کپڑے کو مکمل طور پر اپنے اوپر نہ لپیٹے۔

احتباء کا معنی پہلے بیان ہو چکا ہے اور حکم بھی پہلے آچکا ہے اسی طرح: "التحاف الصماء" "اشتمال الصماء" دونوں کا ایک ہی معنی ہے کہ کپڑا اس طریقے سے اپنے اوپر لپیٹ لینا کہ بوقت ضرورت ہاتھ نکالنا بھی مشکل ہو جائے۔

الفصل الثانی

(٧)----عنِ ابنِ عبَّاسٍ، قال: كانَ لنعلِ رسول الله صلى الله عليه وسلم قِبالانِ، مُثنًّى شراكُها۔ (رواه الترمذى)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے دو تسمے تھے جن میں سے ہر ایک کو دوہرا کیا ہوا تھا۔

(۸) ----وعن جابرٍ، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن ينتعلَ الرجلُ قائماً۔ (رواه أبو داؤد ورواه الترمذى وابن ماجه، عن أبى هريرة)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی کھڑے ہو کر جوتا پہنے۔

کھڑے ہو کر جوتا پہننا:-

یہ ایسے جوتے کے بارے میں ہے جس کے پہننے میں وقت لگتا ہو اور کچھ مشقت ہوتی ہو جیسے بعض خاص قسم کے بوٹ ہوتے ہیں، خاص طور پر ایسے بوٹ جن پر تسمے بھی ہوں اس میں آدمی اگر کھڑا ہو کر پہنے گا تو اس میں آدمی کو کافی دیر تک جھکنا پڑے گا، ایک تو اس میں مشقت ہے اور فضول مشقت اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں۔

دوسرا اس طرح جھکا ہوا آدمی اچھا بھی نہیں لگتا اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوتا بیٹھ کر پہن لو لیکن وہ جوتے جو بآسانی پہنے جاسکتے ہوں جیسا کہ ہمارے ہاں عام چپلیں ہوتی ہیں ان کو بیٹھ کر پہننے کی ضرورت نہیں ہے انہیں کھڑے کھڑے بھی پہن لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(۹) ----وعن القاسمِ بن محمَّدٍ، عن عائشةَ، قالت: ربما مشى النبى صلى الله عليه وسلم فى نعلٍ واحدةٍ وفى رواية: أنها مشت بنعلٍ واحدةٍ۔ (رواه الترمذى وقال: هذا أصح)

ترجمہ ...... قاسم بن محمد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک ہی جوتے میں چلا کرتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک ہی جوتے میں چلا کرتی تھیں اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ دوسری روایت زیادہ صحیح ہے۔

(۱۰) ----وعن ابنِ عبَّاسٍ، قال: من السنَّةِ إذا جلسَ الرَّجلُ أن يخلعَ نَعليه فيضعهما بجنبه۔ (رواه أبوداود)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سنت میں سے یہ ہے کہ جب آدمی بیٹھے تو اپنے جوتے اتار لے اور انہیں اپنی جانب میں اپنے پہلو میں رکھ لے۔

مطلب یہ ہے کہ چلتے وقت تو جوتا پہننے کی ضرورت ہے لیکن جب آدمی بیٹھا ہوا ہے تو خواہ مخواہ پاؤں پر جوتے کا بوجھ رکھنا یہ مناسب نہیں ہے اس لئے پاؤں کو آرام پہنچانے کے لئے جوتا اتار لے۔

یہ جو فرمایا کہ جوتا اتار کر رکھ لے یہ اصل میں پاؤں کی راحت کے لئے ہے اور اگر راحت جوتا نہ اتارنے میں ہو مثلاً کبھی کبھار جوتا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے پہننے میں ذرا وقت لگتا ہے مشکل ہوتی ہے اور یہ پتہ ہے کہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلے جانا ہے اور بیٹھنا کرسی وغیرہ پر ہوتا ہے تو اس صورت میں جوتا نہ بھی اتارا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

یہاں **فیضعهما بجنبه** کی قید اتفاقی ہے کہ اپنے پہلو میں رکھ لے ضروری نہیں ہے کہیں اور بھی رکھ لے تو کوئی فرق نہیں پڑتا اصل مقصود یہ ہے کہ پاؤں کو راحت پہنچانے کے لئے جوتا اتار لے۔

(۱۱)-----وعن ابنِ بريدةَ، عن أبيهِ، أنَّ النجاشي أهدى إلى النبي صلى الله عليه وسلم خُفَّينِ.أسوَدَين ساذجَين، فلبسهما ـ (رواه ابن ماجه وزاد الترمذي عن ابن بريدة، عن أبيهِ: ثمَّ توضَّأ ومسح عليهِما وهذا الباب خال عن الفصل الثالث)

ترجمہ ...... حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی نے دو موزے ہدیہ میں دیئے جو کہ کالے رنگ کے تھے اور سادہ تھے یعنی ان پر کوئی نقش و نگار نہیں تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو موزوں کو پہنا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء فرمایا اور ان پر مسح فرمایا۔

باب الترجل

بالوں کو درست کرنے کا باب

ترجل کا اصل معنی بالوں میں کنگھی کرنا بالوں کو درست کرنا ہے۔
یہاں تین قسم کی حدیثیں ذکر کریں گے:

(۱)..........ایک وہ جن کا تعلق بالوں کے احکام کے ساتھ ہے۔

(۲)..........دوسری وہ حدیثیں جن کا تعلق دوسرے زوائد بدن کے ساتھ ہے مثلاً ناخن، ختنہ وغیرہ۔

(۳)..........تیسری وہ حدیثیں جن کا تعلق دوسرے امور زینت کے ساتھ ہے جیسے سرمہ وغیرہ ان تین موضوعات پر اس باب میں حدیثیں ذکر کی جائیں گی تو عنوان اگرچہ ترجل کا ہے جس کا معنی کنگھی کرنا ہے لیکن اس میں مقصود صرف کنگھی کے احکام بیان کرنا نہیں بلکہ تین قسم کے احکام بیان کرنا ہے۔

(۱)-----عن عائشةَ رضى الله عنها، قالت: كنتُ أرجِلُ رأسَ رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا حائض۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھی اس حال میں کہ حائضہ ہوتی تھی۔

حالت حیض میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھی اور دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم معتکف ہوتے تھے آپ علیہ السلام مسجد کے کنارے پر بیٹھ جاتا کرتے تھے اور میں حجرے میں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھی۔

حدیث سے مستنبط مسائل:-

اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوئے۔

حالت حیض میں حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا:-

(۱)..........پہلا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ حائضہ کو اگرچہ نجاست حکمیہ لاحق ہوتی ہے جس کی وجہ سے حیض ختم ہونے پر اس پر غسل واجب ہوتا ہے لیکن اس کا بدن ناپاک نہیں ہوتا بلکہ اس کا بدن پاک ہے لہٰذا اس کے

ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی جائز ہے، اس کا ہاتھ اگر کسی چیز کو لگ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوگی اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں سے زیادہ پاک چیز اور کیا ہو سکتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہاتھ لگاتی تھیں تو پتہ چلا کہ حائضہ کے ہاتھ ناپاک نہیں ہوتے۔

فقہاء کی عظمت:۔

ایک دفعہ امام اعمش سے جو بڑے محدثین میں سے ہیں کسی نے مسئلہ پوچھا کہ حائضہ کو اگر غسل دینا پڑ جائے یعنی کسی میت کو نہلانا پڑ جائے تو حائضہ غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟ تو امام اعمش نے سوچا تو کوئی حدیث یا کسی صحابی کا اثر یاد نہیں آیا اس لئے امام اعمش نے فرمایا کہ مجھے تو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے البتہ فلاں فقیہ بیٹھے ہوئے ہیں ان کے پاس چلی جاؤ ان سے مسئلہ پوچھ لینا اور جو مسئلہ وہ بتائیں تو جاتے ہوئے مجھے بھی بتلا جانا تاکہ میرے علم میں بھی اضافہ ہو جائے، تو وہ عورت اس فقیہ کے پاس گئی تو انہوں نے مسئلہ بتایا کہ غسل دے سکتی ہے اور دلیل میں یہی حدیث ذکر کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت حیض میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھیں اب ظاہر ہے کہ مردے کا جسم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں سے تو پاکیزہ نہیں ہے۔ وہ عورت واپس آئی اور اعمش کو مسئلہ بتایا اور ساتھ ہی یہ دلیل بھی ذکر کی تو اعمش نے اس حدیث کی سندیں ذکر کرنا شروع کر دیں کیونکہ اعمش کو حدیث پہلے سے یاد تھی تو اس عورت نے کہا: **این کنت إلی الان**۔ آپ پہلے کہاں تھے اور یہ تمہاری حدیث پہلے کہاں تھی، تو اعمش نے کہا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم پنساری ہیں وہ اطباء ہیں ہماری مثال ایسی ہے جیسے پنساری نے دوائیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں میڈیکل سٹور والے نے دوائیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان دوائیوں سے کام کیسے لینا ہے یہ پتہ نہیں ہوتا یہ پتہ معالج یا طبیب یا ڈاکٹر کو ہوتا ہے تو اسی طرح ہم کو حدیثیں یاد ہیں لیکن ہم کو مسئلے نہیں آتے ان کو آتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اعمش اور امام ابو یوسف کے درمیان بھی پیش آیا کہ ایک مسئلہ پوچھا گیا تو امام اعمش کو اس کا جواب نہیں آیا تو امام ابو یوسف نے اس مسئلے کا حکم بیان کیا کہ یہ حکم ہے تو اعمش نے پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ کہاں سے لیا، تو امام ابو یوسف نے فرمایا: فلاں حدیث کی وجہ سے جو آپ نے ہمارے سامنے بیان کی تھی اور آپ نے فلاں سے نقل کی تھی اور فلاں نے فلاں سے نقل کی تھی، تو وہاں پر بھی اعمش نے یہ فرمایا: **یا معشر الفقھا انتم الاطباء ونحن الصیاد لہ**۔ کہ تم اطباء ہو اور ہم پنساری ہیں حدیث مجھے پہلے معلوم تھی بلکہ تمہیں بتائی ہی میں نے ہے لیکن اس سے یہ مسئلہ نکل رہا ہے اس کی طرف میرا ذہن منتقل نہیں ہوا اور تمہارا ذہن اس کی طرف منتقل ہوگیا تو بہر حال ایک مسئلہ اس حدیث سے یہ نکالا گیا ہے کہ حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا۔

حالت اعتکاف میں بیوی کا ہاتھ لگنا ممنوع نہیں:-

(۲)..........اور دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ حالت اعتکاف میں جو مباشرت سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد مضاجعت یا جماع ہے اگر عورت کا ہاتھ لگ جائے تو یہ ممنوع نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لگتا تھا۔

حائضہ کے لئے دخول مسجد ممنوع ہے:-

(۳)..........اور تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ حائضہ مسجد میں نہیں جاسکتی تبھی تو اتنا تکلف کرنا پڑ رہا ہے کہ اپنے گھر کے کنارے پر بیٹھ کر کنگھی کر رہی ہیں۔

پاؤں مسجد سے باہر رکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر مسجد میں کام کرنا دخول مسجد نہیں:-

(۴)..........اور چوتھا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہونا اس وقت سمجھا جاتا ہے جب کہ آدمی قدم مسجد کے اندر رکھے اگر پاؤں مسجد کے باہر ہوں اور ہاتھ بڑھا کر مسجد میں کوئی کام کرلے تو یہ دخول مسجد نہیں سمجھا جاتا اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنا ہاتھ مسجد میں بڑھا کر حضور اقدس ﷺ کے کنگھی کرتی تھیں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مسجد میں کوئی چٹائی وغیرہ یا ایسی چیز رکھی ہوتی اور میں حیض میں ہوتی تو اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ چیز مسجد سے اٹھالیا کرتی تھیں۔

(۲) ----- وعن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: الفِطرة خمس: الختانُ والاستحدادُ وقص الشاربِ وتقليمُ الأظفارِ ونتفُ الإبطِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فطرت کے کام پانچ ہیں ختنہ کرنا، زیر ناف بالوں کو صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا اور بغل کے بالوں کو اکھیڑنا۔

امور فطرت اور ان میں تعداد کا اختلاف:-

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے پانچ کاموں کو فطرت کے کام قرار دیا ہے بعض حدیثوں میں تین کاموں کا ذکر آتا ہے کہ تین کام امور فطرت میں سے ہیں اور ایک حدیث میں آتا ہے: "عشر من الفطرۃ" کہ

دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ تو تعداد میں حدیثیں مختلف ہیں پھر جن میں دس آتا ہے ان دس کی تعیین میں بھی روایتیں مختلف ہیں کسی میں کوئی دس ہیں کسی میں کوئی دس، تو یہ روایات میں اختلاف کیسا۔

اختلاف کی وجوہ ...... بعض حضرات نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو امور فطرت کا حکم تدریجاً دیا گیا ہے پہلے تین کا دیا گیا پھر دو اور آ گئیں پانچ ہو گئیں پھر دس ہو گئیں۔

بعض نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے مختلف تعدادیں موقع محل کے اختلاف کی وجہ سے بیان فرمائی ہیں کہ کسی موقع پر کسی چیز کی زیادہ ضرورت تھی کسی موقع پر کسی چیز کی زیادہ ضرورت تھی کسی موقع پر تھوڑی بیان کرنے کی ضرورت تھی کسی موقع پر زیادہ بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان روایات میں اختلاف سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے کہ عدد کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہوتا یعنی جب کہا کہ امور فطرت تین ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تین سے زائد نہیں ہو سکتے اور اسی طرح جب یہ بیان فرمایا کہ پانچ ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پانچ سے زائد نہیں ہو سکتے اس لئے جن جن حدیثوں میں جن جن کاموں کو امور فطرت قرار دیا وہ ساری باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں جن میں پانچ کو کہا وہ پانچ بھی امور فطرت ہیں اور جن میں دس کو کہا وہ دس بھی امور فطرت میں سے ہیں اور پھر جن میں ان دس کو امور فطرت میں سے قرار دیا وہ بھی امور فطرت میں سے ہیں مثلاً ایک موقع پر میں نے کہا یہ اچھا آدمی ہے تو واقعتاً یہ اچھا آدمی ہے اور دوسرے موقع پر میں نے دوسرے دو آدمیوں کے بارے میں کہا کہ یہ دونوں اچھے آدمی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے نزدیک پہلا آدمی اچھا نہیں رہا بلکہ وہ بھی اچھا تھا یہ دو بھی اچھے ہیں، پھر میں نے کسی اور موقع پر تین آدمیوں کے بارے میں کہا کہ یہ تین آدمی اچھے ہیں اور پھر کسی اور موقع پر اور تین آدمیوں کے بارے میں کہا کہ تین آدمی اچھے ہیں تو میرے ان مختلف بیانات میں ٹکراؤ نہیں سمجھا جائے گا بلکہ آپ یہ سمجھیں گے کہ میرے نزدیک یہ سارے کے سارے اچھے ہیں۔

اسی طرح مختلف چیزوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حدیثوں میں امور فطرت میں سے قرار دیا ہے یہ ساری کی ساری باتیں امور فطرت میں سے ہیں حدیثیں اس بارے میں مختلف ہیں لیکن کل چیزیں اگر جمع کی جائیں تو کتنی بنتی ہیں جیسے میں نے ایک موقع پر ایک آدمی کے بارے میں کہا، دوسرے موقع پر دوسرے دو آدمیوں کے بارے میں کہا اور تیسرے موقع پر تین کے بارے میں اور چوتھے موقع پر اور تین کے بارے میں تو آپ ان کو ملا کر دیکھیں گے کہ کل کتنے آدمی ہیں جن کو میں نے اچھا قرار دیا اس کو بھی اچھا قرار دیا اس کو بھی سب کی ایک فہرست بنالیں گے اسی طریقے سے یہاں پر بھی محدثین نے اس پر بحث کی ہے کہ ساری حدیثوں کو ملا کر کل کتنی چیزیں بنتی ہیں تو بعض حضرات نے کہا کہ کل [illegible] بنتی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس پر اشکال کیا ہے اور یہ فرمایا کہ امور فطرت میں سے ہونے کا مطلب کیا ہے اگر مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں کی ترغیب دی ہے تو جن کاموں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے اور جن کاموں کو انبیاء کی سنت قرار دیا ہے وہ تیس نہیں شاید تیس سے زائد بن جائیں، اگر یہ مطلب ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت کے کاموں میں سے ہونے کی تصریح فرمائی ہے وہ تیس نہیں بنتے بلکہ تیس سے کم ہیں۔

اس لئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایسی باتیں کل پندرہ ہیں جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امور فطرت میں سے قرار دیا ہے ان میں سے پانچ تو وہ ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں: (۱) ختنہ، (۲) زیر ناف بالوں کو صاف کرنا، (۳) مونچھیں کاٹنا، (۴) ناخن کاٹنا، (۵) بغل کے بالوں کو صاف کرنا اور دس ان کے علاوہ اور ہیں (۶) مضمضہ یعنی کلی کرنا، (۷) استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا، (۸) استنثار یعنی ناک کو زور سے صاف کرنا یعنی سانس کو باہر نکال کر ناک کی آلودگی نکال لی جائے، (۹) مسواک، (۱۰) غسل البراجم بعض روایتوں میں اس کی جگہ غسل الرواجب کا لفظ آتا ہے معنی دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔ اصل میں تو براجم انگلیوں کے جوڑوں کو یا انگلیوں کی درمیان والی جگہ کو کہتے ہیں لیکن مراد اس سے جسم کا ہر ایسا حصہ ہے جہاں میل بکثرت جمتی ہے اور اہتمام سے نکالیں تو نکلتی ہے ورنہ نہیں نکلتی، تو ان جگہوں کو دھونا یہ بھی امور فطرت میں سے ہیں، (۱۲) استنجاء، (۱۳) إعفاء اللحیہ یعنی ڈاڑھی کو بڑھانا، (۱۴) الفرق یعنی اگر سر پر بال رکھے ہوئے ہوں تو ان میں مانگ نکالنا، (۱۵) اِنتضاح بعض روایتوں میں اِنتضاح الماء ہے، اس کا لفظی معنی پانی چھڑکنا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات وضو سے فارغ ہوتے تھے تو بچے ہوئے پانی کے کچھ چھینٹے کپڑے یا لنگی وغیرہ کے اس حصے پر ڈال لیتے تھے جو شرمگاہ کے بالمقابل ہو۔

اِنتضاح الماء کی حکمت:۔

اس میں علماء نے کئی حکمتیں بیان کی ہیں ایک حکمت جو سب سے زیادہ معروف ہے وہ یہ ہے کہ یہ تعلیم حضور ﷺ نے وساوس سے بچنے کے لئے دی ہے کہ بعض اوقات آدمی کو خواہ مخواہ ہی وسوسہ آجاتا ہے کہ شاید پیشاب کا قطرہ نکل گیا ہو تو اگر اس طرح کا وسوسہ آئے تو اگر پانی نہیں چھڑکا چھینٹے نہیں ڈالے تو ہو سکتا ہے کہ وضو کرتے ہوئے ویسے ہی شلوار یا لنگی گیلی ہو گئی تو وہ یہ سمجھے کہ پکی بات ہے کہ پیشاب کے کچھ قطرے نکلے ہیں لیکن جب خود اپنے ہاتھ سے پانی کے کچھ چھینٹے ڈالے گا تو اس قسم کا وسوسہ پیدا نہیں ہوگا اور آدمی یہی سوچے گا کہ یہ وہ پانی ہے جو میں نے خود ڈالا ہے بعض نے اور حکمتیں بھی بیان فرمائی ہیں۔

اگر یہ حکمت ہو تو اس کے مطابق حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ نے اس کو امور فطرت میں شامل کرنے پر اشکال فرمایا ہے کیوں کہ یہ ایک مستقل سنت نہ ہوئی بلکہ یہ اس آدمی کے لئے ہے جس کو وسوسہ آنے کا خطرہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ خود وسوسے نہیں آتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے وسوسی لوگوں کو تعلیم تو دینی تھی ان کی تعلیم کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ لہٰذا یہ کوئی مستقل سنت نہ ہوئی یہ تو ایک علاج ہے اس لئے اس کو امور فطرت میں سے شمار کرنا محل نظر ہے اس لئے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں انتضاح الماء سے مراد پانی سے استنجاء کرنا ہے اور استنجاء پہلے بھی گزر چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل چودہ ہو گئیں پندرہ نہ ہوئیں۔ (۱)

بہر حال جن کے نزدیک چھینٹے مارنا ایک مستقل سنت ہے ان کے نزدیک پندرہ ہو گئیں اور جن کے نزدیک یہ ایک مستقل سنت نہیں ہے بلکہ محض ایک علاج ہے ان کے نزدیک چودہ ہو جائیں گی۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مطلقاً استنجاء بھی امور فطرت میں سے ہے اور پانی کے ساتھ استنجاء کرنا یہ ایک مستقل امر فطرت ہے۔ بہر حال یہ چودہ یا پندرہ چیزیں ہیں جن کو حضور ﷺ نے امور فطرت میں سے قرار دیا ہے۔

امور کے فطرت میں سے ہونے کا مطلب:۔

فطرت میں سے ہونے کا مطلب کیا ہے تو اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں مثلاً بعض نے یہ کہا کہ ان کے فطرت میں سے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کام واجب ہیں لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے اس لئے کہ امور فطرت میں سے بہت سارے کام ایسے ہیں جو بالاتفاق غیر واجب ہیں بلکہ ان کے واجب نہ ہونے کی تصریح حدیث میں موجود ہے مثلاً مسواک بعض حدیثوں میں اسے بھی امور فطرت میں سے شمار کیا گیا ہے لیکن حضور ﷺ نے صراحتاً یہ فرمایا: **لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ۔** (۲) کہ اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کا وجوبی حکم دے دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امت پر مشقت کے خطرے کی وجہ سے اور امت کو مشقت سے بچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا وجوبی حکم نہیں دیا لہٰذا مسواک واجب نہیں ہے حالانکہ یہ امور فطرت میں سے ہے۔

صحیح معنی یہ ہے کہ یہ امور فطرت میں سے ہیں یعنی انسان کی فطرت ان کا تقاضا کر رہی ہے اگر شریعت نہ بھی آتی شریعت ان کا حکم نہ بھی دیتی تب بھی انسان کی فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یہ کام کرے۔ (۳)

---

(۱) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۲۵ ...... (۲) جامع ترمذی ابواب الطہارۃ باب ماجاء فی السواک ج ۱/ ص ۱۲

(۳) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۲۵

امور فطرت میں سے ہونے میں یہ بھی داخل ہے کہ یہ پہلے انبیاء کی یا انبیاء میں سے اکثر کی سنت ہے اور ان کا طریقہ ہے اور ان کی اقتداء کا ہمیں حکم دیا گیا ہے قرآن کریم نے کئی انبیاء کا نام لینے کے بعد یہ فرمایا کہ أولئك الذين هَدَى اللهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ۔[۱] کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور ان کو جو ہدایت ملی ہے اس کی پیروی آپ بھی کریں تو یہ ایسے احکام ہیں جو اکثر شرائع میں مشترک ہیں۔[۲] لہٰذا یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں، باقی واجب ہونا ضروری نہیں ہے ان میں سے بعض کام واجب ہیں اور بعض کام سنت ہیں اس اعتبار سے ہر چیز کا حکم الگ الگ ہے۔

امور فطرت چند مقاصد اور حکمتوں میں مشترک ہیں یعنی چند فوائد ایسے ہیں ان میں سے جو اکثر سے حاصل ہوتے ہیں اور بظاہر انہی کی وجہ سے انہیں امور فطرت قرار دیا جاتا ہے۔

امور فطرت سے حاصل ہونے والے فوائد:۔

(۱) نظافت ...... ان کاموں سے نظافت حاصل ہوتی ہے مثلاً مسواک سے نظافت حاصل ہوتی ہے، کلی کرنے سے، ناک میں پانی ڈالنے سے، غسل البراجم سے نظافت حاصل ہوتی ہے، ناخن کاٹنے سے نظافت حاصل ہوتی ہے نہیں کاٹیں گے تو میل جم جائے گی اسی طرح جسم کے مستور حصوں کے بال کاٹنے سے بھی نظافت مطلوب ہے کہ اگر بال نہیں اتاریں گے تو اس میں بھی میل جم جائے گی اور بیماریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں ایک یہ فائدہ ہے۔

(۲) تحسین ہیئت[۳] ...... دوسرا فائدہ تحسین ہیئت ہے کہ ان سے انسان کی ہیئت اچھی ہوتی ہے اگر ناخن نہ کاٹے ہوں تو آدمی بہت برا لگتا ہے، قص الشارب، مونچھیں کاٹنے کا ذکر آیا اگر مونچھیں نہ کاٹی ہوئی ہوں تو آدمی دیکھنے میں بہت برا لگتا ہے، مانگ نکال کر بالوں کو درست نہ کیا گیا ہو تو آدمی ویسے ہی اچھا نہیں لگتا، ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہو، پوری ہو تو اس سے آدمی کی ہیئت اچھی بن جاتی ہے اگرچہ اگر مزاج بگڑا ہوا ہو تو ڈاڑھی مونڈ کر ہیئت اچھی لگتی ہے لیکن انبیاء کا طریقہ یہی ہے ان کی ہیئت ڈاڑھی رکھنے سے اچھی لگتی تھی تو ایک فائدہ تحسین ہیئت ہے اور بعض شارحین نے حدیث میں اس مقصد کو قرآن کریم کی اس آیت کے ساتھ جوڑا ہے: صَوَّرَكُم فأحسن صُوَرَكم۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری شکلیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں، پہلی بات تو ہے کہ اللہ نے بنائیں جب اللہ نے بنائیں تو اچھی ہوں گی صَوَّرَكُمْ پھر اس کی مزید تاکید کے ساتھ

---

(۱) انعام آیت نمبر ۹۰...... (۲) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۲۵

(۳) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۲۳

فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ فرمایا کہ تمہاری صورتوں کو بہت اچھا کر کے بنایا تو گویا ان امور کے ذریعہ شریعت ہمیں کہہ رہی ہے کہ اللہ نے تمہاری صورتوں کو اچھا بنایا ہے تم اس کو بگاڑو نہیں بلکہ اس حسن کو برقرار رکھو۔ اللہ نے جو حسن عطا فرمایا ہے اس کی حفاظت کرو اور اپنی ہیئت کو خراب نہ کرو۔

(۳) رفقاء کے ساتھ حسن سلوک ...... اس میں احسان إلى الرُّفقاء اور احسان إلى اہل المجلس ہے کہ جو پاس بیٹھنے والے ہیں ہم نشین ہیں یا جن سے بکثرت میل جول ہوتا ہے ان کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا بھی ہے کہ یہ کام کریں مثلاً اگر مسواک نہیں کرے گا تو منہ گندا ہو جائے گا اور بدبو آئے گی اور ہو سکتا ہے کہ جب یہ ہنسے تو دوسروں کو رونا پڑ جائے، تو رفقاء کے ساتھ حسن سلوک ہے چاہے یہ رفقاء انسانوں میں سے ہوں یا فرشتوں میں سے ہوں۔

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی میں کافی دیر جبرئیل علیہ السلام تشریف نہ لائے جب آئے تو حضور ﷺ نے پوچھا اتنی دیر سے کیوں آئے ہو اس طرح کی تاخیر کئی مرتبہ ہوئی ہے اور ہر مرتبہ تاخیر کی وجوہ الگ تھیں۔

(۱)......... ایک مرتبہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ گھر کے اندر کتا تصویر تھی اس لئے نہیں آئے۔

(۲)......... ایک مرتبہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آنے کا تھا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ۔[۱]

(۳)......... ایک مرتبہ تاخیر کی وجہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ بیان فرمائی کہ آپ کے کئی ساتھی ایسے ہیں جو مسواک نہیں کرتے اور غسل البراجم نہیں کرتے یعنی بدن کے وہ حصے جن میں میل جم جاتی ہے، تکلف سے نکالنی پڑتی ہے وہاں سے میل کچیل اچھے طریقے سے نہیں نکالتے اس لئے یہاں آتے ہوئے اور اس مجلس میں آتے ہوئے ہمیں تکلیف ہوتی ہے اس لئے ہم دیر سے آتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سے رفیق ہوں یا فرشتوں میں سے ان کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ ان کاموں کو کیا جائے۔

(۴)......... ان کاموں میں تآلف کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے یعنی آپس میں دل جڑتے ہیں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اس لئے کہ جب آدمی کی ہیئت اچھی ہو اور وہ دوسرے کے سامنے جائے تو دوسرا بآسانی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب وہ اچھے طریقے سے متوجہ ہوگا، اچھے طریقے سے پیش آئے گا تو دونوں کے دل اچھے طریقے سے قریب ہوں گے اور اگر آدمی بگڑی ہوئی ہیئت میں کسی کے سامنے جائے، بال بکھرے ہوئے

---

(۱) سورۂ مریم آیت نمبر ۶۴

ہوں، مونچھیں بہت بڑی بڑی ہوں، ناخن بڑھے ہوئے ہوں تو ظاہر ہے جس کے ذوق میں کچھ لطافت ہو گی اس کی طبیعت پر اس کے آنے کی وجہ سے گرانی ہو گی اور جب گرانی ہو گی تو وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہو گا، اس کی بات بھی صحیح طریقے سے نہیں سن سکے گا، تو اس کا کام بھی صحیح طریقے سے نہیں کر سکے گا اور اس کی وجہ سے آنے والا اس سے بدگمان ہو جائے گا اور جب یہ بدگمان ہو گا اور اس سے دور ہو گا تو یہ بھی اس سے دور ہو جائے گا تو دو طرفہ دلوں میں دوری پیدا ہو جائے گی تو دلوں کو قریب کرنے میں بھی یہ امور فطرت معین ہیں۔(۱)

یہ ان کے چار بنیادی مقاصد ہیں جو متعدد شارحین حدیث نے لکھے ہیں ان کے علاوہ اور بھی کئی حکمتیں لکھی ہیں۔

امور فطرت پر علیحدہ علیحدہ گفتگو:۔

یہ تو ان امور فطرت پر عمومی گفتگو ہو رہی تھی اب الگ الگ بھی بات کر لیں، ہمارے سامنے جو اس وقت حدیث ہے تو اس میں امور فطرت میں سے پانچ کا ذکر ہے اس لئے پہلے ان پانچ کی بات کر لیں باقی جہاں جہاں جس حدیث میں آتے جائیں گے ان کے بارے میں بھی بات ہوتی جائے گی۔

پہلا امر الختان:۔

ان میں سے سب سے پہلی چیز الختان ہے یعنی ختنہ کرنا، اس زمانے میں لڑکوں کا بھی ختنہ ہوتا تھا اور لڑکیوں کا بھی ہوتا تھا۔

ختنے کا مطلب:۔

لڑکے کے ختنے کا مطلب تو واضح ہی ہے کہ پیدائشی طور پر حشفے کے اوپر جو کھال ہوتی ہے اس کو کاٹ دیا جائے اور حشفے کو ظاہر کر دیا جائے اور لڑکی کا ختنہ یہ ہے کہ اس کی شرمگاہ میں مدخل الذکر کے قریب ایک چھوٹی سی کھال ہوتی ہے اس کھال کا کچھ حصہ کاٹ دیا جائے، یہ لڑکی کا ختنہ ہے اور بعض اوقات لڑکی کے ختنے کو خفض کہا جاتا ہے بعض اہل لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ **الختن للرِجال و الخفض للنسَاء** کہ ختنے کا اطلاق مذکر پر ہوتا ہے اور خفض کا اطلاق مؤنث پر ہوتا ہے۔(۲)

---

(۱) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۲۳

(۲) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۳۸

ابھی تک ہم ختان کا معنی بیان کر رہے تھے لڑکی کے ختنے کے بارے میں بات بعد میں کریں گے پہلے مرد کے ختنے کی بات کرلیں۔

مرد کے ختنے میں حکمتیں:۔

مرد کا ختنہ امور فطرت میں سے ہے اور اس میں بہت ساری حکمتیں ہو سکتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کیا کیا حکمتیں ہیں۔

پہلی حکمت نظافت ...... سب سے بڑی اور بنیادی حکمت وہ ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ختنہ نہ کیا جائے تو اس کھال کے نیچے میل کچیل اور مختلف قسم کی گندگیاں جم سکتی ہیں اور ہر آدمی اتنا چست نہیں ہوتا کہ وہ اہتمام کے ساتھ صفائی کرے اس لئے وہاں گندگی جم جائے گی اور ایک تو گندگی بذات خود بری چیز ہے اور دوسرے اس کی وجہ سے بیماریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور جب اس کھال کو اتار دیا جائے گا اور حشفہ ظاہر ہو جائے گا تو اب یہ حصہ بھی باقی جسم کی طرح ہو جائے گا کہ جب آدمی غسل وغیرہ کرے گا استنجاء وغیرہ کرے گا تو بآسانی صفائی خود بخود ہو جائے گی زیادہ اہتمام اور تکلف کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ تو گویا ختنے کی بنیادی حکمت کا تعلق نظافت سے ہے۔[1]

دوسری حکمت تقلیل شہوت ......اس کے علاوہ اور بھی بعض نے حکمتیں بیان کی ہیں مثلاً بعض حضرات نے یہ کہا کہ ختنہ کرنے میں تقلیل شہوت ہے اس لئے کہ اگر ختنہ نہیں کیا جائے گا تو حشفہ اس کھال کے اندر گھٹا ہوا ہوگا جس کی وجہ سے زیادت شہوت ہوگی اور مؤمن میں تقلیل شہوت مطلوب ہے اس لئے ختنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تیسری حکمت تکمیل شہوت ...... حضرت شیخ حضرت مولانا زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُوجز المسالک میں فرمایا ہے کہ بظاہر معاملہ اس کے برعکس لگتا ہے وہ یہ کہ اس میں مقصود یہ ہے کہ شہوت پورے طریقے سے مکمل طریقے پوری ہو وہ یوں کہ جب ختنہ ہوگا تو حشفہ ظاہر ہو جائے گا اور جب حشفہ ظاہر ہو جائے گا تو کپڑوں کے ساتھ اور دوسری چیزوں کے ساتھ اس کا مس ہوگا تو مسلسل مس ہونے کی وجہ سے کھلا ہونے کی وجہ سے اس کی حس کم ہو جائے گی اور جب حس کم ہو جائے گی تو انزال جلدی نہیں ہوگا دیر سے انزال ہوگا جب دیر سے انزال ہوگا تو قضائے شہوت میں اس کی پوری تسلی ہو جائے گی اور یہ بھی مؤمن کے اندر مطلوب ہے کہ

(۱) اوجز المسالک الیٰ مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۴۲

قضائے شہوت میں اس کی پوری تسلی ہو جائے تاکہ عفت اور پاک دامنی کا مقصد حاصل ہو۔(۱)

یہ ساری کی ساری باتیں ثانوی ہیں بنیادی حکمت اور مقصد وہی معلوم ہوتا ہے جو پہلے ذکر کیا گیا اس لئے کہ باقی جو امور فطرت ہیں ان کا بھی زیادہ تر تعلق نظافت اور تحسین ہیئت سے ہے لہٰذا اس کا تعلق بھی نظافت ہی کے ساتھ ہونا چاہئے باقی جتنی بھی چیزیں ہیں وہ نکات بعد الوقوع کی قبیل سے ہیں۔

ختنے کا حکم (۲):۔

ختنے کے حکم میں کئی اقوال ہیں اور بنیادی طور پر دو قول ہیں:

(۱) اکثر حضرات شافعیہ کی رائے...... شافعیہ میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ ختنہ واجب ہے۔

(۲) اکثر حنفیہ کی رائے...... اکثر حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ ختنہ سنت ہے۔

حنفیہ کے نزدیک ختنہ ایسی سنت ہے جو شعائر اسلام میں سے ہے اس لئے اگر کسی علاقے کے لوگ ترک ختنہ پر اتفاق کر لیں تو امام انہیں ختنہ کرانے پر مجبور کرے گا بزور طاقت انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے گا کہ ختنہ کروا لیا کرو اس لئے کہ اگر چہ سنت ہے لیکن ایسی سنت ہے جس کا تعلق شعائر اسلام کے ساتھ ہے۔ اسی سے ختنے کی ایک اور حکمت یاد آگئی اور یہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ تورات میں ہے کہ یہودیوں کے ہاں بھی ختنہ ہوتا ہے، یہودی بھی کراتے ہیں البتہ عیسائیوں کے ہاں نہیں ہوتا اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنا ختنہ ہوا تھا اور یہ بات خود انجیل کے اندر مذکور ہے لیکن بعد میں عیسائیوں کا ایک رہنما ہوا ہے جس کا نام پولس ہے تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے یہودی تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر چلے جانے کے بعد اس نے جھوٹ موٹ یہ بات مشہور کر دی کہ مجھ پر عیسیٰ علیہ السلام کی ایک تجلی ظاہر ہوئی ہے جس کی وجہ سے میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور پھر یہ عیسائیوں کا بڑا رہنما بن گیا اور حواریین کو بھی اس نے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت موجودہ عیسائیت درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر مبنی نہیں ہے بلکہ پولس کی تعلیمات پر مبنی ہے اور سب سے پہلے اس نے ہی ختنے کا انکار کیا ہے اور یہ کہا کہ ختنہ کوئی چیز نہیں ہے۔

بہر حال یہ بات کر رہے تھے کہ یہودیوں کے ہاں بھی ختنہ ہوتا ہے اور تورات میں ہے: **إن الختان میسم الله علی ابراهیم و ذریته**۔ میسم خصوصی علامت کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خصوصی علامت ہے۔

---

(۱) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۴۲

(۲) فتح الباری کتاب اللباس باب قص الشارب ج ۱۰/ ص ۲۸۰ (ایضاً) اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۳۸

اصل میں پہلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ بادشاہوں کے جو خاص گھوڑے یا ان کے مخصوص غلام ہوتے تھے ان پر داغ وغیرہ دے کر یا کسی اور ذریعہ سے خاص علامت لگادی جاتی تھی جس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سواری بادشاہ کے ساتھ خاص ہے، یہ غلام بادشاہ کے ساتھ خاص ہے، یہ باندی بادشاہ کے ساتھ خاص ہے تو جو بندے ایمان قبول کر کے اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ خاص کرتے ہیں تو ان پر بھی اللہ کی ایک نشانی لگا دی جاتی ہے کہ یہ بندہ اللہ کا ہے نشانیاں تو اور بھی بہت ساری ہو سکتی ہیں مثلاً ڈاڑھی رکھنا اس طرح کی اور بہت سے چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باقی نشانیاں ایسی ہیں جو تبدیل ہو سکتی ہیں یہ نشانی ایسی ہے جو ہر ایک کے سامنے بہت کھلی ہوئی تو نہیں ہوتی لیکن ناقابل تبدیل ہے یعنی ایک مرتبہ کھال کو کاٹ دیا تو دوبارہ نہیں لگایا جا سکتا، یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک ایسی سنت ہے جو شعار ہے لیکن واجب نہیں ہے۔

حضرات شافعیہ کے دلائل......

(۱)............ شافعیہ نے وجوب پر استدلال ایک اس بات سے کیا ہے کہ یہ سنن الفطرت میں سے ہے لیکن یہ استدلال بظاہر کمزور ہے اس لئے کہ امور فطرت میں شامل ہونا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ واجب ہے۔

(۲)............ دوسرا استدلال جو نسبتاً اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر آدمی بالغ ہو جائے تو بلوغ کے بعد بھی اس کے لئے ختنہ سنت ہے حالانکہ ختنہ کے لئے ستر کھولنا پڑے گا جب کہ ستر کو چھپانا واجب ہے تو ختنے کے لئے ایک واجب کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے، واجب کو چھوڑنے کی اجازت کسی واجب کے لئے ہی ہو سکتی ہے واجب سے کم کے لئے نہیں ہو سکتی، تو معلوم ہوا کہ ختنہ بھی واجب ہے۔[1]

جواب...... لیکن حنفیہ کے اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ترک واجب کی اجازت یا ستر کھولنے کی اجازت کسی واجب کے لئے ہی ہو بلکہ غیر واجب کے لئے بھی ہو سکتی ہے مثلاً علاج معالجہ عام حالات میں واجب نہیں ہوتا (تفصیل کتاب الطب والرقی میں بیان کریں گے) لیکن اس کے باوجود علاج معالجہ کے لئے ستر کھولنے کی حاجت ہو تو اس کی بھی اجازت ہے اگر معالج کو دکھانا پڑے تو اس کی بھی اجازت ہے تو معالجہ مباح ہے لیکن اس کے لئے بھی ستر کھولنے کی اجازت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ستر کھولنے کی اجازت کسی واجب کے لئے ہی ہو۔[2] خیر دونوں قولوں میں کوئی اتنا بڑا اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ حنفیہ کے ہاں اگرچہ سنت ہے لیکن ایک اہم سنت ہے لہٰذا وجوب کے قریب قریب ضرور ہے۔

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب قص الشارب ج ۱۰/ ص ۲۸۱

(۲) فتح الباری کتاب اللباس باب قص الشارب ج ۱۰/ ص ۲۸۱ ایضاً و جز المسالک الی موطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۳۹

ختنے کی مقدار:-

ختنے کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ سنت کتنی مقدار سے پوری ہو سکتی ہے؟

بعض نے کہا کہ اس کھال کو اتنا کاٹ دیا جائے جس سے حشفے کا اگلا سرا ظاہر ہو جائے تو کافی ہے ختنے کی سنت ادا ہو گئی۔

بعض نے کہا کہ پوری کھال کو کاٹنا ضروری ہے اس سے سنت ادا ہو گی۔[1]

حنفیہ کے ہاں اس میں تفصیل یہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ پورے حشفے کو ظاہر کیا جائے اگر اکثر حشفہ کو ظاہر کر دیا تو بھی یہ سمجھا جائے گا کہ ختنہ ہو گیا اس لئے کہ قاعدہ ہے: **للأكثر حكم الكل** اور اگر اکثر سے کم یعنی نصف یا نصف سے کم حشفہ ظاہر ہوا تو ختنہ کی سنت ادا نہیں ہوئی باقی کھال کو بھی کاٹنا پڑے گا۔

ختنہ کتنی عمر میں ہونا چاہئے؟

ختنہ کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ کب کرانا چاہئے یعنی کتنی عمر میں ہونا چاہئے تو اس میں بھی بہت سارے اقوال ہیں۔

(۱)........... بعض نے یہ کہا کہ اصل ختنے کا حکم واجب ہوتا ہے بالغ ہونے کے بعد کیوں کہ بلوغ سے پہلے تو انسان مکلّف ہی نہیں ہے لیکن اگر بلوغ سے پہلے کرا دیا تو بھی ٹھیک ہے لیکن اصل حکم بلوغ کے بعد ہی متوجہ ہوتا ہے۔[2]

(۲)........... بعض نے یہ کہا کہ سات (۷) سال کی عمر میں ختنہ ہونا چاہئے اس لئے کہ سات (۷) سال کی عمر میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ بچے کو نماز کا کہو۔ تو معلوم ہوا کہ سات (۷) سال کی عمر ایسی ہے کہ جس میں کسی نہ کسی درجہ میں شرعی احکام بچے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اگرچہ وہ پورے طور پر مکلّف نہیں بنتا۔

(۳)........... بعض نے یہ کہا کہ دس (۱۰) سال کی عمر میں ختنہ کرانا چاہئے اس لئے کہ دس (۱۰) سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچے کو نماز نہ پڑھنے پر کبھی کبھی مارو بھی اور ختنہ کرنا یہ بھی ایلام ہے یعنی تکلیف پہنچانا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دس (۱۰) سال کی عمر میں بچہ کو تکلیف پہنچانا درست ہے اس لئے دس (۱۰) سال کی عمر میں ختنہ کرنا چاہئے۔

یہ ساری کی ساری باتیں قیاسات ہیں صحیح بات یہ ہے کہ کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے اور عام

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب قص الشارب ج۱۰/ ص ۲۷۹، ایضاً او جز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۳۷

(۲) فتح الباری کتاب اللباس باب قص الشارب ج۱۰/ ص ۲۸۲، ایضاً او جز المسالک الی مؤطا امام مالک ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ ج ۱۴/ ص ۲۴۰

احادیث میں اس کی کوئی خاص تعیین نہیں ہے اس لئے جب بھی کرالیا جائے درست ہے۔

ختنہ بلوغ سے پہلے بہتر ہے ...... البتہ بلوغ سے پہلے ہو جانا بہتر ہے اس لئے کہ بلوغ کے بعد ستر کھولنا زیادہ قبیح ہے بہ نسبت بلوغ سے پہلے کے۔

دوسرا یہ کہ جتنی چھوٹی عمر میں ہو جائے اچھا ہے ایک تو یہ کہ جتنی عمر چھوٹی ہوتی ہے اتنا ستر کھولنے میں قباحت کم ہوتی ہے، بچہ بڑا ہو جائے اگرچہ بالغ نہ بھی ہو تو بھی ستر کھولنے میں قباحت ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ بچہ جتنا چھوٹا ہوتا ہے اتنا ہی اس کی حس اور قوت لامسہ کم ہوتی ہے اس لئے اسے تکلیف کم محسوس ہوتی ہے جتنی چھوٹی عمر میں ختنہ کرلیا جائے گا اتنی ہی تکلیف بچے کو کم ہوگی اور زخم بھی بآسانی درست ہو جائے گا اور جتنا بڑا ہوگا چلنے پھرنے لگے گا اور عمر کے بڑھنے سے حس بھی بڑھتی ہے اس لئے تکلیف زیادہ ہوگی اور دوسرے زخم ٹھیک ہونے میں بھی وقت لگے گا اس لئے جتنی چھوٹی عمر میں ہو جائے اچھا ہے۔

ساتویں دن ختنہ زیادہ بہتر ہے ...... زیادہ بہتر یہ ہے کہ بچہ جب سات (۷) دن کا ہو جائے تو اس کا ختنہ کر دیا جائے اس لئے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ بچے کے لئے ساتویں دن سات (۷) چیزیں سنت ہیں اور ان میں سے ختنہ کا بھی ذکر فرمایا۔[۱] نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کا ساتویں دن عقیقہ اور ختنہ کیا۔[۲] اس سے معلوم ہوا کہ ساتویں دن ختنہ کرانا زیادہ اولیٰ ہے۔

بڑی عمر کے نومسلم کے ختنے کا حکم:۔

بعض اوقات آدمی بالغ ہونے کے بعد بڑی عمر میں جا کر مسلمان ہوتا ہے اس لئے پہلے اس کا ختنہ نہیں ہوا ہوتا تو اب وہ کیا کرے؟ تو اس کا حکم فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اگر اب ختنے کا تحمل ہو تو کرالیا جائے وگرنہ رہنے دیا جائے اگر ختنے کا تحمل نہ ہو تو پھر کرانے کی ضرورت نہیں، آگے کتاب الانبیاء میں آئے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی (۸۰) سال کی عمر میں ہوا اور خود اپنے ہاتھ سے کیا تھا لیکن بہر حال وہ اللہ کے نبی تھے ان کی قوت برداشت پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اس لئے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر تحمل ہو تو کرالیا جائے اور اگر تحمل نہ ہو تو رہنے دیا جائے۔

---

(۱) مجمع الزوائد ج ۴ / ص ۵۹ و قال: رجالہ ثقات نیز دیکھئے اعلاء السنن ج ۱۷ / ص ۱۱۹ باب افضلیۃ ذبح الشاۃ فی العقیقہ

(۲) مجمع الزوائد ج ۴ / ص ۵۹ و قال: رجالہ ثقات نیز دیکھئے اعلاء السنن ج ۱۷ / ص ۱۱۹ باب افضلیۃ ذبح الشاۃ فی العقیقہ

پیدائشی مختون:-

ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض بچے پیدائشی طور پر مختون ہوتے ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ مختون پیدا ہوئے تھے اور مختون پیدا ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے اور بھی کئی بچے مختون پیدا ہوئے ہیں، عوام میں یہ مشہور ہے کہ اس کا ختنہ چاند نے کیا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے بچے بکثرت پیدا ہوتے ہیں جو مختون پیدا ہوتے ہیں ان کا ختنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بعض نے کہا کہ مصنوعی طور پر استرا پھیر لیا جائے تو سنت ادا ہو جائے گی لیکن بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ختنے کا مقصد پہلے ہی سے حاصل ہے اور جو کچھ حاصل ہے اس کو حاصل کرنا تحصیل حاصل ہے۔

لڑکیوں کے ختنے کا حکم:-

لڑکیوں کے ختنے کا کیا حکم ہے؟ لڑکی کے ختنے کا معنی پہلے بیان کر دیا ہے۔

اس کا حکم کیا ہے تو اس میں کافی اختلاف ہے بعض نے تو اسے بھی واجب قرار دیا اور بعض نے اسے سنت قرار دیا لیکن حنفیہ اور حنابلہ نے یہ تعبیر اختیار کی ہے کہ یہ ایک کرامت کی بات ہے چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ **الختان سنة للرجال مكرمة للنساء** - یہ ایک کرامت کی بات ہے، ایک یہ کہ واجب بھی نہیں اور دوسرا یہ کہ جو اہمیت لڑکے کے ختنے کی ہے وہ لڑکی کے ختنے کی نہیں ہے بلکہ طبرانی وغیرہ میں ایک مرفوع حدیث کے لفظ یہی ہیں جو مذکور ہوئے لیکن اس حدیث کی سند کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ کیسی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ جو سنن فطرت میں اور جو شعائر اسلام میں شمار کیا جاتا ہے یہ لڑکوں کا ختنہ ہے لڑکیوں کا ختنہ نہیں ہے اس لئے کہ ایک تو اہل لغت کے مطابق اس لفظ کا تعلق لڑکوں کے ختنے کے ساتھ ہے اور دوسرا یہ کہ امور فطرت کا تعلق اصل میں نظافت کے ساتھ ہے اس لئے ختنہ کی ضرورت لڑکے میں ہوتی ہے لڑکی میں نہیں اس لئے شاید یہ کہنے کی گنجائش ہو کہ امور فطرت میں تو صرف لڑکے کا ختنہ ہے لڑکی کا نہیں ہے البتہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورت کا بھی ختنہ ہوتا تھا اور اس کا رواج پہلے سے تھا اور حضور ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس کی تقریر فرمائی ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ آگے حضرت ام عطیہؓ کی حدیث آئے گی کہ مدینے میں ایک عورت ختنہ کیا کرتی تھی تو حضور ﷺ نے لڑکی کے ختنہ کے بارے میں اس سے فرمایا تھا کہ کھال کو مکمل طور پر نہ کاٹو بلکہ اس کا کچھ حصہ کاٹ دو اس لئے کہ یہ خاوند کو زیادہ محبوب ہے تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے لڑکیوں کے ختنے کو برقرار رکھا ہے اور جو حدیث ماقبل

میں ذکر کی ہے **مکرمة للنساء**، شاید یہی وجہ ہو کہ مسلمانوں کے بہت سارے گھرانے ایسے ہیں کہ ان میں صدیوں سے لڑکیوں کے ختنے کا رواج نہیں ہے اور اس کے باوجود اس کی کوشش نہیں کی گئی اور علماء نے بیان کیا ہے کہ لڑکوں کے ختنے کی اہمیت لڑکیوں کی بہ نسبت زیادہ ہے اور لڑکیوں کی اہمیت بہت کم ہے وہ اہمیت نہیں ہے جو لڑکوں کو حاصل ہے اس لئے لڑکیوں کا ختنہ کرالیا جائے تو بھی درست نہ کرایا جائے تو بھی درست اور اگر کرانے میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں اس چکر میں نہ پڑا جائے آج کل ختنے کے مسئلے پر بہت سارے اعتراضات کئے جاتے ہیں اور آج سے تھوڑی دیر پہلے یہ مسئلہ بہت زور شور پر تھا۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے حالانکہ تکلیف جہاں لڑکیوں کے ختنے میں ہوتی ہے وہاں لڑکوں کے ختنے میں بھی ہوتی ہے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہوتا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہودی بھی ختنہ کرتے ہیں حالانکہ تکلیف میں دونوں برابر ہیں۔ یہاں تکلیف والا مسئلہ کوئی زیادہ اہم نہیں ہے اور یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ بالکل ابتدائی ایام میں اس کی حس بہت کم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کا یا اسی طرح کوئی اور اپریشن وغیرہ کرنا پڑے تو اس کے لئے یا تو بے ہوش کرنا پڑے گا یا اس کے لئے وہ جگہ سن کرنی پڑے گی لیکن بچوں کے ختنوں میں ان دونوں کاموں میں سے عموماً کوئی نہیں کرنا پڑتا۔

الاستحداد (زیرِ ناف بالوں کا حکم):۔

اب چلئے دوسرے نمبر کی طرف، دوسری چیز استحداد ہے یعنی زیر ناف بالوں کو صاف کرنا۔

استحداد کا معنی...... استحداد کا لغوی معنی ہوتا ہے حدید یعنی لوہا استعمال کرنا اور یہ یہاں پر زیر ناف بالوں کو صاف کرنے سے کنایہ ہے، اس طرح کی چیزوں کے بارے میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ صریح الفاظ بولنے کی بجائے کنایہ کو استعمال کیا جائے، اس لئے حضور ﷺ نے یہاں استحداد کا لفظ استعمال فرمایا یعنی لوہا استعمال کرنا اور اس سے عرب خود ہی سمجھ جاتے تھے کہ لوہا استعمال کرنے سے کیا مراد ہے البتہ بعض موقعوں پر وضاحت کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے صریح لفظ بھی استعمال فرمائے ہیں، اس لئے بعض روایات میں استحداد کی بجائے حلق العانة بھی آتا ہے اس کے بارے میں بھی کئی مسئلے ہیں، سب سے پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ عانہ کا معنی کیا ہے، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لئے کون سی اور کتنی جگہ کے بالوں کو اتارنا چاہئے تو اس کا انحصار عانہ کے معنی پر ہے۔

عانۃ کا معنی...... عانہ کے اہل لغت نے کئی معنی بیان کئے ہیں مثلاً بعض نے عانہ کا معنی بیان کیا ہے وہ بال جو مقعد کے ارد گرد ہوتے ہیں لیکن یہ معنی لغت میں اگر آتا بھی ہو تب بھی یہاں سے مراد لینا انتہائی

بعید ہے باقی معانی وہ تقریباً قریب قریب ہیں مثلاً بعض نے کہا کہ ماحول الفرج یا ماحول الذکر اور بعض نے کہا کہ مافوق الذکر یعنی مخصوص عضو کے اوپر یا ارد گرد جو جگہ ہوتی ہے اس کو یا اس جگہ پر جو بال اُگے ہیں ان کو عانہ کہا جاتا ہے اور بعض نے اس کا معنی بیان کیا **ما انحدر من البطن** یعنی وہ حصہ جو پیٹ کے نیچے ہو۔ ان ساری تعبیرات سے معلوم ہوا کہ عانہ اس حصے کو کہا جاتا ہے یا ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو عضو مخصوص کے قریب ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ پیٹ کی حدود جہاں پر ختم ہوتی ہے اس سے نیچے جو حصہ بدن کا عضو مخصوص تک ہے اس کو عانہ کہا جاتا ہے اور یہاں پر انہی بالوں کا ذکر مقصود ہے اور اس جگہ کو اردو میں پیڑو بھی کہہ دیتے ہیں، جہاں تک پیٹ ہوتا ہے وہاں تک ہڈی نہیں ہوتی اور جہاں پر پیٹ کی حدود ختم ہوتی ہیں اس کے آگے ہڈی شروع ہو جاتی ہے اور وہاں سے عانہ شروع ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں جو معروف ہے کہ ناف کے نیچے سے بال مونڈنے کا آغاز کرنا چاہئے اگرچہ مونڈنے میں شاید کوئی حرج نہیں ہے البتہ وہ مطلوب نہیں ہے اور یہ غلط فہمی شاید اس وجہ سے ہو گئی کہ عانہ کا ترجمہ کنایہ کے طور پر زیرِ ناف کر لیا جاتا ہے اور اس جگہ کا ذکر صراحتاً کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تو اس سے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ناف کے متصل سے شروع کریں گے لیکن اصل عانہ وہ نہیں ہے بلکہ اصل عانہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر پیٹ کی حدود ختم ہوتی ہیں تو یہاں پر انہی بالوں کا ذکر مقصود ہے۔

مقعد کے بالوں کا حکم:۔

باقی مقعد یعنی دبر کے بالوں کے حکم میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سُنَن الفطرت میں داخل نہیں ہے یعنی الاِستحداد اور حلق العانۃ وغیرہ میں، البتہ اگر استنجاء بالاحجار یعنی ڈھیلوں سے بکثرت استنجاء کیا جاتا ہو اور پانی سے کبھی کبھار استنجاء کیا جاتا ہو تو پھر ان بالوں کو صاف نہ کرنے کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ نظافت کا مقصد صحیح طریقے سے پورا نہیں ہوگا اس لئے ایسی صورت میں ان بالوں کو صاف کر لینا چاہئے اور اگر نظافت میں ان بالوں کے رکاوٹ بننے کا خطرہ نہ ہو تو پھر صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حلق العانۃ کی مدت:۔

حلق العانۃ کتنے دن کے بعد کرنا چاہئے تو اس میں الفصل الثانی کے اندر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث آئے گی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کاموں کے لئے چالیس (۴۰) دن کی مدت بیان فرمائی ہے: پہلا حلق العانۃ اور دوسرے نتف الإبط یعنی بغلوں کے بال کاٹنا اور تیسرے قص الشارب یعنی

مونچھیں کاٹنا اور چوتھا ناخنوں کو کاٹنا تو ان کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے چالیس (۴۰) دن کی مدت مقرر فرمائی ہے اگرچہ اس حدیث کی سندوں پر کچھ کلام ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس حدیث کو کافی سمجھا گیا ہے اور اس حدیث کی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ چالیس دن سے تاخیر جائز نہیں ہے یعنی چالیس دن کے اندر اندر ان کاموں کو کرنا یعنی بغلوں کے بالوں کو، زیر ناف بالوں کو اور مونچھوں کو اور ناخنوں کو ایک مرتبہ تو کاٹنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر حد بندی نہ ہوتی تو جو متورع قسم کے لوگ ہیں یعنی زیادہ محتاط قسم کے لوگ ہیں تو وہ روزانہ یہ کام کرتے کیوں کہ ناخن روزانہ کچھ نہ کچھ تو بڑھ ہی جاتے ہیں اور جو متساہل قسم کے لوگ ہیں یعنی سست قسم کے لوگ ہیں تو وہ سالوں تک لٹکائے رکھتے اور پھر سال ڈیڑھ سال کے بعد کر لیتے اور یہ کہہ دیتے کہ ہم نے حکم پورا کر دیا ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِفراط و تفریط سے بچنے کے لئے یہ حد بیان فرمائی ہے اور جیسے کہ میں نے بیان کیا کہ یہ آخری حد ہے اس میں ایک مرتبہ کاٹ لینے چاہئے۔

کتنے عرصے کے بعد یہ کام کر لینے چاہئے تو اس میں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس کا زیادہ تر اِنحصار عادت پر ہے اور یہ ہر ایک کا الگ الگ معاملہ ہوتا ہے کیونکہ بعض کے ناخن تیز رفتاری سے بڑھتے ہیں اور بعض کے سست رفتاری سے بڑھتے ہیں اور بعض کو جلدی سے ضرورت محسوس ہو سکتی ہے اور بعض کو دیر سے محسوس ہو سکتی ہے، البتہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہفتہ میں یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ کاٹ لینے چاہئے۔

زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنے کی صورتیں:۔

زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(۱)........ پہلی صورت حلق ہے یعنی استرے یا بلیڈ وغیرہ سے صاف کرنا۔

(۲)........ اور دوسری صورت نتف ہے یعنی بالوں کو اکھیڑنا، ویسے تو آسانی سے نہیں اکھیڑے جا سکتے لیکن پہلے زمانے میں ایک خاص قسم کا چونا ہوتا تھا جس کو "نورہ" کہتے ہیں وہ پہلے لگا لیتے تھے جس سے بالوں کی جڑیں ڈھیلی ہو جاتی تھیں اور اس کے بعد بالوں کو اکھیڑ لیتے تھے۔ آج کل اس مقصد کے لئے کئی کریمیں اور پوڈر مروج ہیں ان کا حکم بھی نورہ والا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہوا کہ کوئی چیز لگا کر بالوں کو نرم کر کے اکھیڑ لیا جائے یہ نتف کہلاتا ہے جائز تو دونوں طریقے ہیں لیکن زیر ناف بالوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بعض نے کہا یہ تفصیل مرد اور عورت دونوں میں ہے اور بعض نے فرق بھی کیا ہے کہ مرد کے لئے زیر ناف بالوں میں اولیٰ ہے کہ مونڈے اور عورت کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ کوئی چیز لگا کر اکھیڑ دے یعنی صاف کر دے،

بہر حال مردوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ مونڈا جائے۔

بغلوں کے بالوں کے بارے میں مرد کے لئے بہتر یہی ہے کہ اکھیڑے البتہ اگر اکھیڑنے میں تکلیف زیادہ ہو تو مونڈے بھی جاسکتے ہیں اور بغیر عذر اور بغیر تکلیف کے بھی جو مونڈتا ہے جائز ہے اس لئے کہ جائز دونوں طریقے ہیں۔

قص الشارب (یعنی مونچھیں کاٹنا):-

شارب کا معنی ...... سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ شارب کا معنی کیا ہے تو شارب اصل میں ان بالوں کو کہتے ہیں جو اوپر والے ہونٹ کے اوپر اگے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ شارب ان بالوں کو کہتے ہیں جو ہونٹ کے کنارے سے آگے بڑھے ہوئے ہوں، ہونٹ کے کنارے سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے جلد کی رنگت تبدیل ہوتی ہے کہ نیچے ذرا اور رنگت ہوتی ہے یعنی سرخ یا کالی ہوتی ہے اور اوپر رنگت عام جلد والی ہوتی ہے، اس کو ہونٹ کا کنارہ کہیں گے۔ بعض حضرات نے شارب کا معنی بیان کیا کہ وہ بال جو اس حصے سے آگے بڑھے ہوئے ہوں اس لئے کہ شارب کا لفظی معنی پینے والا اور جو بال آگے بڑھے ہوئے ہوں تو جب آدمی پانی پیئے گا تو یہ بال بھی گویا پینے میں شریک ہو جائیں گے کیونکہ یہ بال پینے کی چیز میں یا پانی میں لگیں گے، تو بہر حال یہ دونوں معنی قریب قریب ہیں بال وہی ہیں جو ہونٹوں کے اوپر ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا یہ بال مطلقاً شارب کہلاتے ہیں اور بعض نے کہا ان کا وہ حصہ شارب کہلائے گا جو ہونٹ کے کنارے سے آگے بڑھ جائیں، اس کے علاوہ انہی کے متصل وہ بال بھی ہوتے ہیں جو ہونٹ کے اوپر نہیں ہوتے بلکہ دائیں بائیں ہوتے ہیں ان کو عربی زبان میں "سبالان" بھی کہتے ہیں تو آیا یہ بھی شارب میں یعنی مونچھ میں داخل ہیں اس میں بھی دونوں قول ہیں، بعض نے کہا کہ یہ شارب میں داخل نہیں ہیں بلکہ شارب صرف وہی بال ہیں جو ہونٹ سے اوپر ہیں اور بعض نے کہا یہ بھی شارب میں داخل ہیں۔

قص الشارب کے امور فطرت میں داخل ہونے کی وجہ:-

مونچھیں کاٹنے کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت میں شمار کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا تعلق تحسین ہیئت کے ساتھ بھی ہے اور نظافت کے ساتھ بھی ہے کہ اگر مونچھیں بڑھی ہوئی ہوں تو آدمی کی شکل وہیئت گندی ہو جاتی ہے۔

اگر مونچھیں بڑھی ہوئی ہوں تو جب آدمی پانی وغیرہ یا کوئی اور چیز پیئے گا تو یہ بال اس میں لگیں گے،

بال اگر چہ صاف ہوں پھر بھی کھانے پینے کی چیز میں پڑیں تو انسان کو طبعی طور پر کراہت محسوس ہوتی ہے اور فطرت سلیمہ اس کو قبول نہیں کرتی، اس لئے مونچھوں کا بڑھا ہوا ہونا یہ نظافت کے بھی خلاف ہے۔

قص الشارب کی حد:-

مونچھیں کاٹنے میں حد وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ چالیس (۴۰) دن میں ایک مرتبہ مونچھوں کو کاٹنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر چالیس (۴۰) دن گزر گئے اور اس نے مونچھیں نہیں کاٹیں تو بظاہر گنہگار ہوگا۔

البتہ اگر چالیس (۴۰) دن سے پہلے کسی کی مونچھیں زیادہ بڑھ گئیں اور اتنی بڑھ گئیں کہ ہونٹ کے کنارے سے بھی کافی آگے آگئیں تو اس صورت میں بظاہر چالیس (۴۰) دن سے پہلے بھی کاٹنا ضروری ہوگا کیونکہ مونچھیں کاٹنے کی علت پائی گئی ہے جب علت موجود ہے تو حکم بھی موجود ہوگا۔

مونچھیں کاٹنے کا طریقہ:-

مونچھیں کاٹنے کا طریقہ کیا ہے اس میں بنیادی طور پر دو طریقے ہیں:

(۱)........پہلا طریقہ استیصال یعنی کاٹ کر مونچھوں کو بالکل ختم کر دینا مکمل طور پر صاف کر دینا۔

(۲)..........دوسرا طریقہ قص ہے اور قص کا معنی ہے مونچھوں کو بالکل ختم نہ کیا جائے بلکہ چھوٹا کیا جائے احادیث میں دونوں طریقوں پر دلالت کرنے والے الفاظ آتے ہیں۔

مثلاً پہلے طریقہ پر دلالت کرنے والے الفاظ یہ ہیں، بعض حدیثوں میں **أنهكوا الشوارب** ہے **إنهاك** کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو بالکل ختم کر دینا یعنی آخری سرے سے کسی کو کاٹنا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کا ختنہ کرنے والی عورت سے یہ کہا تھا: **لا تنهكي** یعنی اس جلد کو بالکل ختم نہ کرو اور **انهكوا الشوارب** کا معنی ہوگا کہ مونچھوں کو بالکل ختم کر دو یعنی آخر سے کاٹ دو۔

دوسرا لفظ **أحفوا الشوارب** ہے **احفاء** کا معنی بھی ہوتا ہے مبالغہ کے ساتھ کاٹنا کیونکہ اصل **اِحفاء** کا معنی ہے کہ کسی کام میں اصرار کرنا، مبالغہ کرنا چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے: **يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا۔**[1] یہ آپ سے قیامت کے وقت کے بارے میں ایسے پوچھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے جیسے پیچھے پڑ کر اللہ تعالیٰ سے پوچھ لیا ہو، تو اِحفاء کا معنی ہے کسی چیز کے پیچھے پڑ جانا۔

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۸۷

اسی طرح بعض روایتوں میں آتا ہے: "جزوا الشوارب" اور جز کا معنی بھی ہوتا ہے آخر سے کاٹنا، جیسا کہ جانوروں کی اون اتاری جاتی ہے بھیڑ اور دنبے کی اون اتاری جاتی ہے تو وہ بالکل نیچے سے اتاری جاتی ہے اس طریقے سے کسی چیز کو کاٹنا اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مونچھوں کو مکمل طور پر کاٹ دیا جائے۔

بعض روایتوں میں حلق کا لفظ بھی آتا ہے کہ مونچھوں کو مونڈنا لیکن کئی محدثین نے فرمایا کہ حلق کا لفظ محفوظ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو یہ بظاہر پہلے تین الفاظ کے معنی میں ہوگا یعنی حلق سے مراد استرے وغیرہ سے مونڈنا نہیں قینچی وغیرہ سے اس انداز سے کاٹنا کہ دیکھنے میں وہ حلق ہی ہو جائیں۔

اس کے برعکس کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو مونچھوں کو چھوٹا کرنے پر دلالت کرتے ہیں کہ بالکل زائل کرنے کی بجائے چھوٹے کروائے جائیں مثلاً ایک تو یہی لفظ قص الشارب ہے قص کا اصل معنی چھوٹا کرنا ہے۔

بعض روایتوں میں آتا ہے: "حُفُّوا الشوارب" اس کا معنی ہے کنارے سے کاٹنا حافّہ کا معنی ہے کنارہ اور حُفَّ کا معنی ہے کسی چیز کو کنارے سے کاٹو کنارے سے مراد اوپر والا کنارہ ہے یعنی ہونٹ کے کنارے سے قریب قریب کاٹو۔

بعض روایتوں میں آتا ہے: **ألأخذ من الشوارب**، چنانچہ اس باب میں بھی آگے کئی احادیث آئیں گی مثلاً: **مَن لَم يأخذ من شاربه فليس مِنّا**۔ اسی طرح الفصل الثانی کی پہلی حدیث ہے کہ **كان النبي صلى الله عليه وسلمَ يقص اوياخذ من شاربه**۔ اخذ من الشوارب کا معنی بھی بظاہر یہی ہے کہ مونچھیں مکمل طور پر نہ کاٹی جائیں بلکہ ان کا کچھ حصہ کاٹا جائے۔

بعض روایتوں میں لفظ آتا ہے: "قص علی السواک" یعنی مسواک رکھ کر اوپر سے کاٹ لینا چنانچہ کتاب الأطعمہ میں حضرت مغیرہ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزری ہے کہ ایک دفعہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان بنے اور بھی کھانے پینے کی باتوں کا ذکر ہے ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ میری مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أقصه لك على سواك**۔[1] کہ مسواک رکھ کر اس کے اوپر جو آئیں اس کو کاٹ دوں، اس کا تقاضا بھی بظاہر مونچھوں کو زائل کرنا نہیں بلکہ چھوٹا کرنا ہے۔

حاصل یہ کہ حدیثوں کے لفظ دونوں طریقوں پر دلالت کر رہے ہیں اس لئے جائز تو دونوں طریقے ہی ہیں چاہے بالکل اِزالہ کرے چاہے ان کو چھوٹا کرے۔

افضل طریقہ ...... البتہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ ان میں سے اولیٰ اور افضل کون سا طریقہ ہے۔

---

(۱) مشکاۃ المصابیح کتاب الاطعمہ الفصل الثالث ج ۲/ص ۳۶۷

حضرات مالکیہ کا مذہب ...... امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دوسرا طریقہ افضل ہے یعنی مونچھوں کو چھوٹا کرانا بلکہ امام مالک رحمہ اللہ سے یہاں تک مروی ہے کہ استیصال کہ مونچھوں کو بالکل مونڈ دینا مثلہ ہے اور جو ایسا کرے اس کو سزا دی جائے لیکن بظاہر امام مالک رحمہ اللہ کی یہ روایت اس صورت کے بارے میں ہے کہ استرے کے ساتھ مونچھوں کو مونڈ دیا جائے، اگر کاٹ کر اتار دیا جائے یعنی اِستیصال کرایا جائے تو شاید امام مالک رحمہ اللہ اس کے بارے میں یہ بات نہیں فرمانا چاہتے۔ (۱)

حضرات شافعیہ کا مذہب ...... علامہ نووی نے شافعیہ کا مذہب مونچھوں کو چھوٹا کرنا نقل کیا ہے (۲) یعنی قص لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کے کئی شاگردوں کو دیکھا کہ وہ اِحفاء کرتے تھے مونچھوں کو مکمل طور پر کاٹتے تھے اور امام شافعی کے ان شاگردوں نے یہ طریقہ بظاہر امام شافعی رحمہ اللہ سے لیا ہوگا اور امام شافعی کے ان شاگردوں میں مزنی بھی شامل ہیں جو کہ امام طحاوی رحمہ اللہ کے ماموں ہیں تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک اِحفاء یعنی پورے طور پر کاٹنا افضل ہے، پھر امام شافعی رحمہ اللہ کی کوئی تصریح اس بارے میں موجود نہیں ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ان شاگردوں نے یہ طریقہ امام شافعی رحمہ اللہ سے لیا ہو جیسا کہ امام طحاوی سمجھے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا طریقہ اور ہو لیکن ان کے شاگردوں کو امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے سے اتفاق نہ ہو اور یہ اس زمانے میں ہوتا تھا جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے کئی شاگردوں نے بھی ان سے کئی مسائل میں اختلاف کیا ہے۔

حنابلہ کا مذہب ...... امام احمدؒ کا اپنا عمل اِحفاء کرنا ہے یعنی مکمل طور پر کاٹتے تھے۔ (۳) لیکن اولیٰ اور افضل کیا ہے اس میں دو روایتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ اِحفاء افضل ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ دونوں طریقے برابر ہیں کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہے اور ابن قدامہؒ نے المغنی میں اسی کو ترجیح دی ہے، ابن جریر طبریؒ کا قول بھی تخییر کا ہے یعنی دونوں طریقے برابر ہیں کسی دوسرے پر ترجیح نہیں ہے۔ (۴)

ابن جریر طبری رحمہ اللہ ائمہ مجتہدین اور ائمہ متبوعین میں سے ہیں یعنی ان مجتہدین میں سے ہیں جن کی تقلید کی گئی ہے لیکن ان کی تقلید زیادہ دیر چلی نہیں ہے تو بہر حال بڑے درجے کی شخصیات میں سے ہیں، وہ بھی تخییر کے قائل ہیں۔

حضرات حنفیہ کا مذہب ...... حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اِحفاء افضل ہے یعنی مونچھوں کو مکمل طور پر کاٹنا افضل ہے۔

---

(۱) اوجز المسالک الیٰ مؤطا امام مالک ج ۱۴ / ص ۲۳۱ ...... (۲) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۲۳۱ ...... (۳) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۲۳۲

(۴) اوجز المسالک ج ۱۴ / ص ۲۳۲

احفاء کا طریقہ...... اِحفاء کیسے کیا جائے آیا کاٹ کر مونچھوں کو بالکل چھوٹا یا ختم کیا جائے یا مونڈ کر تو اس میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی رائے حلق کی ہے کہ مونڈنا افضل ہے لیکن جن حدیثوں سے امام طحاوی رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے وہ استدلال صحیح نہیں بنتا اس لئے کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے حج اور عمرہ کی احادیث سے استدلال کیا ہے کہ ان میں حلق کرنے والوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ دعائے رحمت فرمائی اور قصر کرنے والوں کے لئے یعنی بال چھوٹے کروانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعائے رحمت فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حلق قصر سے افضل ہے، وہ احادیث ظاہر ہے کہ مونچھوں کے بارے میں نہیں بلکہ اصل میں وہ حدیثیں سر کے بالوں کے بارے میں ہیں کیونکہ حج یا عمرے سے فارغ ہونے کے بعد جو نسک کا حصہ ہے وہ سر کے بالوں کو صاف کرنے کا ہے اس میں افضل یہ ہے کہ بال منڈوائے جائیں، ویسے چھوٹے کرانے سے بھی احرام ختم ہو جاتا ہے تو براہ راست ان حدیثوں کا مونچھوں کے مونڈنے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے راجح یہی ہے کہ اگر اِحفاء کرنا ہو تو مونڈ کر نہ کیا جائے بلکہ کاٹ کر کیا جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کئی صحابہ کا عمل نقل کیا ہے اور دونوں طرح کا عمل نقل کیا ہے، ایک تو چھوٹے کرنے کے اور ایک مونچھوں کو بالکل زائل کرنے کے اور جن کے بارے میں یہ آتا ہے کہ وہ مونچھوں کو بالکل زائل کرتے تھے تو زیادہ تر ان کے بارے میں یہی آتا ہے کہ وہ مونچھوں کو کاٹتے تھے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ اگر اِحفاء کرنا ہو تو کاٹ کر کیا جائے مونڈ کر نہیں کرنا چاہئے۔

دلائل...... دلائل کے اعتبار سے جب آپ دیکھتے ہیں تو حدیثیں دونوں طرف ہیں کہ بعض احادیث کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بال بالکل زائل کر دیئے جائیں اور بعض احادیث کے الفاظ مونچھوں کو چھوٹا کرنے پر دلالت کرتے ہیں تو جنہوں نے احفاء کو اصل قرار دیا انہوں نے قص والی احادیث میں توجیہ اختیار کی اور جنہوں نے قص والی کو اصل قرار دیا تو انہوں نے اِحفاء والی احادیث میں توجیہ اختیار کی ہے۔

توجیہ...... مثلاً جن حضرات نے قص کو افضل قرار دیا ہے مونچھیں چھوٹی کرانے کو افضل قرار دیا وہ دوسری قسم کی احادیث میں یہ توجیہ کرتے ہیں کہ یہاں اِحفاء سے مراد مونچھوں کو بالکل ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اِحفاء کا معنی ہے کاٹنے میں مبالغہ کرنا اور اِحفاء کے مبالغہ سے مراد یہ ہے کہ ہونٹوں کے کنارے سے کافی پیچھے کرنا اس لئے کہ مونچھیں ہونٹ کے کنارے سے آگے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اس کو کاٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ صرف کنارے سے کاٹ دیا جائے اس میں یہ ہوگا کہ اگر دوبارہ مونچھیں کاٹنے میں ذرا دیر ہو گئی تو مونچھیں کافی آگے بڑھ جائیں گی، اس لئے بہتر یہ ہے کہ کنارے سے پیچھے ہٹانے میں مبالغہ کریں کہ ہونٹ

کے ذرا متعدبہ حصہ کے پیچھے کی جانب سے کاٹیں، مونچھیں کاٹنے میں دیر بھی ہو جائے تو بھی کنارے سے آگے نہ بڑھنے پائیں اور اِحفاء کا معنی ہے کاٹنے میں مبالغہ کرنا اور یہی انہاک وغیرہ کا بھی معنی ہے تو مبالغہ سے مراد یہ نہیں کہ مونچھوں کو بالکل زائل کر دیا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ کنارے سے پیچھے ہٹانے میں مبالغہ کیا جائے اور یہ اپنی تائید میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ بال یا بالوں کو وہ حصہ جو ہونٹ کے کنارے سے آگے بڑھا ہوا نہیں شارب کہتے ہیں، ہونٹوں سے اوپر تمام بالوں کو شارب کہتے ہی نہیں ہیں۔

ان حضرات نے دوسری توجیہ یہ کی کہ یہاں اصل میں دو چیزیں ہیں ایک ہے سنن الفطرت میں سے ہونا کہ فطرت کا تقاضا ہے اور دوسری ہے مشرکین سے تشبہ کی ممانعت، تو جہاں تک سنن الفطرت میں سے ہونے کا تعلق ہے اس کے بارے میں زیادہ تر حدیثوں میں لفظ قص ہی کا آتا ہے اس کا معنی ہے مونچھوں کو چھوٹا کرنا لہٰذا فطرت کا تقاضا مونچھوں کو چھوٹا کرنا ہے اور جہاں آپ نے بالکل مبالغہ کے ساتھ کاٹنے کا حکم دیا وہ حکم مخالفت مشرکین کے لئے دیا ہے تو جہاں مشرکین کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہو ان کی مخالفت کی ضرورت ہو وہاں کاٹنے میں مبالغہ کیا جائے اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو تو کاٹنے میں مبالغہ بھی نہیں کیا جائے گا تو اصل حکم قص ہے اور استیصال اور اِحفاء کا حکم ایک عارض کی وجہ سے ہے۔

یہ گفتگو ان لوگوں کی طرف سے تھی جو کہ چھوٹا کرنے کو افضل قرار دیتے ہیں اور انہوں نے دوسری طرف کی حدیثوں میں توجیہ اختیار کی۔

اس کے برعکس وہ حضرات جو استیصال کو یعنی مکمل کاٹنے کو افضل قرار دیتے ہیں ان کی طرف سے قص والی احادیث کی توجیہ کی گئی ہے۔

(۱)............ مثلاً ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ قص سے مراد مبالغہ کے ساتھ کاٹنا ہے کہ مونچھوں کو کاٹو اتنا کاٹو کہ وہ مونڈنے کے قریب قریب پہنچ جائیں۔

(۲)............ دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جن حدیثوں میں قص کا ذکر ہے اس سے مراد کامل سنت بیان کرنا نہیں بلکہ سنت کی ادائیگی کا ادنیٰ درجہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر مونچھوں کو چھوٹا کر لیا تو ادنیٰ درجے میں سنت ادا ہو گئی لیکن کامل درجہ میں سنت تب ادا ہو گی جب کہ مونچھوں کو کاٹ دے، تو یہ ان کی طرف سے دوسری طرف کی احادیث میں توجیہ نقل کی گئی ہے۔

بہر حال مونچھیں زیادہ بھاری نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ہلکی پھلکی ہونی چاہیئے لہٰذا اتنی بات پر تو اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ ہونٹ کے کنارے سے پیچھے ہٹی ہوئی ہوں اور بہت بھاری نہ ہوں۔

مونچھیں کس ترتیب سے کاٹنی چاہئیں؟

مونچھیں کس ترتیب سے کاٹنی چاہئیں تو اس کے بارے میں کوئی صریح روایت تو نہیں ہے البتہ ایک عام اصول شریعت کا ہے کہ دائیں طرف سے آغاز کیا جائے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف سے کاٹی جائیں پھر بائیں طرف سے کاٹی جائیں۔

علماء نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ اسے خود کاٹنا افضل ہے یا دوسرے سے کٹوانا افضل ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقے برابر ہی ہیں۔ اپنے اپنے خیالات ہوتے ہیں کسی کو دوسرے سے کٹوانے میں حجاب سا معلوم ہوتا ہے اس لئے خود کاٹنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہیں جن کو خود اپنے ہاتھ سے کاٹنی ہی نہیں آتی، اپنے ہاتھ سے صحیح کٹتی ہی نہیں ہیں تو وہ دوسروں سے کٹوا لیتے ہیں تو اس میں شرعی مسئلے کے لحاظ سے کسی پہلو کو ترجیح نہیں ہے۔

تقلیم الاظفار (ناخن کاٹنا):۔

اس حدیث میں سنن الفطرت میں سے چوتھی چیز تقلیم الاظفار ہے یعنی ناخنوں کو کاٹنا، اس کا تعلق بھی تحسین ہیئت اور نظافت کے ساتھ ہے اس لئے کہ ناخن بڑھے ہوئے اتنے اچھے نہیں لگتے اور دوسرا یہ کہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے حصے کے نیچے میل جم جاتی ہے اور ایک تو وہ طہارت میں مخل ہوتی ہیں وضوء کے اندر کم از کم اسباغ نہیں ہوتا اور دوسرا یہ کہ جب آدمی ہاتھ کے ساتھ کھائے پیئے گا تو اس میں بیماری کے اجزاو جراثیم بھی ہو سکتے ہیں جو انسان کے اندر چلیں جائیں گے اس لئے ناخن کاٹنے کو بھی سنن الفطرت میں سے شمار کیا ہے اور اس بات پر اتفاق ہے کہ ناخن بڑھے ہوئے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ جب بھی بڑھ جائیں تو کاٹ لینے چاہئیں اور اس میں بھی آخری حد چالیس (۴۰) دن کی ہے۔

اگر کوئی آدمی چالیس (۴۰) دن تک ناخن نہ کاٹے تو وہ بظاہر گنہگار ہوگا البتہ اگر چالیس (۴۰) دن سے پہلے ناخن کافی بڑھ جائیں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کاٹنا بھی ضروری ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ویسے تو ناخنوں کو پورے طور پر کاٹے یعنی ہاتھ کی انگلیوں کے آخر میں جو بڑھا ہوا حصہ ہوتا ہے جہاں سے رنگت تبدیل ہو جاتی ہے وہاں تک مکمل طور پر کاٹے لیکن سفر کے لئے یہ بہتر ہے کہ ناخن کچھ بڑھے ہوئے ہوں اس لئے کہ سفر میں کئی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ناخنوں سے پوری ہو جاتی ہیں مثلاً کوئی گرہ وغیرہ کھولنی پڑ گئی اگر گھر میں ہے تو کسی نوک دار چیز سے یہ مقصد حاصل کر لے گا سفر وغیرہ میں ایسی چیزیں ساتھ نہیں ہوتیں، آج کل کے اعتبار سے یہ کہہ دیجئے کہ مثلاً عینک کا پیچ نکل گیا تو گھر میں یہ کام چھری

یا چھوٹے پیچ کس سے چلالے گا لیکن سفر میں یہ کام ناخن سے لینا پڑے گا۔ناخن کاٹنے کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ناخن نہ کاٹے جائیں تو میل جم جاتی ہے۔

ناخنوں کے نیچے میل کچیل جمنے کی صورت میں وضوءاور غسل کا حکم:۔

اب یہاں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نے ناخن نہیں کاٹے کافی بڑے ہو گئے نیچے میل جم گئی تو ظاہر ہے کہ وضواور غسل میں نیچے پانی نہیں پہنچ سکے گا تو کیا ایسے شخص کا وضواور غسل ہو جائے گا اس میں اختلاف ہے۔

بعض حضرات حنابلہ کا مذہب...... بعض حنابلہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا وضو بھی نہیں ہوا اور غسل بھی نہیں ہوا لہذا میل اتار کر اور ناخن کاٹ کر دوبارہ وضواور غسل کیا جائے۔

حضرات حنفیہ کا مذہب...... حضرات حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگرچہ ناخن نہ کاٹنا بری بات ہے لیکن وضو ہو جائے گا۔[1]

دلیل حنفیہ...... اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے پاس بدو بکثرت آیا کرتے تھے ان میں ناخن نہ کاٹنے کا کافی رواج تھا یا یوں کہیے کہ ناخن کاٹنے میں عموماً یہ لوگ متساہل ہوتے تھے، تو ناخن کئی کئی دن تک نہیں کاٹتے تھے تو حضور ﷺ نے ان کو کبھی بھی وضو اور غسل کے اِعادے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ بیہقی اور طبرانی کی ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ کو ایک مرتبہ نماز میں سہو ہو گیا تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ مجھے سہو اس لئے ہوا کہ تم اپنے آپ کو مکمل طور پر صاف کر کے نہیں آتے بلکہ تمہارے ناخنوں کے نیچے میل جمی ہوتی ہے۔ تو یہاں دیکھئے کہ حضور ﷺ نے ان کو جن کے ناخنوں کے نیچے میل جمی ہوئی تھی وضو کر کے دوبارہ نماز کے اِعادے کا حکم نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس صورت میں وضوءاور غسل اور نماز ہو جاتی ہے۔

ناخن کاٹنے کی ترتیب:۔

علماء نے اس میں مختلف ترتیبیں ذکر کی ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ کوئی ترتیب بھی کسی صحیح اور صریح حدیث سے ثابت نہیں مثلاً ایک ترتیب امام غزالی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے اور ہمارے ہاں وہ کافی مشہور ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن کاٹنے کا آغاز دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے کیا جائے یعنی وہ انگلی جو انگوٹھے کے ساتھ والی ہے اور ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی طرف کاٹتا ہوا جائے یعنی شہادت کی انگلی کے بعد

---

(۱) اوجزالمسالک ج ۱۴/ ص ۲۲۶

درمیان والی پھر برابر والی پھر چھوٹی انگلی اور دائیں ہاتھ کا انگوٹھا چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف آجائے اور بائیں ہاتھ میں چھوٹی انگلی یعنی خنصر سے ابتداء کرے اور کاٹتے ہوئے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر آجائے اور سب سے آخر میں دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کاٹے، اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ابتداء بھی دائیں ہاتھ سے ہو رہی ہے اور انتہاء بھی دائیں ہاتھ پر ہو رہی ہے۔

دوسرا یہ کہ ابتداء دائیں ہاتھ سے کرنی تھی تو شہادت کی انگلی چونکہ سب سے افضل ہے اس لئے اس سے ابتداء کی جائے گی اب اس سے ابتداء کر کے ترتیب وار چلنا چاہئے انگوٹھا کاٹیں گے تو ترتیب غلط ہو جائے گی یہ درست نہیں ہے۔

یہ عقلی وجوہ تو اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن اس کو سنت قرار دینا درست نہیں ہے کیوں کہ کسی صحیح صریح روایت سے ثابت نہیں ہے بلکہ امام غزالی رحمہ اللہ کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج میں حافظ عراقی نے کتاب لکھی ہے، احیاء العلوم کے حاشیہ پر ہی موجود ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے تو عقلی حکمتیں اور نقطے اور بھی بہت ہیں لیکن اس کو سنت قرار دینا یہ درست نہیں بایں معنی کہ حضور علیہ السلام سے ثابت ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ چونکہ کوئی خاص طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے البتہ اجمالاً اتنی بات ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف کو ترجیح دیا کرتے تھے، اس لئے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ دائیں طرف سے شروع کیا جائے اور بائیں پر ختم کیا جائے یعنی دائیں ہاتھ کے ناخن پہلے کاٹے جائیں پھر بائیں ہاتھ کے کاٹے جائیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک ترتیب سے کاٹے جائیں مثلاً اگر ہاتھ کو الٹا تصور کریں یعنی ہتھیلی نیچے کی طرف ہو تو پھر صحیح ترتیب یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی خنصر یعنی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور چلتے چلتے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی یعنی خنصر پر ختم کرے اور اگر ہاتھ کو دوسری طرح تصور کریں تو سیدھی ترتیب یہ بنتی ہے کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے شروع کرے اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کرے۔

مخالف ترتیب سے ناخن کاٹنا:-

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ناخن مخالفاً کاٹے جائیں یعنی مخالف ترتیب سے کاٹے جائیں انہوں نے اس میں ایک حدیث بھی بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص الٹی جانب سے ناخن کاٹے تو وہ آشوب چشم سے یعنی آنکھ دکھنے سے محفوظ رہتا ہے لیکن یہ حدیث تو ثابت نہیں ہے البتہ الٹے ناخن کاٹنے کو بعض بڑے بڑے حضرات اور محدثین نے بھی حتی کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اختیار فرمایا ہے۔

حافظ عراقی اور کئی حضرات نے یہ کہا ہے کہ ہم نے تجربہ کیا ہے کہ اس طریقے سے ناخن کاٹنے کو آشوب چشم سے محفوظ پایا ہے اور اس کو تجربہ کی بات کہی جاسکتی ہے اور بعض حضرات جنہوں نے اس کو اختیار فرمایا ہے وہ تجربہ کی بنیاد پر اختیار کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔

الٹی جانب سے ناخن کاٹنے کے کئی طریقے مختلف حضرات نے نقل کئے ہیں۔

حضرت شیخ حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے اوجز المسالک میں اس کے کئی طریقے جمع کر دیئے ہیں۔(۱) مثلاً ابن بطہ وغیرہ نے یہ طریقہ بیان فرمایا ہے کہ سب سے پہلے دائیں ہاتھ کی خنصر کو پھر درمیان والی پھر انگوٹھا اور اس کے بعد چھوٹی انگلی کے ساتھ والی جس کو بنصر کہا جاتا ہے اور اس کے بعد شہادت والی گویا کہ یوں کہئے کہ ایک انگلی کو چھوڑ کر دوسری انگلی کو کاٹا جائے اور درمیان میں واسطہ نہیں ہے، مخالف یہ ہے کہ کبھی آگے کو جارہا ہے کبھی پیچھے کو آرہا ہے یہ تو ہے دائیں ہاتھ میں اور بائیں ہاتھ میں یہ ہے کہ انگوٹھے کی جانب سے شروع کرے یعنی سب سے پہلے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا پھر درمیان والی چھوٹی انگلی پھر شہادت والی انگلی اور سب سے آخر میں چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی جس کو بنصر کہا جاتا ہے وہ کاٹے اور اس میں بھی وہی ہے کہ انگوٹھے کو چھوڑ کر یکے بعد دیگرے ایک انگلی چھوڑ کر دوسری کاٹا جائے تو درمیان میں دو بچ جائیں گی اور اب یہی بچی ہیں اس لئے بعد میں ان کو کاٹے۔

دوسرا طریقہ ...... دوسرا طریقہ مخالفا کاٹنے کا حافظ عراقی نے اپنے بعض شیوخ سے نقل فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے ناخن کاٹے اور اس کے بعد بنصر یعنی چھوٹی انگلی کے برابر والی پھر انگوٹھا پھر درمیان والی انگلی اور پھر چھوٹی انگلی یعنی خنصر یہ پہلے طریقہ کے برعکس ہیں یہ ترتیب دائیں ہاتھ میں ہوگئی اور بائیں ہاتھ میں شہادت کی انگلی سے شروع کرے اور یہی ترتیب ہے، پھر بنصر اور پھر انگوٹھا پھر اس کے بعد درمیان والی انگلی پھر سب سے آخر میں چھوٹی انگلی یعنی خنصر اور پھر حافظ عراقی رحمہ اللہ نے پاؤں میں بھی ترتیب بیان فرمائی ہے کہ پہلے دائیں پاؤں کے ناخن کاٹے وہ اس طریقے سے کہ سب سے پہلے پاؤں کی خنصر چھوٹی انگلی کا ناخن کاٹے پھر درمیان والی پھر انگوٹھا اور اس کے بعد بنصر اور اس کے بعد انگوٹھے کے ساتھ والی یعنی جو پاؤں میں انگوٹھے کے بعد بڑی انگلی ہوتی ہے اور اس کو شہادت والی انگلی نہیں کہیں گے کیوں کہ وہ ہاتھ میں ہوتی ہے یہ تو ترتیب تھی دائیں پاؤں میں، بائیں پاؤں میں ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے انگوٹھا پھر درمیان والی انگلی پھر خنصر یعنی چھوٹی انگلی اور پھر اس کے بعد انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اور پھر چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی یہ طریقہ پاؤں میں ہے، اس کو مخالفا ناخن کاٹنا کہا جاتا ہے، ان حضرات

(۱) اوجز المسالک ج ۱۴/ ص ۲۲ تا ۲۲۸،

نے اس طریقہ پر کاٹنا بیان فرمایا ہے لیکن پھر بھی اسے سنت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کون سے دن ناخن کاٹنے چاہئیں:۔

دن کون سا ہو تو اس میں بہت سارے اقوال ہیں زیادہ تر قول جمعرات کے دن اور ایک جمعہ کا دن ہے دونوں کے بارے میں یعنی جمعرات اور جمعہ کے بارے میں یعنی دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں البتہ جمعہ کی حدیثیں تعداد کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ ہیں اس لئے حنفیہ نے زیادہ تر یہی لکھا ہے کہ جمعہ کے دن کاٹنے چاہئیں اور ویسے بھی جمعہ کے دن جمعہ کی تیاری کے لئے نظافت مطلوب ہے اس اعتبار سے بھی جمعہ کا دن زیادہ افضل ہے اس لئے اس کو ترجیح ہے۔ بعض حنفیہ نے اس بارے میں یہ لکھا ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد کاٹے تاکہ یہ ناخن جمعہ میں شریک ہو جائیں اور اس کے جمعہ پڑھنے کی گواہی دیں لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی صحیح بات یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے کاٹے اس لئے کہ جمعہ کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی جمعہ پڑھنے کے لئے صاف ستھرا ہو کر جائے اور جمعرات کے بارے میں بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمعرات کے دن ناخن کاٹنا درحقیقت جمعہ کی تیاری ہے بلکہ جمعہ کی تیاری میں تعجیل ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے یہ نقل کیا ہے کہ جمعہ کی تیاری جمعرات سے بہتر ہے اس لئے ویسے تو جس دن بھی کاٹ لیئے جائیں درست ہے کوئی حرج کی بات نہیں ہے ہاں اگر کسی دن کو مقرر کرنا ہو تو جمعرات اور جمعہ کا دن زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے جمعہ کا دن تو اس لئے کہ نظافت کا دن ہے اور جمعرات کا دن اس لئے کہ جمعہ کی تیاری کے لئے ہے۔

بال اور ناخن کاٹنے کے بعد دفن کرنا:۔

کاٹنے کے بعد بہتر یہ ہے کہ بالوں اور ناخنوں کو دفن کر دیا جائے، چنانچہ حیل بنت مسرج کہتی ہیں کہ میرے والد نے اپنے ناخن کاٹے اور کاٹنے کے بعد انہیں جمع کر کے دفن کر دیا پھر فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا ہی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[1]

اسی طرح حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بالوں اور ناخنوں کو دفن کرنے کا حکم فرماتے تھے امام بیہقی شعب الایمان میں اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے لیکن سب ضعیف ہیں۔ امام بیہقی نے السنن کبریٰ[2] میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ناخنوں، بالوں اور خون کو دفن کر دیا کرو یہ حدیث نقل کرنے

(۱) شعب الایمان للبیہقی ج۵/ص ۲۳۴..... (۲) ج۱/ص ۲۳

کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں ناخن کو دفن کرنے کے بارے میں کئی حدیثیں مروی ہیں لیکن سب ضعیف ہیں۔
لیکن ایک تو تعدد طرق سے ضعف کی تلافی ہو جاتی ہے دوسرے یہ مسئلہ شریعت کے ایک عام مسلمہ اصول پر مبنی ہے اور وہ ہے انسانی اجزاء کا احترام اس لئے کئی فقہاء نے ناخن اور بال دفن کرنے کو مستحب لکھا ہے۔[1] اصل وجہ تو دفن کرنے کی احترام جزو انسان ہے اسی وجہ سے انہیں ناپاک جگہ پر پھینکنا مکروہ ہے البتہ بعض حضرات نے اس کی وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے ایسے ہی پھینک دینے کی صورت میں یہ جادوگروں کے ہاتھ چڑھ جائیں گے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ایک روایت بھی نقل کی ہے: **أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أمر بدفن الشعر والأظفار وقال: لایتلعب بہ سحرة بنی آدم۔** یعنی آنحضرت ﷺ نے بالوں اور ناخنوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کہیں جادوگر لوگ انہیں اپنا بازیچہ نہ بنالیں۔

(۳)----- عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالفوا المشرکین، أوفروا اللحی وأحفوا الشوارب۔

وفی روایة: أنھکوا الشوارب وأعفوا اللحی۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: مشرکین کے الٹ کام کیا کرو، داڑھی بڑھایا کرو اور مونچھوں کو مبالغہ کے ساتھ کاٹا کرو اور ایک روایت میں یہ ہے کہ مونچھیں اچھی طرح کاٹا کرو اور داڑھی کو بڑھنے دیا کرو۔

اللحی لام کے پیش اور زیر کے ساتھ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے یہ لحیۃ کی جمع ہے جس کے معنی مشہور امام لغت جوہری نے یہ بیان کئے ہیں: **الشعر النابت علی اللحی** یعنی وہ بال جو جبڑے کی ہڈی پر اگے ہوئے ہوں۔

داڑھی کے بارے میں حدیثوں کے الفاظ:-

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ان الفاظ کو جمع کر دیا ہے جو داڑھی کے بارے میں وارد ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں: "وَفّروا" توفیر سے امر کا صیغہ جس کا معنی ہے بڑھتے رہنے دینا یہاں بحث حدیث میں اَوفروا ہے یہ بھی اسی معنی میں ہے۔

"أعفوا" جیسا کہ یہاں متن کی دوسری روایت میں ہے ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ عفو سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چھوڑنا یعنی داڑھی کو بڑھنے دو اسے چھیڑو نہیں۔ "أعفوا" کے اگرچہ اور بھی معنی کئے گئے ہیں لیکن راجح یہی ہے جو ابھی ذکر کیا گیا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو اوجز المسالک ج ۱۴/ ص ۲۳

"أرجئوا" ارجاء سے مشتق ہے مؤخر کرنا، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ داڑھی کو بڑھنے دو۔

"أرخوا" یعنی لمبا کرو۔

"أوفوا" یعنی پوری داڑھی رکھو۔(۱)

محض داڑھی رکھنے کا حکم نہیں بلکہ بڑھانے کا حکم ہے:۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شریعت میں حکم صرف داڑھی رکھنے کا نہیں ہے بلکہ اسے بڑا کرنے اور نہ کاٹنے کا ہے لہٰذا جب تک دوسری دلیل شرعی سے کاٹنا ثابت نہ ہو جائے تب تک اصل حکم یہی ہوگا کہ اسے نہ کاٹا جائے، اس سے ان بعض متجددین کی غلطی واضح ہو گئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت میں صرف داڑھی رکھنے کا حکم ہے، چھوٹی سے چھوٹی داڑھی رکھ کر باقی کو کاٹ لیا جائے تو اس سے حکم شرعی پورا ہو جاتا ہے، باقی جن دلائل سے ایک قبضہ (مٹھی) کی مقدار ثابت کی جاتی ہے وہ دلائل کمزور ہیں لہٰذا داڑھی کا ایک قبضہ سے پہلے کاٹنا بھی درست ہے لیکن آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ایک قبضہ (مٹھی) کی مقدار کے دلائل کمزور نہیں ہیں لیکن تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ یہ دلائل کمزور ہیں تب بھی اس کا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ایک قبضہ سے کم کاٹنا جائز ہو بلکہ مقدار قبضہ کے دلائل کے انکار کا لازمی نتیجہ اوپر ذکر کردہ الفاظ حدیث کی روشنی میں یہ نکلتا ہے کہ ایک مٹھی سے زائد ہونے کی صورت میں بھی داڑھی کا کاٹنا جائز نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ان الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ داڑھی کو بڑھنے دو اور کبھی بھی نہ کاٹو۔

لیکن داڑھی بڑھانے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کسی معالجہ کے ذریعے اسے بڑا کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ حد شرعی سے پہلے اسے کاٹا نہ جائے۔

داڑھی بڑھانے کا حکم محض مخالفت مشرکین کے لئے نہیں:۔

داڑھی منڈوانے یا اسے حد شرعی سے چھوٹا کرنے میں ایک مفسدہ تو یہ ہے کہ اس میں مشرکین کے ساتھ تشبہ ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث زیر بحث میں خالفوا المشرکین کے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ داڑھی منڈوانے کی ممانعت محض عارض تشبہ کی وجہ سے ہے بلکہ داڑھی کا ہونا بذات خود شریعت میں مطلوب و مقصود اور تمام انبیاء و مقبولین کا شعار رہا ہے اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض روایات میں سنن فطرت شمار کرتے ہوئے داڑھی کا بھی ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اور ابو داؤد وابن حبان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے۔

بڑھی ہوئی داڑھی کاٹنے کا حکم:۔

داڑھی بڑھانے کا یہ حکم علی الاطلاق ہے یا اس کی کوئی حد بھی ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کیا کسی صورت میں داڑھی کاٹنا جائز بھی ہے یا نہیں اس میں سلف اور فقہاء کے مختلف اقوال ہیں جن کا خلاصہ چار قول ہیں:

(۱)......... کسی بھی حالت میں داڑھی کو کاٹنا جائز نہیں خواہ ایک مٹھی سے زائد ہو اکثر شافعیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۲)......... عام حالات میں تو کاٹنا جائز نہیں البتہ حج یا عمرہ میں احرام ختم کرتے وقت جب سر کے بال منڈوائے جائیں اور مونچھیں اور ناخن کاٹے جائیں اس وقت کچھ حصہ داڑھی کا کاٹنا بھی جائز ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے اس موقع پر کاٹنے کے استحباب کی تصریح کی ہے۔

(۳)......... داڑھی کا جو حصہ زیادہ بڑھا ہوا ہو اس کا کاٹنا جائز ہے ان حضرات نے اس سلسلے میں کسی خاص مقدار کی تحدید نہیں کی چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ سے ابن القاسم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے: **لا بأس أن یوخذ ماتطایر من اللحیة وشذ۔**

یعنی داڑھی کے جو بال ادھر ادھر نکلے ہوئے ہوں ان کو کاٹنا تاکہ داڑھی برابر ہو جائے جائز ہے اسی طرح امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر داڑھی بہت لمبی ہو جائے تو اسے کچھ چھوٹا کر لینا چاہئے اسی طرح مالکیہ میں سے قاضی عیاض فرماتے ہیں: **أما الأخذ من طولها وعرضها إذا عظمت فحسن۔** یعنی داڑھی جب بڑھی ہو جائے تو اس کی لمبائی اور چوڑائی میں سے کچھ کاٹ لینا بہتر ہے اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کے ہاں اگرچہ داڑھی کاٹنے کا تصور ہے لیکن اس صورت میں جب کہ داڑھی بڑی ہو جائے۔[1]

(۴)......... حنفیہ کا مذہب بھی مالکیہ کے قریب قریب ہی ہے کہ جب داڑھی بڑی ہو جائے تو اسے کاٹ لینا چاہئے البتہ اتنا فرق ہے کہ حنفیہ نے بڑی اور چھوٹی کی حد بندی بھی کر دی ہے اور وہ ہے ایک قبضہ یعنی مٹھی کی مقدار لہٰذا جو داڑھی بھی اس سے زائد ہو اس کا کاٹنا مستحب یا جائز ہے اور اس سے کم ہو تو اس کا کاٹنا ناجائز ہے۔

حنفیہ کی عام عبارات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مٹھی سے جو بڑھ جائے اس کا کاٹنا مستحب ہے بعض عبارات سے کاٹنے کا وجوب بھی معلوم ہوتا ہے لیکن وجوب کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں اس لئے راجح

---

(۱) تفصیل بالا کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری باب تقلیم الاظفار واوجز المسالک ۱۵: ۴ السنۃ فی الشعر

استحباب ہے البتہ وجوب کو اس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے جب کہ زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے بری لگتی ہو اور سنت کے استہزاء کا خطرہ ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن جریر طبریؒ کا قول نقل کیا ہے: **إن الرجل لو ترك لحيته لايتعرض لها حتى أفحش طولها وعرضها لعرض نفسه ممن يسخر به۔**

یعنی کوئی آدمی اپنی داڑھی لمبی چوڑی ہونے کے باوجود اسے نہ کاٹے تو یہ اپنے آپ مذاق بنوانے والی بات ہے۔

قول اول کے دلائل...... پہلے قول والوں نے حدیث زیر بحث اور اس طرح کی دوسری احادیث کے عموم سے استدلال کیا ہے ان میں بغیر کسی تحدید کے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔

حنفیہ وغیرہ کے دلائل...... دوسرے، تیسرے اور چوتھے قول میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانے کی احادیث اپنے عموم پر نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ نہ کچھ تخصیص ہے یعنی کسی نہ کسی حالت میں کاٹنے کی اجازت ہے، دوسرے قول والوں کے ہاں اجازت صرف حج یا عمرہ کے بعد ہے جب کہ تیسرے اور چوتھے قول والوں کے نزدیک یہ اجازت حج یا عمرہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

حنفیہ نے ایک تو اسی حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی رحمہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی مبارک لمبائی اور چوڑائی کی جانب سے کاٹا کرتے تھے۔

اس حدیث کے ایک راوی عمر بن ہارون ہیں جن پر بعض محدثین نے شدید جرح کی ہے لیکن اس کے برعکس بعض حضرات سے ان کی توثیق بھی منقول ہے مثلاً قتیبہ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تو عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا: **سبحان الله ماقلت فيه إلا خيرا**۔ امام ترمذی نے یہی حدیث روایت کرنے کے بعد امام بخاری سے اس کی توثیق نقل کی ہے البتہ ساتھ ہی یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے ان کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس کے برعکس حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن جریر طبریؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث مختلف فیہ ہے اس لئے تقریباً حسن ضرور ہو گی اس کے علاوہ اس حدیث کی اہم تائید اسی بات سے ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے قبضہ سے زائد داڑھی کاٹنا روایات صحیحہ سے ثابت ہے جب کہ اعفاء اللحیہ یعنی داڑھی بڑھانے والی احادیث کے اہم راوی بھی یہ دو حضرات ہیں، اب یقینی بات ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی

اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی بات سنی ہوگی یا آپ کا کوئی عمل دیکھا ہوگا ورنہ کوئی صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت بھی کر رہا ہو اور عملاً اس کی مخالفت بھی کر رہا ہو یہ ممکن نہیں ہے۔

ذیل میں سلف کے کچھ اقوال ذرا تفصیل سے پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی:

(۱)......... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مٹھی سے زائد داڑھی کاٹ لیا کرتے تھے چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار میں تعلیقاً (بغیر سند کے) ابن عمر کا یہ فعل نقل کیا ہے اور یہ بات پہلے کئی دفعہ بتائی جاچکی ہے صحیح بخاری کی تعلیقات یعنی بغیر سند کے ذکر کردہ روایات بھی صحیح ہوتی ہیں مؤطا امام مالک، مصنف ابن ابی شیبہ، بیہقی کی السنن الکبریٰ اور مستدرک حاکم وغیرہ میں یہی فعل ابن عمر سے متعدد سندوں کے ساتھ بھی مروی ہے، ابن عمر کا یہ معمول صرف حج یا عمرے موقع پر تھا یا عام تھا اس میں کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل حج یا عمرے کے ساتھ خاص نہیں تھا چنانچہ مستدرک حاکم[1] میں مروان بن سالم کی روایت ہے:

رأيت ابن عمر يقبض على لحيته ويقطع ما زاد على الكف قال و كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول إذا أفطر ذهب الظمأ الخ۔

حاکم نے اس حدیث کو صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے امام دارقطنی نے اسے روایت کرنے کے بعد اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[2] اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی کتاب الصوم باب القول عند الافطار میں نقل کیا ہے اس روایت میں حج یا عمرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ[3] میں نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ وہ مٹھی سے زائد کاٹا کرتے تھے اس میں بھی حج اور عمرہ کی تخصیص نہیں ہے۔

البتہ بخاری کی نقل کردہ روایت کے لفظ یہ ہیں: **كان ابن عمر إذا حج أو اعتمر قبض على لحيته فما فضل أخذه۔** اسی روایت کو امام مالک نے مؤطا میں نافع کے حوالے سے ذکر کیا ہے اس میں اگرچہ حج اور عمرے کے موقع پر داڑھی کاٹنے کا ذکر ہے اس میں لیکن دوسرے موقع پر کاٹنے کی نفی نہیں ہے جب کہ پہلے ذکر کردہ روایات سے جن میں خود نافع کی روایت بھی شامل ہے سے علی الاطلاق کاٹنا معلوم ہوتا ہے۔

بخاری کی اس روایت میں صرف حج اور عمرہ کے موقع کو ذکر کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس موقع پر یعنی احرام کھولنے کے موقع پر جسم کے مختلف حصوں کے بال اور ناخن کاٹنے کی زیادہ اہمیت ہے چنانچہ

---

(۱) ج۱/ص ۵۸۴......(۲) ج۲/ص ۱۸۵......(۳) ج۸/ص ۳۷۵

ابن جریر طبریؒ نے مجاہد وغیرہ سے قرآنی آیت:ثم لیقضوا تفثهم کی تفسیر میں سر کے بال، مونچھیں وغیرہ کاٹنے کے ساتھ داڑھی کاٹنا بھی نقل کیا ہے۔

یہاں حج اور عمرہ کو خاص طور پر ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس سال ابن عمر کا حج کا ارادہ ہوتا اس سال شوال ہی سے داڑھی کاٹنا بند کر دیتے تھے چنانچہ بیہقی کی السنن الکبریٰ[1] میں مالک عن نافع کے طریق ہی سے مروی ہے: **كان إذا أفطر من رمضان وهو يريد الحج لم يأخذ من رأسه ولا من لحيته شيأ حتى يحج۔**

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ شافعی ہیں اکثر شافعیہ کے نزدیک حج اور عمرے کے علاوہ کسی بھی حالت میں داڑھی کاٹنا جائز نہیں ہے لیکن یہاں انہوں نے ترجیح اس کو دی ہے کہ ابن عمر کا یہ معمول حج یا عمرے کے ساتھ خاص نہیں تھا چنانچہ فتح الباری میں وہ بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والذی يظهر أن ابن عمر لايخص هذا التخصيص بالنسك بل كان يحمل الأمر بالإعفاء على غير الحالة التی تتشوه فيها الصورة بإفراط طول شعر اللحية أو عرضه۔

یعنی ابن عمر کے نزدیک یہ معاملہ حج یا عمرے کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانے کے حکم سے وہ صورتیں خارج ہیں جبکہ اس کے لمبائی یا چوڑائی میں بڑھ جانے کی وجہ سے بدنمائی ہو رہی ہو، گویا ابن عمر کا کاٹنا محض حج یا عمرہ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ بدنمائی سے بچنے کے لئے تھا۔

(۲)............ابن جریر طبریؒ نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک شخص کی مٹھی سے زائد بڑی ہوئی داڑھی کو کاٹ ڈالا تھا۔[2]

(۳)............حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ایک قبضہ سے زائد داڑھی کو کاٹ دیا کرتے تھے۔[3]

(۴)............ مؤطا امام مالک میں سالم بن عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ وہ احرام باندھنے سے پہلے اپنی مونچھیں اور داڑھی کو چھوٹا کیا کرتے تھے۔

(۵)............ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے داڑھی کو چھوٹا کرنا مروی ہے چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ[4] میں ہے:**عن سلمان بن يزيد قال: كان علی يأخذ من لحيته مما يلی وجهه۔**

(۶)............ حسن بصری فرماتے ہیں: **كانوا يرخصون فيما زاد على القبضة من اللحية أن يؤخذ منها۔** یعنی ایک مٹھی سے بڑی ہوئی داڑھی کو کاٹنے کی صحابہ و تابعین اجازت دیا کرتے تھے۔[4]

(۷)............ابو ہلال کہتے ہیں میں نے حسن بصری اور محمد بن سیرین سے داڑھی کے بارے میں سوال کیا تو

---

(۱) ج۵/ص ۳۳......(۲) فتح الباری......(۳) مصنف ابن ابی شیبہ ج۸/ص ۳۷۵......(۴) ج۸/ص ۳۸۴......(۴) ابن ابی شیبہ

انہوں نے کہا کہ داڑھی کی لمبائی کو کم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

(۸)............ابراہیم نخعی کہتے ہیں: **کانوا یأخذون من جوانبها وینظفونها یعنی من اللحیته** یعنی سلف داڑھی کی جوانب کو چھوٹا کرتے تھے اور اسے صاف ستھرا رکھتے تھے۔[2]

(۹)............ قاسم بن محمد (صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شاگرد خاص) بھی جب سر منڈواتے تھے تو مونچھوں اور داڑھی کو چھوٹا کر لیا کرتے تھے۔[3]

(۱۰)............حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص دیکھا جس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنی شکل بدنما کیوں کرے اور آپ نے اشارے سے اس شخص سے کہا کہ داڑھی اور سر کے بالوں کو چھوٹا کر لو۔

یہ حدیث روایت کرنے کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی عبدالملک بن الحسین النخعی ضعیف ہیں۔[4] یہاں یہ روایت پچھلی روایات کی مؤید کے طور پر لکھی ہے ان روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سلف کی ایک بڑی جماعت جن میں خود اعفاء اللحیہ کی احادیث روایت کرنے والے بعض فقہاء صحابہ بھی شامل ہیں ان احادیث کا یہ مطلب نہیں سمجھ رہے کہ داڑھی کو کسی بھی حالت میں کاٹنا جائز نہیں ہے بلکہ ان حضرات کا اپنا عمل اور فتویٰ داڑھی کو چھوٹا کرنے کا ہے۔ان حضرات کے قول کو اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیم کو غیر نبی کے اقوال کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے بلکہ ان حضرات کے آثار کی مدد سے حدیث کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لیکن حدیث میں لفظ چونکہ داڑھی رکھنے کے نہیں بلکہ بڑھانے کے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ داڑھی کی مقدار قابل ذکر ہونی چاہئے بالکل ہی چھوٹی اور برائے نام داڑھی سے یہ حکم پورا نہیں ہوگا۔اب یہ قابل ذکر اور معتد بہ مقدار کتنی ہے مالکیہ نے اس کی تحدید نہیں کی بلکہ اسے رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دیا ہے جب کہ حنفیہ نے صحابہ و تابعین ہی کے آثار سے اس کی ایک حد یعنی مٹھی کی مقدار بھی مقرر کر دی ہے۔

(٤)----- وعن أنس رضي الله عنه قال: وَقَّتَ لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في قص الشارب وتقليم الأظفار ونتف الابط وحلق العانة أن لانترك أكثر من أربعين ليلة۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ......حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے ہمارے لئے مونچھیں چھوٹی کرنے، ناخن کاٹنے، بغلوں کے بال اکھیڑنے اور زیر ناف بال مونڈنے میں

---

(۱) ابن ابی شیبہ......(۲) شعب الایمان ج ۵ / ص ۲۲۰......(۳) ابن ابی شیبہ......(۴) شعب الایمان ج ۵ / ص ۲۲۱

یہ حد مقرر فرمائی ہے کہ ہم ان کاموں کو چالیس راتوں سے زیادہ تک نہ چھوڑیں۔
ان چاروں کاموں پر پہلے تفصیل سے بات ہو چکی ہے۔

(۵)-----عن أبی هریرة رضی الله عنه أن النبی صلی الله علیه وسلم قال: إن الیهود والنصاری لا یصبغون فخالفوهم۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود و نصاریٰ (سفید بالوں کو) خضاب نہیں لگاتے لہٰذا تم ان کی مخالفت کیا کرو۔ (یعنی خضاب لگایا کرو)

خضاب کا حکم:-

سفید بالوں کو مہندی یا کسی اور چیز سے کوئی بھی رنگ چڑھالیا جائے اسے عربی میں "خضاب" کہہ دی جاتا ہے کالے رنگ کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہے جس کی تفصیل اس باب کی حدیث نمبر ۳۴ کے تحت آئے گی، کالے کے علاوہ باقی رنگوں کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان کا خضاب جائز ہے، البتہ بعض رنگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نسبۃً زیادہ پسند تھے جن کا بیان دوسری فصل کی بعض حدیثوں میں آئے گا۔

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفت یہود و نصاریٰ کے پیش نظر خضاب کا امر فرمایا، اگلی حدیث میں آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفید بالوں پر خضاب کا حکم فرمایا جب کہ دوسری طرف بعض حدیثوں میں سفید بالوں کو مؤمن کا نور قرار دیا گیا ہے اس لئے اس بات میں اختلاف ہو گیا ہے کہ خضاب لگانا افضل ہے یا نہ لگانا بعض حضرات نے خضاب لگانے کو افضل قرار دیا ہے بلکہ حافظ ابن حجر نے امام احمد سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ خضاب واجب ہے لیکن امام احمد کی مشہور روایت استحباب کی ہے ان حضرات نے حدیث زیر بحث اور اس مضمون کی دیگر احادیث سے استدلال کیا ہے۔

بعض حضرات نے ترک خضاب کو افضل قرار دیا ہے ان حضرات نے ان حدیثوں سے استدلال کیا ہے جن میں تغییر الشیب سے یعنی سفید بالوں کو تبدیل کرنے سے ممانعت آئی ہے لیکن اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ تغییر الشیب سے مراد سفید بالوں کو سیاہ کرنا ہے، بعض علماء نے دونوں قولوں میں مختلف طریقوں سے محاکمہ بھی فرمایا ہے ایسے حضرات کی بات کا لب لباب یہ ہے کہ اگر تو کسی جگہ خضاب نہ کرنے کی وجہ سے کفار سے مشابہت ہو رہی ہو وہاں تو خضاب کرنا اولیٰ ہو گا اور جہاں یہ بات نہ ہو وہاں عوارض کے بدلنے سے حکم بدل جائے گا مثلاً:

(۱)........... بعض حضرات نے یہ کہا کہ اگر بال مکمل سفید ہوں تو خضاب اولیٰ ہے جیسا کہ حضرت ابو قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بالوں کے بارے میں اگلی حدیث میں آرہا ہے اور اگر سفید اور کالے بال ملے جلے ہوں تو ترک خضاب اولیٰ ہو گا۔

(۲)........... بعض آدمیوں کو سفید بال زیادہ خوبصورت لگتے ہیں ان کے لئے ترک خضاب اولیٰ ہو گا اور بعض کے سفید بال اتنے اچھے نہیں لگتے ان کے لئے خضاب کرنا اولیٰ ہو گا۔

(۳)........... اگر کسی جگہ خضاب کی بالکل عادت نہ ہو وہاں خضاب کرنا عجیب سا لگتا ہے اور بعض جگہوں پر ہو سکتا ہے کہ خضاب کی ایسی عادت عام ہو کہ سفید بال عجیب سے لگتے ہوں۔ پہلی صورت ترک خضاب اور دوسری صورت میں خضاب کرنا اولیٰ ہو گا چنانچہ معروف مالکی فقیہ اور محدث علامہ باجی فرماتے ہیں:

وذلك عندي يصرف إلى وجهين، أحدهما أن يكون أمرا معتادا ببلدالإنسان فيسوغ له ذلك فإن الخروج عن الأمر المعتار يشهرو يستقبح۔[1]

(٦)-----عن جابر رضي الله عنه قال: أتي بأبي قحافة يوم فتح مكة ورأسه ولحيته كالثغامة بياضا، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: غيروا هذا بشيء واجتنبوا السواد۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ والے دن حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اس وقت ان کا سر اور داڑھی ثغامہ بوٹی کی طرح سفید تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس (سفیدی) کو کسی چیز کے ذریعے بدل ڈالو لیکن کالے رنگ سے بچنا۔

ابو قحافہ رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد ہیں، فتح مکہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود انہیں اٹھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بوڑھے شخص کو لے کر کیوں آئے ہم خود ان کے پاس چلے جاتے، صدیق اکبر نے عرض کیا کہ ان کا حق بنتا تھا کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام کی دعوت دی انہوں نے اسلام قبول کر لیا، حضرت صدیق اکبر کے بھی بعد ۱۴ ہجری میں ستانوے سال کی عمر میں انتقال ہوا، قتادہ کہتے ہیں یہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جنہیں خضاب لگایا گیا۔[2]

ثغامہ ...... ایک بوٹی ہے جس کے پتے اور پھل دونوں انتہائی سفید ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ

(۱) اوجز المسالک ج ۱۵/ ۲۸...... (۲) الاصابہ ج ۴/ ص ۴۵۲

علیہ وسلم نے حضرت ابوقحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بالوں کو خضاب کا حکم فرمایا لیکن کالے خضاب سے منع فرمایا اس کی وجہ امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق تو یہ ہوگی سیاہ خضاب ناجائز ہے جیسا کہ آگے تفصیل سے مسئلہ آئے گا اور جن کے نزدیک زینت کے لئے سیاہ خضاب جائز ہے ان کے نزدیک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ عمر زیادہ ہو اور بڑھاپے کی وجہ سے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہوں تو سیاہ خضاب زینت کی بجائے بدنمائی کا باعث بن جاتا ہے کہ داڑھی اور سر تو جوانوں جیسے ہوتے ہیں اور چہرہ بوڑھوں جیسا۔

(۷)-----عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب موافقة أهل الکتاب فیما لم یؤمر فیه، وکان أهل الکتاب یسدلون أشعارهم، وکان المشرکون یفرقون رؤوسهم فسدل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ناصیته، ثم فرق بعد۔ (متفق علیه)

ترجمہ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کاموں میں جن میں آپ کو اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے اور اہل کتاب سر کے بالوں کو مانگ نکالے بغیر رکھتے تھے اور مشرکین اپنے سروں میں مانگ نکالا کرتے تھے چنانچہ (ابتداء میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سامنے کے بال بغیر مانگ نکالے رکھتے رہے پھر آپ نے مانگ نکالنا شروع کر دیا۔

فرق...... فرق کا معنی ہے سر کے بالوں میں مانگ نکالنا یعنی انہیں درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر کے کچھ دائیں طرف کر دینا اور کچھ بائیں طرف اور سدل کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ سر کے بالوں میں مانگ نہ نکالنا اور سامنے والے بالوں کو پیشانی پر لٹکا لینا یا یہ کہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی بجائے ویسے ہی پیچھے کی طرف موڑ لینا وغیرہ وغیرہ، یہاں سدل کا ذکر چونکہ فرق کے مقابلے میں کیا گیا ہے اس لئے یہاں صحیح یہ ہے کہ سدل سے مراد محض اتنا ہے کہ مانگ نہ نکالی جائے خواہ اس کی کوئی شکل ہو یعنی خواہ بال پیشانی پر گرا لئے جائیں یا پیچھے کی طرف موڑ لئے جائیں۔

اہل کتاب کی موافقت یا مخالفت؟

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو شروع شروع میں آپ ان کاموں میں جن میں کوئی حکم الٰہی موجود نہیں ہوتا تھا اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے

اس لئے آپ ایک عرصے تک بالوں میں بھی ان کی موافقت کرتے ہوئے مانگ نکالنے کی بجائے سدل پر عمل کرتے رہے لیکن بعد میں آپ کا معمول اہل کتاب بالخصوص یہود کی موافقت کا بدل گیا بلکہ کئی امور میں ان کی مخالفت کا امر فرمایا چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسی روایات جمع کی ہیں جن میں اہل کتاب یا صرف یہود کی مخالفت کا حکم دیا گیا، ایسے احکام تیس سے زائد ہیں۔ (۱)

حضور ﷺ ابتداء میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے اس کی وجہ کیا تھی تو شارحین حدیث نے اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ لوگ بھی سماوی دین کو ماننے والے اور بظاہر توحید کے قائل ہیں اس لئے بنسبت مشرکین کے اسلام کے زیادہ قریب ہیں لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک کہ آپ کو ان کی مخالفت کا حکم نہیں دیا گیا جب اور جن کاموں میں ان کی مخالفت کا حکم دے دیا وہاں آپ نے مخالفت کو اختیار فرمالیا۔

دوسری وجہ متعدد شارحین حدیث نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جائز اور مباح کاموں میں آپ ان کی موافقت اس لئے پسند فرماتے تھے تاکہ ان کے دل اہل اسلام کی طرف مائل ہوں اس لئے کہ کسی جیسا طرز اختیار کرنے سے اس کے قلب میں نرم گوشہ ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن بعد کے تجربے سے یہود پر اس ترکیب کا غیر سود مند ثابت ہو گیا اس لئے کہ مشرکین تو اکثر مسلمان ہو گئے لیکن باوجود مدارات کے یہود میں سے بہت کم لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔

سر کے بالوں کے احکام:-

اس حدیث کا تعلق سر کے بالوں کے ساتھ ہے اسی طرح آگے آنے والی بعض احادیث بھی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے سر کے بالوں کے متعلق عمومی گفتگو یہیں کرلی جائے۔

سر کے بالوں کے بارے میں بعض کاموں کا احادیث سے صراحتاً مطلوب و مستحسن ہونا معلوم ہوتا ہے اور بعض کا ناجائز اور ناپسندیدہ ہونا، بالوں کی جس ہیئت کا مطلوب ہونا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے اختیار کرنا ثابت ہو جائے وہ مسنون و محمود ہوگی اور جس ہیئت سے صراحۃً منع کر دیا گیا ہے جیسے قزع یا اصول شریعت اس کے عدم جواز کا تقاضا کرتے ہوں جیسے تشبہ مع الکفار والی ہیئتیں وہ شرعاً ناپسندیدہ ہوں گی ان دو قسم کی ہیئات کے علاوہ باقی ہیئتوں کا حکم یہ ہوگا کہ وہ مباح اور جائز ہیں نہ ہی مسنون ہیں اور نہ ہی حرام یا مکروہ۔ بالوں کی ہیئت کے بارے میں اصل اصول تو یہی ہے اب اس اصول کی روشنی میں بعض خاص ہیئات پر جزوی گفتگو کی جاتی ہے۔

---

(۱) حافظ نے اپنے اس رسالہ کا نام "القول المثبت فی الصوم یوم السبت" ذکر کیا ہے۔

فرق یعنی مانگ نکالنا:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمومی معمول سر پر بال رکھنے کا تھا، نسکین یعنی حج وعمرہ یا پچھنے لگانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سر کے بال منڈوانا ثابت نہیں ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ابتداء میں اگرچہ آپ سدل فرماتے تھے یعنی بغیر مانگ نکالے بال پیچھے کی طرف کر لیتے تھے لیکن آپ کا آخری عمل مانگ نکالنے کا رہا ہے اس لئے اصل سنت سر کے بالوں کے بارے میں یہ ہے کہ سر پر پٹھے رکھے جائیں اور درمیان میں مانگ نکالی جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کتنے لمبے ہوتے تھے اس کا ذکر فصل ثانی کی بعض روایات میں آئے گا حاصل ان کا یہ ہے کہ عموماً آپ کے پٹھے کانوں کی لو کے قریب ہوتے تھے۔

مانگ سر کے درمیان میں ہو:-

مانگ کہاں نکالی جائے تو حدیث میں لفظ "فرق" کا آتا ہے اس کے معنی ہی علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۲۲/۵۶) میں سر کے درمیان سے بالوں کو تقسیم کرنے کے ذکر کئے ہیں، اسی طرح مفرق (مانگ نکالنے کی جگہ) سر کے درمیان کو کہتے ہیں اس لئے مانگ نکالنے کا اصل طریقہ یہی ہے کہ وہ سر کے درمیان ہو اس کے علاوہ فصل ثانی میں ابوداؤد کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہ حدیث آرہی ہے جس میں انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ کیسے نکالا کرتی تھیں اس میں سر کے درمیان سے مانگ نکالنے کی تصریح ہے اس لئے مسنون بال تبھی سمجھے جائیں گے جب کہ مانگ سر کے درمیان میں ہو اگر درمیان میں نہ ہو وہ بال مسنون نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ اگر انداز ایسا ہو جو کسی کافر قوم یا فساق اور لوفر قسم کے لوگوں کا شعار ہو تو اسے ناجائز کہا جائے گا اور اگر یہ تشبہ والی بات نہ ہو تو ایسے بال محض مباح ہوں گے۔

زیادہ بڑے بال بھی پسندیدہ نہیں:-

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل سنت سر پر پٹھے رکھنا ہی ہے لیکن بہت بڑے بال رکھنے کو بھی پسند نہیں کیا گیا، چنانچہ الفصل الثانی میں ابن الحنظلیہ کی حدیث آرہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خریم اسدی اچھے آدمی ہیں اگر ان کے سر کے بال بڑے نہ ہوں اور لنگی ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، چنانچہ خریم اسدی رضی اللہ عنہ نے بالوں کو کاٹ کر کانوں کے برابر کر لیا اور لنگی کو آدھی پنڈلی تک اونچا کر لیا۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں

کہ ایک دفعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ فرمارہے تھے "ذباب ذباب" (نحوست نحوست) میں نے سمجھا مجھے فرمارہے ہیں اس لئے میں گیااور جاکر بالوں کو چھوٹا کر کے واپس حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایامیں تمہیں نہیں کہہ رہاتھالیکن بہرحال یہ حالت پہلی سے اچھی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو صحیح قرار دیاہے۔(۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بعض اوقات جمعہ کے دن مسجد کے دروازے پر آدمی کھڑے کر دیتے وہ جس کے زیادہ بڑے بال دیکھتے انہیں کاٹ دیتے۔(۲)

ایک شخص ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے ابراہیم نخعی نے اس پر ناپسندیدگی کااظہار کیاتوانہوں نے کہاکہ پہلے زمانے میں بھی تو یہ پہنی جاتی تھی، ابراہیم نخعی نے کہاہاں پہنی جاتی تھی لیکن اب اس کو پہننے والے باقی نہیں رہے لہٰذا آج کل اگر کوئی پہنے گاتواس کی طرف انگلیاں اٹھیں گی۔(۳) لہٰذا مسنون بال رکھنا تو اچھی بات ہے لیکن اتنے بڑے کرلیناکہ دیکھنےوالوں کو عجیب سے لگیں یاوحشت ہواچھا نہیں ہے۔

مانگ نکالے بغیر بال رکھنا:۔

اس حدیث میں یہ آیاہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سدل فرماتے تھے یعنی بغیر مانگ نکالے بال رکھتے تھے بعد میں مانگ نکالنے لگ گئے اس سے یہ تو واضح ہے کہ اب مانگ نکالناپسندیدہ اور مطلوب ہے لیکن سدل کااب کیاحکم ہے، بعض حضرات کی یہ رائے ہوئی ہے اب سدل چونکہ منسوخ ہو گیاہے اس لئے اب یہ جائز نہیں ہے لیکن اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ فرق (مانگ نکالنا) اگرچہ پسندیدہ ہے لیکن سدل بھی جائز ہے اس لئے کہ سدل کے عدم جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کافرق کواختیار کرنا فرق کے پسندیدہ ہونے پر تو دلالت کرتاہے سدل کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا صحابہ سے بھی دونوں عمل ثابت ہیں یعنی سدل بھی اور فرق بھی، اس لئے صحیح یہ ہے کہ دونوں جائز ہیں البتہ فرق سدل کی نسبت اولیٰ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کاندھلوی قدس سرہٗ نے جس انداز سے اوجزالمسالک(۴) میں اقوال نقل کئے ہیں اس سے حضرت کارجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتاہے۔

سرمنڈوانے کاحکم:۔

حلق یعنی استرے وغیرہ کے ذریعے سر کے بال منڈوانے کاکیاحکم ہے اس کو بعض فقہاء نے مکروہ اور

(۱) فتح الباری ج۱۰/ ص۳۶۰...... (۲) ابن ابی شیبہ ج۸/ ص۲۶۷...... (۳) ابن ابی شیبہ ج۸/ ص۳۱۲...... (۴) ج۱۵/ ص۱۵

مثلہ (شکل بگاڑنا) قرار دیا ہے، امام احمد سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک حلق بھی جائز ہے یہ اختلاف احرام کھولنے کے موقع کے علاوہ میں ہے اس لئے کہ احرام کھولنے کے موقع پر بالاتفاق حلق یعنی بال منڈوانا افضل اور اولیٰ ہے۔

حلق کے جواز کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ کسی نص میں اس سے منع نہیں کیا گیا اس کے علاوہ سر منڈوانے کے جواز کی ایک دلیل آگے ایک حدیث چھوڑ کر آنے والی حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کے کچھ بال مونڈے ہوئے تھے اور کچھ ویسے ہی تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا تو سارا سر مونڈ دیا کرو یا سارا ہی رہنے دیا کرو۔

الفصل الثانی میں حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت آرہی ہے کہ جب ان کے والد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ غزوہ موتہ میں شہید ہوئے تھے تو تین دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجام کو بلوا کر ان کے سر کے بال منڈوا دیئے تھے۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ سے بھی سر کے بال منڈوانا منقول ہے خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشکوۃ ہی میں کتاب الطہارۃ باب الغسل میں روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا کہ جس آدمی نے غسل جنابت کے موقع پر ایک بال کے برابر بھی جگہ خالی چھوڑ دی اس کے ساتھ دوزخ میں ایسا ایسا کیا جائے گا پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: **ومن ثم عاديت رأسي ومن ثم عاديت رأسي ومن ثم عاديت رأسي**۔ اس لئے میں اپنے سر کا دشمن ہو گیا، اسی لئے میں اپنے سر کا یعنی سر کے بالوں کا دشمن ہوں، اسی لئے میں سر کے بالوں کا دشمن ہو گیا ہوں، اس کے ایک معنی اگرچہ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کثرت کے ساتھ سر کے بال کاٹ کر کافی چھوٹے کر لیتے تھے لیکن بعض حضرات نے اسے حلق یعنی سر منڈوانے پر بھی محمول کیا ہے، لیکن یہ معنی ذرا بعید ہیں، اس لئے کہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں تصریح ہے: **و كان يجز رأسه** اور جز یجز کے معنی مبالغہ کے ساتھ بال کاٹنے کے آتے ہیں مونڈانے کے نہیں آتے۔

جن حضرات نے حلق کو مکروہ قرار دیا ہے ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا: **سيماهم التحليق** یعنی ان کی علامت بال منڈوانا ہو گی، جمہور کی طرف سے اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سب سے معروف جواب یہ ہے کہ کسی کام کا خوارج کی علامت ہونا اس کام کے برا ہونے کی لازمی دلیل نہیں ہے مثلاً خوارج کی علامات ہی میں یہ بھی بیان

کیا گیا ہے کہ وہ نمازیں ایسی اچھی پڑھیں گے کہ تم اپنی نمازوں کو ان کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے، اب ظاہر ہے کہ اچھی نماز پڑھنا کوئی برا کام نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ حلق یعنی سر کے بال منڈوانا بھی جائز ہے اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں، بلکہ بعض علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی آدمی بال اس لئے منڈواتا ہے کہ کسی امر میں انہماک یا مصروفیات وغیرہ کی وجہ سے بالوں کی دیکھ بال نہیں کر سکتا تو اس کا منڈوانا مستحسن ہے، بعض صوفیہ کا حلق کا معمول بھی اسی قبیل سے ہے۔

قینچی یا مشین سے بال کٹوانا:-

جیسا کہ ابھی ذکر کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لفظ **کان یجز رأسه** کے آتے ہیں جس کے معنی بالوں کو کاٹ کر کافی چھوٹا کرنے کے آتے ہیں، اس سے سر کے بالوں کے کاٹنے کا جواز معلوم ہوتا ہے بلکہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار[1] میں اسے مستحسن قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت فرما رہے تھے: ذباب ذباب، انہوں نے سمجھا مجھے فرما رہے ہیں، یہ گئے اور بال کاٹ کر آگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں نہیں کہہ رہا تھا لیکن یہ حالت بہتر ہے۔ اس روایت میں لفظ ہیں **فجز رأسه**، اس سے امام طحاوی نے "جز" کے مستحسن ہونے پر استدلال کیا ہے، درحقیقت امام طحاوی فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرق فرمایا ہے یعنی سر میں مانگ نکالی ہے لیکن شرعاً مستحسن ہونا اس میں منحصر نہیں ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں فرق کی بجائے جز کو "احسن" قرار دیا ہے۔ امام طحاوی یہاں جز کو فرق کے مقابلے میں ذکر کر رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ امام طحاوی کے نزدیک جز کے لئے ضروری ہے کہ بال اتنے چھوٹے ہو جائیں کہ ان میں مانگ نہ نکالی جاسکے۔

اس زمانے میں ظاہر ہے کہ یہ کام عموماً قینچی ہی سے ہوتا ہوگا، لیکن آج کل یہی کام حجامت والی مشین کے ساتھ زیادہ سہولت سے ہو سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سر پر مشین پھروانا جائز بلکہ امام طحاوی کے قول کے مطابق مستحسن ہے۔

اگر قینچی وغیرہ کے ذریعے بال بہت چھوٹے تو نہیں کئے کسی قدر چھوٹے کر لئے جاتے ہیں تو اس میں

---

(۱) ج ۴/ ص ۳۲۲

بھی کوئی حرج نہیں، بشر طیکہ کٹائی کے انداز میں ناجائز تشبہ نہ پایا جاتا ہو، تشبہ کے مسئلہ کی تفصیل پہلے کتاب اللباس کے ابتدائی مباحث میں گزر چکی ہے۔

(۸)-----عن نافع عن ابن عمر رضی الله عنه قال: سمعت النبی صلی الله علیه وسلم ینهی عن القزع، قیل لنافع: ما القزع؟ قال: یحلق بعض رأس الصبی ویترك البعض۔ (متفق علیه، والحق بعضهم التفسیر بالحدیث)

ترجمہ ...... نافع ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو "قزع" سے منع کرتے ہوئے سنا، نافع سے پوچھا گیا کہ "قزع" کیا ہوتا ہے؟ توانہوں نے کہا بچے کے سر کے کچھ حصے کو مونڈ دیا جائے اور کچھ کو رہنے دیا جائے۔

کچھ سر مونڈنا اور کچھ رہنے دینا:-

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع سے منع فرمایا ہے قزعۃ اصل میں بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور قزع بادلوں کے متفرق ٹکڑوں کو کہا جاتا ہے، یہاں پر خود نافع نے قزع کی تفسیر کردی ہے یعنی سر کے کچھ حصہ کے بالوں کو مونڈ لینا اور کچھ کو یوں ہی رہنے دینا، بعض حضرات نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ متفرق جگہوں سے مونڈا جائے لیکن راجح یہی ہے کہ متفرق جگہ کی قید نہیں ہے لہٰذا اگر کوئی ایک ہی طرف سے آدھا سر مونڈ لے اور باقی آدھا رہنے دے تو یہ بھی قزع ہوگا۔

اسی طرح حدیث میں بچے کے سر کا ذکر ہے لیکن قزع کا مفہوم یا اس کی ممانعت بچے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ بڑوں میں بھی ایسا کرنا ممنوع ہے۔

قزع سے منع کرنے کی شارحین حدیث نے متعدد حکمتیں بیان فرمائی ہیں مثلاً اس سے شکل بدنما ہو جاتی ہے، یہ شیطان کا حلیہ ہے، یہ یہودیوں کا طریقہ ہے، آخری وجہ کی تصریح ابوداؤد کی ایک روایت میں بھی ہے۔(۱)

اگر سر کا کچھ حصہ کسی عذر کی وجہ سے مونڈنا پڑ جائے مثلاً تھوڑی سی جگہ پر کوئی دوائی لگائی ہو یا مرہم پٹی کرنی ہو تو اس کی اجازت ہے۔

گدی کے بال مونڈنا:-

اگر صرف گدی کے بال مونڈ لئے جائیں تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو صحیح بخاری میں نافع سے مروی ہے کہ

---

(۱) فتح الباری

اس میں کوئی حرج نہیں، بخاری کے لفظ یہ ہیں: **أما القُصة و القفا للغلام فلا بأس بهما** ۔ یعنی بچے کے گدی کے بال یا کن پٹی کے بال منڈوا دیئے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے، بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے قزع سر کے بالوں میں ہوتا ہے اور یہ بال سر کا حصہ نہیں ہیں البتہ طبرانی کی معجم صغیر میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گدی کے بال مونڈنے سے منع فرمایا، لیکن یہ روایت کرنے کے ساتھ ہی امام طبرانی نے اس کی سند پر جرح بھی فرمادی ہے۔[1]

اگر عدم جواز کو اختیار کریں تو یہ بھی بظاہر اس صورت میں ہوگا جب کہ گدی کے بال خاصی مقدار میں مونڈے جس کا دور سے دیکھنے میں واضح احساس ہو اس لئے نہی کی حدیث کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ممانعت کی وجہ اس کا قزع کے ساتھ ملحق ہونا ہوگی۔[2] اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ گدی بال کے اتنے مونڈے جائیں کہ نمایاں محسوس ہوں اور ایک طرح سر ہی کا حصہ مونڈنا سمجھا جائے جیسا کہ بعض اوقات غالباً فوجی کٹ میں ہوتا ہے، ہمارے ہاں قینچی سے بال چھوٹے کرنے کے بعد یا سر پر مشین پھیرنے کے بعد بالوں کو سیدھا کرنے کے لئے کانوں کے پاس اور گردن پر ہلکا ہلکا استرا پھیر دیا جاتا ہے، بظاہر اس کا جواز معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

والحق بعضهم التفسير بالحديث یعنی صحیح مسلم کے بعض راویوں نے اوراج کرتے ہوئے قزع کی تفسیر جو درحقیقت نافع سے مروی تھی اس کو بھی حدیث ہی کا حصہ بنادیا۔

(۹)-----وعن ابن عمر رضى الله عنه أن النبى صلى الله عليه وسلم رأى صبيًا قد حلق بعض رأسه وترك بعضه، فنهاهم عن ذلك وقال: احلقوا كله او اتركوا كله۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا جس کا کچھ سر مونڈا ہوا تھا اور کچھ چھوڑ دیا گیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یا تو سارا مونڈ دو یا سارا ہی رہنے دو۔

(۱۰)-----عن ابن عباس رضى الله عنه قال: لعن النبى صلى الله عليه وسلم المخنثين من الرجال والمترجلات من النساء، وقال: أخرجوهم من بيوتكم۔ (رواه البخارى)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کی طرح نرم و نازک بنیں اور ان عورتوں پر

---

(۱) المعجم الصغیر ج ۱/ ص ۱۶۶...... (۲) فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج ۶/ ص ۳۲۸

جو مردوں جیسی بنیں اور آپ نے فرمایا کہ مخنث لوگوں کو اپنے گھروں سے نکال دیا کرو۔

"مخنث" نون کے زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس شخص کو کہتے ہیں جس کے اعضاء، حرکات و سکنات، انداز و اداء عورتوں جیسی ہوں اگر اعضاء میں یہ لچک پیدائشی اور غیر اختیاری ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے البتہ جہاں تک ممکن ہو حرکات اور چال ڈھال وغیرہ میں عورتوں کے ساتھ مشابہت سے بچنا ضروری ہے یہاں پر لعنت ان لوگوں پر مقصود ہے جو قصداً اپنے اعضاء اور انداز وغیرہ میں لچک پیدا کریں اور شکل و شباہت وغیرہ میں خود کو زنانہ نہ بنائیں۔

أخرجوهم من بيوتكم ۔ انہیں گھروں سے نکال دیا کرو یعنی گھروں میں بے تکلف نہ آنے دیا کرو بلکہ عورتوں کو ان سے پردہ کرایا کرو، یہ اس لئے فرمایا کہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا اس طرح کے ہیجڑے قسم کے لوگوں کو عورتوں کے محاسن وغیرہ امور کا ادراک نہیں ہوتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مخنث کو کسی عورت کے محاسن بیان کرتے ہوئے سنا تو آپ نے ان کو گھروں میں آنے کی اجازت دینے سے منع فرمادیا۔

(۱۱)-----وعنه رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ لعن الله المتشبهين من الرجال بالنساء المتشبهات من النساء بالرجال - (رواه البخاري)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہے ان مردوں پر جو عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کریں اور ان عورتوں پر جو مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کریں۔

عورتوں اور مردوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا:-

مشابہت اختیار کرنے سے مراد ہے مرد کا بتکلف عورتوں جیسا اور عورتوں کا مردوں کی طرح بننے کی کوشش کرنا، خواہ یہ وضع قطع میں ہو جیسے بالوں کی ہیئت یا زینت اور میک اپ کی شکلوں میں خواہ لباس میں ہو، خواہ طرز تکلم وغیرہ میں ہو اس لئے کہ یہ بھی تغییر خلق اللہ میں داخل ہے یعنی اللہ کی خلقت کو تبدیل کرنا، اللہ نے کسی کو مرد بنایا ہے تو وہ عورتوں جیسا بننے کی کوشش کرے یا اسے عورت بنایا ہے تو وہ مردوں کی طرح بننے کی کوشش کرے۔

اس میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جنہیں شریعت نے از خود مرد یا عورت کے ساتھ مختص کر دیا ہے، جیسے مردوں کے لئے داڑھی اور عورتوں کے لئے سر کے بال، لہٰذا مرد کا داڑھی مونڈنا اور عورت کا سر کے بال مونڈنا ناجائز ہے، باقی امور کا دارومدار عرف پر ہے، جو لباس وغیرہ کسی عرف میں مردوں کے ساتھ خاص ہو

وہاں اس کا پہننا عورتوں کے لئے جائز نہیں ہوگا اور جو عورتوں کے ساتھ خاص سمجھا جاتا ہو اس کا پہننا مردوں کے لئے ناجائز ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ابن ابی جمرہ سے نقل کیا ہے کہ مردوں کی عورتوں اور عورتوں کی مردوں کے ساتھ مشابہت کے ممنوع ہونے کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ جو مشابہت ممنوع ہے وہ ظاہری ہیئت اور بعض صفات و حرکات وغیرہ میں ہے امور خیر میں ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت سے منع کرنا مقصود نہیں ہے۔(۱)

ابن ابی جمرہ نے امور خیر میں ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت کی کوئی مثال ذکر نہیں کی، کسی عورت کی مردوں کے ساتھ امور خیر میں مشابہت کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ وہ بہادری، حوصلہ مندی اور معاملہ فہمی وغیرہ میں مردوں کی طرح ہو اور کسی مرد کی عورتوں کے ساتھ مشابہت کی مثال شاید وہ حدیث بن سکے جس میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیا والے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کے لعنت فرمانے کی حیثیت:۔

ابن ابی جمرہ ہی سے حافظؒ نے نقل کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا لعنت فرمانا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ ہے جو کسی کام یا وصف کی شناخت اور اس کے ممنوع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس طرح کی لعنت ایک وعید ہے جو کسی گناہ کے کبیرہ ہونے کی ایک علامت ہے، دوسری لعنت وہ ہے جو لعنت کئے گئے شخص کے لئے رحمت بن جاتی ہے یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی متعین شخص یا اشخاص پر یہ سمجھ کر لعنت فرمائیں کہ وہ لعنت کا مستحق ہے جب کہ حقیقت میں وہ اس کا مستحق نہیں تھا مثلاً جس برے امر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف منسوب سمجھ رہے تھے واقعہ میں اس کی طرف اس کی نسبت ہی درست نہیں، اس طرح کی لعنت کو باعث رحمت اس لئے قرار دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا کرنا منقول ہے کہ اے اللہ جس انسان کو بھی میری طرف سے ایذاء پہنچی ہو یا اسے مارا ہو، اسے برا بھلا کہا ہو یا اس پر لعنت کی ہو اس کو اس شخص کے حق میں رحمت اور اپنے قرب کا ذریعہ بنا دیجئے۔

(۱۲)۔۔۔عن ابن عمر رضی اللہ عنه أن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال:

لعن اللہ الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب المتشبهون بالنساء الخ۔

وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے دوسروں کے بال اپنے بالوں میں ملانے والی پر اور دوسروں سے ملوانے والی پر اور بدن گودنے والی اور گودوانے والی پر۔

بالوں میں پیوندکاری کرنے والیاں:۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وصل کرنے اور کرانے والیوں پر لعنت فرمائی ہے، وصل کا معنی ہے ملانا اور استوصل کا معنی ہے کسی کو ملانے کا کہنا کسی سے یہ طلب کرنا کہ وہ ملائے، یہاں ملانے سے مراد ہے عورت کا سر کے بالوں میں کوئی اور چیز مثلاً بال یا دھاگے وغیرہ ملانا یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر لعنت بیان فرمائی ہے، اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً بعض اوقات انسانی بالوں کو اپنے بالوں میں ملایا جاتا ہے، اس صورت میں ایک انسانی جزو کا استعمال لازم آتا ہے جو کہ اس کے اکرام کے منافی ہے اس لئے کہ بغیر ضرورت شدیدہ کے انسانی جزو کو استعمال میں لانے میں اس کا ابتذال ہے جو کہ ممنوع ہے۔

بعض اوقات ایسے بال ملائے جاتے ہیں جو ناپاک ہوتے ہیں مثلاً بعض ائمہ کے نزدیک مردار کے بال یا حرام جانوروں کے بال ناپاک ہیں، البتہ حنفیہ کے نزدیک خنزیر کے علاوہ باقی جانوروں کے بال پاک ہیں، خواہ وہ مردار ہو، خنزیر چونکہ نجس العین ہے یعنی سراپا نجاست ہے اس لئے اس کے بال بھی ناپاک ہیں۔

بعض اوقات اپنے بالوں میں دوسرے بال وغیرہ ملانے کا مقصد دھوکہ دینا ہوتا ہے، مثلاً ایک عورت کے بال چھوٹے ہیں لیکن وہ شادی کرانے کے لئے خاوند کو دھوکہ دیتے ہوئے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ میرے بال بڑے ہیں یا عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے بال چھوٹے ہو گئے اپنی عمر چھپانے کے لئے اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا لیتی ہے۔

اپنے بالوں میں کچھ اور ملانا کس صورت میں ناجائز ہے اس میں فقہاء کے کئی اقوال ہیں:[1] مثلاً

(۱)......... بعض حضرات کے نزدیک یہ مطلقاً جائز ہے ان حضرات تک غالباً یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔

(۲)......... مطلقاً ناجائز ہے چاہے بال ملائے یا اون وغیرہ کسی اور چیز کے دھاگے، بال خواہ انسان کے ہوں یا جانور کے یہ قول اکثر مالکیہ کا ہے۔

(۳)......... امام شافعی کے نزدیک اگر وصل انسانی بالوں یا ناپاک بالوں کے ساتھ ہو تو ناجائز ہے اور پاک بالوں کے ساتھ ہو یا بالوں کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہو تو شادی شدہ عورت کے لئے خاوند کے کہنے پر جائز ورنہ ناجائز۔

---

(۱) مذاہب کی اس تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اوجز المسالک ۱۵:۱۰، ۱۳

(۴)........ ہر قسم کے بالوں کے ساتھ وصل ناجائز ہے باقی جائز ہے۔

(۵)........ حنفیہ کے نزدیک انسانی بالوں کے ساتھ وصل ناجائز ہے خواہ اس عورت کے اپنے پہلے سے اترے ہوئے بال ہوں یا کسی اور کے دوسری صورت میں ممانعت کی وجہ جزو انسان کو استعمال میں لانا ہے اور پہلی صورت میں یعنی اپنے بال ہونے کی صورت میں وجہ یہ ہے کہ اس میں تغریر یعنی دھوکہ دینا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک نہی کی علت دو چیزیں ہیں ایک جزو انسان کی بے احترامی اور دوسرے تغریر یعنی دھوکہ دینا دوسری علت کی تصریح بعض روایتوں میں ہے چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: **أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بلغه فسماه الزور** ۔یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کے اس طرح کرنے کی خبر ملی تو آپ نے اسے "زور" یعنی جھوٹ اور دھوکہ قرار دیا، ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: **ألا وهذا الزور** ۔[2]

اسی طرح مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: **أيما امرأة أدخلت في شعرها من شعر غيرها فإنما تدخله زورا نيل الأوطا** ۔[3]

چونکہ نہی کی ایک علت تغریر و تدلیس بھی ہے اس لئے اگر انسانی بالوں کے علاوہ کسی اور چیز سے وصل کرنے کا مقصود بھی دھوکہ دینا ہو تو یہ بھی حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہو گا اگرچہ حنفیہ کے ہاں عدم جواز کی تصریح صرف انسانی بالوں میں ہے۔

اگر بالوں میں کوئی ایسی چیز ملالی جائے جو بالوں کے مشابہ نہ ہو البتہ اس سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہو تو یہ حنفیہ کے اصول پر تو جائز ہے ہی بعض مالکیہ نے بھی اس کی اجازت دی ہے چنانچہ قاضی عیاض فرماتے ہیں:

فأما ربط خيوط الحرير الملونة ونحوها مما لايشبه فليس بمنهي عنه، لأنه ليس بوصل، ولا هو في معنى المقصود بالوصل إنما هو التجمل والتحسين ۔[4]

بخاری وغیرہ میں ہے کہ ایک عورت کے بال کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے جھڑ گئے تھے اس کا خاوند چاہتا تھا کہ یہ وصل کرلے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا، حنفیہ کے نزدیک یہ حدیث انسانی بالوں کے ساتھ وصل پر محمول ہے یعنی اس عورت کا خاوند یہ چاہتا تھا کہ یہ اپنے بالوں میں کسی اور عورت کے بال شامل کرلے تاکہ دیکھنے میں خوبصورت لگیں۔

حاصل یہ کہ حنفیہ کے ہاں عدم جواز کی تصریح تو صرف اس صورت میں ہے جب کہ انسانی بالوں کو اپنے بال میں لگائے، جیسا کہ امام محمدؒ نے مؤطا میں فرمایا ہے:

---

(۱) شامی ج۶/ص ۳۷۳ (۲) فتح الباری ج۱۰/ص ۳۵۸ ...... (۳) ج۶/ص ۳۴۰ ...... (۴) اوجز المسالک

يكره للمرأة أن تصل شعرا إلى شعرها أو تتخذ قصة شعر ولا بأس بالوصل في الرأس إذا كان صوفا، أما الشعر من شعور الناس فلا ينبغي، وهو قول أبي حنيفة والعامة من فقهائنا ۔[1]

اس سے اگرچہ باقی چیزوں کے ساتھ وصل کا جواز مطلقاً معلوم ہوتا ہے لیکن حدیث میں نہی کی علت چونکہ تغریر بیان کی گئی ہے اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔ اگر کوئی چیز زینت کی بجائے دھوکہ دہی کی نیت سے لگائی جائے تو وہ بھی ناجائز ہوگی لیکن زینت یا بدنمائی دور کرنا مقصد ہو تو کوئی حرج نہیں۔

مالکیہ کے ہاں وصل اگرچہ مطلقاً ممنوع ہے لیکن وصل اس صورت میں بنتا ہے جب کہ بالوں کے اندر کوئی دوسری چیز ملائی جائے اگر زینت کے لئے بالوں کے اوپر کچھ رکھ لیا جائے یا لگالیا جائے تو ان کے ہاں بھی جائز ہے۔

(۱۳)-----عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال: لعن الله الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله، فجاءته امرأة فقالت: إنه بلغني أنك لعنت كيت وكيت، فقال: مالي لا ألعن من لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن هو في كتاب الله؟ فقالت: لقد قرأت مابين اللوحين فما وجدت فيه ماتقول فقال: لئن كنت قرأتيه لقد وجدتيه أما قرأت ما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا قالت: بلى قال: فإنه قد نهى عنه۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہے بدن گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر، چہرے کے بال اکھیڑنے والیوں پر اور حسن کی خاطر دانتوں کو باریک کرنے والیوں پر جو کہ اللہ کی بنائی ہوئی شکل کو تبدیل کرتی ہیں، اس پر ایک عورت آپ (یعنی ابن مسعود) کے پاس آئی اور کہا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے تو ابن مسعود نے کہا میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اور جس پر لعنت کتاب اللہ میں ہے، تو وہ کہنے لگی کہ میں نے دو گتوں کے درمیان جو (قرآن) ہے وہ پورا پڑھا ہے میں نے تو اس میں وہ بات نہیں پائی جو آپ کہہ رہے ہیں، ابن مسعود نے فرمایا کہ اگر تم نے واقعی (تدبر کے ساتھ) قرآن پڑھا ہوتا تو (اس میں) یہ بات پالیتی کیا تو نے یہ

---

(۱) موطاامام محمد ص ۳۸۳

نہیں پڑھا: ما آتاکم الرسول الخ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں دیں لے لو اور جس چیز سے روکیں رک جاؤ) اس نے کہا کیوں نہیں (یہ تو پڑھا ہے) تو آپ نے فرمایا کہ ان کاموں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے (لہٰذا ان سے رک جانا کتاب اللہ کا تقاضا ہے)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مصنوعی زینت کے لئے بعض کام کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی، ایک عورت جس کا نام بعض دوسری روایات میں ام یعقوب آتا ہے یہ قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتی تھی اور قرآن پڑھا کرتی تھی اس نے ابن مسعود رضی ال تعالیٰ سے سوال کیا کہ آپ ان عورتوں پر لعنت کیوں کرتے ہیں؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس کا جواب دیا وہ تو حدیث کے ترجمہ سے واضح ہو ہی رہا ہے البتہ اس کے متعلق یہاں چند باتیں قابل ذکر معلوم ہوتی ہیں:

ایک تو یہ کہ ابتداء میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ کام کرنے والی عورتوں پر لعنت تو فرمائی اور یہ لعنت آپ نے اپنی ذاتی رائے سے نہیں فرمائی بلکہ حدیث کے آخری حصے سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بات انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھی تھی لیکن ابتداء میں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ نہیں دیا البتہ اس عورت کے اشکال کا جواب دینے کے لئے بعد میں آپ نے یہ حوالہ دیا اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ دین کا مسئلہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیئے بغیر بیان کر دیتے تھے اگرچہ وہ بات انہوں نے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوتی تھی اس کی مثالیں بکثرت ذخیرۂ حدیث میں ملتی ہیں، یہیں سے فقہاء نے یہ اصول مستنبط کیا ہے کہ غیر مدرک بالرائے مسئلے میں قول صحابی حدیث مرفوع کے حکم میں سمجھا جاتا ہے یعنی مسئلہ ایسا ہو جو از خود قیاس سے سمجھنے میں آنے والا نہ ہو اس میں صحابی کی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد سمجھا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر مسئلہ قیاس و عقل سے بھی سمجھ میں آنے والا ہے تو دونوں احتمال ہیں یہ بھی کہ صحابی نے وہ بات اپنی رائے کی بنیاد پر کہی ہو اور یہ بھی کہ صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو اگر وہ مسئلہ قیاس و عقل سے سمجھ میں آنے والا ہی نہ ہو تو دوسرا احتمال تقریباً متعین ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس لعنت کرنے کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ کتاب اللہ کی طرف بھی منسوب کیا اس پر اس عورت کو حیرت ہوئی کہ میں نے تو قرآن سارا پڑھا ہوا ہے اس میں تو ان کاموں پر لعنت کہیں ذکر نہیں، تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے واقعی قرآن پڑھا ہوتا تو اس میں یہ بات ضرور پاتی، مطلب یہ کہ تم نے قرآن پڑھا تو ہے لیکن پورے تدبر اور

تفقہ کے ساتھ نہیں پڑھا، پھر خود وضاحت کرتے ہوئے ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں ہے: **مَآ آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔** یعنی جو کچھ اللہ کے رسول تمہیں عطا کردیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور ان کاموں پر لعنت فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمادیا ہے لہٰذا یہ ممانعت اور لعنت محض حدیث کا مقتضا ہی نہیں ہے بلکہ کتاب اللہ کا مقتضا بھی ہے۔

یہ آیت اگرچہ نازل ہوئی ہے مال فیٔ کے بارے میں کہ اس میں سے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دے دیں وہ لے لو لیکن ابن مسعودؓ نے آیت کو اپنے عموم پر محمول کرتے ہوئے تمام اوامر و نواہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں شامل فرمایا اس سے فقہاء کا یہ قاعدہ ثابت ہوتا ہے کہ **العبرة للعموم اللفظ لا لخصوص المورد۔**

لئن كنت قرأتيه لقد وجدتيه ...... اصل میں ہونا چاہئے تھا قرأتِہ اور وجدتِہ، اس لئے کہ مؤنث مخاطب کے لئے یاء مضارع میں آتی ہے ماضی میں نہیں، لیکن کبھی کبھی ماضی میں بھی تائے مخاطبہ کے کسرہ میں شباع کر کے یاء بنالیتے ہیں یہاں پر بھی ایسا ہی ہے۔

مصنوعی زینت کی چند ناجائز شکلیں:۔

اس حدیث سے بنیادی طور پر تین کاموں کی حرمت سمجھ میں آتی ہے یہاں ان کے بارے میں کسی قدر تفصیل عرض کی جاتی ہے۔

الوشم ...... بدن گودنا، یعنی بدن کے کسی حصے میں کسی سوئی وغیرہ سے چھوٹے چھوٹے سوراخ کر کے ان میں سرمہ یا رنگ وغیرہ بھرنا بخاری وغیرہ کی بعض روایات میں نافع سے مروی ہے کہ وشم مسوڑھے میں ہوتا ہے لیکن نافع کا مقصد وشم کو مسوڑھے میں منحصر کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ زیادہ تر اس زمانے میں عورتیں مسوڑھوں میں کرتی تھیں، وشم چہرے میں بھی ہوسکتا ہے، بعض اوقات چہرے پر مصنوعی تل بنانے کے لئے ایسا کیا جاتا تھا، جسم کے کسی اور حصے مثلاً ہاتھوں وغیرہ پر بھی ہوسکتا ہے مثلاً ہاتھ یا کلائی پر وشم کے ذریعے نقش و نگار بنائے جاتے تھے یا کسی کا نام مثلاً اپنی کسی معتقد فیہ شخصیت کا نام یا اپنے محبوب کا نام بدن میں سوراخ کر کے لکھا جاتا تھا، یہ سب صورتیں وشم میں داخل ہیں۔

الواشمة ...... اس عورت کو کہا جاتا ہے جو یہ کام کرے اور المستوشمہ وہ عورت ہے جو کسی اور کو اپنے بدن پر اس طرح کرنے کے لئے کہے۔

اس حدیث میں اگرچہ صرف عورت کا ذکر ہے لیکن وشم کی حرمت مرد اور عورت دونوں کے حق

میں ہے، عورت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عورتیں یہ کام زیادہ کرتی تھیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اگلی روایت میں لفظ ہیں: **ونهى عن الوشم** یعنی نے وشم سے منع فرمایا اس حدیث کا عموم بھی مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل ہے۔

وشم میں ایک مفسدہ تو یہ ہے کہ اس میں جسم کو بے جا تکلیف ہوتی ہے، دوسرا بڑا مفسدہ یہ ہے کہ اس میں تغییر خلق اللہ ہے، یعنی اللہ کے بنائے ہوئے جسم میں بے جا تبدیلی ہے یہ بھی شرعاً ناپسندیدہ امر ہے، چنانچہ جب شیطان بارگاہ الٰہی سے ملعون و مطرود ہوا تو اس نے اپنے جن ناپاک عزائم کا اعلان کیا ان میں یہ بھی شامل ہے:

ولأمرنهم فليغيّرن خلق الله۔

انہیں میں حکم دوں گا اور وہ اللہ کی بنائی ہوئی شکلیں تبدیل کریں گے تغییر خلق اللہ جو مذموم ہے اس کی حدود پر بات آگے چل کر کریں گے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے وشم کرالیا ہو اور بغیر شدید تکلیف اور ضرر کے اسے زائل کرنا ممکن ہو تو محض توبہ کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو زائل کرنا ضروری ہے البتہ شدید تکلیف یا ضرر کی صورت میں محض استغفار بھی کافی ہے۔

ابوداؤد (کتاب اللباس باب فی صلۃ الشعر) میں ایک روایت الواشمات پر لعنت کے ساتھ یہ لفظ بھی آتے ہیں من غیر داء یعنی بغیر کسی بیماری کے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر بدن گودنا عذر یا ضرورت کی وجہ سے ہو تو جائز ہے البتہ عذر کی کوئی مثال کہیں نظر سے نہیں گزری اور نہ ہی اس وقت ذہن میں آرہی ہے۔

چہرے یا ابرو کے بال اکھیڑنا:-

تیسرا کام جس پر اس حدیث میں لعنت کی گئی ہے وہ ہے نمص یا نماص، جس کے معنی ہیں چہرے سے بال اکھیڑنا یا کسی اور طریقے سے انہیں زائل کرنا، بعض نے کہا اس کے معنی ہیں ابرو کے بال اکھیڑنا یہ کام کرنے والی عورت کو نامصہ اور کروانے والی کو متنمصۃ کہا جاتا ہے۔

یہ کام مختلف مقاصد کے لئے کیا جاتا تھا کبھی تو محض حسن اور زینت کے لئے کیا جاتا تھا، کہیں عمر چھپانے کے لئے اس لئے کہ بڑی عمر میں بعض اوقات چہرے پر بال سے اگ آتے ہیں اب یہ عورت ہے تو بڑی عمر کی لیکن اپنی کم عمری ظاہر کرنے کے لئے چہرے کے بال صاف کراتی ہے۔

اسی طرح ابرو کے بال کبھی تو اکھیڑے جاتے ہیں ابرو کو باریک کرنے کے لئے تاکہ زیادہ خوبصورت لگیں کبھی یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کہ وہ ابلج ہے یعنی دونوں ابرؤں کے درمیان فاصلہ ہے۔

عورت کا چہرے کے بال اکھیڑنا بعض حضرات کے نزدیک ہر حال میں ممنوع ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے، بعض صورتوں میں ممنوع ہے اور بعض میں ممنوع نہیں ہے۔

اگر چہرے کے بال اکھیڑنا دھوکہ دہی کے لئے ہو مثلاً عمر چھپانے کے لئے ایسا کرے تاکہ کسی کے ساتھ نکاح کرنے میں آسانی ہو اور وہ کم عمر سمجھ کر جلدی آمادہ ہو جائے بعض اوقات تھوڑی عمر یا خوبصورتی کی بنیاد پر عرب عورتیں اپنے مہر میں بھی اضافہ کرتی تھیں۔ حاصل یہ کہ اگر دھوکہ دہی کے لئے عمر چھپانا یا ایسا حسن قدرتی طور پر حاصل ہونا ظاہر کرنا ہو جو حقیقت میں اسے حاصل نہیں ہے تو یہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔

اگر بدنمائی کے ازالے کے لئے ہو تو جائز بلکہ مستحب ہے خاص طور پر جب کہ خاوند اس کا تقاضا کرے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا کہ میرے چہرے پر بعض اوقات کچھ بال ہوتے ہیں کیا میں اپنے خاوند کے لئے مزین بننے کی خاطر انہیں اکھیڑ سکتی ہوں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

أميطي عنك الأذى وتصنعي لزوجك۔ یعنی اپنے چہرے سے بدنمائی کو زائل کرو اور اپنے خاوند کے لئے بن سنور کر رہو جیسا کہ تم کسی سے ملنے کے لئے جاتے وقت بنتی سنورتی ہو۔(۱)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے طبری کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے کہ ابو اسحاق کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں اور پوچھا کہ کوئی عورت اپنے خاوند کے لئے اپنے ابروؤں کو ہلکا کرے تو اس کا کیا حکم ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ

أميطي عنك الأذى ما استطعت۔(۲)

یعنی جہاں تک ہو سکے اپنے سے بدنما چیز کو دور کرو۔

علامہ شامیؒ رد المحتار میں نامصہ اور متنمصہ پر لعنت کے تحت نقل کیا ہے۔

ولعله محمول على ما إذا فعلته لتتزين للأجانب، وإلا فلو كان في وجهها شعر ينفرغها زوجها بسببه ففي تحريم إزالته بعد، لأن الزينة للنساء مطلوبة للتحسين۔(۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اوپر ذکر کردہ آثار میں علامہ شامیؒ کی اس عبارت کی دلیل ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوا واللہ اعلم کہ اگر بالوں کی وجہ سے بدنمائی نہ ہو رہی البتہ زینت میں کمی ہو رہی تو ان کا دور کرنا اگر خاوند کے لئے ہو تو اس کی گنجائش ہے لیکن یہ بات چہرے کے بالوں کے بارے میں ہے ابرو کے بارے میں نہیں اس لئے کہ چہرے کے بال غیر معمولی ہوتے ہیں اس لئے ایک طرح سے زوائد جسم میں سے سمجھے جاتے ہیں

(۱) مصنف عبدالرزاق ج ۳/ ص ۱۴۶...... (۲) فتح الباری کتاب اللباس باب المتنمصات...... (۳) رد المحتار ج ۶/ ص ۳۷۳

جب کہ ابرو کی یہ صورت حال نہیں اس لئے بغیر قابل ذکر عذر کے ان کا اکھیڑنا بظاہر تغییر خلق اللہ میں داخل ہے۔

اگر عورت کے داڑھی یا مونچھیں وغیرہ نکل آئیں تو علامہ نووی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ انہیں صاف کر دینا جائز بلکہ مستحب ہے، شامی وغیرہ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔

مرد کا چہرے کے بال اکھیڑنا:-

یہ ساری تفصیل عورت کے بارے میں ہے، حدیث میں لعنت بھی مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ہے اس سے معلوم ہوا کہ چہرے کے بال اتارنے سے یہ نہی عورتوں کے بارے میں ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی، مرد کے بارے میں حدیث ساکت ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ مرد کے لئے چہرے کے بال اکھیڑنا جائز ہے بشرطیکہ مخنثین کے ساتھ تشبہ مقصود نہ ہو۔

دانتوں کو باریک کرنا:-

چوتھی قسم کی عورتیں جن پر اس حدیث میں لعنت کی گئی ہے وہ **متفلجات** ہیں تفلیج کا معنی ہے سامنے والے دانتوں کو گھسا کر ان کے درمیان فاصلہ کرنا تاکہ اچھے لگیں، اصل میں انسان کے دانت دو طرح کے ہوتے ہیں ایک یہ کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو، دوسرے یہ کہ ان کے درمیان میں تھوڑا تھوڑا فاصلہ ہو، دوسری قسم کے شخص کو افلج کہا جاتا ہے، عربوں کے ہاں دوسری صورت کو زیادہ موجب حسن سمجھا جاتا تھا، اگر کسی شخص کے قدرتی طور پر پہلی قسم کے نہ ہوتے تو وہ اپنا افلج ہونا ظاہر کرنے کے لئے دانتوں کو درمیان سے تھوڑا تھوڑا گھسا کر ان میں فاصلہ کر لیتا، اللہ تعالیٰ نے اس کی جیسی شکل بنائی تھی اس پر گویا یہ راضی نہیں ہے اور اپنا حلیہ تبدیل کر رہا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک کام "وشر" بھی ہے جس کے معنی ہیں دانتوں کو باریک کرنا، اصل میں بڑی عمر میں دانت گھس گھس کر موٹے ہو جاتے ہیں جب کہ ابتدائی عمر میں باریک ہوتے ہیں اب بعض عورتیں اپنی زیادہ عمر چھپانے کے لئے دانتوں کو تیز کر لیا کرتی تھیں اس میں چونکہ دھوکہ دہی ہے اس لئے دوسری احادیث میں اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

حدیث میں لفظ ہیں: **المتفلجات للحسن** یعنی حسن کے لئے دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنے والیاں اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے ایسا کرے تو جائز ہے نیز حدیث میں حسن کا لفظ استعمال ہوا ہے زینت کا نہیں اس سے شاید یہ اخذ کیا جا سکے کہ مذمت اس

صورت میں ہے جب کہ یہ ظاہر کرنا ہو کہ میں اصلاً اور پیدائشی طور پر ایسا ہوں جب کہ زینت سے بھی آدمی اچھا لگتا ہے لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختیار کی گئی ہے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ میں خلقتاً ایسا ہوں۔

تغییر خلق اللہ کب ناجائز ہے؟

اس حدیث کے آخر میں یہ فرمایا المغیرات خلق اللہ اس سے سابقہ عورتوں کی برائی اور شناعت کی ایک وجہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کاموں میں اللہ کی بنائی ہوئی شکل کو تبدیل کرنا لازم آرہا ہے اس لئے یہ کام برے ہیں گویا یہ شخص اللہ کی بنائی ہوئی شکل پر راضی اور مطمئن نہیں ہے اور اپنی شکل اپنی مرضی کے مطابق بنانا چاہتا ہے۔

یہاں المغیرات خلق اللہ والی صفت کا ذکر آخری فعل یعنی دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنے کے ساتھ ہے، لیکن متعدد روایات میں یہ صفت وشم یعنی بدن گودنے کے ساتھ مذکور ہے ان میں کوئی تعارض نہیں اس لئے کہ تغییر خلق اللہ والی بات کئی کاموں میں پائی جارہی ہے۔

جن امور سے اس حدیث میں منع کیا گیا اور ان پر لعنت کی گئی ہیں ان کی علت دو امور ہیں ایک تغریر خلق اللہ یعنی خلق خدا کو دھوکہ دینا اور دوسرے تغییر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی شکل کو بدلنا، بعض میں پہلی وجہ پائی جاتی ہے اور بعض میں دوسری اور بعض میں ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی ہوں۔

انسانی جسم میں کون سی تبدیلی تغییر خلق اللہ میں داخل ہے جو ممنوع اور برا ہے اس کو بھی ذرا مختصراً سمجھ لینا چاہئے۔

انسانی جسم میں تبدیلی دو طرح کی ہو سکتی ہے ایک ازالہ کی شکل میں دوسرے اضافہ کی شکل میں، تیسری صورت ان کا مجموعہ ہو سکتی ہے یعنی کچھ زائل کر کے اس کی جگہ کچھ اور لگایا جائے۔

ازالہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اصول میں ہو، دوسرا یہ کہ زوائد بدن میں ہو۔ اصول میں ازالہ کی مثال ہے، دانتوں کو باریک کرنا یا ان کے درمیان فاصلہ کرنا اور زوائد کی مثال ہے جیسے چہرہ کے بال اکھیڑنا۔

اصول کا ازالہ تو مذموم تغیر خلق اللہ میں داخل ہے، خواہ دھوکہ دہی مقصود ہو یا مقصود نہ ہو البتہ کسی عذر کی وجہ سے ہو تو جائز ہے خاص طور پر جب کہ جس چیز کا ازالہ کیا جارہا ہے وہ غیر معتاد ہو یعنی عموماً ہوتی نہ ہو جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کی زائد انگلی ہو اور وہ تکلیف دیتی ہو تو اس کا کٹوانا جائز ہے اسی طرح رسولی، مہاسے وغیرہ اگرچہ تکلیف دہ نہ ہوں لیکن چونکہ عرفاً انہیں بیماری سمجھا جاتا ہے نیز یہ پیدائشی نہیں ہوتے اس لئے ان کا ازالہ بھی جائز ہوگا۔

زوائدِ بدن کے ازالہ میں اگر دھوکہ دہی یا کوئی اور مفسدہ ہو تو ناجائز ہے وگرنہ جائز ہے داڑھی کا مونڈوانا چونکہ ناجائز ہے اس لئے وہ زوائد کی بجائے اصول میں شمار ہوگی اسی طرح ابروؤں کے درمیان کے بال

اگر بدنمائی کا باعث نہ ہوں تو اصول ہی کے حکم میں ہیں۔

اضافہ یا تبدیلی اگر عارضی ہو تو تغییر خلق اللہ میں داخل نہیں ہے اس کی واضح مثال سرمہ لگانا ہے اسی سے مختلف قسم کی کریموں ہونٹوں پر لگانے والے رنگوں اور اس سے ملتی جلتی میک اپ کی دوسری اشیاء کا حکم معلوم ہو گیا کہ وہ جائز ہیں بشرطیکہ ان میں کوئی اور مفسدہ شرعیہ نہ ہو، حافظ ابن حجرؒ نے بعض حنابلہ کا قول نقل کیا ہے۔

ویجوز الحف والتحمیر والنقش والتطریف إذا کان بإذن الزوج لأنه من الزینة۔[1]

البتہ نووی نے ان میں سے "حف" (ابرو باریک کرنے) کو ناجائز قرار دیا ہے اس لئے کہ یہ تمنص میں داخل ہے النقش سے مراد وہ ہے جو بدن کو گودے بغیر ہو۔

جو اضافہ مستقل ہو وہ تغییر خلق اللہ میں داخل ہے اسی طرح اصول میں مستقل تبدیلی کا بھی یہی حکم ہے جیسے وشم، پلاسٹک سرجری یا کاسمیٹک سرجری کا حکم بھی بظاہر وشم والا ہی ہوگا پہلے گزر چکا ہے کہ عذر کی وجہ سے وشم جائز ہے اسی طرح پلاسٹک سرجری اگر ضرورت کی وجہ سے ہو جیسے زخم کے یا جل جانے کے نشانات ختم کرنے کے لئے وغیرہ وغیرہ تو جائز ہے اگر بغیر ضرورت کے ہو مثلاً محض شکل تبدیل کرنے کے لئے ہو تو ناجائز ہے۔

بہر حال مصنوعی زینت وغیرہ کے جو نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے ہیں ان پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے، یہاں صرف اشارہ سا کرنا مقصود ہے اس حدیث میں مذکور امور پر علماء نے جو کلام فرمائی ہے اس سے اس بحث میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

(١٤)-----وعن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: العین حق، ونهی عن الوشم۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نظر لگ جانا ایک حقیقت ہے اور آپ نے بدن گودنے سے منع فرمایا۔

العین سے نظر بد لگ جانا مراد ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ کتاب الطب والرقی میں آئے گی۔

(١٥)----- وعن ابن عمر رضی الله عنه قال: لقدر رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم ملبدا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے سر کے بالوں پر کسی چیز کی تہ لگا کر انہیں جمایا ہوا تھا۔

تلبید کا معنی ہے کہ سر کے بالوں پر خطمی یا کوئی اور خاص قسم کی گوند یا خاص قسم کی جیلی وغیرہ لگا کر

---

(١) فتح الباری باب المتفصات

بالوں کو جمالیا جائے، عربوں میں ایسا بکثرت کیا جاتا تھا اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا تھا کہ سر کے بال منتشر اور پراگندہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک ہی حالت میں رہتے تھے دوسرے سر میں جوئیں پڑنے سے بھی حفاظت ہوتی تھی۔ ابن عمر کی اس روایت میں جس تلبید کا ذکر ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے سے پہلے فرمایا، اس باب میں یہ حدیث لاکر یہ بتانا مقصود ہے کہ بغیر احرام کے بھی تلبید جائز ہے۔

آج کل اس مقصد کے لئے خاص قسم کی جیلیز آتی ہیں اگر ان میں کوئی خلاف شرع چیز شامل نہ ہو تو ان کا استعمال بھی جائز ہے لیکن حالت احرام میں خوشبودار لگانا جائز نہیں ہے البتہ اگر احرام شروع کرنے سے پہلے لگاتا ہے تو خوشبودار بھی ہمارے نزدیک جائز ہے۔

(۱۶)-----عن أنس رضی اللہ عنہ قال: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یتزعفر الرجل۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے منع فرمایا کہ مرد زعفران کی خوشبو لگائے۔

اس زمانے میں زعفران سے ایک خاص قسم کی خوشبو بنتی تھی جسے خلوق یا صفرۃ کہتے تھے، وہ چونکہ زنانہ خوشبو تھی یعنی عورتوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی اس لئے مردوں کو اس کے استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تاکہ عورتوں کے ساتھ تشبہ نہ ہو البتہ اگر غیر ارادی طور پر لگ جائے مثلاً شادی شدہ ہو اس کی بیوی سے اس کے کپڑے پر لگ جائے تو معاف ہے جیسا کہ فصل ثانی میں یعلی بن مرہؓ کی حدیث سے معلوم ہوگا۔

أن یتزعفر الرجل کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے پہنے، یہ بھی مرد کے لئے ناجائز ہے۔

(۱۷)-----عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: کنت أطیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بأطیب ما نجد حتی أجد وبیص الطیب فی رأسہ ولحیتہ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان خوشبوؤں میں سے جو ہمیں دستیاب ہوتی تھیں سب سے پاکیزہ خوشبو لگایا کرتی تھی، یہاں تک کہ میں خوشبو کی چمک سر مبارک اور داڑھی میں دیکھا کرتی تھی۔

حضور اقدس ﷺ کا خوشبو لگانا:-

آنحضرت ﷺ اپنی ذات میں مطیب ومعطر تھے اس کے ساتھ آپ کو خوشبو لگانا بھی بہت محبوب تھا

دنیا کی چند ایک چیزیں جو آپ کو مرغوب تھیں ان میں خوشبو بھی ہے، خوشبو کے بارے میں آپ کا ذوق کافی لطیف اور نفیس تھا، اس حدیث سے ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خوشبو لگوانا ثابت ہو رہا ہے دوسرے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کو دستیاب خوشبوؤں میں سے نفیس ترین اور پاکیزہ ترین خوشبو لگائی جاتی تھی۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک اور داڑھی مبارک میں خوشبو لگانے کا ذکر ہے، چہرے پر، نہیں، اس لئے کہ چہرے پر خوشبو لگانا عورتوں کے ساتھ خاص ہے اس لئے مردوں کو تشبہ بالنساء کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خوشبو لگائی جاتی تھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جسم دار اور رنگ دار ہوتی تھی تبھی تو اس کی چمک بعد میں بھی محسوس ہوتی رہتی تھی، بخاری وغیرہ کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوشبو کستوری کی ہوتی تھی۔

حضرت عائشہ یہاں جس خوشبو لگانے کی بات کر رہی ہیں وہ احرام باندھنے سے پہلے کی بات ہے، اسی حدیث سے امام ابو حنیفہؒ نے استدلال کیا ہے احرام سے پہلے اگر بدن پر خوشبو لگی ہوئی ہو اور احرام باندھنے کے بعد بھی باقی رہے تو وہ جائز ہے البتہ احرام شروع ہونے کے بعد لگانا ناجائز ہے۔

(۱۸)-----عن نافع قال: كان ابن عمر إذا استجمر استجمر بألوّة غير مطراة، وبكافور يطرحه مع الألوة، ثم قال: هكذا كان يستجمر رسول الله صلى الله عليه وسلم- (رواه مسلم)

ترجمہ ...... نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر جب دھونی لیتے تو اگر کی لکڑی کے ساتھ دھونی لیتے جس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہیں ہوتی تھی اور کبھی کافور کے ساتھ دھونی لیتے جسے اگر میں شامل کر لیا کرتے تھے، پھر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی دھونی لیتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کا دھونی لینا:-

استجمار کا معنی ہوتا ہے دھونی لینا، عربوں کے ہاں ایک خاص دستور تھا اور اب بھی ہے کوئلوں وغیرہ پر کوئی خوشبودار لکڑی، برادہ یا کوئی اور چیز ڈالتے جس سے خوشبودار دھواں اٹھتا اور کمرے وغیرہ کی فضا خوشگوار ہو جاتی تھی۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دھونی لینے کا ذکر ہے کہ آپ عموماً اَلوّۃ سے دھونی

لیتے، اَلُوّۃ ایک خاص خوشبودار لکڑی ہوتی تھی، اسے عود بھی کہہ دیا جاتا ہے اردو میں اسے اگر کہتے ہیں، اگر بتی کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے، اگرچہ اس میں شامل اگر اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہوتی ہے، عربوں کے ہاں آج کل بھی عود سے دھونی لینے کا کافی رواج ہے اور خالص عود مہنگی بھی کافی ہوتی ہے اور اس سے دھونی لینے کے لئے بڑی خوبصورت الیکٹرک انگیٹھیاں ملتی ہیں۔

حضور اقدس ﷺ اگر سے دھونی دو طرح لیا کرتے تھے، کبھی اکیلی اگر سے، اس میں کوئی اور چیز شامل نہیں ہوتی تھی، غیر مطراۃ کا یہی مطلب ہے تطریۃ کا معنی ہوتا ہے خوشبو میں کسی اور چیز کی آمیزش کرنا۔

کبھی آپ الوۃ (اگر) کے ساتھ کافور کو ملا کر دھونی لیا کرتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو چونکہ اتباع سنت کا خاص ذوق تھا اس لئے وہ بھی انہی دو طرح سے اگر کی دھونی لیا کرتے تھے، باب صفة الجنة و أهلها میں آئے گا کہ جنت میں بھی اگر کی دھونی ہوگی۔

الفصل الثانی

(۱۹)-----عن ابن عباس رضی الله عنه قال: كان النبی صلی الله علیه وسلم یقص أو یأخذ من شاربه، وكان إبراهیم خلیل الرحمٰن صلوٰت الرحمٰن علیه یفعله۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مونچھیں کاٹا کرتے تھے یا یوں کہا کہ اپنی مونچھوں کو چھوٹا کیا کرتے تھے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام بھی ایسا کرتے تھے۔

(۲۰)-----وعن زید بن ارقم رضی الله عنه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من لم یأخذ من شاربه فلیس منا۔ (رواه أحمد والترمذی والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی مونچھوں میں سے نہ لے (یعنی انہیں چھوٹا نہ کرے) وہ ہم سے نہیں۔

(۲۱)-----وعن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن النبی صلی الله علیه وسلم كان یأخذ من لحیته من عرضها وطولها۔ (رواه الترمذی وقال: هذا حدیث غریب)

ترجمہ ...... عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا (یعنی عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ

عنہ) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کو چھوٹا کیا کرتے تھے لمبائی اور چوڑائی کی جانب سے

(۲۲)----- وعن يعلى بن مرة رضى الله عنه أن النبى صلى الله عليه وسلم رأى عليه خلوقا، فقال: ألك امرأة، قال: لا، قال: فاغسله ثم اغسله ثم لاتعد۔ (رواه الترمذى والنسائى)

ترجمہ ...... حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر خلوق دیکھی تو آپ نے پوچھا کیا تمہاری بیوی ہے، انہوں نے عرض کیا: نہیں، آپ نے فرمایا تو پھر اس کو دھو ڈالو، پھر اس کو دھو ڈالو، پھر اس کو دھو ڈالو، پھر دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ (یعنی یہ خوشبو نہ لگانا)

مرد کے لئے زنانہ خوشبو کا حکم:-

خلوق ایک خاص قسم کی خوشبو ہوتی ہے جس میں زعفران اصلی جزو ہوتا تھا اس کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ملائی جاتی تھیں، یہ خوشبو صرف عورتیں ہی لگایا کرتی تھیں اس لئے مردوں کو اس سے منع فرمایا البتہ اگر بیوی کے کپڑوں سے غیر ارادی طور پر لگ جائے تو معاف ہے جیسا کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تو ان کے کپڑوں پر خلوق کے نشانات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھے تو آپ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا میرا نکاح ہو گیا ہے۔ تو آپ نے اس خلوق پر انکار نہیں فرمایا۔ یہاں یعلی بن مرہ سے بھی پہلے پوچھا کہ کیا تمہاری بیوی ہے تا کہ بیوی ہونے کی صورت میں غیر ارادی طور پر لگ جانے کی صورت پر محمول کیا جائے۔ جب یہ پتہ چلا کہ بیوی نہیں ہے تو آپ نے دھونے کا امر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر خلوق یا کوئی اور رنگ دار زنانہ خوشبو لگا لے تو اسے دھونا ضروری ہے البتہ اگر بیوی سے از خود لگ جائے تو دھونا ضروری نہیں ہے۔

(۲۳)-----وعن أبى موسى رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايقبل الله صلاة رجل فى جسده شئ من خلوق۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے مرد کی نماز قبول نہیں فرماتے جس کے جسم میں کچھ بھی خلوق لگی ہوئی ہو۔

نماز قبول نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثواب پورا نہیں ملتا۔

(۲٤)-----وعن عمار بن ياسر رضی الله عنه قال: قدمت علی أهلی من سفر وقد تشققت يدای، فخلقونی بزعفران، فغدوت علی النبی صلی الله عليه وسلم، فسلمت عليه، فلم يرد علی، وقال: اذهب، فاغسل هذا عنك۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس ایسی حالت میں آیا کہ میرے ہاتھ پھٹ چکے تھے اس لئے میرے گھر والوں نے مجھے زعفران سے بنی ہوئی خلوق لگا دی پھر میں حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا، آپ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور فرمایا جاؤ اور اسے اپنے سے دھو ڈالو۔

یہاں حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے خلوق ایک عذر کی وجہ سے لگائی ہوئی تھی، لیکن اسے بھی دھونے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذر کا علم نہیں ہو گا اور حضرت عمار نے آپ سے دھونے کا امر سن کر کمال ادب کی وجہ سے عذر پیش کرنے کی بجائے تعمیل حکم کو باعث سعادت سمجھا ہو گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذر معمولی اور نا قابل اعتناء ہو یا یہ کہ حضرت عمار کا مزاج رخصت کی بجائے عزیمت پسند تھا اس لئے آپ نے انہیں یہ فرمایا۔

(۲۵)----- وعن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم طيب الرجال ماظهر ريحه وخفی لونه وطيب النساء ماظهر لونه وخفی ريحه۔ (رواه الترمذی والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی خوشبو نمایاں ہو اور رنگ مخفی (ہلکا) ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ (اگرچہ) نمایاں ہو (لیکن) مہک مخفی ہو۔

مردانہ اور زنانہ خوشبو کا فرق:۔

اس مضمون کی ایک حدیث کتاب اللباس کے پہلے باب کی دوسری فصل میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بھی گزر چکی ہے، حاصل یہ ہے مردوں کی خوشبو میں اصل مقصود خوشبو ہونی چاہئے، رنگت مقصود نہیں ہونی چاہئے اس لئے رنگت کا اہتمام عورتوں کا کام ہے یہ مقصد نہیں کہ مردوں کے لئے تیز خوشبو ہلکی خوشبو کے مقابلے میں بہتر ہے اس لئے کہ اس میں ہر ایک کا اپنا اپنا ذوق ہوتا ہے، شریعت کی طرف سے کوئی تعیین نہیں ہے، مقصد کہنے کا صرف یہ ہے کہ مرد رنگت کی وجہ سے کسی خوشبو کو ترجیح دے یہ

اچھی بات نہیں ہے، اگر زیادہ مہک ہونے کی وجہ سے ترجیح دے تو کوئی حرج نہیں۔

عورت کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ تیز مہک والی خوشبو لگائے خاص طور پر گھر سے نکلتے وقت اس لئے کہ رنگت تو لباس اور پرقعے چادر وغیرہ میں چھپ جائے گی جب کہ خوشبو دور دور تک مہک کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی البتہ اگر عورت کسی خوشبو کو اس کی اچھی رنگت کی وجہ سے پسند اور اختیار کرتی ہے تو کوئی حرج نہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا اپنے جسم پر مصنوعی عارضی رنگت لگانا جائز ہے۔

امام بخاری کے ایک ترجمۃ الباب کی تشریح کرتے ہوئے بعض شارحین بخاری نے یہ کہا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ حدیث غیر ثابت یا مرجوح ہے اس لئے کہ اس سے زیادہ صحیح حدیث میں یہ آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود اپنے ہاتھ سے حضور اقدس کو خوشبو لگایا کرتی تھیں، اب ظاہر ہے کہ وہ خوشبو خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاتھوں پر بھی لگتی ہوگی اگر مردانہ خوشبو عورت کے لئے ممنوع ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کو اس سے منع کر دیتے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مرد اور عورت کی خوشبو میں فرق کی حدیث بھی صحیح ہے اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابو موسی اشعری سے بھی مروی ہے اس لئے کہ کسی حدیث کو رد کرنے کی بجائے تطبیق کا راستہ اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے اور وہ یہ ہے کہ تیز مہک والی خوشبو عورت کے لئے ممنوع تب ہے جب کہ یہ خوشبو لگا کر اس نے گھر سے باہر نکلنا ہو، اگر گھر سے نکلنا ہی نہ ہو یا نکلنا تو ہو لیکن نکلتے وقت اسے دھو ڈالے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔(۱)

اس جواب کی ضرورت بھی تب ہے جب کہ وہ خوشبو تیز مہک والی ہو، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لگائی جانے والی خوشبو ہلکی ہو تو اشکال ہی نہیں ہوتا۔

البتہ ایک اشکال اور ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں یہ ہے کہ مرد کی خوشبو وہ ہے جس کی رنگت مخفی ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو کی چمک بھی بعد میں آپ کے سر مبارک میں نظر آتی رہتی تھی، جواب یہ ہے کہ یہاں رنگت سے مراد وہ ہے جو خود مقصود ہو اور اس سے تزین حاصل کرنا مقصود ہو، یہاں رنگت برائے تزین نہیں ہوتی تھی واللہ اعلم۔

(۲۶)----- وعن أنس رضی الله عنه قال: كانت لرسول الله صلى الله عليه وسلم سكة يتطيب منها۔ (رواه أبو داؤد)

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب تطییب المرأۃ زوجہا بیدہا

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سکہ خوشبو ہوتی تھی جس میں سے آپ خوشبو لگایا کرتے تھے۔

سُکۃ ایک خاص قسم کی خوشبو ہوتی تھی جو قیمتی خوشبو سمجھی جاتی تھی، بعض شارحین نے کہا ہے کہ سکہ سے یہاں خوشبو کا ظرف یعنی ڈبیہ وغیرہ مراد ہے۔

(۲۷)-----وعنه رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ يكثر دهن رأسه وتسريح لحيته ويكثر القناع، كأن ثوبه ثوب زيات۔ (رواه في شرح السنة)

ترجمہ ...... حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر پر کثرت سے تیل لگاتے اور بکثرت داڑھی میں کنگھی فرمایا کرتے تھے اور بکثرت سر پر کپڑا رکھا کرتے تھے، آپ کا (یہ) کپڑا ایسے ہوتا تھا جیسے تیلی کا کپڑا ہو۔

حضور اقدس ﷺ کا بکثرت تیل لگانا:-

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چار معمول نقل کئے گئے ہیں:

پہلا یہ کہ آپ سر مبارک میں تیل کثرت سے لگایا کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ داڑھی میں کنگھی بکثرت کیا کرتے تھے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آگے حدیث نمبر تیس میں یہ آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزانہ کنگھی کرنے سے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ ناغہ کر کے کنگھی کرنا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں ممانعت اس صورت کے متعلق ہے جب کہ کنگھی کرنا بغیر ضرورت کے محض زینت میں انہماک کی وجہ سے ہو اگر کسی حقیقی داعی اور ضرورت کی وجہ سے ہو مثلاً بال گنے ہونے کی وجہ سے کنگھی کرنے کے قابل جلدی ہو جاتے ہوں یا وفود وغیرہ سے ملاقات کرنے یا کہیں جانے کے لئے کنگھی کرنا پڑے تو یہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔

نیز حدیث میں کثرت سے کنگھی کرنے کا ذکر ہے اور کثرت امر اضافی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ روزانہ بالالتزام کرتے ہوں گے بلکہ بوقت ضرورت کرتے تھے اور ضرورت روزانہ بھی پڑ سکتی ہے اور کئی دن کے بعد بھی۔

تیسری بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے ہیں کہ **كان يكثر القناع**، قناع سر پر اوڑھنے والے کپڑے کو کہتے ہیں یہاں مراد لیا گیا ہے وہ کپڑا جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ کے نیچے رکھا کرتے تھے تاکہ عمامہ تیل سے محفوظ رہے۔

تیلی جیسا کپڑا:۔

آخری بات اس حدیث میں یہ فرمائی: **کأن ثوبه ثوب زیات**، آپ کا کپڑا ایسا ہوتا تھا جیسے دھوبی کا ہو، اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ دوسری روایات کثیرہ سے ثابت ہے کہ آپ نظافت پسند تھے اور کپڑوں کو اس طرح تیل لگا ہوا ہونا بظاہر نظافت کے خلاف ہے اس لئے بعض حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور ضعف کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کے ایک راوی الربیع بن الصبیح ضعیف ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کی سند کا انحصار ربیع بن صبیح پر نہیں ہے بلکہ ان کے متابع بھی موجود ہیں مثلاً طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں سفیان ثوری ان کی متابعت کر رہے ہیں اس لئے بحثیت مجموعی یہ حدیث سنداً قابل قبول ہے۔

مذکورہ اشکال کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ اشکال تب ہوتا ہے کہ جب کہ ثوب سے مراد آپ کا لباس ہو یہاں ثوب سے مراد وہ کپڑا ہے جو عمامہ کے نیچے عمامہ کی تیل سے حفاظت کے لئے رکھتے تھے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں یا بالکل بے تکلف جگہ میں لباس میں ایسی چیزیں گوارا کر لیتا ہے جن کے ساتھ وہ باہر لوگوں میں آنا پسند نہیں کرتا، یہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی جو کہ آپ کے ہر وقت کے خادم تھے گھر کی بات کر رہے ہیں کہ کبھی کبھار گھر میں سر پر تیل زیادہ لگانے کی وجہ سے آپ کا لباس اس طرح ہو جاتا تھا۔

(۲۸) ــــــ عن أم هانیء قالت قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم علینا بمکة وله أربع غدائر ۔ (رواه أحمد و أبو داؤد و الترمذی و ابن ماجه)

ترجمہ ...... حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ہمارے پاس مکہ مکرمہ میں تشریف لائے اس وقت آپ کے چار گیسو تھے۔

حضور اقدس ﷺ کے گیسو مبارک:۔

ام ہانی رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں وہ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ ہمارے ہاں مکہ مکرمہ میں ایسی حالت میں تشریف لائے کہ آپ کے سر کے بالوں کی چار مینڈھیاں بنی ہوئی تھیں، بظاہر فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ داخل ہونے کی بات کر رہی ہیں۔

غدائر ...... غدیرہ کی جمع ہے یعنی سر کے بالوں کو کچھ حصوں میں تقسیم کر کے انہیں گوندھ لیا جائے انہی کو ضفائر اور ذوائب بھی کہہ دیتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جن مینڈھیوں کا یہاں ذکر ہے اس کے بارے میں اتنی بات تو یقینی ہے کہ ان کی شکل ایسی ہو گی جن سے عورتوں کے ساتھ تشبہ نہیں بنتا ہو گا اس

کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ آپ کا عام معمول مینڈھیاں بنانے کا نہیں تھا بلکہ ایسا اس وقت فرماتے تھے کہ جب کہ طویل سفر کی وجہ سے سر کے بالوں کی دیکھ بھال مشکل ہوتی تھی۔[1]

حسن اتفاق:۔

فتح مکہ کے موقع پر جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اس وقت آپ کے سر پر چار مینڈھیاں تھیں، اسی طرح مکی دور میں ایک مرتبہ مشرکین نے حضور اقدس ﷺ کو شدید ایذاء رسانی کا ارادہ کیا اور عملاً ایذاء رسانی شروع بھی کر دی، اس موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہا تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت کے لئے تشریف لائے اور مشرکین سے کہا: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا أَن يَّقُوْلَ رَبِّيَ الله۔ مشرکین آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر صدیق اکبر کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کو بہت زیادہ زدو کوب کیا، لیکن صدیق اکبرؓ کا مقصد حاصل ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ بچ گئے اگرچہ اس کے بدلے میں وہ تکلیف خود انہیں اٹھانا پڑی، روایات میں آتا ہے کہ اس وقت حضرت صدیق اکبر کے سر پر بھی چار مینڈھیاں تھیں۔

(۲۹)-----عن عائشة رضى الله عنها قالت: إذا فرقت لرسول الله ﷺ رأسه صدعت فرقه عن يا فوخه وأرسلت ناصيته بين عينيه۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں مانگ نکالنے لگتی تو آپ کی مانگ کو آپ کے سر کے تالو سے چیرتی تھی اور آپ کے سر کے اگلے حصے کے بال آپ کی آنکھوں کے درمیان میں کر دیتی تھی۔

حضور ﷺ کی مانگ کی ہیئت:۔

اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ کا طریقہ بیان کر رہی ہیں کہ جب میں آپ کی مانگ نکالتی یعنی سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنا شروع کرتی تو اس کا آغاز سر کے بالکل درمیان والے حصے سے کرتی تھی، اس سے تو اتنا پتہ چلا کہ مانگ کا آغاز یہاں سے ہوتا تھا، اس مانگ کا رخ کس طرح ہوتا تھا اس کا پتہ اگلے جملے سے چل رہا ہے، فرماتی ہیں: وأرسلت ناصيته بين عينيه، ناصیہ سر کے اگلے حصے کے بالوں کو کہا جاتا ہے اس جملے کا مطلب علامہ طیبی اور ملا علی قاری وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ مانگ کا دوسرا کنارہ آنکھوں کے درمیان والی جگہ کی سیدھ میں ہوتا تھا اور ناصیہ کے بال آدھے اس کی دائیں

---

(۱) فتح الباری باب الجعد کتاب اللباس

جانب اور آدھے بائیں جانب ہوتے تھے، اس تشریح کے مطابق آپ کی مانگ کا رخ بھی متعین ہو گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کی مانگ سر کے درمیان میں ہوتی تھی اور سیدھی ہوتی تھی۔

البتہ صاحب عون المعبود نے اس حدیث کی شرح یہی ذکر کرنے کے بعد اردبیلیؒ سے یہ احتمال بھی نقل کیا ہے أرسلت ناصيته کو اپنے ظاہر پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ ناصیۃ (سر کے اگلے حصے) کے بالوں کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے ویسے ہی لٹکا دیتی ہوں اور ان کو مانگ میں شامل نہ کرتی ہوں، اس معنی کے مطابق یہ حدیث مانگ کے رخ کے بارے میں ساکت ہوگی علامہ سندھیؒ نے ابن ماجہ کے حاشیہ[1] میں اسی احتمال کو لیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: يريد أنها تفرق القفا وتسدل الناصية ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیوں کہ اس کے لفظ ہیں:

كنت أفرق خلف يا فوخ رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم أسدل ناصيته۔

مسند احمد کی ایک روایت کے لفظ ہیں:

صدعت فرقة من يا فوخه وأرسلت له ناصية۔

احمد ہی کی ایک روایت میں ہے:

وأرسلت ناصيته بين صدغيه۔

حاصل یہ کہ ابوداؤد کی روایت پر تو طیبی وغیرہ کی تشریح منطبق ہو رہی ہے لیکن ابن ماجہ اور احمد کی روایات علامہ سندھی والی تشریح کے زیادہ موافق ہیں جو بھی تشریح ہو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے مختلف اوقات میں مختلف عمل بھی ہو سکتے ہیں۔

احقر کے ذہن میں ایک اور احتمال آتا ہے اگرچہ ابھی اس کی تصریح نظر سے نہیں گزری، وہ یہ کہ مراد یہاں پر سامنے کے بالوں کو لٹکانا ہی ہے جیسا کہ علامہ سندھی وغیرہ سمجھتے ہیں لیکن یہ لٹکانا مستقل نہیں ہوتا ہوگا بلکہ تیل لگانے اور کنگھی کے عمل کے دوران عارضی ہوتا ہوگا اس کی کسی قدر تائید شاید مسند ابویعلی کے ان لفظوں سے ہو سکے: أسدل له إذا دهنت ناصيته، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کے بالوں کو تیل لگانے کے لئے لٹکایا جاتا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۳۰)----- وعن عبد الله بن مغفل رضي الله عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الترجل إلا غبار۔ (رواه الترمذي وأبو داؤد والنسائي)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ

---

(۱) ابن ماجہ کتاب اللباس، باب اتخاذ الجمہ والذوائب

علیہ وسلم نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا مگر یہ کہ ناغہ کر کے ہو۔

غب کا اصل معنی ہے جانور کو ایک دن چھوڑ کر اگلے دن پانی پلانے کے لئے لے جانا، پھر اس کا اطلاق ہر ایسے کام پر ہونے لگا جو ایک دن چھوڑ کر کیا جائے، یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھی وغیرہ کرنے کی ایسی کثرت اور اہتمام سے منع فرمایا جس کی وجہ سے انسان کبھی ناغہ ہی گوارا نہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ کثرت ممنوع ہے جو زینت میں انہاک کی وجہ سے ہو اور بلا ضرورت ہو۔

(۳۱)----- وعن عبد الله بن بريدة قال: قال رجل لفضالة بن عبيد مالي أراك شعثا؟ قال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان ينها ناعن كثير من الإ رفاه، قال: مالي لأرى عليك حذاء؟ قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمرنا أن نحتفي أحيانا ـ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... عبداللہ بن بریدہؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت فضالہ بن عبید سے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ میں آپ کو پراگندہ بالوں والا دیکھ رہا ہوں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں زیادہ تنعم سے منع فرمایا کرتے تھے، انہوں نے کہا کیا وجہ ہے کہ میں آپ کے پاؤں میں جوتا نہیں دیکھ رہا، انہوں نے کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم کبھی کبھی ننگے پاؤں چلا کریں۔

زیادہ ناز و نعمت اچھا نہیں:۔

مطلب یہ ہے کہ زیادہ ناز و نعمت اور نخرے کا عادی ہونا اچھا نہیں، جس میں زیادہ زینت کا اہتمام بھی شامل ہے اس لئے کہ اس سے ایک تو کبر و نخوت پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے دوسرے اس سے ضروریات و اخراجات میں اضافہ ہو کر پریشانی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ننگے پاؤں چلنا:۔

دوسرے اس حدیث میں یہ حکم فرمایا ہے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چل لینا چاہئے، اس حکم یا سنت پر عمل کرنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ گھر یا دفتر وغیرہ میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا ہو تو کبھی کبھار ننگے پاؤں بھی چلا جائے اس لئے کہ اتنا بھی ننگے پاؤں نہ چل سکنا بھی زیادہ ناز و نعمت میں داخل ہے۔

(۳۲)-----عن ابی هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم من كان له شعر فليكرمه۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ …… حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے بال ہوں (یعنی اس نے بال رکھے ہوئے ہوں) اسے چاہئے کہ وہ ان کا اکرام کرے۔

یعنی صاف رکھے، اعتدال کے ساتھ تیل کنگھی کرتا رہے، جب کٹوانے وغیرہ کی ضرورت ہو تو کٹوائے غرضیکہ صحیح دیکھ بھال کرے۔

اسی حدیث کے پیش نظر بعض صوفیہ نے سر پر بال نہ رکھنے کو اختیار فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنے بارے میں محسوس کیا کہ ہم بالوں کا حق ادا نہیں کر سکیں گے جس سے اس حدیث کی خلاف ورزی ہوگی۔

(۳۳)----- وعن أبی ذر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ إن أحسن ماغير به الشيب الحناء والكتم۔ (رواه الترمذی و أبو داؤد و النسائی)

ترجمہ …… حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن چیزوں سے سفید بالوں کو تبدیل کیا جاتا ہے ان میں سے سب سے اچھی مہندی اور کتم ہے۔

حناء کے معنی تو معروف ہیں یعنی مہندی، کتم بھی ایک خاص قسم کی بوٹی یا پودے کا نام ہے جس سے روشنائی بھی بنائی جاتی تھی اور بطور خضاب بھی استعمال ہوتا تھا۔

اس حدیث پر یہ اشکال کیا گیا ہے مہندی اور کتم کو ملانے سے تو رنگ کالا ہو جاتا ہے جس سے اگلی حدیث میں منع کیا گیا ہے، اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ یہاں حناء اور کتم ملا کر لگانا مراد نہیں ہے بلکہ الگ الگ لگانا مراد ہے لیکن دو حدیثیں چھوڑ کر آگے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں حناء اور کتم کا ذکر آرہا ہے وہاں بظاہر ملا کر لگانا ہی مراد ہے اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے تناسب تناسب میں فرق ہو گا، بعض تناسب ایسے ہوں گے جن سے رنگت سیاہ ہوتی ہو گی اور بعض سے سیاہ نہیں ہوتی ہو گی بلکہ گہری براؤن ہوتی ہو گی۔

(۳٤)----- وعن ابن عباس رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: يكون قوم فی آخر الزمان يخضبون بهذا السواد كحواصل العمام لا يجدون رائحة الجنة۔ (رواه أبو داؤد و النسائی)

ترجمہ …… حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے

فرمایا کہ بعد والے زمانے میں کچھ لوگ ہوں گے جو اس سیاہ رنگ کے ساتھ خضاب کریں گے جیسا کہ کبوتروں کے پپوٹے ہوتے ہیں یہ لوگ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیں گے۔

سیاہ خضاب کا حکم:-

جیسا کہ پہلے مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ سیاہ خضاب کے علاوہ ہر رنگ کا خضاب بالاتفاق جائز ہے، سیاہ رنگ کے خضاب کی تین صورتیں ہیں:

(۱)..........سیاہ خضاب دھوکہ دہی اور عمر چھپانے کے لئے ہو، یہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔

(۲)..........مجاہد جہاد کے لئے سیاہ خضاب لگائے تاکہ دشمن کی نظر میں رعب اور ہیبت بیٹھے، یہ بالاتفاق جائز ہے۔

(۳)..........سیاہ خضاب زینت کے لئے ہو، بعض نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ تزین للزوجہ کے لئے ہو، یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کہ ویسے آدمی جوان ہو لیکن بال سیاہ ہوں گئے ہوں۔ اس میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ اور دوسرے کئی فقہاء کے نزدیک یہ بھی مکروہ تحریمی ہے جب کہ بعض فقہاء نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے، ائمہ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ سے بھی یہی مروی ہے، چنانچہ ان سے یہ جملہ منقول ہے: **كما أحب أن تتزين لي تحب هي أن أتزين لها** ۔ یعنی جیسے میں چاہتا ہوں وہ میرے لئے زینت اختیار کرے وہ بھی چاہتی ہوں گی کہ میں اس کے لئے زینت اختیار کروں اسی طرح کا جملہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

جو حضرات اس صورت میں سیاہ خضاب کو ناجائز کہتے ہیں انہوں نے زیر بحث اس حدیث سے استدلال کیا ہے اس لئے کہ اس میں سیاہ خضاب لگانے پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، بعض حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کے ایک راوی عبدالکریم بن ابی المخارق ضعیف ہیں، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ عبدالکریم بن ابی المخارق نہیں ہیں بلکہ عبدالکریم بن مالک الخذری ہیں جو کہ ثقہ ہیں البتہ قائلین جواز اس حدیث کو اس صورت پر محمول کرتے ہیں جب کہ تغریر اور دھوکہ دہی کی نیت ہو اس لئے کہ کالا خضاب لگانا متعدد صحابہ سے سے ثابت ہے خاص طور پر اگر ابن عباسؓ سے وہ جملہ بھی ثابت ہو جو ابھی نقل کیا گیا: **كما أحب أن تتزين لي الخ** ۔ اس لئے کہ اس وعید والی حدیث کے راوی بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

اکثر مشائخ حنفیہ نے تیسری صورت میں بھی کراہت تحریمیہ والے قول کو اختیار کیا ہے لیکن شمس الائمہ سرخسی وغیرہ بعض حضرات نے امام ابو یوسف کے قول کو اختیار کیا ہے اس لئے فتویٰ تو کراہت تحریمیہ والے

قول پر ہے اور یہ قول احوط بھی ہے لیکن اگر کسی کے نزدیک امام ابو یوسف والا قول راجح ہو اور وہ اس پر عمل کرے تو اس پر انکار شدید نہیں کرنا چاہئے۔[1]

(۳۵)----- وعن ابن عمر رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يلبس النعال السبتية ويصفر لحيته بالورس والزعفران وكان ابن عمر يفعل ذلك۔ (رواه النسائي)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سبتی جوتے (بغیر بالوں کے جوتے) پہنا کرتے تھے اور داڑھی ورس اور زعفران کا زرد خضاب لگایا کرتے تھے اور ابن عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

النعال السبتیہ کی تشریح باب النعال کی پہلی حدیث میں گزر چکی ہے۔

(۳۶)----- وعن ابن عباس رضي الله عنه قال: مر على النبي صلى الله عليه وسلم رجل قد خضب بالحناء فقال ما أحسن هذا، قال: فمر آخر قد خضب بالحناء والكتم فقال: هذا أحسن من هذا ثم مر آخر قد خضب بالصفرة، فقال: هذا أحسن من هذا كله۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص کا گزر ہوا جس نے مہندی کا خضاب لگایا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: یہ کتنا اچھا ہے، پھر ایک اور شخص گزرا جس نے مہندی اور کتم کا خضاب لگا رکھا تھا تو آپ نے فرمایا یہ اس سے بھی اچھا ہے پھر ایک اور شخص کا گزر ہوا جس نے زرد رنگ کا خضاب لگایا ہوا تھا آپ نے فرمایا یہ ان سب سے اچھا ہے۔

(۳۷)----- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: غيروا الشيب ولا تشبهوا باليهود۔ (رواه الترمذي ورواه النسائي عن ابن عمر والزبير)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سفید بالوں کو (خضاب کے ذریعے) بدل لیا کرو اور یہودیوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔

---

(۱) تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو اوجز المسالک ۱۵: ۲۵، ۲۷

(۳۸)----- وعن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتنتفوا الشيب فإنه نور المسلم، من شاب شيبة في الاسلام كتب الله بها حسنة و كفرعنه بها خطيئة ورفعه بها درجة۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سفید بالوں کو نہ اکھیڑا کرو، اس لئے کہ یہ مسلمان کا نور ہیں جو آدمی مسلمان ہونے کی حالت میں ایک سفید بال والا بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کے بدلے میں ایک نیکی لکھیں گے ایک گناہ معاف کریں گے اور ایک درجہ بلند کریں گے۔

سفید بال چننا:-

متعدد احادیث میں سفید بال چننے سے منع کیا گیا ہے اس حدیث میں اس کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ مسلمان کے لئے نور ہے اس پر یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ اگر بالوں کی سفیدی نور ہے تو اس پر خضاب بھی ممنوع ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ کالے کے علاوہ باقی خضابوں کی ترغیب ہے اس لئے کہ اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خضاب سے سفید بال ختم نہیں ہوتے بلکہ ان کی سفیدی چھپ جاتی ہے اور خاص طور پر خضاب سیاہ نہ ہو تو دیکھنے والے کو بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں، پھر سفید بالوں کو برقرار رکھ کر صرف ان کی سفیدی چھپانے میں بعض دیگر مصالح بھی ہیں مثلاً مخالفت یہود، بعض صورتوں میں بدنمائی سے احتراز وغیرہ۔

(۳۹)----- وعن كعب بن مرَّة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مَن شابَ شيبةً في الإسلامِ، كانت له نوراً يوم القيامةِ۔ (رواه الترمذى والنسائى)

ترجمہ ...... حضرت کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی اسلام کی حالت میں سفید بالوں والا ہو جائے تو یہ اس کے لئے قیامت کے دن نور کا باعث ہوں گے۔

(۴۰)----- وعن عائشةَ، قالت: كنتُ أغتسل أنا و رسول الله ﷺ من إناء واحدٍ، و كانَ له شعرٌ فوقَ الجُمَّةِ، و دونَ الوفرة۔ (رواه الترمذى والنسائى)

ترجمہ ...... حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن میں سے غسل کیا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے بال جمہ سے اوپر اور وفرہ سے نیچے تھے۔

وَفرہ، لمہ، جمہ :-

حدیثوں میں سر کے بالوں کے تین نام آتے ہیں وفرہ، لمہ اور جمہ۔ لمہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو کان کی لو کے برابر یا ان سے تھوڑے سے اوپر ہوں اور جمہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو کندھوں کے قریب ہوں، وفرہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو ان کے درمیان ہوں یعنی کانوں کی لو سے ذرا نیچے ہوں لیکن ان الفاظ کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا رہتا ہے۔ وفرہ، لمہ، جمہ یہ تینوں بول کر بعض اوقات ہر قسم کے سر کے بال مراد لئے جاتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کے سر کے بال کیسے تھے اس کے بارے میں حدیثیں مختلف آتی ہیں بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بال جمہ تھے اور بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ آپ کے بال کانوں کی لو سے ذرا اوپر تھے اور بعض میں آتا ہے کہ آپ کے بال کانوں کی لو سے ذرا نیچے تھے، یہ مختلف روایتیں ہیں اور ان میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے اس لئے کہ بال کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جو ایک ہی حالت پر یا ایک ہی حجم پر برقرار رہیں بلکہ یہ بڑھتے گھٹتے رہتے ہیں اس لئے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بال درمیانے ہوتے ہوں گے یعنی کانوں کی لو کے قریب قریب ہاں البتہ آپ نے بالکل نئی نئی حجامت کرائی ہوئی ہوگی اس وقت کانوں کی لو سے تھوڑے اوپر لگتے ہوں گے اور کبھی کسی عارض کی وجہ سے آپ کو دیر تک بال چھوٹے کرانے کا موقع نہیں ملتا ہوگا تو ذرا زیادہ بڑے ہو جاتے ہوں گے اس لئے مختلف اوقات میں آپ کے بالوں کی مختلف حالتیں ہوں گی لہٰذا ان حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۴۱)----- وعن ابنِ الحنظليَّةِ، رجلٍ من أصحابِ النبى صلى الله عليه وسلم، قال: قال النبى صلى الله عليه وسلم: نعمَ الرجل خُرَيم الأسدى، لولا طولُ جُمَّتِه، وإسبالُ إزارِه فبلغَ ذلكَ خريماً، فأخذَ شفرةً، فقطع بها جُمَّته، إلى أذُنيه ورفعَ إزارَه إلى أنصافِ ساقَيهِ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن الحنظلیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک آدمی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا خریم اسدی اچھے آدمی ہیں اگر ان کے سر کے بال لمبے نہ ہوتے اور ان کا تہبند ٹخنوں سے نیچے نہ ہوتا، یہ بات خریم اسدی تک پہنچی تو انہوں نے چھری لی اور اس کے ذریعے اپنے بالوں کو اپنے کانوں کے برابر کر کے کاٹ دیا اور اپنی لنگی کو اپنی پنڈلیوں کے نصف تک اوپر کر لیا۔

یہ غیبت میں داخل نہیں ...... اس حدیث سے ایک بات تو وہی معلوم ہوئی جو پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ بالوں کا زیادہ لمبا ہونا پسندیدہ نہیں ہے خاص طور پر جب کہ بالقصد بالوں کو لمبا کیا جائے، دوسری

بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ کسی کی عدم موجودگی میں کسی کی برائی کرنا اگرچہ غیبت ہے لیکن اگر یہ یقین ہو کہ اگر اس کو پتہ چل بھی گیا یعنی میری یہ بات اس تک پہنچ بھی گئی تو اس کو ناگواری نہیں ہوگی بلکہ اس کو فائدہ ہوگا کہ وہ اپنی اصلاح کرے گا تو یہ غیبت میں داخل نہیں اور ناجائز نہیں۔ یہاں پر بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین ہوگا کہ اگرچہ میں اس کی دو برائیاں بھی بیان کر رہا ہوں لیکن خریم کو پتہ چلے گا ایک تو وہ اپنی اصلاح کرے گا اور دوسرا یہ کہ اس کو میری یہ بات ناگوار نہیں ہوگی بلکہ خریم اسدی کو بظاہر خوشی ہوگی ایک تو اس بات کی خوشی کہ اصلاح کا موقع مل گیا اور اپنی غلطی پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کی وجہ سے تنبہ ہو گیا اور دوسری خوشی اس بات کی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ان کی دو نامناسب باتیں ذکر فرمائیں وہیں نعم الرجل بھی ان کو کہا اور یہ دو باتیں تو عارضی تھیں وہ تو زائل کرلیں وہ تو ختم ہو گئیں کہ بال بھی چھوٹے ہو گئے اور تہبند بھی ٹخنوں سے اوپر ہو گیا یہ باتیں تو ختم ہو گئیں لیکن نعم الرجل کا سرٹیفکیٹ برقرار ہے لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ خریم اسدی کو یہ بات سن کر خوشی ہوئی ہوگی کوئی ناگواری نہیں ہوئی ہوگی یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ غزوہ احد کے موقع پر کچھ منافقین ساتھ چلے گئے تھے لیکن درمیان میں بھاگ آئے تھے اور مقصد یہ تھا کہ ہمیں بھاگتا ہوا دیکھ کر اور لوگ بھی بھاگیں گے چنانچہ دو مخلص مسلمان قبیلے بھی بھاگنے کے لئے تیار ہو گئے انہوں نے سوچا کہ ہم بھی بھاگتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی اور وہ ڈٹے رہے بھاگے نہیں، تو ان کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں شکایت کی ہے: إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا۔ کہ تم میں سے بھی دو گروہوں نے بھاگنے کا ارادہ تو کرلیا تھا حالانکہ ارادہ دل کی بات تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا پول کھول دیا لیکن اس کے باوجود اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس آیت میں ہماری شکایت کی گئی ہے لیکن ہمارے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہ ہوئی کہ کاش یہ آیت نازل نہ ہوتی بلکہ آیت کا اترنا ہی ہمارے لئے اچھا ہے اس لئے کہ اس میں جہاں ہماری شکایت ہے وہاں یہ بھی ہے وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا اللہ کی طرف سے ولایت کی شہادت قرآن کریم میں آگئی تو اس کے ساتھ لاکھ شکایتیں بھی ہوں گوارا ہیں، اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ان کی دو برائیاں بھی کہی ہیں لیکن اس کے ساتھ نعم الرجل بھی کہا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نعم الرجل آجائے اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو وہ گوارا ہے اس لئے یہ غیبت کے اندر داخل نہیں۔

(۴۲)----- وعن أنسٍ، قال: كانت لي ذوابةٌ، فقالت لي أمي: لا أجزها، كانَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يَمدُّها، ويأخذها۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے سر پر گیسو تھے اور

میری والدہ نے مجھ سے یہ کہہ رکھا تھا کہ میں انہیں نہ کاٹوں اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان بالوں کو کھینچتے تھے اور ان کو پکڑا کرتے تھے۔

یعنی پیار اور شفقت کے طور پر بالوں کا یہ حصہ پکڑتے تھے اور پکڑ کر بعض اوقات کھینچا بھی کرتے تھے اس لئے سر کے باقی بال تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کٹوا لیتے تھے لیکن ان بالوں کے بارے میں ان کی والدہ نے ان کو یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کو نہیں کاٹنا۔

بظاہر یہ بھی قزع معلوم ہوتا ہے کہ باقی بال تو کاٹ لئے ان کو نہیں کاٹا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو قزع یہ ہے کہ باقی بالوں کو مونڈا جائے اور کچھ حصہ نہ مونڈا جائے اور یہ بات حضرت انس کے بارے میں ثابت نہیں ہے کہ وہ باقی بال مونڈتے ہوں گے اور دوسرا یہ کہ یہاں ان بالوں کو نہ کاٹنا ایک عارض کی وجہ سے تھا اور وہ یہ کہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک لگا ہوا ہے یہ متبرک ہو گئے ہیں اب اگر کاٹیں گے تو برکت کو اتار کر پھینکنے والی بات ہے اور کئی صحابہ کے بارے میں یہی بات آتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر دیا تو انہوں نے وہ بال زندگی بھر نہیں کٹوائے۔

(۴۳)----- وعن عبد الله بن جعفر: أن النبي ﷺ أمهلَ آلَ جعفر ثلاثاً، ثم أتاهُم، فقال: لاتبكوا على أخي بعدَ اليومِ ثم قال: ادعوالي بني أخي فجيءَ بنا كأنا أفرُخ فقال: ادعوالي الحلّاق فأمرَه فحلّقَ رؤوسنا۔ (رواه أبوداؤد والنسائي)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کے گھر والوں کو تین دن تک تو کچھ نہیں کہا پھر حضور اقدس ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور یہ فرمایا کہ آج کے دن کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، پھر فرمایا کہ میرے سامنے میرے بھتیجوں کو بلاؤ چنانچہ ہمیں لایا گیا، ہم اس وقت ایسے تھے جیسا کہ چوزے ہوں تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے حجام کو بلاؤ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اس حجام کو حکم دیا اور اس نے ہمارے سروں کو مونڈ دیا۔

أمهل آل جعفر ثلثة ايام تین دن تک جعفر کے گھر والوں کو کچھ نہیں کہا یعنی رونے وغیرہ سے منع نہیں کیا اس لئے کہ یہ رونا ابتداء میں غیر اختیاری ہوتا ہے اور یہ صبر کے منافی بھی نہیں ہے اور ناجائز بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مفید ہوتا ہے اس لئے کہ بعض اوقات رونے کو دبانے سے جسمانی اور طبی نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اور رو لینے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض موقعوں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **دعوها فلترهق سجلا من دموعها** کہ اس کو چھوڑو کہ یہ اپنے آنسو بہالے تو اچھا

ہے بعض موقعوں پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رونے سے منع کیا تو اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منع نہیں کرو بلکہ اس کو اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے دو، رونا وہ ممنوع ہے جو کہ بتکلف ہو اور عام طور پر چونکہ غم کی شدت تین دن کے بعد ختم ہو جاتی ہے اس لئے اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے بعد مت رونا اور اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بھتیجوں کو بلواؤ بھتیجے اس لئے کہا کہ حضرت جعفر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے اور یہ عبداللہ بن جعفر وغیرہ اس وقت چھوٹے چھوٹے بچے تھے اس لئے یہ فرما رہے ہیں کہ ہم اس وقت ایسے تھے جیسے چوزے ہوں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجام کو بلوا کر ان کے بال منڈوا دیئے۔

بال منڈھوانے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عام طور پر غم کی شدت میں بالوں کو درست نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسے موقع پر بکھرے ہوئے بال آدمی کے لئے اور زیادہ پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں اور بالوں کو مونڈ لیا جائے تو آدمی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے بعض علماء نے اس بات پر بھی استدلال کیا ہے کہ چھوٹے بچوں کے بال منڈوا دینا یا مشین پھروا دینا بہتر ہے۔

(٤٤)-----وعن أم عِطيّةَ الأنصاريّةِ: أنَّ امرأةً كانت تختنُ بالمدينةِ فقال لها النبى صلى الله عليه وسلم: لا تنهكى فإنَّ ذلكَ أحظى للمرأةِ، وأحبُّ إلى البعلِ۔ (رواه أبوداود، وقال: هذالحديث ضعيف، وراويه مجهولٌ)

ترجمہ ...... حضرت ام عطیہ انصاریہؓ فرماتی ہیں کہ مدینے میں ایک عورت ختنہ کیا کرتی تھی تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ لڑکیوں کے ختنے میں مبالغہ نہ کرو اس لئے کہ مبالغہ نہ کرنا عورت کے لئے زیادہ لذت کا باعث ہے اور خاوند کو زیادہ محبوب ہے۔

(٤٥)----- وعن كريمة بنت هُمامٍ: أنَّ امرأةً سألت عائشةَ عن خضاب الحنّاءِ فقالت: لا بأسَ، ولكنى أكرهُه، كانَ حبيبى يكرهُ ريحَه ۔ (رواه أبوداود والنسائى)

ترجمہ ...... کریمہ بنت ہمام کہتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مہندی کے خضاب کے بارے میں سوال کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے لیکن میں اسے ناپسند کرتی ہوں اس لئے کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مہک کو پسند نہیں فرمایا کرتے تھے۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مہندی کی بو طبعی طور پر پسند نہیں تھی اس لئے میں اسے پسند نہیں کرتی لیکن ویسے اس کے لگانے میں کوئی شرعی حرج نہیں ہے۔

(٤٦)-----وعن عائشةَ، أنَّ هندا بنت عتبة قالت: يا نبيَّ الله! بايعني فقال: لا أبايعك حتى تغيري كفَّيكِ، فكأنهما كفَّا سَبُعٍ۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ...... حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہندہ بنت عتبہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا نبی اللہ! مجھے بیعت کیجئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس وقت تک بیعت نہیں کروں گا جب تک کہ تم اپنے ہاتھوں کی رنگت تبدیل نہ کرلو (یعنی مہندی وغیرہ اور خضاب ہاتھوں پر نہ لگالو) یہ ہاتھ ایسے ہیں جیسا کہ درندے کے ہاتھ ہوں۔

عورت کو مہندی لگانے کا حکم:-

فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کے ہاتھ ذرا سخت قسم کے ہوں، مردانہ قسم کے ہوں یہ اچھی بات نہیں ہے اگر تو فطری طور پر ہاتھ ایسے ہوں کہ ان میں نسوانیت نظر آرہی ہو تو پھر اور بات ہے پھر بھی عورت کے لئے مستحسن ہے کہ وہ ہاتھوں پر اور ناخنوں پر مہندی وغیرہ لگاتی رہے اس لئے کہ عورت کے لئے تزیین پسندیدہ ہے اور خاص طور پر اس کے ہاتھ بھاری اور سخت قسم کے ہوں، مردانہ قسم کے ہوں تو پھر اس کے لئے اس بات کی زیادہ اہمیت ہے کہ وہ ہاتھوں پر مہندی لگالے تاکہ مردوں کے ساتھ یہ غیر اختیاری مشابہت بھی باقی نہ رہے اگرچہ مردوں کے ساتھ اس کی یہ مشابہت غیر اختیاری ہے لیکن یہ بھی اگر ختم ہو جائے تو اچھی بات ہے اس لئے بہت ساری حدیثیں ہیں جن میں حضور اقدس ﷺ نے عورتوں کو اہتمام کے ساتھ یہ فرمایا کہ مہندی لگاؤ اور یہاں بھی یہی فرمایا بلکہ بیعت کرنے کو مہندی لگانے پر معلق فرمایا کہ پہلے یہ کام کرو پھر بیعت کروں گا۔

عورت کو ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا جائز نہیں:-

یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا تھا اس لئے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث آتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کو کبھی ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہیں فرمایا بلکہ زبانی بیعت فرمایا کرتے تھے یعنی زبانی اس سے عہد لے لیا کرتے تھے یہی بس بیعت ہوتی تھی اگرچہ مسئلہ کے اعتبار سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شاید ہاتھ میں ہاتھ لینا بھی جائز ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ امت کی عورتوں کے ساتھ باپ اور بیٹی

جیسا ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اگر امت کی مائیں ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سے امت کے باپ ہو گئے اور دوسرا یہ کہ ہاتھ اپنی ذات کے اعتبار سے ستر میں داخل نہیں ہے یہ ان اعضاء میں سے ہیں جو بذاتہٖ ستر مین داخل نہیں ہیں بلکہ ان کو چھپانا اگر ضروری ہو گا تو خوف فتنہ کی وجہ سے اس لئے بذاتہٖ ہاتھوں کو غیر محرم کے سامنے ظاہر کرنا جائز ہے اگر خوف فتنہ نہ ہو اور فقہاء نے شریعت کا یہ اصول لکھا ہے کہ جس چیز کو دیکھنا جائز ہے اس کا مس یعنی ہاتھ لگانا بھی جائز ہے بشرطیکہ خوف فتنہ نہ ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جیسے ہاتھوں کو دیکھنا جائز تھا اسی طرح چھونا بھی جائز ہو گا اس لئے کہ امتیوں میں تو خوف فتنہ ہے کہ جب ہاتھوں میں ہاتھ لیں گے تو برا خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو بہر حال فتنے سے محفوظ اور مامون تھے اس لئے آپ کے لئے ہاتھ میں ہاتھ لینا بظاہر جائز تھا لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ میں یہ احتیاط فرمائی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی عورت کو ہاتھ میں ہاتھ ۔ لے کر بیعت نہیں فرمایا بلکہ زبانی بیعت فرمایا کرتے تھے تو یہاں پر بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ اپنے ہاتھوں کو خضاب کر لو یعنی مہندی وغیرہ لگا لو پھر بیعت کروں گا تو یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا تھا بلکہ یہ بیعت کی ایک شرط لگائی مثلاً فرض کیجئے ایک آدمی کی ڈاڑھی نہیں ہے وہ کسی شیخ کے پاس مرید ہونے کے لئے گیا انہوں نے کہا کہ پہلے ڈاڑھی رکھو پھر بیعت کروں گا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ڈاڑھی پکڑ کر بیعت کرنی ہے اسی طرح یہاں پر ہاتھوں کو خضاب لگانے کا یہ حکم دیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر بیعت کرنی ہے۔ کوئی آدمی بیعت ہونے کے لئے گیا اور وہ ننگے سر تھا تو شیخ نے کہہ دیا کہ سر پر کوئی ٹوپی وغیرہ لے کر آؤ پھر بیعت کروں گا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سر کو پکڑ کر بیعت کرنی ہے ایک آدمی بیعت ہونے کے لئے گیا اس نے کانوں کے اندر بالی سی پہن رکھی تھی جسے بعض مرد بھی پہن لیتے ہیں تو شیخ نے کہا کہ پہلے یہ اتار کر آؤ پھر بیعت کروں گا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کانوں کو پکڑ کر بیعت کرنی ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاتھوں پر مہندی لگاؤ پھر بیعت کروں گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھوں کو پکڑ کر بیعت کرنی ہے۔

(٤٧)----- وعنها، قالت: أومتِ امرأةٌ من وراءِ سترٍ، بيدِها كتابٌ إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقبض النبى صلى الله عليه وسلم يدَه فقال: ما أدرى أيدُ رجلٍ أم يدُ امرأةٍ؟

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک

عورت نے پردے کے پیچھے سے اپنے ہاتھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھایا اس حال میں کہ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا اس نے کہا نہیں بلکہ عورت کا ہاتھ ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو عورت ہوتی تو اپنے ناخنوں کا رنگ بدل لیتی۔ (یعنی مہندی وغیرہ کے ساتھ)

یعنی عورت ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ ہاتھوں پر یا کم از کم ناخنوں پر مہندی وغیرہ لگا لیتی تا کہ تمہارے ہاتھ مردانہ قسم کے نظر نہ آتے۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کا ہاتھ پکڑا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کا ہاتھ ہے بلکہ آپ نے سمجھا کہ شاید کسی مرد کا ہاتھ ہے اور بعض شارحین فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ننگا نہ ہو بلکہ اس پر کپڑا وغیرہ ہو اس لئے کہ اس زمانے میں بکثرت رواج تھا کہ آستین لمبی ہوتی تھی اور ہاتھ کے اوپر بھی آجاتی تھی تو ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر آستین ہو تو آپ نے اس عورت کے ہاتھ کو پکڑا تو ہے لیکن حائل کے ساتھ بغیر حائل کے نہیں پکڑا اور تیسری بات یہ ہے کہ ہاتھ پکڑنے میں حضور اقدس ﷺ کا اور باقی امت کا فرق ہے اس لئے بالفرض یہ ثابت ہو جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کو عورت سمجھتے ہوئے اس کا ہاتھ بغیر حائل کے پکڑا ہے تو بھی دوسروں کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اس کی وجہ سے امت کے لئے اجنبی عورت کے ساتھ مصافحہ کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی، امت کے لئے یہی حکم ہے کہ اجنبی عورت کے ساتھ مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے اور پھر یہاں ہاتھ پکڑنے کی بات ہے بیعت کرنے کی بالکل بات نہیں ہے۔ بیعت کے بارے میں حضور اقدس ﷺ عمل وہی ہے کہ آپ عورتوں کو زبانی بیعت فرمایا کرتے تھے ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہیں فرماتے تھے۔

(۴۸)----وعن ابنِ عبَّاسٍ، قال: لُعِنتِ الواصلَةُ والمستوصِلةُ، والنَّامصة والمتنمِّصة، والواشمة، والمستوشمة من غيرِ داءٍ۔ (رواه أبو داود)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لعنت کی گئی ہے سر کے بالوں میں بال ملانے والی اور ملوانے والی پر اور چہرہ کے بال اکھیڑنے والی اور اکھڑوانے والی پر اور بدن گودنے والی پر اور گدوانے والی پر جب کہ یہ کام بغیر بیماری کے کئے جائیں۔

مطلب یہ کہ اگر عذر کی وجہ سے وشم وغیرہ کی بدن گودنے کی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴۹)----وعن أبی هریرةَ، قال: لعنَ رسول الله صلی الله علیه وسلم الرجلَ یَلبَسُ لِبسةَ المرأةِ، والمرأةَ تلبسُ لِبسةَ الرجلِ۔ (رواه أبوداود)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرد پر لعنت فرمائی جو کہ عورتوں جیسا لباس پہنے اور ایسی عورت پر لعنت فرمائی جو مردوں جیسا لباس پہنے۔

(۵۰)----- وعن ابنِ أبی ملیکةَ، قال: قیلَ لعائشةَ: أنَّ امراةً تلبسُ النَّعلَ قالت: لعنَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم الرَّجُلةَ منَ النساءِ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ......ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ذکر کیا گیا کہ ایک عورت جوتے پہنتی ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں جیسا بننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس جوتے کی بات ہو رہی ہے وہ ایسا جوتا ہوگا جو اس زمانے میں مردوں کے ساتھ خاص سمجھا جاتا ہوگا تو جب کسی عورت نے وہ جوتا پہنا تو وہ تشبہ بالرجل ہو گیا۔

(۵۱)------وعن ثوبان، قال: کانَ رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا سافرَ، کان آخرُ عهدِه بإنسانٍ من أهله فاطمةَ، وأوَّل من یدخلُ علیها فاطمةَ، فقدم من غَزاةٍ وقد علَّقت مسحاً أوستراً علی بابها، وحلَّتِ الحسنَ والحسینَ قلبَینِ من فِضَّةٍ، فقدم فلم یدخل، فظنَّت أنَّ مامنعَه أن یدخلَ مارأی، فهتکتِ السترَ، وفکَّتِ القُلبَینِ عن الصَّبیَّینِ، وقطعته منهما، فانطلقا إلٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم یبکِیان، فأخذَه منهما فقال: یا ثوبان! اذهب بهذا إلی فلان، إن هؤلاءِ أهلی أکره أن یأکلوا طیباتهم فی حیاتهم الدنیا یاثوبان! اشترِ لفاطمةَ قِلادةً من عَصب وسوارَین من عاجٍ۔ (رواه أحمد وأبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر تشریف لے جاتے تو جس انسان کے ساتھ آپ کی آخری ملاقات ہوتی تھی آپ کے گھر والوں میں سے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوتی تھیں اور سب سے پہلے جس سے ملنے کے لئے جاتے تھے وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوتی تھیں تو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوے سے واپس تشریف لائے ایسی حالت میں کہ حضرت فاطمہ نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا اور حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو چاندی کے دو کنگن پہنا رکھے تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے لیکن گھر میں داخل نہیں ہوئے تو حضرت فاطمہ سمجھ گئیں کہ جس چیز نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو داخل ہونے سے روکا ہے یہ وہی چیز ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھی ہے (یعنی پردہ وغیرہ) چنانچہ حضرت فاطمہ نے اس پردہ کو چاک کر دیا اور یہ دو کنگن ان دو بچوں سے اتار دیئے اور ان کو ان سے کاٹ کر الگ کر دیا تو یہ دونوں بچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے ہوئے گئے (کہ امی نے ہمارے کنگن توڑ دیئے ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چاندی کو ان کے ہاتھوں سے لیا اور فرمایا کہ اے ثوبان اس کو بنو فلاں کے پاس لے جاؤ (یعنی ان کو دے آؤ) اس لئے کہ یہ میرے گھر والے ہیں اور میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ یہ اپنی پسندیدہ چیزیں اپنی دنیا ہی میں استعمال کرلیں۔ اے ثوبان! فاطمہ کے لئے عصب کا ایک ہار خرید لاؤ اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لو۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تو معمول بیان کیا جارہا ہے کہ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ سے مل کر جاتے اور جب سفر سے واپسی ہوتی تو سب سے پہلے جس کو ملنے کے لئے جاتے وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوتیں اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہ کے ساتھ کتنا قلبی لگاؤ تھا لیکن اس قلبی لگاؤ کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت فاطمہ کی تربیت کی طرف توجہ نہ فرماتے یا ان کے ہاں کوئی نامناسب بات دیکھیں اور اس پر تنبیہ نہ فرمائیں بلکہ تنبیہ دوسروں سے بھی زیادہ ہوتی۔

حضرت فاطمہ نے دو کام کئے، پہلا کام یہ کہ گھر کے دروازے پر پردہ لٹکایا ہوا تھا اور دوسرا یہ کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو چاندی کے کنگن پہنائے ہوئے تھے اور چاندی پہننا مردوں کے لئے ناجائز ہے اور جو چیز مردوں کے لئے ناجائز ہے وہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بچوں کے لئے بھی ناجائز ہے اس لئے چاندی پہننے پر اور چاندی کے کنگن پہننے پر اظہار ناراضگی کی وجہ بہت واضح ہے لیکن پردے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں ناپسند فرمایا اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس پردے پر کسی جاندار چیز کی تصویر ہوگی اور اس طرح کا معاملہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ بھی پیش آیا ہے جیسا کہ آگے باب التصاویر میں آئے گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی تصویروں والا پردہ لٹکایا

ہوا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل نہیں ہوئے تو ہو سکتا ہے کہ یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس پردہ پر تصویریں نہیں تھی یعنی جاندار چیز کی تصویریں نہیں تھیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زینت کو اور غیر ضروری زینت کو خلاف زہد سمجھا ہے، یہ پردہ اگرچہ جائز تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے اہل بیت کی شان کے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کو زینت میں اور دنیا میں انہاک نہیں اختیار کرنا چاہئے اور یہ دوسری وجہ زیادہ واضح اور قوی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إن هؤلاء أهلي أكره أن يأكلوا طيباتهم في حيوتهم الدنيا** ۔ کہ چونکہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان کے ساتھ مجھے محبت ہے اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ اپنی پسندیدہ چیزیں دنیا ہی میں استعمال کرلیں، ساری نعمتیں دنیا ہی میں استعمال کرلیں اور آخرت میں ان کو کچھ بھی نہ ملے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ دنیا میں یہ مجاہدہ کریں اور بہت سی نعمتوں کے استعمال سے بھی بچیں جو دوسروں کے لئے جائز اور مباح ہیں تاکہ اس کا اجرانہیں آخرت میں ملے تو پردے پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ناراضگی فرمایا ہے اس کے خلاف زہد ہونے کی وجہ سے تو ایک طرف تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہ کے ساتھ اتنی محبت کہ سب سے آخر میں ان سے مل کر جاتے ہیں اور واپسی پر سب سے پہلے ان سے ملنے کے لئے آتے ہیں لیکن دوسری طرف تنبیہات میں اتنی باریک بینی کہ ایک چیز جو جائز تھی لیکن خلاف زہد تھی اس پر بھی اظہار ناراضگی فرمایا۔

یہاں حضرت فاطمہ کا جذبۂ اطاعت بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ ایک اندازہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وجہ سے واپس گئے ہیں انہوں نے صراحتاً تو نہیں فرمایا کہ اس پردے کی وجہ سے واپس گیا ہوں یا ان کنگنوں کی وجہ سے گیا ہوں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ بھی سکتی تھیں لیکن پوچھنے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ میرے اندازے کے مطابق جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار گزر سکتی ہے پہلے اس کو ختم کر دیا جائے پھر بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناگواری برقرار رہی تو پوچھیں گے کہ آپ کس وجہ سے ناراض ہوئے ہیں اس لئے اس پردے کو اتار کر چاک کر دیا اور ان دو بچوں نے جو کنگن پہنے ہوئے تھے ان کو بھی توڑ کر الگ کر دیا اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود بتانے بھی نہیں گئیں کہ میں نے یہ کر لیا ہے لیکن بچے بہرحال بچے تھے جب ان کے یہ کنگن اس طریقے سے اتارے گئے تو یہ ٹوٹے ہوئے کنگن لے کر روتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے اپنی امی کی شکایت لگانے کے لئے تو اس طریقے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثوبان کو جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم اور آزاد کردہ غلام

تھے ان کو دو کاموں کا حکم دیا ایک تو یہ فرمایا کہ یہ جو چاندی ہے اس کو بنو فلاں کو دے آؤ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس لے جانے کا مقصد ان پر صدقہ کرنا ہوگا یہ چیز تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تھی لیکن اس کا صدقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک تو یہ یقین ہوگا کہ میں فاطمہ کی طرف سے بھی صدقہ کر دوں گا تو وہ اس کی اجازت دے دے گی اور دوسرا یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا کوئی معاوضہ حضرت فاطمہ کو دے دیا ہوگا اور صدقہ اس لئے کیا کہ ایک تو تنبیہ اچھے طریقے سے ہو جائے اور دوبارہ اس طرح کے کام کی طرف ذہن جائے ہی نہ اور دوسرے چاندی کے یہ کنگن لڑکوں کو پہنانے کی وجہ سے جو گناہ ہوا ہے اس کا اثر بالکل زائل ہو جائے اور اس کا کفارہ ہو جائے، دوسرا کام یہ کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثوبان سے یہ کہا کہ فاطمہ کے لئے عصب کا ایک ہار خرید لاؤ اور ہاتھی کے دانت کے دو کنگن لاؤ، ہار تو بظاہر حضرت فاطمہ کے لئے ہی ہے اور دو کنگن ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ کے لئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے ہوں۔ یہاں دو لفظ قابل تشریح ہیں ایک تو یہ فرمایا کہ فاطمہ کے لئے عصب کا ہار خرید لاؤ، عصب کا معنی کیا ہے؟

عصب کا معنی:-

عصب کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں ایک معنی عصب کا یہ ہے کہ یہ یمن کا ایک خاص قسم کا کپڑا ہوتا تھا اور اس کپڑے کے گولے بنا کر اس سے ہار بناتے تھے اور عصب ایسے کپڑے کو بھی کہتے ہیں جس میں دھاریاں ہوں یعنی مختلف رنگوں کی دھاریاں ہوں، اصل میں ایسا کرتے تھے کہ کپڑے کو باندھ کر رنگا جاتا تھا کہ کچھ حصہ باندھ لیتے تھے اور اس کو رنگ میں ڈال دیتے تھے تو جو حصہ بندھا ہوا تھا اس پر رنگ نہیں چڑھتا تھا اور جو بندھا ہوا نہیں ہوتا تھا اس پر رنگ چڑھ جاتا تھا، پھر دوسرا حصہ باندھ لیتے تھے اور اس کو دوسرے رنگ میں ڈالتے تھے اور پھر تیسرا حصہ کھلا رکھ کر باقی کپڑے کو باندھ کر تیسرے رنگ میں ڈال دیتے تھے اس طریقہ سے ایک ہی کپڑے میں مختلف رنگوں کی دھاریاں آجاتی تھیں اور شاید آپ نے دیکھا ہو آج کل بھی کپڑوں کو اس طریقہ سے رنگا جاتا ہے تو اس طرح کے کپڑے کو بھی عصب کہا جاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں کپڑے کے اس طرح کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر ان کا ہار بنا لیا جاتا ہو۔

بعض نے عصب کا دوسرا معنی پٹھے بیان کیا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ جانوروں کے پٹھوں میں کوئی تصرف اور تبدیلی کر کے ان سے اس زمانے میں ہار بنائے جاتے ہوں جو جانور مذبوح ہو اس کے بارے میں تو

اتفاق ہے کہ کہ اس کے پٹھے پاک ہوتے ہیں البتہ مردار کے پٹھوں کے بارے میں اختلاف ہے خود حنفیہ کی روایتیں بھی مختلف ہیں ایک روایت اس کے پاک ہونے کی ہے اور ایک ناپاک ہونے کی ہے۔

بعض نے عصب کا تیسرا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یہ ایک دریائی جانور کی خوب صورت اور چمک دار ہڈی ہوتی تھی اس کو کاٹ کر اس سے زیورات وغیرہ اور ہار وغیرہ بنائے جاتے تھے تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال ان معانی میں سے کوئی معنی بھی یہاں مراد لیا جاسکتا ہے۔

دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سَوارَیْنِ من عاج" فرمایا کہ عاج کے دو کنگن خرید لاؤ، عاج کسے کہتے ہیں؟ تو عاج کا معروف معنی ہاتھی دانت ہے البتہ بعض حضرات نے عاج کا معنی دریائی یا سمندری کچھوے کی ہڈی بیان کی ہے لیکن اہل لغت کے ہاں یہ معنی اتنا معروف نہیں ہے، معروف معنی پہلا ہی ہے یعنی ہاتھی دانت اگر تو یہ کسی دریائی جانور کی ہڈی ہو تو پھر تو اس کے پاک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے اس لئے کہ شافعیہ وغیرہ کے نزدیک تو اکثر یا سارے کے سارے دریائی جانور حلال ہیں اور جب حلال ہیں تو وہ بطریق اولیٰ پاک بھی ہوں گے اور حنفیہ کے نزدیک اگرچہ مچھلی کے علاوہ باقی دریائی جانور حلال نہیں ہیں لیکن پاک سارے کے سارے ہوتے ہیں اور ان کے سارے اجزاء پاک ہوتے ہیں اس لئے ان کی ہڈی بھی پاک ہو گی لیکن اگر عاج کا معروف معنی یعنی ہاتھی دانت کو مراد لیا جائے تو ہاتھی بذات خود ایک حرام جانور ہے اور بظاہر جن علاقوں سے ہاتھی کے دانت آتے تھے وہ کافروں کے علاقے تھے اس لئے ان کے ذبیحہ کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے یہ میتہ کے دانت یا میتہ کی ہڈی تھی اور شافعیہ کے نزدیک مردار کی ہڈی ناپاک ہے اس ان کے مذہب کے مطابق اشکال ہو گا کہ ہاتھی کے دانت یا ہاتھی کی ہڈی کے کنگن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے حکم دیا لیکن حنفیہ کے مذہب پر کوئی اشکال نہیں اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک مردار کے وہ اجزاء جن میں خون نہیں ہوتا وہ پاک ہیں جیسے بال، دانت وغیرہ انہیں کے اندر ہڈی بھی داخل ہے اس کی ہڈی پاک ہے لہٰذا اگر یہ ہاتھی مردار بھی ہو تو اس کا دانت اور اس کی ہڈی پاک ہے، اس لئے حنفیہ کے مذہب کے مطابق کوئی اشکال کی بات نہیں ہے البتہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک روایت ہے کہ ہاتھی نجس العین ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ہڈی اور دانت وغیرہ ناپاک ہوں جیسا کہ خنزیر کے سارے اجزاء ناپاک ہوتے ہیں لیکن بہر حال شیخین کے مذہب کے مطابق یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مذہب کے مطابق کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ حدیث شیخین کی دلیل ہے۔

یہاں اس حدیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتدال بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ ہر پہلو کی آپ نے رعایت رکھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی آل اولاد کی محبت میں ہر جائز ناجائز مناسب غیر مناسب

چیز کو برداشت کر لیتا ہے اور کسی بات پر تنبیہ نہیں کرتا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انداز بھی اختیار نہیں فرمایا بلکہ باریک بینی کے ساتھ تنبیہ کی، ایسی بات پر بھی تنبیہ فرمائی جو صرف خلاف زہد تھی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے متعلقین اہل اولاد کی تربیت اور تنبیہ کرنے پر آتا ہے تو سارا زور ان کو رگڑنے پر ہی لگا دیتا ہے اور ان کے جذبات کی رعایت اور ان کے دل کو خوش کرنے کی کوئی فکر نہیں ہوتی بعض اوقات آدمی دوسری طرف نکل جاتا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بھی نہیں کیا، پردہ چاک کرنا پڑا اور کنگن اتارنے پڑے اس کی وجہ سے انہیں بہر حال طبعی تکلیف ہوئی ہو گی بچوں کو بہر حال ہوتی ہی ہے وہ روتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی طبعی گرانی ضرور ہوئی ہو گی اس لئے کہ بڑے شوق سے یہ کام کئے تھے اور بظاہر لگتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لئے ہی کئے ہوں یہ جو طبعی گرانی ہوئی اس کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تدارک بھی فرمایا کہ فاطمہ کے لئے تو ہار منگوایا اور ان بچوں کے لئے ہاتھی دانت کے کنگن منگوائے تاکہ کسی درجہ میں ان کا دل خوش ہو جائے۔

(۵۲)----- وعن ابنِ عبَّاسٍ، أنَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اکتحِلوا بالإثمِدِ، فإنه یجلو البصرَ، ویُنبتُ الشَّعر وزعمَ أنَّ النبیَّ ﷺ کانت له مُکحلة یکتحلُ بها کلَّ لیلةٍ، ثلاثة فی هذه وثلاثة فی هذه۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اثمد سرمہ لگایا کرو اس لئے کہ یہ بینائی کو تیز کرتا ہے اور ابرو کے بالوں کو اگاتا ہے یا آنکھوں کے بالوں کو اگاتا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ بھی گمان کیا یعنی یہ بھی نقل فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ ﷺ ہر رات سرمہ لگایا کرتے تھے تین سلائیاں اس آنکھ میں اور تین سلائیاں اس آنکھ میں۔

سرمہ لگانے کی سنت

سرمہ لگانا حضور اقدس ﷺ کی سنن عادیہ میں سے ہے آپ رات کے وقت اکثر وبیشتر آنکھوں میں سرمہ لگایا کرتے تھے سرمے کی بے شمار اقسام ہیں ان میں سے حضور اقدس ﷺ نے اثمد سرمہ کی ترغیب دی ہے اثمد کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے ہمزے اور میم کے کسرہ کے ساتھ إثمِد اور دوسرا ہمزہ اور میم دونوں کا فتح أثمَد اور بھی اس کے مختلف ضبط ہیں لیکن سب سے معروف ضبط پہلا ہی ہے کہ ہمزہ اور میم دونوں کا کسرہ۔

اثمد کے فوائد...... اس کے دو فائدے حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمائے ایک تو یہ کہ اس سے بینائی بہتر ہوتی ہے دوسرے یہ کہ اس سے بال اگتے ہیں یعنی آنکھوں کے بال اگتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا **إکتحلوا بالأثمد** امر یہ امر تشریعی نہیں بلکہ ارشادی ہے [1] یعنی ایک دنیاوی فائدے کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اثمد لگانے کا حکم دیا ہے اس وجہ سے حکم نہیں دیا کہ یہ مسئلہ شرعیہ ہے یا آخرت میں اس پر کوئی اجر وثواب ہے لیکن بہر حال حضور اقدس ﷺ نے فرمادیا کہ اثمد لگاؤ تو اس کا امتثال کرنا اس پر عمل کرنا یہ خیر و برکت سے خالی نہیں ہے اور جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی وجہ سے اس حکم کی تعمیل کرے گا تو اس پر آخرت میں بھی اجر وثواب کی امید ہے۔

اثمد سرمہ خاص قسم کا سرمہ ہوتا ہے یہ عرب میں بھی پایا جاتا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر اصفہان کے علاقے میں پایا جاتا تھا اور وہاں سے لایا جاتا تھا اس کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ کالا نہیں ہوتا عام سرمے تو کالے ہوتے ہیں یہ براؤن سے رنگ کا ہوتا ہے کسی قدر سرخی مائل ہوتا ہے البتہ سننے میں آیا ہے خود تجربہ نہیں کیا کہ لگانے کے بعد یہ کالا ہو جاتا ہے۔ "واللہ اعلم" باقی سرموں کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب نہیں دی، ترغیب صرف اثمد سرمہ کی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کون سا سرمہ لگاتے تھے اس کی اگرچہ کہیں وضاحت نہیں ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اثمد سرمے ہی کا زیادہ اہتمام فرماتے ہوں گے اگر یہ مل سکتا ہو تو یہی استعمال فرماتے ہوں گے، بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اثمد مروّح لگایا کرتے تھے، مروّح ایسے سرمے کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی خوشبو لگائی گئی ہو اور عموماً سرمے میں کستوری ملائی جاتی تھی اس کو پیستے وقت اس میں کستوری شامل کی جاتی تھی تو کستوری والا اثمد بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سرمہ کیسے لگاتے تھے اس میں دو باتیں بہت واضح ہیں ایک تو یہ کہ آپ دائیں جانب سے شروع فرماتے ہوں گے پہلے دائیں آنکھ میں ڈالتے ہوں گے اس لئے کہ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ دائیں کو مقدم کیا کرتے تھے اور اس کو ترجیح دیا کرتے تھے، دوسرا یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سرمہ لگانے میں طاق عدد کی رعایت کرتے تھے بلکہ بعض روایتوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قولی امر بھی آتا ہے کہ جب سرمہ لگاؤ تو طاق عدد میں لگاؤ البتہ یہ معلوم نہیں کہ اس روایت کی سند کیسی ہے تو بہر حال سرمہ لگانے میں إیتار کی یعنی طاق عدد کی رعایت رکھنی چاہئے، اب طاق عدد کی رعایت

(۱) امر ارشادی کی کچھ وضاحت کتاب الاطعمہ کی تمہیدی بحثوں میں آگئی ہے۔

کرنے کے دو طریقے ممکن ہیں اور دونوں ہی شارحین حدیث نے لکھے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر آنکھ میں الگ الگ طاق عدد کی رعایت ہو یعنی مثلاً تین مرتبہ دائیں آنکھ میں اور تین سلائیاں بائیں آنکھ میں اس صورت میں مجموعہ طاق نہیں بنے گا کیونکہ مجموعہ چھ سلائیاں بنیں گی البتہ ہر آنکھ میں الگ الگ طاق عدد کی رعایت ہے اور دوسرا طریقہ یہ ممکن ہے کہ ہر آنکھ میں الگ الگ طاق عدد رکھنے کی بجائے مجموعہ میں طاق عدد کی رعایت کی جائے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں آنکھ میں دو سلائیاں ڈالیں پھر بائیں آنکھ میں دو سلائیاں ڈالے اور پھر ایک سلائی دائیں آنکھ میں ڈالے کل پانچ سلائیاں ہوئیں تو مجموعہ میں طاق عدد کی رعایت ہے اور اس میں دائیں طرف کی ترجیح بھی کئی اعتبار سے ہے ایک تو یہ کہ شروع دائیں آنکھ سے کیا دوسرا یہ کہ ختم دائیں آنکھ پر کیا اور تیسرا یہ کہ دائیں آنکھ میں زیادہ سلائیاں ڈالیں کیونکہ دائیں آنکھ میں تین بنیں گی اور بائیں آنکھ میں دو بنیں گی اور چوتھا یہ کہ جہاں بحیثیت مجموعی طاق عدد کی رعایت ہوئی وہاں دائیں آنکھ میں بھی طاق عدد کی رعایت ہو گئی بائیں میں طاق کی رعایت نہیں ہوئی کیونکہ اس میں دو سلائیاں ڈالی گئیں ہیں البتہ دائیں میں طاق کی رعایت ہے اس لئے کہ اس میں کل تین بنتی ہیں تو کئی اعتبار سے دائیں کو ترجیح ہو جائے گی تو طاق عدد کی رعایت کے دونوں ہی طریقے ممکن ہیں اور شارحین حدیث نے دونوں ہی لکھے ہیں لیکن پہلا طریقہ زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر روایات میں وہ صراحتاً مذکور ہے مثلاً ہمارے سامنے جو حدیث ہے اس میں بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ثَلَاثَةٌ فِی هٰذِهٖ وَ ثَلَاثَةٌ فِی هٰذِهٖ۔ ہر آنکھ میں تین تین سلائیاں ڈالتے تھے اور اس سے اگلی حدیث میں بھی آرہا ہے کہ ثلاثًا فی کل عین کہ ہر آنکھ میں تین تین سلائیاں ڈالتے تھے اس لئے پہلا طریقہ راجح ہے۔

مرد کا زینت کے لئے سرمہ لگانا:۔

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت سرمہ لگایا ہے لیکن آپ رات کے وقت سرمہ لگاتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو لگا رہتا ہوگا اور صبح کے وقت اٹھ کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے ہوں گے تو وہ سرمہ دھل جاتا ہوگا اس پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا مرد کے لئے زینت کی نیت سے سرمہ لگانا جائز ہے؟ آنکھوں کی حفاظت اور علاج کی نیت سے لگانا جائز ہے اور عورت کا زینت کے لئے سرمہ لگانا بھی بظاہر جائز ہے لیکن مرد کا زینت کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے یا نہیں تو بعض حضرات نے کہا ہے کہ مرد کا زینت کے لئے لگانا جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ خلقت کے اندر صنعت کو داخل کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں اور طرح کی بنائیں لیکن یہ مصنوعی طریقے سے ان کی اور رنگت بنا رہا

ہے تو خلقت کے اندر صنعت کو داخل کرنا ہے اور ایسا کام محض زینت کے لئے جائز نہیں ہوتا اس لئے بعض حضرات نے یہ کہا کہ مرد کے لئے زینت کی نیت سے سرمہ لگانا جائز نہیں ہے لیکن راجح یہی ہے کہ جائز ہے اس لئے کہ جب سرمہ لگانے کا جواز بلکہ اس کی ترغیب ثابت ہوگئی تو اب محض زینت کی نیت سے وہ ناجائز نہیں ہو جائے گا کیونکہ فعل بھی جائز اور جس چیز کی نیت کی جارہی ہے وہ بھی کوئی ناجائز نہیں اس لئے کہ زینت بالکل کوئی امر ممنوع نہیں ہے اس لئے راجح یہی ہے کہ یہ جائز ہے باقی خلقت کے اندر صنعت کو داخل کرنے والی بات اس صورت میں بنتی ہے جب کہ یہ تبدیلی پائیدار ہو اور یہاں تو عارضی سی تبدیلی ہوتی ہے اس لئے صحیح یہی ہے کہ زینت کی نیت سے سرمہ لگانا جائز ہے البتہ اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ جو طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہ اختیار کرے کہ رات کے وقت لگالے اور صبح کو ظاہر ہے جب وضو وغیرہ کرے گا تو دھل بھی جائے گا اور اس کا کچھ اثر باقی بھی رہے گا۔

سرمہ اور جدید میڈیکل سائنس:۔

یہاں پر ایک بات یہ ہے کہ احادیث میں سرمے کا ذکر آرہا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لگایا بھی کرتے تھے اور آپ نے اسے مفید بھی قرار دیا لیکن جدید میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ سرمہ آنکھوں کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے اور بہت سارے دین دار آنکھوں کے ماہر ڈاکٹروں کو بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ سرمہ لگانے سے منع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس سے آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیزابیت پیدا ہوتی ہے اور وہ آنکھوں کو نقصان پہنچاتی ہے تو اب کیا کرنا چاہئے ایک تو یہ کہ عمل کیا ہو اور دوسرا یہ کہ آیا ان اُطباء کے قول میں اور حدیث میں کوئی تطبیق ممکن ہے یا نہیں تو اس میں کئی نقطہ نظر ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ سرمہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور آپ نے اس کی ترغیب بھی دی ہے اس لئے محض ان ڈاکٹروں کے کہنے کی وجہ سے اس سنت کو چھوڑا نہیں جا سکتا ان کی تحقیقات تو بدلتی رہتی ہیں آج اگر یہ مضر قرار دے رہے ہیں تو کل کو ہو سکتا ہے کہ مفید قرار دے دیں چنانچہ قدیم اُطباء مفید ہی قرار دیتے چلے آئے ہیں ظاہر ہے انہوں نے بھی تجربات ہی کی بنیاد پر یہ کہا ہوگا، چنانچہ ایک فائدہ تو بہت سارے اُطباء نے بیان کیا کہ اس سے آنکھیں صاف ہو جاتی ہیں آنکھوں کی میل وغیرہ جو نامناسب چیزیں ہوتی ہیں وہ سرمے کی وجہ سے ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور جب آدمی آنکھیں وغیرہ صاف کرتا ہے تو وہ ساری کی ساری نکل جاتی ہے اس لئے اس میں چونکہ افادیت کے پہلو بھی ہیں تو جدید ماہرین کی نظر صرف نقصان پر گئی ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر فائدہ پر نہ گئی ہو۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ اصل میں زمانے زمانے سے فرق پڑ سکتا ہے علاقے علاقے میں فرق

پڑ سکتا ہے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اگرچہ افادیت کے پہلو ہوتے ہیں لیکن ان کو برداشت کرنے کے لئے ذرا قوت برداشت کی ضرورت ہوتی ہے بعض کے اندر وہ ہوتی ہے بعض میں نہیں ہوتی جن کے اندر قوت برداشت ہو ان کے لئے وہ چیز مفید ہو گی اور جن میں قوت برداشت نہ ہو ان کے لئے وہ چیز مفید نہیں ہو گی مثلاً ایسی خوراک یا ایسی دوائی جس میں وافر مقدار میں فولاد ہو یہ انسان کی صحت کے لئے مفید ہے اس لئے کہ فولاد خون کا اہم جزو ہوتا ہے اور انسان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے اگرچہ عام روزمرہ کی خوراک میں بھی کچھ نہ کچھ فولاد شامل ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس سے ضرورت پوری نہیں ہوتی لیکن اس طرح کی غذا یا دوائی جس میں وافر مقدار میں فولاد ہو ہر ایک کا معدہ برداشت نہیں کرتا بعض کو ہضم ہو جاتی ہے اور بعض کو ہضم نہیں بھی ہوتی تو چیز میں افادیت ہے لیکن اس افادیت سے متمتع ہونے کے لئے قوت برداشت کی ضرورت ہے تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ سرمے میں افادیت کے پہلو ہوں لیکن اس کے لئے قوت برداشت کی ضرورت ہو اور بعض لوگوں کے اندر یہ پائی جاتی ہو اور بعض کے اندر نہ پائی جاتی ہو ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لوگوں کی آنکھوں کے اندر قوت برداشت زیادہ ہوتی ہو ان کی آنکھیں اس تیزابیت کو برداشت بآسانی کر لیتی ہوں اور یہ تیزابیت ان کی آنکھوں کو نقصان نہ پہنچاتی ہو اور سرمے کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہو اور آج کل جن آنکھوں پر ان ڈاکٹروں نے تجربہ کیا ہو وہ آنکھیں ایسی ہوں جن کی قوت برداشت کم ہو یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج کے دور میں خاص طور پر شہری زندگی میں آنکھوں کی قوت برداشت ویسے ہی کم ہو اس لئے کہ آج کل آلودگی بہت زیادہ ہے، ملیں ہیں، گاڑیاں دھواں چھوڑ رہی ہیں اور دوسرے پتہ نہیں آلودگی کے کیا کیا سامان ہیں اور ان کی وجہ سے آنکھوں میں پہلے ہی بہت زیادہ تیزابیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور شاید اس زمانے میں دیگر اسباب سے آنکھوں میں پیدا ہونے والی تیزابیت اتنی زیادہ نہ ہوتی ہو کیونکہ آلودگی سے پاک ماحول ہوتا تھا تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کی آنکھ اور آج کی آنکھ میں فرق ہو، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ آج اگر ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سرمہ نہ لگایا جائے تو پھر نہ لگایا جائے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہمارے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے بارے میں ہے اور تیسری بات ایک اور ہے وہ یہ کہ بعض ڈاکٹروں سے سنا ہے کہ ہماری کتابوں میں سرمے کی جو تعریف کی گئی ہے اس میں ایک قید خاص طور پر ذکر کی جاتی ہے اور وہ ہے کالا ہونا تو میڈیکل سائنس کی رو سے سرمہ ہوتا ہی وہ ہے جو کہ کالا ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب اثمد کی دی ہے اور یہ کالا نہیں ہوتا بلکہ سرخ یا بھورے رنگ کا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی تعریف کے مطابق تو یہ سرمہ ہے ہی نہیں اور جب ان کی تعریف کے مطابق یہ سرمہ نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جو تجربات کئے ہیں ان میں اثمد کو

انہوں نے شامل ہی نہیں کیا ہو ان کے تجربات عام سرموں کے بارے میں ہوں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو فرمارہے ہیں وہ اثمد کے بارے میں فرمارہے ہیں عام سرموں کی افادیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہر حال بیان نہیں فرمائی اور پھر تحقیق کے لئے جو سرمے لئے گئے ہوں گے ان میں بازاری سرمے بھی شامل ہوں گے اور بازاری سرموں میں نامعلوم کیا کچھ شامل ہوتا ہے تو ان کے مفید ہونے کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بات صرف اثمد کی کررہے ہیں اس لئے یہ بات بھی یقینی نہیں کہ جب تجربات کرکے بتایا گیا کہ سرمہ آنکھوں کے لئے مضر ہے تو ان تجربات میں اثمد کو بھی شامل کیا یا نہیں؟ بہر حال یہ مسلمان ڈاکٹروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طور پر اس موضوع پر تحقیق کریں اور اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ اثمد سرمے کے بھی کیا وہی آثار ہیں جو عام سرموں کے ہوتے ہیں یا آثار میں کوئی فرق ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کسی شخص کو بالتعیین کوئی ماہر ڈاکٹر سرمے سے منع کردے یہ کہہ کر کہ تمہاری آنکھیں اس کی متحمل نہیں ہیں تمہارے لئے یہ مضر ہے تو اس کو بہر حال بچنا چاہئے اس لئے کہ بعض چیزیں عمومی طور پر مفید ہوتے ہوئے بھی کسی خاص شخص کے لئے مفید نہیں ہوتیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اثمد سرمہ لگایا ہے اسی طرح آپ نے گوشت بھی بکثرت کھایا لیکن ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر کسی کو بطور پرہیز کے کہہ دیں کہ آپ گوشت نہ کھائیں اس لئے کہ تمہارے گردے ٹھیک نہیں ہیں یا معدہ ٹھیک نہیں ہے یا فلاں تکلیف ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوریں بھی بکثرت کھائی ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی کو کھجوروں سے کسی وجہ سے پرہیز ہو اس کے لئے مفید نہ ہوں بلکہ خود ایک موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھجوریں کھانے سے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ تمہارے لئے یہ مفید نہیں ہیں تو ایک چیز مفید ہوتے ہوئے بھی کسی خاص فرد کے لئے کسی خاص بیماری کی وجہ سے مضر ہوسکتی ہے اس کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے اس لئے ایک تو ہے ڈاکٹروں کا عمومی قول کہ سرمہ کوئی مفید چیز نہیں ہے اس پر تو بحث ہو چکی لیکن اگر بالتعیین کسی خاص شخص کو ڈاکٹر سرمے سے پرہیز بتادیں تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔

(۵۳)----- وعنه، قال: كانَ النبي صلى الله عليه وسلم يكتحلُ قبلَ أن ينامَ بالإثمدِ ثلاثاً في كل عينٍ قال: وقال: إنَّ خيرَ ما تداوَيتم به: اللَّدودُ، والسَّعوطُ، والحجامةُ، والمَشِي وخيرَ ماكتحلَم به الإثمدُ، فانَّه يجلو البصرَ، ويُنبتُ الشعرَ، وإنَّ خيرَ ما تحتجمونَ فيه يوم سبع عشرةَ، ويوم تسع عشرةَ ويوم إحدى وعشرين وإنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم حيثُ عُرِجَ

به، مامرَّ علی ملأ من الملائکة إلا قالوا: علیك بالحجامة ۔ (رواہ الترمذی وقال: هذا حدیث حسن غریب)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سونے سے پہلے اثمد سرمہ ہر آنکھ میں تین تین مرتبہ لگایا کرتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتلایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بہترین چیز جس کو تم بطور دوا کے استعمال کرو لدود اور سعوط اور پچھنے لگانا اور مسہل لینا ہے اور بہترین وہ چیز جس کو تم بطور سرمے کے استعمال کرو اثمد ہے اس لئے کہ وہ بینائی کو تیز کرتا اور بالوں کو اگاتا ہے اور بہترین دن جس میں تم پچھنے لگواؤ سترہ (۱۷) تاریخ، انیس (۱۹) تاریخ اور اکیس (۲۱) تاریخ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج کرائی گئی تو آپ کا گزر فرشتوں کی جس جماعت پر بھی ہوا انہوں نے یہ ضرور کہا کہ آپ پچھنے لگانے کا اہتمام کیجئے۔

اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علاج کرنے کے لئے تین چیزیں سب سے بہتر ہیں۔ پہلی چیز لَدود یا لُدود یعنی لام کی زبر کے ساتھ یا اس کی پیش کے ساتھ ہے، اس سے مراد خاص قسم کی دوائی ہے جو منہ کے راستے سے دی جاتی تھی اور عام طور پر منہ کی دائیں یا بائیں جانب سے دی جاتی تھی اور دوسری چیز ہے سُعوط یا سَعوط یعنی سین کے ضمے کے ساتھ یا اس کے فتح کے ساتھ اس کا معنی وہ دوائی جو ناک کے راستے سے استعمال کی جائے اور تیسری چیز حجامہ ہے حجامہ کا معنی ہوتا ہے کوئی طریقہ اختیار کر کے جسم کا کچھ خون نکال لینا اس کے کئی طریقے ہوتے تھے ایک تو خاص قسم کی سنگی ہوتی تھی جسم کے کسی حصے پر تھوڑا سا زخم کر کے کاٹ کر اوپر اس کو رکھتے تھے اور دوسری طرف سے سانس کھینچتے تھے تو اس کے اندر جسم کا خون آجاتا تھا اور یوں جسم کا ایک خاص مقدار میں خون نکل جاتا تھا یا دوسرا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جونک وغیرہ ہوتی تھیں اس طرح کے بعض حشرات الارض ہوتے تھے ان کو جسم کے بعض حصوں پر لگاتے تھے تو وہ خون چوس لیا کرتی تھیں حاصل یہ کہ کسی نہ کسی طریقے سے خون نکالا جاتا تھا یہ بھی علاج کا ایک طریقہ تھا اور چوتھی چیز ہے "المشی" مشی کا معنی مسہل لینا، جلاب لینا یعنی ایسی دوائی استعمال کرنا جس سے کچھ عرصے کے لئے اسہال آئیں اور پیٹ صاف ہو جائے یہ بھی علاج کا ایک طریقہ اطباء میں مروج رہا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بھی یہاں اس کا ذکر فرمایا ہے، علاج کے ان چار طریقوں کی تفصیل انشاء اللہ کتاب الطب والرقی میں آجائے گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر سینگھی لگوائی ہو خون نکلوانا ہو تو اس کے لئے سب سے بہتر تاریخیں تین ہیں سترہ (۱۷)، انیس (۱۹)، اکیس (۲۱) اور مراد اس سے چاند کی تاریخیں ہیں اس میں حکمت کیا ہے اور ان

تاریخوں میں سینگھی لگوانے کی حیثیت کیا ہے اس کی تفصیل بھی انشاء اللہ کتاب الطب والرقی میں آجائے گی۔

(٥٤) ----- وعن عائشةَ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نهى الرِّجالَ والنساءَ عن دخولِ الحمامات، ثمَّ رخَّصَ للرجالِ أن يدخلوا بالميازرِ ۔ (رواه الترمذى وأبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں اور عورتوں کو حمام میں داخل ہونے سے منع فرمایا بعد میں آپ نے مردوں کو یہ اجازت دے دی کہ وہ حمام میں تہہ بند کے ساتھ داخل ہو سکتے ہیں۔

(٥٥) ----- وعن أبي المَليح، قال: قدمَ على عائشةَ نسوةٌ من أهلِ حمصَ فقالت: من أينَ أنتنَّ؟ قلنَ: من الشَّامِ قالت: فلعلَّكنَّ من الكُورة التي تدخلُ نساؤُها الحمامات؟ قلنَ: بَلى قالت: فإني سمعت رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا تخلعُ امرأة ثيابها في غير بيت زوجها، إلا هتكت السترَ بينها وبين ربها وفي رواية: في غيرِ بيتِها، إلا هتكت سترها بينها وبين الله عزَّوجل۔ (رواه الترمذى وأبو داؤد)

ترجمہ ...... ابوالملیح کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حمص والوں کی کچھ عورتیں آئیں (یہ حمص شام کا ایک شہر تھا) تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ تم کہاں سے ہو؟ انہوں نے کہا کہ شام سے ہیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا شاید کہ تم اس علاقے میں سے ہو جس کی عورتیں حمام میں داخل ہوتی ہیں۔ ان عورتوں نے عرض کیا کہ بالکل ایسا ہی ہے، تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ اپنے کپڑے نہیں اتارتی مگر وہ اپنے درمیان اور اپنے رب کے درمیان پردے کو چاک کر دیتی ہے اور ایک روایت میں خاوند کے گھر کی بجائے یہ لفظ ہیں: "اپنے گھر کے علاوہ کہیں کپڑے نہیں اتارتی مگر اپنے اس پردے کو چاک کر دیتی ہے جو کہ اس کے درمیان اور اللہ عزوجل کے درمیان میں تھا۔

(٥٦) -----وعن عبد الله بن عمرو، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: ستُفتَحُ لكم أرضُ العجم، وستجدونَ فيها بيوتًا، يُقال لها:

الحماماتُ، فلا يدخلنَّها الرِجالُ إلّا بالأُزُرِ، وامنعوها النساء إلا مريضةً، أونفساءَ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے عجم کی سرزمین فتح ہوگی اور تم اس میں ایسے گھر پاؤ گے جن کو حمام کہا جاتا ہوگا تو ان میں مرد داخل نہ ہوں مگر تہہ بند کے ساتھ اور عورتوں کو ان میں جانے سے منع کرو اِلا یہ کہ وہ بیمار ہوں یا نفاس والی ہوں۔ (یعنی زچگی کے مرحلے سے گزری ہوں)

(٥٧)----- وعن جابرٍ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: مَن كانَ يؤمنُ باللهِ واليومِ الآخرِ، فلا يَدخلِ الحمّامَ بغيرِ إزارٍ ومن كانَ يؤمن بالله واليومِ الآخر، فلا يُدخِل حليلتَه الحمَّامَ ومن كانَ يؤمنُ باللهِ واليومِ الآخر، فلا يجلس على مائدةٍ تدارُ عليها الخمر۔ (رواه الترمذی والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بغیر تہبند کے حمام میں داخل نہ ہو اور جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنی بیوی کو حمام میں داخل نہ ہونے دے اور جو آدمی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دستر خوان یا کھانے کی میز پر نہ بیٹھے جس میں شراب چلائی جاتی ہو۔

آخری مسئلہ تو واضح ہی ہے کہ ایسی دعوت جس میں شراب پی اور پلائی جاتی ہو اس میں شرکت جائز نہیں ہے اگرچہ آدمی نے خود شراب نہ پئی ہو اگر خود پیتا ہے پھر تو بہت بڑا گناہ ہے ہی لیکن اگر کوئی شراب نہیں بھی پیتا تب بھی بغیر ضرورت شدیدہ کے اس طرح کی کسی دعوت میں شرکت جائز نہیں ہے۔

حمام میں داخل ہونے سے ممانعت:۔

ان چار حدیثوں میں حمام کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس زمانے میں عربوں کے ہاں تو حمامات کا خاص رواج ہی نہیں تھا اس لئے کہ عربوں کی زندگی میں اس طرح کے تکلفات ہوتے ہی نہیں تھے البتہ شام وغیرہ کے علاقے میں جو کہ رومیوں کے ماتحت تھے اور رومی تہذیب سے متاثر بھی تھے وہاں حمامات ہوتے تھے اسی طریقے سے فارس کے علاقے میں بھی حمامات ہوتے تھے، ان میں ایک تو نہانے کے لئے گرم پانی ہوتا تھا اس کے علاوہ

اور بھی کئی سہولتیں ہوتی تھیں، باقاعدہ ماہرین ہوتے تھے جو اس انداز سے آدمی کو نہلانے کے مرحلے سے گزارتے تھے کہ اس کی تھکاوٹ وغیرہ بالکل صاف ہو جاتی تھی اور آدمی تازہ دم اور فریش ہو جاتا تھا مثلاً یہ کہ پہلے جسم کو دبایا جاتا تھا خاص طریقے سے اس کے ماہرین ہوتے تھے یا مساج وغیرہ کیا جاتا تھا اور مخصوص درجہ حرارت کے اندر لے جاکر اس کو نہلایا جاتا تھا اور اس میں ظاہر ہے کہ خاص طریقے ہوتے ہوں گے اور پھر وہاں سے اس کو نکالا جاتا تھا۔ اس میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں حمامات کے اندر الگ الگ خانے بنے ہوتے ہیں اور ہر آدمی دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو کر بالکل پردے کے اندر غسل کر رہا ہوتا ہے اس طریقے سے عموماً نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک بڑی ساری جگہ بنی ہوتی تھی اور وہیں آمنے سامنے نہا رہے ہوتے تھے ایک یہاں پر نہا رہا ہے اور دوسرا یہاں پر اور تیسرا وہاں پر، اس طریقے سے ایک دوسرے کے سامنے ہوتے تھے اور اس بات کا بھی کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا کہ نہاتے وقت کم از کم لنگی وغیرہ باندھ لیں، یہ ان حمامات کی ایک خاص بات ہوتی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حمامات ایسے ہوں جن میں مردوں اور عورتوں کے لئے مخلوط انتظام ہوتا ہو کیونکہ ان قوموں کے اندر پردے وغیرہ کا ایسا تصور نہیں تھا اور حیاء کا بھی کوئی ایسا تصور موجود نہیں تھا جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حمامات میں داخل ہونے سے مردوں کو بھی منع فرمایا اور عورتوں کو بھی منع فرمایا، لیکن مردوں کو ایک شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ایسی جگہ پر نہانے کے لئے جائیں تو تہبند باندھ کر جائیں تاکہ ستر چھپا رہے نہ تو اپنا ستر ظاہر ہو اور نہ ہی دوسرے کے ستر پر نظر پڑے اس شرط کے ساتھ اجازت ہے اس سے معلوم ہوا کہ تہبند باندھنے کی شرط اس صورت میں ہے جب کہ کھلی جگہ پر بیک وقت کئی آدمیوں نے غسل کرنا ہو لیکن اگر ہر آدمی کے لئے الگ الگ باپردہ جگہ بنی ہوئی ہے تو پھر غسل کرتے وقت تہبند باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے بغیر اور لباس مکمل طور پر اتار کر بھی غسل کر سکتا ہے لیکن عورتوں کو محض اس شرط کے ساتھ بھی اجازت نہیں دی بلکہ عورتوں کے بارے میں اصل تو اس کو قرار دیا کہ وہ جائیں ہی نہیں البتہ کسی عذر کی وجہ سے اجازت دی ہے وہ عذر یہ ہے کہ مثلاً مریضہ بیمار ہے اور ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اس کے لئے مضر ثابت ہو سکتا ہے اور گھر میں گرم پانی کا انتظام نہیں ہے یا کوئی ایسی صورت حال ہے کہ مرض کی وجہ سے حمام میں جانا ضروری ہو گیا ہے یہاں حضور اقدس ﷺ نے ذکر فرمایا ایسی عورت کا جو زچگی کے مرحلے سے گزری ایک تو وہ ذرا کمزور ہو چکی ہوتی ہے اور دوسرے اس کو ذرا فزیو تھراپی قسم کے مرحلے سے گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا جسم وغیرہ دبا دیا جائے اور گرم پانی سے ماہرانہ طریقے سے گزر جائے تو طبیعت میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے یہ تو عذر کی دو مثالیں حضور اقدس ﷺ نے ذکر فرمائیں۔ حاصل یہ کہ عذر کے ساتھ اجازت دی بغیر عذر کے اجازت نہیں دی۔

مردوں اور عورتوں کے حکم میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مرد اگر حمام میں جاتے ہیں تو اس میں صرف ایک ہی مفسدہ ہے وہ یہ ہے کہ ستر ایک دوسرے کو نظر آتا ہے لیکن جب سارے تہبند باندھ کر جائیں گے تو یہ مفسدہ زائل ہو جائے گا اس لئے اس طرح جانے میں کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے اس لئے مردوں کے لئے تو صرف یہی ایک شرط لگائی گئی اور اس شرط کے ساتھ علی الاطلاق اجازت دے دی گئی لیکن عورت کے حمام میں جانے کی وجہ سے صرف یہی ایک مفسدہ نہیں اور بھی کئی مفاسد ہیں مثلاً سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عورت کا بغیر حاجت کے گھر سے نکلنا ہی شریعت کی نظر میں اچھا نہیں ہے حمام میں جائے گی تو ظاہر ہے اسے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے گا اور دوسرا یہ کہ مرد کا ستر مختصر ہوتا ہے یعنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک اور یہ غسل کے وقت بآسانی چھپایا جاسکتا ہے لیکن عورت کا ستر اس سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے کہ اس کا پیٹ اور کمر بھی ستر میں داخل ہے اور غسل کے وقت اتنا زیادہ ستر چھپانا نسبتاً مشکل ہے اور تیسرا یہ کہ اس بات کا بھی کافی امکان ہو سکتا ہے کہ حمام کے منتظمین مرد ہوں تو مردوں سے واسطہ پڑے یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے تو اس طرح کے کئی مفاسید ہیں تو مرد کے حمام میں جانے کی وجہ سے صرف ایک مفسدہ تھا لیکن عورت کے وہاں جانے میں کئی مفاسد ہو گئے اور اگر خدانخواستہ وہاں مخلوط انتظام ہے پھر تو یہ آفت کبریٰ ہے صرف مفسدہ ہی نہیں۔

عورت کے بارے میں اصل اس کو قرار دیا کہ وہ حمام میں جائے ہی نہیں ہاں البتہ اگر کوئی عذر ہے تو گھر سے نکلنے والا مفسدہ کالعدم ہو جائے گا کیونکہ ضرورت اور عذر کی وجہ سے عورت کا گھر سے نکلنا جائز ہے لیکن باقی مفاسد کا پھر بھی خیال رکھنا ضروری ہے یعنی اگر عذر کی وجہ سے جاتی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہر عورت کے لئے یا تو الگ الگ باپردہ انتظام ہو ایک دوسرے کے سامنے ہوں ہی نہیں اور یا پھر پورا ستر چھپا کر غسل کریں اور یہ بھی کہ وہاں مردوں سے واسطہ نہ پڑے یہ ساری باتیں پائی جائیں تو عذر کے ساتھ گنجائش ہے لیکن عذر نہ ہو تو پھر اصل یہی ہے کہ وہ گھر سے نکلے ہی نہیں۔

الفصل الثالث

(۵۸) ----- عن ثابت، قال: سئلَ أنس عن خضاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لو شئتُ أن أعدَّ شَمَطات كنَّ فی رأسه، فعلتُ قال: ولم يختضب زاد فی رواية: وقد اختضب أبوبكرٍ بالحنَّاءِ والكَتَم، واختضبَ عمرُ بالحناء بحتًا۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... ثابت بنانی کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت انس نے فرمایا کہ اگر میں ان چند بالوں کو شمار کرنا چاہتا جو کہ آپ کے سر میں تھے تو میں ایسا کر سکتا تھا اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ نے خضاب نہیں لگایا اور ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مہندی اور کتم کا خضاب لگایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف مہندی کا خضاب لگایا ہے۔

حضور ﷺ کے سفید بال:-

لو شئتُ أن اعد شمطات ۔شمطات شمطۃ کی جمع ہے، شمطہ ان متفرق سفید بالوں کو کہتے ہیں جو کالے بالوں کے درمیان میں ہوں یعنی بنیادی طور پر تو سر یا ڈاڑھی میں بال کالے ہوں کچھ کچھ بال سفید ہو چکے ہوں تو ان کو شمطات کہا جاتا ہے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمارہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بال آخر عمر میں سفید ہوئے تھے وہ کوئی اتنے زیادہ نہیں تھے بلکہ تھوڑے سے تھے اتنے تھوڑے تھے کہ اگر میں ان کو گننا چاہتا تو گن بھی سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ جب بال اتنے تھوڑے سفید ہوں تو خضاب کی ضرورت نہیں ہوتی تو مقصد یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بال اس مرحلے پر پہنچے ہی نہیں تھے جس میں خضاب کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا البتہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بال چونکہ زیادہ سفید ہو گئے تھے اس لئے یہ خضاب لگایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حناء اور کتم کا خضاب لگایا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف حناء (مہندی) کا خضاب لگایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا انتقال بھی تقریباً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عمر ہی میں ہوا ہے یعنی مجموعی عمر ان کی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہوئی ہے اور عمر میں یہ حضور ﷺ سے چھوٹے تھے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی چھوٹے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کافی چھوٹے تھے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ بال سفید نہیں ہوئے اور ان حضرات کے بال جلدی سفید ہو گئے تھے اس لئے ان حضرات کو خضاب لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو محسوس نہیں ہوئی۔

(۵۹)----- وعن ابنِ عمر، أنه كان يصفر لحيته بالصفرة حتى تمتلي ثيابه من الصفرة فقيل له: لَم تصبغُ بالصفرة؟ قال إني رأيتُ رسول الله صلى الله

علیه وسلم یصبغُ بها، ولم یکن شئیٌ أحبَّ إلیه منها، وقد کان یصبغُ بها ثیابَه کلَّها، حتی عمامته۔ (رواه أبو داؤد والنسائی)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اپنی ڈاڑھی کو زرد رنگ کے ساتھ رنگا کرتے تھے یہاں تک کہ زرد رنگ سے ان کے کپڑے بھی بھر جاتے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی ڈاڑھی کو زرد رنگ کے ساتھ کیوں رنگتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ساتھ رنگتے ہوئے دیکھا ہے اور آپ کو (زرد رنگ سے زیادہ) کوئی چیز محبوب نہیں تھی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما زرد رنگ کے ساتھ اپنے سارے کپڑوں کو بھی رنگ لیا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے عمامے کو بھی زرد رنگ کے ساتھ رنگ لیا کرتے تھے۔

زرد خضاب:۔

ایک تو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ فرما رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ڈاڑھی کو زرد خضاب لگایا کرتے تھے جب کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ آرہا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا، یہ مسئلہ تو اگلی حدیث ذکر کرنے کے بعد بیان کریں گے۔
دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ڈاڑھی کو جب زرد خضاب لگاتے تھے تو اس سے ان کے کپڑے بھی بھر جاتے تھے اور بعض اوقات اپنے کپڑوں کو بھی زرد رنگ میں رنگ لیا کرتے تھے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو زرد رنگ میں رنگنے کی بظاہر وجہ یہ ہوگی کہ ڈاڑھی کو زرد خضاب لگاتے ہوئے اس کے زرد دھبے ان کے کپڑوں پر بھی پڑ جاتے ہوں گے اب کپڑے پر زرد رنگ کے دھبے ہوں یہ اچھے نہیں لگتے اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پورے کپڑے ہی کو زرد رنگ میں رنگ لیتے ہوں گے تا کہ دھبے نظر نہ آئیں، سوال یہاں پر یہ ہے کہ مرد کو تو زعفران کے رنگ کے کپڑے سے منع کیا گیا ہے حضرت ابن عمر ایسا کیوں کرتے تھے، تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نہی کو تنزیہہ پر محمول کرتے تھے جیسا کہ شافعیہ وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے اور دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ زرد رنگ زعفران کا نہیں ہوتا ہوگا بلکہ کسی اور چیز کا ہوتا ہوگا اور یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مرد کے لئے کپڑے میں پیلا رنگ اس وقت ممنوع ہے جب کہ وہ ورس یا زعفران کی وجہ سے ہو اگر کسی اور چیز سے رنگ دیا جائے تو وہ ممنوع نہیں ہے البتہ ڈاڑھی کے اندر اگر زعفران بھی لگا لیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(٦٠)----- وعن عثمان بن عبد الله بن مَوهِبٍ، قال: دخلتُ على أم سلمةَ فأخرجت إلينا شعراً من شَعر النبی ﷺ مخضوباً۔ (رواه البخاری)

ترجمہ...... حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب کہتے ہیں کہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گیا تو انہوں نے ہمارے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں سے بال نکالے جن کو خضاب لگا ہوا تھا۔

آگے کتاب الطب والرقی میں اس حدیث کی تفصیل آئے گی کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جو گھنگرو نما ایک ڈبیا کے اندر رکھے ہوئے تھے اور جب کوئی آدمی بیمار ہوتا تو اس کے لئے کسی برتن میں پانی ڈال کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس لے جایا جاتا اور حضرت ام سلمہ ان بالوں کو اس برتن کے اندر ایک مرتبہ ڈبو کر نکال لیا کرتی تھیں اور مریض وہ پانی سارا استعمال کرتا تھا اور شفایاب ہو جایا کرتا تھا۔

حضور ﷺ کے بالوں کو خضاب لگانے کی حیثیت:-

علماء میں یہ بحث چلی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا یا نہیں لگایا تو اس میں دونوں ہی قول ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے چنانچہ بہت سارے حنفیہ کا رجحان اس طرف ہے دوسری رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا اور بہت سارے شافعیہ کا رجحان اس طرف ہے، حدیثیں دونوں طرح کی ہیں بعض سے خضاب لگانے کا اثبات ہوتا ہے اور بعض سے نفی ہوتی ہے مثلاً حضرت ابن عمر اور حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب کی روایت سے خضاب لگانے کا اثبات ہوتا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ڈاڑھی کو زرد خضاب لگایا کرتے تھے اور حضرت عثمانؓ بن عبد اللہ بن موہب بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو موئے مبارک دیکھے اس میں خضاب لگا ہوا تھا جب کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا اس لئے کہ آپ کے بال اس مرحلہ تک پہنچے ہی نہیں تھے جن میں عموماً خضاب لگایا جاتا ہے کیونکہ خضاب سفید بالوں کی رنگت بدلنے کے لئے ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال اتنے سفید ہوئے ہی نہیں تھے۔ تو جو حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے وہ پہلی دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ آپ

نے خضاب نہیں لگایا وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

جو کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا یعنی حضرت انس کی روایت کو اختیار کرتے ہیں وہ باقی روایتوں میں مختلف توجیہات کرتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جو ذکر فرمارہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ڈاڑھی کو زرد خضاب لگایا تو یہ ہو سکتا ہے کہ اصل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال حضرت ابن عمرؓ نے کبھی دیکھے ہوں اور دوسرے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھی کی ہوئی ہو اور جب آدمی کنگھی کرتا ہے تو بعض اوقات جو بال اوپر نظر آرہے ہوتے ہیں وہ اندر چلے جاتے ہیں اور اندر والے باہر آجاتے ہیں تو دوسرے موقع پر جب دیکھا تو ان سفید بالوں کی جگہ سرخ رنگ کے بال اوپر تھے اور وہ سرخ رنگ یا کسی قدر زردی مائل رنگ خضاب لگانے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے تھا کہ بال سفید ہونے سے پہلے بعض اوقات ان کا اس طرح کا رنگ زرد ہو جایا کرتا ہے یا بعضوں کے بالوں کا یا کچھ بالوں کا قدرتی رنگ ہی ایسا ہوتا ہے، ایک توجیہ یہ کی گئی ہے لیکن یہ توجیہ بُعد سے خالی نہیں ہے۔

حضرت عثمان بن عبداللہ بن موہب کی روایت میں یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بال دیکھے جن کو خضاب لگا ہوا تھا تو اصل میں بالوں کو خضاب لگا ہوا نہیں ہوگا اصل میں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بال ہوں گے جو قدرتی طور پر ذرا سرخ رنگ کے ہو جاتے ہیں لیکن انہوں نے یہ سمجھا کہ ان پر سرخ خضاب لگا ہوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امتداد وقت سے ان کی رنگت بدل گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ احتراماً اور ادباً لوگ خوشبو وغیرہ لگا دیتے ہوں اور بکثرت خوشبو لگانے کی وجہ سے بعد میں ان کی سیاہی دور ہو گئی ہو اور رنگت سرخ ہو گئی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان پر خضاب لگایا تھا۔

دوسری طرف کے حضرات کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات اپنے علم کے اعتبار سے فرمائی ہے ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب لگایا ہو لیکن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا پتہ نہ چلا ہو اس لئے حضرت انس نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب نہیں لگایا دونوں طرف یہ توجیہ کی گئی ہے۔

دونوں طرف کی روایات کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور بظاہر تطبیق اولیٰ اور بہتر معلوم ہوتی ہے۔

(۱) ...... پہلی تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جو یہ فرمایا کہ خضاب لگایا تو یہ

کبھی کبھار کی بات کر رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک آدھ مرتبہ زندگی میں خضاب لگایا ہوگا کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی اور ضرورت کی وجہ سے ایسی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ بال سفید نہ ہوئے ہوں پھر بھی کوئی چیز لگائی ہو اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بات کر رہے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی معمول کی کہ عام طور پر آپ خضاب نہیں لگایا کرتے تھے اس لئے کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔

(۲)......... دوسری تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بات کر رہے ہیں سر کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک میں کبھی خضاب نہیں لگایا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بات کر رہے ہیں ڈاڑھی کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھار داڑھی کو خضاب لگایا ہے لہٰذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(٦١) ----- وعن أبي هريرةَ، قال: أُتيَ رسول الله صلى الله عليه وسلم بمخنَّثٍ، قد خضبَ يديهِ ورجليه بالحناءِ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما بالُ هذا؟ قالوا: يتشبَّه بالنساءِ، فأمرَ به فنُفيَ إلى النقيع فقيل: يا رسول الله! ألا نقتله؟ فقال: إني نُهيتُ عن قتلِ المصلّينَ۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مخنث لایا گیا جس نے اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کو مہندی کے ساتھ رنگا ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ عورتوں کے مشابہ بننا چاہتا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اس کو نقیع کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! (اگر یہ اتنا ہی برا ہے کہ مدینے میں رہنے کے قابل نہیں تو) کیا ہم اسے قتل نہ کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نماز پڑھنے والوں یعنی مسلمانوں کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔

یہ مخنث تھا ہو سکتا ہے کہ یہ فطری اور پیدائشی طور پر خنثیٰ (ہیجڑا) ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ویسے ہی بتکلف اس طرح بنا ہوا ہو اور عورتوں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہو اور اسی کا یہ حصہ تھا کہ ہاتھ اور پاؤں پر مہندی لگا رکھی تھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مدینے سے جلاوطن کرنے کا حکم فرمایا اور یہ فرمایا کہ اسے نقیع میں بھیج دو، نقیع مدینے کے قریب ایک جگہ تھی وہاں رہے اور وہاں رہ کر اپنی ضرورتیں وغیرہ پوری کرتا رہے، جانور چرائے اور ان پر گزارہ کرتا رہے اس کو جلاوطن بظاہر اس لئے کیا ہے کہ مدینے میں رہ

کر یہ مردوں کے لئے بھی فتنے کا باعث بن سکتا تھا اور عورتوں کے لئے بھی۔

(٦٢)----- وعن الوليدِ بن عقبةَ، قال: لما فتحَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم مكةَ، جعلَ أهلُ مكةَ يأتونه بصبيانهم، فيدعو لهم بالبركة، ويمسح رؤوسهم، فجئَ بي إليه وأنا مخلَّقٌ، فلم يمسني من أجل الخلوق۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو اہل مکہ اپنے بچوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے برکت کی دعا بھی فرماتے اور ان کے سروں پر ہاتھ بھی پھیرتے تو مجھے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا اور اس وقت میرے سر پر خلوق لگی ہوئی تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خلوق کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگایا۔

یعنی میرے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا کہ کہیں آپ کے ہاتھوں کو خلوق نہ لگ جائے البتہ ویسے برکت کی دعا فرمادی۔

(٦٣)----- وعن أبي قتادة، أنه قال لرسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ لي جُمَّةً، أفأرجِّلُها؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نعم، وأكرِمها قال: فكانَ أبو قتادة ربما دهَّنَها في اليوم مرتينِ من أجل قول رسول الله صلى الله عليه وسلم: نعم، وأكرمها۔ (رواه مالك)

ترجمہ ...... حضرت ابو قتادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ میرے سر پہ بال ہیں تو کیا میں ان میں کنگھی کیا کروں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں اور ان بالوں کا اکرام بھی کیا کرو تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے کہ ہاں ان بالوں کا اکرام بھی کیا کرو، بعض اوقات دن میں دو مرتبہ ان بالوں کو تیل لگاتے تھے۔ (اور کنگھی بھی کرتے ہوں گے)

بالوں کا اکرام:۔

سوال کیا کہ کیا میں اپنے بالوں میں کنگھی کیا کروں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنگھی بھی کیا کرو اور اس کے ساتھ اکرام بھی کیا کرو، اکرام کا مطلب یہ ہے کہ بالوں کو بنانے سنوارنے میں جو اور کام

کئے جاتے ہیں وہ بھی کیا کرو مثلاً بالوں کو دھونا، صاف ستھرا رکھنا، بالوں میں تیل لگانا اور مناسب وقت پر انہیں کاٹنا اور ان کو درست حالت میں رکھنا یہ سب کچھ اکرام میں داخل ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنگھی بھی کیا کرو اور بالوں کا اکرام بھی کیا کرو تو چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ **نعم وأکرمها** تو اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابو قتادہؓ سر پہ تیل اور کنگھی وغیرہ کا بہت اہتمام فرماتے تھے اور بعض اوقات دن میں دو مرتبہ یہ کام کرتے تھے کسی وجہ سے بال منتشر وغیرہ ہو گئے تو دو مرتبہ ایسا کرتے تھے۔ ویسے تو پہلے گزرا کہ کنگھی وغیرہ کرنے میں کبھی کبھار ناغہ کر لینا چاہئے اور اس میں زیادہ انہاک نہیں ہونا چاہئے لیکن حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل اس نہی میں داخل نہیں ہے اس لئے کہ نہی جو فرمائی ہے وہ اس صورت کے لئے ہے کہ آدمی زینت میں انہاک کی وجہ سے کنگھی وغیرہ زیادہ کرے لیکن ابو قتادہ کے فعل کا منشا یہ نہیں تھا بلکہ ان کے فعل کا منشا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں مبالغہ تھا اس لئے یہ اس میں داخل نہیں ہے ایک ہی کام ہوتا ہے ایک منشا کی وجہ سے کیا جائے تو صحیح ہوتا ہے دوسرے منشا سے ہو تو غلط۔

(٦٤)----- وعن الحجاج بن حسَّان، قال دخلنا عَلَى أنس بن مالك، فحدثتني أختي المغيرةُ، قالت: وأنت يومئذٍ غلامٌ، ولك قرنانِ أو قُصّتانِ، فمسحَ رأسكَ، وبرَّكَ عليك، وقال: احلقوا هذين أو قصوهُما، فإنَّ هذا زِى اليهود۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت حجاج بن حسان کہتے ہیں کہ ہم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تھے تو میری بڑی بہن مغیرہ نے مجھے بتایا کہ تم اس وقت چھوٹے بچے تھے یعنی جب حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تو تم چھوٹے بچے تھے اور تمہارے سر پہ دو مینڈھیاں تھیں (یعنی دو گیسو تھے) تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمہارے سر پر ہاتھ بھی پھیرا اور تمہارے لئے برکت کی دعا بھی کی اور یہ فرمایا کہ یا تو ان دونوں کو مونڈ دو یا ان کو کاٹ کر چھوٹا کر دو اس لئے کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے۔

باقی سر کے بال تو مونڈے ہوئے ہیں یا چھوٹے کئے ہوئے ہیں لیکن ایک آدھ جگہ پر گیسو رکھے ہوئے ہیں مینڈھیاں سی رکھی ہوئی ہیں یہ پسندیدہ طریقہ نہیں ہے آج کل بھی بعض اوقات بچوں کے سر پر بال کسی پیر فقیر کے نام پر چھوڑ دیا کرتے ہیں تو وہ بھی اس میں داخل ہے۔

(٦٥)----- وعن علي، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تحلقَ المراةُ رأسها۔ (رواه النسائی)

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ عورت اپنے سر کو مونڈے۔

عورت کے لئے حلق کرانا جائز نہیں ہے اور جو حکم حلق کا ہے وہی حکم قصر یعنی بال چھوٹے کرانے کا ہے اتنے چھوٹے کرانا جس میں مردوں کے ساتھ تشبہ ہو اس لئے کہ اصل علت حلق سے نہی کی تشبہ بالرجال ہے لہٰذا بالوں کی جس ہیئت میں بھی عورت کا مردوں کے ساتھ تشبہ پایا جائے گا وہ ہیئت اس کے لئے ناجائز ہوگی۔

(٦٦)-----وعن عطاء بن يسار، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم في المسجد، فدخل رجل ثائر الراس واللحية، فأشار إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، كأنه يأمره بإصلاح شعر ولحيته، ففعل، ثم رجع فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أليس هذا خيرا من أن يأتي أحدكم وهو ثائر الرأس كأنه شيطان۔ (رواه مالك)

ترجمہ ...... حضرت عطاء بن یسارؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے تو ایک ایسا آدمی داخل ہوا جس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا جیسا کہ آپ اسے اپنے سر اور ڈاڑھی کو درست کرنے کا حکم دے رہے ہوں چنانچہ اس نے جا کر ایسا ہی کیا پھر وہ دوبارہ واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ حالت اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی اس حالت میں آئے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور ایسا لگے جیسا کہ شیطان ہوتا ہے۔

یہاں یہ شخص جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے بالوں کو درست کر آؤ بلکہ ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ جا کر درست کرو اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہیں سمجھا ہوگا کہ دوسروں کے سامنے اس کی بے وقعتی ہو اگر زبان سے کہتے تو وہ اپنی ہتک محسوس کر سکتا تھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا جس کو اشارہ کیا سمجھ گیا اور باقیوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس کو کیا کہا ہے یا ایک آدھ کو اندازہ ہوا ہوگا باقیوں کو اندازہ ہی نہیں ہوا اور جب وہ واپس آیا تو حضور ﷺ نے اس کی تعیین کر کے بات نہیں فرمائی بلکہ عمومی بات فرمائی اور دوسرا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرما رہے ہوں تو آپ نے اپنا سلسلہ کلام منقطع کرنا مناسب نہ سمجھا ہو اس لئے اپنی پہلی والی بات کو جاری رکھتے ہوئے اس کو ہاتھ کے اشارے سے بتا دیا کہ جا کر اپنے بالوں کو درست کر آؤ۔

(٦٧)----- وعن ابنِ المسيب سُمِعَ يقول: إنَّ اللهَ طَيِّبٌ يُحب الطِيب، نظيفٌ يحب النظافةَ، كريمٌ يحب الكرمَ، جَوادٌ يحب الجودَ، فنظفوا أراه قال: أفنِيتكم ولا تشبَّهوا باليهود۔

قال: فذكرتُ ذلك لمهاجرين مِسمارٍ، فقال: حدَّثنيهِ عامرُ بن سعدٍ، عن أبيهِ، عن النبی صلی الله علیه وسلم مثله، إلّا أنه قال: نظفوا أفنيتكم۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ...... حضرت سعید بن المسیب کو یہ فرماتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہیں اور پاکیزگی یا خوشبو کو پسند فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور ستھرائی کو پسند فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کریم ہیں اور کرم کو پسند فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سخی ہیں اور سخاوت کو پسند فرماتے ہیں لہٰذا تم اپنے گھروں کے سامنے والے حصوں کو بھی صاف کیا کرو اور یہودیوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔

یہ سعید بن المسیب سے جو روایت ہے اس میں تو راوی کو تردد ہے کہ أفنیتکم کا لفظ کہا نہیں کہا نظفوا کا لفظ تو یقیناً یاد ہے لیکن أفنیتکم کے لفظ میں تردد ہے اگرچہ غالب گمان یہی ہے کہ یہ لفظ کہا ہے لیکن راوی کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں اسی حدیث کا ذکر مہاجر بن مسمار کے سامنے کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے عامر بن سعید نے بتایا اور انہوں نے اپنے والد حضرت سعد بن وقاصؓ سے نقل کیا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا جس میں مضمون وہی ہے اتنا فرق ہے کہ اس میں نظفوا أفنیتکم کا لفظ ہے اور اس میں کسی قسم کے تردد کا اظہار نہیں ہے تو گویا پہلی روایت سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ حضرت سعید بن المسیب کا قول ہے لیکن دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت بن المسیب نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کی بلکہ حضور اقدس ﷺ سے بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی تصریح ہو گئی کہ حضور اقدس ﷺ نے نظفوا کے بعد أفنیتکم فرمایا کہ اپنے گھروں کے سامنے والے حصوں کو صاف کیا کرو یہ مطلب نہیں کہ گھروں کے باہر والے حصے کو تو صاف کر لیا اندر سے صفائی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اندر والے حصے کو بطریق اولیٰ صاف کرنا ہے۔

(٦٨)----- وعن يحيى بن سعيد، أنه سمع سعيد بن المسيب يقول: كان إبرهيم خليل الرحمن أوَّلَ الناس ضَيَّفَ الضيف، وأول الناس اختتن وأول الناس قصَّ شاربه، وأول الناس رأى الشيب فقال: يارب: ما هذا؟ قال الرب تبارك: وقارٌ يا إبرهيم قال: رب زدني وقاراً۔ (رواه مالك)

ترجمہ...... حضرت یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن المسیب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام لوگوں میں سے پہلے شخص تھے جنہوں نے مہمانوں کی مہمان نوازی کی اور یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ختنہ کیا اور یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی مونچھوں کو کاٹا اور یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سفید بال دیکھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے رب! یہ کیا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم یہ وقار ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے رب میرے وقار میں اضافہ کر دیجئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی اور مہمان نوازی کی روایت ڈالی اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے لوگ مہمان نوازی نہیں کیا کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلب یہ ہو کہ مہمان نوازی کو بطور عادت کے اپنانا اور اس کا خاص اہتمام کرنا یہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا ہے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ جب تک کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا کھانے والا نہیں ہوتا تھا اس وقت تک کھانا ہی نہیں کھاتے تھے تو مہمان نوازی کا اتنا اہتمام اس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا اگرچہ پہلے لوگ بھی بوقت ضرورت مہمان نوازی کر لیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ختنہ کیا یہ بظاہر اپنے ظاہر پر محمول ہے اور اس سے پہلے لوگوں میں ختنے کا رواج نہیں تھا اب پہلے انبیاء کا کیا معاملہ تھا تو کسی روایت میں تو اس کی تصریح نہیں ہے البتہ بعض شارحین حدیث نے یہ لکھا ہے کہ اس سے پہلے انبیاء پیدا ہی مختون ہوتے تھے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ اور بھی کئی لوگ مختون پیدا ہوئے ہیں اس لئے انہیں ختنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

یہ فرمایا کہ سب سے پہلے مونچھیں ابراہیم علیہ السلام نے کاٹی ہیں تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے لوگ مونچھیں کاٹتے ہی نہیں تھے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی مونچھیں اتنی بڑھتی ہی نہ ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں مونچھیں کاٹنے سے مراد ہو مبالغے اور اہتمام کے ساتھ کاٹنا، مبالغے اور اہتمام کے ساتھ کاٹنے کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ سفید بال سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہوئے ہیں اور یہ بات بظاہر اپنے ظاہر پر معلوم ہوتی ہے کہ اس سے پہلے لوگوں کے بال سفید نہیں ہوا کرتے تھے تو اس لئے انہوں

نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے تو انہوں نے عرض کیا: یارب زدنی وقاراً، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص حالت تھی کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو براہ راست اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ تمہارے لئے وقار ہیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ادب کا تقاضا یہی تھا کہ یہ کہتے کہ اگر یہ وقار ہے تو مجھے اور عطا فرما دیجئے، لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمارے لئے بھی یہ سنت ہو کہ ہم بالوں کے سفید ہونے کی خواہش کریں آدمی فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ میرے بال جلدی سفید نہ ہوں دیر تک کالے رہیں تو یہ خواہش بھی سنت ابراہیمی کے خلاف نہیں ہے۔

باب التصاویر

الفصل الاوّل

تصاویر جمع ہے تصویر کی اور تصویر اصل میں تو باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا معنی صورت بنانا ہے یعنی کسی چیز کی نقل بنانا لیکن تصویر یا تصاویر کا بکثرت اطلاق اس بنی ہوئی صورت اور بنائی ہوئی نقل پر بھی ہوتا ہے صرف مصدری معنی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ دونوں معنی آتے ہیں مصدری معنی بھی آتا ہے یعنی صورت بنانا اور اس بنائی ہوئی صورت اور نقش کو بھی کہا جاتا ہے۔

اس باب میں بنیادی طور پر تو تصویر کے متعلق حدیثیں ذکر کی جائیں گی لیکن اس کے ساتھ لہو و لعب کی دوسری صورتوں کے بارے میں بھی بعض حدیثیں ذکر کی جائیں گی مثلاً شطرنج اور نردشیر کھیلنے کے بارے میں اور اس طرح کی بعض اور چیزوں کے بارے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ تصاویر بنیادی طور پر لہو و لعب کے قبیل سے ہیں اس لئے ان ساری چیزوں کو صاحب مشکوٰۃ نے ایک ہی باب میں ذکر کیا ہے۔

تصویر کے بارے میں پہلے احادیث کا ترجمہ اور خلاصہ دیکھ لیجئے اس کے بعد متعلقہ احکام کو سمجھنا ذرا آسان ہو جائے گا۔

(۱)----- عن أبی طلحةَ، قال: قال النبی صلی اللہ علیه وسلم لا تدخل الملائکةُ بیتـًا فیه کلبٌ، ولا تصاویر۔ (متفق علیه)

ترجمہ...... حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو اور نہ ہی ایسے گھر میں جس میں تصویریں ہوں۔

تصویر والے گھر میں (رحمت والے) فرشتے نہیں آتے:-

جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ سلم نے یہ نہیں فرمایا کہ **بیتـًا فیه کلبٌ وتصاویر** بلکہ یہ فرمایا کہ **بیتـًا فیه کلب ولا تصاویر** یعنی واؤ کے ساتھ لا کا حرف بھی ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لا نہ ہوتا اور کلبٌ و تصاویر کہا جاتا تو اس سے کوئی یہ سمجھ سکتا تھا کہ کتا اور تصاویر دونوں چیزیں اگر گھر میں موجود ہوں دونوں کا مجموعہ ہو تو فرشتوں کے گھر میں

داخل ہونے سے مانع ہے اگر ان میں سے ایک چیز ہو صرف کتا ہو تصویر نہ ہو یا تصویر ہو اور کتا نہ ہو تو فرشتے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں یہ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی سے بچاؤ کے لئے درمیان میں لا کا لفظ بڑھا دیا جو درحقیقت تکرار عامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی جو پہلے **لا تدخل الملٰئکۃ** آیا تھا وہ کلب کے بارے میں الگ ہے اور تصاویر کے بارے میں الگ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس گھر میں بھی فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو اور اس گھر میں بھی داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو اور جس میں دونوں ہوں اس میں بطریق اولیٰ داخل نہیں ہوں گے۔

کون سے فرشتے؟

جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، کون سے فرشتے داخل نہیں ہوتے اس میں کئی اقوال ہیں بعض نے تو یہ کہا کہ حفظہ فرشتے یعنی وہ فرشتے جو بندوں کے اعمال لکھنے پر مامور ہوتے ہیں وہ مستثنیٰ ہیں وہ تو انسان کے ساتھ رہتے ہیں اس کے علاوہ باقی سارے کے سارے فرشتے مراد ہیں تو حفظہ فرشتوں یعنی کراما کاتبین کے علاوہ باقی اور فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو البتہ حفظہ فرشتے ساتھ ہی رہتے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہاں صرف رحمت کے فرشتے مراد ہیں یعنی وہ فرشتے جو رحمت اور برکت کا باعث ہوتے ہیں وہ ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو لیکن باقی ہر قسم کے فرشتے جن کی مختلف ڈیوٹیاں ہوتی ہیں مختلف کاموں پر مامور ہوتے ہیں وہ داخل ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ ہر قسم کے فرشتے مراد ہیں تو گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں کوئی بھی فرشتہ داخل نہیں ہوتا اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اعمال لکھنے والے فرشتے اس دوران کئے ہوئے عمل کیسے لکھتے ہوں گے اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر میں تصویر لگا لو اور اس کے بعد جو مرضی کرو اس لئے کہ گواہ تو موجود ہوں گے نہیں اس لئے مقدمہ ثابت نہیں ہو سکے گا، تو اس کا جواب ان حضرات نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ان کو ایسی قدرت دے دیں کہ وہ اس گھر سے باہر رہنے کے باوجود اس کے کئے ہوئے اعمال کا پتہ چلا کر انہیں لکھتے رہیں، آج کل فاصلوں پر بیٹھ کر کوئی چیز بآسانی دیکھی جا سکتی ہے اور بہت ساری جگہوں پر سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے کیمرے نصب کئے جاتے ہیں اور ان کیمروں کے ذریعے تصویریں کہیں سکرین پر دور جا رہی ہوتی ہیں اور وہ دور کمروں میں بیٹھ کر دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے اور کیا کچھ ہو رہا ہے سب کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے تو اگر بندہ ایسے کر سکتا ہے کہ خود کسی جگہ موجود نہ ہو لیکن وہاں ہونے والے سارے اعمال دیکھ رہا ہو تو اللہ فرشتوں کو بھی یہ قدرت دے سکتے ہیں۔

ایک قول اور ہے لیکن وہ انتہائی شاذ اور نا قابل اعتبار ہے وہ یہ ہے کہ یہاں فرشتوں سے مراد وحی کے فرشتے ہیں یعنی جو وحی لے کر آتے تھے وہ ایسی جگہ پر داخل نہیں ہوتے لہٰذا دوسرے فرشتے داخل ہو جاتے ہیں لیکن یہ قول شاید اس بات پر مبنی ہے کہ تصویر رکھنے سے ممانعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھی اور یہ بات بعض حضرات نے کہی ہے لیکن انتہائی شاذ قول ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

گویا اب تین قول ہو گئے، ایک تو یہ کہ حفظہ فرشتوں کے علاوہ باقی فرشتے نہیں آتے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کے فرشتے ایسے گھر میں داخل ہونے سے گریز کرتے ہیں البتہ حفظہ فرشتے دور سے ہی یہ اعمال لکھ لیتے ہوں گے اور تیسرا یہ کہ رحمت کے فرشتے مراد ہیں اس سے یہ بات بہر حال طے ہو گئی کہ جو فرشتے کسی کام پر مامور ہیں وہ کام بہر حال وہ کرتے ہیں چاہے تصویر ہو۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ میں ایک لطیفہ آتا ہے کہ ایک صاحب تھے وہ ہر وقت اپنے ساتھ کتا رکھتے تھے کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ جہاں پر کتا ہو وہاں پر فرشتے نہیں آتے لہٰذا جب کتا میرے پاس موجود ہو گا تو ملک الموت بھی میرے پاس نہیں آئے گا، موت کا فرشتہ بھی نہیں آئے گا تو جواب دینے والے نے بھی عجیب جواب دیا اس نے کہا کہ ہاں جو فرشتے انسانوں کی روح قبض کرتے ہیں وہ تو نہیں آئیں گے لیکن اگر کوئی فرشتہ یا کوئی بھی مخلوق کتوں کی روح قبض کرتی ہے تو وہ یقیناً کتوں کے پاس آتی ہو گی جب تمہاری موت کا وقت آئے گا تو ایسے فرشتے یا مخلوق جو کتوں کی روح قبض کرتی ہے وہ تمہاری روح قبض کرے گی، یوں کہنا تو اس نے مناسب نہیں سمجھا ہو گا کہ آپ کتے کی موت مریں گے۔

یہ بات کس تصویر اور کتے کی ہے؟

ایک بحث یہاں پر اور ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو فرمایا کہ جہاں کتا یا تصویر ہو وہاں فرشتے نہیں آتے یہ کس قسم کے کتے اور تصویر کے بارے میں ہے بعض صورتوں میں کتا رکھنے کی شریعت میں اجازت بھی ہے مثلاً کھیتی کی حفاظت کے لئے یا بعض اور چیزوں کی حفاظت کے لئے جب کہ واقعۃً حفاظت کی ضرورت ہو اسی طرح آگے تفصیل سے مسئلہ آئے گا اس سے پتہ چلے گا کہ تصویر کی بھی بعض صورتیں جائز ہیں مثلاً یہ کہ تصویر نیچے زمین پر ہو اور اس کی اہانت ہو رہی ہو تو اس کا رکھنا گھر میں جائز ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے جو نہیں آتے آیا یہ حکم ہر قسم کے کتے اور ہر قسم کی تصویر کے بارے میں ہے چاہے جائز ہو یا نا جائز ہو یا صرف نا جائز کتے اور نا جائز تصویر کے ساتھ خاص ہے تو اس میں دونوں قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ کتا یا تصویر دخول ملائکہ سے مطلقاً

مانع ہے چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز ہو فرق صرف اتنا پڑے گا کہ اگر وہ کتا یا تصویر رکھنا جائز ہے تو آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا لیکن دنیا میں فرشتوں کی برکت سے محروم رہے گا اور اگر وہ ناجائز تصویر یا ناجائز کتا ہے تو دنیا میں بھی فرشتوں کی رحمت اور برکت سے محروم رہے گا اور آخرت میں اس فعل پر اسے سزا بھی ملے گی اور دوسرا قول یہ ہے کہ صرف ناجائز کتا اور ناجائز تصویر ہی دخول ملائکہ سے مانع ہے جو جائز ہو وہ مانع نہیں ہے اس کے ہوتے ہوئے فرشتے آسکتے ہیں اور دونوں حضرات نے اپنے اپنے قرائن پیش کئے ہیں آگے ایک حدیث میں تصویر والے پردے سے تکیے یا گدے بنانے کا ذکر آرہا ہے تا کہ وہ محل اہانت میں ہو اور ایسی تصویر رکھنا جائز ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے اپنے گھر میں گوارہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جائز تصویر دخول ملائکہ سے مانع نہیں اکثر حنفیہ کا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔[1] یہاں تصویر سے مراد جاندار کی تصویر ہے اگر بے جان کی تصویر ہو تو وہ فرشتوں کے آنے سے کسی کے نزدیک بھی مانع نہیں۔

(۲) ----- وعن ابنِ عبَّاسٍ، عن ميمونة: أنَّ رسولَ صلى الله عليه وسلم أصبحَ يومًا واجماً، وقال: إنَّ جبريلَ كانَ وعدني أن يلقاني الليلةَ، فلم يلقَني، أمَ والله، ما أخلفني ثمَّ وقع في نفسه جروُ كلب تحت فُسطاطٍ له، فأمر به، فأخرج، ثمَّ أخذ بيدِه ماءً، فنضح مكانه، فلما أمسى لقيه جبريلُ فقال: لقد كنت وعدتني أن تلقاني البارحةَ قال: أجل ولكنَّا لا ندخل بيتاً فيه كلبٌ، ولا صورة، فأصبح رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يومئذ، فأمر بقتل الكلاب، حتى إنه يأمر بقتل كلب الحائط الصغير، ويتركُ كلبَ الحائط الكبير۔ (رواه مسلم)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ اور گم سم تھے اور آپ نے یہ فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ آج رات مجھے ملیں گے لیکن انہوں نے مجھ سے ملاقات نہیں کی اللہ کی قسم پہلے انہوں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خیال گزرا اس پلے کا (یعنی کتے کے بچے کا) جو کہ آپ کے بستر کے نیچے تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتے کے بارے میں حکم دیا اور اسے گھر سے نکال دیا گیا پھر آپ نے اپنے ہاتھ میں پانی لیا اور اسے اس کتے کی جگہ پر چھڑکا جب شام ہوئی تو جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے ملاقات کی۔ حضور اقدس صلی

---

(۱) ردالمحتار ج ۱/ ص ۶۴۹

اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے کہا کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گزشتہ رات مجھ سے ملاقات کریں گے، جبرئیل علیہ السلام نے کہا جی ہاں، لیکن ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو اور نہ ہی ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو تو اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی اور کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ آپ چھوٹے باغ کے کتے کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے اور بڑے باغ کے کتے کو چھوڑ دیتے تھے۔

''أصبح يومًا واجمًا'' وَجَمَ يَجِمُ (ض) کسی پریشانی اور فکر مندی کی وجہ سے آدمی خاموش سا ہو، چپ چاپ اور گم سم سا ہو جیسا کہ کسی گہری فکر اور سوچ کے اندر ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ فکر مندی تھی کہ جبرئیل علیہ السلام نے میرے پاس ملاقات کے لئے آنا تھا لیکن آئے نہیں پتہ نہیں کیا بات ہے اگر تو یہ ان کی عادت ہوتی کہ وعدہ آج کا کیا اور آئے کل کو پھر تو آدمی سوچ لیتا ہے کہ پہلے بھی ایسا کر لیتے ہیں اب بھی ایسا کر لیا ہو گا کہ وقت پر نہیں آئے لیکن وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں اور انہوں نے پہلے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی جو ملاقات کا وقت مقرر ہوتا ہے اسی پر آتے ہیں لیکن اس دفعہ نہیں آئے تو پتہ نہیں کیا وجہ ہو گی؟ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر لاحق تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں یہ بات ڈالی اور آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے گھر میں ایک کتے کا بچہ ہے شاید کہیں وہ رکاوٹ نہ بنا ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گھر سے نکلوا دیا۔

کتے کا پلا کہاں پر تھا تو یہاں پر یہ لفظ آ رہے ہیں: ''تَحتَ فُسطاط'' فسطاط کا معنی ہوتا ہے خیمہ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خیمے کے نیچے تھا بعض روایتوں میں تحت نضد آتا ہے اور نضد کا معنی ہوتا ہے چارپائی تو مطلب یہ ہوا کہ وہ کتا چارپائی کے نیچے تھا اور بعض روایتوں میں آتا ہے: تَحتَ بساط لنا بساط کہتے ہیں بستر کو بچھونے کو، ہمارے ایک بچھونے کے نیچے تھا یہ تین طرح کی روایتیں ہو گئیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ کتا چارپائی کے نیچے تھا اور اس چارپائی پر بچھونا بچھا ہوا تھا اس لئے یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ وہ بچھونے کے نیچے تھا اور وہ بچھونا اس کپڑے کا بنا ہوا تھا جس سے خیمہ بنتا تھا اس لئے یہ کہہ دیا ''تحت فسطاط'' لہٰذا تینوں باتوں میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتے کو نکالنے کے بعد وہاں پانی چھڑکا ہے بعض نے تو اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کتے کی کوئی نجاست وہاں پر لگی ہوئی ہو گی اس کو زائل کرنے کے لئے آپ نے ایسا کیا تو اس صورت میں ''نَضَحَ مكانهٗ'' کا معنی محض پانی چھڑکنا نہیں ہو گا بلکہ جگہ کو دھونا مراد ہو گا اور نضح کا لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دودھ پینے والی بچی پیشاب کردے تو اس کپڑے کو دھویا جائے اور اگر دودھ پینے والا بچہ یعنی ماں کا دودھ پینے والا بچہ پیشاب کر دے تو نضح کیا جائے نضح کا مشہور معنی تو چھینٹے مارنا ہے لیکن حنفیہ کے نزدیک یہاں نضح سے مراد غسل خفیف ہے یعنی دھونا لیکن دھونے میں زیادہ مبالغے کی ضرورت نہیں ہے تو یہاں پر یہی معنی مراد ہوگا اگر یہ کہیں کہ کسی نجاست کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عمل کیا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ کوئی ظاہری نجاست تو وہاں پر موجود نہیں تھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی چھڑکا ہے اس کتے کی نحوست کو زائل کرنے کے لئے یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیت اللہ سے بت نکالے ہیں تو بت نکالنے کے بعد وہاں پانی چھڑکا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ بت ظاہری اعتبار سے تو ناپاک نہیں ہوتے ان میں کوئی ظاہری گندگی نہیں ہوتی پھر بھی پانی چھڑکا ہے ان بتوں کی نحوست کو زائل کرنے کے لئے تو یہاں پر بھی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی چھڑکا ہے اس کتے کی نحوست کو زائل کرنے کے لئے، اب پانی چھڑکنے سے نحوست کیسے زائل ہوتی ہے یہ اللہ جانے اور اللہ کا رسول جانے ہمیں درمیان میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اس کا ایک منشا تو یہ واقعہ ہی ہے اس سے پتہ چلا کہ کتا ایک انتہائی منحوس چیز ہے اور اس کے علاوہ اور وجوہات بھی ہوسکتی ہیں اور کچھ عرصے تک مدینہ منورہ میں یہ مہم جاری رہی ہے اور آہستہ آہستہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہم میں تخفیف فرمادی کہ پہلے ہر قسم کے کتے کو مارنے کا حکم دیا پھر آپ فرماتے کہ فلاں فلاں قسم کے کتے کو مارو اور فلاں قسم کے کتے کو نہ مارو یہاں تک کہ آخر میں آپ نے حکم دیا کہ جو کالا کتا ہو اس کو مارو باقیوں کو مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں اس حدیث میں یہ آرہا ہے کہ اگر کسی کا چھوٹا باغ ہوتا اور وہاں اس نے کتا رکھا ہوتا تو آپ اسے قتل کرنے کا حکم دیتے لیکن اگر بڑا باغ ہوتا تو اس کے کتے کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں حفاظت کے لئے کتا رکھنے کی اجازت ہے لیکن اس وقت جب کہ واقعتہً حفاظت کی ضرورت ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے حالات کے پیش نظر یہ محسوس فرمایا ہوگا کہ چھوٹے باغ میں حفاظت کے لئے کتا رکھنے کی ضرورت نہیں بغیر کتے کے بھی حفاظت ہوسکتی ہے البتہ بڑے باغ کی حفاظت کے لئے کتا رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۳)----- وعن عائشةَ رضی اللہ تعالیٰ عنها أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم لم یکن یترکُ فی بیته شیئاً فیه تصالیبُ، إلا نقضه۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کسی چیز میں تصویر نہیں چھوڑتے تھے مگر اس کو توڑ ڈالتے تھے۔

اس میں تصالیب کا لفظ آیا ہے تصالیب تصلیب کی جمع ہے اور تصلیب کا معنی ہوتا ہے صلیب کی صورت، تصویر کا معنی ہوتا ہے کسی بھی چیز کی صورت اور تصلیب کا معنی ہوتا ہے خاص چیز کی صورت یعنی صلیب کا نشان جو کہ عیسائیوں کے ہاں ایک مقدس چیز سمجھی جاتی ہے عام تصویریں اور اس میں فرق یہ ہے کہ عام تصویر میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ غیر اللہ کی عبادت کا نشان ہو یا اس میں شرک پایا جائے جب کہ صلیب کا نشان عام طور پر ہوتا ہی عبادت کے لئے ہے اس لئے یہ عام تصویر سے سخت چیز ہے۔

تصلیب یا تصالیب کا اصل معنی صلیب کا نشان ہے لیکن بعض حضرات نے یہ کہا کہ یہاں تصالیب سے مطلقاً تصویر مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں تصالیب کی جگہ تصاویر کا لفظ ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت شاذ ہے۔[1] کیونکہ اس ایک روایت کے علاوہ باقی تمام روایات میں تصالیب ہی کا لفظ آتا ہے اس لئے اگرچہ احتمال ہے کہ تصالیب کا عمومی معنی مراد ہو یعنی تصاویر لیکن بظاہر راجح یہ معلوم ہوتا واللہ اعلم۔ یہاں پر تصالیب سے مراد خاص صورت ہے یعنی صلیب کا نشان عام تصویر بھی ناجائز ہے لیکن اس کی حرمت دوسرے دلائل سے مستقل طور پر ثابت ہے یہاں جو بات ہو رہی ہے وہ صلیب کے نشان کی ہو رہی ہے البتہ عام تصویر کا حکم بطور استنباط ثابت ہوتا ہے۔

اِلا نقضہ ...... نقض کے اصل معنی توڑ دینا ہے لیکن یہاں مراد ہے کسی بھی طریقے سے اس کو زائل کر دینا جس میں اس کو مٹانا بھی شامل ہے اگر یہاں صلیب کا نشان مراد ہے تو نقض کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو توڑ دیتے تھے اور ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس میں ایسا تصرف کر لیا جائے یا ایسی تبدیلی کر لی جائے کہ وہ صلیب کا نشان نہ رہے اور اگر عام تصویر مراد ہو جیسا کہ ایک قول ہے تو بھی دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کو توڑ دیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس میں کوئی ایسا تصرف کیا جائے جس سے وہ تصویر جاندار کی تصویر کے حکم میں نہ رہے مثلاً اس پر سیاہی وغیرہ ڈال کر اس کا چہرہ وغیرہ مسخ کر دیا جائے جب چہرہ نہیں رہا تو اکثر علماء کے نزدیک یہ تصویر کے حکم میں نہیں رہا تو گویا مطلب یہ ہوا کہ جو تصویر ہوتی تھی اس کو حضور ﷺ مٹا دیتے تھے۔

(٤)----- وعنها، أنها اشترت نُمرُقةً فيها تصاوير، فلما رآها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم قامَ على البابِ، فلم يدخل، فعرفتُ في وجهه الكراهيةَ قالت: فقلتُ: يا رسول الله! أتوبُ إلى الله وإلى رسوله، ماأذنبتُ؟ فقال

(١) فتح الباری ج ١٠/ ص ٤٠٧ نقض الصور کتاب اللباس

رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما بالُ هذه النمرُقة؟ قلتُ: اشتريتُها لكَ لتقعدَ عليها، وتوَسَّدَها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ أصحابَ هذه الصوَرِ يُعذَّبونَ يومَ القيامةِ ويقال لهم: أحيوا ما خلقتُم وقال: إنَّ البيتَ الذى فيه الصورة لاتدخله الملائكة۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بچھونا یا تکیہ خریدا جس میں تصویریں تھیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو آپ دروازے پر ہی کھڑے ہوگئے اور گھر میں داخل نہیں ہوئے تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے میں ناپسندیدگی کے آثار کو پہچان لیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اللہ اور رسول کے سامنے توبہ کرتی ہوں میں نے کیا گناہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بچھونے کو رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں نے اسے آپ کے لئے خریدا ہے تاکہ آپ اس پر بیٹھیں اور اسے اپنا بستر (یا تکیہ) بنائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان تصویروں والوں کو (یعنی ان کے بنانے والوں کو) قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بنایا ہے اس میں زندگی ڈالو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ گھر جس میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔
اس سے ملتی جلتی راویتیں آگے بھی آرہی ہیں۔
اس حدیث میں نمرقہ کا لفظ آیا ہے کہ میں نے ایسا نمرقہ خریدا کہ جس میں تصویریں تھیں۔

نمرقہ کا معنی:-

نمرقہ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، پہلا معنی نیچے بچھانے کی چیز یعنی گدا، قالین وغیرہ اور نمرقہ کا دوسرا معنی تکیہ ہے جس پر ٹیک لگائی جائے اس طرح آگے چل کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے کہ **لتقعد عليها وتوَسَّدَها۔ توَسَّد** کے بھی دو معنی آتے ہیں توسد کا معنی ہے وسادہ بنانا وسادہ کے طور پر استعمال کرنا اور وسادہ کے دو معنی میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں اس کا معروف معنی تو گدا ہے جسے نیچے بچھا کر اس پر بیٹھا یا لیٹا جاتا ہے اور وسادہ کا دوسرا معنی تکیہ بھی آتا ہے تو یہاں دونوں معنی ہی مراد ہوسکتے ہیں اور اس کا انحصار اس پر ہے کہ نمرقہ کا کیا معنی ہے۔

حضرت عائشہؓ کا حسن ادب:-

اس حدیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک حسن ادب سمجھ میں آرہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دروازے پر ہی رک گئے اور آپ کے انداز سے پتہ چلا کہ آپ ناراض ہیں لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بالتعیین نہیں جان سکیں کہ میری کون سی غلطی کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے پوچھنا تھا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے آپ ناراض ہوئے ہیں تاکہ میں اپنی اس غلطی کی اصلاح کروں اس کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ جملہ استعمال فرمایا: "مَاذَا أذنبتُ" کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے لیکن یہ جملہ بولنے سے پہلے یہ کہا: أتوب إلى الله وإلى رسوله کہ اللہ اور رسول کے سامنے میں توبہ کرتی ہوں یہ اس لئے کہا گیا کہ اگر سیدھا کہہ دیا جائے: ماذا أذنبتُ تو اس کا مقصد تو درست تھا کہ حضرت عائشہ یہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ مجھے میری غلطی کا علم ہو جائے تاکہ میں اس کی اصلاح کروں اور توبہ کروں لیکن محاورات کے اعتبار سے اس کا یہ مطلب بھی بن جاتا ہے کہ میرا کوئی گناہ ہی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ماذا أذنبتُ میں نے کیا گناہ کیا یعنی اس کا معنی انکار بھی ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بے ادبی ہے تو حضرت عائشہ کا مقصد اگرچہ بے ادبی نہ ہوتا لیکن اس انداز کلام میں بے ادبی کا شائبہ ضرور ہو سکتا تھا تو حضرت عائشہ نے اس کو بھی زائل فرمایا کہ "أتوب إلى الله وإلى رسوله" جس میں اس بات کا اقرار کیا کہ میں یہ مانتی ہوں کہ مجھ سے کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے میں ضرور گناہ گار ہوں لیکن گناہ ہے کیا یہ مجھے پتہ نہیں ہے اس لئے براہ کرم مجھے بتا دیجئے تو پہلے اپنے غلط کار ہونے کا اقرار کیا اس کے بعد غلطی کی تعیین پوچھی ہے۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ فرمایا کہ أتوب إلى الله وإلى رسوله لفظ إلیٰ دونوں پر مستقل داخل کیا ہے حرف جر کا اعادہ کیا ہے یوں بھی کہا جا سکتا تھا: "إلى الله ورسوله" لیکن یہ کہا کہ إلى الله وإلى رسوله اس میں بھی بڑی لطیف بات ہے اور اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فہم اور ان کے گہرے ادراک کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ہے توبہ کرنا اس معنی میں کہ اللہ کے حکم کے خلاف اور ناجائز ہے اور ایک یہ ہے کہ ایک چیز اگرچہ ناجائز نہیں ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند ہے اور اس کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی ہے تو اگر یہ کہتی کہ أتوب إلى الله ورسوله تو اس کا یہ مفہوم بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ محض حرام ہونے اور گناہ ہونے کی حیثیت سے میں توبہ کرتی ہوں، محض شریعت کا حکم ٹوٹنے کی وجہ سے میں توبہ کرتی ہوں باقی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی یا نہیں ہوئی اس سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے، مجھے فکر صرف حکم شریعت کی اور اللہ کو راضی کرنے کی ہے اس سے

زائد مجھے کسی چیز کی فکر نہیں ہے تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے اس شائبہ کو دور کرنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: "أتوب إلى الله وإلى رسوله" رسول پر مستقل حرف داخل کیا کہ اللہ کو راضی کرنا مستقل مقصود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا مستقل مقصود ہے لہٰذا اگر آپ کو ناگواری ہوئی ہے اس وجہ سے کہ یہ اللہ کے حکم کے خلاف اور ناجائز ہے حکم شریعت ٹوٹا ہے تو بھی میں توبہ کرتی ہوں أتوب إلى الله لیکن اگر اللہ کے حکم کے خلاف نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور وجہ سے ناگواری ہوئی ہے تو بھی میں اللہ سے معافی مانگتی ہوں اور آپ کا بھی دل دکھا ہے تو آپ سے بھی معافی مانگتی ہوں یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لفظ إلی دوبارہ لا کر فرمائی۔

(۵)----- وعنها، أنها كانت اتخذت على سَهوَةٍ لها ستراً فيه تماثيل، فهتكه النبى صلى الله عليه وسلم، فاتحذت منهُ نمرقتين، فكانتا فى البيت، يجلسُ عليهما۔ (متفق عليه)

ترجمہ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی ایک ڈیوڑھی پر ایک پردہ لٹکایا جس میں تصویریں تھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھاڑ دیا تو حضرت عائشہ نے اس سے دو بچھونے بنالئے جو کہ گھر کے اندر رہتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بیٹھا کرتے تھے۔

اس حدیث میں ایک لفظ ستر ہے اور ستر کا معنی معروف ہے پردہ جو دروازے، کھڑکی یا دیوار وغیرہ پر لٹکایا جاتا ہے۔

لفظ سہوۃ کے معانی:-

ایک لفظ سہوۃ ہے سہوۃ کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں بعض نے سہوۃ کا معنی بیان کیا ہے ڈیوڑھی، یعنی گھر میں داخل ہوتے وقت جو تھوڑا سا مسقف حصہ ہوتا ہے۔

بعض نے اس کا معنی بیان کیا ہے چھوٹا کمرہ کوٹھڑی اور بعض نے سہوہ کا معنی بیان کیا ہے الماری اور بھی معنے بیان کئے گئے ہیں لیکن یہاں بظاہر پہلے دو معنی میں سے کوئی معنی مراد ہے اس لئے کہ اس روایت میں سہوہ کا لفظ آرہا ہے کہ اپنے سہوہ پر پردہ لٹکایا جب کہ دوسری میں باب کا لفظ آرہا ہے اپنے دروازے پر پردہ لٹکایا اور دروازہ یا تو ڈیوڑی کا ہو سکتا ہے اور یا پھر چھوٹے کمرے کا ہو سکتا ہے اس لئے پہلے دو معنے یہاں مراد لینا بظاہر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو پھاڑ دیا لیکن دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حکم دیا کہ وہ پھاڑ دیں تو ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پھاڑا ہو تو اصل میں پھاڑنے والی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت مجازاً کر دی گئی ہے آمر ہونے کی وجہ سے۔

تصویر والے پردے کو پھاڑنے کی وجہ:-

اس کو پھاڑا کیوں؟ ایک تو یہ کہ پھاڑ کر اس کا بچھونا بنالیا گیا اور جب بچھونا بنایا تو وہ تصویر اونچی جگہ پر نہ رہی بلکہ اہانت کی جگہ پر ہو گئی اور جو تصویر اہانت کی جگہ پر ہو وہ حرام نہیں ہے یعنی اس کا رکھنا حرام نہیں ہے اور دوسرا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو اس لئے پھاڑا ہو تاکہ تصویر والا حصہ درمیان سے پھٹ جائے آدھی تصویر ایک طرف ہو جائے اور آدھی تصویر ایک طرف ہو جائے اور وہ تصویر تصویر ہی نہ رہے مثلاً چہرے کا آدھا حصہ ایک حصے میں چلا گیا اور دوسرا حصہ دوسری طرف چلا گیا تو آدھا چہرہ تصویر نہیں رہتی اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پھاڑا یا پھاڑنے کا حکم دیا۔

(٦)----- وعنها، أنَّ النبی صلی اللہ علیه وسلم خرج فی غزاة، فأخذتُ نمَطاً فسترتُه علی الباب، فلما قدم، فرأی النَّمط، فجذبه حتی هتکه، ثم قال: إن اللہ لم یأمرنا أن نکسوَ الحجارةَ والطینَ۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں تشریف لے گئے تو میں نے ایک بچھونا لیا اور اس کو دروازے پر پردے کے طور پر لٹکا دیا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو دیکھا اور اس کو کھینچا یہاں تک کہ اس کو پھاڑ دیا پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا کہ ہم گارے اور پتھروں کو لباس پہنائیں۔

اس حدیث میں لفظ نمط آرہا ہے اور نمط اصل میں نیچے بچھانے والی چادر کو کہتے ہیں لیکن عموماً جو چادر نیچے بچھائی جا سکتی ہے اس کو بطور پردے کے لٹکایا بھی جا سکتا ہے تو وہ نیچے بچھانے والی چادر تھی لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے پردہ بنا کر دروازے پر لٹکا دیا اور اس پردے پر تصویر تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے تشریف لائے تو اس پر اظہار ناراضگی فرمایا اور اس کو کھینچا اور کھینچ کر پھاڑ دیا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی روایت میں جو واقعہ تھا اس روایت میں بھی وہی واقعہ ہے۔

اس پردے کو پھاڑنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو پوری طرح پر چیر کر دو ٹکڑے کر دینا اس معنی میں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے چیرا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت مجازی ہو اور پھاڑنے کا دوسرا معنی یہ ہے کہ چونکہ پردہ دروازے پر لگا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کے ساتھ اس کو کھینچا اور کھینچ کر اتار دیا اس عمل کے دوران بھی اس کا کچھ حصہ پھٹ گیا لیکن چیر کر دو ٹکڑے نہیں ہوا اس معنی میں پھاڑنے کی نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حقیقی ہے تو "هَتَكَ" کا بعض جگہوں پر پہلا معنی مراد ہے اور بعض جگہوں پر دوسرا معنی مراد ہے یہ بات اگر آپ ذہن میں رکھیں گے تو آپ کے لئے احادیث میں تعارض کو حل کرنا بڑا آسان ہو جائے گا کیونکہ اس واقعہ کے بارے میں حدیثوں کے الفاظ میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔

تصویر والے پردے پر اظہار ناراضگی کی وجہ:-

دوسری بات یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ پچھلی روایت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار ناراضگی اس لئے فرمایا کہ تصویر ناجائز ہے لیکن اس حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو خلاف زہد ہونے کی وجہ سے اتارا ہے ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم عمارتوں کو لباس پہنائیں اور ان کو خوب صورت بنائیں خود تو پہننے کو سب کو پورے کپڑے مل نہیں رہے انسانوں کو تو ابھی پورا لباس مل نہیں رہا اور ہم محض شوقینی اور شوبازی کے طور پر اپنی عمارتوں پر پردے لٹکانے لگ جائیں یہ کم از کم ہمیں زیب نہیں دیتا ایک تو ویسے ہی ایسے غربت کے حالات میں اس طرح کا تعیش ٹھیک نہیں ہے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اسراف حالات کے بدلنے سے بھی مختلف ہو جاتا ہے ایک ماحول میں ایک چیز اسراف ہے اور دوسرے ماحول میں وہ چیز اسراف نہیں ہے، جہاں خوش حالی ہے خوش حالی کا دور دورہ ہے تو وہاں پر تھوڑی بہت خوبصورتی کی چیز لٹکالی تو اور بات ہے اور جہاں کھانے کو نہیں مل رہا اور پہننے کو پورا لباس نہیں مل رہا تو وہاں اس طرح کے نخرے یقیناً اسراف میں داخل ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا ہے یا تو اسراف کی وجہ سے یا خلاف زہد ہونے کی وجہ سے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل اظہار ناراضگی تو فرمایا تصویر کے حرام ہونے کی وجہ سے اصل وجہ تو یہ تھی جو کہ دوسری روایت سے معلوم ہو رہی ہے ہاں البتہ آپ نے اس کو مزید تاکید کے طور پر یہ بات فرمائی کہ جان دار کی تصویر حرام ہے اور ویسے بھی اس طرح کے نخرے ہمیں زیب نہیں دیتے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اس پر تو میں ناراض ہوا ہوں اس وجہ

سے کہ اس پر تصویر ہے اور تصویر حرام ہے، لیکن اگر جان دار کی تصویر نہ ہو تو اگرچہ وہ حرام نہیں ہے لیکن ہمیں وہ بھی لٹکانے نہیں چاہئے یہ بات بتلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بات بھی فرمائی تو دونوں باتیں آپ نے اس موقع پر فرمائی ہیں ایک وجہ یہ بیان فرمائی کہ تصویر حرام ہے اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ گارے اور اینٹوں کو لباس پہنانا ہمیں زیب نہیں دیتا کسی راوی نے وہ وجہ ذکر کردی اور کسی راوی نے یہ وجہ ذکر کردی لیکن فرمائی آپ نے دونوں باتیں ہیں۔

یہ بات حنفیہ اور جمہور فقہاء کے نقطہ نظر کے مطابق ہے جو کپڑے وغیرہ پر بنی ہوئی تصویر (غیر سایہ دار) تصویر کو بھی حرام کہتے ہیں مالکیہ وغیرہ بعض فقہاء کے مذہب کے مطابق یہ حدیث محمول ہی خلاف زہد کراہت تنزیہی پر ہے یہ واقعہ روایت کرنے والے بعض صحابہ و تابعین کا نقطہ نظر بھی یہی ہے اس کے مطابق اس حدیث میں توجیہ کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ ظاہر پر محمول ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آگے آنے والا عنوان ''جمہور کے دلائل پر ایک نظر''۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ میں اختلاف روایات:-

حضور اقدس ﷺ کے اظہار ناراضگی کا ذکر مختلف روایتوں کے اندر آرہا ہے اور ان روایتوں میں کئی قسم کے اختلافات بھی ہیں لیکن ان میں سے اکثر اختلافات ایسے ہیں جن میں تطبیق ممکن ہے مثلاً یہ کہ یہ پردہ کس نے پھاڑا تو اس میں یہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ جہاں تک اس کو اتارتے ہوئے پھاڑنے کا تعلق ہے تو یہ حضور اقدس ﷺ نے کیا اور جہاں تک اس کو چیرنے کا تعلق ہے تو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس کو پھاڑا ہو اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت مجازی ہو۔

اس طرح جس چیز پر تصویر تھی اس کے بارے میں بھی روایتیں مختلف ہیں بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پردہ تھا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچھونا تھا لیکن اس سلسلے میں بھی اکثر روایات قابل تطبیق ہیں اس لئے کہ بعض کپڑے ایسے ہوتے ہیں جو بچھونے کے طور پر بنے ہوتے ہیں لیکن پردے کے طور پر اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے تو وہی کپڑا ہے جس کو بعض نے پردے سے تعبیر کردیا ہے اور بعض نے بچھونے سے تعبیر کردیا یا پردے سے تعبیر اس لئے کیا کہ اب پردے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اور جس نے اس کو بچھونا کہا اس کو اصل وضع کے اعتبار سے کہا۔

یہ واقعہ ایک دفعہ ہوا یا متعدد بار؟ ...... اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے یا متعدد بار پیش آیا ہے اور سوال اس لئے بھی اہمیت

رکھتا ہے کہ بعض حضرات نے تصویر کے جواز پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے یعنی ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو ناپسند فرمایا دوسری مرتبہ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ پردہ لگالیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ سمجھیں ہیں کہ یہ کراہت تنزیہی ہے یا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ سمجھیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اس لئے نہیں منع فرمایا کہ یہ حرام اور ناجائز ہے بلکہ خلاف زہد ہونے کی وجہ سے منع فرمایا ہے اس لئے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہوتا تو دوبارہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایسا کام نہ کرتیں تو چونکہ ان حضرات نے تصویر کے جواز کی بنیاد تعدد واقعہ کو بنایا ہے اس لئے اس سوال کا جائزہ لینا اہم ہو گیا ہے کہ یہ واقعہ ایک بار پیش آیا یا متعدد بار تو ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے میں جو ان کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' میں چھپا ہوا ہے تفصیل سے مختلف روایات کو سامنے رکھ کر یہ ثابت فرمایا ہے کہ یہ واقعہ ایک ہی بار پیش آیا ہے باقی جن حضرات کو شبہ پڑ گیا کہ متعدد بار پیش آیا ان کو یہ شبہ روایات میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے لیکن یہ اختلاف ایسا ہے جو کہ قابل تطبیق ہے اس لئے اس اختلاف روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا اور ویسے بھی تعدد واقعہ اس لئے بھی انتہائی بعید ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کراہت تنزیہی کے طور پر ہی سہی خلاف زہد ہونے کی وجہ ہی سے سہی لیکن ایک چیز کو جب ناپسند کر دیا تو یہ بہت بعید ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وہی چیز دوبارہ لٹکائیں اگرچہ آپ نے حرام قرار نہ دیا ہو لیکن اتنا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پتہ چل گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہیں ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پتہ چل گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہیں ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوبارہ وہ کام کیسے کر سکتی ہیں۔

کچھ روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تعدد واقعہ کے قول کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں ہے مثلاً یہی نمرقہ والی روایت اور نمرقہ، بچھونے کو یا قالین وغیرہ یا نیچے بچھانے والی چادر کو کہتے ہیں باقی روایتوں کو جن میں بچھونے کے لفظ آئے ہیں وہاں یہ توجیہ کر لی کہ کپڑا بچھونے کے لئے بنا تھا لیکن بطور پردے کے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہاں تو حضرت عائشہ تصریح فرما رہی ہیں کہ میں نے اس کو خریدا ہی اس لئے ہے کہ آپ اس کو بطور بچھونے کے استعمال کریں یا بطور تکیے کے استعمال کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس واقعے سے الگ ہے جس میں دروازے پر پردہ لٹکایا گیا تھا اس لئے تعدد واقعہ کے قول کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، پھر ایک اور واقعہ بھی آتا ہے وہ یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک الماری

پر پردہ لٹکا ہوا تھا اور کافی عرصے تک وہ پردہ لٹکا رہا لیکن ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یہ پردہ ہٹادو اس لئے کہ اس پر جو تصویریں اور نقش بنے ہوئے ہیں یہ نماز کے دوران میری توجہ کو بٹاتے ہیں ان کی وجہ سے میری توجہ بٹتی ہے اس لئے اس کو یہاں سے ہٹادو یہ بھی ایک واقعہ ہے۔

ساری صورت حال کو سامنے رکھ کر ان روایات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے ''واللہ اعلم'' وہ یہ ہے کہ یہاں پر تین واقعے الگ الگ ہیں۔

ایک واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے دروازے پر پردہ لٹکایا اور اس میں جاندار چیزوں کی تصویریں تھیں تو حضور اقدس ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا اور اس پردے کو چاک کر کے اس کے دو حصے کر دیئے۔

دوسرا واقعہ پیش آیا جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی طرح کا تصویر والا کپڑا بطور بچھونے کے استعمال فرمایا اور وہ حضرت عائشہؓ نے لیا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔

اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سے منع فرما دیا ہے تو اب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ کام کیسے کر لیا اس لئے کہ حضرت عائشہ نے یہ سمجھا ہو گا کہ آپ نے منع فرمایا ہو گا اس تصویر سے جو کہ دروازے پر لٹکی ہو اور وہ تصویر جو کہ نیچے روندی جائے اس سے منع نہیں فرمایا اور واقعتاً مسئلہ بھی یہی ہے کہ وہ تصویر ممنوع نہیں ہے اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا اور اسے نیچے بچھا لیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ناپسند فرمایا اس وجہ سے نہیں کہ اس طرح کی تصویر رکھنا حرام ہے بلکہ اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے لئے مناسب نہیں سمجھا اگرچہ فی نفسہٖ اس کی توہین ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔

تیسرا واقعہ پیش آیا ہے جس میں ایک پردہ آنحضرت ﷺ کی الماری پر لگا رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں اسے ہٹانے کا حکم نہیں دیا لیکن جب آپ کی توجہ نماز میں بٹنے لگی تو اسے ہٹانے کا حکم دیا لیکن کسی بھی روایت میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ پردے پر جو نقش تھے یا تصویریں تھیں وہ کسی جاندار چیز کی تھیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بے جان چیزوں کی تصویریں تھیں اس لئے ابتداء میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز ہونے کی وجہ سے گوارہ کر لیا لیکن جب نماز میں توجہ بٹنے کا باعث بنیں تو اسے ہٹانے کا حکم دے دیا۔

یہیں سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نمازی کے آگے ایسی چیز نہیں ہونی چاہئے اور ایسے نقش و نگار نہیں ہونے چاہئیں جو نماز کے دوران اس کی توجہ بٹنے کا باعث بنیں اس لئے قبلے کی

دیوار میں کم از کم قد آدم تک نقش و نگار بنانا درست نہیں ہے اس لئے کہ نمازی کی توجہ نماز کے دوران اس کی طرف ہوسکتی ہے۔

تو اب یہ تین واقعے الگ الگ ہو گئے لیکن جاندار کی تصویر غیر محل اہانت میں ہو یہ واقعہ صرف ایک دفعہ پیش آیا اس میں تعدد نہیں یعنی تعدد تو ضرور ہے لیکن دوسری مرتبہ کا واقعہ ایسی تصویر کا ہے جو کہ محل اہانت میں تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے جائز سمجھتے ہوئے بچھالیا اور واقعتاً ہے بھی جائز اور ایک واقعہ ایسی تصویر کا ہے جو غیر جاندار چیز کی ہے جاندار چیز کی تصویر ہو اور اس کو لٹکایا گیا اس کو روزانہ جارہا ہو یہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا اس طرح کے واقعے میں تعدد نہیں اور اگر اس طرح کے واقعے میں تعدد ہوتا تو شاید کوئی یہ کہہ سکتا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں کراہت تنزیہی ہے یا خلاف زہد ہونے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا لیکن اس طرح کا واقعہ صرف ایک دفعہ پیش آیا یہ متعدد بار پیش نہیں آیا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ایک چیز کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرمائیں اور بعینہٖ وہی کام حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دہرائیں ہاں اس سے مختلف کام حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کرلیں یہ ہوسکتا ہے جیسے کہ نیچے بچھالیا یا الماری پر غیر جاندار تصویروں والا پردہ لگالیا، تو واقعے میں تعدد ضرور ہے لیکن یہ تعدد ایسا نہیں جس سے تصویر کے جواز پر استدلال کیا جاسکے۔

(۷)----- وعنها، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: أشد الناس عذاباً یوم القیامة الذین یضاهون بخلقِ اللہِ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سخت ترین عذاب والے لوگ وہ ہوں گے جو کہ اللہ کی صفت تخلیق میں مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

(۸)----- وعن أبی هریرة، قال: سمعتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: قال اللہ تعالیٰ: ومَن أظلم ممَّن ذهَبَ یخلق کخلقِی، فلیخلقوا ذرَّة أو لیخلقوا حبَّة، أو شعیرة۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (یعنی یہ حدیث قدسی ہے) کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے جو یہ ارادہ کرے کہ میرے خالق ہونے کی طرح خالق بنے ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ ذرا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں یا ایک دانہ یا جو بنا کر دکھائیں۔

سب سے بڑے ظالم:-

مطلب یہ ہے کہ جو آدمی تصویر بناتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی نقالی کی کوشش کر رہا ہے کہ انسان اور حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں بھی کسی نہ کسی درجے میں انسان اور حیوان بنا سکتا ہوں یہ حق تعالیٰ کی صفت خالقیت میں برابری اور ہمسری کا دعویٰ ہے یا برابری اور ہمسری کا دعویٰ نہیں تو کم از کم مشابہت کا دعویٰ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں خالق میں بھی ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا مقابلہ ہے کہ آپ یہ کام کرتے ہیں تو میں بھی یہ کام کرتا ہوں دو قدم پیچھے سہی لیکن کر میں بھی لیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے اگر بالفرض واقعتاً کوئی خالق ہوتا تو بے شک دعویٰ کرتا لیکن کر کچھ نہیں سکتا ہے اور دعوے بڑے بڑے کرتا ہے اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے اگر واقعتاً ہی خالق ہونے کا دعویٰ ہے تو یہ مصنوعی تصویریں بنانے کی بجائے یہ مصنوعی خالقیت کی بجائے اصل خالقیت کر کے دکھاؤ کہ **فلیخلقوا ذرّۃ** کہ تم ہاتھیوں کی گھوڑوں کی بڑی بڑی تصویریں بناتے ہو ان کے خالق تو کیا بنو گے تم تو ایک چیونٹی بھی پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو اور چیونٹی تو جاندار چیز ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری طرف سے چیلنج ہے کہ بے جان چیزیں بنا کر دکھادو **فلیخلقوا حبّۃ أو شعرۃً** حبہ سے مراد بظاہر گندم کا دانہ ہے کہ گندم کا ایک دانہ اگا کر نہیں بلکہ پیدا کر کے دکھاؤ اور جو کا ایک دانہ پیدا کر کے دکھاؤ، ایک ہے کاشت کرنا پیدا کرنا نہیں کیونکہ کاشت کرنے میں صرف اسباب کو استعمال کیا ہے باقی اس کو پیدا تو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے **ما کان لکم أن تنبتوا شجرھا** کہ ان درختوں کو اگانا بھی تمہارا کام نہیں ہے تو حیثیت تمہاری یہ ہے کہ نہ حیوان میں سے کوئی چیز پیدا کر سکتے ہو نہ نباتات میں سے کوئی چیز نہ جمادات میں سے کوئی چیز اور تصویر بنا کر اللہ تعالیٰ کے مشابہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ بڑی زیادتی کی بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ تصویر بنانے والوں کو جو عذاب ہوگا ان میں سے ایک یہ بھی ہے جو آگے حدیث میں آرہا ہے کہ یہ ڈھانچا بنایا تھا اب اس میں روح بھی ڈالو تب پتہ چلے گا تم کتنے بڑے خالق ہو اگر کرنا ہے کام تو پورا کر کے دکھاؤ ادھورے کام کر کے برابری کا دعویٰ کرنا تو ٹھیک نہیں ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تصویر بنانے کی حرمت کی وجہ محض شرک نہیں بلکہ اس حرمت کی وجہ **المضاھاۃ بخلق اللہ** ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نقالی کا دعویٰ ہے۔

(۹)----- وعن عبد اللہ بن مسعود، قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: أشد النّاس عذابًا عند اللہ المصوِّرون۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ترین عذاب والے لوگ تصویریں بنانے والے ہوں گے۔

مصورین کے لئے سخت عذاب:۔

اس حدیث میں مصورین کے لئے اشد الناس عذاباً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ سب سے سخت عذاب ان کو ہوگا اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ تصویر بنانا زیادہ سے زیادہ ایک گناہ کبیرہ ہے اور مرتکب کبیرہ کو کتنا ہی سخت عذاب ہو کفار سے تو بہر حال کم ہی ہوگا، دوسرا یہ کہ قرآن کریم میں صراحتاً فرعون اور آل فرعون کے بارے میں أدخلوا آل فرعون اشد العذاب آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سخت ترین عذاب فرعونیوں کو ہوگا تصویر بنانے والوں کا عذاب اس سے کم ہوگا تو ان کا عذاب سخت ترین کیسے ہوگا اس اشکال کے علماء نے کئی جوابات دیئے ہیں۔

ایک جواب تو امام طحاوی وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ اشد الناس عذاباً یعنی سخت ترین عذاب والے لوگ یہ درحقیقت فرد یا افراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک جنس ہے یعنی سخت ترین عذاب ایک جنس ہے جس میں آگے کئی انواع ہیں یعنی سخت ترین عذاب بھی کئی طرح کے ہیں کسی کو کوئی ملے گا کسی کو کوئی ان میں سے بھی جو سب سے سخت ہوگا فرعون کے لئے ہوگا اور اس کے بعد اور کفار اور مشرکین کے لئے ہوگا درجہ بدرجہ اور کچھ سخت ترین عذاب ایسے ہوں گے جو بعض گناہ گاروں کے لئے ہوں گے تو گویا سخت ترین عذاب کے اندر بھی آگے کئی قسمیں ہیں اور انواع ہیں اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو الفصل الثالث میں تیسرے نمبر پر آرہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب پانچ قسم کے لوگوں کو ہوگا ایک تو وہ جو کسی نبی کو قتل کرے (نعوذ باللہ من ذالك) اور دوسرے وہ جس کو کوئی نبی جہاد میں قتل کردے ظاہر ہے وہ کافر ہونے کی حالت میں مرا ہوگا تبھی تو نبی نے اس کو قتل کیا اور تیسرے وہ شخص جو نعوذ باللہ اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کردے اور چوتھے تصویریں بنانے والے اور پانچویں ایسا عالم جو اپنے علم سے نفع نہ اٹھائے تو یہاں پانچ قسم کے لوگوں کو سخت ترین عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ سارے گناہ ایک درجے کے نہیں ہیں تو معلوم ہوا کہ سخت ترین عذاب میں بھی آگے درجے اور قسمیں ہیں۔

دوسرا جو اسی سے ملتا جلتا ہے وہ یہ کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہ کہا کہ اس حدیث میں اشد الناس، سخت عذاب کی اضافت الناس کی طرف کی گئی ہے یعنی لوگوں میں سے سب سے سخت عذاب، تو یہاں الناس سے مراد سارے لوگ نہیں ہیں بلکہ کچھ لوگ ہیں تو یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے لوگوں میں سے سخت ترین عذاب تصویریں بنانے والوں کو ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں میں سے سخت ترین عذاب تصویریں بنانے والوں کو ہوگا اور ان لوگوں میں فرعون اور آل فرعون شامل نہیں ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں جن مصورین کی بات ہو رہی ہے یہ سارے کے سارے مصورین نہیں بلکہ وہ مصورین مراد ہیں جو ایسی تصویریں بناتے ہیں جن کی عبادت کی جائے اور ان کو پتہ بھی ہو کہ ان کی عبادت کی جائے گی اور اسی مقصد کے لئے بنائیں تو ظاہر ہے کہ یہ محض گناہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہے بلکہ شرک پھیلانے کا ایک طریقہ ہے اور اس پر اگر سخت ترین عذاب ہو اور فرعون وغیرہ کے برابر عذاب ہو تو کوئی بعید نہیں۔

یا وہ مصورین مراد ہیں جن کے فعل سے از خود اللہ کی صفت خالقیت کی نقالی سمجھ میں نہیں آ رہی بلکہ ان کا مقصد ہی اس نقالی کا ہے تو ظاہر ہے یہ بڑی جرأت اور بے باکی کی بات ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے تو اس پر سخت ترین عذاب ہو تو کوئی بعید نہیں۔

تیسرے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ یہاں تمام مصورین مراد نہیں ہیں بلکہ خاص قسم کے مصورین مراد ہیں اور یہ توجیہ اس لئے بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ تصویر بنانا اگرچہ گناہ ہے لیکن عام قسم کی تصویریں جو عبادت کے لئے اور اللہ کی صفت خالقیت کی نقالی کی نیت سے نہیں بنائی جاتیں ان کا گناہ قتل، چوری، زنا، ڈاکہ اس طرح کے کاموں سے بہر حال بڑھ کر نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ گناہ ایسے ہیں جو تمام شرائع میں بالاتفاق حرام رہے ہیں اور دنیا کا کوئی بھی مذہب حتیٰ کہ غیر آسمانی مذہب بھی ان کو درست قرار نہیں دیتا، تو ظاہر ہے عام قسم کی تصویر سازی کی شناعت اس کے برابر نہیں ہو گی اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں المصورین عام نہیں ہے بلکہ خاص قسم کے مصورین مراد ہیں۔

لیکن یہ مطلب نہیں کہ ان خاص قسم کے مصورین کے علاوہ یعنی جو کہ عبادت کی نیت سے یا نقالی کی نیت سے بنائیں باقی تصویریں بنانا جائز ہے اور وہ حرام نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اشد الناس عذابا کی یہ خاص وعید عام مصورین کے بارے میں نہیں ہے لیکن عام تصویر سازی کی حرمت دوسرے دلائل سے مستقل طور پر ثابت ہے اس لئے حرام بہر حال وہ بھی ہے۔

یہ بات بہت سارے شارحین حدیث نے کہی ہے کہ یہاں سب مصورین مراد نہیں بلکہ خاص مصورین مراد ہیں تو اس سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے اور تصویر کے کسی مجوز کو یہ استدلال نہیں کرنا چاہئے کہ خاص قسم کی تصویر سازی کے علاوہ باقی تصویر سازی جائز ہو گئی ہے کیونکہ ایک سخت ترین وعید کسی گناہ کے بارے میں نہ ہونا اور بات ہے اور اس کا جائز ہونا اور بات ہے ہو سکتا کہ ایک خاص گناہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جائز بھی ہو جائے اس کے جائز ناجائز ہونے کے لئے دوسرے دلائل دیکھنے پڑیں گے اور دوسرے دلائل سے عام تصویر سازی کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہے۔

(۱۰)----- وعن ابن عبَّاس، قال: سمعتُ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم یقول: کلُ مُصَوِّرٍ فی النار، یُجعَل له بکل صورة صوَّرها نفساً، فیعذبه فی جهنم قال ابن عباس: فان کنتَ لأبدَّ فاعلاً: فاضنع الشجر وما لاروح فیه۔ (متفق علیه)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر تصویر بنانے والا دوزخ میں ہوگا اور اس کے لئے ہر ایسی تصویر کے بدلے میں جو اس نے بنائی ہے اللہ تعالیٰ ایک جان بنائیں گے جو اسے جہنم میں عذاب دے گی۔

جتنے گھوڑے بنائے اللہ بھی اتنے جاندار گھوڑے بنائیں گے اور وہ اسے لتاڑیں گے جتنے ہاتھی بنائیں گے اللہ بھی اتنے ہاتھی بنائیں گے جتنے انسان بنائیں گے اللہ تعالیٰ انسانوں جیسی اتنی ہی کوئی مخلوق بنائیں گے جو اسے مارے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نے ضرور یہ کام کرنا ہی ہے تو درختوں کی تصویر بنالو اور ایسی چیزوں کی تصویر بنالو جن کے اندر روح نہیں ہوتی یعنی غیر جاندار چیز کی تصویر بنالو اور اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کا جواز حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حدیث سے ثابت کر رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنی تصویریں بنائے گا ہر تصویر کے بدلے میں ایک جاندار مخلوق اللہ تعالیٰ بنائیں گے وہ اسے عذاب دے گی اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعید جاندار کی تصویر میں ہے بے جان کی تصویر میں نہیں ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت میں مشابہت کا دعویٰ جیسے جاندار چیزوں کی تصویر میں پایا جاتا ہے بے جان چیزوں کی تصویروں میں بھی پایا جاتا ہے اس لئے کہ ایسا تو نہیں ہے کہ جاندار چیزوں کے خالق تو اللہ تعالیٰ ہوں اور بے جان چیزوں کے خالق اللہ تعالیٰ نہ ہوں بلکہ بندے بھی ہوں پھر حکم میں یہ فرق کیوں کیا گیا تو اس کی وجہ در حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ہر چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں چاہے وہ جاندار میں سے ہو نباتات میں سے ہو یا جمادات میں سے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ جاندار چیزوں کے علاوہ باقیوں کے بنانے میں اسباب کے درجے میں انسان کا دخل ہوتا ہے اور یہ دخل حیوانات کی نسبت کافی زیادہ ہوتا ہے اگرچہ حیوان کی پیدائش میں بھی انسان کا کسی نہ کسی درجے میں سبب کے طور پر دخل ہوتا ہے لیکن وہ کافی کم ہوتا ہے اور باقی چیزوں میں زیادہ ہوتا اس لئے ان میں **المضاهاة بخلق الله** کو اتنا برا نہیں سمجھا گیا یہ بات ایک حکمت

کے درجے میں ہے وگرنہ اصل بات یہی ہے کہ اللہ ورسول کو وہ ناپسند ہے اور یہ ناپسند نہیں ہے ان کو یہ کیوں ناپسند ہے اور یہ کیوں ناپسند نہیں ہے یہ اللہ ورسول جانیں ہمارا کام حکم ماننا ہے بحث کرنا نہیں ہے۔

(۱۱)----- وعنه، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من تحلَّم بحُلم لم يره، كلف أن يعقد بين شعيرتين، ولن يفعل، ومن استمع إلى حديثِ قومٍ وهم له كارهون، أويفرون منه، صُبَّ في أذنيه الآنكُ يوم القيامة ومن صَوَّر صورة عذّبِ و كُلِّف أن ينفخ فيها، وليس بنافخ- (رواه البخاري)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی ایسا خواب گھڑے جو اس نے دیکھا نہ ہو اسے اس بات کا مکلّف بنایا جائے گا کہ وہ جو کے درمیان گرہ لگائے اور وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکے گا اور جو آدمی ایسے لوگوں کی بات سننے کی کوشش کرے جو اسے سنانے کو ناپسند کرتے ہوں یا یہ فرمایا کہ وہ اس سے دور بھاگتے ہوں اس کے دونوں کانوں میں قیامت کے دن پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا اور جو آدمی کوئی تصویر بنائے تو اسے عذاب دیا جائے گا اور اسے اس بات کا مکلّف بنایا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے حالانکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔

جھوٹا خواب بیان کرنے کا گناہ:-

یہاں تین کاموں پر وعید بیان فرمائی ہے پہلا کام تو یہ ہے کہ آدمی نے کوئی خواب دیکھا نہیں اور یوں ہی جھوٹ موٹ کہتا ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے تو اس کی سزا یہ بیان فرمائی کہ اسے کہا جائے گا کہ دو جو لے کرانہیں گرہ لگاؤ اب ظاہر ہے کہ جو کو تو گرہ نہیں لگائی جاسکتی اس سزا کا مطلب کیا ہے تو اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔

ایک مطلب تو یہ ہے کہ اصل سزا تو کوئی اور ہو گی اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا جہنم کا عذاب ہو گا اور جو کو گرہ لگانا یہ عذاب ٹالنے کی شرط ہو گی کہ جب تک یہ گرہ نہیں لگتی اس وقت تک تجھے عذاب ہو گا یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ قرآن کریم میں آیا ہے: **حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاط** ۔ کہ یہ کافر جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے اور ظاہر ہے کہ اونٹ اس میں سے نہیں گزرسکتا لہٰذا یہ بھی نہیں جائیں گے تو جب تک گرہ نہیں لگتی اس وقت تک عذاب ہوتا رہے گا اگر گرہ لگالو گے تو سزا پوری ہونے سے پہلے تمہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا لیکن اگر گرہ نہیں لگاسکے تو پوری سزا بھگت کے

جتنی اللہ تعالیٰ نے اس کی مقرر کی ہے پھر جہنم سے نکل سکو گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی بذات خود ایک سزا ہو گی اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آدمی کوئی باریک کام کر رہا ہو اور مسلسل کوشش کرنے سے وہ کام نہ ہو رہا ہو تو آدمی کے اندر ایک خاص قسم کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے عام حالات میں تو آدمی اس جھنجھلاہٹ سے بچنے کے لئے وہ کام ہی چھوڑ دیتا ہے اور عام طور پر بڑے جذباتی انداز میں چھوڑ دیتا ہے اگر آپ کو یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو کبھی اپنی گھڑی کھول کر بیٹھ جائیں اور اس کے پرزے ہٹا کر دوباہ لگانے کی کوشش کریں اور ایک باریک پیچ اپنی جگہ پر فٹ نہیں ہو رہا تو کچھ دیر تو آپ اس کو لگانے کی کوشش کریں گے لیکن کچھ وقت کے بعد طبیعت میں ایسی جھنجھلاہٹ پیدا ہو گی ہو سکتا ہے آپ گھڑی اٹھا کر ہی پھینک دیں اور دور اس کو ماریں تو اسی طرح یہاں پر بھی ان کو کہا جائے گا یہ لو دو جَو اور ان کو گرہ لگاؤ اب وہ لگا نہیں سکیں گے تو ایک نفسیاتی تکلیف میں مبتلا ہوں گے دنیا کے اندر تو آدمی اس تکلیف سے جان چھڑا لیتا ہے لیکن وہاں یہ کرے کہ ان دو جَو کو پھینک دے کہ میں نہیں لگاتا تو یہ نہیں ہو گا مسلسل یہ کام کرنا پڑے گا اور مسلسل اس جھنجھلاہٹ میں رہے گا اور اس تکلیف کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنی زیادہ ہوتی ہے یعنی دنیا میں یہ تکلیف اتنی ہوتی ہے کہ آدمی جھنجھلا کر چیز دور پھینک دیتا ہے حالانکہ بسا اوقات قیمتی چیز ہوتی ہے لیکن تکلیف اتنی ناقابل برداشت ہوتی ہے کہ چند لمحے اسے گوارہ نہیں کر سکتا اور جب وہاں مسلسل یہی جھنجھلاہٹ ہو گی تو اس کا کیا عالم ہو گا، تو یہ ایک مستقل سزا ہو گی اور شاید جرم اور سزا میں مناسبت یہ ہو کہ جرم بھی نفسیاتی قسم کا ہے کہ خواب گڑگڑ کہ بیان کر رہا ہے کہ خواب میں مجھے فلاں بزرگ ملے فلاں شئی ملی فلاں ملے اور انہوں نے مجھے یہ بشارت دی یہ کہا اور یہ کہا اور مجھے فلاں مقام پر فائز کر دیا تو اللہ تعالیٰ بھی اسے جسمانی سزا کے ساتھ نفسیاتی سزا دیں گے۔

یہاں بعض شارحین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ جھوٹا خواب بیان کرنا یہ بھی ایک جھوٹ ہی ہے جس طرح زندگی کے بارے میں جھوٹ بولنا گناہ ہے اسی طرح نیند کے بارے میں بھی جھوٹ بولنا گناہ ہے تو اس گناہ پر اس سے زیادہ وعید کیوں ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آ رہا کہ عام جھوٹ سے یہ سزا زیادہ ہے باقی نوعیت مختلف ہے لیکن کون سی سزا تھوڑی کون سی زیادہ اس کا فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ بہر حال اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہیں اللہ اس کو بڑا سمجھتے ہیں وہ بڑی سزا دیتے ہیں اس کی وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بات وہی رہے گی جو اللہ اور رسول نے فرمادی۔

تیسرا یہ ہے کہ اصل میں خواب کے بارے میں جو آدمی جھوٹ بولتا ہے اس میں صرف جھوٹ ہی

نہیں ہوتا بلکہ ریاکاری اور مکاری بھی ہوتی ہے عام طور پر اس جھوٹ کا مقصد اپنے کسی کمال یا اونچے رتبے کا لوگوں کے دلوں میں سکہ بٹھانا مقصد ہوتا ہے تو جھوٹ کے ساتھ ساتھ اس میں ریاکاری مکاری جب جاہ تکبر جیسی بہت ساری بیماریاں ہوتی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس بنیاد پر یہ گناہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں عام جھوٹ سے بڑھ کر ہو۔

کسی کا راز حاصل کرنے کا گناہ:-

دوسرا گناہ یہ ہے کہ آدمی ایسے لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش کرے جو اسے سنانا نہیں چاہتے باتوں سے مراد ہر قسم کی Communication چاہے وہ زبان سے ہو یا خط وکتابت کے ذریعے سے ہو یا (ای میل) وغیرہ سے آج کل کے جدید ذرائع مواصلات ہوں ان کے ذریعہ سے ہو کوئی یہ چاہتا ہے کہ میری بات دوسرے تک نہ پہنچے صرف اسی کو پہنچے جس کی طرف میں بھیج رہا ہوں اس کو درمیان میں اچکنا یہ ناجائز اور گناہ ہے دو آدمیوں کا راز معلوم کرنا یا کرنے کی کوشش کرنا یہ ناجائز اور گناہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ دو آدمیوں کو باتیں جو وہ آپس میں کررہے ہیں ان کی باتیں سننے کی کوشس کرنا یہ بھی ناجائز ہے ایک آدمی دوسرے کو فون کررہا ہے درمیان میں اسے سننے کی کوشش کرنا یہ بھی گناہ ہے اور اسی طریقے سے دوسرے ذرائع مواصلات کو درمیان میں اچکنے کی کوشش کرنا یہ بھی گناہ ہے اور کسی کا خط بغیر اجازت کے پڑھنا یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

تیسرا گناہ وہ ہے جو اس باب سے متعلق ہے جو تصویر کا ہے مصور کو ایک سزا یہ بھی دی جائے گی کہ اس کو کہا جائے گا کہ جو تصویر بنائی ہے اس میں روح ڈالو اور ظاہر ہے کہ اس میں روح نہیں ڈال سکے گا ایک طرف دباؤ ہوگا کہ یہ کام کرو اور دوسری طرف سے وہ کام کر نہیں سکے گا تو یہ بذات خود ایک تکلیف ہے اور یہی بات دوسری حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **يقال لهم أحييو ما خلقتم** کہ جو تم نے بنایا ہے اس میں اب زندگی بھی ڈالو تو یہ سزا بھی اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کی نقالی کی کوشش کی تھی تو اللہ تعالیٰ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دیں گے کہ نقالی کی کوشش کی تھی تو اب پوری نقالی کرو۔

اب تک جتنی بھی حدیثیں آئی ہیں سب کا تعلق تصویر کی حرمت کے ساتھ تھا اس باب میں آگے جو حدیثیں آرہی ہیں ان میں سے بعض تو لہو ولعب کی دوسری صورتوں کے بارے میں ہیں اور بعض تصویر کے بارے میں ہیں اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے یہاں پر تصویر کے متعلق ضروری مسائل کا سمجھ لینا مناسب ہے کیوں کہ آگے دوسرے موضوعات پر بھی حدیثیں شروع ہو رہی ہیں۔

تصویر کے احکام

اتنی بات پر امت کا اجماع ہے کہ فی الجملہ تصویر بنانا اور رکھنا حرام ہے فی الجملہ کی قید کا مطلب یہ ہے کہ تفصیلات میں تو فقہاء کا اختلاف ہے کہ کون کون سی تصویر حرام ہے اور کون سی تصویر جائز ہے لیکن اجمالاً اتنی بات کہ تصویر کی کچھ قسمیں حرام ضرور ہیں یہ اجماعی ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے باقی تفصیلات بعد میں بیان کرتے ہیں کہ کون سی جائز اور کون سی ناجائز اور کس کے بارے میں اختلاف ہے اس سے پہلے یہ مسئلہ تفصیل سے سمجھ لیں کہ فی الجملہ تصویر کی حرمت پر اجماع ہے اور یہ حرمت احادیث کثیرہ سے ثابت ہے اور ان میں صرف یہ نہیں کہ تصویر سے منع کیا گیا ہے بلکہ اس پر وعیدیں بھی بیان کی گئی ہیں اگر سادہ نہی ہوتی کہ یہ کام نہ کرو تو یہ بھی اس کے ناجائز ہونے کے لئے کافی تھی لیکن یہاں صرف سادہ نہی نہیں ہے بلکہ اس کے کرنے پر وعیدیں بھی ہیں لیکن آج کل بعض جدت پسند لوگوں نے مختلف حیلے بہانوں سے تصویر کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے بعض دلائل کا سہارا لیا ہے جن کو دلائل کی بجائے حیلے بہانے یا شبہات کہنا چاہئے۔

تصویر کا جواز ثابت کرنے کے کچھ شبہات:۔

ان میں سے سب سے پہلے یہ حیلہ یا شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ اصل میں تصویر ابتدائے اسلام میں حرام تھی اب حرام نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تصویر ذریعہ شرک ہونے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے اور ابتدائے اسلام میں توحید ابھی اتنی راسخ نہیں ہوئی تھی اور شرک کا زمانہ قریب تھا اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سے منع فرمایا لیکن جب سارے لوگ مسلمان ہو گئے جزیرہ عرب میں تو اسلامی عقائد نسلاً بعد نسل متوارث ہونے کی وجہ سے ذہنوں میں راسخ ہو گئے اور یہ بات ذہنوں میں اچھی طریقے سے بیٹھ گئی کہ اسلام توحید کا داعی ہے اور شرک سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے تو اب تصویر کو ناجائز قرار دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے اب تصویر حرام اور ناجائز نہیں ہے لیکن یہ استدلال کئی وجوہ سے غلط ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ نے یہ جو کہا کہ ابتدائے اسلام میں تصویر حرام تھی بعد میں جائز ہو گئی اس کا مطلب کیا ہے؟ آیا یہ مطلب ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ حکم منسوخ ہو گیا یا یہ مطلب ہے کہ اب بعد میں یہ حکم مرتفع ہوا ہے؟ تو اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ حکم منسوخ ہوا تو ایسا ہونا ممکن تو ہے کہ ایسا ہوتا رہا کہ بعض کاموں کو ناجائز قرار دے دیا بعد میں جائز قرار دے دیا

گیااور پہلے بعض کاموں کو جائز قرار دے دیا گیااور بعد میں ناجائز قرار دے دیا گیالیکن اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے کوئی بھی ایسی دلیل کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر بنانے سے منع کیا تھالیکن بعد میں اس کی اجازت دے دی تھی بغیر دلیل کے نسخ کادعوئ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ کہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد یہ حکم مرتفع ہوا ہے توجو کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال تک ناجائز رہا ہو نص سے جس کی حرمت ثابت ہو ظاہر ہے کہ بعد میں کیسے جائز ہو سکتا ہے کیوں کہ حکم شرعی وحی سے معلوم ہوتا ہے اور وحی کو وحی ہی منسوخ کر سکتی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد وحی کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا تو احکام شرعیہ میں رد و بدل کی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں رہی۔

باقی رہی یہ بات کہ اس کی علت ذریعہ شرک ہونا ہے اور اب یہ علت نہیں رہی اس لئے حکم بھی باقی نہیں رہا تو یہ بات بھی غلط ہے ایک تو اس لئے کہ یہ بات قطعی نہیں ہے کہ تصویر سازی کی حرمت کی وجہ محض ذریعہ شرک ہونا ہے بلکہ تصویر سازی کی حرمت کی اصل وجہ اور اصل علت جو احادیث مین مصرح ہے وہ **المضاهاة بخلق الله** ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کے ساتھ مشابہت ہونا اور یہ وجہ جیسے پہلے زمانے میں پائی جاتی تھی آج بھی پائی جاتی ہے اور کل بھی پائی جائی گی وجہ عام ہے کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

اصل میں دو چیزیں ہیں ایک ہے تصویر بنانا اور ایک ہے تصویر رکھنا تصویر رکھنے کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے اس کی حرمت کی وجہ ذریعہ شرک ہونا ہے اور بظاہر یہی علت معلوم ہوتی ہے لیکن تصویر بنانے کی حرمت کی علت محض یہ نہیں ہے بلکہ ''**المضاهاة بخلق الله**'' اس کی وجہ ہے۔

ذریعۂ شرک ہونا یہ تصویر سازی کی حرمت کی علت ہے ہی نہیں ہے اور اگر یہ علت بھی ہو تب بھی یہ خیال انتہائی غلط ہے کہ علت مرتفع ہو چکی ہے اس لئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کل شرک دنیا سے ختم ہو چکا ہے اور شرک کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقع ہے آج دنیا میں مشرک قومیں موجود ہیں جو اور چیزوں کے علاوہ تصویروں کی بھی عبادت کرتی ہیں اور خود مسلمانوں کے اندر شرکیہ جراثیم جہالت کی وجہ سے موجود ہیں اور وہ جہالت کی وجہ سے شرکیہ کاموں میں بہت جلدی مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ ذریعہ شرک ہونے والی علت مرتفع ہو گئی ہے یہ بھی ٹھیک نہیں جب تک دنیا میں شرک موجود ہے اور مسلمانوں میں شرکیہ کاموں کے خطرات موجود ہیں اس وقت تک یہ علت بھی موجود ہے اس لئے یہ تو محض بہانہ ہے۔

دوسرا بہانہ تصویر کو جائز قرار دینے کا لئے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ جنات ان کے لئے بڑی بڑی عمارتیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ اور سابقہ انبیاء کے جو احکام قرآن وحدیث میں نقل کئے جائیں وہ ہمارے لئے بھی حجت ہوتے ہیں اس لئے اس سے پتہ چلا کہ تصویر بنانا حرام نہیں ہے اور جب بنانا حرام نہیں ہے تو رکھنا بطریق اولیٰ حرام نہیں ہوگا اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جو تصویریں جنات بناتے تھے وہ بے جان چیزوں کی تصویریں ہوتی تھیں اور اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تورات کے متبع تھے تورات کے اندر بھی تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ آج بھی جو تورات موجود ہے مثلاً عیسائیوں کے ہاں جو بائبل ہے اس کی پہلی پانچ کتابیں ان کے ہاں تورات کہلاتی ہیں ان میں سے دو کتابوں ''خروج'' اور ''استثناء'' کے اندر آج بھی صراحتاً مورتیاں بنانے اور جاندار چیزوں کی مورتیاں بنانے سے منع کرنے کا ذکر موجود ہے۔[1] تورات میں جاندار چیز کی تصویر ممنوع تھی لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جاندار چیزوں کی تصویریں نہیں بناتے ہوں گے بلکہ بے جان چیزوں کی تصویریں بناتے ہوں گے چنانچہ بہت سے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ جاندار چیزوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں تو بھی شرائع سابقہ ہمارے لئے علی الاطلاق حجت نہیں بلکہ حجت اس وقت ہوں گی جب کہ اس کے خلاف حکم قرآن وسنت میں موجود نہ ہو اور یہاں بکثرت حدیثوں میں تصویر سے منع بھی کیا گیا ہے اور اس پر وعیدیں بھی بیان کی گئی ہیں اس لئے یہاں شرائع سابقہ ہمارے لئے حجت نہیں اس لئے یہ بھی محض ایک بہانہ ہے۔

تیسرا بڑا بہانہ وہ ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ پردے والا واقعہ متعدد بار پیش آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور کراہت تنزیہی کے منع کیا تھا اس لئے کہ اگر تحریمی طور پر منع کیا ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوبارہ اس طرح کا پردہ نہ لٹکاتیں تو اس کا جواب پہلے ہو چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اگرچہ متعدد بار پیش آیا ہے لیکن جاندار چیز کی تصویر لٹکے ہوئے پردے پر ہو یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا ہے اس لئے تعدد واقعہ کو بنیاد بنا کر استدلال کرنا درست نہیں ہے یہ تو آج کل کے جدید مجوزین تصویر کے چند بہانے ذکر کئے گئے ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو خروج ۲۰:۴ واستثناء ج ۴:۱۶، ۱۷

تصویر کے بارے میں فقہاء کے اقوال

اب آیئے ان جدت پسندوں کی اباحت سے ذراہٹ کر سلف اور فقہاء کے اقوال کی طرف اتنی بات تو میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ تصویر کی حرمت پر فی الجملہ اجماع ہے لیکن تفصیلات میں اختلاف ہے ان اختلافی احکام کو سمجھنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ جس تصویر میں درج ذیل باتیں جمع ہوں وہ بالاجماع حرام ہے۔

(۱)..........وہ تصویر مجسد ہو یعنی جس کا اپنا وجود اور جسم ہو کسی اور چیز مثلاً کاغذ، کپڑے، دیوار وغیرہ پر منقش نہ ہو ایسی تصویر کو ذی ظل یعنی سایہ دار تصویر کہا جاتا ہے۔

(۲)..........وہ تصویر ایسی ہو کہ جس کو دوام اور بقاء حاصل ہو عارضی نہ ہو۔

(۳)..........اس کے اعضاء مکمل ہوں اور اس کا کوئی ایسا عضو مفقود نہ ہو جس پر زندگی کا انحصار ہوتا ہے یعنی اس کے بغیر وہ جاندار چیز زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

(۴)..........وہ لعب البنات کے قبیل سے نہ ہو یعنی بچیوں کی جو کھیلنے والی گڑیاں ہوتی ہیں اس قبیل سے نہ ہو۔

(۵)..........وہ تصویر بہت چھوٹی نہ ہو۔

(۶)..........اور وہ تصویر محل اہانت میں نہ ہو۔

تو جس تصویر میں یہ ساری باتیں پائی جائیں تو اس کے عدم جواز پر اجماع ہے اور ایسی تصویر کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں ہے البتہ جس تصویر میں ان باتوں میں سے کوئی بات مفقود ہو اس میں کچھ اختلافات ہیں کسی میں زیادہ اختلاف ہے اور کسی میں تھوڑا اس کو یہاں سمجھنا ہے۔

بے جان چیز کی تصویر:۔

اس سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ یہ مسئلہ جاندار چیزوں کی تصویروں کا ہے بے جان چیزوں کے بارے میں اگرچہ بعض سلف سے منقول ہے کہ وہ اسے بھی ناجائز قرار دیتے تھے اور بعد کے بعض حضرات نے اس کو اختیار بھی کیا ہے لیکن صحابہ اور تابعین اور فقہاء کی بہت بڑی اکثریت بے جان چیزوں کی تصویر کو جائز قرار دیتے ہیں اب آیئے ان قیود کی طرف۔

پہلی قید لگائی تھی کہ وہ مجسد ہو تو اگر وہ تصویر مجسد نہ ہو بلکہ کسی اور چیز میں منقش ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے یہ اختلاف چونکہ تفصیل طلب ہے اس لئے اس کو بعد میں بیان کریں گے پہلے باقی چھوٹے چھوٹے مسئلے کر لیں۔

عارضی اور ناپائیدار تصویر کا حکم:۔

دوسری قید لگائی تھی وہ تصویر ایسی ہو جس کو دوام حاصل ہو بعض تصویریں ایسی ہوتی ہیں جو دوام اور بقاء کے لئے نہیں بلکہ عارضی نوعیت کی ہوتی ہیں اس کی مثال بعض حضرات نے یہ دی ہے کہ وہ گارے سے بنائی گئی ہو اور بعض نے اس کی مثال دی ہے کہ تربوز کے چھلکے سے تصویر بنائی جاتی تھی لیکن جب تربوز کا چھلکا سوکھ جاتا تھا تو وہ تصویر گر جاتی تھیں اور ختم ہو جاتی تھی اور اسی کی مثال بعض حضرات نے بیان کی کہ میٹھی چیز اور حلوہ سے بنائی ہوئی تصویر جیسا کہ کچھ لوگ ڈنڈے پر ایک میٹھی چیز لپیٹ لیتے ہیں اور بچوں کو اس سے مختلف چیزیں بنا کر دیتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے بچے اس سے کھیلتے تھے بعد میں اسے کھا لیتے تھے یہ ہے عارضی تصویر اس کا حکم کیا ہے؟

اس میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مجھے حنفیہ کے ہاں اس کا حکم صراحۃً نہیں ملا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں قرطبی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ تصویر جو فخار سے یعنی مٹی سے بنی ہوئی ہو اس میں دو قول ہیں بظاہر مالکیہ کے دو قول مراد ہیں ایک جواز کا اور ایک عدم جواز کا لیکن راجح عدم جواز ہے یہ بات نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ تو بات ہوئی ہے مٹی سے بنی ہوئی تصویر کی لیکن جو تصویر کسی کھلونے کے طور پر میٹھی چیز سے بنائی جاتی ہے اس کو کس کے ساتھ شامل کریں گے آیا اس کو بھی اس مٹی سے بنی ہوئی تصویر کے حکم میں شامل کریں گے اور یہ کہیں گے کہ اس میں راجح ناجائز ہونا ہے یا اس کو "لعب البنات" کے ساتھ ملحق کریں گے جس کا حکم آگے ہم بیان کریں گے تو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں تامل ہے اگر یہ دیکھیں کہ جس طرح یہ تصویر عارضی ہے اسی طرح وہ بھی عارضی تصویر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حکم فخار کی تصویر کا ہے وہی حکم اس تصویر کا ہوگا اور اگر یہ دیکھیں کہ حلوہ وغیرہ یا میٹھی چیز وغیرہ سے جو تصویر بنتی ہے وہ اس کی بنسبت زیادہ عارضی ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کھلونے کے طور پر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو لعب البنات کے ساتھ ملحق کریں اس لئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے تامل ہے البتہ احوط یہ ہے کہ اس طرح کی تصویر کے ساتھ بھی حرمت والا برتاؤ کیا جائے اور اس سے بچا جائے ضرورت تو کوئی ہے نہیں یا تو ضرورت ہو تو پھر آدمی سوچے ضرورت تو کوئی ہے نہیں اور حرمت کا قول موجود ہے اس لئے حرمت والے قول پر عمل کرنا احوط ہے۔

ناتمام اعضاء والی تصویر کا حکم:۔

تیسری قید تھی جس تصویر کے اعضاء مکمل نہ ہوں اس میں دو صورتیں یہاں قابل بحث ہیں پہلی تو

11

یہ کہ ایسی تصویر جس کا چہرہ اور سر نہ ہو وہ سب کے نزدیک جاندار چیز کی تصویر کے حکم میں نہیں ہے بلکہ درخت وغیرہ بے جان چیزوں کی تصویروں کے حکم میں ہے لہٰذا وہ حرام اور ناجائز نہیں ہے دوسرے وہ تصویر جس میں کوئی ایسا عضو مفقود ہو جس پر زندگی کا مدار ہے یعنی اگر وہ عضو ہی نہ ہو تو انسان زندہ ہی نہ رہ سکے مثلاً تصویر کا پیٹ نہیں ہے اب ظاہر ہے کہ بغیر پیٹ کے تو کوئی انسان نہیں ہو سکتا یا تصویر کا سینہ نہیں ہے تو اس کے حکم میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک یہ تصویر کے حکم میں ہے اور حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک ایسی تصویر بھی بے جان کی تصویر کے حکم میں ہے گویا حنفیہ کے نزدیک جاندار چیز کی تصویر ہونے کا مدار چہرے پر ہے اگر اس کا چہرہ ہے تو جاندار چیز کی تصویر سمجھی جائی گی اور اگر چہرہ نہیں ہے یا چہرے کو مٹادیا گیا ہے یا کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے تو اب بے جان چیز کی تصویر کے حکم میں ہو گا جب کہ حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک مدار ایسے اعضاء کے موجود ہونے اور نہ ہونے پر ہے جن پر زندگی کا مدار ہوتا ہے ان میں کوئی بھی عضو مفقود ہو تو حرام تصویر میں شامل نہیں رہے گی۔

بچیوں کی کھیلنے والی گڑیاں کا حکم:۔

چوتھی قید وہ لعب البنات کے قبیل سے نہ ہو یعنی بچیوں کے کھیلنے کے لئے جو گڑیاں وغیرہ ہوتی ہیں ان کا حکم کیا ہے یہ مسئلہ حضرات فقہاء کے ہاں زیر غور آیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں آیا کہ جس وقت میری رخصتی ہوئی اس وقت میری تقریباً نو (۹) سال کی عمر تھی فرماتی ہیں کہ میری گڑیاں بھی میرے ساتھ تھیں میرے کھلونے بھی میرے ساتھ تھے۔

دوسری ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے گھر کے اندر ایک الماری میں یہ کھلونے رکھے ہوئے تھے اور اس الماری پر ایک پردہ لٹکا ہوا تھا ایک دن ہوا چلی اور پردہ ایک طرف کو ہوا تو حضور اقدس ﷺ کی نظر ان کھلونوں پر پڑی آپ نے پوچھا یہ کیا ہے تو میں نے عرض کیا کہ یہ میرے کھلونے ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ جو ان کے درمیان میں ہے یہ کیا ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یہ گھوڑا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے تو پر بھی ہیں اور گھوڑے کے تو پر نہیں ہوتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے عرض کیا کہ آپ کو پتہ نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑے کے پر تھے تو گویا یہ سلیمانی گھوڑا ہے تو حضور اقدس ﷺ میری یہ بات سن کر مسکرانے لگے یہاں تک کہ آپ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں تو اس سے بظاہر اس طرح کے کھلونوں کا جواز معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ سے یہ مسئلہ فقہاء اور علماء میں زیر بحث آیا۔

اس سلسلے میں کئی نقطۂ نظر ہیں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے ابتدائے اسلام کا یہ واقعہ ہے اور اس واقعے کا ابتدائے اسلام کا ہونا یا یوں کہئے مدنی دور کے ابتدائی سالوں کا ہونا تو تقریباً واضح ہے وہ اس وجہ سے کہ واقعہ کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس وقت بچی تھیں زیادہ بڑی نہیں تھیں جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر تقریباً اٹھارہ (۱۸) برس تھی تو یہ واقعہ بظاہر آخری دور کا نہیں لگتا پہلے کا واقعہ لگتا ہے اگرچہ ابو داؤد اور بیہقی کی بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس آئے تو آپ نے یہ کھلونے دیکھے اور اس وقت یہ مکالمہ ہوا ہے۔[1] اور غزوہ تبوک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ ہے لیکن کئی محدثین کی رائے یہ ہے کہ جن روایتوں میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے یہ بعض راویوں کا وہم ہے اصل میں غزوۂ تبوک سے واپسی پر پردہ والا واقعہ پیش آیا ہے کہ آپ کے دروازے یا کوٹھری وغیرہ پر پردہ لٹکا ہوا تھا اس پر آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا اس پردے پر بھی ایسے گھوڑے کی تصویر تھی جس کے پر تھے تو اس وجہ سے شاید راوی کو دونوں واقعوں میں اختلاط ہو گیا ورنہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر واقعہ پردہ لٹکانے والا ہے اور کھلونوں والا واقعہ بظاہر اس دور کا ہے جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی لہٰذا یہ آخری دور کا واقعہ نہیں ہے تو اتنی بات تو بظاہر طے شدہ ہے کہ یہ واقعہ پہلے کا ہے۔

البتہ تصویر کی حرمت سے بھی پہلے کا ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک ابھی تصویر کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اس پر کوئی واضح نص یا واضح روایت موجود نہیں ہے اور اس کی وجہ سے علماء میں یہ اختلاف ہوا کہ یہ منسوخ ہے یا نہیں؟ ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ منسوخ تو نہیں ہے البتہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بچپن کا واقعہ ہے اور ایک تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ واقعہ بعد کا بھی ہو تو اصل میں یہ مکمل تصویریں نہیں تھیں بلکہ یوں ہی ڈھانچے سے بنے ہوئے تھے جن میں خاص طور پر چہرے وغیرہ کے اعضاء مکمل نہیں ہوں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعے کے بارے میں تین نقطۂ نظر ہیں اور اسی بنیاد پر اس طرح کے کھلونوں کے حکم میں اختلاف ہوا ہے بعض حضرات نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے جن حضرات نے اس واقعے کو منسوخ قرار دیا یا یہ فرمایا کہ تصویریں مکمل تھیں ہی نہیں بلکہ نامکمل تصویریں تھیں اس لئے حضور ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے اور دوسری طرف عام حدیثوں میں مطلقاً تصویروں سے منع کیا گیا ہے اس لئے یہ ناجائز ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بچیوں کے لئے یعنی نابالغ بچیوں کے لئے اس کی اجازت ہے، درمختار میں کتاب

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء وما لکل واحد منہا من الحقوق

البیوع کے آخر میں جہاں متفرق احکام ذکر کئے جاتے ہیں وہاں پر امام ابو یوسف سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ بچیوں کے لئے اس طرح کے کھلونوں کی اجازت ہے اور ان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے اور اس کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام ابو یوسف کا قول نقل کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا قول اس کے خلاف ہے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اس مسئلے میں امام اعظم ابو حنیفہ سے کوئی بات منقول ہی نہ ہو تو بہر حال حنفیہ کے ہاں بھی ایک نقطۂ نظر جواز کا موجود ہے لیکن اگر کوئی احتیاط کر لے اور ان سے بچ جائے تو یہ اچھی بات ہے۔

لعب البنات کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی حکمت یا علت ان حضرات نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں بچیوں کی تربیت ہوتی ہے اولاد کی پرورش پر، ان کو ابھی سے عادت پڑتی ہے کہ بچوں کو کیسے سنبھالنا ہے چنانچہ عام طور پر بچیاں ان کو لباس بھی پہناتی ہیں ان کو نہلاتی ہیں کبھی دلہن بناتی ہیں تو جو ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ کرتی ہے وہ سب کچھ یہ اپنی گڑیا کے ساتھ کرتی ہے۔

بہت چھوٹی تصویر کا حکم:-

ایک قید یہ ذکر کی تھی کہ وہ تصویر بہت چھوٹی نہ ہو اس لئے کہ وہ تصویر جو بہت چھوٹی ہو وہ تقریباً سب کے ہاں جائز ہے یعنی اس کا رکھنا جائز ہے چھوٹی ہونے کا معیار کئی فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اس تصویر کو زمین پر رکھ کر آدمی اگر کھڑا ہو کر دیکھے تو اس کے اعضاء واضح طور پر نظر نہ آئیں تو وہ چھوٹی تصویر ہے اور جس کے اعضاء اس طرح بھی واضح نظر آئیں وہ چھوٹی نہیں بلکہ وہ بڑی ہے، بڑی کا رکھنا جائز نہیں چھوٹی کا رکھنا جائز ہے چنانچہ کئی صحابہ سے یہ بات مروی ہے کہ ان کی انگوٹھیوں میں مختلف جانوروں کی تصویر تھی بعض صحابہ کی انگوٹھیوں پر شیر کی تصویر تھی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی پر مکھیوں کی تصویر تھی لیکن ان حضرات نے اسے گوارا کیا اور بھی کئی صحابہ سے اس طرح کی روایتیں آتی ہیں ان کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ یہ تصویریں چھوٹی تھیں اس لئے چھوٹی تصویر کا رکھنا حنفیہ کے ہاں بھی جائز ہے اور باقی فقہاء کے ہاں بھی جائز ہے البتہ چھوٹی تصویر کا صرف رکھنا جائز ہے بظاہر بنانا اس کا بھی ناجائز ہے، رکھنے کا حکم اور ہے بنانے کا حکم اور ہے یہ بات رکھنے کی ہو رہی ہے تصویر بنانے کی نہیں ہو رہی ہے تصویر بنانا اگرچہ چھوٹی ہو ناجائز ہے اور ان حضرات کی انگوٹھیوں میں جو تصویریں تھیں یہ ضروری نہیں کہ ان حضرات نے یہ بنوائی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح سے بنی بنائی خریدی ہوں تو ان کی طرف تصویر رکھنے کی نسبت تو واضح ہے لیکن اس کے بنانے یا بنوانے کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جو تصویر اہانت والی جگہ پر ہو:-

آخری قید ہم نے یہ ذکر کی تھی کہ وہ تصویر محل اہانت میں نہ ہو اگر وہ تصویر محل اہانت میں ہے یعنی ایسی جگہ پہ ہے کہ جہاں اس کا ابتذال اور توہین ہوتی ہے مثلاً زمین پر بچھی ہوئی تصویر تو یہ بھی جائز ہے اکثر فقہاء کے ہاں اس کا رکھنا جائز ہے ان میں بھی جمہور فقہاء اکرام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس طرح کی اجازت تب ہو گی جب کہ اس تصویر کی اہانت ہو رہی ہو جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ پردے کو کاٹ کر اس کے دو وسادے بنا دو جو زمین پر بچھائے جاتے اور ان کو روندا جاتا تھا۔

غیر سایہ دار تصویر کا حکم:-

اب یہاں مسئلہ ہے غیر سایہ دار تصویر کا تصویر کی دو قسمیں ہیں ایک تصویر وہ ہوتی ہے جس کا باقاعدہ اپنا جسم ہوتا ہے جیسے بت وغیرہ ایسی تصویر کو سایہ دار تصویر کہتے ہیں اور دوسری تصویر وہ ہے جس کا اپنا مستقل وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی اور چیز پر نقش ہوتی ہے مثلاً کپڑے، دیوار یا کاغذ وغیرہ پر اس کو غیر سایہ دار تصویر کہتے ہیں سایہ دار تصویر کے عدم جواز پر تو اتفاق ہے سوائے چند استثناءات کے جن کا پہلے ذکر ہوا۔

لیکن غیر سایہ دار تصویر کے بارے میں اختلاف ہے،[1] حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ بھی ناجائز ہے البتہ مالکیہ کے نزدیک غیر سایہ دار تصویر حرام اور ناجائز نہیں بلکہ مکروہ تنزیہی ہے اگرچہ بعض مالکیہ کا قول غیر سایہ دار تصویر کی حرمت کا بھی ہے لیکن اسے ان مالکیہ کی ذاتی رائے قرار دیا گیا ہے مذہب یہی ہے کہ غیر سایہ دار تصویر جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے۔[2] چنانچہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر کے اندر یہ لکھا ہے کہ غیر سایہ دار تصویر کے جواز پر اجماع ہے۔[3] اجماع سے مراد تمام علماء کا اجماع نہیں ہے بلکہ مالکیہ کا اجماع مراد ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کا اصل مذہب جواز ہی کا ہے اور یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ قرطبی یہ اپنی رائے پیش نہیں کر رہے بلکہ مالکیہ کا مذہب نقل کر رہے ہیں کیوں کہ قرطبی خود اپنی ذاتی رائے کی حد تک اس معاملہ میں کافی متشدد ہیں اس لئے ان کی رائے تو یہ ہے کہ بے جان چیزوں کی مثلاً درختوں وغیرہ کی تصویر بنانا بھی جائز نہیں ہے اور یہ بات انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے: ''مَا کَانَ

---

(۱) تکملہ فتح الملہم ج ۴ / ص ۱۵۹..... (۲) سورۃ نمل ما کان لکم أن تنبتوا شجرھا آیت نمبر ۴۰ قرطبی ج ۱۳ / ص ۱۴۵

(۳) سورۃ سبا یعملون لہٗ مایشاء من محاریب الخ قرطبی آیت نمبر ۱۳ ج ۱۴ / ص ۱۷۷

لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا۔ ''کہ درخت بنانا بھی تمہارا کام نہیں ہے۔[1] اب اگر کوئی درخت کی تصویر بناتا ہے تو اس میں المضاہاۃ بخلق اللہ ہے تو ذاتی رائے ان کی کچھ اور ہے لیکن جہاں تک نقل مذہب کا تعلق ہے تو یہی نقل کر رہے ہیں کہ یہ جائز ہے۔

مالکیہ کی کتب فقہ میں تصویر کا مسئلہ عام طور پر کتاب النکاح میں ولیمے کے احکام بیان کرتے ہوئے ذکر کیا جاتا ہے مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ مالکیہ کے نزدیک اور دیگر بعض فقہاء کے نزدیک دعوت ولیمہ قبول کرنا واجب ہے اور بغیر عذر کے عدم اجابت جائز نہیں ہے البتہ اگر کوئی عذر ہو تو جائز ہے کہ دعوت قبول نہ کرے اور وہاں پر نہ جائے، اعذار کیا ہیں تو اس میں فقہاء مالکیہ نے کافی تفصیل سے بحث کی ہے جیسے حنفیہ نے ترک جماعت کے اعذار پر مفصل گفتگو کی ہے اور باقی حضرات نے اتنی مفصل گفتگو نہیں کی کہ کن کن اعذار کی وجہ سے جماعت کا چھوڑنا جائز ہو جاتا ہے تو اس کے برعکس فقہاء مالکیہ نے ترک ولیمہ پر مفصل گفتگو کی ہے ان میں سے ایک عذر یہ بھی ہے کہ جس جگہ دعوت ولیمہ ہو رہی ہے وہاں منکرات شرعیہ اور ناجائز چیزیں ہوں اس پر فقہاء مالکیہ نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ اگر وہاں تصویر ہو تو کیا حکم ہے تو تفصیلی بحث کرتے ہوئے اکثر فقہاء مالکیہ نے یہ لکھا ہے کہ اگر تو سایہ دار تصویر ہو پھر تو وہاں نہ جائے اور یہ ترک ولیمہ کا عذر ہے لیکن اگر غیر سایہ دار تصویر ہے تو یہ ترک ولیمہ کا عذر نہیں ہے اگر وہاں غیر سایہ دار تصویر موجود ہے تو اس کے ہوتے ہوئے بھی دعوت ولیمہ کو قبول کرنا واجب ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ اس طرح کی تصویر جائز ہے اور کراہت تنزیہی ہے۔

میں نے چند سال پہلے اس موضوع پر ایک تحریر کافی تفصیل سے لکھی تھی اس میں اصل میں سوال یہ تھا کہ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ پر جو تصویر لگانی پڑتی ہے اس کا کیا حکم ہے تو اس کے آخر میں فقہائے مالکیہ کی عبارات ضمیمہ کے اندر میں نے کافی جمع کر دی ہیں اس لئے کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ جو مالکیہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے کہ غیر سایہ دار تصویر جائز ہے یہ ان کا مذہب بھی ہے یا نہیں تو یہ بات واضح ہے کہ مالکیہ کا مذہب یہی ہے باقی راجح مرجوح کی بحث تو الگ ہے لیکن مالکیہ کا مذہب یہ ہے اس کے علاوہ بعض صحابہ اور تابعین کا مذہب بھی یہی ہے جن میں خاص طور پر یہاں چار حضرات قابل ذکر ہیں۔

القاسم بن محمد جو کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھتیجے ہیں اور بھتیجے ہی نہیں بلکہ ان کے شاگرد خاص اور تربیت یافتہ ہیں باقیوں نے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے استفادہ پردے کے پیچھے سے کیا ہوگا لیکن انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ

---

(۱) قرطبی ج ۱۳/ ص ۱۴۵ سورۃ نمل آیت نمبر ۶۰

تعالیٰ عنہا سے استفادہ بغیر پردے کے کیا پردے کی ان کو ضرورت نہیں تھی اور ان کا شمار مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہوتا ہے یعنی تابعینؒ میں سات شخصیات ایسی ہیں کہ جن کو مدینے کے بڑے درجے کے فقہاء میں شمار کیا جاتا ہے جیسے عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سعید بن میسبؒ وغیرہ ان میں قاسم بن محمد بھی شامل ہیں اور ان کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یہ فرمایا تھا کہ میرا جی یہ چاہتا تھا کہ میں اپنے بعد خلافت قاسم بن محمد کو سونپ دوں اور انہیں اپنا ولی عہد بنادوں لیکن یہ میں اس لئے نہیں کر سکتا کہ مجھ سے پہلے یہ معاملہ طے ہو چکا ہے اس لئے کہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے انتقال سے پہلے ولی عہد کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میرے بعد عمر بن عبدالعزیز ہوں گے اور عمر بن عبدالعزیز کے بعد ولید بن عبدالملک ہوگا اور اس پر باقی سب نے بھی اتفاق کر لیا تھا تو چونکہ ولید بن عبدالملک کے لئے پہلے عہد ہو چکا ہے اس لئے میں اس کو بدلتا نہیں لیکن اگر اس طرح کا عہد پہلے سے موجود نہ ہوتا تو میں اپنا ولی عہد قاسم بن محمد کو بناتا۔ تو بہر حال بڑے درجے کی شخصیات میں سے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پردے والی جو حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پردے پر تصویر دیکھ کر اظہار ناراضگی فرمایا اس حدیث کے راویوں میں سے بھی ہیں غیر سایہ دار تصویر کی عدم حرمت کے قائلین میں دوسری شخصیات حضرت ابو طلحہ تیسرے حضرت سہل بن حنیفؓ اور چوتھے حضرت زید بن خالد جہنیؓ ہیں صحابہ اور تابعین میں یہ چار حضرات قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ اور بعض حضرات کا بھی یہی مذہب ہے تو اب تک کی بات کا حاصل یہ نکلا کہ غیر سایہ دار تصویر کے بارے میں اختلاف ہے حنیفہ اور فقہاء کی ایک بڑی اکثریت اس کے عدم جواز کی قائل ہے اور صحابہ اور تابعین میں سے بھی کافی حضرات کا یہی مذہب ہے دوسری طرف مالکیہ کا مذہب اور متعدد صحابہ اور تابعین کی رائے یہ ہے کہ غیر سایہ دار تصویر جائز ہے تو یہ مسئلہ عہد صحابہ اور تابعین ہی سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے۔

ہمارا معمول یہ ہے کہ درس حدیث میں جب کوئی اختلافی مسئلہ آتا ہے تو وہاں فریقین کے دلائل بھی ذکر کئے جاتے ہیں اس لئے یہاں بھی دونوں طرف کے دلائل کو مد نظر رکھ لینا چاہئے۔

حنفیہ اور جمہور کے دلائل ...... حنفیہ اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ تصویر سے ممانعت کی حدیثیں مطلق اور عام ہیں اور ان میں سایہ دار اور غیر سایہ دار کا کوئی فرق نہیں کیا گیا اور ان حدیثوں کو بنیادی طور پر ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ...... ایک تو وہ حدیثیں ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

(۲)..........اور دوسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں تصویر بنانے والوں پر وعید بیان کی گئی ہے فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی حدیثوں میں ایک دنیاوی قسم کی بے برکتی کا ذکر ہے لیکن بہر حال تصویر کا ناپسندیدہ ہونا وہاں بھی سمجھ میں آرہا ہے فرشتے نہیں آتے تو ناپسندیدہ چیز ہو گی تب ہی تو نہیں آتے اور دوسری میں اخروی سزا کا ذکر ہے مثلاً یہ کہ تصویریں بنانے والوں کو یہ کہا جائے گا کہ ان میں روح پھونکو اور یہ کہا جائے گا (اَحْیُوْا مَاخَلَقْتُمْ) وغیرہ وغیرہ۔

(۳)..........اور تیسری قسم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پردے والا واقعہ پہلی دو قسم کی حدیثوں کے عموم سے استدلال تھا کہ اس میں سایہ دار یا غیر سایہ دار کا کوئی فرق نہیں بلکہ مطلقاً وعیدیں ہیں لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ واقعہ ہے ہی غیر سایہ دار تصویر کے بارے میں اس لئے کہ یہ تصویر پردے پر بنی ہوئی تھی اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ناراضگی فرمایا تو پتہ چلا کہ غیر سایہ دار تصویر بھی جائز نہیں ہے۔

(۴)..........اور چوتھی قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں یہ آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر تصویریں تھیں اور گھر میں کتا تھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ کہا کہ آپ کتے کو گھر سے نکال دیجئے اور دروازے پر جو تصویر ہے اس کو کاٹ دیجئے تاکہ وہ درخت کی تصویر کی طرح ہو جائے یعنی اوپر کا سر وغیرہ ختم ہو جائے اور ایک پردہ بھی لٹکا ہوا تھا اس پر بھی تصویر تھی تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اس کو بھی چاک کر دیجئے اور اس کا وسادہ بنا لیجئے تاکہ یہ توہین کی جگہ پر ہو جائے تو یہاں دیکھئے کہ جبرئیل علیہ السلام نے اس وقت تک گھر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا جب تک کہ تصویر کو وہاں سے ہٹایا نہ جائے اور ان میں سے خاص طور پر پردے کی جو تصویر ہے یہ یقیناً غیر سایہ دار ہے اور دروازے پر جو تصویر ہے اس کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ وہ سایہ دار ہو یعنی جسامت والی تصویر ہو جو دروازے کے ساتھ کسی نے لگا دی ہو لیکن اغلب یہی ہے "واللہ اعلم" کہ وہ بھی غیر سایہ دار ہو گی تو پتہ چلا کہ جس گھر میں غیر سایہ دار تصویر ہو وہاں پر بھی جبرئیل علیہ السلام نہیں آتے تھے یہ حنفیہ اور جمہور فقہاء کے دلائل تھے۔

حضرات مالکیہ کی دلیل......ان حضرات نے ان حدیثوں سے استدلال کیا ہے جن میں تصویر سے منع کیا گیا یا یہ کہا گیا کہ اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے لیکن اس کے ساتھ ایک استثناء بھی کیا گیا وہ ہے "اِلَّا رقمًا فِی ثوبٍ" سوائے ایسی تصویر کے جو کسی کپڑے میں منقش ہو تو پتہ چلا کہ جس تصویر کا اپنا وجود نہ ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے "اِلَّا رقما فی ثوبٍ" کا استثناء صحیحین کی بعض حدیثوں میں موجود ہے اور موطا امام مالک میں بھی موجود ہے مثلاً بخاری وغیرہ کی حدیث ہے کہ ایک دفعہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ کی عیادت

کرنے کے لئے(1) حضرت بسر بن سعیدؓ اور ایک اور شخص گئے تو وہاں ان کے گھر میں پرندے وغیرہ کی تصویریں تھیں تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے یہ کہا کہ خود انہوں نے یعنی حضرت زید بن خالد جہنیؓ نے ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا تھا کہ جس گھر میں تصویر ہو وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور خود ہی اپنے گھر میں تصویر لٹکائی ہوئی بھی ہے تو یہ عجیب "مولوی" ہیں کہ ہمیں مسئلہ کچھ اور بتاتے ہیں اور ان کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے تو دوسرے نے کہا کہ تمہیں یاد ہوگا کہ جب انہوں نے یہ حدیث سنائی تھی تو یہ استثناء بھی نقل کیا تھا "اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ" سوائے اس تصویر جو کپڑے میں مرقوم ہو تو اس کی وجہ سے انہوں نے یہ تصویر لگائی ہوئی ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ مؤطا امام مالک میں بھی ہے کہ ایک دفعہ حضرت سہل بن حنیفؓ حضرت ابو طلحہؓ کے پاس گئے اس وقت حضرت ابو طلحہؓ کے بستر پر جو چادر بچھی ہوئی تھی اس پر جاندار چیزوں کی تصویریں تھیں تو حضرت ابو طلحہؓ نے کہا کہ یہ چادر میرے نیچے سے نکال دو تو حضرت سہل بن حنیفؓ نے پوچھا کہ آپ یہ چادر کیوں اٹھا رہے ہیں تو ابو طلحہؓ نے کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تصویر کے بارے میں جو ارشاد ہے اس کی وجہ سے میں اٹھوا رہا ہوں تو حضرت سہل بن حنیف نے کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا "اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ" تو حضرت ابو طلحہؓ نے کہا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے لکنّهُ أطيبُ لنفسي لیکن میں اس چادر کو اٹھوا دینا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں کیوں کہ اس میں احتیاط زیادہ ہے اس میں ایک تو ان حضرات نے اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ کا استثناء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ایک نے یہ کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ استثناء کیا تھا اور دوسرے نے اس کی تصدیق کی اور دوسرے اس استثناء کی وجہ سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت سہل بن حنیفؓ اور حضرت ابو طلحہؓ دونوں حضرات کا مذہب یہ تھا کہ جو تصویر کپڑے وغیرہ پر منقش ہو وہ جائز ہے البتہ ابو طلحہؓ اس کو مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ سمجھتے تھے اور یہی بات حضرت زید بن خالد جہنیؓ کے بارے میں بخاری کی روایت سے سمجھ آرہی ہے کہ ان کا مذہب بھی اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ کی وجہ سے یہی تھا کہ جو تصویر منقش ہو کسی اور چیز میں وہ جائز ہے۔

جواب ...... حنفیہ اور جمہور کی طرف سے مالکیہ کی اس دلیل اس کا جو معروف جواب دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ رقمًا فی ثوب سے مراد جاندار چیزوں کی تصویر نہیں بلکہ بے جان چیزوں کی تصویر ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے مگر یہ کہ کسی کپڑے وغیرہ پر کسی درخت وغیرہ یا کسی عمارت وغیرہ کی تصویر منقش ہو تو وہ فرشتوں کے دخول سے مانع نہیں ہے رقمًا فی ثوب اپنے عموم پر نہیں

---

(1) بخاری کتاب اللباس باب من کرہ القعود علی الصور فتح الباری ج ۱۰/ ص ۳۱۹

ہے بلکہ اس سے مراد صرف بے جان چیزوں کی تصویر ہے اور اس کا واضح قرینہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ ان کے پردے پر جو تصویر تھی وہ بھی رقماً فی ثوب تھی یعنی کپڑے کے اندر منقش تھی اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار فرمایا تو معلوم ہوا کہ جاندار چیز کی تصویر اگر کپڑے پر بھی مرقوم ہو تو وہ بھی جائز نہیں ہے یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں اس حدیث میں **اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ** کے استثناء سے مراد بے جان چیز کی تصویر ہے جاندار چیز کی تصویر اس میں داخل نہیں ہے۔

لیکن اس جواب پر کچھ اشکالات کی گنجائش ضرور ہے:

(۱) .... پہلا اشکال تو یہ ہے کہ **اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ** کے لفظوں کے جو راوی صحابہ ہیں مثلاً حضرت ابوطلحہؓ، حضرت سہل بن حنیفؓ اور زید بن خالد جہنیؓ یہ سب کے سب یہ مطلب نہیں سمجھ رہے بلکہ ان سب نے رقماً فی ثوب کو اپنے عموم پر محمول کیا ہے یعنی چاہے جاندار کی تصویر ہو یا بے جان کی، جاندار چیز کی تصویر جو کپڑے پر مرقوم ہو اس کو انہوں نے **اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ** کے لفظوں کی وجہ سے مستثنیٰ سمجھا ہے۔

(۲) .... دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس میں سے ہوتا ہے اگر ماقبل میں مستثنیٰ منہ میں یہ کہا کہ **لا تدخل الملائكةُ بيتًا فيهِ كلبٌ وَلا صُورة** میں صورۃ سے مراد جاندار چیز کی تصویر ہے تو **اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ** سے مراد بھی وہی ہونا چاہئے یہ بظاہر اتنی قوی بات معلوم نہیں ہوتی کہ مستثنیٰ منہ صورۃ سے مراد تو صرف جاندار چیز کی تصویر ہو اور جب اس میں "**اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ**" کا استثناء کیا تو اس سے مراد بے جان چیز کی تصویر ہو۔

(۳) .... اور تیسرا اشکال یہ ہے کہ اگر بے جان چیز کی تصویر ہی مراد ہے تو رقماً فی ثوب کے استثناء کی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ بے جان چیز کی تصویر چاہے کسی کپڑے وغیرہ پر نقش ہو یا وہ مجسد اور سایہ دار ہو وہ تو مطلقاً جائز ہے تو وہ تصویر جو کپڑے میں مرقوم ہے وہ جائز ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی یہ اشکالات ہو سکتے ہیں اس محمل پر جس پر حنفیہ وغیرہ نے "**اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ**" کو محمول کیا ہے۔

جمہور کے دلائل پر ایک نظر ...... دوسری طرف جمہور کے یہ دلائل پر ایک نظر دوبارہ ڈالیں جمہور کے دلائل کو ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا تھا ایک تو وہ حدیثیں جن میں آتا ہے کہ فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو تو یہ الفاظ لازمی طور پر حرمت پر دلالت نہیں کرتے یعنی یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو چیز فرشتوں کے داخل ہونے سے مانع ہو وہ حرام بھی ہو۔ (میں کوئی فیصلہ نہیں کر رہا بلکہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے دلائل پر جو کلام کی گنجائش ہے اسے بیان کر رہا ہوں) اس لئے کہ بعض حدیثوں میں یہ بھی آتا ہے کہ جس گھر میں جنبی ہو اس میں فرشتے نہیں آتے بلکہ تصویر والی روایتوں

میں بھی یہ بات آتی ہے کہ لا تدخل الملائکۃُ بیتًا فیه کلبٌ ولا صورۃٌ ولا جُنب۔حالانکہ نماز کے وقت غسل کرنا واجب ہے لیکن اس سے پہلے آدمی رات جنابت کے ساتھ رہے تو یہ خلاف اولیٰ تو ہے لیکن مکروہ تحریمی یا حرام نہیں ہے یعنی فرض کیجئے کسی آدمی نے رات کے ابتدائی حصے میں مجامعت کی اور فوری طور پر غسل نہیں کیا صبح کے وقت غسل کیا تو یہ ناجائز اور حرام نہیں ہے اس لئے پہلی قسم کی روایات کے بارے میں دوسرے فریق کی طرف سے یہ بات کہی جاسکتی ہے۔

دوسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں اس فعل پر عذاب کا ذکر ہے اور وہ عذاب زیادہ تر یہ ہے کہ تصویریں بنانے والوں کو یہ کہا جائے گا "أحيُوْا ما خلقتُمْ" اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ومَنْ أظْلَمُ ممَّنْ ذهب يخلق كخلقي۔اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو میری طرح خالق بن کر دکھائے یہ حدیثیں واقعتاً حرمت کا تقاضا کرتی ہیں لیکن ان میں غیر سایہ دار کی تصریح نہیں بلکہ جمہور نے محض عموم سے استدلال کیا ہے تو دوسرے قول والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حدیثیں اپنے عموم پر نہیں ہیں بلکہ ہم اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ جیسی حدیثوں کی وجہ اس کے عموم میں تخصیص کرتے ہیں اور نصوص کے اندر تخصیصات تو چلتی ہی رہتی ہیں ایک نص عام ہوتی ہے لیکن دوسری نص کی وجہ سے اس میں تخصیص کر دی جاتی ہے اور یہاں تخصیص اس وجہ سے بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ حدیثیں بالاجماع مخصوص منہ البعض ہیں یعنی دنیا میں شاید کوئی بھی فقیہ ایسا نہیں ہے جس کا مذہب یہ ہو کہ ہر تصویر حرام ہے بلکہ کم از کم بے جان چیزوں کی تصویر تو سب کے نزدیک مستثنیٰ ہے ہی اس کے علاوہ بہت سے فقہاء نے لعب البنات کو بھی مستثنیٰ قرار دیا ہے اور بھی کچھ استثناءات ہیں تو یہ بات تو اتفاقی اور طے شدہ ہے کہ یہ حدیثیں اپنے پورے عموم پر نہیں بلکہ کچھ تخصیصات ان میں ہیں تو مالکیہ وغیرہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھی اِلّا رقمًا فِي ثوبٍ کی وجہ سے ایک تخصیص کر لی ہے۔

بعض نے اس تخصیص کا ایک قرینہ بھی پیش کیا ہے خود ان احادیث کے اندر وہ قرینہ موجود ہے وہ یہ ہے کہ یہ عذاب والی حدیثیں صراحۃً بتا رہی ہیں کہ اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرح خالق بننے کی کوشش کی ہے یعنی صفت خلق میں اللہ تعالیٰ کی نقالی کی کوشش کی ہے سب حدیثوں کا سیاق یہی بتا رہا ہے اور یہ کہ ان کو کہا جائے گا کہ ان میں روح پھونکو اس میں جان ڈالو وغیرہ اور اللہ تعالیٰ کی خلق کے ساتھ قوی مشابہت اس وقت ہوتی ہے جب کہ ایسی تصویر بنائی جائے جس کا مستقل ڈھانچہ ہو محض نقش نہ ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان، پرندے، گائے، بیل، گھوڑے وغیرہ کو کسی چیز کے تابع پیدا نہیں کیا بلکہ مستقل وجود والا بنایا ہے اور بعض حضرات نے اس نکتے کی تائید کے لئے خاص طور پر یہ حدیث پیش کی ہے: مَنْ أظلم مِمَّن ذهب يخلق كخلقي۔اس میں کخلقی کا لفظ ہے تو ایک قرینہ مالکیہ یہ پیش کر سکتے ہیں کہ یہ حدیثیں اپنے

عموم پر نہیں ہیں نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث سے اصالۃً تصویر سازی کی حرمت سمجھ میں آتی ہے نہ کہ تصویر رکھنے کی، تصویر رکھنے کا حکم اس سے اہون ہوگا۔

تیسری قسم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ اتروادیا تھا اس وجہ سے کہ اس پر تصویر ہے لیکن جو حضرات غیر سایہ دار تصویر کے جواز کے قائل ہیں وہ اسے زہد پر محمول کرتے ہیں اور یہ بات ان کی طرف سے حافظ ابن حجرؒ [1] نے فتح الباری میں نقل فرمائی ہے کہ حدیث عائشہؓ اگرچہ غیر سایہ دار تصویر کے بارے میں ہے لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ حدیث زہد پر محمول ہے کہ خلاف زہد ہونے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتروایایا کراہت تنزیہیہ پر محمول ہے کہ مکروہ تنزیہی ہونے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتروایا اور یہ عجیب بات ہے کہ حدیث عائشہؓ کے راویوں میں سے کافی حضرات اور بڑی اہم شخصیات غیر سایہ دار تصویر کے جواز کے قائل ہیں مثلاً ایک تو ان میں سے قاسم بن محمد ہیں جو حضرت عائشہؓ کے محض شاگرد ہی نہیں ان سے حدیث روایت کرنے والے ہی نہیں بلکہ ان کے مزاج شناس ہیں یعنی ایسے شاگرد ہیں جن کو اپنی استانی سے ملازمت طویلہ حاصل ہے اب یہ بات بہر حال نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ حضرت عائشہؓ کا یہ جو پردے والا واقعہ ہے اس کے سیاق و سباق کو جتنا قاسم بن محمد سمجھ سکتے ہیں شاید بعد کا کوئی آدمی اتنا سمجھنے کا دعویٰ نہ کرسکے آپ ساری روایتوں کو ملا کہ ان کا تجزیہ اور تحلیل کرلیں لیکن بہر حال جو کچھ قاسم بن محمد کے سامنے ہوگا وہ کسی اور کے سامنے نہیں وہ غیر سایہ دار تصویر کو جائز سمجھتے ہیں معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک یہ حدیث زہد یا کراہت تنزیہی پر محمول ہے۔ اس طریقے سے میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ بھی غیر سایہ دار تصویر کے جواز کے قائل ہیں اور انہوں نے ایک طرف تو وہ حدیث روایت کی ہے: **لا تدخل الملائكة بيتا فيه صورة** اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ کے پردے والے واقعہ کو بھی حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں اس حدیث کے بھی راوی ہیں۔[2] چنانچہ صحیح مسلم کی روایت میں تھوڑی سی تفصیل ہے کہ زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ میں نے ابو طلحہؓ سے یہ حدیث سنی "**لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة**" تو مجھے یہ بات عجیب لگی اس لئے میں پوچھنے کے لئے حضرت عائشہؓ کے پاس گیا کہ آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہے تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ بات تو میں نے نہیں سنی البتہ میرے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آیا کہ اس طرح سے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا اور میں نے اسے اتار کر اس سے دو

---

(۱) فتح الباری کتاب اللباس باب ماوطی من التصاویر ج۱۰/ص ۳۱۹ ...... (۲) صحیح مسلم کتاب اللباس والزینۃ باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان الخ

وسادے بنالئے تو حضرت زید بن خالد جہنیؓ بھی حضرت عائشہؓ سے پردے والا واقعہ نقل کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ غیر سایہ دار تصویر کے جواز کے قائل ہیں اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ زید بن خالد جہنیؓ کے گھر میں جو تصویر تھی وہ پردے پر تھی بخاری کی روایت میں تصریح ہے کہ جب حدیث کے راوی زید بن خالدؓ کی عیادت کرنے کے لئے گئے تو ان کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا جس پر پرندوں کی تصویر تھی یعنی بعینہ وہ صورت ہے جو حضرت عائشہؓ کو پیش آئی اور اس واقعہ کا حضرت زید بن خالد جہنیؓ کو پتہ بھی ہے لیکن پھر بھی پردے پر تصویر لٹکائی ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ حضرت عائشہؓ کے اس واقعہ کو خلاف زہد ہونے پر محمول کرتے ہیں یا کراہت تنزیہی پر محمول کرتے تھے۔

جمہور کی چوتھی قسم کی دلیل وہ حدیث تھی جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے گھر میں آنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس میں تصویر ہے لیکن یہ چوتھی قسم کی دلیل در حقیقت راجع ہے پہلی قسم ہی کی طرف کیوں کہ اس سے بھی تصویر کی برائی یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

اب تک دونوں طرف کے دلائل کا ایک جائزہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس سے یہ صورت حال سامنے آئی کہ اگرچہ حنفیہ اور جمہور فقہاء غیر سایہ دار کے بھی عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ مسئلہ ایک تو اجماعی نہیں ہے بلکہ اس میں نہ صرف یہ کہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے بلکہ صحابہ اور تابعین کا اختلاف بھی موجود ہے اور دوسرا یہ کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں تو یہ مسئلہ اجماعی بھی نہیں اور قطعی بھی نہیں ہم اگرچہ ترجیح دے لیں عدم جواز والے نقطہ نظر کو لیکن بہر حال یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ دوسری طرف کے دلائل بالکل نظر انداز کرنے کے قابل ہیں یا وہ کالعدم ہیں اور ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ اس نقطہ نظر میں بھی خاصا وزن موجود ہے اس لئے غیر سایہ دار تصویر کو حرام قطعی سمجھنا بہر حال درست نہیں اس لئے کہ ہم نے جس کو ناجائز قرار دیا وہ ہم نے ان صحابہ اور تابعین کی رائے کو نظر انداز کر کے قرار دیا ہے جو خود حرمت تصویر کی حدیثوں کے راوی ہیں اس لئے ہم اپنے نقطہ نظر کو قطعی کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان صحابہ اور تابعین کو ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ بالکل غلط ہیں اول تو کسی صحابی کی رائے کے بارے میں یہ کہا بھی نہیں جا سکتا لیکن جہاں یہ امکان ہو کہ کسی صحابی تک یہ حدیث نہیں پہنچی وہاں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نقطہ نظر قابل اعتبار نہیں لیکن جہاں یہ یقین ہے کہ یہ ساری حدیثیں جن سے ہم نے حرمت پر استدلال کیا یہ ان کے سامنے تھیں لیکن ان حدیثوں کا مطلب وہ کچھ اور سمجھتے تھے وہاں اپنے نقطۂ نظر کو ہم قطعی کہہ دیں اور یہ کہہ دیں کہ دوسرا نقطہ نظر بالکل کالعدم ہے یہ تجاوز عن الحدود ہوگا۔

ہماری اپنی حیثیت محض ناقل کی ہے اور ہمارا یہ منصب نہیں کہ کسی نقطہ نظر کو دوسرے پر دلیل کے

اعتبار سے ترجیح دیں لیکن بہر حال ایک طالب علم کی حیثیت سے ذاتی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مالکیہ کا نقطہ نظر اگرچہ اقلیتی نقطہ نظر ہے یعنی اکثر فقہاء نے اس کو اختیار نہیں کیا لیکن ان کی دلیلوں میں وزن زیادہ لگ رہا ہے، ہمارے اکابر کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دوسرے ائمہ میں سے کسی کا قول دلیل کے اعتبار سے وزنی معلوم ہوا تو اس کا کھل کر اعتراف کیا البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حنفیہ اور جمہور کا مذہب احوط ہے احتیاط اس میں زیادہ ہے اور احتیاط دو طرح کی ہوتی ہے ایک عمل میں احتیاط کہ کہتے تو کسی کام کو جائز ہیں لیکن عملاً اس سے بچتے ہیں اور ایک فتوے میں احتیاط ہوتی ہے فتوے میں احتیاط کا مطلب یہ ہے کہ کہیں ہی اس کو ناجائز تو یہاں احتیاط سے مراد میری دونوں قسم کی احتیاط ہے کہ احوط فی العمل بھی یہی ہے کہ اس کے ساتھ ناجائز والا برتاؤ کیا جائے اور احوط فی الافتاء بھی یہی ہے کہ اس کو ناجائز قرار دیا جائے لیکن یہ بات مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ کوئی قطعی اور اجماعی نقطہ نظر نہیں ہے بلکہ جس طرح اور مسائل صحابہ تابعین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہوتے ہیں اور ان میں دلائل کا وزن دونوں طرف ہوتا ہے اور حتمی فیصلہ مشکل ہوتا ہے اس مسئلے کی حیثیت بھی اسی طرح کی ہے۔

تصویر کے بارے میں کچھ جدید مباحث:۔

یہ تو تصویر کے بارے میں وہ بحثیں تھیں جو قدیم زمانے سے ہی چلتی آرہی ہیں اور فقہاء اور شارحین حدیث نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں تصویر کے بارے میں کچھ مباحث ایسی بھی ہیں جو پیدا ہی اس دور میں ہوئی ہیں پہلے ان بحثوں کا کوئی تصور نہیں تھا ان کے بارے میں ذرا غور کر لیا جائے لیکن ان مباحث کو شروع کرنے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ اس طرح کے مسائل جن کا واضح اور حتمی جواب قدیم فقہاء کی کتابوں میں موجود نہیں ہوتا بلکہ پیدا ہی اس دور میں ہوتے ہیں ان میں یہ احتیاط ضروری ہوتی ہے کہ انسان اپنے علم اپنے فہم کے مطابق جس نقطہ نظر کو بھی اختیار کرے یا ترجیح دے لیکن اس ترجیح کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئے کہ دوسرے مستند اہل علم کا نقطہ نظر اگر اس کے خلاف ہے تو اس پر انکار یا طعن شروع کر دے کیونکہ مسئلہ پیدا ہی اس دور میں ہوا ہے تو اس میں کسی بات کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیمرے والی تصویر کا حکم:۔

سب سے پہلا مسئلہ کیمرے سے حاصل کی گئی تصویر کا ہے پہلے زمانے میں تصویریں سایہ دار یا غیر سایہ دار ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں آج کل کیمرہ ایجاد ہو گیا ہے کیمرے میں ہوتا یوں ہے کہ جس شخص یا جس

چیز کے سامنے وہ کیمرہ کیا جاتا ہے اس کا عکس اس کیمرے کے اندر آجاتا ہے جس طرح آئینے کے اندر کسی چیز کا عکس نظر آتا ہے اور بٹن دبانے سے وہ عکس اس ریل پر محفوظ ہو جاتا ہے جو کیمرے کے اندر ڈالی ہوتی ہے اور بعد میں اس کو ڈویلپ (Develop) کر کے کاغذ یا گتے یا کسی اور چیز پر تصویر بنائی جاتی ہے تو اس دور کے علماء میں یہ بحث چلی ہے کہ کیمرے کی تصویر بھی آیا اس تصویر میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے جن کے نزدیک غیر سایہ دار تصویر ویسے ہی جائز ہے صرف مکروہ تنزیہی ہے ان کے ہاں یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کیوں کہ ان کے ہاں اگر یہ تصویر میں داخل ہوگی بھی تو مکروہ تنزیہی ہوگی البتہ حنفیہ اور جمہور کے نزدیک چونکہ غیر سایہ دار تصویر ناجائز ہے اس لئے ان کے ہاں یہ بحث زیادہ اہمیت رکھتی ہے تو اس میں اس دور کے علماء کے (اس دور سے مراد کیمرے کی ایجاد کے بعد کا دور) دو نقطہ نظر ہیں پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ بھی تصویر ہی کے حکم میں ہے اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر یا کیمرے سے لی گئی تصویر میں کوئی فرق نہیں چنانچہ ہمارے برصغیر کے علماء کی غالب اکثریت اسی نقطہ نظر کی قائل ہے اور علماء عرب میں بھی ایک تعداد ایسی ہے جن کا یہی قول ہے دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہی ہاتھ سے بنی ہوئی تصویروں سے ہے کیمرے سے جو تصویر حاصل کی جائے یہ اس میں داخل نہیں ہے اور علماء عرب کی ایک بہت بڑی تعداد کا نقطہ نظر یہی ہے اور ان میں سے بعض متدین علماء بھی ہیں جن کا یہ نقطہ نظر ہے۔

پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ بات بہت موٹی سی ہے کہ شریعت جب کسی چیز سے منع کرتی ہے تو اس میں آلے کے بدلنے سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خمر اور شراب شریعت میں حرام ہے اب چاہے وہ شراب پرانے زمانے کی بھٹیوں سے کشید کی ہو یا جدید آٹومیٹک پلانٹ پر تیار کی گئی ہو شراب بہر حال شراب ہے محض اس وجہ سے کہ اس کا آلہ نیا ہے اس لئے یہ حلال ہو جائے یہ کوئی معقول نقطہ نظر نہیں ہے سود کی پہلے سادہ سی شکلیں ہوتی تھیں اور زیادہ تر افراد افراد سے لیا کرتے تھے لیکن آج کل باقاعدہ آلے وجود میں آگئے ہیں نئی نئی شکلیں وجود میں آگئی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سود حلال ہو گیا ہے، قمار حرام ہے پہلے جوئے کے سیدھے سادے طریقے ہوا کرتے تھے لیکن اب جدید ذرائع مواصلات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے قمار کے نئے نئے طریقے متعارف کرا دیئے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ پہلے جوا عام سادہ سی پرچیوں سے کھیلا جاتا تھا، شطرنج کے سادہ سے بورڈ پر جوا کھیلا جاتا تھا یا سادہ سی گھڑ دوڑ پر ہوتا تھا اور آج کل جو جدید ترین آلات سے ہے اور یہ آلات اس زمانے میں موجود نہیں تھے اس لئے یہ جوا حلال ہے تو یہ نقطہ نظر ظاہر ہے کہ معقول نہیں ہوگا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آلہ کے بدلنے سے حکم نہیں بدل جاتا اس لئے تصویر جب ناجائز ہے اور یہ بھی جمہور فقہاء کے ہاں طے شدہ ہے کہ غیر سایہ دار تصویر بھی ناجائز ہے تو محض اس وجہ سے کہ یہ ایک جدید ترین آلے سے حاصل کی گئی ہے اس کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قائلین جواز کی دلیل...... جب کہ دوسری طرف جو حضرات کیمرے کی تصویر کو ممنوع تصویر میں داخل نہیں سمجھتے ان کی دلیل کئی انداز سے بیان کی جاتی ہے یوں بھی کہہ لیجئے کہ ان کی مختلف دلیلیں ہیں لیکن زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ دلیل تو ایک ہی ہے البتہ تعبیریں مختلف ہیں۔

(۱)........... ایک تعبیر یہ ہے کہ کیمرے سے جو تصویر حاصل کی جاتی ہے اصل میں یہ تصویر نہیں بلکہ عکس ہے اور عکس ناجائز نہیں مثلاً ایک کاغذ پر کسی کا حلیہ بنایا وہ بھی بالکل اسی جیسا حلیہ ہے اور وہی شخص جب آئینے کے سامنے آیا تو اس میں بھی اس کا حلیہ آگیا اور وہ بھی بالکل اسی جیسا ہے لیکن پہلی چیز ناجائز ہے اور دوسری چیز جائز ہے اس لئے کہ وہ تصویر ہے اور آئینے کے اندر جو کچھ آیا وہ عکس ہے تو اس طرح کیمرے سے جو چیز حاصل کی جاتی ہے وہ عکس ہے تصویر نہیں ہے لیکن یہ دلیل یا یوں کہئے کہ جس انداز سے یہ دلیل بیان کی گئی ہے یہ بہت ہی ضعیف ہے اور ہمارے برصغیر کے علماء میں جن علماء نے شدت کے ساتھ اس نقطۂ نظر کو رد کیا ہے ان میں سے اکثر کے پیش نظر غالباً یہی دلیل یا دلیل کی یہی تعبیر ہے اور اس کا کمزور ہونا اس لئے واضح ہے کہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تصویر اور عکس میں فرق کیا ہے اتنی بات تو ہے کہ تصویر میں بھی اسی جیسا حلیہ اور عکس میں بھی اسی جیسا حلیہ فرق کیا ہے، تو بنیادی اور واضح فرق یہی ہے کہ عکس تابع اور عارضی ہوتا ہے جب کہ تصویر کسی کے تابع نہیں ہوتی آئینے کے سامنے جب تک آپ کھڑے ہیں تو آپ کی شکل اس میں ہے لیکن جب آپ آئینے سے ہٹ جائیں گے تو آپ کا حلیہ بھی آئینے میں نظر نہیں آئے گا لیکن آپ کی تصویر اگر بنائی گئی تو آپ اگر وہاں موجود ہیں تب بھی وہ تصویر وہاں پر موجود ہے اور وہاں سے کہیں اور چلیں جائیں تب بھی وہ تصویر موجود ہے اور اگر آپ کا انتقال ہو جائے تب بھی وہ تصویر موجود رہے گی تو عکس ناپائیدار ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ تابع ہوتا ہے اور تصویر تابع نہیں ہوتی یعنی جس کی تصویر ہے اس کے تابع نہیں ہوتی اب کیمرے سے بنی ہوئی تصویر کو دیکھ لیجئے کیمرے کی تصویر میں اصل موجود ہو تب بھی تصویر موجود اور اگر اصل غائب ہو جائے تب بھی وہ تصویر موجود ہے اصل کا انتقال ہو جائے تب بھی وہ تصویر موجود ہے لہٰذا کیمرے سے جو چیز لی گئی ہے وہ عکس ہے ہی نہیں بلکہ وہ تصویر ہے اس لئے عکس کہہ کر اس کو جائز قرار دے دینا بہت ہی کمزور بات ہے۔

(۲)........... ان حضرات کی دوسری تعبیر یہ ہے کیمرے سے جو تصویر حاصل کی جاتی ہے یہ حبس الظل ہے یعنی کیمرے میں اس شخص کا سایہ پڑا یا دوسرے لفظوں میں کہئے اس کا عکس آیا اور ہم نے اس کو بٹن دبا کر محفوظ کر لیا تو عکس کو ہم نہیں لائے عکس تو خود آگیا ہے البتہ ہم نے صرف اتنا کیا کہ اس کو جانے نہیں دیا بلکہ اس کو محبوس کر لیا لیکن یہ دلیل بھی اتنی قوی نہیں ہے اس لئے کہ آپ ایک جانور شکار کرتے ہیں اس طریقے سے کہ اس

کے پیچھے بھاگے اس کو پکڑ لیا یا شکاری کتے اس کے پیچھے دوڑائے اور اس کو پکڑ لیا یا تیر یا بندوق وغیرہ سے اس کا شکار کر لیا تو یہ بھی شکار کرنا ہی سمجھا جائے گا اور ایک یہ ہے کہ آپ نے ایک پنجرہ سا بنایا اور اس میں اس جانور کی کوئی مرغوب خوراک رکھ دی جب اس پنجرے کے اندر آگیا تو آپ نے اس کا دروازہ بند کر دیا تو بھی شکار کرنا ہی کہلائے گا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اب یوں کہیں کہ وہ آیا تو خود ہے ہم نے پکڑ کر اس کو اس میں داخل تو نہیں کیا تھا، یہ تو بنی اسرائیل والی بات ہو گی وہ کہتے تھے کہ مچھلیاں ادھر خود آئیں ہیں ہم تو نہیں لائے تو اسی طرح یہ بات ہے کہ عکس اس کے اندر خود آیا ہے ہم لائے تو نہیں ہیں آپ لائے تو نہیں لیکن لانے کا انتظام تو آپ نے کیا کہ کیمرے کو اس کے سامنے کیا یہ عمل تو آپ کا ہے اس لئے یہ بھی کوئی اتنی قوی دلیل نہیں ہے۔

(۳)............اس نقطۂ نظر کی تیسری تعبیر یہ ہے کہ اصل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تصویر سازی کی حرمت کی علت کیا ہے تو احادیث سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی علت المضاہات بخلق اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کی نقالی مصور یہ بتاتا ہے کہ میں نے بھی ایک تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے اپنی مہارت کا ثبوت دیتا ہے اور یہ علت ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں تو پائی جاتی ہے لیکن کیمرے کی تصویر میں یہ علت نہیں پائی جاتی اس لئے کہ جس کی تصویر بنائی گئی ہے اس کے نقش و نگار اس کے اندر لانے میں اس مصور یا کیمرہ مین کی کسی تخلیقی صلاحیت کا کوئی دخل نہیں بلکہ وہ نقش اس میں قدرتی طریقے سے آئے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آئینے کے اندر ہمارے نقش آجاتے ہیں اور وہ قدرتی طریقے سے آتے ہیں کوئی آدمی آئینہ کسی کے سامنے کر دے تو اگرچہ اس کے نقش آنے میں اس کے فعل کا دخل ہے کہ اس نے آئینہ اس کے سامنے کیا تو اس کے نقش اس میں آگئے لیکن اس کے باوجود یہ کہیں گے کہ نقش لانا اس کا فعل نہیں ہے بلکہ وہ قدرتی طریقے سے آئے ہیں یہ اس کا کمال نہیں، یہی معاملہ کیمرے کے اندر ہے کہ کیمرے کو کسی کے سامنے کرنا اگرچہ اس کا فعل ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو نقوش کیمرے کے اندر آتے ہیں یہ ایک قدرتی طریقے سے آئے ہیں کہ اس کے جسم سے شعاعیں نکل کر کیمرے کے اندر آئیں اور اس کی وجہ سے اس کے اندر اس کا عکس آگیا اس میں کوئی تخلیقی مہارت اس کی نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ کہیں کہ اللہ کی صفت خالقیت کے ساتھ نقالی کا دعویٰ ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں تو شاید بات ذہن میں بیٹھ جائے فرض کیجئے کہ ایک بہت بڑے خطاط ہیں انہوں نے بالکل نئے انداز سے اور اپنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے بہت ہی خوبصورت بسم اللہ لکھی ایسی بسم اللہ کہ کمال کر دیا اب ایک اور صاحب آئے انہوں نے نے بھی قلم پکڑا اور اس بسم اللہ کو سامنے رکھا یا اس کا نقشہ ذہن میں بٹھایا اور اس جیسی بسم اللہ لکھنے کی کوشش کی اس جیسی لکھی گئی یا نہیں لکھی گئی لیکن اس نے

پانچواں جواب ...... سب سے بہتر اور صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیثیں ذمیوں پر محمول ہیں، جزیے کے باب میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرو غیرہ نے کچھ لوگوں پر جب جزیہ مقرر کیا تو ان کے جزیہ میں کچھ تو درہم و دنانیر سالانہ شامل تھے یا کچھ اور چیزیں شامل تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی شامل تھی کہ ہمارے لوگ ہمارے لشکر یا ہمارے عاملین اس علاقے میں آئیں گے تو ان کی مہمانی بھی تمہارے ذمہ ہوگی یہ مہمانی جزیے کا باقاعدہ حصہ تھی اور اس کے بدلے میں جو سالانہ جزیہ تھا اس میں تخفیف کی جاتی تھی مثلاً اگر سالانہ بارہ درہم لینے ہیں تو جن پر مہمانی واجب کی گئی ہے ان سے بارہ درہم کی بجائے دس درہم لئے جاتے تھے یا ایک دینار لیا جاتا تھا جب کہ وہاں تفصیل سے گزر چکا ہے یہ حدیث اس طرح کے ذمیوں پر محمول ہے، تو چونکہ مہمانی ان کے جزیے کے اندر شامل ہے اس لئے ان پر اس کی ادائیگی لازم ہے اور اگر وہ انہیں دیتے تو زبردستی بھی ان سے لیا جا سکتا ہے۔ بہر حال جمہور کے نزدیک ان احادیث سے ضیافت کا وجوب ثابت نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ وہ ضیف مضطر ہو۔ (۱)

جائزہ کا معنی اور اس میں وسعت:-

دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضیافت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

جائزتہٗ یوم ولیلة والضیافة ثلثة ایام۔

اس میں جائزہ مشتق ہے جاز یجوز سے، جس کا معنی گزرنا ہے جائزۃ یا جِیزۃ اصل میں کھانے کی اسی مقدار کو کہا جاتا ہے جو ایک منزل سے دوسری منزل تک کافی ہو جائے یا پانی کی اتنی مقدار جو ایک منزل سے دوسری منزل تک کافی ہو جائے یعنی جس کے ذریعے سے سفر کیا جا سکے، سفر میں گزارا کیا جا سکے۔ بعد میں جائزہ کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جو کسی مہمان کو رخصت ہوتے وقت زادِ راہ کے طور پر دے دی جاتی ہے کہ راستے میں کھانے پینے کا انتظام ہو جائے، اس کو جائزہ بھی کہتے ہیں اور جیزہ بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انتقال سے پہلے جو وصیتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ **اجیزوا الوفد بنحو ما کنتُ اجیزھم**۔ کہ جس طرح میں وفد کو جائزۃ یا جیزہ دیا کرتا تھا تم بھی ان کو جائزۃ یا جیزہ دیا کرنا۔ اس کے بعد جائزے کا اطلاق مطلقاً اعزاز و اکرام پر ہونے لگا کہ اعزاز و اکرام کے طور پر کسی کو کوئی چیز دے دی جائے تو وہ جائزہ ہے اس لئے کہ مہمان کو جو جاتے وقت دیا جاتا تھا کبھی تو اس کو ضرورت کے پیش نظر دیا جاتا تھا اور کبھی محض اعزاز و اکرام کے طور پر اسے کچھ تحفہ دے دیا جاتا تھا پھر اسی سے اسی معنی کو وسعت

---

(۱) فیض الباری علی صحیح البخاری کتاب الادب اکرام الضیف ج ۴/ ص ۳۹۶

ہوئی اور شعرا کو قصیدہ پڑھنے کی وجہ سے بادشاہوں اور حکام کی طرف سے جو عطیہ ملتا تھا اس کو جائزہ کہا جانے لگا، پھر کسی بھی اچھے کام پر جو انعام کسی کو دیا جاتا ہے اس کو جائزہ کہا جانے لگا چنانچہ آج کل عربی زبان میں جائزۃ کا اطلاق زیادہ تر انعام پر ہوتا ہے۔

حدیث میں جائزہ سے مراد...... حدیث میں جہاں جائزۃ سے کیا مراد ہے اس میں دو احتمال ہوسکتے ہیں:

مہمان کو سفر میں کھانے کے لئے دینا:۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ مہمان کو رخصت ہوتے وقت سفر میں کچھ کھانے کے لئے بطور زادراہ دے دیا جائے۔

مہمان کے کھانے میں تکلف کرنا:۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ مہمان کے اعزاز واکرام کے طور پر اس کے لئے کھانے میں تکلف کیا جائے عام معمول کا کھانا اس کے سامنے نہ رکھا جائے۔ یہاں دونوں معنی درست ہیں اس لئے کہ دونوں چیزیں ہی مہمانی کے آداب میں شامل ہیں۔ کم از کم ایک دن مہمان کے لئے کھانے میں اپنی حیثیت کے مطابق تکلف کرنا بھی مہمانی کے آداب میں شامل ہے اگر وہ لمبے سفر پر جارہا ہے تو راستے کا کھانا دے دینا بھی اس کے آداب میں شامل ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مہمان دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض ٹھہرنے والے ہوتے ہیں، بعض جلدی چلے جانے والے، جو ٹھہرنے والے ہیں ان کے لئے جائزہ سے مراد کھانے میں تکلف کرنا ہے کہ اگر وہ تین دن ٹھہر رہا ہے تو ایک دن کم از کم اسے نسبتاً پر تکلف کھانا کھلایا جائے باقی دو دنوں میں عام معمول کا کھانا کھلا دیا جائے اور جو مہمان ٹھہرنے والا نہیں ہے آتے ہی بس جارہا ہے تو اس کے لئے جائزہ یہ ہے کہ اسے راستے میں کھانے کے لئے دے دیا جائے اور اگر کسی مہمان میں دونوں باتیں جمع کردی جائیں کہ ٹھہرنے والا مہمان اس کے لئے ایک دن کے کھانے میں بھی تکلف کرلیا جائے اور جب وہ جائے تو ساتھ دے دیا جائے تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ ایک سوال شارحین حدیث نے یہاں اٹھایا ہے وہ یہ کہ

حدیث میں تین دن مراد ہیں یا چار دن؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **جائزتہ یوم ولیلۃ والضیافۃ ثلثۃ ایام۔**

کہ ضیافت تین دن ہے اور جائزۃ یعنی پر تکلف کھانا ایک دن ہے، تو یہ ضیافت کے تین دن جائزے والے دن کے علاوہ ہیں یا اس کو شامل کرکے ہیں اگر اس کے علاوہ ہوں تو چار دن بن جائیں گے

ابراہیم نخعیؒ وغیرہ سے نقل کر چکا ہوں کہ تصویر کا رکھنا اس وقت ناجائز ہے جب کہ وہ منصوبہ ہو، یعنی کھڑی ہو، مقصود اس سے بھی بظاہر یہی ہے کہ وہ محل تعظیم میں ہو۔

تصویر رکھنے کے ممنوع ہونے کی علت تعظیم ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے تصویر والے پردوں کو بچھونا یا تکیہ بنانے کا حکم دیا تھا تا کہ یہ تصویر ایسی جگہ پر ہو جو روندی جائے، اعلاء السنن[1] میں ایک روایت مسند احمد کے حوالے سے ان لفظوں سے نقل کی گئی ہے: **ولقد رأيته متكئا على إحدهما وفيها صورة۔**

تعظیم کے علت ہونے کا مقصد ایک ایسی چیز کی تعظیم سے بچنا ہے جو فی الجملہ ذریعہ شرک بن سکتی ہے اگرچہ بالفعل اس کی عبادت نہ کی جاتی ہو یا ایسی چیز کی تعظیم سے بچنا ہے جس کے بنانے والے کا مقصد اللہ کی خالقیت میں شرکت کا دعوی یا اس دعوے کا انداز تھا، کیونکہ اس تعظیم کے اندر اس کے اس فعل کی ایک گونہ تائید پائی جاتی ہے۔

تعظیم کا یہ مطلب نہیں کہ عملاً اس کی تعظیم کر رہا ہو بلکہ ایسی جگہ پر ہونا ہے جہاں ہونے کا مقصد تعظیم بھی ہو سکتا ہے اگرچہ اس کا مقصد تعظیم نہ ہو تب بھی ناجائز ہے۔

حاصل پوری بحث کا یہ ہے کہ کیمرے کی تصویر میں مضاہاۃ بخلق اللہ (اللہ کی خالقیت کے ساتھ مشابہت) پائے جانے یا نہ پائے جانے کے حوالہ سے دو نقطۂ نظر علماء کے ہو گئے ایک اس کو بھی عام تصویر کے حکم میں سمجھتا ہے اور دوسرا اس علت کے کیمرے کی تصویر میں نہ پائے جانے کی وجہ سے اسے جائز قرار دیتا ہے لیکن دوسرا نقطۂ نظر اگر اختیار کر بھی لیا جائے تو اس دلیل سے جواز صرف کھنچوانے کا ثابت ہوتا ہے رکھنے کا نہیں اس لئے کہ مضاہاۃ بخلق اللہ علت صرف تصویر بنانے کی حرمت کی ہے تصویر رکھنے کی علت کی نہیں اس لئے کیمرے سے بنی ہوئی تصویر خاص طور پر جب کہ شوقیہ ہو، جیسے عموماً گھروں میں آرائش یا کسی کی یادگار کے لئے لٹکائی جاتی ہے تو اس کی اجازت دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق بھی نہیں ہونی چاہئے البتہ ایسی تصویر جو محل تعظیم میں نہ ہو بلکہ محل اہانت میں ہو یا عموماً مستور رہتی ہو تو اس کے رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال کیمرے کی تصویر کے بارے میں دونوں نقطۂ نظر موجود ہیں ایک یہ کہ یہ بھی ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کی طرح ہے دوسرا فریق کیمرے اور ہاتھ کی تصویر میں فرق کرتا ہے ہمارے بیشتر علماء نے اس دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار نہیں کیا اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے پہلا نقطۂ نظر احوط ہے لیکن اس کے ساتھ قطعی حکم والا معاملہ کرنا کہ دوسرا نقطۂ نظر بالکل ہی نا قابل اعتبار ہے اور مسئلہ اختلافی کہلانے کے

---

(۱) ج۵/ص ۱۲۰

بھی قابل نہیں ہے یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ تصویر سازی کے فعل کی حد تک یہ نقطۂ نظر بھی بالکل ہی بے وزن نہیں ہے البتہ اس نقطۂ نظر کو شوقیہ تصویروں تک وسیع کر دینا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔

جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا کہ اس طرح کے مسائل میں اپنا نقطۂ نظر جو بھی ہو عالم کو عمل اس پر کرنا چاہئے جس پر اس کو شرح صدر ہو جس میں احتیاط اور خروج عن الخلاف ہو اور جو غیر عالم ہے یا عام عرفی معنی میں وہ مولوی ہے لیکن علمی تبحر اور دلائل پر غور کی صلاحیت نہیں ہے یا صلاحیت ہے لیکن کسی وجہ سے موقع نہیں ملا تو اس کو ایسے عالم کے قول پر عمل کرنا چاہئے جس پر وہ عام طور سے مسائل شرعیہ میں اعتماد کرتا ہے وگرنہ اتباع ہوی کا راستہ کھل جائے گا کہ ایک مسئلے میں اس کی بات مان لی اور دوسرے میں دوسرے کی تیسرے میں تیسرے کی اور منشاء یہ نہیں ہے کہ اس کی بات دل کو لگتی ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس کی بات اپنی مرضی کے زیادہ موافق ہے تو عمل میں تو یہ طریقہ اختیار کرے لیکن بہر حال دوسرے نقطۂ نظر والوں پر انکار شدید یا طعن کرنا یہ بھی مناسب نہیں ہے آج کل ہمارے ہاں یہ غلطی بعض اوقات ہو جاتی ہے چنانچہ بعض اچھے اچھے لوگ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھ جاتے ہیں کہ مصر کے احمقوں کا یہ قول ہے فلاں ملک کے بیوقوں کا یہ قول ہے اور فلاں جگہ کے جاہلوں کا یہ قول ہے تو اس طرح کی تعبیرات قابل احتراز ہیں۔

شناخت کے لئے تصویر کا حکم:۔

آج کل زیادہ ابتلاء کیمرے ہی کی تصویر میں ہے اس ابتلاء کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان میں سے سب سے اہم اور معروف مسئلہ شناخت کے لئے تصویر لگانا ہے مثلاً شناختی کارڈ، پاسپورٹ، ڈرائیونگ لائیسنس، بعض ڈگریوں پر اور اس طرح کی کئی دستاویزات پر تصویر لگائی جاتی ہے اور بعض جگہوں پر یہ تصویر قانوناً لازم ہوتی ہے تو اس تصویر کا کیا حکم ہے اس میں دو مسئلے ہیں ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ لوگ جن کا اس طرح کے قانون بنانے میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن بہر حال جس ملک میں وہ رہتا ہے اس میں اس طرح کا قانون موجود ہے اور اس قانون کی وجہ سے وہ تصویر بنانے پر مجبور ہو گیا ہے مثلاً اسے شناختی کارڈ بنوانا ہی پڑے گا یا کوئی ضروری سفر کرنا ہے تو اس کے لئے پاسپورٹ بنوانا ہی پڑے گا اور اس پر اس کو تصویر بھی لگانی پڑے گی تو اس کے بارے میں اہل علم کا تقریباً اتفاق ہے کہ اس کے لئے تصویر جائز ہے کیونکہ یہ مجبور ہے اور مجبوری کے درجے کے احکام عام حالات سے مختلف ہوتے ہیں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ بذات خود یہ تصویر جو شناخت کے لئے استعمال کی جاتی ہے یہ جائز ہے یا نہیں یعنی کوئی اس طرح کا قانون بناتا ہے تو اس کے لئے یہ درست ہے یا نہیں تو اس سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس طرح کی دستاویزات پر تصویر کو ضروری کیوں قرار دیا

یا ایک رات گھر سے باہر نکلے تو آپ نے اچانک حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تمہیں تمہارے گھروں سے کس چیز نے نکالا؟ ان دونوں نے عرض کیا بھوک نے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے جس چیز نے تمہیں نکالا۔ اٹھو! چنانچہ وہ آپ کے ساتھ اٹھے، تو آنحضرت ﷺ انصار میں سے ایک شخص کے پاس آئے، تو وہ انصاری اپنے گھر میں موجود نہیں تھے، تو جب ان کی بیوی نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو اس نے کہا خوش آمدید ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں شخص کہاں ہے؟ تو اس نے بتایا کہ وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گیا ہے، اتنے میں وہ انصاری آگئے انہوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا تو کہا: **الحمد للہ** آج مجھ سے زیادہ معزز مہمانوں والا کوئی نہیں۔ (اور لوگوں کے پاس بھی مہمان آئے ہوں گے لیکن جتنے اونچے مہمان میرے پاس آئے ہیں کسی کے پاس نہیں آئے) حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ وہ انصاری گئے اور ان کے پاس ایک خوشہ لائے جس میں کچی اور پکی کھجوریں بھی تھیں، خشک اور تر کھجوریں بھی تھیں اور یہ عرض کیا کہ اس میں سے کھاؤ اور خود اس نے چھری پکڑلی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم دودھ دینے والی بکری سے بچنا۔ (یعنی دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا اس میں تمہارا نقصان زیادہ ہوگا) چنانچہ اس انصاری نے ان کے لئے بکری ذبح کی تو انہوں نے بکری کا گوشت کھایا اور اس خوشے میں سے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا، جب سیر ہوگئے اور سیراب ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے قیامت کے دن تم سے اس نعمت کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا تمہیں تمہارے گھروں سے بھوک نے نکالا تھا پھر تم گھروں کو واپس نہیں لوٹے یہاں تک کہ یہ نعمت تمہیں حاصل ہوگئی۔

حدیث میں بیان کردہ واقعہ سے مستنبط احکام:-

(۱) حضور ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے حالات اور مزاج میں یکسانیت ......

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حالات میں بہت زیادہ

یکسانیت ہوتی تھی، حالات ایک ہی رہتے تھے جس کی وجہ سے جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھوک کا شکار ہوئے اسی وقت حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھوک کا شکار ہوئے اور مزاج بھی ایک جیسا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بھوک کی وجہ سے باہر نکل آئے اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی بھوک کی وجہ سے گھر سے باہر نکل آئے تو گویا ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

(۲) مشکل میں ابتلاء کی صورت میں ممکنہ حد تک ضرور کوشش کرنی چاہئے ......
اگر آدمی کسی مشکل میں مبتلا ہو یا کسی ضرورت کا شکار ہو تو اگرچہ اسے اسباب نظر نہ آرہے ہوں یا اسباب کے نتائج نظر نہ آرہے ہوں لیکن جتنی حد تک ممکن ہو اتنی حد تک ہاتھ پاؤں ضرور مار لینے چاہئیں۔ حضرت ابو بکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا کہ کیا ملے گا؟ کہاں سے ملے گا؟ لیکن بہر حال گھر سے نکل پڑے، گھر میں آرام سے نہیں بیٹھے رہے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی دیا۔

(۳) حاجت کے وقت بے تکلف احباب کے پاس کھانے پینے کے لئے جانا ......
اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت اور حاجت وغیرہ کے موقع پر کھانے پینے کے لئے اگر آدمی اپنے بے تکلف احباب کے پاس چلا جائے اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔

(۴) خوف فتنہ نہ ہونے کی صورت میں عورت سے بات کرنا اور مرد کی عدم موجودگی میں عورت کے لئے مہمان کو ٹھہرانا اور بٹھانا ...... اس حدیث سے شارحین نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اگر فتنے کا خوف نہ ہو تو کسی عورت سے بات کرنا بھی جائز ہے اور کسی عورت کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ کسی مہمان وغیرہ کو مرد کی عدم موجودگی میں اپنے گھر کے اندر ٹھہرائے اور بٹھائے۔[1]

(۵) مہمانی کا ایک لطیف ادب ...... اس حدیث سے میزبانی کا ایک بڑا لطیف ادب سمجھ میں آرہا ہے اور اس انصاری صحابی کی دانائی اور سمجھ داری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اصل میں تو بکری ذبح کر کے کھلانی تھی لیکن اس میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ وقت لگ جانا تھا اس لئے انہوں نے فوری طور پر جو چیز پیش کی جاسکتی تھی پیش کر دی کہ کھجوروں کا خوشہ پیش کر دیا تاکہ تھوڑا بہت یہ کھانا شروع کر دیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مہمان کے آتے ہی اس کے سامنے تھوڑی بہت چیز پیش کر دی جائے اصل کھانا بعد میں آجائے یہ بھی ایک اچھی بات ہے بشرطیکہ وہ ایسی چیز نہ ہو جس کے بعد کھانا کھانا مشکل ہو جائے۔[2]

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح باب الضیافۃ تحت حدیث ابی ہریرۃ ج ۸ / ص ۲۰۴ ..... (۲) المرجع السابق

فرق ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ جعلی ہے اور اگر بالکل اسی جیسے ہوں تو مطلب یہ کہ یہ اسی کا ہے وگرنہ یہ اس طرح کے دستخط نہ کر سکتا اس لئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ اجازت نہیں لیکن راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کی وجہ سے اجازت ہونی چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ تصویر کے باوجود بھی تزویر چلتی ہے لیکن اگر تصویر نہ ہو تو تزویر کا راستہ بہت زیادہ کھل جائے گا تصویر تزویر کو ختم کرنے کا ذریعہ تو نہیں ہے لیکن قابل ذکر تقلیل کا ذریعہ ضرور ہے تصویر کے ہوتے ہوئے تزویر کا ارادہ وہی آدمی کرے گا جو واقعتاً فراڈی ہو اگر تصویر نہ ہو تو عام زید، عمر، بکر بھی کچھ نہ کچھ گڑبڑ کر لیں گے اور دوسری طرف بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تزویر خطرناک ثابت ہوتی ہے اب فرض کیجئے ایک شخص ہے فرض کیجئے ایک حساس تنصیب ہے آئل ریفائنری ہے تیل صاف کیا جاتا ہے وہاں پر اگر غیر متعلقہ آدمی چلا جائے اور تھوڑی سی بھی کسی حساس جگہ پر چنگاری رکھ آئے سگریٹ ہی بغیر بجھائے وہاں رکھ آئے تو بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے کوئی اسلحہ سازی کی تنصیب ہے ایٹمی تنصیبات میں ایسی تنصیبات ہیں جن میں غیر متعلقہ آدمی پانچ منٹ کے لئے بھی چلا گیا تو بہت ساری چیزیں دیکھ کر اور راز لے کر کسی دشمن کو پہنچا سکتا ہے۔

اب وہاں قانون یہ بنایا گیا کہ جو یہاں کے ملازم ہیں انہیں کو اندر آنے کی اجازت ہوگی کسی غیر متعلقہ شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں اس مقصد کے لئے ملازمین کو شناختی کارڈ جاری کیا گیا جس میں لکھا ہوا ہے کہ فلاں ابن فلاں یہاں کا ملازم ہے اور اس کو اندر آنے کی اجازت ہے اب اگر تصویر اس پر لگی ہوئی نہیں ہے تو ایک شخص کا یہ شناخت نامہ کسی طریقے سے حاصل کر کے دوسرا غیر متعلقہ شخص بھی جا سکتا ہے وہ گیٹ کیپر کو کہے گا میرا نام یہ ہے اور یہ میرا شناخت نامہ ہے لہٰذا مجھے اندر جانے دیا جائے جب کہ اگر تصویر ہو تو یہ کام خاصا مشکل ہوگا آسانی سے اس طرح کا دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور عام طور پر ایسی جگہوں پر یہ شناخت نامہ بیج کی شکل میں سینے پر لگایا جاتا ہے تاکہ آمد و رفت کے وقت جو گیٹ کیپر ہے وہ بآسانی دیکھ کر اسے اندر جانے دے۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ مقصد شناخت کا اور ذرائع سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے تو وہ ذرائع اتنے آسان نہیں ہیں جتنی تصویر آسان ہے اس لئے کہ دستخط کو پہچاننے کے لئے مہارت کی ضرورت ہے وگرنہ ایک آدمی دوسرے آدمی جیسے دستخط بآسانی کر سکتا ہے اسی طرح نشان انگوٹھا پہچاننے کے لئے بھی مہارت کی بالخصوص آلات کی ضرورت ہے اور ہر جگہ پر انہیں مہیا کیا جائے یا ہر جگہ پر اس کا ماہر موجود ہو یہ خاصا مشکل ہے اسی طریقے سے اگر تصویر نہ ہو تو ایک ملک کا کوئی آدمی شہری نہیں ہے لیکن وہ کسی کا کارڈ چرا کر اپنے آپ کو بآسانی شہری ثابت کر سکتا ہے اور وہ کوئی تخریب کاری بھی کر سکتا ہے ایک شخص کو حکومت کی طرف سے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے لیکن وہ کسی دوسرے کا پاسپورٹ استعمال کر لیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ

میرا نام یہ ہے جو اس پر لکھا ہوا ہے اگر اس پر تصویر لگی ہوئی ہو تو بھی اس طرح کے فراڈ چل سکتے ہیں کیونکہ شناختی کارڈ رشوت دے کر جعلی بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور بھی مختلف قسم کے فراڈ کئے جا سکتے ہیں لیکن بہر حال ان میں کمی ضرور ہوگی کیوں کہ اس طرح کے فراڈ کے لئے کافی پاپڑ بیلنے پڑیں گے پھر بہر حال یہ ضرورت ضرور ہے اور اتنی ضرورت تو ضرور ہے جتنی کہ دراہم اور تصویر والی تلوار کے استعمال میں تھی اس لئے اس کی بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں کئی سال پہلے ایک صاحب نے شناختی کارڈ پر تصویر کے لازمی ہونے کے قانون کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا تھا کہ یہ چونکہ خلاف شریعت ہے اس لئے اس قانون کو کالعدم قرار دیا جائے لیکن وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ یہی دیا کہ یہ قانون صحیح ہے اور خلاف شریعت نہیں ہے اس کے بعد اس نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت بینچ میں اپیل دائر کی تو اس بنچ نے بھی باتفاق رائے یہی فیصلہ دیا کہ یہ قانون خلاف شریعت نہیں ہے اس لئے اسے ختم نہیں کیا جاتا اور اس بنچ میں دو علماء بھی شامل تھے ایک تو حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اور دوسرے پیر کرم شاہ صاحب مرحوم اور دونوں ہی بہر حال متدین اور متبحر عالم ہیں، انہوں نے بھی یہی فیصلہ دیا حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم کا لکھا ہوا فیصلہ عدالتی فیصلے نامی ایک کتاب کے اندر بھی موجود ہے اس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک اور اصول کی وجہ سے گنجائش نکل آئی وہ یہ ہے کہ مجتہد فیہ مسائل میں حکم حاکم اور قضائے قاضی رافع نزاع ہوتی ہے یعنی جس مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف ہو اس میں عمل اگرچہ اپنے امام کے قول پر کیا جاتا ہے لیکن اگر قاضی اگر دوسرے امام کے قول پر فیصلہ کر دے یا حاکم دوسرے امام کے قول پر حکم جاری کر دے تو اب اس کے لئے بھی مسئلہ وہی ہو جاتا ہے جہاں جہاں تک یہ قضا نافذ ہوگی اور جہاں جہاں تک یہ حکم نافذ ہوگا وہاں وہاں تک گویا یہ مسئلہ اختلافی رہے گا ہی نہیں بلکہ ہماری اپنی فقہ کا مسئلہ بھی یہی بن جائے گا کہ یہ ٹھیک ہے، دوسری فقہ کا مسئلہ ہماری فقہ کا مسئلہ بن جائے گا یہ اصول ہے اور یہ تصویر جو شناخت کے لئے استعمال ہوتی ہے یہ بھی مجتہد فیہ ہے اور کئی پہلوؤں سے مجتہد فیہ ہے۔

(۱)......... ایک تو اس لئے کہ یہ غیر سایہ دار تصویر ہے اور اس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

(۲)......... دوسرا یہ کہ کیمرے سے بنی ہوئی تصویر ہے۔

(۳)......... تیسرا یہ کہ اس تصویر میں اعضاء مکمل نہیں ہوتے بلکہ عموماً سینے تک ہوتی ہے پیٹ اگر ہو بھی تو تھوڑا سا ہوتا ہے تو گویا بعض ایسے اعضاء مفقود ہوتے ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی مفقود ہوتی ہے اور ایسی

وہ تمہیں حق نہیں دے رہا خیانت کر رہا ہے، تم اس کی اجازت کے بغیر لے رہے ہو تو تم اس کے ساتھ خیانت کر رہے ہو، تو خیانت کے بدلے میں خیانت کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب...... جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اپنا حق لینا یہ خیانت نہیں ہے لہٰذا **لا تخن من خانك** کے اندر داخل نہیں ہوگا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ اس نے میرا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چرالیا بعد میں وہ مجھے مل گیا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس نے میرا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چرایا تھا لہٰذا وہ چور ہے اور چور کی چوری کرنا ٹھیک ہے۔ لہٰذا اگر میرے ہاتھ میں اس کا ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چڑھتا ہے تو میں لے لیتا ہوں یہ لینا بہر حال خیانت ہے اس وجہ سے کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی تھی اب میں اس کے ساتھ خیانت کروں یہ جائز نہیں۔

جواز والوں کے دلائل...... جو حضرات کہتے ہیں کہ اپنا حق لینا جائز ہے ان کا استدلال ایک تو اس حدیث سے ہے۔

پہلی دلیل...... کہ یہ عاملین زکوٰۃ کی بات ہو یا ذمیوں کی بات ہو۔ (جیسا کہ پہلے تفصیل سے گزرا) بہر حال مہمان کا حق تھا کہ اس کو مہمانی ملے اور اگر وہ حق نہیں دیتے تو جیسے ہو سکتا ہے یہ اپنا حق لے لے، تو معلوم ہوا کہ اپنا حق لینا جائز ہے۔

دوسری دلیل...... دوسرا استدلال حضرت ہندہ زوجۂ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ ابوسفیان بعض اوقات ہمیں خرچہ نہیں دیتے کنجوسی کرتے ہیں، تو کیا ان کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے لے سکتے ہیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف۔**

کہ قاعدے اور عرف کے مطابق جو تمہارے لئے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو سکتا ہے وہ تم ان کی اجازت کے بغیر لے سکتے ہو یعنی نفقہ تمہارا حق ہے اگر وہ خود نہیں دیتے تو تم چوری چھپے نفقہ لے سکتی ہو۔

البتہ حنفیہ ان حدیثوں کو جنس حق کے ساتھ خاص کرتے ہیں کیوں کہ جب خلاف جنس کا مسئلہ ہوتا ہے تو وہاں در حقیقت مال کا مال کے بدلے میں تبادلہ ہو رہا ہوتا ہے کہ اصل میں تو اس کے ذمے میرے ہزار روپے واجب ہیں لیکن اس ہزار روپے کے بدلے میں میں اس کی گھڑی لے رہا ہوں، تو صرف اپنا حق لینا نہیں ہے بلکہ مال کا مال کے بدلے میں تبادلہ ہے تو جب مال کا مال کے بدلہ میں تبادلہ ہو تو اس میں اجازت ضروری ہے اور یہاں اجازت نہیں پائی گئی اس لئے یہاں لینا جائز نہیں۔

حنفیہ کا اصل مذہب تو یہی ہے کہ غیر جنس سے لینا جائز نہیں ہے لیکن متاخرین نے فساد زمان کی وجہ

سے اور جور قضاۃ کی وجہ سے یعنی قاضیوں کے غیر عادل ہونے کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ ان کے ذریعہ سے حق حاصل کرنا مشکل ہے۔ فتویٰ شافعیہ کے مذہب پر دیا ہے کہ جنس حق میں سے لینا بھی جائز ہے اور غیر جنس میں سے بھی لینا جائز ہے البتہ اس میں اتنی احتیاط ضرور ہونی چاہئے کہ جب غیر جنس میں سے لیں گے تو اس میں قیمت بہر حال لگانی پڑے گی، یہ دیکھنا پڑے گا کہ گھڑی تقریباً کتنے کی ہے، تو قیمت لگانے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ دو ہزار (۲۰۰۰) کی گھڑی ہے اور آپ ویسے ہی فرضی طور پر یہ خیال کرلیں کہ یہ ہزار کی ہے اور یہ سمجھیں کہ ہزار (۱۰۰۰) کے بدلے میں مجھے ہزار (۱۰۰۰) کی گھڑی مل گئی بلکہ قیمت لگانے میں دیانت داری کے ساتھ پوری احتیاط کرنی چاہئے اگر واقعتاً اتنی قیمت بنتی ہے تو وہ چیز لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(٦)-----وعن أبي الأحوصِ الجُشَمي، عن أبيهِ، قال: قلت: يا رسولَ الله! أرأيتَ إن مررتُ برجلٍ فلم يَقرِني ولم يُضِفني ثمَّ مرَّبي بعد ذلك، أأقرِيه أم أجزيهِ قال: بل اقرهِ۔ (رواه الترمذي)

ترجمہ ...... حضرت ابو الاحوص جشمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بتلایئے اگر میں کسی آدمی کے پاس سے گزروں اور وہ مجھے کھانے کے لئے بھی نہ دے اور اپنا مہمان بھی نہ بنائے پھر وہ شخص اس کے بعد میرے پاس سے گزرے تو میں اس کی مہمانی کروں یا اس کو بدلہ دوں۔ (یعنی اس کی مہمانی نہ کروں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلکہ اس کی مہمانی کرو۔

(٧)-----وعن أنس أو غيره أنَّ رسولَ اللهِ صلى اللهُ عليه وسلم استأذنَ على سعدِ بن عبادة فقال: السلام عليكم ورحمة الله فقال سعد: وعليكم السلام ورحمة الله، ولم يُسمعِ النبيَّ صلى الله عليه وسلم حتى سلم ثلاثـاً، وردَّ عليهِ سعدٌ ثلاثـاً، ولم يُسمعه، فرجعَ النبي صلى الله عليه وسلم فاتبعه سعد، فقال: يا رسولَ الله! بأبي أنتَ وأمي، ماسلَّمتَ تسليمةً إلا هيَ بأذني: ولقد رددتُ عليكَ ولم أسمِعك، أحببتُ أن أستكثرَ من سلامِكَ ومن البركة، ثمَّ دخلوا البيتَ، فقرب له زبيبـاً، فأكلَ نبي اللهِ صلى الله عليه وسلم، فلما فرغَ قال: أكلَ طعامَكم الأ برارُ، وصلَّت عليكم الملائكةُ، وأفطرَ عندكم الصائمون رواه في شرح السـنة۔

ہے کہ کسی عالم کا نقطۂ نظر یہ نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو جو سمجھ میں آیا آپ حضرات کے سامنے عرض کر دیا لیکن بہر حال یہ نہیں ہے کہ جو ہم نے کہا ہے یہ کوئی حرف آخر ہے البتہ ابھی تک ہمیں اسی پر شرح صدر ہے۔

عموم بلوی کی وجہ سے حکم میں تخفیف کب ہوگی:-

ایک اور اصول قابل تنقیح ہے اس لئے کہ اس مسئلے کے سلسلے میں آج کل اس کا بکثرت حوالہ دیا جاتا ہے وہ یہ کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ عموم بلویٰ کی وجہ سے حکم میں تخفیف پیدا ہو جاتی ہے اور تصویر میں بھی چونکہ عموم ابتلاء ہے اس لئے اس کے حکم میں بھی اس وجہ سے تخفیف ہونی چاہئے لیکن اس اصول کا بعض دفعہ غلط انطباق کر لیا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ یہ اصول واقعتاً فقہاء نے لکھا ہے کہ عموم بلوی کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوتی ہے اور یہ اصول قرآن و سنت سے بھی مستنبط ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم قرآن کریم کی ایک آیت سے مستنبط فرمایا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا گیا بلی کے جھوٹے کا اب عام قاعدے اور اصول کے لحاظ سے تو بلی کا جھوٹا ناپاک ہونا چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی جانور کے جھوٹے کا حکم اس کے لعاب والا ہوتا ہے کیوں کہ اس میں اس کا لعاب پڑتا ہے او لعاب کا حکم اس کے گوشت والا ہوتا ہے لہٰذا جس جانور کا گوشت حرام ہے اس کا لعاب بھی ناپاک ہوگا اور جس میں وہ ڈالا جائے وہ پانی بھی قابل استعمال نہیں رہے گا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کے جواب میں فرمایا کہ **إنها ليست بنجس** کہ یہ ناپاک نہیں ہے اور وجہ اس کی بیان فرمائی کہ **إنما هي من الطوافين عليكم والطوفات** کہ یہ تو طواف کرنے والیوں میں سے ہے اور طواف کرنے والوں میں سے ہے طواف سے مراد یہاں بکثرت آمد و رفت رکھنا کہ بلی کی گھر میں بکثرت آمد و رفت ہوتی ہے اور اس کے جھوٹے سے احتراز مشکل ہے اگر اس کو ناپاک قرار دے دیا جائے تو حرج اور تنگی لازم آئے گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے **انما هي من الطوافين عليكم والطوافات** فرما کر درحقیقت قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ آیت یہ ہے کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو استیذان کرو یہ شریعت کا حکم ہے اجازت لے کر گھر میں جاؤ اس لئے کہ پتہ نہیں کہ گھر میں کیا صورت حال ہوگی عورتیں ایسی حالت میں ہوں کہ ان کو دیکھنا مناسب نہ ہو اور یہ علت جس طرح بڑوں میں پائی جاتی ہے اسی طرح بچوں میں بھی ہے خاص طور ایسے بچوں میں جن کو تمیز ہوتی ہے اگرچہ وہ نابالغ ہی ہوتے ہیں کیوں کہ کسی عورت کو بے لباسی کی حالت میں بچے کا دیکھنا بھی درست نہیں ہے خاص طور پر صبی ممیز ہو۔ اس لئے اصل اصول کے لحاظ سے تو بچے کو بھی گھر میں آنے کے لئے استیذان کی ضرورت ہونی چاہئے اسی طرح غلام کو بھی ہونی چاہئے لیکن قرآن کریم نے یہ فرمایا

کہ بچے تین اوقات میں تو گھر میں آتے وقت اجازت طلب کریں **لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یلبغ الحلم منکم ثلث مرات** کہ تمہارے غلام اور بچے تین اوقات میں تو اجازت طلب کریں گے لیکن ان تین اوقات کے علاوہ غلاموں کو اور بچوں کو گھر میں آنے کے لئے استیذان کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی وجہ قرآن کریم نے خود بیان فرمادی **طوافون علیکم بعضکم علی بعض** کہ ان کا تمہارے ہاں بکثرت آنا جانا رہتا ہے تو اصول کے لحاظ سے اگرچہ استیذان ضروری ہونا چاہئے تھا لیکن چونکہ اس میں تنگی اور حرج ہے اس لئے استیذان کی ضرورت نہیں ہے تو یہاں استیذان کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرمادی عموم ابتلاء کی وجہ سے کہ یہ کام بکثرت کرنا پڑتا ہے اور یہی علت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لاگو کی بلی کے جھوٹے پر تو اس آیت اور حدیث سے یہ اصول سمجھ میں آیا کہ جہاں ابتلاء کسی چیز میں عام ہو وہاں حکم میں تخفیف پیدا ہو جاتی ہے عموماً فقہاء لکھتے ہیں کہ علت طواف کی وجہ سے بلی کے جھوٹے میں تخفیف پیدا ہو گئی تو علت طواف سے مراد یہی عموم بلوای ہے۔

اسی سے یہ بھی پتہ چلا کہ عموم بلوی بذات خود تخفیف حکم کا موجب نہیں ہے بلکہ یہ حکم میں تخفیف کا موجب ہے اس وجہ سے کہ تنگی پیش آتی ہے تو اصل مقصود تنگی سے بچانا ہے اور یہ بھی شریعت کا قاعدہ ہے کہ **الحرج مدفوع** اور قرآن کریم میں ہے: **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** تو اس سے پتہ چلا کہ عموم ابتلاء کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوتی ضرور ہے لیکن وہاں جہاں تنگی اور حرج لازم آرہا ہو یعنی جہاں کوئی ضرورت ہو بغیر ضرورت کے عموم ابتلاء کی وجہ سے حکم میں تخفیف پیدا نہیں ہوتی آج کل لوگ عموم ابتلاء والے اصول کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ سارے لوگ کرتے ہیں لہٰذا ہم بھی کرلیں کیا حرج کی بات ہے عام طور پر لوگ اس اصول کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام تو ہر کوئی کرتا ہے جب ہر کوئی کرتا ہے تو ہم بھی کرلیں تو کیا حرج کی بات ہے اور اس اصول کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی ناجائز کام سارے لوگ کرنے لگ جائیں یا اکثر لوگ کرنے لگ جائیں تو ویسے ہی جائز ہو جاتا ہے تو اس اصول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے بلکہ اس اصول کا تعلق دراصل نفی الحرج والے اصول کے ساتھ ہے لہٰذا جہاں عموم ابتلاء ایسا ہو کہ تنگی پیش آرہی یا کوئی ضرورت فوت ہو رہی ہو تو وہاں واقعتاً حکم میں تخفیف پیدا ہو جائے گی اور جہاں اصل حکم پر عمل کرنے میں کوئی تنگی پیش نہ آرہی ہو تو اگرچہ بکثرت لوگ وہ کام کر رہے ہوں تو بھی حکم میں تخفیف پیدا نہیں ہو گی۔

اب اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ تصویر کے معاملے میں یہ اصول کس حد تک جاری ہو گا بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تصویر میں ابتلاء عام ہو گیا ہے اور سارے لوگ بناتے اور بنواتے ہیں، گھروں میں لٹکاتے ہیں استعمال کرتے ہیں لہٰذا سب کے لئے علی الاطلاق جائز ہے تو یہ فقہاء

نیک صحبت نصیب ہو، اچھے لوگوں کے ساتھ تعلقات نصیب ہوں اور فرشتے تمہارے لئے دعائے رحمت کریں اور روزہ دار تمہارے ہاں روزہ افطار کریں اس میں بھی دو باتیں آگئیں ایک تو یہ کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بکثرت روزے رکھنے کی توفیق ہو دوسرا یہ کہ دوسرے روزہ داروں کو افطار کرانے کی توفیق ہو۔

(٨)-----وعن أبی سعید، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: مثَلُ المؤمنِ ومثَلُ الإیمانِ کمثَلِ الفرس فی آخیَّتِه یجولُ ثمّ یرجع إلی آخیَّتِه، وإنّ المؤمنَ یسهو ثمَّ یرجِعُ إلی الایمان، فأطعموا طعامکم الأتقیاء، وأولُوا معروفکم المؤمنینَ۔ (رواه البیهقی فی شعب الایمان وأبو نعیم فی الحلیة)

ترجمہ ...... حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کی مثال اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی طرح ہے جو اپنی کنڈی کے اندر بندھا ہوا ہو، وہ گھومتا ہے پھر اپنی کنڈی کی طرف لوٹ آتا ہے اور مؤمن بھی بھول جاتا ہے پھر ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے لہٰذا تم اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ اور اپنا حسن سلوک ایمان والوں کو عطا کرو۔

اس حدیث میں پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کی مثال سمجھائی ہے، مؤمن کی حالت ایک مثال سے سمجھائی ہے کہ جیسے زمین کے اندر کنڈی گاڑی ہوئی ہو اور گھوڑے کو رسی کے ساتھ باندھ کر وہ رسی اس میں باندھ دی جائے تو گھوڑا اس سے دور بھی چلا جائے گا کیونکہ رسی بالکل چھوٹی نہیں بلکہ کچھ لمبی ہے لیکن زیادہ دور نہیں جاسکتا، ایک خاص حد تک دور جائے گا۔ بس یوں ہی سمجھئے کہ مؤمن ایک گھوڑا ہے اور ایمان کنڈی ہے، مؤمن غلطی سے بداعمالیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ایمان کے تقاضوں سے دور نکل جاتا ہے لیکن ایک خاص حد تک جاتا ہے کہیں نہ کہیں جا کر وہ رک جاتا ہے اور ایمانی تقاضوں کی طرف واپس لوٹ آتا ہے اس پر تفریع کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں بیان فرمائیں:

(۱)..........ایک تو یہ کہ تم اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ۔

(۲)..........ایمان والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اس بات کا پچھلی بات سے ربط اور تعلق کیا ہے؟ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاء درمیان میں استعمال فرمایا ہے یعنی ان دو باتوں کو پچھلی بات پر مرتب فرمار ہے ہیں۔

جواب ...... دراصل پچھلی بات کا تعلق دوسرے حکم کے ساتھ ہے یعنی **أولوا معروفکم المؤمنین**۔ کہ ایمان والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اس لئے کہ کسی مؤمن کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو سکتا

ہے کہ اس کے اعمال تو اچھے نہیں لہٰذا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرنا چاہئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسن سلوک کیلئے اس کے دل میں ایمان ہونا کافی ہے، وہ مؤمن ہے تو وہ ایمان کے ساتھ بندھا ہوا ہے اگرچہ ایمان سے ذرا دور ہٹا ہوا ہے لیکن ایک خاص حد تک دور جائے گا اس سے زیادہ نہیں جائے گا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **أطعموا طعامكم الأتقياء** ۔ کہ اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ، یہی بات ایک اور حدیث میں ان لفظوں کے ساتھ آتی ہے کہ **لا يأكُلُ طعامَكم إلا تَقِيٌّ** ۔[1] کہ تمہارا کھانا متقی آدمی ہی کھائے۔ تو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کو کھلانا دو طرح سے ہوتا ہے:

(۱)...... کسی کو اس کی حاجت کی وجہ سے کھانا کھلانا۔

(۲)...... کسی کو اس سے تعلق اور محبت کی وجہ سے کھانا کھلانا۔

جیسے آپ کسی دوست کی دعوت کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے گھر میں کھاتا پیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ جو کھانا آپ اسے کھلا رہے ہیں گھر میں وہ اس سے اچھا ہی کھاتا ہو لیکن آپ کو چونکہ اس کے ساتھ تعلق ہے اور محبت ہے اس لئے آپ اس کی دعوت کرتے ہیں۔

حاجت کی وجہ سے جو کسی کو کھانا کھلانا ہے اس میں متقی اور غیر متقی کا کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ ہر حاجت مند کو کھلانا چاہئے بلکہ اگر حاجت مند کافر ہو تو اس کی مدد کرنا بھی کار ثواب ہے۔ یہاں بات اس کھانے کی ہو رہی ہے جو بطور محبت کے کھلایا جاتا ہے کہ بطور محبت کے کھانا صرف نیک اور متقی لوگوں کو کھلانا چاہئے کیونکہ اس سے ان کے ساتھ تعلق مزید بڑھے گا، اگر برے لوگوں کو اس طریقے سے کھانا کھلاؤ گے تو ان کے ساتھ تمہارا تعلق بڑھے گا تو اس کے برے اثرات بھی تم پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

(۹)------عن عبد الله بن بُسر، قال: كانَ للنبي صلى الله عليه وسلم قصعةٌ، يحملها أربعة رجال، يقال لها: الغرَّاءُ، فلمَّا أضحَوا وسجدو الضحى، أُتي بتلكَ القصعة وقد ثُرد فيها، فالتفوا عليها، فلمَّا كثروا، جثا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فقال أعرابي: ماهذه الجِلسَةُ؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: إنَّ اللهَ جعلني عبداً كريماً، ولم يجعلني جبَّاراً عنيداً ثمَّ قال: كلُوا من جوانبها، ودَعوا ذِروتها يُبارَكْ فيها۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا برتن تھا جسے چار آدمی اٹھاتے تھے، اسے غراء کہا جاتا تھا، جب چاشت

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج ۸ / ص ۲۰۸ ☆ ایضاً جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی صحبۃ المومن ج ۲ / ص ۶۵

ویڈیو کیسٹ اور ٹی وی کا حکم:-

اب ایک مسئلہ رہ گیا اور وہ ہے ویڈیو کا اور اسی کے ساتھ مسئلہ ہے ٹی وی کا یہاں دو مسئلے ہیں۔ایک مسئلہ ہے تصویر ہونے یا نہ ہونے کا اور دوسرا مسئلہ ہے جائز اور ناجائز کا یاد رکھیں یہ دونوں مسئلے الگ ہیں اس لئے کہ کوئی چیز تصویر نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جائز بھی ہو اصل مقصود یہاں ہمارا پہلا مسئلہ ہے کیوں کہ باب تصاویر کا چل رہا ہے۔

البتہ تکمیل بحث کیلئے بات تھوڑی سی دوسرے مسئلے پر بھی ہو جائے گی تو پہلا مسئلہ ہے کہ ٹی وی اور وی سی آر میں جو ہوتا ہے وہ تصویر ہے یا نہیں تو ٹی وی کے حکم سے پہلے ویڈیو کا حکم سمجھ لیجئے اور ویڈیو کے حکم سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ تصویر کیا ہوتی ہے اور کسے تصویر کہتے ہیں۔

تصویر کی حقیقت:-

اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ تصویر ناجائز ہے اور عکس جائز ہے تصویر اور عکس میں فرق یہ ہے کہ تصویر کا وجود کسی اور چیز کے تابع نہیں ہوتا کہ اگر وہ رہے تو یہ بھی رہے اور وہ ختم ہو جائے تو یہ بھی ختم ہو جائے جب کہ عکس اس چیز کا تابع ہوتا ہے جس کا وہ عکس ہوتا ہے۔یہ بات آگے چل کر لکھیں گے کہ عکس کیا ہوتا ہے اور کیسے بنتا ہے؟اور دوسری بات یہ بھی واضح ہے کہ تصویر تب بنے گی جب کہ اس کے اندر اعضاء موجود ہوں اور الگ الگ اور متمیز ہوں یعنی ایسے طور پر متمیز ہوں کہ ان کی طرف اشارہ حسیہ کر کے یہ بتایا جاسکے کہ یہ اس کی آنکھیں ہیں اور یہ ناک ہے، یہ ہونٹ ہیں، یہ رخسار ہے وغیرہ وغیرہ۔ وگرنہ آپ کے ذہن میں بھی بہت ساری تصویریں ہیں لیکن وہ شرعاً تصویریں نہیں ہیں تو تصویر بننے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو یہ کہ اس میں اعضاء متمیز ہوں الگ الگ بتایا جاسکے کہ یہ آنکھ ہے، یہ ناک ہے، یہ فلاں ہے، یہ فلاں ہے وغیرہ وغیرہ اور دوسرا یہ کہ وہ کسی کے تابع اور عکس کے قبیل سے نہ ہو یہ اصول مد نظر رکھنے کے بعد ویڈیو کیسٹ کی حقیقت سمجھ لینی چاہئے لیکن ویڈیو کیسٹ کی حقیقت سے پہلے آسانی کی خاطر آڈیو کیسٹ کی حقیقت سمجھ لیں۔

آڈیو کیسٹ کی حقیقت:-

یعنی وہ کیسٹ جس میں آواز بھری ہوتی ہے، آواز کی حقیقت یہ ہے کہ جب دو جسم آپس میں ٹکراتے ہیں چاہے وہ عام جسم ہو جیسے ہاتھ کے ساتھ ہاتھ ماریں یا کسی انسان یا حیوان کے اعضاء نطق ہوں کوئی سے

بھی دو جسم جب وہ آپس میں ٹکراتے ہیں تو وہاں پر موجود ہوا میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اور اس ارتعاش کی وجہ سے مخصوص قسم کی ہوا کی لہریں جن کو ہم صوتی لہریں کہتے ہیں وہ دور تک پھیل جاتی ہیں جیسا کہ پانی کے اندر آپ کوئی پتھر ماریں تو لہریں سی بن جاتی ہیں جتنا بڑا پتھر پھینکیں گے اتنی ہی زور دار لہریں ہوں گی اور دور تک جائیں گی یہی معاملہ آواز کا ہے دو جسم جتنی طاقت کے ساتھ ٹکرائیں گے اتنی ہی طاقت ور لہریں پیدا ہوں گی اور یہی لہریں انسان کے کان کے ساتھ جا کر ٹکراتی ہیں تو اس سے آواز سنائی دیتی ہے تو آواز درحقیقت ان لہروں کا نام ہے اگر یہ لہریں کمزور ہوں تو تھوڑے فاصلے تک جاتی ہیں اور آواز بھی تھوڑے فاصلے تک سنائی دیتی ہے اور یہی لہریں اگر طاقت ور ہوں تو دور تک جاتی ہیں اور آواز بھی دور تک سنائی دیتی ہے آواز کی یہ حقیقت قدیم علماء نے بھی بیان کی ہے اور جدید سائنس بھی آواز کی حقیقت یہی بیان کرتی ہے کہ آواز درحقیقت خاص قسم کی لہروں کا نام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ کان کے اس پردے میں یا کان کے مخصوص حصے میں ایسی تیز حس پیدا کر دی ہے کہ دو جسموں کے ٹکرانے کی نوعیت میں بھی فرق محسوس کر لیتی ہے زبان دانتوں کے نچلے حصے سے ٹکراتی ہے یا دانتوں کے اوپر والے حصے سے کان کے پردے کو پتہ چل جاتا ہے لہروں کے ذریعے اور وہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ فلاں حرف ہے تو بہت تیز ادراک اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھا ہے تو یہ آواز کی حقیقت ہے اس دور میں آواز کے بارے میں کئی مشقیں کی گئی ہیں ایک مشق تو یہ کی گئی کہ آلہ مکبر الصوت یعنی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ان صوتی لہروں کو طاقت ور بنا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے عام معمول کے انداز سے آدمی بولے تو اتنی دور اس کی آواز نہیں پہنچتی جتنی دور اس لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے جاتی ہے لیکن یہ لہریں تاروں کے ذریعے سے گزاری جاتی ہے کچھ تجربات ایسے بھی کئے ہیں کہ ان لہروں کو طاقت ور بنایا گیا اور طاقت ور بنا کر دور دور تک پھیلا دیا گیا اور دوسری طرف ایسا آلہ یا ٹرانسمیشن ایجاد کر لیا گیا جو دور دور تک پھیلی ہوئی ان صوتی لہروں کو جذب کر کے دوبارہ نمایاں کرنے کی قدرت رکھتا ہے پہلی چیز ریڈیو اسٹیشن کہلاتی ہے اور دوسری مشین ریڈیو یا ریڈیو سیٹ کہلاتی ہے، ریڈیو میں یہی ہوتا ہے ایک طرف تو بولنے والے کے منہ سے صوتی لہریں نکلیں ان لہروں کو طاقت ور بنا کر دور تک پھیلا دیا گیا اور دوسری طرف ریڈیو سیٹ کے اندر یہ طاقت رکھی گئی ویسے ہوا میں پھیلی ہوئی لہروں کا ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کیا کیا لہریں گھوم رہی ہیں لیکن یہ پہچان کر دوبارہ ہمیں سنا دیتا ہے۔

ایک مشق اور کی گئی صوتی لہروں پر وہ یہ کہ ایک مخصوص قسم کے فیتے پر یا مخصوص قسم کی ٹیپ پر اس کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی، آڈیو کیسٹ میں یہی ہوتا ہے کہ اس کو ٹیپ ریکارڈر کے اندر لگا کر مخصوص بٹن دبا کر چلا دیا جاتا ہے تو بولنے والے کے بولنے کی وجہ سے جو صوتی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور عام حالات میں ساتھ

ساتھ ہوا میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں وہ اس میں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ جب آپ اس ریل کو دوبارہ مشین میں ڈال کر چلائیں گے تو وہ لہریں اسی ترتیب سے دوبارہ نکلنی شروع ہو جائیں گی اور ہمیں ایسے لگے گا جیسے کوئی دوبارہ بول رہا ہے قدیم فقہاء کی کتابوں میں اس سے ملتی جلتی نظیر ملتی ہے صدائے بازگشت کہ پہاڑی علاقے میں یا کسی جگہ گونجنے والی جگہ میں جب آدمی زور سے بولے تو کسی جگہ پر وہ آواز ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ چنانچہ آڈیو کیسٹ کے بہت سارے احکام اس دور کے علماء نے صدائے بازگشت کے احکام سے مستنبط کیے ہیں تو یہ حقیقت آڈیو کیسٹ کی ہے، آڈیو کیسٹ میں الفاظ اور آوازیں بھری ہوئی تو ہوتی ہیں لیکن باقاعدہ حروف کو دیکھ کر متمیز کر دیں ایسا نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر ایک ریل میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھری ہوئی ہے تو آپ کوئی حساس سے حساس خوردبین لگا کر یہ تعیین نہیں کر سکتے کہ یہ اس میں "ب" ہے یہ "س" ہے یہ "م" ہے۔

وڈیو کی حقیقت:-

اب آیئے اصل چیز کی طرف یعنی وڈیو کیسٹ کی طرف آڈیو کیسٹ کھیل تھا مسموعات کا اور وڈیو کیسٹ کھیل ہے مبصرات کا یعنی دیکھی جانے والی چیزوں کا تو اس میں جہاں پہلے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ ہمیں آواز سنائی کیسے دیتی ہے اسی طرح یہاں پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ہمیں کوئی چیز دکھائی کیسے دیتی ہے تو ہوتا یوں ہے کہ جس چیز کو ہم دیکھتے ہیں اس پر اگر روشنی پڑ رہی ہو وہ اندھیرے میں نہ ہو تو اس سے مخصوص قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں اور وہ ہر وقت نکل کر پھیلتی رہتی ہیں اور وہی شعاعیں اس سے نکل کر ہماری آنکھ کے ساتھ آکر ٹکراتی ہیں اور اس سے ہمارا دماغ اس چیز کا ادراک کر لیتا ہے کہ یہ چیز ہے اور اتنی لمبی اور اتنی چوڑی ہے یہ اس کا رنگ ہے وغیرہ اس عمل کو دیکھنے کا عمل کہا جاتا ہے تو دیکھنے اور سننے کے عمل میں بہت حد تک مماثلت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سننے کے عمل میں صوتی لہریں مسموع سے نکل کر آتی ہیں اور ہمارے کان سے ٹکراتی ہیں اور یہاں دیکھنے میں مرئی سے شعاعیں خاص قسم کی جن کو ہم بصری شعاعیں کہہ سکتے ہیں یہ شعاعیں نکل کر آتی ہیں اور کان سے ٹکرانے کی بجائے ہماری آنکھ سے ٹکرائیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے ان بصری شعاعوں پر بھی اس دور میں بہت سارے تجربات کیے گئے اور بہت ساری ایجادات کی گئیں۔

عکس کی حقیقت:-

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیجئے کہ عکس کیا ہوتا ہے وہ بھی اسی سے سمجھ میں آجائے گا جو چیز بھی نظر آنے کے قابل ہو اس پر روشنی ہو تو اس سے یہ شعاعیں ہر وقت نکلتی رہتی ہیں لیکن یہ نکل کر کبھی

کسی دیوار کے ساتھ جا کر ٹکرائیں گی کبھی کسی درخت کے ساتھ جا کر ٹکرا گئیں کبھی چھت کے ساتھ جا کر ٹکرائیں گی جدھر وہ شعاعیں جاتی ہیں آگے جو جسم آتا ہے اس کے ساتھ جا کر وہ ٹکرا جاتی ہیں کبھی آنکھ کے ساتھ آکر ٹکرا جاتی ہیں اگر آنکھ سے ٹکرائیں تو وہ چیز ہمیں نظر آجاتی ہے لیکن عام چیزوں سے یہی شعاعیں جا کر ٹکراتی ہیں اور یہ محض فلسفہ نہیں ہے بلکہ مسلمات ہیں۔ تو وہ اجسام ان شعاعوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں لیکن کچھ اجسام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ایسے اجسام کو شفاف اجسام یا کچھ اور نام دے دیں جیسا کہ آئینہ ہے یا پانی ہے یا کوئی چمک دار دھات ہے تو ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کے اجسام کے ساتھ مثلاً آئینے کے ساتھ جب وہی شعاعیں جا کر ٹکراتی ہیں تو ٹکرا کر واپس آجاتی ہیں اور شعاعوں کی وجہ سے نظر آتا تھا تو ادھر سے شعاعیں آکر اگر کسی آنکھ کے ساتھ لگیں تو اس کو وہی چیز آئینے کے اندر نظر آئے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام حالات میں جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ شعاعیں سیدھی ہماری آنکھ میں آتی ہیں اور آئینے کے اندر سے جب ہم دیکھتے ہیں تو جس کو ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں اس کی شعاعیں پہلے آئینے کی طرف جاتی ہیں لیکن آئینہ چونکہ جذب نہیں کرتا اس لئے وہ واپس آجاتی ہیں ہم بھی چونکہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اس لئے وہی شعاعیں ہماری آنکھوں کے ساتھ ٹکراتی ہیں تو سیدھی آنے کے بجائے چکر کاٹ کر آتی ہیں لیکن ہیں وہ شعاعیں ہی جب تک آئینے پر وہ شعاعیں پڑتی رہیں گی یعنی جس کو ہم آئینے کے اندر دیکھ رہے ہیں جب تک وہ آئینے کے سامنے رہے گا اس وقت تک ہمیں اس کی شکل آئینے میں نظر آئے گی اور جب وہ آئینے سے ہٹ جائے تو چونکہ اس کی شعاعیں آئینے پر آنی بند ہو گئی ہیں اس لئے وہ ہمیں نظر آنا بھی بند ہو جائے گا اور اگر وہ آدمی وہاں سے ہٹا تو نہیں لیکن جہاں پر آدمی کھڑا تھا وہاں تاریکی ہو گئی تب بھی آئینے کے اندر وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا کیونکہ اب وہ ہے تو آئینے کے سامنے لیکن اس کی شعاعیں آئینے کی طرف نہیں جا رہی اور آئینے سے ہو کر ہماری طرف بھی نہیں آرہیں اس لئے ہمیں اس کا عکس بھی نظر نہیں آرہا اور آئینے میں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عام حالت میں ہمارے جسم سے نکلنے والی شعاعیں خود ہماری آنکھوں سے آکر ٹکرائیں یہ مشکل ہوتا ہے یعنی ساری شعاعیں ہماری آنکھوں سے آکر نہیں ٹکراتیں ہاتھ آنکھ کے سامنے کر لیں گے تو ہاتھوں سے نکلنے والی شعاعیں ہماری آنکھوں سے ٹکرائیں گی لیکن ہماری ناک ہمارا رخسار ہماری آنکھیں ہمارا ماتھا ان سے نکلنے والی جو شعاعیں ہیں وہ دوسرے کی آنکھ کے ساتھ تو جا کر ٹکراتی ہیں لیکن سیدھی ہماری آنکھ کے ساتھ نہیں ٹکراتیں اس لئے ہمیں اپنا آپ نظر نہیں آتا لیکن جب آئینے کے سامنے ہم جاتے ہیں تو یہی ہمارے چہرے سے نکلنے والی شعاعیں آئینے کے ساتھ جا کر ٹکراتی ہیں اور ٹکرا کر جب واپس آتی ہیں تو وہ ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہیں تو ہمیں اپنا آپ نظر آنے لگ

جاتا ہے تو عکس کی حقیقت یہ ہوئی کہ عکس وہ ہے کہ جب تک پیچھے سے شعاعیں آتی رہیں اس وقت تک اس کا نقش نظر آتا رہے اور جب شعاعیں آنا بند ہو جائیں تو نقش نظر آنا بند ہو جائے یہ عکس کی حقیقت ہے۔

اب یہ جو شعاعیں ہیں ان کے بارے میں عرض کر رہا تھا کہ کئی مشقیں کی گئیں مثلاً ایک مشق تو یہ کی گئی کہ عام حالات میں یہ شعاعیں فضا میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں جس وقت نکل رہی ہوتی ہیں اسی وقت تو آپ دیکھ سکتے ہیں لیکن آگے پیچھے آپ نہیں دیکھ سکتے یہاں میں بیٹھا ہوں جب تک میں بیٹھا ہوں اس وقت تک آپ مجھے دیکھیں گے میں اٹھ کر چلا جاؤں تو آپ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے اس لئے کہ وہ جو بصری شعاعیں میرے جسم سے نکل رہی تھیں اب وہ اس قابل نہیں رہیں کہ آپ کی آنکھوں کو ادراک مہیا کریں لیکن جدید مشینوں کے ذریعے ایک تو یہ کام کیا گیا کہ ان شعاعوں کو طاقت ور بنا دیا گیا جیسا کہ ریڈیو کے اندر صوتی لہروں کو طاقت ور بنا دیا گیا اور دور دور تک پھیلا دیا گیا اور دوسری طرف ایسا آلہ ایجاد کیا گیا جو دور تک پھیلی ہوئی ان شعاعوں کو جو عام حالات میں ہمیں محسوس نہیں ہوتیں وہ خاص سکرین پر آجائیں تو جو کچھ ریڈیو میں ہوتا ہے وہی کچھ ٹی وی میں ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہوتا ہے آواز کے ساتھ یعنی صوتی لہروں کے ساتھ اور یہ ہوتا ہے بصری شعاعوں کے ساتھ پھر جیسے وہاں صوتی لہروں کو محفوظ کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس وقت وہ لہریں نکل رہی تھیں صرف اسی وقت آپ نہیں سن سکتے بلکہ بعد میں بھی سن سکتے ہیں اسی طرح ان بصری شعاعوں کو بھی ویڈیو کیسٹ کے اندر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جب اس کو خاص مشین میں رکھ کر دوبارہ چلایا جاتا ہے تو وہی شعاعیں اسی طریقے سے دوبارہ سکرین پر آنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہی منظر ہمیں دوبارہ نظر آتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض انبیاء کو دیکھنا:-

یہاں ضمناً ایک اور بات سمجھ لیجئے اور بڑے مزے کی بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر بھی انبیاء کو دیکھا اس کے علاوہ ایک دفعہ آپ مکہ مکرمہ کی طرف جا رہے تھے راستے میں ایک وادی آئی آپ نے پوچھا کون سی وادی ہے تو بتلایا گیا کہ فلاں وادی ہے فرمایا کہ میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سرخ رنگ کی اونٹنی پر ہیں اور ان کی اونٹنی کی مہار کھجور کے چھلکے کی بنی ہوئی ہے اور وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں اور کسی اور جگہ فرمایا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کہ دبلے پتلے آدمی ہیں ور تلبیہ پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں فلاں نبی کو یوں دیکھ رہا ہوں، فلاں نبی کو یوں دیکھ رہا ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نبی تلبیہ پڑھتے ہوئے آئے تھے لیکن صدیوں پہلے تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیسے دیکھ لیا تو اس کے جواب میں محدثین نے بہت ساری توجیہات کی ہیں لیکن آج کل اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل

نہیں رہا کیوں کہ پتہ چلا کہ بصارت نام ہے شعاعوں کے آنکھوں کے ساتھ ٹکرانے کا شعاعیں نکلتی ہیں فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں اب اگر انسان ان شعاعوں کو محفوظ کر سکتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ محفوظ نہیں کر سکتے؟ اور اگر انسان ان شعاعوں کو سالہا سال بعد بھی دیکھ سکتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو نہیں دکھا سکتے تو حدیث میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے تو صحیح یہ ہے کہ وہی منظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ہے جو صدیوں پہلے پیش آیا تھا، باقی کیسے یہ اللہ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نہ آلات کے محتاج نہ کسی اور چیز کے محتاج تو خیر بات کر رہے تھے کہ ویڈیو کے اندر ان بصری شعاعوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور اسی ترتیب سے دوبارہ نکل کر سکرین پر آ جاتی ہیں اور اس سے ہمیں وہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

ویڈیو کیسٹ تصویر کے حکم میں ہے یا نہیں:۔

اب آیئے اصل مسئلے کی طرف کہ یہ تصویر ہے یا نہیں تو یہاں دو چیزوں پر ہمیں الگ الگ غور کرنا ہے ایک تو ویڈیو کیسٹ ہے اور دوسرا اس کو چلانے کے بعد جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے تو جہاں تک تعلق ہے ویڈیو کیسٹ کا تو وہ بظاہر تصویر معلوم نہیں ہوتی اگرچہ کسی عالم کا نقطۂ نظر کچھ اور بھی ہو سکتا ہے لیکن جو ہمیں راجح معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ تصویر نہیں ہے اس لئے کہ تصویر کے لئے چاہے کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو لیکن اتنا تو ہونا چاہئے کہ کسی خوردبین ہی کے ذریعے کم از کم بتا سکے کہ یہ فلاں کی آنکھ ہے یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں چیز ہے جب کہ ویڈیو کیسٹ کے اندر ایسا نہیں ہوتا اس میں صرف شعاعیں ہیں جیسا کہ آڈیو کیسٹ کے اندر حروف نہیں ہوتے صرف لہریں ہوتی ہیں اور آپ کوئی حساس ترین خوردبین لے لیں جو کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑا کر کے دکھاتی ہے اس میں اس ریل کا تھوڑا سا حصہ لگا کر دیکھیں تو آپ کو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا یہ آنکھ ہے، یہ ناک ہے، یہ فلاں ہے، یہ فلاں ہے کچھ بھی نظر نہیں آئے گا تو چونکہ اس میں اعضاء متمیز نہیں ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں شعاعوں کے علاوہ کوئی چیز اس میں سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے اس کو تو تصویر کہنا مشکل ہے۔

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ جب ہم اس کیسٹ کو چلاتے ہیں اس میں بھرے ہوئے منظر ترتیب وار سکرین پر آتے ہیں تو اس میں اعضاء متمیز ہوتے ہیں اس میں آپ اشارہ کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ اس کی آنکھ ہے، یہ ناک ہے، یہ کان ہے، یہ فلاں ہے، یہ فلاں ہے اس لئے اعضاء متمیز ہونے والی شرط تو اس کے اندر پائی جاتی ہے لیکن تصویر بننے کے لئے محض اعضاء کا متمیز ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عکس کے قبیل سے نہ ہو جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا تھا اس لئے کہ جب آئینے میں ہم اپنی شکل دیکھتے ہیں تو اعضاء تو اس میں بھی متمیز ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ عکس ہے یا نہیں اگر یہ عکس ہے تو پھر تصویر نہیں ہے تو غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عکس کے زیادہ مشابہ ہے اس لئے کہ عکس میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک آئینے وغیرہ پر شعاعیں آتی رہیں شعاعوں کی آمد جاری رہے اس وقت تک ہمیں وہ منظر نظر آئے گا اور جب شعاعوں کا آنا بند ہو جائے تو منظر بھی بند ہو جائے گا، محض سامنے ہونے والی بات نہیں ہے اس لئے کہ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ آدمی سامنے بھی ہو لیکن وہ اندھیرے میں ہو جائے تو بھی آئینے میں نظر نہیں آئے گا اس لئے کہ شعاعیں نہیں پڑ رہیں تو اصل عکس کے اندر سامنے ہونا نہیں ہے سامنے ہونا تو ایک شرط ہے کیوں کہ شعاعیں سیدھی جاتی ہیں اصل چیز شعاعوں کا آنا ہے جب تک شعاعیں آتی رہیں گی اس وقت تک وہ ہمیں نظر آتا رہے گا اور ویڈیو میں بھی یہی بات ہے کہ جب تک وہ کیسٹ چل رہی ہے اس وقت تک اس میں سے شعاعیں نکل نکل کر سکرین پر پڑ رہی ہیں اور ہمیں وہ منظر نظر آ رہا ہے لیکن جوں ہی آپ اس کیسٹ کو چلنے سے روک دیں گے چاہے ویسے ہی بند کر دیں یا کچھ دیر کے لئے Pause کا بٹن دبا دیں وہ کیسٹ چلنا بند ہو گئی کیسٹ چلنا بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سے شعاعیں نکلنا بند ہو گئیں جونہی شعاعیں نکلنا بند ہوں گی سکرین بالکل خالی ہو جائے گی یہ نہیں کہ آڈیو کیسٹ کے اندر کسی کی بسم اللہ الرحمان الرحیم کی آواز بھری ہوئی ہے اور اس نے "بس" ابھی کہا تھا کہ آپ نے کیسٹ بند کر دی تو "بس" س س س یہ آواز آتی رہے گی بلکہ آواز بالکل بند ہو جائے گی یا م م م م یہ آواز آتی رہے گی بلکہ بالکل بند ہو جائے گی اسی طرح جب یہاں پر وہ کیسٹ بند ہو گی تو اس کے بند ہونے کے بعد یہ نہیں کہ جو منظر آخر میں تھا وہ سکرین پر ٹک جائے گا بلکہ بالکل ہی ختم ہو جائے گا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی منظر دیر تک سکرین پر نظر آ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی منظر کی شعاعیں مسلسل آ رہی ہیں اس کو یہ نہیں کہتے کہ یہ تصویر پائیدار ہو گئی ہے جیسے کہ ایک آدمی آئینے کے سامنے بت بن کر کھڑا ہو جائے گھنٹے تک کھڑا رہے تو گھنٹے تک آئینے میں بالکل ایک منظر ٹکا رہے گا تو یہ نہیں کہیں گے کہ آئینے میں یہ تصویر مستقل ہو گئی ہے یہ استقلال نہیں ہے استقلال یہ ہوتا ہے کہ اس سے شعاعیں نکل کر اس پر پڑ رہی تھیں وہ بند ہو جاتیں تو بھی اس میں وہ بت نظر آتا حالانکہ ایسا نہیں ہوتا یہی صورت حال سکرین پر نظر آنے والی تصویر کے اندر ہے کہ یہ خالصتاً کیسٹ سے نکلنے والی شعاعوں کے رحم و کرم پر ہے اس لئے اس کی زیادہ مشابہت کسی کاغذ وغیرہ پر بنی ہوئی تصویر کے ساتھ نہیں ہے بلکہ زیادہ مشابہت اس کی آئینے میں نظر آنے والے عکس کے ساتھ ہے اس لئے اس کو بھی تصویر قرار دینا مشکل ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ ویڈیو کیسٹ میں جو کچھ بھرا ہوا ہے وہ تصویر نہیں ہے اس لئے کہ اس میں اعضاء متمیز نہیں اور اس کو چلا کر سکرین پر جو کچھ آ رہا ہے وہ تصویر نہیں اس لئے کہ وہ شعاعوں کے ماتحت ہے بلکہ ہے ہی وہ شعاعیں جو اس میں سے نکل کر اس پر پڑ رہی ہیں لہٰذا اس کو

دیکھنا تصویر کو دیکھنا نہیں کہلائے گا بظاہر یہ نقطۂ نظر اس وجہ سے جو میں نے ذکر کی ہے راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ کیسٹ تصویر ہے نہ ہی سکرین پر نظر آنے والا منظر تصویر ہے[1] لیکن بہر حال جیسا کہ میں شروع میں عرض کیا یہ مسئلے چونکہ پیدا ہی اس دور میں ہوئے ہیں کوئی منصوص تو ہیں نہیں اس لئے اپنا شرح صدر جس رائے پر بھی ہو دوسری رائے کے لئے بھی گنجائش ذہن میں ضرور رکھنی چاہئے اس لئے ہم یہ نہیں کہتے کہ اگر کسی کی یہ رائے ہے کہ یہ تصویر ہے تو وہ سوفی صد غلط ہے بلکہ اجتہادی مسائل کی طرح ہے کہ ہمیں جس رائے پر شرح صدر ہے اس کے راجح ہونے کا ظن غالب ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ دوسری صحیح ہو اور اسی طرح ان کو بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ ہمارا شرح صدر اس بات پر ہے کہ یہ تصویر ہے لیکن جو اس کو تصویر قرار نہیں دیتے ان کے رائے کے بھی صحیح ہونے کا امکان اور احتمال ہے۔

آج کل بعض بڑے اچھے اچھے لوگ اس طرح کی چیزوں کو حرام قطعی اور بالاجماع حرام اور اس طرح کے فتوے لگادیتے ہیں تو یہ تجاوز عن الحدود ہے اول تو اس کا تصویر ہونا ہی مشکوک ہے اور جیسا کہ میں

---

(۱) سی ڈی (CD) کمپیوٹر کی یادداشت (Memory) کی ایک شکل ہے۔ کمپیوٹر کی یادداشت کی جتنی بھی شکلیں ہیں مثلاً عارضی یادداشت، ہارڈ ڈسک، فلاپی، ڈی وی ڈی وغیرہ سب کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے۔ احقر کی نظر میں ان کا حکم بھی وہی ہے جو وڈیو کا منسلکہ تحریر میں بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ میموری میں جو کچھ محفوظ ہے وہ موجودہ حالت میں قابل رویت اور قابل اشارہ حسیہ نہیں بلکہ وہ Bytes کی خاص ریاضیاتی تشکیلیں ہیں جو کمپیوٹر کے خاص نظام میں آکر تو قابل رویت بن سکتے ہیں موجودہ حالات میں نہیں۔ کمپیوٹر میموری کی قریب ترین نظیر اگر ہو سکتی ہے تو وہ انسانی یا حیوانی دماغ ہے جس طرح اس میں شکل، رنگ، آواز، نص (Text) اور مخصوص احکامات کو محفوظ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس لئے سی ڈی وغیرہ میں جو تصویر محفوظ ہے وہ اس تصور کے شاید مشابہ ہو جو ہمارے دماغ میں محفوظ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں نہ خود اس انسان کیلئے قابل رویت ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کے لئے، اگر کسی کو ذرا گردن جھکانے سے "تصویر یار" نظر آتی ہے تو وہ آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہوتا۔

اب رہا دوسرا مرحلہ کہ اس میموری کو ایک نظام میں لاکر کسی Output Device کے ذریعے دیکھے جانے کے قابل بنالیا جائے تو اس کے حکم کا انحصار اس Device کی نوعیت پر ہے، اگر وہ Device پرنٹر ہے اور اس کے ذریعے اس تصویر کا کاغذ پر پرنٹ لے لیا جاتا ہے تو وہ عکس نہیں ہوگا بلکہ تصویر ہوگا اور اگر وہ Device مانیٹر وغیرہ ہے تو بظاہر یہ عکس کے زیادہ مشابہ ہے لیکن سکرین پر اس کا وجود مستقل نہیں ہے بلکہ جونہی مانیٹر آف کر دیا جائے، ڈیٹا کیبل کو الگ کر دیا جائے یا خود اس پروگرام کو بند کر دیا جائے جس میں یہ تصویر تھی تو مانیٹر وغیرہ کی سکرین پر کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔

یہ ساری گفتگو تو جاندار کی تصویر والی سی ڈی یا کسی اور میموری کو اپنے پاس رکھنے کے بارے میں ہے کہ اس معاملے میں یہ تصویر کے حکم میں نہیں الا یہ کہ اس کا پرنٹ نکال لیا جائے۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے تو اگر وہ تصویر کیمرے کے ذریعے حاصل کر کے محفوظ کی جاتی ہے اس میں وہی گفتگو ہوگی جو منسلکہ تحریر میں عام کیمرے کی تصویر کے بارے میں ہے اور اگر کمپیوٹر گرافکس کا کوئی پروگرام استعمال کرتے ہوئے کی بورڈ، ماؤس، ٹیبلٹ اور خاص قسم کے پین سے بنائی جاتی ہے تو یہ یقیناً ایک تصویر سازی کا عمل ہی کہلائے گا۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ محمد زاہد

نے عرض کیا کہ جو اس کو تصویر قرار نہیں دیتے ان کے نقطۂ نظر میں خاصا وزن ہے تصویر ہونا ہی اس کا مشکوک ہے اور اگر تصویر ہو بھی سہی تو زیادہ سے زیادہ غیر سایہ دار تصویر کے حکم میں ہو گی اور غیر سایہ دار تصویر کا مختلف فیہ ہونا عصر صحابہ سے چلا آ رہا ہے تو ایسی چیز پر آپ فتویٰ تو اپنے شرح صدر کے مطابق دیں لیکن اپنی رائے کو قطعی یا اجماعی قرار دینا یہ ٹھیک نہیں ہے اور اس سے بڑا غلو یہ ہوتا ہے کہ دوسری رائے والوں پر طعن و تشنیع ہوتا ہے یہ تو بس جی ہر چیز کو جائز کہہ دیتے ہیں اور یہ تو ماڈرن دنیا سے متأثر ہو جاتے ہیں ڈھیلے ہیں تصلب نہیں ہے ایمان کمزور ہے وغیرہ وغیرہ یہ بہت بڑی زیادتی کی بات ہے علم کو علم کے انداز دیکھنا چاہئے اور اہل علم کی جو رائے ہے اس سے اتفاق یا اختلاف ہو بہر حال اس کا احترام ضرور کرنا چاہئے۔

اب تک جو گفتگو ہو چکی ہے اس کا حاصل یہ نکلا کہ ویڈیو کیسٹ میں جو کچھ بھرا ہوا ہوتا ہے وہ بھی تصویر نہیں اور اس کو چلاتے وقت جو کچھ سکرین پر آتا ہے وہ بھی تصویر نہیں۔

ٹی وی (T V) کا حکم:-

اب رہ گیا ٹی وی کا حکم وہ تصویر ہے یا نہیں تو بظاہر اسے بھی تصویر کہنا مشکل ہے اس لئے کہ ٹی وی کے پروگرام عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو براہ راست پروگرام ہوتے ہیں یعنی لائیو براڈ کاسٹ ہوتی ہے اور دوسرے وہ پروگرام ہوتے ہیں جن کو ویڈیو کیمرے کے ذریعے پہلے محفوظ کیا جاتا ہے پھر اسے دکھایا جاتا ہے پہلی قسم کے پروگرام تو یقیناً عکس ہیں اس لئے کہ ساتھ ساتھ ادھر وہ کام ہو رہا ہوتا ہے یا کوئی مقرر بول رہا ہے اور ساتھ ساتھ ہی اس کی تصویر دور دور تک پہنچ رہی ہے اگر وہ کیمرے کے سامنے سے ہٹ جائے تو اس کی تصویر بھی ہٹ جائے گی اور جو دوسری قسم کے پروگرام ہیں ان کا حکم ظاہر ہے ویڈیو والا ہو گا اور ویڈیو کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ تصویر نہیں۔

البتہ ایک تیسری صورت ہو سکتی ہے لیکن وہ آج کل عموماً استعمال نہیں ہوتی لیکن اگر ہو تو وہ تصویر ہو گی اور وہ یہ ہے کہ فلم ہو ویڈیو کی بجائے پرانے زمانے کی جس طرح فلم ہوتی تھی کہ ایک لمبی سی ریل سی ہوتی تھی اس پر چھوٹی چھوٹی تصویریں ہوتی ہیں اور اسی کو چلایا جاتا ہے تو ایک تسلسل کے ساتھ وہ تصویریں بڑی ہو کر سامنے آ جاتی ہیں اور وہ چونکہ چل رہی ہوتی ہے ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر اور دوسری کے بعد تیسری اور تسلسل کے ساتھ چل رہی ہوتی ہیں اس لئے سکرین پر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آدمی حرکت کر رہا ہے وہ اگرچہ بہت چھوٹی ہوتی ہے لیکن ہوتی وہ تصویر ہے اس کو جب بڑا کیا جائے یا کسی خوردبین وغیرہ کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ تصویر واضح طور پر نظر آئے گی اور اس میں اعضاء کو الگ الگ طور پر متمیز کیا جا سکتا ہے وہ تصویر ہے

اگرچہ اصل کے اعتبار سے وہ چھوٹی ہے لیکن سکرین پر دکھاتے وقت اس کو بڑا کر لیا جاتا ہے وہ تصویر کے حکم میں ہے لیکن وہ آج کل مروج نہیں ہے، خاص طور سے ٹی وی پر پروگرام اس کی بنیاد پر نہیں آتے۔

ویڈیو اور ٹی وی دیکھنے کا حکم:-

اب تک جو بات ہم نے کہی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تصویر نہیں ہے لیکن جو چیز تصویر نہ ہو وہ جائز بھی ہو یہ شروع میں ہم نے عرض کیا تھا کہ ضروری نہیں۔

اس لئے اب دیکھنے کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ ویڈیو اور ٹی وی جائز ہے یا نہیں تو چونکہ یہ تصویر نہیں ہے اس لئے اپنی ذات کے اعتبار سے تو یہ مباح ہے لہٰذا جس کام یا جس منظر کو ویسے دیکھنا جائز ہے اس کو ان آلات میں بھی دیکھنا جائز ہوگا اور جس منظر کو ویسے دیکھنا ناجائز ہے ان کو ان آلات میں دیکھنا بھی ناجائز ہوگا جو کام ویسے جائز ہے جیسے شادی بیاہ کی تقریبات ان کا ویڈیو کیسٹ میں بھرنا بھی جائز ہوگا اور جو کام ویسے ہی ناجائز ہیں تو ان کا ان میں بھرنا بھی ناجائز ہوگا جیسا کہ ناچ گانے کی یا اس طرح کی کوئی تقریب یا بے حجابی والی تقریب جس میں حجاب کا لحاظ نہیں ہے بلکہ عریانی اور فحاشی ہے تو اس طرح کی چیزوں کو ویسے دیکھنا ناجائز تو اس میں دیکھنا بھی ناجائز اور جیسے کرنا ناجائز ویسے ان میں بھرنا بھی ناجائز ہوگا۔

اپنی ذات کے اعتبار سے تو یہ مباح ہے لیکن کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک کام فی نفسہ تو مباح ہوتا ہے لیکن وہ بعض مفاسد پر مشتمل یا بعض مفاسد کو مستلزم ہوتا ہے یعنی وہ جائز کام کرنے کے بعد یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ اس پر کوئی مفسدۃ مرتب ہو جائے گا یا عام طور پر اس جائز کام کے کرنے سے ناجائز کام میں ابتلاء ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ فی نفسہ مباح کام بھی ناجائز ہو جاتا ہے اس کو فقہاء کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ **سَدًّا للذریعہ** ناجائز ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں با جماعت نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتی تھیں اور آخر وقت تک آتی رہی ہیں تو پتہ چلا کہ یہ کام فی نفسہ مباح ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر تک منع نہیں کیا اور ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد کسی حکم کا نسخ ممکن ہی نہیں ہے اس لئے فی نفسہ تو یہ مباح ہے لیکن خود وہ صحابہ کرام جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں نمازیں پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا کرتی تھیں انہیں میں سے متعدد حضرات نے بعد میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع کر دیا مثلاً صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ **لو أدرك النبی صلی اللہ علیہ وسلم ماأحدث النساء بعدہ لمنعن المساجد**

كما منعت فساء بني أسرائيل ۔ کہ عورتوں کے جو حالات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں پیدا ہوئے ہیں اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی وہ حالات ہوتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع کر دیا جاتا جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا تو دیکھئے کہ حضرت عائشہؓ جانتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں مسجدوں میں جایا کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود منع بھی کر رہی ہیں، منع اس لئے کر رہی ہیں کہ اب عورتوں کا مسجدوں میں جانا بعض مفاسد کا باعث بن سکتا ہے اور یہ مفاسد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ تو اس سے پتہ چلا کہ بعض کام فی نفسہٖ مباح اور جائز ہوتے ہیں لیکن سد أللذ ریعہ ان سے منع کر دیا جاتا ہے تو سد ذریعہ بھی شریعت کا ایک اصول ہے، ہمارے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ جو چیزیں ہیں ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ تو ان کا گھر میں رکھنا سد أللذ ریعہ ممنوع ہے فی نفسہٖ اگرچہ یہ تصویر میں داخل نہیں اور مباح ہیں ان کو دیکھنا بھی جائز ہے لیکن اگر ان چیزوں کو اپنے گھر میں لائیں گے تو بہت سارے مفاسد مرتب ہو سکتے ہیں مثلاً ایک تو یہ ہے کہ ٹی وی میں بہت سارے پروگرام ایسے ہوتے ہیں جو خلاف شریعت ہوتے ہیں اور ان کو ویسے دیکھنا بھی جائز نہیں ہوتا تو ٹی وی پر دیکھنا بھی ناجائز ہوگا اور ایسے پروگرام کافی ہوتے ہیں اب اگر سربراہ خاندان جو گھر میں ٹی وی لایا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت یہ ہو کہ میں صرف جائز پروگرام ہی دیکھوں گا مثلاً خبر نامہ دیکھ لیا یا بعض معلوماتی پروگرام اور ہوتے ہیں وہ دیکھ لئے اس طرح کی دوسری چیزیں دیکھ لوں گا، فحش قسم کے پروگرام نہیں دیکھوں گا لیکن ظاہر ہے کہ وہ سارے اہل خانہ پر تو کنٹرول نہیں کر سکتا گھر کے باقی افراد خاص طور پر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ظاہر ہے جو دلچسپی غلط پروگراموں میں ہو سکتی ہے وہ سنجیدہ پروگراموں میں شاید نہیں ہو گی تو ان کے غلط چیزوں میں مبتلاء ہونے کا خطرہ موجود ہے اس لئے گھر میں اس کا یہ ٹی وی لانا اس مفسدہ کا باعث بن سکتا ہے۔ یہی حال ویڈیو کا ہے کہ اگرچہ تصویر نہیں لیکن اس کے استعمال کے لئے عام حالات کے اندر ٹی وی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اسی کی سکرین پر اسے دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا جب وہ گھر میں آئے گا تو لازمی طور پر ٹی وی بھی گھر میں آئے گا اور پھر جب وہ گھر میں آ گیا تو بازار سے ہر قسم کی ویڈیو کیسٹ دستیاب ہیں اچھی بھی مل جاتی ہیں بری بھی مل جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بری زیادہ ملتی ہیں اور انسان کا رجحان بھی ان کی طرف زیادہ ہوتا ہے تو جب یہ چیز گھر میں آئے گی تو یہ دنیا بھر کی غلاظت اور گندگی اس کے ساتھ گھر میں آ جائے گی، یہ ایک ایسا نالہ ہے جس کے ذریعہ گندہ پانی اس کے گھر کے اندر بھر جائے گا۔ اس لئے ان مفاسد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہمارے اکثر بلکہ تقریباً سب علماء کرام کم از کم سد أللذ ریعہ اسے ممنوع قرار دیتے ہیں، بعض حضرات تو ویسے ہی اسے تصویر میں داخل کرتے ہیں ان کے نزدیک اس کا ممنوع ہونا واضح ہی ہے اور جو

تصویر میں داخل نہیں کرتے وہ بھی سد اللذریعہ اسے ممنوع قرار دیتے ہیں اس لئے ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں لانا چاہیئے۔ یہاں سد ذریعہ کی بات آئی سد اللذریعہ کے بارے میں چند اور موٹی باتیں ذہن میں رکھ لیں اس سے ان آلات کے حکم کے سمجھنے میں مزید کچھ آسانی ہو جائے گی۔

سد ذریعہ کا مطلب:-

ایک بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ سد ذریعہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کام کسی گناہ کا ذریعہ بن رہا ہے اس سے بھی منع کر دیا جائے لیکن یہ اصول ہر جگہ پر لاگو نہیں ہوتا کہ جو کام بھی کسی ناجائز کام کا ذریعہ بنے اس سے روک دیا جائے اور یہ بات بھی ایک حدیث سے سمجھ میں آتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں عورتیں مسجد میں آیا کرتی تھیں ایک دن ایک عورت فجر کی نماز پڑھنے کے لئے آرہی تھی تو راستے میں کسی آدمی نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے زبردستی اپنا برا ارادہ پورا کیا اتنے میں کچھ اور لوگ بھی پہنچ گئے تو اس عورت کے چیخنے چلانے پر لوگوں نے اس شخص کو پکڑ لیا اور اس نے اپنی غلطی کا اقرار بھی کر لیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پر حد جاری فرمائی اس عورت پر اس لئے حد جاری نہیں فرمائی کہ یہ مستکرہہ تھی یعنی اس پر جبر کیا گیا تھا لیکن اس مرد پر حدِ جاری فرمائی تو دیکھئے کہ مسجد میں آنے پر ایک مفسدۃ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مرتب ہوا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ اعلان نہیں فرمایا کہ اب عورتیں مسجد میں نہ آیا کریں اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ عشاء اور فجر میں نہ آیا کریں جس نماز میں واقعہ پیش آیا اس کے بارے میں بھی نہیں فرمایا کہ عورتیں نہ آیا کریں اس سے پتہ چلا کہ سد ذریعہ کا اصول اتنا عام نہیں ہے کہ جہاں کہیں کسی جائز کام پر کوئی مفسدۃ مرتب ہوا تو فوراً اس جائز کام کو بھی ناجائز قرار دے دیا جائے بلکہ اس کے لئے بہت ساری چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے مثلاً ایک تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس جائز کام پر اس گناہ کام کے ترتب کا وقوع کتنا ہے اس اور اس کے کتنے امکانات ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس جائز کام پر گناہ کے مرتب ہونے کا امکان تو ہوتا ہے لیکن اس بات کا بھی کافی امکان ہوتا ہے کہ اس جائز کام کے کرتے ہوئے آدمی اس پر مرتب ہونے والی برائی سے بچ جائے تو ایسی صورت میں اس جائز کام سے سداً للذریعہ منع نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ جائز کام تو کر لو لیکن اپنے آپ کو اس مفسدے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے تو اس مفسدے سے منع کیا جائے گا اس جائز کام سے منع نہیں کیا جائے گا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس جائز کام پر مفسدے کا ترتب اتنا عام اور اتنا یقینی ہوتا ہے کہ بظاہر یہ بات انتہائی بعید ہوتی ہے کہ ان حالات میں وہ جائز کام کیا جاوے اور اس مفسدہ سے بچا جائے تو ایسی صورت میں اس مفسدے سے روکنے

کی بجائے اس کا ذریعہ بننے والے جائز کام سے ہی منع کر دیا جاتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں عورتوں کے مسجدوں میں آنے پر مفسدہ تو مرتب ہوا لیکن یہ ترتب عام نہیں تھا بلکہ اکا دکا واقعہ تھا اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس کی وجہ سے عورتوں کے مسجدوں میں آنے سے منع نہیں کیا۔

پھر جس پر مفسدے کا ترتب عام ہو اس میں سد ذریعہ کا اصول جاری کرتے ہوئے یہ بھی دیکھا جائے گا کہ یہ جائز کام کتنی ضرورت کا ہے اگر اس کی معتدبہ ضرورت ہو تو بھی یہی کہیں گے کہ یہ جائز کام تو کرلو لیکن اس پر مرتب ہونے والے فلاں مفاسد سے بچتے ہوئے اور اگر وہ کام ضرورت کا نہ ہو تو اس سے منع کر دیا جائے گا مثال کے طور پر یہی ٹی وی اور وی سی آر میں ان مفاسد کا ترتب ہوتا ہے اور یہ کوئی ضرورت کی چیزیں نہیں ہیں ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اس کے نہ ہونے سے کوئی ضرر ہو نقصان ہو اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھر میں اگر ٹی وی وغیرہ نہیں ہے تو اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا کہ وقت بچ جائے گا اور بہت ساری خرافات سے انسان بچ جائے گا، ضرر کوئی نہیں ہے۔ تو یہاں پر کہیں گے کہ صرف مفاسد سے بچنے کی بجائے اس کے ذریعے سے بھی بچو اور ایک ہے ضرورت کا کام جیسے کاروبار ہے آج کوئی آدمی اگر کاروبار کرتا ہے تو اس میں بھی بکثرت جھوٹ، فراڈ، ملاوٹ، جھوٹی قسم نماز میں سستی اور اس طرح کی بہت ساری ناجائز باتوں میں ابتلاء عام ہے اور کاروبار کرتے ہوئے آدمی ان چیزوں سے بچے یہ بھی انتہائی مشکل ہے تو کاروبار پر بھی مفاسد مرتب ہوتے ہیں لیکن یہ کام چونکہ ضرورت کا ہے اس لئے یہاں یہ نہیں کہیں گے کہ چونکہ اس چیز پر مفاسد مرتب ہو رہے ہیں اس لئے یہ کام ہی نہ کرو بلکہ یہ کہیں گے کہ کاروبار بے شک کرو لیکن اپنی پوری کوشش کرو اس بات کی کہ ان گناہوں سے بچو۔

سد ذریعہ کا جو اصول ہے یہ جاری کرنے کے کچھ قواعد ہیں ان کے تحت اس اصول کو جاری کیا جاتا ہے اب کہاں سد ذریعہ کا اصول لگے گا اور کہاں نہیں لگے گا اس کا دارومدار گویا حالات کے فہم اور ادراک پر ہے کہ ایک تو یہ سمجھنا کہ اس پر مفاسد کتنے مرتب ہوتے ہیں مفاسد کا ترتب کم ہے یا زیادہ ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کام ضرورت کا ہے یا نہیں یہ دونوں باتیں حالات کے فہم کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور حالات کے فہم میں اہل علم کی انظار اور آراء مختلف ہو سکتی ہیں اور اس کی وجہ سے مسئلہ میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ اختلاف درحقیقت مسئلہ کا نہیں بلکہ حالات کے فہم کا ہے ایک آدمی حالات سے کچھ اور نتیجہ اخذ کرتا ہے، دوسرا آدمی انہیں حالات سے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اس میں اپنے اپنے تجربات کا بھی فرق پڑ جاتا ہے ایک جگہ میں رہتے ہوئے آدمی کے سامنے اور قسم کے حالات آرہے ہیں دوسرے ماحول میں رہتے ہوئے دوسرے آدمی کے سامنے اور قسم کے حالات آرہے ہیں۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ سد ذریعہ کے اصول کو لاگو کرنے کے کچھ قواعد ہیں ان کے تحت یہ اصول لاگو ہوتا ہے ہر جگہ پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج کل فحاشی اور بے حیائی کے آلات صرف یہی دو نہیں ہیں ویڈیو اور ٹی وی بلکہ اور بھی بے شمار ہیں مثلاً اخبارات کے اندر اس طرح کی تصویریں آتی ہیں، بہت سارے رسائل بڑے اہتمام سے اس طرح کی تصویریں چھاپتے ہیں بہت سارے تجارتی مراکز اور چوراہے وغیرہ ایسے ہوتے ہیں جہاں سائن بورڈ ایسے لگے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی بد ذوقی کی تسکین کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، بڑے بڑے ائیر پورٹس پر بہت سے اشتہارات ایسے ہوتے ہیں جو خوبصورت سائن بورڈ وغیرہ کی شکل میں ائیر پورٹس کے لاؤنج میں لگے ہوتے ہیں ان میں بعض اوقات بڑی عریاں تصویریں ہوتی ہیں کہ کچھ لوگوں کے لئے تو دیکھنا ہی مشکل ہوتا ہے اور کچھ لوگ ایسی جگہوں پر جاتے ہی دیکھنے کے لئے ہوں تو بے حیائی کے آلات یہی دو نہیں ہیں بلکہ ان آلات کی بھرمار ہے اور خاص طور سے آج کل یہ کام کمپیوٹر نے تو بہت ہی آسان کر دیا، اس لئے گھر میں اگر آپ کے پاس کمپیوٹر موجود ہے تو بازار سے آپ کو ہر قسم کی (C D) سی ڈی مل جائے گی جس میں اچھی چیزیں بھی مل سکتی ہیں اور بڑی خرافات بھی مل سکتی ہیں اور اگر آپ کے پاس انٹر نیٹ کی سہولت موجود ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ فی گھنٹہ معمولی سے پیسے خرچ کر کے آپ کی رسائی دنیا بھر کی بد ترین سے بد ترین بے حیائی تک ہو گئی ہے جس کا شاید ٹی وی میں تصور بھی نہیں تھا تو یہ چیزیں بھی آج کل بے حیائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

ایک اور نقطۂ نظر:-

اب جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ جس کام سے سد الذریعہ منع کیا جاتا ہے وہاں کسی چیز کے حکم کے بارے میں رائے قائم کرنے کا انحصار حالات کے فہم پر ہے ہمارے ہاں علماء کی ایک واضح اکثریت بہر حال ٹی وی اور وی سی آر کو سد الذریعہ ناجائز ہی قرار دیتی ہے لیکن اس کے برعکس بھی کسی کی رائے ہو سکتی ہے مثلاً کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بہت سارے گھرانے ایسے ہیں جن میں ٹی وی موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان گھرانوں میں تدین اور شریعت کا جو عام معیار ہوتا ہے وہ برقرار ہے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ گھرانہ دین سے بالکل بے زار ہو گیا ہے یا اس میں عفت حیاء اور پاک دامنی نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہی اور اگر آپ مدرسے کی اس چار دیواری سے باہر نکل کر دنیا کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ایسی بے شمار مثالیں مل جائیں گی آپ کو اپنے محلے میں مل جائیں گی بہت سارے لوگ ہیں ڈاڑھی بھی ہے، نماز کے بھی پابند ہیں جائز و ناجائز کی بھی فکر ہے اور یہ کہہ دیں کہ ان کی عورتیں بے حیاء ہو گئیں ہیں یہ بھی مشکل ہے اور ان کی اگلی نسل بگڑ گئی۔

یہ کہنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ان کے گھر میں ٹی وی موجود ہوتا ہے، خود ہم سے بعض لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں ہم ان کو بڑا پکا دین دار سمجھ رہے ہوتے ہیں اور واقعتاً ہوتے بھی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے عجیب وغریب حالات ہوتے ہیں جو کہ بعض اوقات علماء اور مشائخ کے نہیں ہوتے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک جاننے والے صاحب ہیں ان کا انتقال ہوا تو ان کے انتقال کے حالات بتاتے ہوئے ان کے گھر والوں نے بتایا کہ ان کا معمول یہ تھا کہ صبح کو سب سے پہلے یہ کام کرتے تھے کہ کم از کم ایک گھنٹہ قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے اور اس میں ناغہ نہیں ہوتا تھا اس کے بعد ناشتہ کرتے تھے اور اس کے بعد پھر اپنے کام پر جاتے تھے، کاروبار بھی تھا اور بہت ساری تنظیموں کے رکن بھی تھے، اس دن انہوں نے کسی میٹنگ میں جانا تھا لیکن حسب معمول انہوں نے قرآن شریف کی تلاوت پوری کی اس کے بعد انتقال ہو گیا تو اس طرح کے بہت سارے لوگ ہیں وہ بعض اوقات مسئلہ پوچھتے ہیں کہ ٹی وی میں ایک پروگرام آیا تھا اس میں کسی نے یہ مسئلہ بتایا تھا تو کیا واقعتاً مسئلہ ایسے ہی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے گھر میں بھی ٹی وی ہے تو کسی کی یہ رائے ہو سکتی ہے کہ ٹی وی گھر میں ہو اور وہ لوگ بددین اور بے حیا ہو جائیں یہ دو چیزیں کوئی لازم وملزوم نہیں ہیں۔

اسی طریقے سے کسی کی یہ رائے بھی ہو سکتی ہے کہ ہم ٹی وی وغیرہ سے منع کرتے ہیں بے حیائی سے بچنے کے لئے اور بے حیائی کا ذریعہ صرف ٹی وی رہا نہیں ہے بلکہ وہ تو کمپیوٹر بھی ہے انٹرنیٹ بھی ہے اور صرف یہی نہیں کہ یہ بے حیائی کا ذریعہ ہیں بلکہ اس کا بکثرت استعمال اس مقصد کے لئے ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کوئی یہ نہیں کہتا کہ کمپیوٹر اپنے گھر میں رکھنا ناجائز ہے ہاں یہ فرق تو ہے کہ وہ کسی درجے میں ضرورت کی چیز ہے لیکن یہ ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب بے حیائی کا ذریعہ ایک نہیں رہا بلکہ قدم قدم پر اس کے سامان موجود ہیں تو اب ذرائع سے روکنا بے کار ہے ایک ذریعہ سے روکیں گے تو دوسرا موجود ہے دوسرے سے روکیں گے تیسرا موجود ہے، تو جس کو بے حیائی سے نفرت نہیں ہے غلط پروگراموں سے نفرت نہیں ہے اس کو ٹی وی اور وی سی آر سے آپ روک بھی دیں گے تو وہ اپنے اس برے ذوق کی تسکین کسی نا کسی ذریعہ سے کر ہی لے گا سد الذریعہ تو منع کیا جاتا ہے تا کہ رکاوٹ پیدا ہو لیکن جب حالات نے بتا دیا کہ اس بند باندھنے سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہی نہیں ہے تو سد ذریعہ کا مقصد ہی فوت ہو گیا، اب مسئلے کا حل یہ نہیں کہ ایک دو ذریعوں کی نفرت بٹھانے پر سارا زور صرف کر دیں بلکہ اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اصل جو برائی ہے اس کی نفرت ذہنوں میں بٹھائیں کہ اس سے بچو اگر اس کی نفرت ذہن میں بیٹھ گئی تو گھر میں کمپیوٹر ہے یا ٹی وی ہے یا اس طرح کی اور کوئی چیز ہے وہ برائی سے بچے گا اور اگر اس کی نفرت ذہن میں نہیں بیٹھی ہوئی بلکہ اس کا ذوق موجود ہے تو آپ نے گھر سے ٹی وی اٹھا کر جلا بھی دیا تو جس نے اس طرح کی

خرافات دیکھنی ہے وہ کسی اور طریقے سے دیکھ لے گا کہاں کہاں تک آپ رکاوٹ پیدا کریں گے مواصلات اور اس طرح کی چیزیں اتنی ترقی کر گئیں ہیں کہ ان میں رکاوٹیں کھڑی کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ کسی عالم کا یہ نقطۂ نظر ہو اور اس کی وجہ سے یہ سمجھتا ہو کہ اب ان چیزوں سے سد الذریعہ منع کرنے پر اتنا زور لگانا اتنا سود مند نہیں ہے تو اگر کسی کی یہ رائے ہو تو اس رائے سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس پر طعن و تشنیع نہیں کی جاسکتی کیوں کہ ایک تو یہ کہ ان چیزوں کا تصویر ہونا منصوص نہیں ہے بلکہ یہ خالصتاً اجتہادی مسئلہ ہے جس میں ایک سے زیادہ آراء کی گنجائش ہے اور دوسرا سد ذریعہ کا معاملہ ہو تا ہی حالات کے فہم پر ہے تو ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی حالات اور طریقے سے سمجھ رہا ہو اور دوسرا اور طریقے سے سمجھتا ہو اس لئے کسی کی جو واقعتاً صاحب علم ہے اس کی رائے پر طعن و تشنیع کرنا درست معلوم نہیں ہو تا۔

ایک غلو کی اصلاح:-

یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ بعض اوقات اس معاملے میں غلو ہو جاتا ہے مثال کے طور پر کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دینی رسالے میں ایک استفتاء اور اس کا جواب چھپا اور وہ رسالہ بھی معتبر سمجھا جاتا ہے سوال یہ تھا کہ ایک جگہ پر کوئی دینی جلسہ تھا اس کی باقاعدہ ویڈیو ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی کیمرے موجود تھے تو جو مولانا صاحب خطاب کر رہے تھے ان سے کسی آدمی نے کہا کہ آپ ایک دینی جلسہ کر رہے ہیں اور اس میں اس طرح کی ناجائز چیزیں ہیں اس پر مولانا صاحب نے کہا کہ یہ اس تصویر میں داخل نہیں جو ناجائز ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس کا حکم کیا ہے تو اس کے جواب میں ایک بات تو یہ تھی کہ ویڈیو ریکارڈنگ وغیرہ کرنا یہ ناجائز ہے اور خاص طور پر دینی تقریبات میں یہ چیز نہیں ہونی چاہئے اس حد تک تو بات درست ہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان مفتی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہو گا کہ یہ تصویر میں داخل ہے اور تصویر نہ بھی ہو تو بھی اس میں اور قباحتیں ضرور ہیں لیکن اس کے بعد یہ لکھا تھا کہ جن مولانا صاحب نے یہ بات کہی ہے اور اس کو جائز قرار دیا ہے وہ فاسق ہو گئے ہیں اور ان پر واجب ہے کہ وہ علی الاعلان اپنی اس بات سے توبہ کریں اور جب تک وہ ایسا نہیں کرتے اس وقت تک ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے اس حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ تقریبات میں خاص طور پر دینی تقریبات میں اس طرح کی چیزیں نہ ہوں اور اپنی رائے کی مطابق نفس مسئلہ میں جو فتویٰ دیا وہ بھی صحیح ہے لیکن یہ رائے کوئی منصوص تو ہے نہیں حتیٰ کہ فقہاء کی کلام میں بھی اس کی کوئی نص نہیں ہے اس لئے اگر واقعتاً کسی عالم کا شرح صدر کسی دوسری رائے پر ہو جاتا ہے تو اس سے اختلاف بھی اس طرح کے موقعوں پر کرنا چاہئے دوسری رائے کا اظہار کرنا چاہئے اس پر دلائل بھی قائم کرنے چاہئیں لیکن اس حد تک چلے جانا کہ یہ

رائے جس نے اختیار کی ہے وہ فاسق بن گیا ہے اور اس پر علی الاعلان توبہ کرنا واجب ہے یہ بہر حال تجاوز عن الحدود ہے یہ مناسب طرز عمل نہیں ہے کیوں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو رائے ہم نے اختیار کی ہے وہ قطعی ہے کیوں کہ قطعی چیز کے انکار سے ہی آدمی اس حد تک پہنچتا ہے جس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہو اس میں واقعتاً کوئی صاحب علم دوسری رائے اختیار کرے تو وہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہوتی۔

سد ذریعہ کے متعلق ایک اور مسئلہ:۔

اسی سلسلہ میں ایک مسئلہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ جن چیزوں سے سد اًللذریعہ منع کیا جاتا ہے ان کا اگر کوئی ارتکاب کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ اس مباح کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے وہ اس گناہ اور مفسدے میں بھی مبتلا ہو گیا جس سے بچنے کی خاطر اس مباح کام سے منع کیا گیا تھا تو اس صورت میں تو ظاہر ہے کہ جس گناہ میں ابتلاء ہوا ہے اس کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے گا اور وہ گناہ کبیرہ ہے اور موجب فسق ہے تو اس پر فاسق ہونے کا حکم بھی لگایا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس کام کو سداً للذریعہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اس نے وہ کام کیا لیکن جس مفسدے سے بچنے کے لئے اس سے روکا گیا تھا اس مفسدے میں ابھی تک وقوع نہیں ہوا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں بھی اسے فاسق قرار دیا جائے گا تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔ کہ یہ بات تو کہیں گے کہ اس نے اس کام کا ارتکاب کر کے بڑی غلطی کی ہے اور دین کے بارے میں تساہل کا ثبوت دیا ہے اس لئے کہ اگرچہ یہ اگلے گناہ میں مبتلا نہیں ہوا لیکن اس مباح کے ارتکاب کی وجہ سے اس میں واضح ابتلاء کا خطرہ تھا تو گناہ کے قریب ضرور پہنچا گناہ کے راستے پر اس نے اپنے آپ کو ضرور ڈال دیا یہ اس کی غلطی تو ضرور ہے لیکن فاسق قرار دینا مشکل ہے کیوں کہ فاسق ہوتا ہے گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اور کبیرہ کسے کہتے ہیں اور صغیرہ کسے کہتے ہیں یہ ایک الگ بحث ہے لیکن کبیرہ بننے کے لئے کم از کم اتنا تو ضروری ہونا چاہئے کہ وہ کام فی نفسہٖ گناہ ہو اپنی ذات کے اعتبار سے مباح نہ ہو جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے مباح تھا محض مصلحتاً اس سے منع کیا گیا تھا تو اس کے ارتکاب کو کبیرہ کا ارتکاب بہر حال قرار نہیں دیا جا سکتا اس لئے اس پر فسق کا حکم لگانا انتہائی مشکل ہے۔

جس کے گھر میں ٹی وی وغیرہ ہو اس کا حکم:۔

اس سے ان لوگوں کا حکم معلوم ہو گیا جن کے گھروں میں ٹی وی یا وی سی آر ہے اور اس طرح کی دوسری چیزیں ہیں کہ اگر تو یہ یقین ہے کہ وہ ان آلات کو ان کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں جو بالکل حرام

ہیں اور یہ استعمال اس حد تک پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے پھر تو فسق کا حکم لگایا جائے گا لیکن اگر یہ معلوم ہے کہ انہوں نے یہ آلات اپنے گھر میں رکھے ہوئے ہیں لیکن جائز حد تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں یا کوئی غلط پروگرام کو دیکھتے بھی ہیں تو وہ پروگرام ایسے نہیں ہیں جو فسق کی حد تک پہنچتے ہوں یا پتہ نہیں کہ اس کے ذریعہ سے کیا دیکھتے ہیں تو ایسی صورت میں ہمارے علماء کے معروف قول کے مطابق یہ کہنا تو درست ہے کہ ان کا گھر میں اس چیز کو رکھنا اچھا نہیں ہے اور انہیں نہیں رکھنا چاہئے لیکن محض گھر میں ہونے کی وجہ سے فاسق ہونے کا حکم لگادیا جائے یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

دینی پیشوا کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے:-

البتہ یہاں مسئلے عام طور پر دو ہوتے ہیں جو بکثرت پوچھے جاتے ہیں ایک ویسے جس کے گھر میں ہو وہ فاسق ہے یا نہیں اور دوسرے عموماً مسئلہ پوچھا جاتا ہے مسجد کے امام کا تو مسئلہ تو ایک ہی ہے فاسق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں البتہ امام کے بارے میں ایک اور بات یہ ہے کہ امام کو اس انداز سے رہنا چاہئے کہ وہ اپنے مقتدیوں میں متنازعہ نہ بنے ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے اس پر انگلی اٹھے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید بیان فرمائی ہے اس آدمی پر جو کسی قوم کا امام بنے اور وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں تو ہمارے ہاں لوگ اگرچہ گھروں میں یہ سب کچھ رکھتے ہیں لیکن بہر حال اپنے اماموں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ اور ان کا یہ چاہنا درست ہے کہ ان کے گھروں میں نہ ہو اگر وہ رکھیں گے تو **من اُم قوماً وھُم لہٗ کارھون** میں کم از کم ضرور داخل ہو جائے گا اس لئے امام کا اور اسی طرح جو آدمی مقتداء اور عالم بنے اس کا حکم عام لوگوں سے بہر حال مختلف ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ محض کسی کے گھر میں موجود ہے اس کی وجہ سے یہ کہہ دیں کہ یہ فاسق ہے یہ بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔

ٹی وی (T V) پر نامحرم کی تصویر دیکھنا:-

یہاں ایک مسئلہ اور ہے ایک تو ہے گھر میں ٹی وی وغیرہ رکھنا وہ تو میں نے بتادیا کہ اسے عموماً متعدد مفاسد کی وجہ سے ممنوع کہا جاتا ہے لیکن دیکھنے کی حد تک اگر گھر میں رکھا نہیں کہیں دیکھنے کا اتفاق ہو گیا تو اس کی گنجائش ہے اسی طرح بعض اوقات تصویر بھی دیکھنی پڑ جاتی ہے یا اس پر نظر پڑ جاتی ہے یا اخبارات میں تصویر عموماً دیکھی جاتی ہے تو اس میں غیر محرم کی تصویر دیکھنے کا کیا حکم ہے چاہے وہ اخبار وغیرہ پر ہو چاہے وہ ٹی وی وغیرہ پر ہو کیوں کہ اخبار وغیرہ میں وہ تصویر ہے اور ٹی وی وغیرہ میں وہ عکس ہے اس کا کیا حکم ہے یعنی باقی

مفاسد کی بات تو الگ ہے لیکن نظر الی الاجنبیہ میں وہ داخل ہو گا یا نہیں ہو گا تو ان چیزوں کا صراحتاً حکم تو ظاہر ہے کہ فقہاء کی کلام میں نہیں مل سکتا البتہ اس کی بعض نظریں ملتی ہیں اور وہ نظیر ہے کسی اجنبیہ کو آئینے کے ذریعے سے دیکھنا یا پانی کے اندر اس کا عکس دیکھنا علامہ شامیؒ نے کتاب الحظر والاباحۃ میں اس مسئلے پر بحث فرمائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی عورت کو شیشے کے اندر دیکھا یعنی شفاف شیشہ تھا، مثلاً کوئی شیشے کا کمرہ بنا ہوا ہے اس کے اندر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے اس کی فرج داخل کو دیکھا یا ایک عورت پانی کے اندر ہے پانی کے اندر سے اس کی فرج داخل کو دیکھا شہوت کے ساتھ تو اس سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی لیکن اگر اس عورت کے عکس کو آئینے میں دیکھا یا اس کے عکس کو پانی کے اندر دیکھا تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہو گی اور وجہ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں بعینہٖ اس عورت کو دیکھا ہے عین کو دیکھا ہے راستے میں شیشہ یا پانی ہے لیکن یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو نفوذ بصر سے مانع نہیں ہیں لیکن دوسری صورت میں اس کے عین کو نہیں دیکھا بلکہ اس کی مثل کو دیکھا ہے اس لئے اس صورت میں حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہو گی تو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجنبیہ کو دیکھنا نظر الی الفرج کی بات نہیں ہو رہی ویسے اجنبیہ کو دیکھنے کی بات ہو رہی ہے اجنبیہ کو ویسے دیکھنا یا پانی وغیرہ کے اندر سے دیکھنا جب کہ اس کا عکس نہ ہو بلکہ براہ راست وہ سامنے ہو تو یہ ناجائز ہے لیکن آئینے کے اندر یا پانی کے اندر اس کا عکس دیکھنا جائز ہے کیوں کہ بعینہٖ یہ وہ نہیں بلکہ اس کی مثل ہے بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے لیکن علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ استنباط اتنا واضح نہیں ہے اس لئے کہ حرمت مصاہرت کے مسئلے میں اور نظر کے جواز کے مسئلے میں فرق ہے وہ یہ کہ حرمت مصاہرت کے اثبات میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے احتیاط سے مراد یہ ہے کہ کہ اس کی شرطوں میں ذرا سختی کی گئی ہے کیوں کہ اصل وہاں حلت ہے احتیاط کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت کی جاتی ہے اس لئے وہاں پر معمولی باتوں کی وجہ سے ثابت نہیں کریں گے لہٰذا فرج داخل کے عین کو دیکھا تو حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اور اس کے عکس کو دیکھا تو ثابت نہیں ہو گی لیکن یہاں معاملہ ہے فتنہ اور شہوت کا کہ نظر الی الاجنبیہ موجب فتنہ اور مظنہ شہوت ہے اور یہ بات جس طرح عین کو دیکھنے میں ہے اسی طرح عکس کو دیکھنے میں بھی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اجنبیہ کو دیکھنا جس طرح ناجائز ہے اسی طرح اس کے عکس کو دیکھنا بھی ناجائز ہے اور اس کے بعد علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ شافعیہ میں سے ابن حجر مکیؒ نے بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے اور اس کی وجہ بھی یہی بیان کی ہے تو اس سے دو باتیں سمجھ میں آئیں ایک تو یہ پتہ چلا کہ نظر کے جائز ہونے یا نہ ہونے کو حرمت مصاہرت کے مسئلے پر قیاس نہیں کیا جائے گا بلکہ اس مسئلے میں عین کو دیکھنا یا اس کے عکس کو دیکھنا برابر ہے دونوں ہی ناجائز ہیں دوسرا مسئلہ یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ ناجائز ہونا لذاتہ

نہیں ہے کیوں کہ ذات کے اعتبار سے تو فرق کر لیا کہ نظر الی العین اور ہے اور نظر الی المثل اور ہے دونوں کا حکم ایک جیسا نہیں ہے بلکہ یہ ممانعت ہے ایک علت کی وجہ سے اور وہ علت خوف فتنہ ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جہاں فتنے سے واضح امن موجود ہو وہاں شاید اس کی گنجائش ہو بالخصوص اگر ابتلائے عام ہو اب اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ جتنے بھی عکس اور تصویریں ہیں ان کی کئی صورتیں بنتی ہیں۔

(۱)..........ایک تو یہ کہ وہ منظر ایسا ہی ہو جس کا مقصد ہی عورت کے محاسن کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے اور کوئی مقصد اس کا ہوتا ہی نہیں ہے وہ تو ظاہر ہے کہ ناجائز ہوگا اس لئے کہ ایک تو اس میں خوف فتنہ واضح ہے اور دوسرے شریعت کا اصول ہے کہ ''الامور بمقاصدہا'' کہ امور کا دارومدار ان کے مقاصد پر ہوتا ہے۔

(۲)..........دوسری صورت ہے کہ ایسا پروگرام ہے یا ایسا منظر ہے جو اس طرح کا بے حیائی والا تو نہیں ہے لیکن بے حجابی ہے یعنی اس میں عورت ہے اور جتنے حجاب کے اندر اس کو ہونا چاہئے اتنے حجاب کے اندر وہ نہیں ہے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میں مظنہ شہوت یا خوف فتنہ ہے پھر تو ظاہر ہے کہ دیکھنا ناجائز ہے دوسری صورت یہ ہے کہ خوف فتنہ نہیں ہے تو دیکھنا جائز ہوگا اور بچنا اولیٰ ہوگا اگرچہ دونوں امر برابر ہیں پھر بھی ترجیح عدم جواز کو ہونی چاہئے اس کی مثال کہ ٹی وی پر فرض کیجئے خبریں آرہی ہیں اور نیوز کاسٹر کوئی عورت ہے تو اکثر و بیشتر وہ بے حجاب بھی ہوتی ہے اور بناؤ سنگھار کے ساتھ بھی ہوتی ہے لیکن بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ چونکہ مقصد صرف خبریں سننا ہے اس لئے اس طرف دھیان نہیں جاتا کہ یہ میرے سامنے کس طرح کی عورت ہے اس کے محاسن کی طرف ذہن متوجہ نہیں ہوتا یا فرض کیجئے کہ ایک عورت بڑی سیاستدان ہے یا کسی بڑے منصب پر فائز ہے اس کی اخبار میں تصویر آتی ہے کہ وہ کہیں خطاب کر رہی ہیں یا کسی ریلی کی قیادت کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ یا یہی ٹی وی وغیرہ پر ان کی جھلک دکھائی جاتی ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ عام آدمی کا ذہن اس کے محاسن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو اس سے بھی کوئی آدمی بچ لے اور نہ دیکھے بہت اچھی بات ہے لیکن اگر نظر پڑ جائے تو بہر حال عام جو حکم ہوتا ہے نظر الی الاجنبیہ خاص طور پر جب کہ اس کے وہ اعضاء ظاہر ہوں جن کا چھپانا لذاتہ واجب ہے جیسے کہ سر وغیرہ تو اس کی طرف دیکھنا حرام ہے خوف فتنہ ہو یا نہ ہو لیکن یہاں چونکہ عین کی طرف دیکھنا نہیں بلکہ اس کی مثل کی طرف دیکھنا ہے اس لئے حکم میں تخفیف ضرور ہو جائے گی۔

خوف فتنہ کا مطلب:-

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ وہ یہ کہ خوف فتنہ کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے بعض لوگ خوف فتنہ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اس عورت کو دیکھ کر دل میں میلان پیدا ہوگا اور اس سے

رابطہ پیدا کرنے کا دل میں خیال پیدا ہوگا یہ بھی خوف فتنہ ہے اس فتنے کا وقوع ذرا کم ہوتا ہے اس طرح کا خیال دل میں ذرا کم آتا ہے لیکن خوف فتنہ اس میں منحصر نہیں ہے بلکہ فتنہ اور مظنہ شہوت ہونے کی ایک صورت اور ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کے ساتھ رابطہ کرنے کا ذہن میں وہم وگمان بھی نہیں آیا لیکن جس وقت اس کا وہ عکس اور اس کی تصویر سامنے ہے اس وقت اس کو دیکھ کر لذت حاصل کرتا ہے التذاذ بالنظر بھی فتنہ ہے یہ بھی ناجائز ہے لہٰذا اگر یہ بات پائی جاتی ہے یا اس کے پائے جانے کا بہت واضح خطرہ موجود ہے تو بھی دیکھنا ناجائز ہوگا پہلی قسم کا فتنہ تو نادر ہوتا ہے لیکن دوسری قسم کا فتنہ نادر نہیں ہے اس لئے احوط یہی ہے کہ علی الاطلاق اس طرح کی چیزوں سے بچا جائے الا یہ کہ بغیر قصد اور ارادے کے نظر پڑ جائے احوط یہی ہے الا یہ کہ یقین ہو کہ اس طرح کی بات نہیں ہوگی۔

تصویر کشی والی تقریبات میں شرکت کا حکم:-

ایک مسئلہ اور ہے اس کا حکم جاننے کی بھی بکثرت ضرورت پیش آتی ہے وہ یہ کہ ایسی تقریبات جس میں کیمرے سے تصویر کشی ہو رہی ہو یا ویڈیو کیمرہ وغیرہ سے ان میں شرکت کا کیا حکم ہے تو اس میں دو صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی نے از خود ان چیزوں کا اہتمام کیا ہے مثلاً کیمرے والوں کو بلوایا ہے یا ٹی وی والوں کو بلوایا ہے، ویڈیو کیمرے والوں کو بلوایا ہے کہ آکر مووی بنائیں تو اس کا حکم گزشتہ تقریر سے سمجھ میں آ گیا اسی طرح وہاں جاتا ہی اس مقصد کے لئے ہے کہ میری تصویر کھینچی جائے یا ویڈیو کے اندر میری تصویر آجائے شاید ٹی وی پر میری ایک جھلک نظر آجائے یا اخبار میں میری تصویر چھپ جائے یا ویسے ہی تصویر کے نقطۂ نظر سے شریک ہوتا ہے یا بالقصد کیمرے کے سامنے ہوتا ہے ان صورتوں کا حکم تو بیان ہو چکا اس لئے کہ اس میں یا تو آدمی کا اپنا فعل ہے یا فعل کا امر ہے اس فعل میں شرکت ہے لہٰذا جو حکم اصل تصویر کا ہے وہی حکم اس کا ہوگا لیکن ایک صورت یہ ہے کہ اپنے اختیار سے اس نے اس طرح کا انتظام نہیں کیا اور اس کا حکم بھی نہیں دیا اور محض اس مقصد کے لئے جاتا بھی نہیں ہے اور خود قصد کر کے کیمرے کے سامنے بھی نہیں ہوتا تو ایسی تقریب میں شرکت کا حکم کیا ہے تو اس سے پہلے ایک دو اصولی باتیں ذہن میں رکھ لینی چاہئیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس صورت میں یہ تصویر کھینچنا اس کا فعل نہیں ہے بلکہ دوسرے کا فعل ہے تصویر اُس نے کھینچی ہے اس نے نہیں کھینچی البتہ کسی نہ کسی درجے میں اس کا سبب بنا ہے کہ یہ اگر وہاں پر موجود نہ ہوتا تو اس کی تصویر نہ کھینچی جاتی وہاں پر موجود ہے اس وجہ سے اس کی تصویر کھینچی گئی ہے اور جس طرح معصیت کا ارتکاب ناجائز ہے اسی طرح اس کا سبب بننا بھی ناجائز ہے لیکن سبب بننا مطلقاً ناجائز نہیں ہے اس

میں تفصیل ہے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع صاحبؒ کے ایک رسالے میں دیکھی جاسکتی ہے جو جواہر الفقہہ کا جز ہے جس میں اعانت علی الحرام اور حرام کام میں سبب بننے کا مسئلہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یہاں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ سبب قریب اگر بن رہا ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے اور اگر سبب بعید بن رہا ہے تو یہ مکروہ تحریمی نہیں بلکہ مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے اب سبب قریب کس کو کہیں گے سبب بعید کس کو کہیں گے اس میں بھی تفصیل ہے لیکن اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ جہاں ایسا سبب بن رہا ہو کہ فعل میں کسی اور فاعل مختار کے ارادے اور قدرت کا دخل ہو محض اس کے سبب بننے کی وجہ سے وہ کام نہیں ہو رہا تو وہ سبب بعید ہے اور اس صورت میں یہ سبب بننا مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے اور یہاں پر بھی یہی صورت پائی جارہی ہے اس لئے کہ اس کے جانے کی وجہ سے وہ کسی بھی درجے میں اس کی تصویر کھینچنے پر مجبور نہیں ہوا بلکہ یہ کام وہ شخص مکمل طور پر اپنے ارادے اپنی قدرت اور اپنی خواہش کے مطابق کر رہا ہے لہٰذا سبب تو بن رہا ہے لیکن سبب بعید بن رہا ہے۔

نہی عن المنکر کب واجب ہوتا ہے:-

دوسرا یہاں پر یہ اصول ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ منکر سے جس طرح خود بچنا ضروری ہے اسی طرح جہاں منکر ہو رہا ہو وہاں دوسروں کو اس سے روکنا بھی ضروری ہے نہی عن المنکر بھی واجب ہے لیکن نہی عن المنکر کے وجوب میں بھی فقہاء نے تفصیل لکھی ہے، پوری تفصیل بیان کرنے کا تو یہاں پر موقع نہیں ہے لیکن یہاں کے متعلق جو باتیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نہی عن المنکر اس وقت واجب ہوتی ہے جب کہ دوسرے کو پہلے مسئلے کا علم نہ ہو اگر اس مسئلے کا علم ہے تو پھر اس مسئلے کا بتادینا اور واجب کام کی طرف اس کو متوجہ کر دینا یا منکر سے روک دینا مستحب اور بہتر تو ہے لیکن واجب نہیں ہے، دوسرا یہ کہ نہی عن المنکر جو واجب ہے اس سے مراد وہ منکر ہے جو حرام قطعی ہو اور مجتہد فیہ نہ ہو اور اگر وہ مجتہد فیہ ہو اور خاص طور پر یہ امکان ہو کہ دوسرے شخص کی رائے ہی دوسری ہے یا وہ کسی ایسے عالم پر اعتماد کرتا ہے کہ جس کی دوسری رائے ہے تو وہاں نہی عن المنکر واجب نہیں ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ نے شرح مسلم حدیث عنّ رأی منکم منکرا افلیغیرہ بیدہ کی تشریح میں اس کی صراحت کی ہے تو ان دو اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ایسی تقریب میں شرکت جس میں تصویر کشی ہو رہی ہو یا ویڈیو کیسٹ بن رہی ہو اور وہ کام اس کے اختیار اور مرضی کے بغیر ہو رہا ہے تو اس میں شرکت جائز تو ہے لیکن اس وجہ سے مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے یہ اس ناجائز کام کا سبب بعید ضرور بن رہا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ایسی تقریب میں نہ جائے البتہ جو کام کسی ناجائز کا سبب بعید ہوتا ہے بعض بڑے مصالح کی وجہ سے اس کی گنجائش ہو جاتی ہے مکروہ تحریمی

کی اجازت کے لئے تو باقاعدہ ضرورت موجود ہو تو پھر ہی دی جاتی ہے لیکن مکروہ تنزیہی کی اجازت مصالح کی وجہ سے بھی دی جاسکتی ہے، مصالح کئی قسم کی ہو سکتی ہیں مثلاً مسئلہ صلہ رحمی کا ہوتا ہے کہ اگر نہیں جائے گا تو قطع رحمی ہوگی یا رشتہ داروں کے حالات آپس میں خراب ہوں گے یا ایک بات آج بکثرت پیش آرہی ہے کہ وہ یہ کہ دیندار لوگ جو باقاعدہ کسی پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں مثلاً ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، وکیل ہیں وغیرہ وغیرہ ان کے بہت سارے پیشہ وارانہ قسم کے اجتماعات ہوتے ہیں ڈاکٹروں کے ہو رہے، وکلاء کے ہو رہے مثلاً بار کونسل کا اجلاس ہے اس طرح کی دوسری چیزیں ہیں اور ان میں ظاہر ہے کہ یہ تصویر کشی تو ہوتی ہے اب باقی لوگوں کو تو اس کی فکر ہی نہیں ہے لیکن چند ایک لوگ ہیں جن کو دین کی فکر ہے دیندار ہیں اگر دینداروں کو یہ کہہ دیں کہ آپ ایسی تقریبات میں نہ جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں ان سب شعبوں کے اندر ڈاڑھیوں والے دیندار لوگ بالکل پیچھے رہ جائیں گے وہ آگے نہیں آسکیں گے اور جن کو دین کی کوئی فکر نہیں کوئی پرواہ نہیں وہ آگے آجائیں گے تو یہ تقویٰ بحیثیت مجموعی دین سے کم تعلق رکھنے والے یا دین سے نہ تعلق رکھنے والے لوگوں کے اوپر آنے کا ذریعہ بن سکتا ہے تو ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے تحت اس طرح کے اجماعات میں جہاں واقعتاً ایسی ضرورت موجود ہو وہاں شرکت کر لی جائے لیکن وہاں شرکت کرنے کے بعد اگرچہ منع کرنا واجب نہیں ہے اس لئے کہ یہ ایسا موقع نہیں جس میں نہی عن المنکر واجب ہو لیکن اگر مناسب طریقے سے منع کرنے کا موقع ہو تو ایسا کر لینا چاہئے لیکن اگر پتہ ہے کہ میرے کہنے کا کوئی فرق نہیں پڑے گا تو نہی عن المنکر واجب نہیں البتہ کہہ لینا اچھا ہے لیکن اگر نہیں روکتا تو اس کی بھی گنجائش ہے پھر روکنے میں یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ یہ چونکہ منکرات قطعیہ میں سے ہے نہیں اور فی الجملہ لوگوں کو مسئلے کا پتہ ہوتا ہے کہ بہت سارے علماء اس کو ناجائز کہتے ہیں اس لئے روکنے کے لئے ایسی جگہ پر ہنگامہ آرائی کرنا اور سخت الفاظ استعمال کرنا اور کوئی طوفان کھڑا کر دینا یہ بہت سارے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے کسی زمانے میں ہم بھی ایسا کر لیا کرتے تھے لیکن بعد میں اپنے بڑوں سے پوچھا بھی اور کئی بزرگوں کے حوالے سے سننے میں بھی آیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے اور پھر یہ بات بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ ایسے موقعوں پر بعض اوقات اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے کہ اس کو لوگ عجیب وغریب مخلوق سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ اس کی کوئی بھی بات دین کے بارے میں سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے حتیٰ کہ بڑے بڑے منکرات کا بھی ارتکاب ہوگا اور یہ منع کرے گا تو لوگ نہیں سنیں گے۔ تو اس لئے بحیثیت مجموعی دعوتی نقطۂ نظر سے بھی نقصان ہو جاتا ہے یہ ذہن میں رکھیں کہ دعوتی نقطۂ نظر سے مصلحت کی خاطر کسی ناجائز کام کا ارتکاب جائز نہیں ہو جائے گا یہ مداہنت بن جاتی ہے میں بات کر رہا ہوں اس موقع کی جہاں

شریعت گنجائش دے رہی ہے تو وہاں دعوتی مصلحت کے لئے اس گنجائش کو استعمال کر لیا جائے تو اچھی بات ہے کیوں کہ شریعت یہاں نہی عن المنکر کو واجب قرار نہیں دے رہی۔

پہلی بات تو یہ کہ ایسی تقریبات میں شرکت سے بچا جائے لیکن جہاں کسی مصلحت سے شریک ہونا پڑے اور مصالح متعدد ہو سکتی ہیں تو وہاں اگر روکنا ممکن ہو شائستگی اور تہذیب کے ساتھ تو روک دینا اچھا ہے لیکن کوئی طوفان نہیں کھڑا کرنا چاہئے اور اگر روکنا ممکن نہ ہو یا کسی وجہ سے نہ روکے تو پھر تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر ممکن ہو کہ خود کیمرے وغیرہ کے سامنے نہ آئے تو ایسا کر لینا چاہئے لیکن اگر یہ بھی ممکن نہیں ہے مثلاً خاندان کا ایسا بڑا آدمی ہے کہ نیچے بیٹھ ہی نہیں سکتا اس کو زبردستی اٹھا کر لوگ دلہا میاں کے پاس لا کر بیٹھا دیں گے یا پروفیشنل آدمی ہے اور اس طرح کی میٹنگ میں اپنی کوئی تحقیق پیش کرنی ہے یا کچھ پیپر پڑھنا ہے یا کوئی بات کرنی ہے تو ظاہر ہے اسٹیج پر تو پہنچ کر اس سے بچا نہیں جا سکتا تو چونکہ تصویر اس کا فعل نہیں دوسرے کا فعل ہے اور یہ سبب بن رہا ہے اس لئے یہ بالکل حرام نہیں ہوگا۔

یہ ہے تصویر کی مختلف اقسام کے بارے میں کچھ موٹے موٹے احکام ان میں زیادہ تر احکام میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ جو مختلف فیہ مسائل ہیں ان میں علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ان کے دلائل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں اس سلسلے میں جو باتیں میں نے کہی ہیں ان سب کا حرف آخر ہونا یا ہمارا فتویٰ ہونا یہ کوئی ضروری نہیں زیادہ تر باتیں ناقل محض ہونے کی حیثیت سے کی ہیں تاکہ آپ حضرات کے سامنے مسئلے کے سارے پہلو آ جائیں آپ نے آگے چل کر علمی و تحقیقی کام کرنے ہیں تو اس میں ان ساری باتوں کو آپ اپنے مد نظر رکھ سکیں اور اس لئے بھی کہ آپ کے سامنے واضح ہو کہ کس مسئلے کی حیثیت کیا ہے کون سا قطعی ہے کون سا قطعی نہیں ہے اور کس میں دوسرے نقطۂ نظر کی گنجائش ہے اور کس میں دوسرے نقطۂ نظر کی گنجائش نہیں ہے یہ ضروری نہیں ہر جگہ دوسرا نقطۂ نظر جو میں نے پیش کیا وہ صحیح بھی ہو لیکن بہر حال اس لئے پیش کیا ہے کہ وہ بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔

علم ایک امانت ہے اس لئے جو بات سامنے آئی یا جو سمجھ میں آئی وہ غلط ضرور ہو سکتی ہے اور آپ اس پر دلیل کے اعتبار سے تنقید کر سکتے ہیں اور رد کر سکتے ہیں لیکن کہنے والے کو بہر حال وہی بات کہنی چاہئے جس پر اس کا شرح صدر ہو اور جس پر اسے علمی اعتبار سے اطمینان ہو ہاں البتہ آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ ہم نے بھی وہی بات کہی جس پر ہمیں شرح صدر تھا لیکن ہمارے جیسے طالب علموں کے شرح صدر کی حیثیت آخر کیا ہے اس لئے ان باتوں پر غور کر لیا جائے اور اگر سمجھ میں آئیں تو قبول کر لیا جائے اور اگر سمجھ میں نہ آئیں تو ان کو قبول کرنا اور اس کو ماننا کوئی ضروری نہیں ہے۔

(٥٠٠)----- وعن بُريدة، أن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من لعب بالنردشیر فکأنما صبَغ یده فی لحم خنزیر و دمه۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ...... حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر کے ساتھ کھیلا گویا کہ اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون کے ساتھ رنگا۔

نردشیر شطرنج سے ملتا جلتا ایک کھیل ہے اس کا حکم اور دوسرے کھیلوں کا حکم باب کے آخر میں بیان کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

الفصل الثانی

(٥٠١)-----عن أبی هریرة، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أتانی جبریل علیه السلام قال: أتیتك البارحة، فلم یمنعنی أن أکون دخلت إلا أنه کان علی الباب تماثیل، وکان فی البیت قِرام سترٍ، فیه تماثیل، وکان فی البیت کلب، فُمر برأس التمثال الذی علی باب البیت فیقطع، فیصیر کهیئة الشجرة، ومُر بالستر فلیقطع، فلیُجعل وسادتین منبوذتین توطآن ومُر بالکلب فلیخرُج ففعل رسول الله صلی الله علیه وسلم ۔(رواہ الترمذی وأبو داؤد)

ترجمہ...... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ میں کل رات آپ کے پاس آیا تھا لیکن مجھے داخل ہونے سے منع نہیں کیا مگر اس بات نے کہ دروازے پر تصویریں تھیں اور گھر میں پردہ کے طور پر ایک کپڑا تھا جس پر تصویریں تھیں اور گھر کے اندر ایک کتا تھا لہٰذا آپ اس تصویر کے سر کے بارے میں حکم دیجئے جو کہ گھر کے دروازے پر ہے کہ اسے کاٹ دیا جائے اور وہ درخت کی ہیئت کی طرح ہو جائے اور پردے کے بارے میں حکم دیجئے کہ اسے کاٹ دیا جائے اور اس کے دو تکیے یا دو گدھے بنا لئے جائیں جنہیں زمین پر رکھا جائے اور انہیں پامال کیا جائے اور کتے کے بارے میں حکم دیا جائے کہ اسے بھی گھر سے نکال دیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔

(٥٠٢)----- وعن، قال: قال رسول الله ﷺ: یخرج عُنق من النار یوم القیامة لها عینان تبصران، وأذنان تسمعان، ولسان ینطق یقول: إنی وکلت بثلاثة: بکل جبّارٍ عنید، وکل من دعا مع اللهِ إلهاً آخر، وبالمصوِّرین۔ (رواہ الترمذی)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن آگ کی ایک گردن ظاہر ہو گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھتی ہوں گی اور دو کان ہوں گے جو سنتے ہوں گے اور ایک زبان ہو گی جو بولتی ہو گی اور وہ یہ کہے گی کہ مجھے مقرر کیا گیا ہے تین قسم کے لوگوں پر ایک تو ہر متکبر ظالم پر اور دوسرے ہر ایسے شخص پر جو اللہ کے علاوہ کسی اور خدا کو پکارے اور تیسرے تصویر بنانے والوں پر۔

(۵۰۳)----- وعن ابن عبّاس، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنَّ اللهَ تعالى حرَّم الخمرَ، والميسر، والكوبة، وقال: كل مسكر حرام قيل: الكوبة الطبل۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے اور کوبہ کو حرام قرار دیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے کہا گیا ہے کہ کوبہ کا معنی ہے طبل۔
کوبہ اصل میں چھوٹے طبلے کو کہتے ہیں چھوٹا طبلہ یا چھوٹا ڈھول۔

(۵۰٤)----- وعن ابن عمر: أن النبی صلى الله عليه وسلم نهى عن الخمر، والميسر، والكوبة، والغبيراء والغبيراء: شراب يعمله الحبشة من الذرة، يقال له: السكركة۔ (رواه أبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا شراب، جوئے، کوبہ اور غبیراء سے اور غبیراء ایک قسم کی شراب ہے جس کو حبشی بناتے تھے اس کو سکرکہ بھی کہتے ہیں۔

(۵۰۵)----- وعن أبی موسى الأشعری، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من لعب بالنرد فقد عصى الله ورسوله۔ (رواه أحمد وأبو داؤد)

ترجمہ ...... حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی نرد کے ساتھ کھیلے اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔

(۵۰٦)----- وعن أبی هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى رجلاً يتبع حمامةً فقال: شيطانٌ يتبع شيطانةً۔ (رواه أحمد وأبو داؤد وابن ماجه والبيهقی فی شعب الايمان)

ترجمہ ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ایک کبوتری کے پیچھے بھاگ رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شیطان ہے جو شیطانہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

کبوتر بازی اور پرندے رکھنے کا حکم:-

بظاہر یہ لگتا ہے کہ یہ آدمی کبوتر باز ہو گا، ایک ہوتا ہے کبوتر یا پرندے گھر میں رکھنا وہ تو جائز ہے اور اس کی واضح دلیل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ان کے بھائی کے پاس ایک نُغیر ہوتی تھی جو مر گئی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **!یا ابا عمیر ما فعل النغیر** اس سے معلوم ہوا کہ گھر میں شوقیہ پرندے رکھنا جیسا کہ لوگ طوطے وغیرہ رکھ لیتے ہیں، مور رکھ لیتے ہیں یا اور پرندے رکھ لیتے ہیں وہ تو جائز ہے لیکن ایک ہے اس کو باقاعدہ کھیل بنالینا جیسا کہ عام طور پر کبوتر باز قسم کے لوگ کیا کرتے ہیں اگر تو اس میں قمار اور جوا شامل ہو تو پھر تو حرام ہے ہی لیکن اگر اس میں قمار اور جوا نہیں ہے تو بھی عام طور پر اس میں اشتغال کی وجہ سے آدمی مقاصد اور فرائض سے غافل ہو جاتا ہے نہ نماز کی فکر نہ اور ضروری کاموں کی فکر اور نہ ہی ذکر اللہ کی طرف توجہ اور مکمل غفلت آدمی کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک شیطانی فعل قرار دیا ہے کیون کہ شیطان کا بڑا مقصد انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنا ہے سب سے زیادہ زور اس کا اسی بات پر ہوتا ہے اور یہ کام بھی ایسا ہے کہ آدمی اس سے فرائض اور ذکر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے اس لئے اس میں جوا نہیں تب بھی یہ شیطانی کام ہے اور اگر جوا ہے تو دوہرا شیطانی کام ہو گیا کیوں کہ جوئے کو بھی قرآن کریم نے شیطانی کام قرار دیا ہے کہ **انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلٰوۃ ۔** الآیۃ کہ شیطان جوئے وغیرہ کے ذریعے سے تم میں عداوت و بغض پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمہیں نماز اور ذکر اللہ وغیرہ سے روکنا چاہتا ہے تو یہ کبوتر بازی اور اس طرح کے کام ایسے ہیں کہ اگرچہ جوا نہ بھی ہو **ویصد کم عن ذکر اللہ وعن الصلٰوۃ** والی بات اس میں ضرور پائی جاتی ہے۔

﴿الفصل الثالث﴾

(۵۰۷)----عن سعید بن أبی الحسن، قال: کنت عند ابن عبّاس، إذ جاء رجل، فقال: یا ابن عبّاس إنی رجل، إنما معیشتی من صنعة یدی، وإنی اصنع

هذه التصاوير فقال ابن عبّاس: لا أحدثك إلا ماسمعتُ من رسول الله ﷺ، سمعته يقول: من صور صورة، فإن الله مُعذِبَه حتى ينفخ فيه الروح، وليس بنافخ فيها أبداً فربا الرجل ربوة شديدة، واصفرَّ وجهه، فقال: ويحك إن أبيت إلا أن تصنع، فعليك بهذا الشجر وكل شى ليس فيه روح۔ (رواه البخاری)

ترجمہ ...... حضرت سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس موجود تھا آپ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا! اے ابن عباس کہ میں ایسا آدمی ہوں کہ میرا ذریعہ معاش صرف میرے ہاتھ کی کاری گری ہے اور میں یہ تصویریں بناتا ہوں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں نہیں بتاتا مگر وہی بات جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو آدمی تصویر بنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دیں گے یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونکے حالانکہ وہ اس کے اندر کبھی بھی روح نہیں پھونک سکے گا۔ تو اس آدمی نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا (یعنی وہ پریشان ہو گیا) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم انکار کرو مگر اس بات سے کہ تم تصویریں بناؤ (یعنی تصویریں بنانا ضروری ہی سمجھو) تو تم ان درختوں کی تصویریں بنالیا کرو اور ہر ایسی چیز کی تصویریں بنالیا کرو جس کے اندر روح نہ ہو۔

تصویر سازی کا پیشہ:۔

وہ پریشان اس لئے ہوا کہ میرا ذریعہ معاش میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے میری تو روزی ہی تصویر سازی سے چل رہی ہے اور اب پتہ چلا کہ یہ کام ناجائز ہے اب کماؤں گا کہاں سے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بتایا کہ جاندار کی تصویر ناجائز ہے بے جان کی ناجائز نہیں ہے لہٰذا تم بے جان چیزوں کی تصویریں بنا کر اس کے ذریعے روزی کما لیا کرو۔

اس سے پتہ چلا کہ جیسے تصویر ناجائز ہے اسی طرح تصویر سازی کا پیشہ اختیار کرنا بھی ناجائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی کمائی بھی درست نہیں ہے اس لئے آدمی کو ایسے پیشے سے بچنا چاہئے۔

یہاں دو صورتیں ممکن ہیں ایک صورت یہ ہے کہ ابھی اس نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ سوچ رہا ہے کہ یہ کام سیکھ لوں اور یہ کیا کروں تو اس صورت میں اس کو حتمی طور پر اس سے رک جانا چاہئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی جہالت اور لاپرواہی کی وجہ سے ایک ذریعہ معاش کو اختیار کر چکا ہے مثلاً فوٹو گرافر ہے اس کام کی دکان کھول چکا ہے یا کسی اخبار وغیرہ میں یہ ملازمت شروع کر چکا ہے تو یہ کام ہے تو اس کے لئے بھی ناجائز لیکن ہمارے بہت سارے بزرگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ذریعہ معاش اس کو فوراً نہیں چھوڑنا چاہئے اور یہ حکم صرف اس ذریعہ معاش کا نہیں ہے بلکہ ہر ناجائز ذریعہ معاش کا ہے مثلاً کوئی آدمی سودی ملازمت کر رہا ہے یا اس طرح کا اور کوئی ذریعہ معاش کر رہا ہے بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ متبادل ذریعہ معاش پورے اہتمام کے ساتھ تلاش کرنا شروع کر دے اور جب متبادل مل جائے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لے اور جب تک متبادل نہیں ملتا تو پورے اہتمام سے تلاش بھی جاری رکھے اور اپنے اس فعل پر استغفار بھی کرتا رہے، ایک دم چھوڑنے کا اس لئے نہیں کہا جاتا کہ فی الحال تو یہ ایک گناہ میں مبتلا ہے لیکن اس نے یہ ذریعہ معاش یک دم چھوڑا اور یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوا تو پتہ نہیں کتنے ناجائز کاموں میں مبتلا ہو گا اس لئے کہ فقر ایک ایسی چیز ہے بسا اوقات آدمی کو کفر تک پہنچا دیتی ہے اور کفر تک نہ بھی پہنچائے تب بھی فقر کی وجہ سے آدمی بہت سارے ناجائز کام کر جاتا ہے اب تو ایک ناجائز کام میں مبتلا ہے لیکن اگر یہ ذریعہ معاش یک دم چھوڑ دیا تو بیسوں ناجائز کاموں میں مبتلا ہو جائے گا تو اتنے زیادہ حرام کاموں میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے کہ ایک ہی میں رہے بظاہر یہ لگتا ہے کہ اس کو ناجائز کام کی اجازت دی ہے اگرچہ عارضی طور پر ہی سہی تو حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس کو حرام کی اجازت نہیں دی بلکہ بہت سارے حراموں سے اس کو بچایا ہے گویا حرام میں تقلیل کی ہے۔

(٥٠٨)----- وعن عائشة، قالت: لما اشتكى النبي صلى الله عليه وسلم، ذكر بعض نسائه كنيسةً يقال لها: مارية، وكانت أم سلمة وأم حبيبة أتتا أرض الحبشةِ، فذكرتا من حسنها وتصاوير فيها، فرفع رأسه فقال: اولئكَ إذا مات فيهم الرجل الصَّالح بنَوا على قبره مسجداً، ثم صَوَّروا فيه تلك الصَّوَرَ، اولئك شرار خلق الله۔ (متفق عليه)

ترجمہ ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ کی بعض ازواج مطہرات نے ایک کینسہ کا ذکر کیا جسے ماریہ کہا جاتا ہے اور حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ حبشہ کے علاقہ میں گئیں تھیں تو ان دونوں نے اس کنیسے کے حسن کا ذکر کیا اور ان تصاویر کا بھی ذکر کیا جو اس کنیسہ کے اندر تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور فرمایا کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان میں سے

اگر کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو اس کی قبر کے نزدیک مسجد بنا لیتے تھے پھر اس میں یہ تصویر بناتے تھے یہ لوگ اللہ کی مخلوق میں سے سب سے برے ہیں۔

اس لئے کہ شرک کا راستہ یہیں سے کھلا ہے کہ جب نیک لوگوں کا انتقال ہوا تو شیطان نے آکر ان سے یہ کہا کہ فلاں فلاں لوگ کیسے تھے تو انہوں نے کہا کہ بڑے اچھے لوگ تھے شیطان نے کہا کہ ان کا انتقال ہو گیا اب تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تو ایسا انتظام ہو جائے کہ تم انہیں دیکھ لیا کرو تا کہ ان کی یاد تازہ ہو جایا کرے انہوں نے کہا کہ وہ تو قبروں میں دفن ہو گئے تو ان کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے شیطان نے کہا کہ اس کا طریقہ میں تمہیں بتلاتا ہوں اور طریقہ بتایا کہ یوں یوں ان کی تصویریں بنالو، تصویریں بنانے کا طریقہ سکھا دیا تصویریں بن گئیں نیک لوگ تھے تو شیطان نے کہا کہ عبادت کرتے وقت ان کی یہ تصویریں اپنے سامنے رکھ لیا کرو فائدہ یہ ہو گا کہ یہ نیک لوگ تھے ان کے تصور سے عبادت میں زیادہ خشوع و خضوع ہو گا اور دوسرے خیالات ذہن میں نہیں آئیں گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کر لیا تو پھر ایک آدھ نسل گزرنے کے بعد شیطان نے انہیں پٹی پڑھائی کہ انہیں کی عبادت کر لیا کرو اس لئے کہ اللہ میاں تو نظر نہیں آتے ان کی عبادت کا اتنا فائدہ نہیں ہے وہ تو بہت اونچے ہیں ان کی عبادت کرو یہ تمہیں اللہ میاں سے کام کروا دیا کریں گے اس لئے عبادت ان کی کرو کیوں کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى تو یوں تصویر سازی سے شیطان نے شرک کا راستہ کھولا اور اسی وجہ سے عبادت گاہوں میں بھی تصویریں بننے لگ گئیں چنانچہ عیسائیوں کے گرجوں میں آج بھی رواج ہے اور اس زمانے میں بھی رواج تھا کہ تصویریں ہوتی تھی اور عموماً یہ تصویریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام اس طرح کے مقدس حضرات کی ہوتی تھیں اس میں ایک قباحت تو تصویر سازی کی ہے اور دوسری قباحت ان برگزیدہ بندوں کی تصویر بنانا اور یہ کہنا کہ وہ ایسے تھے حالانکہ ان کی شکل اور طرح کی تھی خواہ مخواہ اپنے پاس سے ایک تصویر بنا کر کہہ دیا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ایسے تھے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں، یہ کہنا کہ ان کی شکل ایسی تھی یہ ان برگزیدہ بندوں کی توہین بھی ہے تو تصویر بنانے کا گناہ ایک ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی توہین کا گناہ دوسرا۔

یہاں پر حضرت ام سلمہ اور حضرت حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں آپ کے پاس بیٹھ کر اس کنیسے کا ذکر کیا جب تک تو اس کنیسہ کے عمارتی حسن کا تذکرہ چلتا رہا ہے اس وقت تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ناپسندیدگی نہیں فرمایا اور جب تصویر کی بات آئی تو اس موقع پر آپ نے یہ وضاحت کر دی کہ اس طریقہ سے یہ کام شروع کیا اور یہ لوگ شرار خلق اللہ ہیں یعنی اللہ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اور آپ کی موجودگی

میں صرف آخرت کی ہی باتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ تفریح طبع کے لئے دنیا کی چیزوں پر بھی تبصرے ہوا کرتے تھے جیسا کہ یہاں کنیسہ کی عملارت کی خوبصورتی پر بات ہو رہی تھی البتہ یہ ہے کہ جہاں پر خلاف شریعت بات آئی وہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوک دیا۔

(۵۰۹)----- وعن ابن عبّاس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ أشدَّ الناس عذابًا يوم القيامة، من قتل نبيًا، أو قتله نبيٌّ، أو قتلَ أحدَ والديه، والمصورون، وعالم لم ينتفع بعلمه۔

ترجمہ ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب والے لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے کسی نبی کو قتل کیا یا جن کو کسی نبی نے قتل کیا یا جس نے اپنے والدین میں سے کسی ایک کو قتل کیا اور تصویریں بنانے والے اور ایسا عالم جو اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھائے۔

(۵۱۰)-----وعن علی رضی الله تعالیٰ عنه أنه كان يقول: الشطرنج هو ميسر الأعاجم۔

ترجمہ ...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ شطرنج عجمیوں کا جوا ہے۔

(۵۱۱)----- وعن ابن شهاب، أن أبا موسى الأشعرى قال: لا يلعب بالشطرنج إلا خاطى۔

ترجمہ ......ابن شہاب زہری حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ شطرنج نہیں کھیلتا مگر خطاکار آدمی۔

(۵۱۲)----- وعن، أنه سئل عن لعب الشطرنج، فقال: هى من الباطل، ولا يحب الله الباطل روى البيهقى الأحاديث الأربعة فى شئب الايمان۔

ترجمہ ...... حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شطرنج کھیلنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ باطل میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ باطل یعنی فضول کام کو پسند نہیں کرتے۔

(۵۱۳)-----وعن أبى هريرة، قال: كان رسول الله ﷺ يأتى دار قوم من الأنصار، ودونهم دارٌ، فشقَّ ذلك عليهم، فقالوا: يا رسول الله! تأتى دار فلان، ولا تأتى دارنا فقال النبى ﷺ لأن فى دار كم كلبًا قالوا: أنَّ فى دارهم سنوَّراً

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: السِنّور سَبُعٌ۔ (رواہ الدار قطنی)

ترجمہ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انصار میں سے ایک قوم کے گھریاان کی حویلی میں آیا کرتے تھے ان کے قریب ہی کسی اور کا گھر تھاان پر یہ بات گراں گزری (کہ نبی کریم ﷺ ان کے گھرمیں آتے ہیں ہمارے گھرمیں نہیں آتے) انہوں نے عرض کیاکہ آپ فلاں کے گھرآتے ہیں ہمارے گھرمیں نہیں آتے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایاکہ اس لئے کہ تمہارے گھرمیں کتاہے تو انہوں نے کہاکہ ان کے گھرمیں بھی تو بلی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایاکہ بلی (عام قسم کا) ایک درندہ ہے۔

یعنی کتے کے اندر شیطانی اثرات ہوتے ہیں اور یہ فرشتوں کو پسند نہیں ہے جہاں پر کتا ہو وہاں پر وہ آتے بھی نہیں ہیں اس لئے میں بھی جہاں کتا ہو وہاں نہیں جاتا لیکن بلی کا یہ معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی جہاں بلی ہو وہاں فرشتے آنے سے گریز کرتے ہیں اس لئے بلی والے گھرمیں جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا یہاں ان کے گھرمیں کتا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو فرمایاکہ تمہارے گھرمیں چونکہ کتاہے اس لئے میں نہیں آتا لیکن کتا نکالنے کا حکم نہیں دیا تو اس کی وجہ بعض شارحین نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ کتا ایسا ہو جس کا رکھنا جائز ہو مثلاً حفاظت کے لئے رکھا گیا ہو اور واقعتاً حفاظت کی ضرورت بھی ہو۔

تفریح اور کھیلوں کے بارے میں اسلامی اصول:۔

اس باب میں صاحب مشکوٰۃ نے کچھ کھیلوں اور العاب کے بارے میں بھی حدیثیں پیش کی ہیں باب اگرچہ تصاویر کے بارے میں ہے لیکن لہو اور کھیلوں کی احادیث کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ تصویر بھی بنیادی طور پر لہو ہی کے قبیل سے ہے۔ کچھ کھیلوں کا اس باب کی احادیث میں صراحتاً ذکر آیا ہے ان کھیلوں کے حکم کو جاننے سے پہلے کھیلوں کے بارے میں شریعت کا عمومی مزاج سمجھ لینا چاہئے۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے انسان کے کسی فطری تقاضے پر اس نے پابندی نہیں لگائی بلکہ انہیں تسلیم کر کے انہیں پورا کرنے کی اجازت یا ترغیب دی ہے یہ بھی انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت کھیل یا تفریح وغیرہ میں خرچ کرے اس کی ضرورت دو وجہ سے ہوتی ہے ایک تو جسمانی صحت کے لئے کھیل اور ورزش وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کسی قسم کی ریاضت اور ورزش وغیرہ نہ کی جائے تو جسم کو کئی بیماریاں لاحق ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور انسان کا جسم پورے طور پر صحت مند نہیں رہتا اور دوسری ضرورت دماغی اور ذہنی صحت کے لئے ہوتی ہے کچھ وقت آدمی کا کسی ایسے کام میں گزرے جو سنجیدہ نہ

ہو اور اس کی وجہ سے اس کا ذہن کچھ ہلکا پھلکا ہو جائے اور سنجیدہ مشاغل کی وجہ سے انسان کے ذہن میں جو جکڑن سی پیدا ہو جاتی ہے وہ دور ہو جائے اس لئے کہ اگر اس کو دور نہ کیا جائے اور مسلسل بر قرار رہے تو انسان کی ذہنی صحت متاثر ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو جو کام بدنی صحت کے لئے کئے جاتے ہیں ان کو ہم کھیل سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو کام ذہنی صحت کے لئے کئے جاتے ہیں ان کو ہم تفریح سے تعبیر کر سکتے ہیں تو کھیل اور تفریح یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام سے ایک ہی مقصد حاصل ہوتا ہے مثلاً جسمانی ورزش کا یا اس سے صرف تفریح کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام سے دونوں مقصد حاصل ہو جاتے ہیں چنانچہ بعض کھیل ایسے ہیں کہ ان سے جسمانی ورزش بھی حاصل ہوتی ہے اور تفریح طبع بھی حاصل ہو جاتی ہے اور انسان کا دماغ بھی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے تو شریعت مطہرہ نے انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو تسلیم کیا ہے بلکہ پہلی ضرورت کو تو پورا کرنے کی ترغیب ہے مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **المؤمن القوی خیر واحب الی اللہ من المومن الضعیف وفی کل خیر** کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں طاقت ور مومن بہتر ہے کمزور مومن سے اگرچہ خیر دونوں کے اندر ہی ہے اور ہر مومن میں خیر موجود ہے لیکن مومن قوی میں خیر اللہ کی نظر میں زیادہ ہے بنسبت مومن ضعیف کے اس لئے کہ مومن قوی عبادت بھی زیادہ کرے گا وہ خلق خدا کے کام بھی زیادہ آئے گا اور اصول ہے کہ **خیر الناس من ینفع الناس** اور وہ جہاد وغیرہ بھی کر سکے گا جب کہ مومن ضعیف ان چیزوں میں کمزور ثابت ہو سکتا ہے۔ تو بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقتور مومن بہتر ہوتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مومن کو چاہئے کہ وہ اپنی صحت کی حفاظت کرے اور صحت کی حفاظت میں جہاں غذا اور علاج معالجہ داخل ہے وہیں جسمانی ورزش بھی داخل ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ورزشوں کی خاص طور پر ترغیب دی ہے جس سے یا تو جسم مضبوط ہوتا ہے یا جہاد کی تیاری میں مدد ملتی ہے مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑ دوڑ کی ترغیب دی ہے اسی طریقے سے تیر اندازی کی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے اور باقاعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ان دونوں کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے، گھوڑ دوڑ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقابلہ کروایا ہے ایک دفعہ دو گروپ تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ میں فلاں ٹیم میں شامل ہو کر کھیلتا ہوں تو دوسری طرف والے کھیلنے سے رک گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رک کیوں گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مقابلہ میں ہم کیسے کھیلیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف ہٹ کر فرمایا کہ تم دونوں کھیلو میں تم دونوں ٹیموں کے ساتھ ہوں تو

اس طرح کے کھیل جس میں جسمانی صحت کا مقصد بھی حاصل ہو وہ جہاد کی تیاری میں مفید بھی ہو اس کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے۔

اسی طرح ایسے لہو اور لعب کی ترغیب یا اجازت دی ہے جس سے کوئی شرعی مقصد حاصل ہو رہا ہو مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر لہو و لعب باطل ہے سوائے تین قسم کے لہو کے ایک آدمی کا تیر چلانا دوسرا گھوڑ دوڑ اور تیسرا اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا۔

اس حدیث کا مطلب شارحین حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ ان تین کے علاوہ اور لہو اگرچہ جائز ہیں لیکن وہ مستحب نہیں ہیں اور یہ تین لہو مستحب ہیں اور مستحب اس لئے ہیں کہ ان سے شرعی مقاصد حاصل ہو رہے ہیں پہلے دو کھیلوں سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے کہ مومن ضعیف نہیں رہتا بلکہ قوی بن جاتا ہے اور دوسرا یہ مقصد حاصل ہوتا ہے کہ اس سے جہاد کی تیاری ہوتی ہے جو بذات خود مقصود ہے اور تیسرے کھیل کا فائدہ یہ ہے کہ اہل خانہ کے آپس میں تعلقات اچھے ہوتے ہیں اور اہل خانہ کے آپس میں تعلقات کا اچھا ہونا یہ بھی ایک مقصد شرعی ہے جب میاں بیوی کے تعلقات اچھے ہوں گے تو باقی گھر کے بھی اچھے ہو جائیں گے اگر میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں تو آگے جو بچے ہوں گے وہ بھی چڑچڑے ہوں گے اور پورے گھر کا ماحول خراب ہو جائے گا یہ بات کھیل کی تھی۔

تفریح کا ثبوت:۔

اسی طرح تفریح کے معاملے میں بھی مراسیل ابی داؤد میں ایک حدیث ہے اس کی سند کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: **روحوا القلوب ساعة فساعة** کہ کبھی کبھار اپنے دل کو راحت و آرام پہنچایا کرو، دل و دماغ کو راحت پہنچانے کا مطلب ہے کوئی جائز تفریح کر لینا تاکہ دل و دماغ ذرا ہلکا ہو جائے اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن مرسل بھی ہمارے نزدیک حجت ہوتی ہے حدیث اگرچہ نہ بھی ہو لیکن اس طرح کے اقوال متعدد صحابہ و بزرگان دین سے ثابت ہیں اسی طرح کی ایک حدیث میں آتا ہے جس کو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ **الهوا و العبوا فانی اکره ان اری فی دینکم غلظة** کہ تم تفریح اور کھیلا کرو اس لئے کہ میں اس بات کو ناپسند سمجھتا ہوں کہ تمہارے دین کے اندر سختی دیکھوں۔

اسی طرح متعدد جگہوں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تقریر اور عمل سے یہی بات ثابت فرمائی ہے مثال کے طور پر ایک دفعہ کچھ حبشیوں نے مدینہ منورہ میں آکر اپنا ایک خاص قسم کا کھیل پیش کیا تو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی وہ کھیل دکھایا اس طریقے سے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑی ہو گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کے اوپر سے انہیں دیکھنے لگیں تاکہ حجاب کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی یہ کھیل دیکھ لیں ان کی تفریح بھی ہو جائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ سیر ہو گئی تمہاری تسلی ہو گئی جتنا دیکھنا تھا دیکھ لیا یا نہیں تو میں کہتی رہی کہ اور دیکھنا ہے اور مقصد یہ تھا کہ میں اندازہ لگاؤں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں میری کتنی قدر ہے اور دیکھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری خاطر کتنی دیر کھڑے رہتے ہیں یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب النکاح میں ہے اور صحیحین کی حدیثوں میں سے ہے۔ یہ دوسری حدیث جو پیش کر رہا ہوں یہ آگے باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں آئے گی یہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے کہ باہر ذرا شور سا سنائی دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیکھنے کے لئے باہر گئے کہ کیا معاملہ ہے تو وہاں ایک حبشن تھی اور بظاہر وہ نابالغ ہو گی وہ کچھ اپنا رقص سا پیش کر رہی تھی اچھل اچھل کر کوئی کھیل اپنا دکھا رہی تھی اپنا کرتب دکھا رہی تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کہا آؤ تمہیں بھی دکھاؤں چنانچہ میں بھی گئی تو میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ کھیل دیکھنے لگی اور لوگ بھی اس کے ارد گرد اکھٹے تھے اور اس کا کھیل دیکھ رہے تھے، اتنے میں وہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے ہی وہ کھیلنے والی بھاگ گئی اور دوسرے لوگ بھی بھاگ گئے نہ کھیل رہا نہ تماشا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے شیاطین بھاگ گئے یہاں یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ یہ اگر شیطانی کام تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت کیسے دے دی اور اگر یہ کام جائز تھا تو شیاطین کے بھاگنے کا کیا مطلب ہے اس پر تفصیلی بات تو کتاب المناقب میں جہاں یہ حدیث آئے گی وہاں کریں گے اجمالاً یہ سمجھ لیا جائے کہ بعض کام فی نفسہ جائز ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ امکان ہوتا ہے کہ ان کو ذریعہ بنا لیا جائے کسی ناجائز کام کا مثلاً اس میں نماز کا وقت آگیا نماز کی بھی فکر نہیں تو کام فی نفسہ اگرچہ جائز ہے لیکن اگر اس میں کوئی آدمی مبتلا ہوتا ہے تو شیطان کو ایک توقع وابستہ ہو جاتی ہے کہ میں اس آدمی کو اغوا کر سکتا ہوں اور وہ انتظار میں بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ بلی شکار کی تاک میں بیٹھتی ہے کہ جب میرا داؤ چلے گا تو اس پر جھپٹ پڑوں گی یہ کام شیطانی نہیں تھا بلکہ جائز تھا کیوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا بھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دکھایا بھی

اور اس پر انکار بھی نہیں فرمایا منع بھی نہیں فرمایا لیکن بہر حال ایسا مباح کام تھا جس سے شیطان کو کسی درجہ میں توقع پیدا ہو سکتی تھی کہ شاید میرا داؤ چل جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے کھیل ختم ہو گیا تماشائی بھی منتشر ہو گئے تو شیطان کی امید پر بھی اوس پڑ گئی اس لئے وہ بھی بھاگ گیا اس نے کہا کہ میرے یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے کہ شیطان کا ایک وصف بہت اہم ہے کہ وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتا جہاں اسے مایوس کر دیا جائے وہاں سے وہ چلا جاتا ہے کہ بجائے اس پر محنت کرنے کے اپنا وقت ضائع کرنے کے یہ محنت کہیں اور جا کر کرتے ہیں کسی ایسی جگہ پر کرتے ہیں جہاں پر کامیابی کی کچھ امید ہو اس کو فقہاء کی اصطلاح میں **قطع طمع الشیطان** کہتے ہیں کہ شیطان کے لالچ کو ختم کر دیا جائے اور بعض کام اس مقصد کے لئے ہوتے ہیں مثلاً فرائض سے پہلے جو سنتیں شروع ہیں ان کی حکمت فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ اس کا مقصد **قطع طمع الشیطان** کہ شیطان امید لگا کر بیٹھا تھا کہ میں اس کو نماز نہیں پڑھنے دوں گا ور غلاؤں گا شاید یہ میرے کہنے سے نماز پڑھنے سے رک جائے اب شیطان دیکھتا ہے کہ یہ تو اتنا پکا ہے کہ فرض تو کیا چھوڑنے تھے یہ فرض کی تمہید چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے کہتا ہے کہ یہ میرے قابو سے نکل گیا تو اس طرح یہاں کام تو مباح تھا لیکن اس میں شیطان کو ایک طمع ضرور تھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر وہ طمع منقطع کر دی لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلا کہ اس طرح کی تفریح جائز ہے بلکہ ایک معقول حد تک مناسب ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیکھنے کے لئے خود بلایا ہے۔

بغیر ورزش کے محض تفریح بھی جائز ہے:-

یہاں کھیلنے والی کی تو جسمانی ورزش بھی ہو رہی تھی لیکن دیکھنے والوں کو تو ظاہر ہے کوئی جسمانی ورزش نہیں ہو رہی تھی لیکن تفریح کا فائدہ حاصل ہو رہا تھا تو اس سے پتہ چلا کہ خالص تفریح کی بھی گنجائش ہے اور ان واقعات سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن خلق بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات کا بھی کتنا خیال رکھتے تھے۔

اسی طریقہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میری رخصتی ہوئی اس وقت میرے ساتھ میرے کھلونے بھی تھے اور بعد میں بھی میری سہلیاں میرے پاس کھیلنے کے لئے آیا کرتی تھیں اور کھیلا کرتی تھیں تو جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو وہ ادھر ادھر کھسک جاتیں آنحضرت ﷺ دیکھتے کہ میرے آنے کی وجہ سے ان کا کھیل خراب ہو گیا تو خود ان سہلیوں کو بلا کر لاتے اور کہتے کہ آکر کھیلوں میں کہیں اور چلا جاتا ہوں تو اس طریقہ سے ان کو دوبارہ کھیل میں لگا دیتے تھے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک بچی کی رخصتی کی اور اس کی شادی انصار کے گھر میں ہوئی تھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے اس کی رخصتی کر دی ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ کر دی ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی ڈولی کے ساتھ لہو کا بھی انتظام کیا تھا کہ ساتھ کچھ تھوڑا سا کھیل تماشا بھی ہو تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ایسا تو کوئی انتظام نہیں کیا اصل میں قریش کے ہاں اس طرح کی چیزوں کا کوئی رواج بھی نہیں تھا بہت سادہ زندگی تھی لیکن انصار کی زندگی پہلے سے متمدن تھی اور ان میں اس طرح کی چیزوں کا بھی رواج تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں چاہئے تھا کہ تم اس کی رخصتی کے ساتھ لہو (کھیل تماشے) کا بھی انتظام کرتیں اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسی بچیوں کا انتظام کرتیں جو اس کے ساتھ گاتی ہوئی جاتیں أتینا کم أتینا کم ۔ اس لئے کہ انصار لہو کو پسند کرتے ہیں تمہیں ضرورت نہیں ہے لیکن جن کے ہاں رخصتی ہو رہی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح کا کام ہو اس لئے تمہیں اس طرح کا انتظام کرنا چاہئے تھا یہ بخاری وغیرہ کی روایت ہے۔

خوشی کے موقع پر خوشی کا اظہار:۔

ان روایتوں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ خوشی کے مواقع پر خوشی کا اظہار پسندیدہ ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے۔

بعض لوگوں کا ایک عجیب وغریب مزاج ہوتا ہے ان کے ہاں دین داری کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی خوشی نہیں آنی چاہئے جس طرح خود اپنے تقوے میں جلے ہوئے ہیں اس طرح سارے گھرانے کو اس تقوے میں جلا کر رکھنا ہے۔ حضور ﷺ کا طریقہ یہ نہیں تھا ہاں ویسے حضور اقدس ﷺ نے لہو کی ترغیب کہیں نہیں دی لیکن یہاں چونکہ خوشی کا موقع ہے اس طرح عید کے موقع پر بھی اس طرح کی حدیثیں آتی ہیں کہ حضور ﷺ نے کہا کہ خوشی کا اظہار بھی ہونا چاہئے اور بعض اس طرح کی چیزوں کی اجازت بھی ہونی چاہئے۔

اسی طرح کوئی کھیل ہو رہا تھا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر روکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مت روکو اس لئے کہ یہ عید کا دن ہے خوشی کا دن ہے انہیں خوشی منانے دو لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ حدود کے اندر ہو کسی ناجائز کام کا ارتکاب نہ ہو تو اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ خوشی کے موقع پر خوشی کا اظہار اور خوشی کا انداز جائز حدود کے اندر ہونا چاہئے اور یہ نہیں ہونا چاہئے کہ شادی اور مرگ یعنی سوگ میں فرق کرنا ہی مشکل ہو جائے۔

کھیل اور تفریح میں شرعی پابندیاں:-

دوسری بات ان احادیث سے یہ سمجھ میں آرہی ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے کہ کھیل ہویا تفریح یہ ایک حد تک انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور شریعت اسلامی نے اس تقاضے پر کوئی پابندی عائد نہیں کہ بلکہ اسے پورا کرنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ اجازت اتنی کھلی اور عام بھی نہیں ہے کہ کھیل اور تفریح کے نام پر جو چاہو کر لو بلکہ اس پر شریعت کی جانب سے کچھ پابندیاں ہیں نماز بھی ہر وقت نہیں پڑھ سکتے اور روزے بھی تمام دن نہیں رکھ سکتے تو جہاں عبادات کے اندر بھی پابندیاں اور حدود و قیود ہیں تو وہاں کھیل اور تفریح کی کھلی اجازت کیسے ہو سکتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی قیود اور پابندی نہ ہو پھر تفریح انسان کی ضرورت ہے لیکن ظاہر ہے کھانے پینے اور لباس سے تو بڑی ضرورت نہیں کیوں کہ کھانا پینا اور لباس ضروریات اصلیہ ہیں کھیل و تفریح ضروریات زائدہ ہیں اور ظاہر ہے کہ شریعت نے کھانے پینے پر پابندی تو نہیں لگائی لیکن کھانے پینے اور لباس میں بھی کچھ نہ کچھ حدود و قیود ضرور ہیں حلال و حرام اس میں بھی ہیں کہ یہ کھا سکتے ہو یہ نہیں کھا سکتے یہ پہن سکتے ہو اور یہ نہیں پہن سکتے کھیل اور تفریح ضرورت سہی لیکن ثانوی درجے کی ضرورت ہے تو ظاہر ہے اس میں اتنی کھلی چھوٹ نہیں ہو سکتی کہ تفریح کے لئے جو چاہو کرو بلکہ اس میں کچھ پابندیاں ہیں کھیل اور تفریح کی اجازت تو دی ہے لیکن یہ اجازت علی الاطلاق نہیں ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح کے کھیل جائز ہیں اور کس طرح کے ناجائز ہیں تو اس کے بارے میں مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع رحمہ اللہ نے اپنے احکام القرآن میں اس پر باقاعدہ ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں اس سلسلہ میں ایک ضابطہ بھی بیان کیا ہے پہلے وہ ضابطہ ذہن میں رکھ لیجئے اس کے بعد پھر بعض کھیلوں کے بارے میں فقہاء کا اختلاف سمجھ لیں گے۔

ضابطہ یہ ہے کہ اس کھیل یا تفریح کے بارے میں یہ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی قابل ذکر فائدہ ہے یا نہیں ہے اگر تو اس میں کوئی قابل ذکر فائدہ ہی نہیں ہے نہ ہی جسمانی ورزش حاصل ہوتی ہے نہ ہی تفریح طبع کا فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے خالص لہو میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع ہو گا کیوں کہ اس میں مشغول ہونا اضاعت وقت اور اشتغال بمالا یعنی ہے اور اگر اس میں کوئی فائدہ ہے تو پھر یہ دیکھیں گے کہ کسی نص میں یا کسی صریح حدیث وغیرہ میں اس سے منع تو نہیں کیا گیا اگر صریح حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے تو بھی وہ کھیل ناجائز ہو گی اور یہ کہیں گے کہ اگرچہ اس میں ہمیں فائدہ نظر آرہا ہے لیکن اللہ اور رسول کی نظر میں اس کے اندر کوئی ایسا نقصان ضرور ہے جو اس فائدے سے بڑھ کر ہے اور یہ **اثمھما اکبر من نفعھما** کا مصداق ہے چاہے وہ نقصان سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کی مثال نرد شیر ہے، یہ ایک خاص قسم کا کھیل ہے جو شطرنج سے

ملتا جلتا ہے اس میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں تشحیذ اذہان ہے اور دماغ کی ریاضت ہوتی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ صراحتاً اس سے منع فرمادیا اس لئے یہ کھیل جائز نہیں ہے اور یہ سمجھیں گے کہ ہمیں اس میں جو فائدہ سمجھ میں آرہا ہے وہ اس نقصان کے مقابلہ میں معمولی ہے جو نقصان شریعت نے اس میں سمجھا ہے۔

اگر اس کھیل کے اندر فائدہ ہو اور کسی نص میں اس سے منع بھی نہ کیا گیا ہو تو پھر یہ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی مفسدہ بھی ہے یا نہیں اگر اس میں فائدہ تو ہے مفسدہ نہیں ہے تو اس کی اجازت ہوگی اور اگر وہ فائدہ شرعاً مطلوب اور مستحسن ہے تو وہ کھیل بھی مستحسن ہوگا بشرطیکہ اپنی حدود کے اندر ہو اور اگر اس کے اندر فائدہ کے ساتھ ساتھ کوئی مفسدہ بھی ہے یا مفاسد ہیں پھر دیکھیں گے غلبہ کس کو ہے فائدہ کا پہلو غالب ہے یا مفاسد کا پہلو غالب ہے اگر مفاسد تو ہوں لیکن فائدہ کا پہلو غالب ہے اور مفسدہ کا پہلو اس کے مقابلہ میں معمولی ہے تو پھر بھی اس کھیل کی اجازت ہوگی لیکن اس سے بچنا اولیٰ ہوگا لیکن اجازت اس شرط پر ہوگی کہ آدمی ان مفاسد سے بچتے ہوئے اس کھیل کو اختیار کرے اور اگر اس میں فوائد تو ہوں لیکن مفاسد فوائد سے زوائد ہوں تو وہ کھیل شرعاً ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

بعض کھیلوں میں ممکنہ مفاسد:۔

یہ اس ضابطے کا خلاصہ ہے اس ضابطے کے اندر ہم نے مفاسد کی بات کی ہے تو ضابطے کو مکمل طور پر سمجھنے اور اس کے انطباق کی سہولت کے لئے یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ عام طور پر کھیلوں میں مفاسد کون سے ہو سکتے ہیں تو چند مفاسد جو کھیلوں میں بکثرت پائے جاسکتے ہیں یہ ہیں۔

سب سے بڑی بات جو تفریحات میں پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے کئی تفریحات سے فقہاء نے منع کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایسا انہماک ہو جائے کہ ذکر اللہ فرائض اور ضروری کاموں سے انسان کو غافل کر دے بعض تفریحات ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی ان میں ایک دفعہ لگ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا خاص طور پر ایسی تفریحات جن میں جسمانی توانائی خرچ نہ ہوتی ہو کیوں کہ جس میں جسم کو حرکت دینی پڑے گی اس میں آدمی کبھی تو تھکے گا لیکن محض دماغی کام ہے یا تھوڑا بہت ہاتھ ہلانے کا کام ہے تو بعض اوقات آدمی اس میں ایسا لگتا ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا بہت سارے ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں نماز کا وقت آگیا نماز کا پتہ نہیں بیوی بچوں کے لئے کمانا ضروری تھا لیکن اس کی بھی کوئی فکر نہیں آرام کی کوئی پرواہ نہیں گھر میں کوئی بیمار ہے اس کے آرام کی کوئی پرواہ نہیں تو اس طرح کا انہماک کسی تفریح میں ہو جانا یہ ایک اہم مفسدہ ہے۔

دوسرا مفسدہ کشف ستر ہے یعنی جسم کے جس حصے کو چھپانا ضروری تھا اس کو ظاہر کرنا کئی کھیل ایسے

ہوتے ہیں کہ ان میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ ستر پورے طور پر چھپا ہوا نہیں ہوتا مثلاً صرف نیکر پہن کر بعض کھیل کھیلے جاتے ہیں بعض کھیل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ تو چھپا ہوا ہوتا ہے اس لئے مرد کے لئے تو اس میں گنجائش ہوتی ہے لیکن عورتیں بھی وہ کھیل کھیلتی ہیں ان کے لئے ظاہر ہے ستر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کے لئے جائز نہیں ہوتا تو دوسرا ممکنہ مفسدہ کشف ستر ہے۔

تیسرا مفسدہ جو کسی کھیل میں پایا جاسکتا ہے کہ جس میں بد تمیزی اور بد تہذیبی ہو یعنی ایسا کھیل ہو جو شائستگی کے خلاف ہو اس کی آسان مثال ہمارے ماحول میں بسنت کی دی جاسکتی ہے کہ اس میں دوسرے مفاسد کے علاوہ ایسی ہلڑ بازی ہوتی ہے اور اس انداز کا شور شرابہ ہوتا ہے جو شریف آدمی کو زیب نہیں دیتا۔

چوتھا مفسدہ ایذاء رسانی کا ہو سکتا ہے کہ بعض کھیل ایسے انداز سے کھیلے جاتے ہیں کہ اس میں دوسروں کو ایذاء ہوتی ہے مثلاً اس میں شور ہوتا ہے یا راستے کے اندر کوئی کھیل کھیلنا شروع کر دیا گلیوں کے اندر کھیلنا شروع کر دیا جس سے گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

پانچواں ممکنہ مفسدہ بے احتیاطی ہے کہ بعض کھیل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بالفعل اگرچہ کسی کو ایذا نہیں ہوتی لیکن کسی کے نقصان کا خطرہ ضرور ہوتا ہے جو کھیل کے اندر شریک ہوتے ہیں وہ تو چونکہ اس کو سمجھ رہے ہوتے ہیں اس لئے وہ تو نقصان سے بچ جاتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کو بہر حال نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اس کی ایک تو آسان سی مثال ہے اب کبھی نہیں دیکھا پہلے ہوتا تھا گلی ڈنڈا اب یہ ایسی چیز ہے کہ پتہ نہیں ہوتا کہ کس کو جا کر لگے کہاں پر لگے سر پر لگے آنکھ میں لگے یا کہیں اور لگے یہ اندھا کھیل ہے تو اس میں کسی کے ضرر کا واضح احتمال موجود ہے یا گلی محلوں کے اندر کرکٹ کھیلنا شروع کر دیا اور کرکٹ کی اصل گیند آپ جانتے ہیں بڑی بھاری اور وزنی ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر میں چلی جائے جس کے گھر میں گئی ہو سکتا ہے اس کے سر میں جا کر لگے یا کسی اور جگہ جا کر لگے اور اس کا نقصان ہو جائے تو یہ چیز بے احتیاطی سے خالی نہیں ہے یہ چند مفاسد بطور مثال کے ذکر کئے ہیں اور فقہاء زیادہ تر جس مفسدہ کا ذکر کرتے ہیں وہ پہلا ہے لیکن باقی بھی فی الجملہ بعض کھیلوں میں ہوتے ہیں۔

یہ کھیلوں کے بارے میں عام ضابطہ ہے یہ ضابطہ تو ایسا ہے کہ بظاہر اس میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں ہو سکتا البتہ اس کے انطباق میں بسا اوقات اختلاف ہو جاتا ہے مثلاً یہی اصول تھا کہ نص میں صراحتاً کسی کھیل سے منع کر دیا گیا ہو تو وہ ناجائز ہو گی لیکن اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ نص ثابت ہے یا نہیں جن کے نزدیک وہ حدیث ثابت ہو گی ان کے نزدیک وہ کھیل ناجائز ہو گا اور جن کے نزدیک ثابت نہیں ہو گی ان کے نزدیک جائز ہو گا۔

اسی طرح اس ضابطے کے اندر ایک بات آئی تھی کہ مفاسد کا فوائد پر غلبہ ہو اور مفاسد زیادہ ہوں اور ان سے احتراز نہ ہو سکتا ہو تو وہ کھیل بھی ناجائز ہے اب کون سے کھیل میں مفاسد زیادہ ہیں کس میں کم اور کس کھیل میں ان مفاسد سے احتراز کیا جاسکتا ہے اور کن میں ممکن نہیں ہے یہ معاملہ تجربے اور مشاہدے کا ہے اور تجربے اور مشاہدے میں حالات کو سمجھنے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے اس اصول کے انطباق میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔

شطرنج اور نرد کھیلنے کا حکم :-

چنانچہ بعض کھیلوں کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہوا بھی ہے ان میں سے دو کھیل یہاں پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس لئے کہ ان کا روایات میں ذکر آیا ہے ایک نرد شیر اور دوسرا شطرنج شطرنج معروف کھیل ہے اور نرد شیر اس سے ملتا جلتا کھیل ہے بعض حضرات نے ان میں فرق یہ بیان کیا ہے کہ اصل میں دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن میں انسان کی تدبیر اور حیلہ بازی کا کوئی دخل نہیں ہوتا جیسے موسم، آندھیاں، بارشیں اور زلزلے ہیں دوسری قدرتی آفات اور واقعات ہیں اور دوسرے وہ واقعات ہیں جن میں انسان کی تدبیر اور حیلہ بازی کا بھی دخل ہوتا ہے اور ان میں پہلے زمانے میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی بادشاہوں کے واقعات اور اقتدار کی رسہ کشی کو کہ کبھی کسی کو دبالیا کبھی کسی نے کسی کو دبالیا کبھی لشکر کشی کے ذریعہ سے کبھی حیلہ بازی کے ذریعہ سے تو شطرنج میں اصل میں دوسرے قسم کے واقعات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ کوئی اس میں بادشاہ ہوتا ہے کوئی کچھ ہوتا ہے کوئی کچھ ہوتا ہے اور ان کا ایک کھیل ہوتا ہے تو اس میں اس قسم کے واقعات کا سامنا کرنے کی ایک ریاضت ہوتی ہے اور نرد شیر میں پہلے قسم کے واقعات کی تمثیل ہوتی ہے۔

بہر حال دونوں ملتے جلتے ہیں نرد شیر غیر اختیاری امور سے متعلق ہے اور شطرنج اختیاری امور سے متعلق ہے نرد شیر کے بارے میں اگرچہ بعض سلف سے اجازت ثابت ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تک یہ نہی کی حدیثیں نہیں پہنچیں اس لئے ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ناجائز ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً اس سے منع فرمادیا اور یہ نہی بھی صحیح احادیث کے اندر آتی ہے ان میں ایک تو صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے نرد شیر کے ساتھ کھیلا تو گویا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کو خنزیر کے گوشت اور خون کے ساتھ رنگ لیا۔

شطرنج کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے شطرنج کی تین صورتیں ہیں۔